تاریخ پاک و ہند

(ازمنۂ قدیم تا ۱۷۰۷ء)

ڈگری کلاسوں کے لئے

مصنفہ

پروفیسر ایم - شمس الدین

ایم - اے' ایل ایل - بی (پنجاب) و بی - اے آنرز (لنڈن)

صدر شعبۂ تاریخ

اسلامیہ کالج ' سول لائنز ' لاہور

1966

ناشران : یونائیٹڈ بک کارپوریشن

۳۵ - حق سٹریٹ ' اردو بازار ' لاہور

ملنے کا پتہ : فاضل مقبل اینڈ سنز

۱۴ - اردو بازار ' لاہور - ۲

قیمت .25

تاریخ پاک و ہند

(ازمنۂ قدیم تا ۱۷۰۷ء)

ڈگری کلاسوں کے لئے

مصنفہ

پروفیسر ایم - شمس الدین
ایم-اے، ایل ایل-بی (پنجاب) و.ا

...ہے۔
...اچھی طرح۔
...ری میں دے کر
...خیہ امور پر تنقید و تبصرہ
... پر مذاکرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب تین حصوں یا ادوار پر تقسیم ہے۔ پہلا حصہ ہندوؤں کے دور سے متعلق ہے۔ لیکن اس میں برصغیر کی قدیم تہذیبوں اور مذاہب کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کو خاص طور پر اہمیت دی گئی ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے اپنے ملک کا شاندار ماضی ہے۔ مہاتما بدھ اور راجہ اشوک کے حالات ان کی عظیم شخصیتوں کی بنا پر خوب تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ علاقائی حکمرانوں کے متعدد

پیش لفظ

پنجاب یونیورسٹی نے امسال بی ۔ اے کے نصاب تاریخ میں ترمیم کرنے کے علاوہ طلبہ کو یہ اجازت عطا کی ہے ۔ کہ وہ اپنی قومی زبان یعنی اردو میں جوابات تحریر کر سکتے ہیں ۔ یہ کتاب ترمیم شدہ نصاب کے عین مطابق لکھی گئی ہے ۔ اور تاریخی واقعات کو سلیس اردو میں مربوط اور مناسب پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے ۔ امتحانی معیار کو ہر حالت میں پیش نظر رکھا گیا ہے ۔ جدید تاریخی تنقید کے اصولوں کے مطابق تمام واقعات کا اچھی طرح جائزہ لیا گیا ہے ۔ مستند مورخین کے مشہور حوالے انگریزی میں دے کر اُن کا اردو میں ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے ۔ متنازعہ فیہ امور پر تنقید و تبصرہ کے بعد منطقی استدلال سے واضح نتیجہ برآمد کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

کتاب تین حصوں یا ادوار پر تقسیم ہے ۔ پہلا حصہ ہندوؤں کے دور سے متعلق ہے ۔ لیکن اس میں برصغیر کی قدیم تہذیبوں اور مذاہب کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں ۔ وادی سندھ کی تہذیب کو خاص طور پر اہمیت دی گئی ہے ۔ کیونکہ یہ ہمارے اپنے ملک کا شاندار ماضی ہے ۔ مہاتما بدھ اور راجہ اشوک کے حالات ان کی عظیم شخصیتوں کی بنا پر خوب تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں ۔ علاقائی حکمرانوں کے ضروری

حالات مختصر لیکن جامع انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ تاکہ قدیم تاریخ کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ ہندو نوآبادیات۔ ہندو مصلحین اور بھگتی تحریک کا حال بھی مناسب مقام پر بیان کیا گیا ہے۔ مسلمان صوفیوں اور مبلغین کے مختصر حالات پیش بھی کئے گئے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں سلاطین دہلی کے حالات خاندانوں کے مطابق دیئے گئے ہیں۔ بہمنی سلطنت اور وجیا نگر کی ہندو ریاست کے حالات علیحدہ علیحدہ ابواب میں پیش کئے گئے ہیں۔ مغلیہ دور کی اہمیت کے پیش نظر بابر سے اورنگ زیب تک تمام تاریخی حالات اور جدید تنقید کو خوب کھنگال کر پیش کیا گیا ہے۔ آخری باب میں مغلیہ دور کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مغلوں کے نظام سلطنت۔ فن تعمیر اور تہذیبی ورثے کی تفصیلات اسی باب میں دی گئی ہیں۔

امید واثق ہے۔ کہ ڈگری کلاسوں کے لیے یہ کتاب از حد مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

(پروفیسر) ایم۔ شمس الدین

۲۵ دسمبر ۱۹۶۴ء
اسلامیہ کالج
سول لائنز۔ لاہور

فہرست

ابواب	صفحہ
۱ جغرافیائی کیفیت اور تاریخ پر اس کے اثرات	۱
۲ قدیم ہندوستان کی نسلیں اور اصلی باشندے	۸
۳ برصغیر کی قدیم تاریخ کے ماخذ	۱۴
۴ وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب	۲۴
۵ آریہ قوم اور رگ ویدک تہذیب	۳۹
۶ زمانۂ شجاعت	۵۱
۷ ذات پات کی تمیز	۶۷
۸ جین مت اور بدھ مت	۸۰
(ب) چھٹی صدی ق.م میں ہندو ریاستیں	۱۰۳
۹ ایرانیوں اور یونانیوں کی یورش اور سکندر اعظم کا حملہ	۱۰۹
۱۰ موریا خاندان کا عروج	۱۲۰
(ا) چندر گپت موریا	۱۲۳
(ب) مہاراجہ اشوک	۱۳۹
(ج) موریا سلطنت کا زوال	۱۵۳
۱۱ کشان خاندان - راجہ کنشک	۱۶۴
(ب) سنگھار اور کانوا ریاستیں	۱۷۵
(ج) تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں شمالی ہند کی ریاستیں	۱۷۷

۱۲	گپت خاندان یعنی ہندوؤں کا سنہری زمانہ	۱۸۲
	(ا) چندر گپت اوّل	۱۸۳
	(ب) سمندر گپت	۱۸۴
	(ج) چندر گپت بکرماجیت	۱۹۲
	(د) فاہیان کے بیان کردہ حالات	۱۹۴
	(ہ) ھن قوم کی تاخت و تاراج	۲۰۱
۱۳	مہاراجہ ہرش	۲۰۷
	(ا) ہیون سانگ کے بیان کردہ حالات	۲۱۴
	(ب) اس دور کے تاریخی ماخذ	۲۱۷
	(ج) ہرش چرتر کی اہمیت	۲۲۱
۱۴	راجپوتوں کا دور	۲۲۷
	(ا) شمالی ہند کی ریاستیں	۲۳۳
	(ب) دکن کی ریاستیں	۲۳۹
	(ج) اندھرا سلطنت کی تاریخ	۲۴۰
	(د) چالوکیہ خاندان	۲۴۲
	(ہ) راشٹر کوٹہ خاندان و دیگر حکمران	۲۴۴
	(و) تامل علاقے کی ریاستیں	۲۴۵
۱۵	ہندی نو آبادیات	۲۵۰
۱۶	جدید ہندومت اور ہندو ریفارمر	۲۵۹

مسلمانوں کی آمد سے

۱۷	سندھ پر عربوں کا حملہ	۲۶۴

۱۸	غزنوی سلاطین	۲۸۹
۱۹	غوری خاندان یا آلِ شنسب	۳۱۹
	(ب) محمد غوری اور سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ	۳۲۷
	(ج) ہندوؤں کی شکست کے اسباب	۳۲۹
۲۰×	خاندانِ غلاماں	۳۳۵
	(ا) سلطان قطب الدین ایبک	۳۳۷
	(ب) شمس الدین التمش	۳۴۴
	(ج) رضیہ سلطانہ	۳۵۲
	(د) ناصر الدین محمود	۳۵۷
	(ہ) سلطان غیاث الدین بلبن	۳۶۴
×	(و) خاندانِ غلاماں کا زوال	۳۸۱
۲۱	خلجی سلاطین	۳۸۵
	(ا) جلال الدین فیروز	۳۸۶
	(ب) سلطان علاؤالدین خلجی	۳۹۲
۲۲	تغلق خاندان	۴۱۹
	(ا) غیاث الدین تغلق کے کارنامے	۴۲۰
	(ب) سلطان محمد بن تغلق	۴۲۳
	(ج) فیروز شاہ تغلق	۴۳۶
	(د) امیر تیمور کا حملہ	۴۴۵
۲۳	بہمنی سلطنت اور وجیانگر کی ریاست	۴۵۸
۲۴	گجرات۔ مالوہ۔ جونپور اور بنگال کی اسلامی ریاستیں	۴۸۲
۲۵	سید اور لودھی سلاطین	۴۹۶

سلطان سکندر لودھی ۵۰۱

۲۶ سلاطین دہلی کا دور اور اس کے مختلف پہلو ۵۰۶

بھگتی تحریک ۵۳۳

دور سلاطین کے مسلمان صوفی ۵۳۹

مُغلیہ دور

۲۷ ظہیر الدین محمد بابر ۵۴۸

۲۸ ہمایوں اور شیر شاہ سوری ۵۶۶

(ا) ہمایوں کی ناکامی کے اسباب ۵۹۱

(ب) فرید خاں (شیر شاہ سوری) ۵۹۵

۲۹ اکبر اعظم ۶۱۹

(ا) اکبر کی راجپوت پالیسی ۶۲۹

(ب) اکبر کے مذہبی حالات کا ارتقاء ۶۴۴

(ج) اکبر کا لگانِ اراضی ۶۶۱

(د) منصب داری نظام ۶۶۷

(ہ) تاریخ میں اکبر کا مقام ۶۷۸

(و) اکبری دور کے معاشی و سماجی حالات ۶۸۳

۳۰ جہانگیر کا عہد حکومت ۷۰۰

۳۱ شہاب الدین شاہجہاں ۷۵۱

(ا) سنہری دور ۷۵۵

(ب) وسط ایشیائی پالیسی ۷۶۱

(ج) شاہجہاں کی دکنی پالیسی ۷۶۶

	(د)	فنِ تعمیر	۷۷۸
	(ہ)	شاہجہاں کے بیٹوں میں جنگِ تخت نشینی	۷۸۵
۳۳		محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر	۸۰۱
	(ا)	راجپوتوں سے جنگ	۸۱۳
	(ب)	اورنگ زیب کی دکنی پالیسی	۸۱۶
	(ج)	مرہٹوں سے جنگ و جدل	۸۲۴
۳۴		مغلیہ دور کے مختلف پہلو	۸۳۳
	(ا)	مرکزی نظامِ سلطنت	۸۳۳
	(ب)	مغل شہنشاہ	۸۳۶
	(ج)	صوبائی انتظامی ڈھانچہ	۸۴۱
	(د)	منصب داری نظام	۸۴۵
	(ہ)	لگانِ اراضی کا نظام	۸۴۶
	(و)	مغلیہ فنِ تعمیر	۸۴۷
	(ز)	مغلیہ دور میں آرٹ، مصوری اور موسیقی	۸۵۳
	(ح)	مستند تاریخی اور علمی ذخیرے	۸۵۶
	(ط)	ادب، ثقافت اور کتب خانے	۸۵۸

پہلا باب

جغرافیائی کیفیت اور تاریخ پر اُس کے اثرات

جہاں تک تاریخ کی رسائی ہے اُس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان عام طور پر چھوٹی چھوٹی حکومتوں اور خود مختار ریاستوں میں بٹا رہا اور اس تمام علاقے میں کبھی بھی مستقل طور پر ایک ہی سلطنت قائم نہ ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ عیاں ہے کہ ذرائع آمد و رفت میں آسانی مہیا نہ تھی اور مرکزی حکومت کے لئے کسی ایک مقام سے ہندوستان کے دور دراز حصّوں پر اقتدار قائم رکھنا از حد مشکل تھا۔ لہٰذا ہندوؤں کے زمانے میں سیاسی اور قومی اتحاد ہمیشہ مفقود رہا۔ چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہمسایہ سلطنت کی مصیبتوں سے ہمیشہ لاپرواہی برتتی تھیں اور اُن میں سیاسی وحدت یا ملکی خطرات کا احساس تک بھی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن کلچر کے لحاظ سے ملک بھر میں یگانگت تھی۔ بھارت ورش سے یہی مفہوم ہے یعنی ہندوؤں کے ذہن سے سیاسی اتحاد غائب رہا ہے لیکن اُن کے مذہبی مقامات ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے اور لوگوں کے دماغی رجحانات اور طرزِ فکر اور تمدن تقریباً ایک ہی جیسا تھا اس لحاظ سے ہندوستان کی وحدت کا ڈھونگ رچایا گیا تھا اور اسی بات کو ظاہر کرنے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ:

"India offers unity in diversity."

اس کے علاوہ ہندوستان بھر میں بھانت بھانت کی نسلیں، طرح طرح کی زمینیں، مختلف موسم اور قسم قسم کی پیداوار پائی جاتی ہے۔ اور آبادی میں مختلف مذاہب اور عقائد کے پیرو ملتے ہیں۔ اس افتراق کے باوجود ہندوستان کے مختلف حصّوں کا کلچر تقریباً ایک جیسا رہا

ہے۔ جسے ہم وحدت کا نام دے سکتے ہیں۔

مشہور مورخ سمتھ صاحب کا قول ہے کہ "انیسویں صدی تک جغرافیائی حالات کی بنا پر ہندوستان کی تاریخ علاقائی طور پر علیحدہ علیحدہ تین الگ تھلگ حصوں کی تاریخ ہے"۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق ہے صرف انگریزوں کی آمد پر ہی ذرائع آمدورفت کی موجودگی اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت ہندوستان کو سیاسی وحدت نصیب ہوئی ورنہ یہ برصغیر جو انگلستان سے اُنیس گنا بڑا ہے اور جو رقبے میں تمام یورپ کے برابر ہے کبھی بھی صحیح معنوں میں متحدہ ہندوستان نہ رہا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی سلطنت خداداد کے معرض وجود میں آنے سے یہ برصغیر پھر دو الگ حصوں میں تقسیم ہو گیا لیکن دونوں ملکوں کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے عام طور پر "تاریخ ہندوستان" کی اصطلاح گھڑلی گئی ہے۔ حالانکہ دراصل یہ تاریخ ہندو پاکستان کا مطالعہ ہے لیکن سہولت کے لئے مورخ جا بجا ہندو پاکستان کی بجائے محض ہندوستان کا لفظ استعمال کر لیتے ہیں۔ اس سے مراد دونوں ملکوں کی تاریخ ہے۔ اس کتاب میں لفظ بھارت تقسیم شدہ ہندوستان کو ظاہر کرتا ہے اور ہندوستان کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس سے مراد برصغیر ہندو پاکستان ہے۔

کسی ملک کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے اُس کے جغرافیائی حالات کا جاننا نہایت اہم ہے کیونکہ تاریخ اور ملک کے طبعی حالات کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کسی ملک کے باشندوں کی عادات و خصائل، رسم و رواج، طرز بود و باش اور معاشی ترقی کا انحصار طبعی حالات اور جغرافیائی کیفیت پر ہوتا ہے۔

ہندوستان برا عظم ایشیا کے عین جنوب میں مکونی شکل کا جزیرہ نما ہے جس کے جنوب میں بحر ہند، مشرق میں خلیج بنگال اور مغرب میں بحیرۂ عرب کے سمندر واقع ہیں۔ قدیم زمانہ میں ان سمندروں کی وجہ سے ہندوستان دنیا سے الگ تھلگ رہا۔ اور اس جانب سے غیر ملکی حملوں سے محفوظ رہا۔ اگرچہ ہندوستان کا ساحل تین ہزار میل کی لمبائی میں ہے

لیکن یہ ساحل بہت کم کٹا پھٹا ہے اور قدرتی بندرگاہیں بہت کم ہیں۔ جہاز رانی تو کجا فرمانرواؤں نے سمندر کی جانب توجہ ہی بہت کم دی ہے اور اس بنا پر ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ تک بحری بیڑہ کبھی بھی قائم نہ ہوا۔

سمندر کی بدولت ہندوستان قدیم زمانے میں جنوبی جانب سے غیر ملکی حملوں سے محفوظ رہا لیکن دکن کے دشوار گذار علاقے کی جانب بھی شمالی حملہ آوروں کی توجہ بہت کم مبذول ہوتی۔ نرمدا، چیل اور ست پڑا کے پہاڑوں کے بعد گھنے جنگل اور پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے جس پر تسلط قائم رکھنا از حد مشکل ہے کیونکہ وہاں کے باشندے جفاکش اور جنگجو ہیں اور نیز ذرائع آمد و رفت میں حد سے زیادہ دشواری ہوتی ہے۔ اگرچہ چند ایک فتوحات کے شوقین حکمرانوں نے دکن پر بھی یلغار کی لیکن زیادہ دیر تک وہاں اپنا اقتدار قائم نہ رکھ سکے۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ:

"The Deccan has repeatedly proved the grave of Indian empires in the past.

لیکن دکن کے شمال میں سطح کی بلندی کی وجہ سے موسم خوشگوار رہتا ہے۔ اس علاقے مہاندی، گوداوری اور کرشنا سیراب کرتے ہیں۔ لہذا یہ سطح مرتفع زرخیز اور شاداب ہے یہی وہ علاقے ہیں جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی عظیم الشان خود مختار دکنی سلطنتیں قائم ہوئیں جن کو ہندوستان کی مرکزی سلطنت سے بہت کم تعلق رہا۔

دریائے کرشنا کو عبور کرنے کے بعد دکن کا وہ حصہ ہے جو ہندوستان کی تاریخ سے بالکل الگ تھلگ رہا اور اس علاقے کی جانب ہندوستان کے حکمرانوں نے شاذ و نادر ہی توجہ مبذول کی۔ بعض مؤرخین کا یہ قول ہے کہ:

"This extreme corner of India has played absolutly no part in Indian history."

بلکہ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نسلی اعتبار سے بھی دکن ہمیشہ الگ تھلگ اور ممتاز رہا ہے یہاں خالص دراوڑی نسل کے لوگ آباد رہے ہیں جن کا قد چھوٹا، رنگ سیاہ، سر لمبوترا، پھیلی ہوئی ناک اور گھنگریالے بال ہوتے ہیں، ہندوستان کی سب سے قدیم نسل یہی ہے مدراس اور ریاست حیدرآباد میں اب تک اسی نسل کے لوگ آباد ہیں اور موجودہ عہد تک دکنی علاقے کی تہذیب و تمدن بالکل الگ تھلگ رہے ہیں۔

اراولی کی پہاڑیوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ پہاڑیاں بنجر ہیں اور راجپوتانہ کے علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں، علاقہ بالکل بنجر ہے اور زندہ رہنے کے لئے یہاں کے باشندوں کو از حد محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے لیکن یہ پہاڑیاں کیا ہیں قدرتی قلعے ہیں جن سے دشمن مجبور ہو کر لوٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ راجپوت قوم ہمیشہ حملہ آوروں کے دانت کھٹے کرتی رہی، راجپوتوں کی بہادری اور جفاکشی بھی اس علاقے کی جغرافیائی کیفیت کی بنا پر تھی۔

ہندوستان کے عین شمال میں کوہ ہمالیہ کا بلند اور عظیم الشان سلسلہ ہے جو ایک مضبوط قدرتی فصیل ہے۔ اس کی برفانی چوٹیاں ناقابل عبور ہیں اور کوہ ہمالیہ کی شاخیں مشرق اور مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں۔ برما کی جانب سے اس پہاڑ کی شاخیں اس قدر خوفناک ہیں کہ اس جانب سے انسانی گذر ناممکن ہے۔ شمالی سلسلہ کوہ دنیا کے بلند ترین پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ صرف شمال مغرب کی جانب کچھ خشک پہاڑ ہیں جن میں چند درے ہیں مشہور درے خیبر، ٹوچی، گومل اور بولان ہیں۔ ان دروں کے وجود نے ہندوستان کو غیر ملکی حملہ آوروں کی آماجگاہ بنا دیا ورنہ ہندوستان دنیا سے الگ تھلگ رہتا اور اس ملک کی تاریخ چین، تبت اور وسط ایشیا کی تاریخ کی مانند بہت کم تبدیلیوں کی حامل ہوتی۔ یہی شمال مغربی درے ہندوستان کی تاریخ میں حد سے زیادہ تغیر و تبدل کا باعث بنے ہیں اور اسی سمت سے حملہ آور ہندوستان میں وارد ہوتے رہے۔ قدیم آریہ قوم اسی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ سکندر اعظم اور دیگر حملہ آور حتیٰ کہ مغل بھی ان ہی دروں سے

آئے۔ صرف محمد بن قاسم اور انگریزوں نے اس شاہراہ کو ترک کیا۔

کوہ ہمالیہ کا وجود ہندوستان کے لئے ایک نعمت ہے۔ شمالی ہندوستان کے تمام دریا اسی پہاڑ سے نکلتے ہیں اور گنگا اور سندھ کے میدانوں کی زرخیزی کا انحصار اسی سلسلہ کوہ پر ہے۔ اگر یہ پہاڑ نہ ہوتا تو شمالی ہندوستان میں بارش کا نام نہ ہوتا اور اس ملک کی تاریخ تبت سے مختلف نہ ہوتی۔ نہ دریا بہتے اور نہ یہ ملک زرخیزی کی بنا پر سونے کی چڑیا کہلاتا۔ اور نہ ہی اس ملک کی زرخیزی اور دولت کی بنا پر غیر ملکی حملہ آور اس کی جانب کھنچے چلے آتے۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوہ ہمالیہ کے وجود اور ہندوستان کے جغرافیائی حالات نے اس ملک کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

سمتھ صاحب نے تاریخی لحاظ سے ہندوستان کے تین حصے کئے ہیں جن میں سے ایک حصہ ہمالیہ کے سلسلہ کوہ کو گردانا ہے۔ اور دوسرا حصہ دکن کو شمار کیا ہے۔ تیسرا حصہ گنگا اور سندھ کے زرخیز میدان ہیں جو ہندوستانی تہذیب کا اصل گہوارہ ہیں۔ یہ سرسبز اور زرخیز علاقہ ہندو اور مسلمانوں کی سلطنتوں کا مرکز رہا ہے۔ اور اسی خطے کی تاریخ ملک بھر کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ یہ علاقہ مشرق میں خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے اور مغرب میں بحیرہ عرب تک جاملتا ہے۔ شمال میں کوہ ہمالیہ اور جنوب میں بندھیاچل تک اسی علاقے کی حدود ہیں۔ اس خطے میں پاکستان کے علاوہ بھارت کے اکثر حصے شامل ہیں مثلاً سندھ۔ پاک پنجاب، مشرقی پنجاب، کشمیر، یو۔پی۔ راجپوتانہ، بہار، بنگال، سی۔پی اور صوبہ بمبئی کا کچھ حصہ۔ یہی علاقہ ہے جہاں اہم تاریخی واقعات رونما ہوئے۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس خطے کی اہم تاریخی تبدیلیاں بھی تمام تر جغرافیائی حالات اور قدرتی زرخیزی کی مرہون منت ہیں۔ پس یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ:

ہندوستان کی تاریخ کو ڈھالنے میں جغرافیائی کیفیات نے اہم ترین اثر ڈالا ہے اور ذرائع آمدورفت کی دشواری کی بنا پر برصغیر ہندو پاکستان کو کبھی بھی سیاسی وحدت

نصیب نہ ہوئی۔

دریائے گنگا اور جمنا ہندوستان کے مغربی علاقے میں بہہ کر الہ آباد کے قریب مل جاتے ہیں۔ ان دریاؤں کا درمیانی علاقہ تاریخ میں اہم ترین علاقہ ہے اور "دوآب" یا دوآبہ کہلاتا ہے۔ اس سے مشرق کی جانب بہار اور بنگال کا علاقہ ہے جسے قدیم مورخ علیحدہ ملک تصور کرتے ہوئے "مشرقی سلطنت" کے نام سے پکارتے تھے۔

ادھر دہلی اور سرہند کا درمیانی علاقہ ایسا ہے جہاں پنجاب کے میدان ختم ہو کر گنگا کی وادی شروع ہوتی ہے۔ اور ہندوستان خاص پر تسلط جمانے کے لئے پنجاب کے میدانوں سے اتر کر اسی مقام سے حملہ آوروں کی پیش قدمی ہوتی تھی۔ پس ہندوستان کی تاریخ میں تمام کی تمام معرکہ خیز اور فیصلہ کن لڑائیاں اسی گرد و نواح میں یعنی پانی پت کے قریب ہی لڑی گئیں۔ لہذا مورخین کا قول ہے کہ:

"Panipat has been the cockpit of India."

جغرافیائی حالات، زمین کی زرخیزی اور ملک کی شادابی نے ہندوستان کے باشندوں کو سہل انگار اور عیش پسند بنا دیا ہوا ہے۔ جفاکشی اور محنت کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ قدرت فیاض ہے اور پیداوار کی صورت میں نعمتیں عام ہیں۔ پس ہندوستان کے لوگ جسمانی طور پر کمزور ہیں۔ اور اسی بنا پر ہمیشہ غیر ملکی حملہ آوروں کے سامنے پسپا ہوتے رہے ہیں۔

Typical Questions

Q. 1. How does India illustrate the influenee of Geography on History?

Q. 2. "Geographical conditions divided Indian history, until the nineteenth century, into three well-marked territorisl eompartments" (Dr. V A. Smith). Explain this statement.

Q. 3. Point out clearly the various ways in which the History of India has been influenced by her Geography.

Q. 4. Discuss the influence of geographical conditions on the history of Indo-Pakistan.

امتحانی سوالات

1۔ تاریخ ہندوستان پر اس کی جغرافیائی کیفیت کے اثرات کو وضاحت سے بیان کیجئے۔

2۔ سمتھ صاحب کے قول کی تشریح کرو۔ کہ "انیسویں صدی تک جغرافیائی حالات کی بنا پر ہندوستان کی تاریخ علاقائی طور پر علیحدہ علیحدہ یعنی الگ تھلگ حصوں کی تاریخ ہے۔"

3۔ ہندوستان کی تاریخ اپنے جغرافیائی حالات سے کن کن طریقوں میں اثر پذیر ہوئی ہے؟

4۔ برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ پر جغرافیائی حالات کیسے اثر انداز ہوئے ہیں۔ واضح کیجئے۔

دوسرا باب

قدیم ہندوستان کی نسلیں اور اصلی باشندے

ہندوستان کے اصلی باشندوں کے بارے میں تاریخ حتمی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرسکی ہے لیکن یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ زمانۂ قبل از تاریخ میں برصغیر ہندو پاکستان کے لوگ بھی وحشی اور غیر مہذب تھے اور شروع شروع میں غاروں میں رہتے یا درختوں پر بسیرا کرتے تھے۔ جنگلی جڑی بوٹیوں پر گذارہ کرتے تھے۔ یا پتھر کے ناتراشیدہ اور بھدے ہتھیاروں سے جنگلی جانوروں کا شکار کرکے اپنا پیٹ پالتے تھے اس دور کو پتھر کا زمانہ کہتے ہیں۔ جو غالباً مسیح کی پیدائش سے کئی ہزار سال پہلے ہوگا۔ جدید نظریہ یوں ہے کہ مسیح کی پیدائش سے تین چار ہزار سال سے پہلے قدیم ترین دور کو زمانۂ قبل از تاریخ کہنا چاہیئے۔ نیز پتھر کے زمانے کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے پتھر کا زمانہ و پتھر کا جدید دور۔

ایک طویل مدت گذر جانے کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اپنی حالت کو سدھارا اور دھات کے استعمال سے واقف ہو گئے۔ انہوں نے پتھر کے ہتھیاروں کی بجائے کلہاڑے، بھالے اور تیر کمان بنا لئے۔ گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں رہنے لگے اور جسم کو درختوں کے پتوں اور جانوروں کی کھالوں سے ڈھانپ لیا۔ اس دور کو دھات کا زمانہ کہتے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ چونکہ بالکل تاریک ہے لہٰذا ہمیں محض قیاس آرائی سے کام لینا پڑتا ہے تاتاریوں کی آمد کے بعد بھی تاریخ کے صفحات روشن نہیں ہیں اور بعد کے دور کی تاریخ بھی واضح طور پر عیاں نہیں ہے۔ لہٰذا ہندوستان کے اصلی باشندوں کے بارے میں یقینی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن قدیم ہندوستان کی مختلف نسلوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہم قیاس آرائیوں سے ہندوستان کے اصلی باشندوں کا تعین کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔

ہندوستان بھر میں رنگارنگ کے نسلی امتیاز اور بھانت بھانت کے لوگ پائے جاتے ہیں، ملک کے طول و عرض میں کئی شمار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور لاتعداد مذاہب کے پیروکار موجود ہیں لیکن صدیوں کے میل ملاپ کی وجہ سے نسلوں کی پاکیزگی قائم نہیں رہی اور رنگ و روپ اور خط و خال کی بنا پر لوگوں کے گروہ بالکل الگ کر دکھانا ناممکن ہے، پس مورخین نے ہندوستان کے باشندوں کو رنگ روپ، قد و قامت اور سر کی بناوٹ کے لحاظ سے مندرجہ ذیل نسلوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ کول :- کول برصغیر ہند و پاکستان کے قدیم ترین باشندے گردانے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دراوڑ قوم سے بھی قدیم ہیں۔ بعد میں یہ لوگ دوسری نسلوں میں ادغم ہو گئے لیکن اب تک کول نسل کے لوگ مغربی بنگال (بھارت)، اڑیسہ اور وسط ہند کے پہاڑی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی زبان دراوڑ قوم سے بالکل مختلف ہے اور "منڈا" کہلاتی ہے۔ کول شروع شروع میں شمالی اور وسط ہند میں رہتے تھے کئی ایک قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے شکار کے شوقین تھے ابتدا میں لکڑی کے آلات استعمال کرتے تھے لیکن بعد میں لوہے کے استعمال سے واقف ہو گئے۔ کول نسل کے لوگوں کے اہم قبیلے بھیل۔ گونڈ اور سنتھال ہیں بعض مورخ غلطی سے ان قبیلوں کو دراوڑ سمجھ کر اس ملک کے قدیم ترین باشندے گنتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ بھیل اور گونڈ در اصل کول نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو دراوڑ خیال کرنا غلط ہے۔

۲۔ دراوڑ :- برصغیر ہند و پاکستان کے شمالی علاقوں میں کول قوم کو مغلوب کرنے والے دراوڑ قوم کے لوگ تھے۔ یہ لوگ سیاہ فام، کوتاہ قد اور مضبوط جسم والے تھے عام طور پر موٹی ناک گھنے بال اور لمبوترے سر رکھتے تھے آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ رنگ کی ہوتی تھیں۔ اب یہ لوگ زیادہ تر دکن کے علاقے میں پائے جاتے ہیں بعض مورخ دراوڑ قوم کو عراق کے سمیری (Sumerians) گنتے ہیں۔ اور یہ خیال کی

جاتا ہے کہ آریہ قوم نے ان کو دکن کی جانب دھکیل دیا۔ اور ان کی تہذیب کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس نظریہ کے حامی مورخ یہ خیال کرتے ہیں کہ دکن میں تامل، تلنگو اور کناری زبانیں جو بولی جاتی ہیں۔ وہ دراصل قدیم دراوڑ لوگوں کی زبان ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ دراوڑ نسل کے لوگ درہ خیبر کی بجائے بلوچستان کے راستے برصغیر ہندو پاکستان میں وارد ہوئے اور صدہا سال تک مغربی پاکستان اور بھارت کے شمالی علاقوں میں آباد رہے۔ اس کے برعکس سر ہربرٹ رسل کا نظریہ مختلف ہے۔ اُن کا یہ خیال ہے کہ دراوڑ لوگ اس برصغیر کے اصلی باشندے (Aborigines) تھے اور غیر ملکی نہ تھے۔ بعد میں یہ لوگ آریہ سیتھینز اور منگولوں کے ملاپ سے بدل گئے۔ اور اتفاقیہ طور پر خالص دراوڑ نسل اب بھارت کے دکنی علاقوں میں ملتی ہے۔ سر ہربرٹ کے نظریہ کو اگر صحیح مان لیا جائے تو دراوڑ قوم ہندو پاکستان کی قدیم ترین ثابت ہوتی ہے لیکن آجکل زیادہ رجحان اس جانب ہے۔ کہ کول نسل کے لوگ دراوڑ قوم کے غلبہ سے پہلے اس برصغیر میں موجود تھے خالص دراوڑ قوم کو تین نئی نسلوں نے مدغم کر لیا اور ان کے ملاپ سے دراوڑ قوم خلط ملط ہو گئی۔ دراوڑ اور منگول نسل کے مخلوط لوگ بنگال، آسام اور اڑیسہ میں پائے جاتے ہیں۔ آریہ نسل اور دراوڑ قوم کے خون کی آمیزش سے مشرقی پنجاب، یوپی اور بہار کے لوگ معرض وجود میں آئے اور سیتھینز لوگ جب دراوڑ قوم سے گھل مل گئے تو زیادہ تر جنوبی سندھ (پاکستان) اور گجرات کاٹھیاوار (بھارت) میں آباد ہوئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مرہٹے بھی انہی کے ملاپ کی پیداوار ہیں۔

۳۔ آریہ۔ یہ لوگ حتمی طور پر غیر ملکی تھے اور کم از کم ۲۰۰۰ ق۔م میں شمال مغربی دروں کی جانب سے برصغیر ہندو پاکستان میں داخل ہوتے۔ یہ لوگ مختلف گروہوں اور قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور یکے بعد دیگرے مغربی پاکستان میں وارد ہوتے رہے اپنے ہی پہلے گروہ کو آگے دھکیلا اور خود اُن کی جگہ آباد ہو گئے۔ خالص آریہ قوم کے لوگ دراز

قد۔ سفید فام اور ابھری ہوئی ناک والے خوش شکل اشخاص ہوتے ہیں۔ جوں جوں اس ملک کے باشندوں سے گھل مل گئے۔ ان کی رنگت اور خوبصورتی میں فرق آتا گیا لیکن بھارت کے دکنی علاقوں میں آریہ نسل کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ آریہ نسل اور دراوڑ نسل کا سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ آریہ لوگ اپنے قبیلے کے سب سے عمر رسیدہ مرد کو اپنا سردار مانتے تھے (Patriarchal System) اس کے برعکس دراوڑ قوم کے لوگ (افریقہ کے بعض قبیلوں کی مانند) اپنے خاندان کی سب سے عمر رسیدہ عورت کی اطاعت کرتے تھے۔ اسے (Matriarchal System) کہتے ہیں۔ مغربی پاکستان، کشمیر اور بھارت کے شمالی علاقوں میں زیادہ تر آریہ نسل کے لوگ آباد ہیں

۴۔ یونانی، سیتھین اور ہن:۔ سکندر کے حملے کے بعد برِصغیر ہند و پاکستان غیر ملکیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ چنانچہ باختر اور پارتھیا کے لوگ بڑھتے بڑھتے افغانستان اور مغربی پاکستان پر چھا گئے۔ ان کے پے در پے حملوں کی وجہ سے یونانی اثر غالب رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ تمام نسلیں مغربی پاکستان کے قدیم باشندوں میں جذب ہو گئیں اس کے بعد یوچی قبیلے کے عروج کے ساتھ سیتھین قوم ہند و پاکستان میں وارد ہوئی یہاں ان کی سلطنت بھی قائم ہوئی اور برِصغیر میں اُن کے خون کی آمیزش سے آبادی میں خوب ردوبدل ہوا۔ ان کی آمد کے تین چار سو سال بعد ہن قوم حملہ آور ہوئی۔ یہ لوگ بھی نسلی تغیر و تبدل کا باعث بنے۔ پاکستان کے سرحدی علاقوں کی اکثر آبادی کشان نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ سیتھین لوگ پنجاب، یوپی اور متھرا تک پھیلے ہوئے تھے۔ بعض مورخین کے قول کے مطابق جاٹ اور راجپوت بھی سیتھین قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

۵۔ منگول:۔ قدیم زمانہ میں اس نسل کے لوگ منگولیا سے اُٹھے اور چین سے گزرتے ہوئے برہم پتر کی وادی میں وارد ہوئے۔ یہ لوگ برما، آسام اور مشرقی پاکستان میں آباد ہوئے۔ آج تک خالص منگول نسل کے لوگ سکم، نیپال اور بھوٹان میں آباد ہیں۔ بعد میں

تیرھویں صدی میں منگول مغربی پاکستان میں بھی داخل ہوئے اور اپنے متواتر حملوں سے اس علاقے کو لالہ زار بنا دیا۔ منگولوں کے خطرے سے دہلی کے مسلمان سلاطین ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ منگول نسل کے کچھ لوگ اس طرح مغربی پاکستان میں آباد ہو گئے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ مغل کہلائے۔

۶۔ **مختلف اقوام**:- ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قدیم ایام سے ہی برصغیر ہند و پاکستان میں بھانت بھانت کی نسلیں پائی جاتی ہیں۔ مندرجہ بالا نسلوں کے امتزاج کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں سے لوگ یہاں وارد ہوتے رہے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کرنے کے بعد ملکی آبادی میں جذب ہو گئے۔ چنانچہ قدیم زمانے سے عرب جہاز ران تجارت کی غرض سے اس برصغیر میں آیا کرتے تھے۔ محمد بن قاسم سے بہت پہلے عرب دکن کی بندرگاہوں میں پہنچ چکے تھے، بلکہ بنگال کے بعض علاقوں میں بھی سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ ہند و پاکستان میں عربوں کی اولاد اب تک موجود ہے۔ اسی طرح ترک اور ایرانی بھی ہند و پاکستان کی نسلوں پر اثر انداز ہوئے۔ وسط ایشیا سے آنے والے ترک اس برصغیر پر کافی عرصہ حکمران بھی رہے اور ان بلند قامت، خوبصورت شکل والے لوگوں نے ہندی نسل پر گہرا اثر چھوڑا۔ ایرانی لوگ مغلیہ دور میں تو بڑی تعداد میں ہند و پاکستان میں وارد ہوئے، لیکن اس سے پہلے ایرانی باشندے بمبئی اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں آباد تھے۔ یہ لوگ عربوں کے اقتدار کے بعد بھاگ کر اس برصغیر میں آ گئے۔ بمبئی کے پارسی انہی لوگوں کی نسل سے ہیں۔

پس یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے ہند و پاکستان کے لوگ کئی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس ملک نے ہر نووارد نسل کو جذب کر لیا۔ اب تک بعض لوگ خالص نسل کے ہیں لیکن زیادہ تر باشندے مخلوط نسل کے ہیں۔ لوگوں کے دماغی رجحانات، تمدن اور طرز فکر تقریباً ایک ہی رہا ہے اگرچہ اس علاقے کو سیاسی وحدت کبھی نصیب نہیں ہوئی لیکن لوگوں کی مختلف نسلیں اس طرح سے گھل مل گئی ہیں کہ بظاہر تمام لوگ ایک ہی قوم معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل

پاکستان و ہند میں بھانت کی نسلیں موجود ہیں۔

Typical Questions

Q. 1. Describe some of the people that inhabit the Sub-continent of Indo-Pakistan.

Q. 2. Write a critical account of the Pre-Aryan people of Indo-Pakistan.

Q. 3. Write short notes on .

(*a*) The Neolithic Men.

(*b*) The Kols.

(*c*) The Dravidians.

امتحانی سوالات

1۔ برصغیر ہند و پاکستان کے باشندوں کا مختصر حال بیان کیجئے۔

2۔ آریوں کی آمد سے پہلے ہند و پاکستان میں کون کون سے لوگ بستے تھے؟
اُن کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

3۔ مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیے۔

(الف) پتھر کا زمانہ۔ (ب) کول۔ (ج) دراوڑ۔

تیسرا باب

برِّ صغیر کی قدیم تاریخ کے ماخذ

مسلمانوں کی آمد سے پہلے برِّ صغیر ہند و پاکستان کے لوگوں کو فنِ تاریخ نویسی میں بالکل دلچسپی نہ تھی، اگرچہ قدیم ہندوستان کی تہذیب از حد پرانی اور دلچسپ ہے لیکن ہندوؤں کے زمانے میں تاریخی واقعات میں ربط اور تسلسل غائب ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام کا پتہ تو چلتا ہے لیکن تفصیلات مفقود ہیں بعض اوقات ایک خاندان کے بعد صدیوں کا تاریک دور آجاتا ہے۔ اگرچند واقعات میسر بھی آجاتے ہیں تو اُن کے بارے میں صحیح سن کا تعین نہیں کیا جاسکتا پس ہندوستان کی قدیم تاریخ میں تاریکی کے دور بہت زیادہ ہیں نیز ہماری معلومات میں تیقن نہیں ہے اور قیافہ یا قیاس آرائی سے کام لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ازمنۂ قدیم میں علم صرف برہمنوں تک محدود تھا لیکن ان کو تاریخی شغف نہ تھا، اس کے علاوہ ان کی توجہ کا مرکز مذہب ہی رہا اور تاریخ کی جانب انہوں نے پرواہ نہ کی پس قدیم ہندوستان کی کوئی مستند تاریخ موجود نہیں ہے البتہ مسلمانوں کے عروج کے بعد تاریخی واقعات ربط و تسلسل سے ملتے ہیں۔ لہٰذا ہندوؤں کی قدیم تاریخ کو صحیح طور پر تعین کرنا ایک معجزہ ہے۔ سمتھ صاحب کا قول ہے کہ موریا خاندان کے عروج سے تاریکی چھٹ جاتی ہے اور تاریخی واقعات روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات درست نہیں، مسلمانوں کی آمد تک برِّ صغیر کی قدیم تاریخ یقینی طور پر تعین نہیں کی جاسکتی۔ اگرچہ سنہ ۶۵۰ ق۔م سے چند تاریخی واقعات سلسلہ وار مل جاتے ہیں لیکن سکندر کی آمد تک (سنہ ۳۲۶ ق۔م) متعدد بار سن کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے،

تاریخی ماخذ: سارس برصغیر کی قدیم تاریخ کا پتہ لگانے کے لئے ایک مورخ کے لئے لازم ہے کہ مختلف تاریخی ماخذوں میں سرگرداں رہے۔ کافی مغز کھپانے کے بعد بھی اُسے ناکافی مواد ملتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہند و پاکستان کی قدیم تاریخ کو جاننے کے لئے کسی ایک ماخذ پر انحصار کرنا بے سُود ہے۔ کیونکہ اس صورت میں قدیم تاریخ کے کئی پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں، اور طالب علم کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ لہذا قدیم تاریخ کے حصول کے لئے تمام کے تمام ماخذ یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے بغیر ہمارا گزارہ ممکن نہیں ہے۔ یہ تاریخی ماخذ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سینہ بسینہ کہانیاں (Folk Lore) یا مقامی روایات

۲۔ سکے۔ آثار قدیمہ۔ اور عمارات۔

۳۔ کتبے اور لاٹھیں۔

۴۔ غیر ملکی سیاح۔

۵۔ مذہبی کتابیں۔

۶۔ دیگر کتابیں۔

۱۔ سینہ بسینہ کہانیاں قدیم ترین زمانہ سے مقامی لوگوں میں چند سینہ بسینہ قصے کہانیاں مشہور چلے آتے ہیں۔ یہ مقامی روایات اگرچہ خالص تاریخی واقعات نہیں ہیں لیکن ان سے ہمیں بعض تاریخی حقائق کا پتہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ ۶۵۰ ق م سے لیکر سکندر کے حملے یعنی ۳۲۶ ق م تک برصغیر پاکستان و ہند کی قدیم تاریخ کی بنیاد یہی مقامی روایات ہیں۔ کرشن رام چندر اور پرتھوی راج کے بارے میں بے شمار مقامی روایات سینہ بسینہ کہانیوں کی شکل میں۔ ان سے بعض تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے لیکن ان کہانیوں سے حقیقت کی تلاش ایک مشکل امر ہے۔

We have to sieve out truth from these.

۲۔ سکّے۔ آثارِ قدیمہ اور عمارات:۔ ہر ملک کی قدیم تاریخ کے بارے میں سکّے ہمیشہ اہم ماخذ ثابت ہوتے ہیں سکوں کی مدد سے مختلف تاریخوں اور ادوار کا تعین (Chronology) کیا جا سکتا ہے۔ سکّے اکثر قدیم کھنڈروں کی کھدائی (Excavations) سے ملتے ہیں۔ سکوں سے مختلف حکمرانوں کی شخصیت اور اُن کے عقائد کا پتہ بھی چلتا ہے۔ سمندر گپت کا مذہب اُس کے سکّوں سے ہی ثابت ہوتا ہے۔ گپتا خاندان اور مہاراجہ کنشک کے سکّے اس دور کے تمدّن پر روشنی ڈالتے ہیں قدیم تاریخی عمارات بھی تاریخ کی تدوین میں ممد و معاون ہوتی ہیں لیکن قدیم کھنڈرات کا معائنہ اور اُن کے متعلق تحقیق تاریخ کو روشن کرنے میں از حد اہمیت رکھتے ہیں۔ ٹیکسلا، ہڑپا اور منجوڈھارو کے مقامات پر کھدائی کے عمل سے قدیم تاریخی شہر دریافت ہوئے ہیں ٹیکسلا کے تاریخی شہر سے کھدائی کی بدولت سکندر اعظم کے زمانہ سے لے کر کشان خاندان کے خاتمہ تک کی گراں بہا تاریخی معلومات میسّر ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہڑپا اور منجوڈھارو کے مقامات پر کھدائی کی بدولت وادی سندھ کی قدیم ترین تہذیب کے تاریخی ماخذ دریافت ہو گئے ہیں۔ ان مقامات سے برآمد ہونے والی ہر چیز قدیم تمدّن کی آئینہ دار ہے۔

۳۔ کتبے اور لاٹھیں:۔ قدیم زمانہ میں بعض حکمرانوں کا دستور تھا۔ کہ اپنے عہدِ حکومت کے اہم واقعات چٹانوں پر کندہ کروا دیتے تھے یا کتبے اور لاٹھیں نصب کراتے تھے اور اُن پر اپنے قوانین اور شاہی فرمان لکھواتے تھے۔ یہ تحریریں برّصغیر ہند و پاکستان میں مختلف جگہوں پر دریافت ہوئی ہیں اور قدیم تاریخ کا اہم ماخذ ہیں۔ مہاراجہ اشوک کے زمانے کے کتبے اور فرمان کئی ایک ہیں۔ ان کے بغیر اشوک کی تاریخ کو معلوم کرنا ہمارے لیے ناممکن ہوتا۔ اسی طرح الٰہ آباد کے قریب سمندر گپت کا ایک کتبہ دریافت ہوا ہے جو اُس دور کی معلومات کا بہترین ذخیرہ ہے۔ کتبوں کے علاوہ مختلف مقامات پر تانبے کی تختیاں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ جن کی تحریریں تاریخ پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کتبوں سے

نہ صرف مختلف حکمرانوں کے نام میسر آتے ہیں بلکہ تاریخوں کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے۔ یہ کتبے اور لاٹھیں قدیم تاریخ کو روشن کرتے ہیں ہماری بہت اہمائی کا باعث ہیں۔

۴۔ غیر ملکی سفیر اور سیاح :۔ غیر ملکی سفیروں اور سیاحوں نے برصغیر کے چند حالات لکھے ہیں۔ ان کی کتابیں بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ہیں۔ اور قدیم تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہیں۔ لیکن بعض اوقات غیر ملکی لوگ جذباتیت یا لاپرواہی کا ثبوت دیتے ہیں اور تاریخی تحقیق کے بغیر کئی چیزیں لکھ جاتے ہیں۔ اس خامی کے باوجود یہ تحریریں کافی اہم ہیں۔ اور تاریخی امور پر قابل قدر روشنی ڈالتی ہیں سب سے پہلی بار جن لوگوں نے برصغیر ہند و پاکستان کے بارے میں تاریخی معلومات اپنی کتابوں میں لکھیں۔ وہ یونانی مصنف تھے۔ یوں تو سکندر کے ساتھ آنے والے بے شمار ادیبوں نے اس برصغیر کا حال لکھا ہے۔ لیکن ان سے کافی پہلے مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus) نے ہندوستان اور ایران کے حالات کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اس مورخ نے مختلف لوگوں کے بیانات سے تاریخی نتائج اخذ کئے۔ اور قابل قدر معلومات بہم پہنچائیں۔ ہیروڈوٹس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں اپنی کتاب لکھی۔ اس سے پہلے چھٹی صدی قبل مسیح میں یونانی جغرافیہ دان ملاٹس (Miletus) نے برصغیر ہند و پاکستان کے حالات لکھے ہیں۔ لیکن تفصیلی معلومات سیلوکس کے یونانی سفیر میگستھنیز کی کتاب انڈیکا سے ملتے ہیں۔ یہ کتاب اب ناپید ہے لیکن اسکے اقتباسات سے ایک ضخیم کتاب بن جاتی ہے۔ میگستھنیز آٹھ سال کے قریب چندر گپت موریا کے دربار میں رہا اور اس کی تیز بین نگاہوں نے عقل و دانش کی بنا پر حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اور انہیں سپرد قلم کیا۔ پس یہ یونانی ماخذ اس برصغیر کے قدیم تمدن، معاشرت اور

سیاست پر روشنی ڈالتے ہیں۔

(ب) چینی ذرائع :- چینی سیاح بدھ مت کے حامی تھے۔ لہٰذا وہ مذہبی عقیدت سے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے بھارت میں آتے رہے۔ انہوں نے سیر و سیاحت کرنے کے علاوہ اس ملک کے چشم دید حالات بھی لکھے۔ ان سیاحوں میں فاہیان، ہیون سانگ اور آئی سانگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فاہیان نے چندر گپت بکرماجیت کے زمانے کے حالات لکھے ہیں۔ وہ چودہ سال بھارت میں مقیم رہا۔ اور اس نے ہندوؤں کے سنہری دور کے سیاسی، مذہبی اور سماجی حالات قلمبند کئے ہیں۔ ہیون سانگ ساتویں صدی عیسوی میں اس برصغیر میں آیا۔ اور ۱۶ سال یہاں مقیم رہا۔ اس نے دلچسپ انداز میں مہاراجہ ہرش کے عہد حکومت کے بارے میں انتظام سلطنت سیاست اور سوسائٹی کا حال لکھا ہے۔ نالندہ یونیورسٹی کے بارے میں اس کی بیان کردہ تفصیلات خاصی دلچسپ ہیں۔ آئی سانگ ساتویں صدی کے آخر میں سیر و سیاحت میں مشغول رہا۔ اور ۶۷۳ء سے لے کر ۶۹۵ء تک اس برصغیر میں رہا۔ اس دور کی اہم معلومات ہمیں آئی سانگ کی تحریروں سے حاصل ہوتی ہیں۔

(ج) اسلامی ماخذ :- عرب تاجروں، جہازرانوں اور سیاحوں نے بھی ہندو پاکستان کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ لیکن یہ حالات سطحی اور مختصر ہیں۔ البتہ ابوریحان البیرونی نے اپنی مشہور تصنیف کتاب الہند میں ہندوؤں کے ادب، مذہب اور سوسائٹی پر معلومات سے بھرپور تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ البیرونی سلطان محمود غزنوی کے ساتھ اس برصغیر میں آیا۔ وہ سنسکرت کا عالم تھا۔ نیز ہند و علوم و فلسفہ بھی جانتا تھا۔ لہٰذا اس کی کتاب نہ صرف جامع ہے۔ بلکہ اصلیت پر مبنی ہے۔ کتاب الہند ۱۰۳۰ء میں لکھی گئی اور آج تک دنیا البیرونی کے علم و فضل پر دنگ ہے۔

(۵) مذہبی کتابیں :- قدیم تاریخ کی تدوین میں مذہبی ادب کا نمایاں حصہ

ہے۔ سب سے پہلے ہندوؤں کی الہامی کتابیں اور غیر الہامی کتابیں ہماری معلومات کا ماخذ بنی ہیں۔ چاروں وید ہندوؤں کی الہامی کتابیں تصور کی جاتی ہیں۔ (رگ وید یجروید، اتھروید، سام وید) اگرچہ ان میں مذہبی شلوک ہیں لیکن قدیم آریاؤں کی تہذیب و تمدن کے بارے میں معلومات کا ذریعہ یہی وید ہیں۔ رگ وید ان میں قدیم ترین ہے۔ اور آریہ قوم کے ابتدائی دور کی تاریخ کا حال اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے۔ یعنی وہ زمانہ جب آریہ قوم مغربی پاکستان پر مسلط تھی۔ ویدوں کے علاوہ شاستر (Shastras) اور اپنشد (Upanishuds) بھی آریاؤں کی سیاسی، تمدنی اور مذہبی حالات کا پتہ دیتے ہیں۔ اپنشد تعداد میں اٹھارہ ہیں اور مسیح کی پیدائش سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے کی تصنیف ہیں۔ ان میں ہندو فلسفہ تصوف اور ہندوؤں کے رشیوں منیوں کے حالات ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ روح (آتما)، خدا (پرماتما) اور کائنات پر بحث کی گئی ہے۔ ان سے قدیم آریاؤں کے مذہبی اور دماغی ارتقاء کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

(ب) بدھ مت کے دور کی تاریخی معلومات تری پیٹا کا (Tripitaka) میں درج ہیں۔ اور اسی طرح جین مت کے دور کا ذکر ان کی مذہبی کتابوں یعنی جتنا کا (Jatakas) سے ملتا ہے۔ ان دونوں ذرائع سے بدھ مت اور جین مت کے عروج و زوال کا حال ملتا ہے۔ مہاویر کے حالات بارہ کتابوں سے ملتے ہیں۔ جو مجموعی طور پر انگ کہلاتی ہیں۔ بدھ مت کے بارے میں کچھ اور تحریریں ہمیں ان کے سٹوپا اور وہارا Stupas and Viharas سے بھی ملتی ہیں۔ یعنی سٹوپوں میں بدھ مذہب کی روایات دیواروں پر تصویروں سے عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختلف مقامات سے بدھ مذہب کے متعلق تختیاں بھی ملی ہیں۔ جن پر مقامی روایات تصویروں کے ذریعے واضح کی گئی ہیں۔ یہ سب تاریخ کے ماخذ ہیں اور ان سب

کو مذہبی ادب Religious literature گنا جاتا ہے

(ج) رامائن اور مہابھارت کو مورخ رزمیہ کتابیں گنتے ہیں۔ لیکن ہندو ان کو مذہبی کتابیں مانتے ہیں۔ یہ کتابیں ہندوؤں کے زمانہ شجاعت میں لکھی گئیں جب آریہ شمالی بھارت میں پھیل چکے تھے۔ اور برصغیر پاک و ہند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ بعض مورخ ان کتابوں کو محض افسانوی درجہ دیتے ہیں لیکن ہمارے خیال میں کافی محنت کے بعد ہم مذہبی کتابوں سے بھی تاریخی حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ اور زمانہ شجاعت کی تہذیب و تمدن پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

(د) پران اور منوسمرتی:- غیر الہامی کتابوں میں پران خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ تعداد میں ۱۸ ہیں۔ یہ مختلف انسانوں کی تصنیف ہیں۔ مثلاً خیال کیا جاتا ہے کہ آخری پران ہندوؤں کے سنہری زمانے میں لکھا گیا۔ ان کتابوں میں ہندوؤں کی مذہبی تعلیمات درج ہیں۔ لیکن ان سے مذہبی حالات اور تاریخی روایات کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اسی طرح منوسمرتی ایک مشہور کتاب ہے۔ ہندوؤں کے ایک مذہبی راہنما منوجی نے لکھی۔ اسے منوجی کا دھرم شاستر بھی کہتے ہیں۔ یہ کتاب دراصل قدیم دور کے ہندوؤں کے سیاسی اور سوشل قوانین کا مجموعہ ہے۔ نیز اس میں عوام کے حقوق و فرائض اور حکمران کے حقوق پر بحث کی گئی ہے۔ پس قدیم تاریخ پر یہ دونوں کتابیں کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کتابوں کو بھی مذہبی ادب کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔

(ہ) دیگر کتابیں۔ زمانے کی دستبرد سے اتفاقیہ طور پر بعض ایسی کتابیں بھی محفوظ رہیں جو مذہبی کتابیں نہیں ہیں۔ ان کو مورخ Secular literature گنتے ہیں۔ بعض مورخ ان کو ادبی کتابیں شمار کرتے ہیں۔ یہ بات ثابت ہے کہ ان کتابوں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ان کتابوں سے قدیم تاریخ کی تدوین میں قابل قدر مدد ملتی ہے۔ پس اس تاریخی ماخذ کی اہمیت بھی کسی لحاظ سے کم نہیں۔

ان کتابوں میں سب سے اہم ارتھ شاستر ہے۔ جس کا مصنف کوٹلیا ہے۔ جو چانکیہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اور چندر گپت موریہ کا اتالیق اور وزیر تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں نہ صرف اصول سیاست پر بحث کی ہے۔ بلکہ چندر گپت کے انتظام سلطنت اور ملکی حالات کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ پس یہ کتاب موریہ تاریخ کو مدون کرنے میں مشعل راہ کی مانند ہے۔ موریہ دور کی درباری زندگی کا من وعن نقشہ سنسکرت میں لکھے ہوئے ایک ڈرامہ میں ملتا ہے۔ جس کا نام مُدرا راکشش (Mudra Rakashasa) ہے۔ اس کا مصنف ویساکھ دت پانچویں صدی عیسوی میں ہو گذرا ہے۔ کالی داس کے ڈراموں میں بھی گپتا دور کی سماجی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ مہاراجہ ہرش کے تینوں ڈرامے رتناولی، ناگانند اور پریادرشاکا (Priyadarshaka) ساتویں صدی کے سماجی حالات جاننے کے لئے کافی اہم ہیں ہرش کی سوانح عمری (ہرش چرتر) جو بان بھٹ نے لکھی ہے۔ اگرچہ نیم تاریخی قسم کی کتاب ہے۔ لیکن پُر از معلومات ہے۔ اسی قسم کی ایک اور سوانح عمری پرتھوی راسو نامی کتاب بھی ہے۔ جس میں تاریخی اغلاط بے شمار ہیں۔ لیکن راجپوت دور کے بارے میں کافی معلومات کی حامل ہے۔ سب سے آخری کتاب راج ترنگنی ہے جس کا مصنف کلہن (Kalhan) اعلیٰ مورخ کہلانے کا حقدار ہے۔ اس فاضل مصنف نے کشمیر کی تاریخ لکھی ہے اور ساتویں صدی عیسوی سے شروع کر کے بارہویں صدی تک کے حالات کو ایمانداری سے قلمبند کیا ہے۔ کشمیر کے علاوہ اس کتاب میں برصغیر کے دیگر علاقوں کا مختصر حال بھی درج ہے۔

نتیجہ :۔ تاریخی ماخذوں کی اس طویل فہرست کے باوجود ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ برصغیر ہند و پاکستان کی قدیم تاریخ ایک عقدہ لاینحل ہے۔ کافی محنت اور تحقیق کے باوجود بعض حالات میں مواد ناکافی ملتا ہے اور محض قیاس

اندازی سے کام چلانا پڑتا ہے۔ نیز کسی بھی ایک ماخذ پر انحصار کر کے قدیم تاریخ صحیح طور پر لکھی نہیں جا سکتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ تمام کے تمام ماخذ یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے اگر کسی ماخذ کو ترک کیا جائے تو قدیم تاریخ ادھوری رہ جاتی ہے۔ پس قدیم تاریخ پر تحقیق آسان امر نہیں۔ اتنے زیادہ ماخذوں پر آنکھوں کا تیل ٹپکانے کے باوجود اب تک قدیم تاریخ ہند و پاکستان میں کئی ایک تاریک دور ہیں یعنی ایسے زمانے ہیں جن کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔

Typical Questions

Q. 1. Write a Short Note on the sources of the early history of Indian sub-continent.

Q. 2. Write a short but critical note on the sources of early Indian history.

Q. 3. What is, in your opinion, the value of the inscriptions in the reconstruction of the History of Ancient India ?

Q. 4. Write a note on the sources of ancient Indian history. Examine the value of each source.

Q. 5. Describe the principal sources of information about the history of Ancient India.

امتحانی سوالات

1 - برصغیر ہند و پاکستان کی قدیم تاریخ کے ماخوذ مختصر طور پر قلمبند کیجئے۔

ط - قدیم تاریخ ہند کے ماخذوں پر مختصر تنقید کیجئے۔

ح - قدیم تاریخ ہند کو روشن کرنے کے لئے کتبے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ اپنی رائے واضح طور پر لکھئے۔

ی - قدیم تاریخ ہند کے ماخذوں کا مختصر حال بیان کیجئے۔ اور ہر ماخذ کی اہمیت بیان کیجئے۔

چوتھا باب

وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب

INDUS VALLEY CIVILIZATION

مغربی پاکستان کو قدیم زمانہ میں وادیٔ سندھ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اس علاقے کی قدیم ترین تہذیب زمانہ حال میں یعنی آج سے تقریباً ۴۲ سال قبل ۱۹۲۲ء میں دریافت ہوئی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ مسٹر آر۔ ڈی بنرجی اور رائے بہادر دیارام ساہنی کی ان تھک کوششوں سے چند قدیم ٹیلوں کو کھودا گیا اور ان کھدائی کے کاموں سے حیرت انگیز دریافت ہوئی۔ کھدائی کے ان تمام کاموں کے انچارج محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر سر جان مارشل تھے۔ ماہرین نے دن رات کھدائی کے کام میں جانفشانی سے کام لیا۔ اور برآمد شدہ اشیاء کی مکمل طور پر حفاظت کی۔ کھدائی کا یہ تازہ بتازہ کام موہنجو داڑو (ضلع لاڑکانہ سندھ) میں کیا گیا۔ مسٹر بنرجی یہاں مصروف کار تھے۔ کھدائی سے اوپر نیچے آبادی کے نشانات ملے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شہر بار بار اجڑا اور پھر آباد ہوا۔ موہنجو ڈھارو جدید دور کا نام ہے۔ اور اس کا مطلب "مردوں کا ٹیلہ" ہے۔ قدیم ترین شہر کے کھنڈرات ظاہر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں شہری عمارتوں کی تعمیر خاص منصوبہ بندی سے کی جاتی تھی۔ گلی کوچے وسیع تھے۔ پکے فرش لگائے جاتے تھے۔ روشنی کے معقول انتظام کے لئے ہر منزلہ مکانوں میں کھڑکیاں اور روشن دان رکھے جاتے تھے۔ حفظان صحت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ شہر کے وسط میں ایک بہت بڑا تالاب اور ایک وسیع ہال بھی ملا ہے۔ کوڑا کرکٹ ڈالنے کے لئے جابجا مقامات (Filtlr depot) مخصوص تھے۔

منجو ڈھارو کے مقام پر کھدائی کی دریافتوں سے علمی حلقوں میں حیرانی پھیل گئی۔ اور اتفاقیہ طور پر مغربی پاکستان کی قدیم ترین تہذیب دریافت ہوئی جو آریہ تہذیب سے بالکل مختلف تھی۔

اسی دوران میں رائے بہادر دیارام ساہنی نے ہڑپہ کے مقام پر (ضلع منٹگمری پنجاب) کھدائی کا کام شروع کیا۔ اور وہاں بھی اسی وادئ سندھ کی تہذیب کا کھوج نکلا۔ ہڑپہ سے کئی ایک کھلونے، پیتل کی مہریں، انگوٹھیاں اور برتن ملے ہیں۔ مہروں پر جانوروں کی تصویروں کے علاوہ کچھ حروف بھی لکھے ہوئے ملے ہیں۔ یہ زبان ابھی تک پڑھی نہیں گئی۔

ان انکشافات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔ کہ آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے وادی سندھ میں ایک خوشحال اور متمدن قوم آباد تھی یہ لوگ مسیح کی پیدائش سے ساڑھے تین ہزار سال قبل تک اس وادی میں قیام پذیر تھے۔ اور اس درخشاں تہذیب سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ آریہ قوم کی آمد سے پہلے پاکستان میں وحشی لوگ آباد نہ تھے۔ بلکہ ان کی تہذیب عراق کی قدیم تہذیب سے ملتی جلتی ہے آریہ لوگ مسیح کی پیدائش سے ۱۵۰۰ یا دو ہزار سال قبل ہند و پاکستان میں وارد ہوئے۔ لیکن ہڑپا اور منجو ڈھارو سے اس برصغیر کی قدیم ترین تہذیب دریافت ہوئی ہے۔ جس کی عظمت مصر اور یونان کی تہذیب کے ہم پلّہ ہے۔

لوگ :۔ ہڑپا اور منجو ڈھارو کے مقامات پر انسانی کھوپڑیاں ملی ہیں۔ ان کے معائنہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ یہ کھوپڑیاں آریہ قوم کے سروں سے بالکل مختلف ہیں۔ لہٰذا اس تہذیب کے حامل غالباً دراوڑ قوم کے لوگ تھے اور آریوں نے اس تہذیب و تمدن کو غارت کیا۔ بعض ہندو مورخین غلط طور پر وادئ سندھ کی قدیم تہذیب کو آریہ تہذیب کا حصہ سمجھتے ہیں۔

وادیٔ سندھ میں چار مختلف نسلوں کے لوگوں کی کھوپڑیاں ملی ہیں۔ لیکن سوتے جلی کا اندازہ ہے۔ کہ ان میں اکثریت دراوڑ قوم کی تھی۔ یہ لوگ درہ خیبر کی بجائے کیچ اور مکران کے راستے عراق سے آئے اور پنجاب اور سندھ میں آباد ہوئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب عراق کی تہذیب سے مشابہ ہے

سر جان مارشل نے جو اس زمانے میں محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر تھے۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بارے میں تین عمدہ کتابیں لکھی ہیں جنرل کنھگم نے بھی ہڑپہ سے کھدائی کی بدولت دریافت شدہ چیزوں کے حوالے اپنی تحریروں میں دیئے ہیں۔ سر مارٹیمر وھیلر Sir Mortimer Wheeler نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "پاکستان کے پانچ ہزار سال" (Five thousand years of Pakistan) میں اسی تہذیب کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

زمانے کا تعین: وادیٔ سندھ کی تہذیب کے اصلی زمانے کا تعین مشکل امر ہے۔ سر جان مارشل کا خیال ہے۔ کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب مسیح کی پیدائش سے تین ہزار سال قبل بام عروج پر تھی۔ عراق میں بھی کئی مہریں اسی دور کی دریافت ہوئی ہیں۔ جن کا حلیہ وادیٔ سندھ کی مہروں سے مشابہت رکھتا ہے۔ عراقی مہروں کی بدولت وادیٔ سندھ کی تہذیب کے دور کے بارے میں قیاس آرائی کرلی گئی ہے۔ البتہ وھیلر صاحب کا خیال ہے۔ کہ یہ مہریں مسیح کی پیدائش سے اڑھائی ہزار سال یا ڈیڑھ ہزار سال قبل کی ہیں

رگ وید میں یہ ذکر موجود ہے۔ کہ آریاؤں نے ہندوستان کے ان باشندوں سے جنگ کی جو شہروں کے گرد اگرد فصیل بناتے تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ یہ اشارہ دراوڑ قوم کی جانب ہے جن کے زمانۂ عروج کو وادیٔ سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے۔ چونکہ رگ وید مسیح کی پیدائش سے پندرہ سو برس پہلے

مکمل ہوتی۔ لہذا وادی سندھ کی تہذیب کا زمانہ ضرور مسیح کی پیدائش سے تین یا ساڑھے تین ہزار سال قبل کا ہو گا۔

موہنجوڈارو میں ایک مرتبان کی شکل کے برتن پر کچھ عبارت ملی ہے جس کی تحریر بابل کی سومیری تحریر سے ملتی جلتی ہے۔ نیز ظروف کی سجاوٹ دونوں مقامات پر ایک جیسی ہے۔ ان امور کی بنا پر ڈاکٹر سی۔ ایل فیبری C.L. FABRI نے یہ رائے قائم کی ہے۔ کہ وادی سندھ کا تہذیبی دور مسیح کی پیدائش سے ۲۸۰۰ سال قبل گننا چاہئے۔

وادی سندھ کی تہذیب کے خدوخال

کھدائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ موہنجوڈارو کا شہر سات بار اجڑا اور آباد ہوا۔ بربادی کی صحیح وجہ معلوم نہیں۔ لیکن شہر کی تباہی کا باعث زلزلہ یا دریائے سندھ کی طغیانی یا کسی طاقتور دشمن کا حملہ گنا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کی تہذیب صدہا سالوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔

ان دونوں شہروں میں کھدائی سے رنگا رنگ کی چیزیں ملی ہیں۔ جن سے اس وادی کے لوگوں کی تہذیب و تمدن پر روشنی پڑتی ہے۔ دریافت شدہ چیزوں میں کھانے کے برتن، مٹی کے برتن، مختلف اوزار، زیورات، تانبے، مٹی اور پتھر کے بت، کھلونے، مہریں، روئی کے کپڑے کے نشانات، جنگلی اور پالتو جانوروں کے پنجر ملے ہیں۔ ان سب اشیاء سے اس وادی کے لوگوں کی زندگی کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ ہڑپہ میں ایک قبرستان کا سراغ ملا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ مردوں کو دفن کرتے تھے۔ بعض اوقات پارسیوں کی طرح لاش کو کھلے میدان میں رکھتے تھے تاکہ پرندے گوشت نوچ لیں۔ پھر ہڈیاں دفن کرتے

تھے۔ تیسرا طریقہ یہ تھا۔ کہ لاش جلا کر راکھ کسی برتن میں ڈال کر دفن کر دیتے تھے۔
مذہب: کھدائی سے کسی مندر یا عبادت گاہ کا نشان نہیں ملا۔ لیکن مختلف بتوں اور مہروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ وادی سندھ کے قدیم لوگ ماتا دیوی کی پوجا کرتے تھے۔ یہ لوگ اس دیوی کو زندگی دینے والی اور زرخیزی کا ماخذ گنتے تھے۔ ماتا دیوی کے بت اکثر برہنہ عورت کے ہیں۔ ایک مہر پر تین سروں والے ایک دیوتا کی تصویر بھی ہے۔ مختلف جانور اس کے گرد جمع ہیں۔ بعض مورخوں نے اسے شیو قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ مورخین کا قیاس ہے۔ کہ آریوں نے شیو پوجا کا تخیل ان قدیم لوگوں سے لیا۔

خوراک اور زراعت: ہڑپا کے مقام پر ایک گودام ملا ہے۔ جہاں اناج کا ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ لوگ زیادہ تر گندم اور جو کاشت کرتے تھے۔ لیکن ان کی خوراک میں گندم اور جو کے علاوہ دودھ، مچھلی، سبزیاں اور ہر قسم کا گوشت بھی شامل تھا۔ یہ لوگ بھیڑ کے گوشت کے علاوہ گائے، سور، اور مرغ کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ دونوں شہروں سے جانوروں کے ڈھانچے ملے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ پالتو جانوروں میں گھوڑے، بیل، بھیڑ، بھینس اور کتے عام تھے۔ اس کے علاوہ لوگ سور اور ہاتھی بھی پالتے تھے۔ جنگلی جانوروں میں گینڈا، بندر، ریچھ اور شیر کے پنجر ملے ہیں۔ سندھ کا علاقہ اس زمانے میں از حد زرخیز تھا۔ اور خوراک وافر تھی۔ یا سندھ کے علاقے میں اس زمانے کافی بارش ہوتی ہو گی۔ یا دریائے سندھ کے پانی سے مصنوعی آب پاشی کی جاتی ہو گی۔

لباس اور زیورات: مٹی کے کھلونوں اور مجسموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ لوگ کپڑے بننا جانتے تھے۔ اور لباس کے مختلف فیشن اُن میں رائج تھے۔ روئی کے علاوہ لوگ اون کات کر بھی کپڑا بناتے تھے۔ ایک بت میں مرد کے بائیں کندھے

پر شال دکھائی گئی ہے۔ دایاں بازو ننگا ہے۔ منجھوڑھارو میں چرخے بھی ملے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے، کہ یہ لوگ روئی اور اون کاتتے تھے۔ مستورات زیور پہنتی اور زیبائش کی شوقین تھیں۔ زیورات چاندی، سونے، اور ہاتھی دانت کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ عورتیں کانوں میں بالیاں، ہاتھوں کی چوڑیاں اور گلے کے ہار کثرت سے پہنتی تھیں۔ مرد بھی زیبائش کے لئے گردن کے قریب اپنے بالوں کو دھاگے یا سونے کے تاروں سے باندھے تھے۔

کھلونے :- کھدائی سے لاتعداد کھلونے دریافت ہوئے ہیں۔ کھلونے برتنوں کی طرح بھٹیوں میں پکائے جاتے تھے۔ ان کھلونوں کی شکلیں مختلف ہیں۔ مرد عورت پرندے، مویشی، اور جنگلی جانور غرض ہر شکل کھلونوں سے ظاہر ہے۔ ہڑپہ میں تانبے کا ایک کھلونا ملا ہے۔ جس کی شکل موجودہ تانگہ سے مشابہ ہے۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ پہیہ دار گاڑیوں کا اس زمانہ میں رواج تھا۔ کھلونوں کو رنگوں سے سجایا بھی جاتا تھا۔

برتن اور گھریلو اشیاء :- دریافت شدہ برتن زیادہ تر مٹی کے ہیں۔ کمہار ان کو باقاعدہ بھٹیوں میں پکاتے تھے۔ ان برتنوں پر مختلف رنگ بھر کر ان کو سجاتے تھے بھی رنگ ان کے برتنوں پر ہیں۔ برتن تانبے اور پیتل کے بھی تھے۔ لیکن لوہے کے استعمال کا نشان بالکل نہیں ملا۔ مختلف دھاتوں کے استعمال سے لوگ واقف تھے۔ چنانچہ دریافت شدہ اشیاء سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وادی سندھ کے لوگ سونا، چاندی، پیتل، تانبا اور سیسہ کے استعمال کو خوب جانتے تھے۔ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی سوئیاں اور کنگھیاں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ تانبے اور کانسی سے لوگ ہتھیار بھی بناتے تھے۔ لوگ شکار کے شوقین تھے۔ ان کے ہتھیار شکار کے علاوہ جنگ میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ یہ ہتھیار زیادہ تر تانبے

اور پیتل کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ کلہاڑی، نیزہ اور خنجر کے علاوہ گرز اور تیر کمان ان کے مقبول ہتھیار تھے۔ وادیٔ سندھ کے لوگ تلوار، ڈھال، خود اور زرہ بکتر کے استعمال سے بالکل ناواقف تھے۔ کھدائی کی اشیاء میں ان اسلحہ جات کا نشان بالکل مفقود ہے۔

طرزِ تحریر:۔ وادیٔ سندھ کے لوگوں کی زبان اور طرزِ تحریر کے بارے میں ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے مقامات پر چند مہریں دستیاب ہوئی ہیں۔ مگر ماہرین ان کو پڑھنے میں ناکام رہے ہیں۔ رسم الخط بکر نویسی (تصویری) کے مشابہ ہے۔ اور عربی فارسی کی طرح دائیں سے بائیں جانب لکھا جاتا ہے بعض مورخ بعض حروف کو ہندی سے مشابہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں تاحال کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

عمارات اور رہائش:۔ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی قدیم عمارات کو دیکھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں۔ عمارتوں کی تعمیر خاص منصوبہ بندی سے کی جاتی تھی۔ روشن دان باقاعدہ تھے۔ اور فرش کے لئے پکی اینٹیں استعمال ہوتی تھیں۔ گندے پانی کے نکاس کے لئے باقاعدہ انتظام تھا۔ اور حفظانِ صحت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ عمارت کی بنیادیں کچی اینٹ کی ہوتی تھیں۔ لیکن دیواروں پر اعلیٰ قسم کی پکی اینٹیں استعمال ہوتی تھیں۔ گھروں کے غسل خانے کشادہ ہوتے تھے۔ گھروں کے قریب کنوئیں تھے جن کا پانی استعمال ہوتا تھا۔ گلی کوچوں کی نالیاں اینٹوں یا پتھروں کی چھت سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ شہر کا گندہ پانی زمین دوز نالیوں میں بہتا تھا۔ شہر میں صفائی قائم رکھنے کے لئے جابجا کوڑا کرکٹ ڈالنے کے لئے بڑے بڑے برتن رکھے ہوئے تھے۔ لوگ آرٹ سے بھی بہرہ ور ہوتے تھے ناچ سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ کھدائی سے ایک رقاصہ کا بت بھی ملا ہے۔ لوگ

شطرنج بھی کھیلنا جانتے تھے ۔ ان شہروں میں سڑکیں کشادہ تھیں۔ اور بل کھاتی ہوئی نہیں ہوتی تھیں۔ پبلک عمارات بھی دریافت ہوئی ہیں۔ ان عمارتوں میں ایک بہت بڑا ہال ہے۔ اور وسیع تالاب بھی ہیں۔ ان تمام چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ پانچ ہزار سال پہلے بھی مغربی پاکستان کے قدیم ترین باشندے ازحد مہذب، ترقی یافتہ اور متمدن لوگ تھے۔ موجودہ دور کے بڑے بڑے انجنیئر بھی ان کی عمارات کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ پس ہڑپہ اور منجھوڈھارو دو تاریخی تیرتھ کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان مقامات سے کھدائی کی دریافتوں نے برصغیر ہندو پاک کی تاریخ کو مسیح کی پیدائش سے تین ہزار سال پہلے تک روشن کر دیا ہے۔ شاید کسی وقت مزید کاوش سے اس قدیم تہذیب کے اور بھی نمایاں خدوخال ظاہر ہو جائیں۔

مہریں (Seals) وادی سندھ کی تہذیب کے زمانے کی تقریباً پانچ سو مہریں دستیاب ہوئی ہیں۔ دریائے راوی کی قدیم گزرگاہ سے بعض چھوٹی چھوٹی مہریں ملی ہیں۔ جن سے کننگھم (Cunnigham) کے قول کے مطابق ہمیں وادی سندھ کی تہذیب کے نشانات ملتے ہیں۔

ڈاکٹر میکے کی رائے ہے کہ ان مہروں سے لوگوں کے رسم الخط اور زبان معلوم ہو جانے کی توقع ہے۔ بعض مہریں تعویذوں کی شکل میں ہیں۔ اور اس دور کے لوگوں کے مذہب پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ مہریں زیادہ تر بادامی رنگ کی پکائی ہوئی مٹی سے بنی ہیں جسے (Terra Cotta) کہتے ہیں۔ ایک مہر پر سینگوں والی برہنہ دیوی کی تصویر ہے۔ جس کے تین چہرے ہیں۔ اس کے گرد بہت سے مویشی بھی ہیں۔ یہ دیوی مذہبی سوچ بچار میں محو بیٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دیوی نے دوپٹے کے علاوہ کنگن یا کڑے (Bangles) پہنے ہوئے

ہیں۔ ڈاکٹر مارشل اسے شیو کی تصویر گردانتے ہیں۔ لیکن یہ بات یقینی نہیں ہے برہنہ دیوی کی تصویر والی بہت مہریں دستیاب ہوئی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تصویر کسی کنواری دیوی (Virgin goddess) کی ہو۔

ایک مہر نہایت دلچسپ ہے۔ اس میں پیپل کے درخت کے عین درمیان میں سینگوں والی ایک دیوی ہے جس کے سامنے سینگوں والی ایک اور دیوی جھک کر آداب بجالا رہی ہے دیوی اور پجاریوں نے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اور ان کے بال لمبے ہیں نیز چوٹی (Plaits) کی مانند ہیں۔ پجاریوں کے عین پیچھے ایک بکری کی تصویر ہے۔ جس کا چہرہ انسانی ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ اس زمانے میں دیوتاؤں اور دیویوں کی روحوں کی پرستش ہوتی تھی۔ دیوتا اس درخت کی شاخوں سے سجاوٹ کرتے تھے۔ اور جو کوئی اپنے سر کو پیپل کی شاخوں سے سجاتا یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اسے علم کی بلندیاں حاصل ہو گئی ہیں۔

موہنجوداڑو کی ایک مہر سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ چیتے کو ایک دیوی کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر میکے کی رائے یہ ہے کہ ابتدائی دور میں چیتے کی شکل والی زنانہ دیوی کو شیو کی بیوی گنا جاتا تھا۔

ایک مہر پر بکری کی تصویر ہے۔ جس پر چیتے کی شکل والی دیوی سوار ہے۔ اس دیوی کا جسم عورت کا ہے، ٹانگیں، اور دم چیتے جیسی نظر آتی ہے۔ دوسری مہروں پر چیتے کی شکل والی دیوی کے سر پر بیل کے دو سینگ ہیں۔

ایک مہر میں بھینس کی تصویر ہے جو انسانوں کے ایک گروہ پر فتحیاب ہونے کے بعد ان سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تصویر کسی دیوی یا دیوتا کا نشان ہے۔ جسے اپنے دشمنوں پر فتح ہوئی۔

ایک مہر پر انسانی تصویر ہے۔ لیکن اس کے سینگ ہیں۔ اور اس کا چہرہ

اور دیم ہیں کی مانند ہیں۔ یہ تصویر ایک اور سے معروف پیکار ہے۔ دوسری تصویر سینگ والے چیتے کی ہے۔ قیاس ہے کہ انسانی تصویر کسی اوتار (Demigod) کی ہے۔ اور دوسری تصویر شیطانی طاقت کا مظہر ہے۔ یعنی ان دونوں طاقتوں کے درمیان ہمیشہ کش مکش رہتی ہے۔

افسوس یہ ہے کہ مہروں کی تمام تصاویر بے مثل ہیں پس اس دور کے لوگوں کے لباس کے بارے میں حتمی معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ مہروں کا استعمال عام تھا۔ شاید ہر شخص کے پاس ذاتی مہر ہوتی تھی۔ مہروں سے اس دور کے مذہبی رجحانات پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ قدیم آریاؤں نے شو کی پوجا اور لنگ کی تپسیا کا خیال وادی سندھ کی تہذیب سے لیا۔ بیل ہمیشہ سے شو کے ساتھ لازم و ملزوم رہا ہے۔ چنانچہ وادی سندھ کی مہروں میں سے ایک پر ایک تصویر ہے جس پر کسی دیوتا جوگیوں کی مانند بیٹھا ہے۔ اور اس کے دونوں جانب مویشی ہیں۔ اس تصویر کی تین آنکھیں اور تین چہرے ہیں۔ اور اس کے سر پر دو سینگ ہیں۔ یہ تصویر ہندو دور کے شوجی کی پیش رو کی گئی جاتی ہے۔

یہ بات بھی ثابت ہے۔ کہ وادی سندھ کی تہذیب کے اس دور میں لوگ جادو منتر اور تعویذوں میں یقین رکھتے تھے۔ اور جن بھوت یا شیطانی طاقتوں سے خوفزدہ رہتے تھے۔

وادی سندھ کی تہذیب اور آریاؤں کی ویدک تہذیب کا موازنہ

وادی سندھ کی تہذیب اور آریاؤں کی ابتدائی تہذیب یعنی رگ ویدک دور کی تہذیب کا مقابلہ و موازنہ درج ذیل ہے:-

1 :۔ دونوں تہذیبوں کے دور میں مویشی ایک جیسے تھے۔ کتا، گائے، بیل اور بھیڑ بکریاں دونوں زمانوں کے لوگ پالتے تھے۔ البتہ بھینس کو جنگلی جانور شمار کیا جاتا تھا۔ دونوں زمانوں میں شیر، سور اور ہاتھیوں کا شکار کیا جاتا تھا۔ ویدک دور میں گھوڑا پالتو جانور تھا۔ لیکن وادیٔ سندھ کی تہذیب کے زمانے تک یعنی تقریباً ۲۸۰۰ ق م تک گھوڑا جنگلی جانور تھا۔

۲ :۔ ہر دو زمانوں میں لوگ سجاوٹ کی غرض سے زیورات پہنتے تھے۔۔۔۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب سے ظاہر ہے کہ امیر لوگ سونے چاندی اور ہاتھی دانت کے زیور یعنی ہار، انگشتریاں اور بازو بند پہنتے تھے۔ قیمتی پتھروں کے ہار بھی پہنتے تھے۔ البتہ عورتیں اپنے ٹخنے۔ کمر اور کانوں کو بھی زیورات سے سجاتی تھیں۔ غریب لوگ اپنے زیورات "تانبے، کوڑیوں، ہڈیوں اور بادامی رنگ کی پکائی ہوئی مٹی (Terra Cotta) سے بناتے تھے۔ ویدک تہذیب کے دور میں سونے کے زیورات میں کان کی بالیاں۔ ہار، پہنچیاں (Bracelets) اور پازیب (Anklets) ہوتے تھے۔ نیز مرد اور عورتیں موتیوں کے ہار پہنتے تھے۔

۳ :۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ لوگ زرہ بکتر اور خود کا استعمال نہ جانتے تھے۔ نیز ان کے پاس ہتھیاروں کی فراوانی نہ تھی۔ اسکے برعکس آریہ قوم جنگجو تھی۔ ان کے پاس عمدہ ہتھیار کثرت سے تھے۔ لوگ زرہ بکتر پہنتے تھے۔ ان کے خود سونے یا دیگر قیمتی دھاتوں کے ہوتے تھے۔ آریہ قوم فتوحات کی شوقین تھی۔ اور مال غنیمت کے لالچ میں آریہ اکثر ہمسایوں کا قافیہ تنگ کرتے تھے۔

۴ :۔ موہنجوڈھارو سے سوتی اور اونی کپڑے کے آثار دستیاب ہوئے

ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے تہذیبی دور میں لوگ آریاؤں کی مانند سوتی کپڑا بننا جانتے تھے۔ رگ وید میں پارچہ بافی اور جلاہوں کا ذکر ملتا ہے۔ پس یہ بات عیاں ہے کہ دونوں تہذیبوں میں سوتی کپڑوں کا استعمال یکساں طور پر موجود تھا۔

۵:۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب دیہاتی زندگی بسر کرنے کی بجائے شہری زندگی کی شوقین تھی۔ چنانچہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان کے شہروں سے باقاعدگی عیاں ہے۔ اور وہ گندے پانی کے نکاس کے لئے باقاعدہ نالیاں تعمیر کرتے تھے ان کے برعکس آریہ رگ ویدک تہذیب کے زمانے میں دیہاتی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا لباس اور خوراک سادہ تھی۔ ہر گاؤں قبیلے کے سردار کے ماتحت ہوتا تھا۔ نیز ہر گاؤں کے گرد اگرد باڑ ہوتی تھی۔ آریہ قوم لوہے کے استعمال سے واقف تھی۔ وادی سندھ کے تہذیبی دور میں لوہے کی ابھی دریافت نہ ہوئی تھی۔

۶:۔ شہری تہذیب کے دلدادہ ہونے کی بدولت وادیٔ سندھ کے لوگ شکار کے بالکل شوقین نہ تھے۔ بلکہ گھریلو قسم کے مشاغل میں دلچسپی لے کر تفریح کا سامان پیدا کر لیتے تھے مثلاً جوئے اور چوسر کے شوقین تھے۔ اس کے برعکس آریہ رتھ چلانے اور شکار کے شوقین تھے۔

۷:۔ وادیٔ سندھ کے تہذیبی دور میں عورتیں لہنگا پہنتی تھیں۔ اور اپنے بالوں کو گوندھ کر چوٹی کی مانند بنا لیتی تھیں۔ مرد دھوتی کی مانند کپڑے سے اپنی رانوں کو لپیٹ لیتے تھے۔ اور مدراسیوں کی مانند دھوتی کا پلو ان کے شانے سے لٹکتا تھا۔ رگ ویدک تہذیب کے لوگ جانگیہ استعمال کرتے تھے۔ عورتیں چوٹی رکھتی تھیں۔ بالوں کو کنگھی کر کے تیل بھی لگاتی تھیں۔ آریاؤں میں داڑھی

رکھنے کا رواج تھا۔ زاہد لوگ جانوروں کی کھال پہنتے تھے۔

۸ :۔ وادیِ سندھ کی تہذیب سے عیاں ہے۔ کہ لوگ صفائی پسند تھے اور نہانے کے شوقین تھے۔ لاتعداد غسل خانوں کے آثار اس بات کا ثبوت ہیں۔ آریہ تہذیب کو غسل خانوں اور نہانے سے اسقدر دلچسپی نہ تھی۔

۹ :۔ وادیِ سندھ کی تہذیب کے برتن پکے اور سجاوٹ دار تھے۔ نقش و نگار کے لئے سرخ اور سیاہ رنگ استعمال ہوتا تھا۔ ان کے بعض ظروف روغنی اور چمکدار ہیں۔ اس کے برعکس آریاؤں کے برتن بالکل سادہ ہوتے تھے۔

۱۰ :۔ وادیِ سندھ کی تہذیب بلند پایہ تھی۔ لیکن لوگوں کی خوراک سادہ تھی۔ عوام زیادہ گندم اور مکئی کی روٹی پکاتے تھے۔ اور دودھ سے کھانے پینے کی کئی چیزیں بناتے تھے۔ آریاؤں کی خوراک میں دودھ پر زور زیادہ تھا۔ وہ چاول بھی کھاتے تھے۔ اور جانوروں کی قربانیاں کر کے ان کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ وہ جَو کی روٹی گھی میں گوندھ کر کھاتے تھے۔ مکھن کا استعمال بھی جانتے تھے آریہ قوم بھنگ پینے کی شوقین تھی۔ لیکن شراب کا رواج نہ تھا۔

۱۱ :۔ دونوں تہذیبوں میں مذہبی فرق نمایاں تھا۔ وادیِ سندھ کی تہذیب سے ظاہر ہے کہ ان کے مذہب میں دیوی (Mother—Goddess) کی پرستش پر زور تھا۔ لیکن اس دور میں کئی ایک دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا ہوتی تھی۔ پیپل کے درخت کو مقدس گِنا جاتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ دھرتی ماتا کی روح اس درخت میں رہائش رکھتی ہے۔ اس دور کے دیوتاؤں کی تصاویر میں انسانی شکل کے ساتھ حیوانوں کی شکل کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ شو کی پوجا کی ابتدا اس دور میں ہو چکی تھی۔ اور مادہ چیتے کو دیوی کے طور پر شو جی کی بیوی قرار دے کر اس کی پوجا بھی ہوتی تھی۔

مہروں سے مذہبی تفصیلات جو ملتی ہیں ان کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے
بعض مورخین کی رائے یہ ہے کہ اس دور کے لوگ پیپل کے درخت کی پوجا کرتے
تھے۔ اور ان کے دیوتا کئی اقسام کے تھے۔ البتہ دیویوں کا مقام بلند نہ تھا۔ وہ
کم درجے کی گنی جاتی تھیں۔ مورخین کا ایک اور طبقہ اس خیال کا حامی ہے کہ آریاؤں
نے شو کی پرستش اور لنگ کی پوجا وادی سندھ کی تہذیب سے لی۔

آریاؤں کے مذہب کا تفصیلی ذکر پانچویں باب میں پیش کیا جائے گا۔ یہاں
صرف یہی جاننا کافی ہے کہ آریاؤں نے اپنے پیش روؤں سے گہرے مذہبی
اثرات قبول کیے۔ ابتدا میں وہ مناظر قدرت کی پرستش کرتے تھے۔ اور بارش
آگ، ہوا اور صبح صادق کو مظاہر قدرت سمجھ کر پوجتے تھے۔ جوں جوں زمانہ
گزرتا گیا۔ ان کے مذہب میں بلند تر ہستی کی پرستش شروع ہو گئی۔ رگ وید کا
دور میں مندر، ذات پات یا بت بالکل مفقود تھے۔

کافی زمانہ گذرنے کے بعد آریاؤں نے لاتعداد دیوتاؤں کی پرستش شروع
کر دی۔ ان کے بعض دیوتا برصغیر کے باشندوں (یعنی وادی سندھ کی تہذیب)
کی دیکھا دیکھی ان کے مذہب میں شامل ہوئے۔ بعض دیوتاؤں کا تصور وہ
بیرونی علاقوں سے لائے۔ آریاؤں نے بعد ازاں شو اور لنگ کی پرستش
شروع کر دی۔ اور دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے وہ قربانیاں کرنے لگے۔

Typical Questions

Q. 1. Discuss important aspects of the Indus valley civilization as discovered at Harrapa and Mohenjo Daro.

Q. 2. Write a short but critical note on the Indus Valley Civilization.

Q. 3. What light do the recent discoveries at Mohenjo Daro throw on the pre-historic culture of India ?

Q. 4. What are, in your opinion, the outstanding features of the Indus Valley Civilization ?

امتحانی سوالات

۱۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر ہڑپہ اور موہنجو ڈھارو کے تاریخی انکشافات کیا روشنی ڈالتے ہیں؟

2۔ وادی سندھ کی تہذیب کا تنقیدی جائزہ لیجئے؟

3۔ ہندوستان کے زمانۂ قبل از تاریخ کی ثقافت پر موہنجو ڈھارو کے تاریخی انکشافات کیا روشنی ڈالتے ہیں؟

4۔ وادی سندھ کی تہذیب کے نمایاں خد و خال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

پانچواں باب

آریہ قوم اور رگ وید کی تہذیب

آریہ لوگ غیر ملکی تھے اور مسیح کی پیدائش سے صدہا سال پہلے وہ گروہ در گروہ درۂ خیبر اور شمال مغربی سرحدی صوبے کی جانب سے برصغیر ہند اور پاکستان میں وارد ہوئے۔ اُن کی آمد کی صحیح تاریخ کا اندازہ مشکل ہے لیکن عام نظریہ یہی ہے کہ آریہ اس برصغیر میں مسیح کی پیدائش سے دو ڈھائی ہزار سال پہلے آئے یعنی آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل۔ اُن کے مختلف قبیلے ایک دوسرے کے بعد حملہ آور ہوتے رہے اور آہستہ آہستہ وہ اس مُلک کے اصلی باشندوں پر غلبہ پاکر پاکستان اور شمالی ہندوستان میں آباد ہو گئے اس چیز میں اُن کے کئی سو سال صرف ہوئے۔

"The immigration must have been a prolonged process, distributed over a period of a few centuries."

آریاؤں کے اصلی وطن کے بارے میں شدید اختلاف رائے ہے لیکن سب سے اہم اور جدید نظریہ یہی ہے کہ آریہ قوم کا اصلی وطن وسط ایشیا تھا۔ سب سے اہم نظریہ سر ولیم جونز نے پیش کیا۔ اُن کا خیال ہے کہ وسط ایشیا قدیم زمانے میں ازحد زرخیز اور شاداب علاقہ تھا۔ اچانک دریاؤں کا رخ بدل جانے سے یہ علاقہ بنجر ہو گیا اور تمام آبادی مجبوراً نئے وطن کی تلاش میں نکلی وسط ایشیا

سے نکل کر آریاؤں کی مختلف شاخیں یورپ اور ایران میں گھس گئیں۔ وہ شاخ جو برصغیر ہند و پاکستان کی جانب نکلی اُسے انڈو آرین یا آریہ کہتے ہیں۔

بعض مورخ یہ سمجھتے ہیں کہ آریہ مشرقی یورپ سے اُٹھے اور ایران ہوتے ہوتے پنجاب آ پہنچے۔ مشہور مورخ بی۔ جی۔ تلک کا خیال ہے کہ آریاؤں کا اصلی وطن قطب شمالی کا قریبی علاقہ تھا۔ جب اُس علاقے میں برف باری زیادہ ہوئی تو آبادی وہاں سے نئے علاقوں کی تلاش میں نکلی۔ بنگالی مورخ مسٹر داس کا خیال ہے کہ سپت سندھو (Land of seven rivers) دراصل آریاؤں کا قدیم وطن تھا۔ یعنی خطۂ مغربی پاکستان۔ مسٹر داس کا خیال ہے کہ اس خطے سے آریہ قوم بھارت اور دنیا کے دوسرے ممالک میں پھیلی موجودہ زمانے میں یہ دونوں نظریے مقبول نہیں ہیں۔ سر ولیم جونز کا نظریہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

مسیح کی پیدائش سے چند ہزار سال پہلے آریہ قوم آب و ہوا کی تبدیلی کی بدولت وسط ایشیا سے اُٹھی اور اُن کے مختلف قبیلے کئی ایک ممالک کی جانب حملہ آور ہوئے۔ نئی سرزمین کی تلاش میں بعض قبیلے ایران میں آباد ہوئے لفظ ایران سے مراد ہے "آریاؤں کی سرزمین" یہاں مذہب کی بنا پر ان میں خانہ جنگی ہوئی اور مغلوب قبیلہ جو مختلف دیوتاؤں کو پوجتا تھا ہندوکش کے پہاڑوں کی جانب بھاگ گیا۔ یہاں سے یہ لوگ پنجاب میں وارد ہوئے جہاں اس زمانے میں دراوڑ قوم آباد تھی۔ ایک لمبے عرصے تک دونوں میں جنگ ہوتی رہی اور آریاؤں نے دراوڑ قوم کو شکست دے کر جنوبی علاقوں کی جانب دھکیل دیا اور خود اُن کی جگہ پنجاب اور سندھ میں آباد ہو گئے اسی علاقے میں رگ وید لکھی گئی جو آریہ قوم کی قدیم ترین مذہبی کتاب ہے۔ دیگر وید اس کے کئی سو سال بعد

لکھے گئے ۔ رگ وید میں سپتا سندھو کا ذکر ہے ۔ اس سے مراد یہی پنجاب اور سندھ کا علاقہ ہے ۔ بعد میں جوں جوں زمانہ گذرتا گیا آریہ قوم کے دیگر قبیلے گروہ در گروہ ہند و پاکستان میں وارد ہوئے اور پہلے آنے والے آریاؤں کو جنوب کی طرف دھکیل دیا ۔ کافی مدت کے بعد آریہ قوم تمام مغربی پاکستان اور شمالی بھارت میں آباد ہو گئی اور اس برصغیر کے اصلی باشندے دکنی علاقوں کی جانب چلے گئے ۔ گنگا جمنا کے میدانوں کے تمام علاقے میں آباد ہونے میں آریہ قوم کو تقریباً دو ہزار سال صرف ہوئے ۔ اور اس عرصے میں انہوں نے بعض مفتوحین کے ساتھ شادی بیاہ بھی رچائے ۔ بنگال اور بہار طویل مدت تک آریاؤں کے اثر سے محفوظ رہے ۔ لیکن مدتِ مدید کے بعد آریہ قوم اُن علاقوں تک بھی جا پہنچی ۔ آریاؤں نے ہند و پاکستان میں سکونت اختیار کرنے میں تمدن کی مختلف منزلیں طے کیں اور قدیم ترین تمدن یعنی وادیٔ سندھ کی تہذیب کو غارت کیا ۔ ہندو تہذیب کے آباد اجداد بھی آریہ لوگ تھے جن کی قدیم ترین تہذیب کو رگ ویدک تہذیب یا ویدک تہذیب کہتے ہیں ۔ یورپ کے مؤرخین اس کو Indo-Aryan Civilization کہتے ہیں ۔ عام طور پر قدیم آریاؤں کی تہذیب کہتے ہیں (Civilization of Ancient Aryans)

مقدس کتابیں :۔ آریہ قوم کی چار مقدس کتابیں ہیں جن کو وہ "وید" کہتے ہیں ۔ لفظ وید سے مراد ہے "علم و فضل" یعنی "جاننا" یا "معرفت" ہندو ان کتابوں کو الہامی کتابیں گنتے ہیں ۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ قدیم ترین رگ وید ہے اور دوسرے وید بعد کے زمانہ کی تصنیف ہیں ۔ یجر وید ، اتھر وید اور سام وید کی زبان اور ان کے شلوک اس امر کو ظاہر کرتے ہیں ۔

رگ وید کے بھجن یا شلوک سنسکرت زبان میں ہیں ۔ اور ان میں اکثر دیوتاؤں اور مظاہر قدرت کا ذکر ہے اس دور میں جب رگ وید لکھی گئی ۔ آریہ

قوم پنجاب اور سندھ میں مقیم تھی اسی لئے سپتا سندھ کے دریاؤں کی تعریف اکثر ملتی ہے۔ گنگا اور جمنا کا ذکر صرف ایک دو بار ملتا ہے۔

اتھروید میں زیادہ زور اُن منتروں پر دیا گیا ہے جن سے بیماریوں اور بھوت پریت سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ توہم پرست تھے۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ آخری وید مسیح کی پیدائش سے ۸۰۰ سال پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔

رِگ ویدک تہذیب

ویدک تہذیب کے زمانہ کا صحیح تعین ممکن نہیں۔ میکس مُلر (Max Muller.) کا خیال ہے کہ رگ وید مسیح سے دو ہزار سال قبل لکھی گئی اور ویدک زمانہ مسیح سے ۶۰۰ سال قبل تک گنا جا سکتا ہے۔ ہندو مورخ تلک نے رگ وید سے اخذ کر کے نجوم کے چند حوادث سے یہ کہا ہے کہ رگ ویدک تہذیب کا آخری سال ۱۴۰۰ سنہ ق م ہے۔ جبکہ مہابھارت کی جنگ لڑی گئی۔ جدید دَور کے مورخین تلک کے نظریات کو محض مذہبی رجحانات گنتے ہیں جرمن مورخ جن میں جیکوبی (Jacobi) اور ونٹرنٹز (Winternitz.) شامل ہیں، ویدک زمانے کو ۴۵۰۰ ق۔م سے لے کر ۲۵۰۰ ق۔م تک سمجھتے ہیں۔

یہ بات یاد رہے کہ رگ ویدک، آریہ ویدک۔ قدیم آریہ، انڈو آریہ سب اصطلاحات ہم معنی ہیں اور اُن سے مُراد قدیم ترین آریاؤں کا تمدن ہے اُس دور میں آریہ قوم پنجاب اور سندھ میں آباد تھی اور گنگا جمنا کے میدانوں میں پُوری طرح سے اُن کا غلبہ نہیں ہوا تھا۔

(Vedic Age) کے بارے میں تاریخوں کا صحیح تعین ممکن نہیں لیکن قیاس یہ ہے کہ ۱۵۰۰ ق م سے لے کر ۲۵۰۰ ق م تک کا دور قدیم آریاؤں کی تہذیب کا گہوارہ کہلانے کا مستحق ہے اسی زمانے کو رگ ویدک زمانہ کہتے ہیں اس دور میں قدیم آریاؤں کی تہذیب کا حال درج ذیل ہے۔

مذہب :- رگ ویدک زمانہ میں مندر بالکل مفقود تھے اس کے علاوہ لوگ نہ بت پرست تھے اور نہ ہی بت تیار کرتے تھے وہ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ اور قربانیوں پر زور دیتے تھے۔ وہ مناظر قدرت کی پرستش کرتے تھے اور ہر مظہر قدرت کو دیوتا سمجھتے تھے۔ چاند۔ سورج، آگ (اگنی) ہوا (وایو) بارش (اندر) وغیرہ سب کی پوجا ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ آسمان (دوان) اور اوشا دیوی (یعنی صبح صادق) کی پرستش بھی ہوتی تھی۔ موقعہ کے مطابق دیوتا کو چن لیا جاتا تھا اور کھلے میدان میں کھڑے ہو کر اُس دیوتا کی شان میں گیت گائے جاتے تھے۔ نیز اُن کو خوش کرنے کے لئے اناج اپھل، گوشت اور سوم رس (بھنگ) پیش کرتے تھے۔ اس طریقہ کو مورخ (Open air worship) کہتے ہیں۔ رگ وید میں بلند و برتر ہستی کا ذکر بھی موجود ہے جسے برہما کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اُس کی شان میں کئی ایک بھجن ہیں۔ سمتھ صاحب کا قول ہے کہ رگ ویدک دور میں ہندوؤں کا مذہب مناظرِ قدرت کی پرستش کرنا ہے لیکن وہ خدا کے برتر تک بھی پہنچ جاتے تھے۔

"The religion of the Hindus in the Vedic epoch, was a worship of nature leading to Nature's God."

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدیم آریہ لوگ سادہ مذہب رکھتے تھے اور مناظر قدرت کو پوجتے تھے اُن کو ہم نہ مشرک کہہ سکتے ہیں نہ توحید پرست، چند دیوتا

وہ آبائی وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے اور کچھ دیوتا انہوں نے اس برصغیر میں آکر اپنے مذہب میں شامل کر لئے یہ لوگ گائے کی پرستش نہ کرتے تھے لیکن گائے اور گھوڑے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ایران کے آریہ بیل دیوتا کو پوجتے تھے لیکن ہندو پاکستان کے آریہ محض گائے کی افادیت کے پیش نظر اسے اچھا سمجھتے تھے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا آریاؤں کے دیوتاؤں کی تعداد بڑھتی گئی اور مذہب رسومات اور قربانیوں کا پلندہ بن کر رہ گیا۔ برہمن کا وجود بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن رسومات کی پیچیدگیوں کی بدولت عبادت کے موقع پر ماہر پادری کا ہونا ضروری ہو گیا یہی شخص بعد میں برہمن کہلایا۔ ویدک زمانہ کے آغاز میں خاندان کا بڑا بوڑھا عبادت کے موقع پر امام ہوتا تھا اور خاندان کے دیگر افراد مقتدی۔ وقت گذرنے پر آریاؤں کے مذہب نے ارتقائی صورت اختیار کی اور اُن میں سے بعض نے سورج اور چاند کے بنانے والی ہستی پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح انہوں نے ایک خدا کی پرستش اختیار کی لیکن وہ مسلمانوں کی طرح توحید پرست نہ تھے۔ آریاؤں کے بلند و برتر خدا کے علاوہ لاتعداد دیوتا بھی تھے جن کو خوش کرنا ان کا دھرم تھا۔ پس ویدک زمانہ کے خاتمہ کے قریب آریہ لوگ مشرک تھے اور اُن کا مذہب قدیم سادگی کھو چکا تھا۔

سوشل حالات:۔ قدیم آریہ خوش پوش، ملنسار، دراز قد اور خوش شکل لوگ تھے۔ مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ بہت سے کنبوں پر مشتمل تھا۔ باپ کنبے کا سردار تھا۔ لوگ زیادہ تر گاؤں میں بستے تھے۔ لیکن شہری زندگی سے بھی آشنا تھے۔ عورت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ستی کی رسم بالکل مفقود تھی اور بیوہ عورت دوبارہ شادی کر سکتی تھی۔ ناچ اور گانے کا عام رواج تھا۔ عبادت کے وقت عورت بھجن گاتی تھی۔ پردے کا رواج نہ تھا

عورت کھلے بندوں مردوں سے میل جول رکھ سکتی تھی۔ ذات پات کا نام تک نہ تھا۔ عورت اپنی مرضی سے خاوند چن سکتی تھی۔ اور بچپن کی شادیوں کا رواج نہ تھا۔

آریہ لوگ ڈاڑھی بڑھانا پسند نہ کرتے تھے۔ کپڑے سادہ ہوتے تھے۔ لیکن محض دو چادریں لپیٹ کر گزارہ کرتے تھے۔ کپڑے سینا نہ جانتے تھے۔ مرد اور عورت دونوں زیبائش کے دلدادہ تھے اور سونے چاندی کے زیور پہنتے تھے۔ لمحاتِ فرصت میں زندگی کا لطف اٹھاتے تھے۔ موسیقی اور رقص کے علاوہ رتھ اور گھوڑوں کی دوڑ کے شوقین تھے۔ آریاؤں کی عام خوراک اناج، گھی، سبزی، پھل، دودھ اور مکھن پر مشتمل ہوتی تھی۔ لیکن گوشت کھانا بھی جائز تھا۔ سوم رس پینے کے بہت شوقین تھے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سوم رس سے مراد بھنگ ہے۔

معاشی حالات:۔ آریاؤں کا سب سے اہم پیشہ زراعت تھا لیکن وہ مویشی بھی پالتے تھے اور بھیڑ بکری کے دودھ کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ زیادہ تر گاؤں میں رہتے تھے اور تجارت روپے پیسے کے بغیر اشیاء کے تبادلے کی صورت میں ہوتی تھی۔ برتن سازی، کپڑا بننا، لکڑی کے سامان کی ساخت اور مختلف دھاتوں کے اوزار بنانا ان کے مشہور پیشے تھے آریہ لوگ چمڑا رنگنا جانتے تھے۔ لوہا اور دھاتوں کے کام کرنے والوں کی کافی مانگ تھی۔ کیونکہ یہ لوگ زراعتی آلات کے علاوہ جنگ کے لئے اسلحہ بھی بناتے تھے ترکھان کشتیاں بنانا بھی جانتے تھے۔ کشتیوں کے ذریعے سامان کی نقل وحرکت میں مدد ملتی تھی رتھ جیسی گاڑیوں کا رواج عام تھا۔ پالتو جانوروں میں بھیڑ بکری اور گھوڑے عام تھے کتے پالنے کا رواج بھی تھا۔ شہر بہت کم تھے مختلف

کنبے مل کر گاؤں آباد کرتے تھے۔ ان گاؤں کو موجودہ دور کی اصطلاح میں (Homogeneous village.) کہتے ہیں۔

سیاسی زندگی۔ رگ وید میں اکثر قبیلوں کا ذکر آتا ہے۔ لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آریوں کا سیاسی نظام خاندان پر انحصار رکھتا ہے خاندان کا عمر رسیدہ مرد اس کا سردار تھا اسے (Patriarchal system) کہتے ہیں۔ مختلف خاندان مل کر گاؤں آباد کر لیتے تھے جسے گرام کہا جاتا تھا گاؤں کا سردار "گرامانی" کہلاتا تھا یعنی گاؤں کا مالک۔ یہ شخص گاؤں کے تمام انتظامی اُمور کا ذمہ دار تھا۔ جنگ کے زمانہ میں یہ کمانڈر ہوتا تھا۔ گاؤں کی زرعی پیداوار کا کچھ حصہ "گرامانی" کو ملتا تھا۔ مختلف گرام اگر متحد ہو جاتے تو اُن کے سردار کو "وش پتی" کہتے تھے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ مختلف خاندانوں کے اتحاد سے قبیلے معرض وجود میں آئے ہر قبیلے کا علیحدہ سردار (Tribal chief.) ہوتا تھا بعد میں طاقت ور قبائل کے اتحاد سے راجن یا راجہ وجود میں آیا شروع شروع میں قبیلے کے سردار یا راجن منتخب ہوتے لیکن بعد میں راجہ کا عہدہ موروثی ہوگیا راجہ اپنی رعایا سے ہمیشہ اچھا سلوک کرتا تھا اور امن و امان قائم رکھتا تھا جنگ کے زمانہ میں وہی سپہ سالار ہوتا تھا۔ صلاح و مشورہ کے لئے اس کے وزیر بھی ہوتے تھے جو دراصل منتخب قبائل کے سردار ہوتے تھے۔ ٹیکس لگانے کا نظام نہ تھا لیکن حکومت کا کام چلانے کے لئے لوگ چندہ ادا کیا کرتے تھے جو اُن کی اپنی مرضی پر منحصر ہوتا تھا۔ جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کا رواج موجود تھا حکومت کے اہم عہدہ دار مندرجہ ذیل تھے۔

سونا ——————— شاہی رتھ بان

ساجنا ——————— شاہی دربار کے اُمراء

مدھیاناسی ——————— مجسٹریٹ یا جج

سمگراہنتر ——————— خزانچی

سب سے اہم عہدیدار شاہی پروہت تھا۔ جس نے بعد میں برہمن کا درجہ اختیار کیا۔ پروہت مذہبی اُمور کا رہنما ہونے کے علاوہ سیاسیات میں بھی راجن کی مدد کرتا تھا۔

سمتی اور سبھا: ویدک زمانہ میں راجہ کبھی بھی خود مختارانہ (Despotic) حکومت نہ کر سکا۔ آریہ لوگ جمہوریت کے دلدادہ تھے۔ لہٰذا راجن خواہ موروثی ہو یا منتخب شدہ، ہمیشہ رعایا کے احساسات کا دھیان رکھتا تھا۔ سبھا مختلف سرداروں کی مجلس کا نام تھا (Council of elders.) اس کے اراکین اکابر یا ان کے نمائندے ہوتے تھے اس کے برعکس سمتی عام لوگوں کی نمائندہ جماعت تھی۔ سبھا کے مشورہ پر عمل کرنا راجہ کے لئے لازم ہوتا تھا۔

سمتی عوام کی جماعت تھی۔ لہٰذا ہر بالغ مرد اور عورت اس کے جلسہ میں آزادانہ تقریر کر کے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ صلح اور جنگ کے اہم معاملات پر بھی سمتی غور و خوض کر سکتی تھی۔ سمتی کے فیصلے راجن کی خدمت میں بھیج دیئے جاتے تھے۔ سمتی کے اجلاس میں کوشش کی جاتی تھی کہ فیصلے متفقہ طور پر ہوں۔ عوام کی بہبودی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا سمتی اور سبھا کو اختیار تھا کہ راجن کو تخت سے بھی اُتار دیں۔

"Vedic monarchy was thus severely limited by the will of the people."

راجہ کبھی بھی من مانی کارروائی نہ کر سکتا تھا۔ سمتی اور سبھا کا مشورہ قومی جمہوری مشورہ کے مترادف تھا۔

آریہ لوگ شروع شروع میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے تھے لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، مختلف قبیلے متحد ہوتے گئے اور اس طرح سے طاقت ور حکومتیں وجود میں آئیں۔

اسلحہ جنگ :- آریہ لوگ بہت بہادر اور شجاع تھے اُن کو اس ملک کے قدیم باشندوں سے طویل جنگیں لڑنی پڑیں۔ اس کے علاوہ باہمی جنگ وجدل بھی عام تھی۔ آریہ تیر کمان، تلوار، نیزہ اور کلہاڑی بطور اسلحہ جنگ استعمال کرتے تھے۔ ویدک زمانے میں زرہ بکتر اور خود پہننے کا رواج بھی عام ہو گیا تھا اور ڈھال بھی رائج ہو گئی تھی۔ رتھ کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ آریہ لوگ وادئ سندھ کے لوگوں کی نسبت زیادہ جنگجو تھے۔ فن تحریر سے بھی ناواقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ویدک زمانے کی کوئی تحریر نہیں مل سکی۔

آریہ لوگ خوش شکل، صحت مند، دراز قد اور باہمت تھے۔ ان کے برعکس ملکی لوگ سیاہ فام اور پست قد تھے۔ آریہ اور غیر آریہ کا امتیاز بہت زیادہ تھا اور صدیوں تک قائم رہا۔

Typical Questions

Q. 1. Describe briefly the social, political and religious condition during the Vedic Age.

Q. 2. What do you understand by the Rig Vedic Age? Give a brief account of the religious, political and social life of the Rig Vedic Aryans.

Q. 3. Describe briefly the outstanding features of the Vedic Civilization.

Q. 4. Who were the Aryans'? Where did they come from ? What do you know about Aryan's social life during the Rig Vedic Period ?

Q. 5. What do you know of the life and religious conceptions of the Indo-Aryans in the Vedic Age ?

Q. 6. " The religion of the Hindus in the first or Vedic epoch, was a worship of nature leading up to Nature's God." Discuss.

Q. 7. What light is thrown by the Vedic Literature on the social customs and political conditions of early Aryans in India ?

Q. 8. Describe briefly the Salient features of the Vedic civilization and culture.

امتحانی سوالات

1۔ ویدک دور میں عوام کی سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی کا حال مختصر طور پر بیان کیجئے۔

2۔ "رگ وید کے دور" کا مفہوم کیا ہے؟ اس دور کے آریاؤں کی مذہبی

سیاسی اور سماجی زندگی کا حال قلم بند کیجیے۔

3۔ ویدک تہذیب کے نمایاں پہلو بیان کیجیے۔

4۔ آرین کون تھے۔ ان کا وطن کون سا تھا؟ ویدک دور میں آریاؤں کی سماجی اور مذہبی زندگی کے حالات بیان کیجیے۔

5۔ ویدک دور میں انڈو آرین لوگوں کی زندگی اور مذہبی نظریات کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟

6۔ "ابتدائی ایام میں یا ویدک دور میں ہندوؤں کا مذہب محض مناظرِ قدرت کی پرستش پر مشتمل تھا لیکن رولتی قدرت کی عبادت کی جانب راغب کر دیتا ہے" تبصرہ کیجیے۔

7۔ ہندوستان میں قدیم آریاؤں کی سماجی رسم و رواج اور سیاسی حالات پر ویدک ادب کیا روشنی ڈالتا ہے؟

8۔ ویدک دور کی ثقافت اور تہذیب و تمدن کے نمایاں خدوخال مختصر طور پر بیان کیجیے۔

چھٹا باب

زمانہ شجاعت

(Epic Age)

زمانہ شجاعت سے مراد وہ دور ہے جب ہندوؤں کی مشہور رزمیہ نظمیں رامائن اور مہابھارت لکھی گئیں۔ اس زمانے میں آریہ قوم تمام بھارت پر قابض ہو چکی تھی اور پنجاب اور سندھ اُن کی نظر میں اہم نہ رہے تھے زمانہ شجاعت کی تاریخوں کا صحیح تعین ناممکن ہے لیکن اکثر مورخین کا خیال ہے کہ زمانہ شجاعت قدیم آریاؤں کی رگ ویدک تہذیب کے فوراً بعد کا زمانہ ہے نیز زمانہ شجاعت مسیح کی پیدائش سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اس زمانہ کی تہذیب ویدک دور سے بالکل مختلف ہے۔

رامائن اور مہابھارت ہندوؤں کی (Epic Poems یا رزمیہ نظمیں ہیں۔ رزمیہ نظم میں قومی بہادروں کے کارناموں کا بیان ہوتا ہے اور ان کے پڑھنے سے قدیم روایات تازہ ہوتی ہیں۔ اور دلوں میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ ہندو علماء کا خیال ہے کہ رامائن اور مہابھارت میں بالکل سچے اور تاریخی واقعات درج ہیں۔ لیکن یورپ کے مورخ ان نظموں کو محض افسانہ سمجھتے ہیں۔

ہندو رامائن کو قدیم مانتے ہیں اور مہابھارت کے واقعات کو آریاؤں کے دور کے لحاظ سے متعلق سمجھتے ہیں یورپ کے بعض مورخ مہابھارت کو رامائن کی نسبت اہم مانتے ہیں۔ مشہور مورخ سمتھ صاحب کی رائے

یہ ہے کہ رامائن اور مہابھارت کے واقعات محض قصے کہانیاں ہیں۔ جن کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تمام واقعات تخیل کی پیداوار ہیں۔ جن پر ہر زمانے کے مصنفین اضافہ کرتے رہے۔ ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں نظمیں بے شک افسانوی ہیں۔ لیکن ان کتابوں کے پڑھنے سے ہندوؤں کے زمانہ شجاعت کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ عین اسی طرح جیسے کسی دور کے تاریخی ناول سے اُس زمانہ کی زندگی اور بود و باش کا پتہ چلتا ہے۔

رامائن:۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ کتاب رشی والمیکی جی نے لکھی اس کتاب میں چوبیس ہزار شلوک ہیں اور اس کے سات حصے ہیں کتاب کی ترتیب اور نفس مضمون پر نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ کتاب کے مصنف ایک سے زیادہ ہیں اور اس کی تکمیل میں کئی سو سال لگے۔ کتاب کے پہلے اور آخری حصے میں رام چندر کو اوتار گنا گیا ہے۔ اور بقایا پانچ حصوں میں محض ایک ہیرو گردانا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کا مصنف ایک شخص نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر میکڈانل اور جیکوبی کا خیال ہے کہ والمیکی جی نے اس کتاب کا کچھ حصہ ۵۰۰ ق م میں لکھا اور تین صدیوں تک مختلف لوگ اضافے کرتے رہے کتاب کا آخری حصہ ۲۰۰ ق م میں لکھا گیا۔

رامائن کی کہانی مختصر طور پر یہ ہے کہ رام چندر اور لچھمن اودھ کے راجہ دسرتھ کے بیٹے تھے اور کوشلیا کے بطن سے تھے رام چندر بہادری میں لاثانی اور اعلیٰ صفات کا مالک تھا۔ لہٰذا باپ نے اُسے یوو راج (ولیعہد) بنانا چاہا۔ لیکن رام چندر کی سوتیلی ماں کیکئی حسد سے جل گئی اور خاوند کو بات بتائے بغیر اس سے وعدہ لیا کہ دسرتھ اس کی ایک بات ضرور مانے گا۔

بعد میں کیکئی نے یہ شرط پیش کی کہ رام چندر کو چودہ برس کا بن باس دیا جائے اور اُس کی بجائے بھرت ولیعہد مقرر ہو۔ بن باس کے دوران میں رام چندر نے سوئمبر جیت کر بہار کے راجہ جنک کی خوبصورت لڑکی سیتا سے شادی کرلی تھی۔ باپ کے قول کو برقرار رکھنے کے لئے رام چندر بخوشی جلاوطن ہوگیا اور لچھمن نے بھائی کا ساتھ دیا۔

دونوں بھائی دکن ڈونڈوک بن میں جلاوطنی کے دن گذار رہے تھے کہ لنکا کے راجہ راون کی بہن نے ان دونوں بھائیوں کو دیکھ لیا اور اُس کے دل میں عشق کی چنگاری سلگ اُٹھی۔ رام اور لچھمن نے سروپ نکھا کی جانب التفات نہ کی کیونکہ وہ اعلیٰ خاندان سے نہ تھی۔ بلکہ لچھمن نے اس کی ناک بھی کاٹ لی۔ سروپ نکھا نے یوں بدلہ لیا کہ اپنے بھائی راون کو سیتا کے حسن و جمال کی داستان سُنا کر اُسے سیتا کو اغوا کر لینے پر اُبھارا۔ ایک روز رام چندر اور لچھمن کہیں گئے ہوئے تھے کہ راون سیتا کو زبردستی اُٹھا کر چلتا بنا۔

رام چندر نے سراغ لگایا کہ سیتا لنکا میں ہے چنانچہ دکنی حکمرانوں کی مدد سے لنکا فتح کیا اور سیتا کو لے کر واپس ہوئے۔ راون اور اس کے بھائی تلوار کے گھاٹ اُتارے گئے۔ اس دوران میں جلاوطنی کے چودہ سال گذر گئے تھے لہٰذا وہ اپنے باپ کی راجدھانی اجودھیا میں واپس آگئے بھرت نے بخوشی تخت اپنے بھائی کو دے دیا۔ لیکن عوام نے سیتا کی پاکدامنی پہ شک کیا۔ کیونکہ وہ راون کے قبضہ میں رہی تھی۔ اگرچہ رام چندر کو سیتا کے باعصمت ہونے کا یقین تھا اور وہ اُس وقت حاملہ تھی۔ لیکن رائے عامہ کے سامنے جھک کر اُسے جلاوطن کر دیا۔ سیتا جنگلوں کو چلی گئی۔

اور رشی والمیکی جی کے پاس پناہ لی - وہاں اس کے ہاں ایک ہی وقت میں دو بچے پیدا ہوئے ۔ اُن کی داستان کو رامائن کے نام سے لکھا گیا کچھ عرصہ کے بعد سیتا اور اُس کے بچوں کو واپس بلا لیا گیا اور رام چندر کافی عرصہ تک حکمران رہے ۔ رامائن کا ترجمہ دُنیا کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے ۔

مہا بھارت :- دہلی کے قریب ہستنا پور ریاست تھی ۔ جس پر پانڈو نامی ایک راجہ حکمران تھا ۔ اس کی وفات پر اُس کے پانچوں بیٹے نابالغ تھے ۔ اِس لئے اُن کے بالغ ہونے تک اُن کا چچا دھرت راشٹر حکمران بنا ۔ اُس نے اپنے بھتیجوں کو اعلیٰ تربیت دی اور اُن کے اتالیق آچاریہ نے اُن کو علم و فضل کے علاوہ جنگ میں بھی ماہر کر دیا ۔ یہ پانچوں بھائی پانڈو کہلاتے ہیں ۔ سب سے بڑے بھائی کا نام یدھشٹر تھا جسے چچا نے ولی عہد بنانا چاہا ۔

دھرت راشٹر کے سَو بیٹے تھے جو کورو کہلاتے ہیں ۔ ان میں سے سب سے بڑے لڑکے کا نام دریودھن تھا ۔ اس نے پانڈو شہزادوں کو جلاوطن کروا دیا اور ان کے خلاف کئی ایک سازشیں کیں ۔ اس دوران میں پانڈو شہزادہ ارجن فقیروں کے بھیس میں ریاست پنچال پہنچا اور سوئمبر جیتنے کے بعد وہاں کے راجہ کی خوبصورت لڑکی دروپدی سے شادی کی ۔ ماں کے قول + مدد سے پانڈو شہزادوں نے نصف ریاست کوروؤں سے واپس لے لی اور اندر پرست کے مقام پر اپنی راجدھانی قائم کی ۔ لیکن دریودھن نے یدھشٹر کو قمار بازی میں پھانس لیا اور یدھشٹر نے مال و دولت اور ریاست کے علاوہ دروپدی کو بھی جوئے میں ہار دیا ۔ بعد میں یہ طے ہوا ۔

+ ... پانچوں بھائیوں نے دروپدی سے شادی کی ۔ دروپدی کے والد کی

کہ پانڈوں شہزادوں کو بارہ برس کے لئے بن باس ملے اور اس دوران میں ریاست پر کورو حکمران رہیں۔

جلا وطنی کا عرصہ گذارنے کے بعد جب پانڈو واپس لوٹے تو کوروؤں نے ان کی سلطنت لوٹانے سے انکار کر دیا۔ اس پر دونوں میں جنگ چھڑ گئی جس میں دونوں پارٹیوں کے حلیف راجاؤں نے بھی حصّہ لیا۔ کوروکشیتر کے میدان میں اٹھارہ دن تک جنگ ہوتی رہی۔ کورو تمام کے تمام مارے گئے، اور پانڈو فتحیاب ہو کر کافی عرصہ بھارت پر حکمران رہے۔

کرشن مہاراج :۔ سری کرشن ارجن کے رتھ بان کا نام ہے۔ کوروکشیتر کے میدان میں ارجن جنگ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ کیونکہ مخالف صفوں میں اس کے کئی عزیز۔ دوست اور اُستاد تھے۔ ارجن کا خیال تھا کہ عزیز و اقارب کا خون گرانے کے بعد فتح حاصل کرنا اچھی بات نہیں۔ اس کے برعکس کرشن جی نے ایک طویل بحث میں ارجن کو جنگ کے لئے اُبھارا۔ مہابھارت کا یہ حصّہ بھگوت گیتا کہلاتا ہے۔ اس میں کرشن نے جنگ کا فلسفہ یہ بیان کیا ہے کہ انسان کو ہر حالت میں اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ دھرم کے لئے جو جنگ لڑی جائے اُس میں ذاتی تعلقات رکاوٹ کا باعث نہیں بن سکتے۔ موت بے حقیقت ہے۔ جسم سے علیحدہ ہو کر بھی رُوح باقی رہتی ہے۔ انسان کو موت سے ڈرنا نہیں چاہیئے بلکہ اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ بھگوت گیتا فلسفیانہ نظم ہے ہندو بھگوت گیتا کو مذہبی خیالات کی بنیاد سمجھتے ہیں اور اُسے پڑھنے کے بعد جوش و خروش میں بھر جاتے ہیں۔

مہابھارت میں ایک لاکھ کے قریب شلوک ہیں اور اس کے اٹھارہ حصّے ہیں۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ پنڈت ویاس اس کتاب کا مصنّف

تھا - لیکن زبان - مضمون کی ترتیب وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل میں کئی مصنفین نے حصہ لیا اور اس پر کافی عرصہ صرف ہوا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ۵۰۰ ق - م اور ۲۰۰ ق - م کے درمیانی عرصہ میں یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی - بعض مورخین کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مہا بھارت کسی حقیقی جنگ عظیم سے متاثر ہو کر لکھی گئی لیکن کتاب کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام واقعات میں تخیل کو بہت بڑا دخل ہے۔

زمانۂ شجاعت میں تہذیب و تمدن!

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ رامائن اور مہا بھارت اگرچہ افسانوی حیثیت رکھتی ہیں لیکن ان دونوں رزمیہ نظموں سے زمانۂ شجاعت کی تہذیب و تمدن پر کافی روشنی پڑتی ہے - یہ وہ زمانہ تھا جب آریاؤں کو اس برصغیر میں آتے صدہا سال گذر چکے تھے - اور ویدک تہذیب ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوتے بدل چکی تھی - آریہ قوم پنجاب اور سندھ سے آگے بڑھ کر گنگا جمنا کے میدانوں پر قابض ہو چکی تھی - بلکہ آریاؤں کی بڑھتی ہوئی آبادی نے جنگلوں کو صاف کر کے کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں - یہ راجہ ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لئے باہمی جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے - لہٰذا اس دور کو زمانۂ شجاعت کہتے ہیں رامائن اور مہا بھارت کے واقعات قصے کہانیاں سہی لیکن ان سے لوگوں کی سیاسی - مذہبی اور معاشرتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور محض اسی غرض کے لئے ان نظموں کی تاریخ میں اہمیت ہے زمانۂ شجاعت میں ہندوؤں کی تہذیب و تمدن کے حالات درج ذیل ہیں :-

سیاسی حالت :- اس دور میں قبائلی حکومتیں مفقود تھیں اور ان کی بجائے

موروثی راجے ملک کے مختلف حصوں میں حکمران تھے۔ سمتی اور سبھا متروک ہو چکی تھیں۔ اور راجہ امور سلطنت میں درباری امرا اور اپنے رشتہ داروں کے سوا کسی کی بات نہ سنتا تھا۔ غیر آریہ قومیں پوری طرح سے مغلوب ہو چکی تھیں۔ لیکن آریاؤں کے درمیان جنگ و جدل عام تھی۔ آس پاس کے راجاؤں کو باجگذار بنانے کے بعد ایک رسم منائی جاتی تھی جسے اشو مدھیہ یگیہ (گھوڑے کی قربانی) کہتے تھے۔ گھوڑے کی قربانی کرنے والا حکمران اپنے آپ کو مہاراجہ کہتا تھا۔ لیکن برصغیر ہند و پاکستان میں کئی حکمران اپنے آپ کو مہاراجہ کہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرکزی طاقت مفقود تھی یعنی چکرورتی (تمام ملک کا حاکم) کوئی بھی نہ تھا۔ راجہ کے محل بنا ہوا تھا۔ جہاں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ شراب۔ موسیقی اور جوا راجہ کیلئے تفریحات تھیں راجاؤں کو پہلوانی کا بھی شوق تھا۔ جنگ کے موقع پر راجہ ہی فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا۔ درباری امرا سپہ سالار پروہت اور ولی عہد کے علاوہ وزرا بھی شاہی مشورہ میں شامل ہوتے تھے وزرا علم و فضل میں باکمال ہوتے تھے اور ان کو منتری پریشد کہتے تھے۔ مختلف ذاتوں کے حقوق کا خیال رکھا جاتا تھا۔ فوجی سپاہی صرف کشتری ہوتے تھے۔ پیدل فوج موجود ہوتی تھی۔ لیکن میدان جنگ میں گھوڑے۔ رتھ اور ہاتھیوں کو کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ تلوار اور نیزے کے علاوہ چکر کو بھی جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا گاؤں میں ابھی تک گرامانی ہی اعلیٰ حاکم تھا۔ مقامی انتظام کے لئے مکمل طور پر حاکم کو آزادی تھی۔ جج خاص طور پر انصاف کرنے والے اور با اختیار ہوتے تھے۔ ملک بھر میں مالیہ کی ایک ہی شرح تھی یعنی پیداوار کا ۱/۶ حصہ۔ حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ یہی مالیہ تھا۔ پنچایتوں کو کافی سے

زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

سوشل حالات:۔ عوام سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ایمانداری اور قناعت ہی ان کی خوشبیوں کا دارومدار تھا۔ گوشت خوری بند ہو چکی تھی۔ لوگوں کی خوراک گندم۔ جو۔ چاول سبزیاں اور دودھ وغیرہ پر مشتمل تھی۔ ذات پات کا نظام مکمل طور پر رائج ہو چکا تھا۔ برہمنوں کی فوقیت تھی اور شودر کیلئے زندگی ایک مصیبت تھی سوئمبر کی رسم عام تھی یعنی اعلیٰ خاندان کی لڑکیاں اپنی مرضی کے خاوند سے شادی کرتی تھیں عوام ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتے تھے۔ لیکن راجے اور امرا کئی بیویاں رکھ سکتے تھے۔ مثلاً راجہ دسرتھ اور کوروں کے باپ راجہ دھرت راشٹر کی ایک سے زیادہ بیویاں تھی مہابھارت سے واضح ہے کہ بعض بڑے گھرانوں میں (Polyandry) بھی رائج تھی۔ یعنی ایک ہی وقت میں ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے تھے۔ یہ رسم اب تک کانگڑہ اور کلو کے پہاڑی علاقوں میں رائج ہے۔ شہر۔ خندق اور فصیلیں عام ہو چکی تھیں۔ تبادلہ اشیاء کی بجائے نقدی رائج ہو چکی تھی۔ لکھنا پڑھنا اور علم صرف برہمنوں تک محدود تھا۔ لوگوں نے کپڑے سینا ابھی نہیں سیکھا تھا۔ لوگ مہمان نواز تھے۔ لیکن جوئے کی رسم عام تھی۔

مذہبی حالات:۔ ویدک دور کے سادہ مذہب اور طرز عبادت کی بجائے پیچیدہ مذہبی رسومات وجود میں آ چکی تھی برہمنوں کی فوقیت مذہب کو اور بھی پیچیدہ بنانے کا باعث ہوئی۔ مندر بن چکے تھے۔ بت سازی اور بت پرستی عام تھی مناظر قدرت کی۔ پرستش گھٹتی جا رہی تھی ذات پات مذہب کا لازمی حصہ بن چکی تھی۔ عورت کا درجہ دن بدن گھٹ رہا تھا۔ ورجنوں نئے دیوتا پیدا ہو چکے تھے۔ کئی بہادر انسانوں کو اوتار سمجھا جاتا تھا،

اور بعد میں انکو دیوتا بنا دیا جاتا تھا۔ ویدک دور کے دیوتاؤں کو لوگ بھول چکے تھے اور ان کی جگہ نئے دیوتاؤں نے لے لی تھی۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے رسومات پر کافی خرچ کرنا پڑتا تھا۔ برہما۔ وشنو شیوا اور گنیش نئے خداؤں میں اہم ترین تھے برہما پیدا کرنے والا تھا۔ وشنو پالنے والا اور شیوا برباد کرنے والا۔ شیوا کو مہادیو بھی کہتے تھے۔ اس کی بیوی ایک مشہور دیوی تھی جسے پاروتی مہارانی یا کالی یا درگا بھی کہتے تھے گنیش ایک رحم دل اور مہربان دیوتا تھا۔ جو درگا اور مہادیو کا فرزند تھا۔ گنیش کا سر ہاتھی جیسا ہے اور دنیا کی بہبودی کے لیے انسان کے روپ میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتا ہے۔ ہندو اسے اوتار کہتے ہیں Theory of Incarnation رام چندر اور کرشن کو ہندو آج تک اوتار سمجھ کر پوجتے ہیں۔ مسئلہ تناسخ یعنی جون بدلنے کا خیال (آواگون کا چکر) رائج ہو چکا تھا اور عوام اہنسا کے بھی بندریج قائل ہو رہے تھے اسی بنا پر گوشت خوری ختم ہو رہی تھی۔ اس دور کے مذہب کو مورخین نے برہمن مت (Brahmanism) کا نام دیا ہے۔

قدیم آریاؤں سے متعلق چند اصطلاحات

رگ ویدک تہذیب کا دور آریاؤں کی قدیم ترین تہذیب کا زمانہ گنا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ دور ہے جب چاروں ویدوں کی تکمیل ہوئی اور ہندوؤں کی ان مقدس کتابوں کا متن موجودہ صورت میں لکھا گیا۔ ہندو مورخین اس زمانے کو سمیتا (Samhita) کہتے ہیں۔ رگ وید کے کل منڈل یا ابواب دس ہیں۔ جن میں ۱۰۲۸ بھجن ہیں۔ مورخین کا خیال ہے کہ پہلا اور دسواں باب کافی بعد میں لکھ کر رگ

ویدکے متن میں شامل کر دیا گیا۔ دوسرے باب سے لیکر نواں باب رگ وید کا اصلی قدیم ترین متن ہیں۔

سام وید سیمتا میں صرف منتر موجود ہیں جن کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ یہ منتر ۱۵۴۹ء ہیں لیکن بعض لوگ ان منتروں کی تعداد ۱۸۱۰ سمجھتے ہیں۔ سام وید سمہتا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذات پات وجود میں آچکی تھی اور قربانیوں کے موقع پر برہمنوں کے گون سے بھجن گانے پڑتے تھے۔ اس متن سے موسیقی کی جانب ہندوؤں کی رغبت بھی عیاں ہے

اتھر وید سیمتا کے بیس حصے ہیں جن میں ۷۳۱ بھجن ہیں۔ یہ چیز کافی دلچسپ ہے کہ اتھر وید میں محض وہ منتر درج ہوئے ہیں جن کی بدولت روحوں اور شیطانی طاقتوں پر قابو پا جانے کی ترکیب بتائی گئی ہے پس سمیتا سے مراد ویدوں کے متن یا تحریر شدہ عبارت ہے۔ چونکہ ویدوں کی تحریر میں طویل عرصہ صرف ہوا۔ اس لئے سمہتا یعنی مختلف ویدوں کے متن کے مطالعہ سے ہندو سوسائٹی کے ارتقاء کا پتہ چلتا ہے۔

سمہتیا ویدوں کا قدیم ترین حصہ ہے۔

۲۔ برہمانا (Brahmana) تاریخی لحاظ سے ویدوں کا یہ حصہ سیمتا (یعنی اصلی متن) کے بعد لکھا گیا۔ برہمانا میں قربانیوں کی تشریح کی گئی ہے۔ اور مختلف رسومات کو واضح کیا گیا ہے۔ یعنی برہمنوں کے اقتدار کا زمانہ ویدوں کے اس حصے سے ظاہر ہوتا ہے ہر وید کی سمہتیا کے بارے میں تشریحات برہمانا کی صورت میں موجود ہیں۔

برہمانا سے ہمیں غیر آریائی آبادی کے متعلق کافی معلومات میسر ہوتی ہیں۔ برہمانا سے پروہتوں کے مختلف فرقوں پر روشنی پڑتی ہے اور

ثقافتی ترقی کا ثبوت ملتا ہے۔ مشہور مورخ میکس ملر کا قول ہے۔ کہ برہمانا کے دس صفحے پڑھنا بھی عذاب ہے کیونکہ ان میں مہمل اور دھکی بھیکی مذہبی باتوں کے سوا کچھ نہیں۔ "Simply twaddle, a mere theological twaddle." بعض جرمن مورخین کی رائے یہ ہے کہ برہمانا کے مطالعہ سے ہندوستان کے مذہبی خیالات کے ارتقاء کا پتہ چلتا ہے اور تاریخ مذہب میں برہمانا کی اہمیت کم نہیں ہیں ویدوں کے یہ حصے بیکار نہیں۔

۳۔ ویدوں کے تیسرے حصے کی تدوین پر طویل مدت صرف ہوئی۔ اس دور کو مجموعی طور پر تین مختلف اصطلاحات سے یاد کیا جاتا ہے (۱) آریانکا (ب) اپنشد اور (ج) سوتر ان تینوں حصوں کو مقدس گنا جاتا ہے۔ برہمن اس بات پر زور دیتے ہیں کہ صرف جنگل میں جاکر پوتر فضا پڑھے جائیں۔ دراصل آریانکا سے مراد ویدوں کے وہ حصے ہیں جہاں برہمانا کا خاتمہ ہوا لیکن متن کی تشریحات لکھنے والوں نے چند فلسفیانہ باتوں کو ان سادھوؤں کے لئے علیحدہ لکھ ڈالا جو جنگلوں میں مقیم ہو کر عبادت کرتے تھے آریانکا میں رسومات کا ذکر نہیں ملتا بلکہ فلسفیانہ اور متصوفانہ خیالات کی بھرمار ہے

اپنشد سے مراد ویدوں کے وہ فلسفیانہ حصے ہیں جو رشیوں اور منیوں (SAINTS) نے ۸۰۰ ق م سے تیکز ۵۰۰ ق م تک لکھے اپنشد کی کل تعداد ۱۰۸ ہے اور آخر کار ہندوؤں کے فلسفہ کی چھ شاخیں بن جاتی ہیں جن کو چھ درشن کہا جاتا ہے۔ اپنشدوں کا بنیادی، فلسفہ آتما کے متعلق ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ انسانی ذہن سے حقیقت کا ادراک ممکن نہیں۔ اصلی علم رشیوں کے ذریعے حاصل ہوتا

ہے ایشور کو پہچاننے سے نجات حاصل ہوتی ہے بلکہ انسان خود دیوتا یا ایشور کا روپ بن جاتا ہے ہندو فلسفہ میں بعض لوگ تپسیا یا ریاضت کو ذریعہ نجات گنتے ہیں اور مذہبی رسومات پر زور دیتے ہیں۔ ہندو فلسفے کی چھ اقسام ہیں۔

(۱) سانکھیہ درشن اسے کپل منی نے لکھا تھا۔ وہ خدا کی ہستی کا منکر تھا

(۲) یوگ درشن اس کی بنیاد پتنجلی نے ڈالی۔ اس کا خیال تھا کہ آوا گون (یا جون بدلنے کے چکر) سے نجات محض یوگ یا شدید ریاضت اور پاکیزگی خیال سے ممکن ہے۔

(۳) نیائے درشن اس کا مصنف گوتم تھا۔ اس میں منطقی طریقے سے انسانی روح خواہشات۔ شکوک اور دیگر امور پر بحث کی گئی ہے نیائے درشن میں ایشور یعنی خدا کو علم کا اصلی سرچشمہ قرار دیکر نجات پر زور دیا گیا ہے۔ نیائے درشن کا مصنف بدھ مت کی ابتدا سے کافی عرصہ پہلے ہو گزرا ہے۔

(۴) ویشیشگ درشن۔ اس کا بانی رشی منی کنار تھا۔ وہ خدا کے بارے میں خاموش تھا۔ لیکن فلسفیانہ بحث میں الجھ کر کوئی واضح نتیجہ بھی برآمد نہیں کر سکا۔

(۵) پورو امیمانسا درشن۔ اس کا بانی جے مینی تھا۔ اس میں فلسفیانہ بحث سے ویدوں کے تقدس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مذہبی رسوم پر زور دیا گیا ہے روایتی کی زندگی یا کرم دھرم کی تعریف کی گئی ہے

۶ اُتر میمانسا درشن۔ اس کا مصنف مشہور رشی دیاس جی تھا۔ جسے بدریان بھی کہتے ہیں اس نے انسانی روح اور دنیا سے اس کے تعلق کے بارے میں بحث کی ہے اور بعد از حیات روح کی حالت واضح کرنے

کی کوشش کی ہے۔

سوتر :۔ زمانۂ شجاعت سے قبل سوتر لکھے گئے جن سے مراد وہ ہدایات ہیں جو مختصر لیکن جامع الفاظ میں زبانی یاد کرنے کے لئے لکھی گئیں سوتروں کی تصنیف کا زمانہ مقرر نہیں کیا جاسکتا لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ سوتر ۸۰۰ ق۔م سے لیکر ۲۰۰ ق۔م تک لکھے گئے۔

سوتر کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) گرھیہ سوتر۔ ان میں تمام رسومات کا ذکر ہے جو پیدائش سے لیکر مرتے دم تک انسان کے لئے لازمی ہیں۔

(ب) شروتہ سوتر :۔ ان میں یگیہ کے متعلق ضروری رسومات ویدوں کی روشنی میں درج ہیں۔ اشومیدھ یگیہ (مہاراج ادھیراج بننے کے لئے گھوڑے کی قربانی) کی رسومات بھی ان سوتروں میں درج ہیں۔

(ج) دھرم سوتر۔ ان سوتروں میں آریہ قوم کے حکمران کے فرائض وراثت کے قاعدے اور دیگر سماجی امور کا ذکر ملتا ہے نیز پیدائش سے لیکر موت تک انسان کے چالیس فرائض یا اعمال (سنسکار) کی تفصیل دی گئی ہے۔

وید انگ :۔ ویدوں کو سمجھنے کے لئے فنی امور کے علم کو وید انگ کہتے ہیں۔ اس علم یعنی وید انگ میں چھ چیزیں شامل ہیں اور ہر ایک کے بارے میں علمی ذخیرہ موجود ہے وید انگ کے یہ چھ حصے مندرجہ ذیل ہیں:

۱ سکشا۔ یعنی ویدوں کے منتروں کے صحیح تلفظ کے اصول۔

۲۔ چھند۔ یعنی اوزان اور عروض کا علم۔

۳ دیاکرن یعنی صرف ونحو (گرامر) کا علم اس بارے میں بہترین کتاب پانینی (Panini) کی ہے یہ کتاب معلومات کا ذخیرہ ہے اور اس سے

سیاسی اور سماجی معلومات بھی اخذ کی جاتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پانینی ساتویں صدی قبل مسیح میں ہو گزرا ہے اس نے صرف و نحو کی بدولت سنسکرت زبان کو برصغیر کی اہم ترین زبان بنا دیا۔

(۴) نگھنٹو دیدوں کے مختلف الفاظ کے معانی تلاش کرنے کے اصول ہیں۔

۵ کلپ:۔ مذہبی امور کی جانچ پڑتال کے اصول۔

۶ علم نجوم کے سوتر۔ ان تحریروں میں سے بعض بالکل مبہم ہیں ان کو شرح کے بغیر سمجھنا دشوار ہے۔

ان تمام فنی اصولوں یعنی دیدانگ کا مقصد محض یہ ہے کہ دیدوں کی تفہیم میں آسانی رہے۔

دھرم شاستر

زمانہ شجاعت کے بعد دھرم شاستروں کا دور شروع ہوا۔ یعنی دھرم سوتروں کو سامنے رکھ کر ہندو علماء یا رشی منیوں نے دھرم شاستر تصنیف کئے جن میں مذہبی اصولوں کو مجتمع کیا گیا۔ دھرم شاستر چار ہیں لیکن ان میں سے منوجی کا دھرم شاستر مشہور ترین ہے اسے منوسمرتی بھی کہتے ہیں۔ انگریزی دور میں بھی اسے ہندومت کے بنیادی قوانین کا مجموعہ قرار دیا گیا۔ منوجی نے ذات پات۔ مذہبی رسوم وراثت سے متعلق بنانے کے طویل قاعدے اور اصول جمع کر کے ہندو قوانین کا کوڈ (CODE) تیار کر دیا ہے اس نے پہلی بار ذات پات کے بندھن غیر لچکدار بنا دیئے۔ اس کے علاوہ اس نے انسانی زندگی کے چار آشرم بنائے ہیں۔

۱ برہمچاری: ہر انسان کو چاہیئے کہ بچپن سمیت زندگی کے ابتدائی چوبیس برس حصول علم پر صرف کرے۔ نفسانی اور شہوانی خواہشات سے باز رہے

اور استاد کی خدمت میں حاضر رہ کر پاکیزہ زندگی بسر کرے یعنی تکمیل علم کے لئے ضبط نفس لازم ہے۔

۲ گرہست :- حصول علم کے بعد زندگی کا دوسرا دور پچیس برس سے لیکر پچاس برس تک ہے۔ اسے گرہست آشرم کہتے ہیں۔ اس دور میں انسان شادی کر کے زندگی کے مزے لوٹے روزی کمائے اور بال بچوں کی تربیت پر متوجہ ہو۔ زندگی کا یہ بہترین دور ہے۔ لہذا انسان کو چاہئے کہ برہمنوں کو دان دینے کے علاوہ نیک کام کرے اور مہمانوں کی خاطر تواضع کرے نیز طالب علموں کی ہر ممکن مدد کرے۔

(۳) بان پرستھ آشرم :- پچاس برس کی عمر پر انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ تارک الدنیا ہو کر جنگلوں کو نکل جائے۔ وہاں اسے چاہیے کہ انسانی خواہشات ترک کر کے جنگلی پھلوں پر گزارہ کرے۔ اور عبادت میں مگن رہ کر گیان دھیان حاصل کرے۔

۴ سنیاس آشرم :- ستر یا پچھتر برس کی عمر کے بعد انسان کو چاہیئے کہ سنیاسی بن کر مختلف مقامات میں گھومتا رہے۔ اپنی عقل و دانش اور زندگی کا نچوڑ لوگوں کو بتائے۔ خاص طور پر تپسیا کی بدولت حاصل کردہ علم و عرفان لوگوں میں پھیلائے۔ مرتے دم تک وہ لوگوں کی راہنمائی کرے لیکن جاہ طلب نہ بنے۔

گویا منوجی کے دھرم شاستر میں ہر انسان کی اوسط زندگی سو سال شمار کی گئی ہے۔ منوجی کے دھرم شاستر کے مطالعہ سے ہندوؤں کے مذہب کی تمام تفصیلات رسوم اور بنیادی عقائد کا پتہ چل جاتا ہے

Typical Questions

Q. 1. Describe briefly the political, social and religious life of the people of the Epic Age.

Q. 2. Describe briefly the social and political condition of India as depicted in the Ramayana and Mahabharta. How does it differ from the state of Society in Vedic times?

Q. 3. Discuss the historical importance of the Ramayana and the Mahabharta. What light do they throw on the social, political and religious conditions of thos times?

Q. 4. Write a brief account of the social, political and economic condition of India during the Epic Age.

امتحانی سوالات

۱۔ زمانہ شجاعت میں برصغیر ہندو پاکستان کے لوگوں کی سیاسی سماجی اور مذہبی زندگی کا حال بیان کیجئے۔

۲۔ رامائن اور مہابھارت میں بیان کردہ قدیم ہندوستان کی سماجی اور سیاسی زندگی کی وضاحت کیجئے۔ ویدک دور کی سوسائٹی کا فرق اس دور کے حالات سے کس قدر مختلف تھا۔

۳۔ رامائن اور مہابھارت کی تاریخی اہمیت پر تبصرہ کیجئے۔ ان کتابوں سے اس دور کے سماجی۔ سیاسی اور مذہبی حالات پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

۴۔ زمانہ شجاعت میں ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی حالت کیا تھی؟ اس پر ایک شذرہ منضبط تحریر میں لائیے۔

ساتواں باب

ذات پات کی تمیز

ذات پات کی تمیز نے ہندوؤں کو ازحد نقصان پہنچایا ہے قومی شیرازہ بکھیرنے کے علاوہ ذات پات نے انسانیت سوز مظالم ڈھائے اور انسانی برابری (Equality.) کو ختم کر کے رکھ دیا ذات پات نے ہندوؤں میں نفاق کا ایسا بیج بویا کہ انہیں کبھی بھی اپنے دشمنوں کے خلاف فتح نصیب نہ ہوئی مہاتما گاندھی جیسا لیڈر بھی اپنی دن رات کی کوششوں کے باوجود ذات پات کی تمیز کو ختم نہ کر سکا۔ ہندوؤں کی چار بڑی ذاتیں یا برن ہیں:۔

(۱) برہمن ۔ (۲) کھشتری ۔ (۳) ویش ۔ (۴) شودر

لیکن یہ ذاتیں دن بدن نشو و نما پاتی رہتی ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی رہتی ہے۔ جب ایک ذات کا شخص کسی دوسری ذات میں شادی کرے تو ایک نئی ذات پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آج کل ہندوؤں میں، 2378 چھوٹی چھوٹی ذاتیں ہیں۔ پس ذات پات کی تمیز نے ہندو سوسائٹی کے اتحاد کا خاتمہ کر ڈالا ہے۔

"Caste has divided Hindu Society into water-tight compartments".

رگ وید میں ذات پات کا ذکر نہیں ملتا اس کے علاوہ تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ ذات پات زمانہ شجاعت کی پیداوار ہے یعنی مسیح کی پیدائش سے تقریباً ۲۰۰۰ سال پہلے ذات پات کا آغاز ہوا۔ اور ۱۰۰۰ ق م میں ذات پات

کے بذریعہ حتمی صورت اختیار کر گئے تھے اب ہندو سوسائٹی کا تصور ذات پات کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا مورخین کا خیال ہے۔ کہ ذات پات کے دور رس لیکن خاموش اثرات ہوئے ہیں۔

"Caste has played a great but silent part in Indian history.

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذات پات کی ابتدا کیسے ہوئی اس کے متعلق علما کے کئی ایک نظریئے ہیں بیشتر اس کے کہ ہم ان نظریوں کو جانچیں مختلف ذاتوں کے فرائض جاننا لازم ہے۔

برہمن۔ ہندو سوسائٹی میں برہمنوں کو بلند ترین مقام حاصل ہے دماغی کام اور علم پڑھنا پڑھانا صرف برہمنوں کی اجارہ داری ہے مذہبی رسوم کی ادائیگی اور پروہت کا کام صرف برہمن ہی کر سکتا ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ تخلیق عالم کے وقت برہمنوں کا گروہ برہما یا برہمو (خدائے آفریننده) کے منہ سے نکلا لہٰذا ان لوگوں کو سوسائٹی کے باقی افراد پر خداداد اور پیدائشی فوقیت ہے برہمن ہمیشہ پوتر ہے اور قابل عزت ہے اس کی ہستی دیوتا کے مانند ہے۔

کشتری:۔ وہ گروہ جو جنگ و جدل میں مصروف رہے اور ملک کو دشمنوں سے بچائے رکھے وہ ہندو سوسائٹی میں دوسرے درجے پر ہے یہ لوگ کشتری کہلاتے ہیں۔ مذہبی نکتہ نگاہ یہ ہے کہ کشتری برہمو کے بازو کے نیچے سے پیدا ہوئے لہٰذا ان کا کام یہ ہے کہ سوسائٹی کے بازوئے شمشیر زن بنیں ملکی حکومت بھی کشتریوں کی ذمہ داری پر ہے اگر سوسائٹی میں مذہبی رجحانات زوروں پر ہوتے تو برہمن حکمران بنتا تھا ورنہ راجہ ہمیشہ کشتری جماعت سے تعلق رکھتا تھا

ویش:۔ مندرجہ بالا دو ذاتوں کے علاوہ تمام آبادی لوگ ویش طبقے میں

یس شامل ہیں اس گروہ میں تمام زراعت پیشہ اور تاجر لوگ شامل تھے ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ فرقہ برہمو کے پیٹ سے نمودار ہوا۔ اسی لیے معاشی ضروریات بہم پہنچانا اس گروہ کا فرض ہے۔ دلیش لوگ قومی خطرے کے باوجود الگ بیٹھے تماشا دیکھتے تھے اور کبھی بھی وطن کی حفاظت کے لیے سر بکف نہ ہوتے تھے

شودر:۔ سوسائٹی میں سب سے نچلا طبقہ یہی تھا ان کا کام اعلےٰ ذات کے لوگوں کی خدمت کرنا ہے ہندوؤں کا نظریہ ان کے بارے میں یہ تھا کہ شودر برہمو کے پاؤں تلے سے نکلے ہیں لہٰذا ان کا فرض ہے کہ سوسائٹی کا بوجھ اٹھائیں، عام طور پر اس برصغیر کے اصلی باشندوں اور غیر آریہ لوگوں کو شودر کا درجہ دیا گیا تھا شودر کے کوئی حقوق نہ تھے ان کو جانوروں سے بھی گھٹیا رذیل اور کمینہ سمجھا جاتا تھا۔ اعلےٰ ذات کے لوگ ان کے سائے سے بھاگتے تھے شودر سے ہر ذات والا اچھوت جیسا رکھتا تھا شودر کو شہر میں رہنے کی اجازت نہ تھی ان کی آبادی آریاؤں کی آبادی سے کچھ فاصلے پر الگ تھلگ ہوتی تھی۔ وید یا کسی اور مقدس کتاب کا لفظ بھی شودر کے ناپاک کانوں میں پڑ جاتا تو کھولتا ہوا سکہ اس کے کانوں میں ڈال دیا جاتا بیچارہ شودر چپ چاپ انسانوں کے ہاتھوں ظلم سہتا تھا اور کہیں بھی اس کی داد رسی نہ تھی نچلی ذات کے تمام لوگوں کے لیے ترقی کے دروازے بند تھے ہندو سوسائٹی میں حریت، اخوت اور مساوات نام کو نہ تھی۔

ذات پات کی ابتدا

Origin

ذات پات کی تمیز کیسے شروع ہوئی اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں

کہا جا سکتا رگ وید کے زمانے میں اگرچہ پروہت شروع ہو چکے تھے لیکن ذات پات کی تمیز نہ تھی لیکن زمانہ شجاعت میں ذات پات باقاعدہ طور پر وجود میں آ چکی تھی اور ایک ذات کے شخص کے لئے دوسری ذات میں شادی بیاہ کر لینا ناممکن ہو چکا تھا ذات پات کی ابتدا کے بارے میں کئی ایک نظریئے ہیں جنہیں ہم مختصر طور پر جانچیں گے۔

۱۔ **مذہبی نکتہ نگاہ:**۔ ہندوؤں کی مذہبی تھیوری یہ ہے کہ برہمو نے جب دنیا کو پیدا کیا تو برہمن اس کے منہ سے برآمد ہوئے۔ کشتری اس کے بازو کے نیچے سے پیدا ہوا، ویش اس کے پیٹ سے نمودار ہوا، اور شودر اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل کر عالم وجود میں آئے اسی نسبت سے ان کے فرائض مقرر ہوئے اور انسانی گروہ بندیاں ہوئیں یعنی ذات پات خداداد چیز ہے اور یہ خدائی بانٹ ہے اس میں ظلم کی کوئی بات نہیں انسان کو خدا جس حالت میں رکھے اسی میں خوش رہنا چاہیئے اور حکمت خداوندی پر شاکر رہنا چاہیئے۔

مورخین اس نظریئے کی حمایت نہیں کر سکتے کیونکہ یہ محض مذہبی ضعیف الاعتقادی پر مبنی ہے تاریخی شواہد اس کے خلاف ہیں مثلاً رگ وید کے دور میں اس قسم کی گروہ بندیاں غائب تھیں۔

۲۔ **فاتح اور مفتوح کا فرق:**۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ آریہ لوگ جب برصغیر ہندو پاکستان میں وارد ہوئے تو کچھ لوگ مغلوب ہو کر ان کے مطیع ہو گئے اور کچھ آخر دم تک لڑتے رہے ان کو آریہ لوگوں نے آخر کار اپنا غلام بنا لیا۔ اور انہیں شودر کا درجہ دیا۔ آریاؤں نے بطور فاتح اپنے آپ کو اعلیٰ ذات کا گنا۔ اور مطیع لوگوں کو اپنے سے کم درجہ دیا اس نظریئے کی معقولیت سے انکار نہیں لیکن مؤرخ زیادہ تر اس کے حامی نہیں ہیں۔

۵۔ **رنگ کا فرق:۔** بعض مؤرخ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آریہ لوگ سفید فام اور خوش شکل تھے جب اس برصغیر پر حملہ آور ہوئے تو وہ اپنے ساتھ عورتوں کی بہت کم تعداد لائے تھے مجبوراً انہیں مقامی لوگوں میں شادیاں کرنی پڑیں۔ اور اس ملاپ سے سانولی رنگ کی نسل پیدا ہوئی پس تین طبقے بن گئے۔ پہلا طبقہ خالص آریائی خون تھا۔ یہ لوگ سفید فام اور دراز قد تھے اور نجیب الطرفین ہونے پر فخر کرتے تھے۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو دیسی اور آریائی خون کی آمیزش تھے اور سانولے رنگ کے تھے ان کی عزت و توقیر خالص آریاؤں سے کم تھی نچلا طبقہ کالے رنگ کے دیسی لوگوں کا تھا۔ شروع میں رنگ کے فرق پر تین ذاتیں قائم ہوئیں پھر اعلیٰ طبقہ برہمن اور کشتری میں منقسم ہو گیا موجودہ نظریہ یہ ہے کہ محض رنگت کا فرق ذات پات کی تمیز کا باعث نہیں ہو سکتا۔

۴۔ **پیشوں کی تقسیم:۔** ذات پات کے آغاز کا ایک نظریہ ہے کہ جوں جوں آریاؤں کی تہذیب و تمدن نے ترقی کی سوسائٹی مختلف پیشوں میں منقسم ہو گئی مختلف پیشہ وروں کی حد بندیاں قائم کیں جو بعد میں مستقل صورت اختیار کر گئیں یہ نظریہ اور رنگت کے فرق کا نظریہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور ان دونوں کے خلاف ایک ہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ ذات پات محض ایک ہی وجہ سے اس قدر گہری اور مستقل صورت اختیار نہیں کر سکتی جو کہ ہر زمانے میں ذات پات نے ہندو سوسائٹی پر خاموشی کے ساتھ گہرا اثر ڈالا ہے۔ لہٰذا اس کے ارتقاء میں کئی صدیاں صرف ہوئی ہوں گی۔

۵۔ **تاریخی نظریہ:۔** (Evolutionary Theory) ذات پات کے بارے میں جدید نظریہ یوں ہے کہ ذات پات مسئلہ ارتقاء کے مطابق آہستہ آہستہ ترقی پذیر ہوتی گئی حتیٰ کہ چار بڑی ذاتیں منوجی کے زمانے

تک وجود میں آگئی ذات پات کی اصل اور ابتدا خواہ پردہ تاریکی میں ہو۔ لیکن مورخین کا خیال ہے کہ مختلف عناصر ذات پات کو موجودہ شکل دینے میں اثر انداز ہوئے، مذہب کے بغیر سوسائٹی کا قیام ممکن نہیں لہٰذا قدیم زمانے میں مذہبی جماعت کو فوقیت دی گئی اور اس سے برہمن ایک الگ ذات بن گئے۔ اور اسی بنا پر برہمنوں کو ہندوؤں میں سب سے بلند ترین درجہ دیا گیا۔ فاتح اور مفتوح کے فرق نے کشتری اور غیر کشتری کی تمیز پیدا کر دی۔ بعض حالات میں رنگت کے فرق کی بنا پر بھی علیحدہ گروہ بندیاں ہوتیں، پیشہ وروں کی گروہ بندیاں بعض اوقات مستقل صورت اختیار کر گئیں۔ لیکن مقامی باشندے چونکہ مغلوب تھے اسلئے شودر کہلائے اس نظریئے کے مطابق ذات پات کا وجود کئی ایک وجوہات اور عناصر کی بنا پر ہے جو صدیوں تک کارفرما رہے۔ ابتدائی ایام میں ذات پات کا تعین کسی شخص کی پیدائش کی بنا پر نہ تھا اور ایک ذات سے دوسری ذات میں منتقل ہو جانا مشکل نہ تھا لیکن منوجی نے ذات پات کو مستقل اور پائیدار شکل دی۔ ہندوؤں نے اس نظام کو الہامی درجہ دیا۔ اور اس طرح سے ذات پات ہندو مذہب اور ہندو سوسائٹی کا جزو لاینفک بن کر رہ گئی ذات پات کی ابتدا کے اس نظریئے کو تاریخی نظریہ (Historical Theory) بھی کہتے ہیں موجودہ دور کے مورخین کی اکثریت اس نظریئے کی حامی ہے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زمانہ شجاعت میں ذات پات مستقل صورت اختیار کر چکی تھی۔ اور اب تک ہندو سوسائٹی ذات پات سے نجات حاصل نہیں کر سکی۔

ذات پات کے فوائد اور نقصانات

ذات پات ہندو سوسائٹی کی بنیاد ہے اور اس نے ہر دور میں ہندو ازم

کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیا ہے۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمان اور عیسائی بھی ذات پات سے اثر پذیر ہوئے ہیں چنانچہ ہر قوم میں فرقہ بندیاں شروع ہو چکی ہیں، ذات پات کے شدید نقصانات ہیں لیکن ہندو علماء نے ذات پات کے کئی ایک فائدے بھی گنوائے ہیں۔

۱۔ **مذہب کی حفاظت**:۔ ذات پات میں چونکہ چھوت چھات بھی شامل ہے لہٰذا ہندو باقی مذاہب کے لوگوں کو ملیچھ سمجھتے رہے اور ان سے الگ تھلگ (Isolated) رہے اس امر نے ان کے مذہب کو دیگر مذاہب میں جذب ہونے سے بچا لیا نہ ہندو دوسروں کی بات سنتے تھے نہ ان میں گھلتے ملتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مذاہب ذات پات سے متاثر ہوئے لیکن ہندو مذہب مٹ نہ سکا۔ نیز برہمن اور کشتریوں نے اپنی فوقیت برقرار رکھنے کے لیے ہندو مت کی حفاظت کے لئے بہت کام کیا اور وہ سختی سے ذات پات کے نظام پر ڈٹے رہے اس سے ہندو کلچر لچک پذیر نہ ہو سکا

۲۔ **خون کی پاکیزگی اور نسل کی حفاظت**:۔ جب ذات پات مستقل اور پائیدار صورت اختیار کر گئی تو باہمی شادیوں پر پابندی لگ گئی ذات پات کی بدولت ایک ذات کا شخص دوسری ذات میں شادی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بعض ذاتیں اعلےٰ تھیں اور بعض نیچ اس بنا پر آریاؤں اور غیر آریاؤں کا اختلاط رک گیا اور خون کی پاکیزگی برقرار رہی اس سے خالص نسلوں کی حفاظت ہوئی چنانچہ ہندو سوسائٹی میں آج تک خالص آریہ لوگ مل سکتے ہیں باقی ممالک میں کسی نسل کا خالص انداز میں برقرار رہنا ناممکن ہے۔

۳۔ **معاشی فائدے**:۔ ہندو علماء یہ خیال کرتے ہیں کہ ذات پات

کی بدولت لوہار کا بیٹا لوہار اور سنار کا بیٹا ہمیشہ سنار ہوتا تھا لہٰذا ہر شخص بچپن سے ہی اپنے آبائی پیشے کو سیکھنے کی کوشش کرتا تھا اور سن بلوغت کو پہنچتے پہنچتے اس میں مہارت اختیار کر لیتا تھا یعنی اس کی معاشی کارکردگی (Efficiency) بڑھ جاتی تھی۔ نیز ذات پات سے تقسیم کار ہو جاتا تھا اور سوسائٹی کا ہر فرد اپنے پیشے میں (Specialize) کر لیتا تھا کسی فرد کو مناسب پیشہ اختیار کرنے میں سرگرداں ہونا نہیں پڑتا تھا۔

۳۔ **سماجی لچک**:۔ ذات پات کی بدولت ہندوؤں نے غیر ملکی حملہ آوروں کو اپنے اندر جذب کر لیا وہ خود اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ سرکتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی باختری۔ ہن۔ کشان اور پارتھین باوجود فاتح ہونے کے مجبوراً ہندوؤں میں سمو گئے ہندوؤں نے ان کو الگ جاتی قرار دے کر اپنے اندر جذب کر لیا۔

اور حالات کے مطابق چار بڑی ذاتوں میں سے کسی ذات سے متعلق کر دیا۔ پس ذات پات ہندو سماج میں لچک پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ اور اس کی بدولت غیر ملکیوں کو بھی ہندو کلچر میں جذب ہونا پڑا۔

۴۔ **سماجی خوف**:۔ تاریخ کے ہر دور میں سماجی برائیوں کو روکنے میں ذات پات نے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ برائی کرنے والے کو ہمیشہ یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں اسے جاتی سے خارج نہ کر دیا جائے۔ اس ڈر کی بدولت اخلاقی بدعنوانیاں رک گئیں۔ اور سوسائٹی کی عام حالت خراب ہونے سے بچ گئی۔ لہٰذا ذات پات ڈسپلن کا باعث بنی۔ اور اس نے کئی ایک نوجوانوں کو خراب ہونے

سے بچا لیا۔

نقصانات

۱۔ نفاق اور تذلیل :۔ ذات پات نے ہندو قوم کے شیرازے کو بکھیر دیا اور ان میں ازلی نفاق کا بیج بو دیا۔ ہندو قوم کبھی بھی ایک محاذ پر متحد نہ ہو سکی چنانچہ غیر ملکی حملہ آوروں کے ہاتھوں ہندوؤں کی تذلیل اور شکست کا باعث ہمیشہ یہ بھی نفاق تھا۔ کشتریوں کے علاوہ دیگر ذاتوں کے لوگ کبھی دشمن کے خلاف لڑنا اپنا فرض نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ راجپوتوں کے مختلف قبیلے بھی ایک دوسرے کی مدد کو نہ آتے تھے۔ اور محض اپنی جاتی (Caste) کی حفاظت پر قناعت کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے ہمیشہ شکست کھائی۔ اور ہندو راجے ایک ایک کر کے مغلوب ہو گئے۔

"Never did the entire nation rise like one man to defend itself against aggressors and invaders".

۲۔ ترقی کی راہیں مسدود۔ ذات پات کی بدولت ہر شخص مجبوراً اپنا آبائی پیشہ اختیار کرتا ہے۔ برہمن کے سوا کوئی علم حاصل نہیں کر سکتا کشتری خواہ بزدل ہو۔ اسے میدانِ جنگ میں جانا پڑتا ہے اس طرح ویش اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کے باوجود علمی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا یعنی تعلیمی معاشی اور صنعتی ترقی کی تمام راہیں ہندو سوسائٹی میں ذات پات کی سختی کی بنا پر مسدود رہیں موجودہ دور میں ذات پات کے فرائض کے باوجود پیشوں کے اختیار کرنے پر قدیم پابندیاں قائم نہیں رہیں لیکن انیسویں صدی کے وسط تک ہندوؤں کے لیے جبری پیشے تھے اور ترقی کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ اسے بعض مورخ (Shut door policy) کہتے ہیں۔

۳۔ **افراد پر ظلم:**۔ ذات پات کی سختی ہمیشہ کے لئے نیچی ذات کے لوگوں پر ظلم و ستم کا باعث ہوئی ہے خاص طور پر شودر طبقہ پر انسانیت سوز مظالم توڑے جاتے رہے ہیں یہ لوگ بے آس ہو کر دائمی غلامی اور ذہنی کوفت کا شکار رہے اعلیٰ ذات کے لوگ ان کے سائے سے بچتے تھے۔ جمہوریت اور مساوات تو کجا بے چارے شودر کو عزت کی زندگی بسر کرنا بھی دوبھر تھی۔ آج تک ہندو سوسائٹی میں (Untouchable) اسی جبر و استبداد کی نشانی ہے درِ اصل ذات پات کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ نچلی ذات کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اور اونچی ذات کے نااہل لوگوں کی فوقیت برقرار رہتی ہے۔

"Caste system fails miserably to prrvide for low-born talent and high-born incompetence"

۴۔ **تنگ نظری اور تعصب:** ذات پات کی بدولت ہندو ہمیشہ الگ تھلگ رہے ہیں لہٰذا وہ ہمیشہ تنگ نظر اور متعصب ثابت ہوئے ہیں۔ انسانی فضائل اور سربلندیوں کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے ہندو ہمیشہ ذات پات کے چکروں میں کھوئے رہتے ہیں۔

"Society becomes static, not dynamic"

اسی ذہنیت کی بدولت ہندو کنوئیں کے مینڈک بنے رہے اور وسعت نظر ان کو کبھی بھی نصیب نہ ہوئی دوسری قوموں سے آزادانہ میل ملاپ کی بدولت دنیاوی ترقی کے علاوہ تنگ نظری دور ہوتی ہے لیکن ذات پات نے ہندوؤں کو ان صفات سے محروم رکھا۔

۵۔ **مذہبی بیزاری:**۔ نچلی ذات کے لوگ ناروا سلوک کی بنا پر ہندو مذہب

سے بیزاری کا اظہار کرتے رہے موقع پاکر ان لوگوں نے نئے مذہب اختیار کئے اور اسی طرح سے ہندو سوسائٹی کے خلاف بغاوت کا اظہار کیا جین مت اور بدھ مت کی حیران کن کامیابی کی اصل وجہ یہ تھی کہ نچلی ذات کے لوگ اونچی جاتی کے ظلم وستم سے تنگ آچکے تھے جس میں ذات پات کا نظام اتنا جامد (Rigid) تھا

موجودہ صورت:- مغربی علوم کی ترویج کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ ذات پات کے پرانے بندھن ڈھیلے پڑ گئے ہیں ذات پات موجود تو ہے لیکن پیشوں کے اختیار کرنے میں اب ہر شخص آزاد ہے۔ چھوت میں بھی بہت زیادہ کمی واقع ہوئی ہے۔ لیکن ذات پات کی جڑیں اتنی گہری اور دیرینہ ہیں کہ ان کو کاٹ پھینکنا ہندوؤں کے لئے ناممکن ہے مہاتما گاندھی کی چلائی ہوئی ہریجن سدھار تحریک کا چنداں اثر نہ ہوا کیونکہ ہندو سوسائٹی دقیانوسی خیالات کی حامل ہے۔

نیز اعلےٰ ذات کے لوگ اپنی فوقیت ختم کروانا نہیں چاہتے ذات پات کا اثر مسلمانوں اور عیسائیوں پر یہ ہوا ہے کہ یہ لوگ بھی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی محض اپنی ہی ذات برادری میں شادی بیاہ رچاتے ہیں۔ لیکن ہندوؤں میں ذات پات کی گہرائی مختلف ہے اور ان میں حریت اور مساوات کا بالکل فقدان ہے اور نچلی ذات کے لوگوں کے خلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ اب تک موجود ہے

Typical Questions

Q. 1. What do you know of the origin of Caste System ? Discuss its chief merits and demerits.

Q. 2. Write a brief note on the Caste System.

Q. 3. D.scuss the origin and growth of the Caste System in India and point out its merits and demerits.

Q. 4. "Caste has played a great but silent part in Indian history". Discuss the origin and nature of the Caste System and its merits and demerits.

Q. 5. What do you know about the growth of the Caste System in Hindu Society? Discuss its merits and demerits.

Q. 6. Discuss the merits and demerits of caste system in India.

امتحانی سوالات

1- ذات پات کی ابتدا کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ ذات پات کے فوائد اور نقصانات بیان کیجیے۔

2- ذات پات پر ایک چھوٹا سا جواب مضمون لکھیے۔

3- ہندوستان میں ذات کے آغاز اور ارتقا کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے فائدے اور نقصانات قلم بند کیجیے۔

4- "ہندوستان کی تاریخ پہ ذات پات نے خاموشی سے اہم ترین اور گہرے اثرات چھوڑے ہیں" تبصرہ کیجیے اور بتائیے کہ ذات پات

کی ابتدا کیسے ہوئی اس کی نوعیت کیا تھی؟ نیز ذات پات کے فائدے
اور نقصانات بیان کیجئے۔

5۔ ہندو سوسائٹی میں ذات پات کا نظام کیسے رائج ہوا؟ ذات پات کے
فائدے اور نقصانات پر بحث کیجئے۔

6۔ ہندوستان کی تاریخ میں ذات پات کے فائدے اور نقصانات
بیان کیجئے۔

آٹھواں باب

جین مت اور بدھ مت

جین مت:۔ برصغیر ہند و پاکستان میں جین مت کا عروج چھٹی صدی ق۔م میں ہوا۔ اور اکثر مورخین مہادیر کو جین مت کا بانی گنتے ہیں، مہادیرہ ۵۹۹ ق۔م میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن جین مت کے پیرو یہ خیال کرتے ہیں کہ جین مذہب ازحد قدیم ہے اور مختلف اوقات اس مذہب کے ہادی دنیا میں پیدا ہوتے رہے جنہیں "ترتھنکرا" کہا جاتا ہے (یعنی پیغمبر) جین مت کی ایک روایت یہ ہے کہ جین ازم کا سب سے پہلا "ترتھنکر" "رشنا" نامی ایک شخص تھا جو اجودھیا کا حکمران تھا۔ اور اسی نے اس مذہب کی ابتدا کی اس مذہب کے کل ۲۴ ترتھنکر ہو گذرے ہیں، تیئیسواں ترتھنکر پارس ناتھ یا پرشوناتھ تھا جو مہادیر سے اڑھائی سو سال پہلے پیدا ہوا آخری پیغمبر مہادیرہ نے بھارت میں جنم لیا اور جین مت کے قوانین کو نئے سرے سے ترتیب دے کر اس مذہب کو عوامی مذہب بنا دیا۔

پارس ناتھ کے چیلے:۔ تاریخی روایات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ پارس ناتھ بنارس کے راجہ کا بیٹا تھا اور جوانی تک خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کی۔ تیس برس کی عمر میں دل اچاٹ ہوگیا۔ لہٰذا شاہی زندگی کو ترک کرکے درویشی اختیار کی چوراسی دن غور و خوض کرنے کے بعد پارس ناتھ نے سچائی اور حقیقت کا راستہ پا لیا اور بقایا زندگی اپنے مذہبی خیالات (یعنی جین مت)

کا پرچار ہیں لگائی۔ ۱۰۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اکثر پیدائش مہاویر سے ڈھائی سو برس پہلے تئی پارس ناتھ کے چیلے نگر نتھ کہلاتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ جن کے پاس مذہبی رہنمائی کے لئے کوئی گرنتھ یا کتاب موجود نہ ہو۔ پارس ناتھ کی تعلیمات یہ تھیں۔

۱۔ دنیاوی چیزوں کی ملکیت سے بے نیاز ہو جاؤ تا کہ انسان کوفت سے بچے
۲۔ سادہ زندگی بسر کرو جھوٹ اور چالاکی سے باز رہو
۳۔ چوری کرنا از حد معیوب ہے۔
۴۔ کسی جاندار کو ایذا رسانی درست نہیں۔ اسے اہنسا یا (Ahimsa) کا اصول کہتے ہیں۔

مہاویر :۔ مہاویر ۵۹۹ ق۔م میں کنڈا گرام نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا یہ گاؤں ویسالی کے قریب تھا مہاویر وردھمن کے باپ کے نام سدھارتھ تھا وہ کشتری تھا اور مہاویر کی ماں ویسالی کے چھوٹی خاندان کی شہزادی تھی مہاویر کی پرورش لاڈ پیار سے ہوئی اور اسے دنیا کے تمام آرام اور سہولتیں حاصل تھیں بالغ ہونے پر اس کی شادی یشودھا نامی ایک حسینہ سے کر دی گئی اور مہاویر کے ہاں ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی لیکن ماں باپ کی وفات کے بعد مہاویر کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور اس نے دنیا ترک کر دی اپنے نفس کو مارنے کے لیے اس نے لباس پہننا بھی چھوڑ دیا۔ اور وہ دن رات ریاضت و عبادت میں مصروف رہا آخر کار اس نے سچائی کا راستہ پا لیا اس روز سے وہ مہاویر یعنی ''روحانیت کا سب سے بڑا ہیرو'' کہلایا اس کو جن یعنی سب کچھ جاننے والا بھی کہتے تھے اسی لفظ کی رعایت سے اس کی تعلیمات کو جین سے اور اس کے چیلوں کو جینی کہتے ہیں، ۴۶۸ ق۔م میں وہ صوبہ بہار میں ۷۲ سال

کی عمر پا کر فوت ہوا اس وقت اس کے مذہب کو چودہ ہزار اشخاص نے قبول کر لیا تھا۔

مہاویر کی تعلیمات :- پارس ناتھ کی طرح مہاویر کی تعلیمات بھی ازحد سادہ اور عام فہم تھیں اس نے پارس ناتھ کے چاروں عقائد کے علاوہ مزید باتوں پر زور دیا۔

(۱) انسان کو چاہیئے کہ برہنہ رہے تاکہ ہر قسم کی ضروریات سے بے نیاز ہو سکے

(۲) بدکاری سے دور رہنا چاہیئے تاکہ حفاظت نفس ہو سکے۔

جین مت کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان نیکی اور بدی کرنے پر قادر ہے کیونکہ اس میں دونوں صفات موجود ہیں انسان کو چاہیئے کہ دنیاوی اور مادی ضروریات میں نہ کھو جائے بلکہ غیر فانی زندگی یعنی روحانیت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اسے مکتی یا نجات کہا جاتا تھا۔ نجات کے لئے تین چیزیں لازم ہیں۔

۱۔ درست عقائد (Right Faith)

۲۔ درست علم (Right knowledge)

۳۔ درست عمل (Right action)

مہاویر کے ان تینوں ذرائع کو "انمول موتی" یا جواہر گنا جاتا ہے۔

جین مت کے پیروکار اصولی طور پر ذات پات کی تمیز کے خلاف ہیں لیکن موجودہ دور میں جینی لوگ، مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں جین مت کے پیروکار شروع سے ہی ویدوں کو الہامی کتابیں نہیں مانتے ہندوؤں کی رسومات قربانیوں اور برہمنوں کی فوقیت کے بھی مخالف ہیں لیکن تناسخ اور کرم کے اصول کو بالکل ہندوؤں کی طرح مانتے ہیں۔ یعنی ان کا بھی یہی خیال ہے کہ انسان کو نیکی اور بدی کی جزا اور سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے۔ اور اپنے اعمال کے مطابق انسان جون

بدل کر دنیا میں بار بار جنم لیتا رہتا ہے۔ اس آواگون کے چکر سے نجات پانے کے لئے مہاویر کے بتائے ہوئے "انمول موتیوں" پر عمل کرنا لازم ہے نجات کو وہ موکشا یا زوان کہتے ہیں۔ جینی خدا کی ہستی کے قائل نہیں اس لئے ان کو "ناستک" بھی کہتے ہیں مہاویر نے خدا کو انسانی صفات کا مظہر قرار دیا اور زندگی کا مقصد صرف یہی قرار دیا کہ روح کو دنیاوی علائق سے آزاد کیا جائے اس کا اعتقاد یہ بھی تھا کہ انسان کے علاوہ موجودات عالم کی ہر شے میں روح موجود ہے اسی لئے اہنسا کے اصول پر اس نے زیادہ زور دیا انتہا پسند جینی ننگے پاؤں پھرتے ہیں اور اپنے منہ کو ہمیشہ کپڑے سے ڈھانپے رکھتے ہیں تاکہ ننھے منے جراثیم بھی سانس کے ساتھ ان کے منہ میں داخل نہ ہوں اور اہنسا کے اصول کی خلاف ورزی نہ ہو۔

جین مت میں ایک اہم تضاد یہ ہے کہ ایک جانب تو اہنسا پر اس قدر زور دیا گیا ہے لیکن دوسری جانب راہبانیت اور تپسیا پر اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ فاقہ کشی کر کے جان کو ضائع کرنا مذہبی کمال گنا گیا ہے۔

(Lewis Rice) نے اس تضاد کو جین مت کی ستم ظریفی (Irony) کہا ہے

جینیوں کے انتہا پسند فرقے کو دی گمبرا (Digambars) کہتے ہیں یعنی لباس سے بے نیاز لوگ یا (Sky-clad) اس فرقے کے برعکس دیگر جینی لوگ سویتمبرا (Svetambhras) کہلاتے ہیں یعنی کپڑوں میں ملبوس لوگ ان میں سے اکثر لوگ مختلف تیرتھنکروں کے بتوں کو بھی پوجتے ہیں۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ بت پرستی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی شروع ہوئی ورنہ قدیم مذہب محض زہد و عبادت پر زور دیتا تھا۔ اور اس کے اصول از حد سادہ تھے۔

جین مذہب کے تین انمول موتیوں" میں سے درست عمل (Right action)

کے لئے پانچ امور پہ عمل پیرا ہونے کے لیے قسم کھانی پڑتی تھی یعنی۔

"Kill not, steal not, lie not possess no property and observe charitty."

(۱) کسی جاندار کو اذیّت نہ دینا (۲) چوری نہ کرنا (۳) جھوٹ نہ بولنا (۴) دولت سے بے نیاز رہ کر فقر و درویشی اختیار کرنا (۵) حفاظت نفس اختیار کرنا۔

جین مت یوں تو ہندوستان میں بہت مقبول ہوا لیکن بدھ مت کی طرح اس کی تبلیغ غیر ممالک میں نہ کی گئی۔ تیسری صدی عیسوی میں جینیوں میں فرقہ بندیاں شروع ہوئیں اور ایک بڑے فرقے نے شادی اور عورتوں سے اختلاط جائز قرار دیا اور سفید کپڑے بھی پہننے شروع کر دیئے موجودہ دور میں جینی ہندوؤں کا ایک حصہ شمار ہوتے ہیں۔ اور دولت کی فراوانی کے لئے مشہور ہیں

بدھ مت کا عروج

گوتم بدھ:۔ بدھ مت کا بانی سدھارتھ نامی ایک شہزادہ تھا اسے ساکی منی اور گوتم بدھ بھی کہتے ہیں اس کے باپ کا نام سدودھن تھا جو کپل وستو کا راجہ تھا یہ ریاست نیپال کی ترائی میں واقع تھی اور گوتم کے والدین کھشتری تھے گوتم کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے لیکن اکثر موّرخ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ 563 ق۔م میں پیدا ہوا اور اسی برس کی عمر پا کر 483 ق۔م میں فوت ہوا

گوتم کی پیدائش کے سات روز بعد اس کی ماں مایا دیوی چل بسی لیکن اس کی سوتیلی ماں مہامایا نے اسے ناز و نعمت سے پالا اور ماں کی جدائی کا احساس نہ ہونے دیا۔

سدھارتھ کو اعلےٰ تعلیم دلائی گئی اور اسے زمانے کے دستور کے مطابق تیراندازی۔ شمشیر زنی اور شہسواری بھی سکھائی گئی لیکن بچپن سے ہی شہزادہ متفکر رہا کرتا تھا اور غور و خوض کا عادی تھا۔

اس کے لئے عیش و عشرت کے تمام اسباب موجود تھے اور اسے ازحد ناز و نعمت سے پالا گیا تھا لیکن وہ تنہائی پسند تھا اور جوں جوں وہ جوان ہوتا گیا۔ اسے اس امر کا احساس دل کی گہرائیوں میں بیٹھ گیا کہ یہ دنیا دکھ درد سے بھرپور ہے اور انسانی دل کو سکون حاصل ہونا چاہیئے لیکن اسے کوئی راستہ نہ ملتا تھا اس کے علاوہ یہ کائنات اور موت و حیات بھی اس کے لئے عقدۂ لاینحل تھا ان حالات میں سدھارتھ اداس رہنے لگا اس کی دماغی پریشانی بڑھتی چلی گئی

باپ نے اس کی مغموم حالت کو بدلنے کے لئے ایک حسین شہزادی یشودھرا سے اس کا بیاہ رچایا اور شادی کے کچھ عرصہ بعد اسے خدا نے بیٹا بھی عطا کیا لیکن اس دوران سدھارتھ کا دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ اور اسے اس امر کا یقین ہو گیا کہ دنیا کی زندگی ایک مصیبت اور دکھ ہے اس دارالمحن سے کسی صورت نجات حاصل کرنی چاہیئے۔

ترک دنیا:۔ سچی خوشی اور سکون قلب کی تلاش میں آخر کار سدھارتھ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ گھربار اور بیوی بچے چھوڑ کر کسی جنگل میں چلا جائے تاکہ عبادت اور درویشانہ زندگی کی بدولت اس کے دل کو قرار حاصل ہو۔ چنانچہ ایک رات جبکہ اس کی بیوی اور اس کا بچہ غفلت کی نیند سو رہے تھے وہ چپکے سے کھسک گیا۔ اور دنیا کو ترک کر کے درویش بن گیا اس واقعہ کو تیاگ کہتے ہیں یعنی ترک دنیا۔ (Great Renunciation)

محل سے نکل کر سدھارتھ نے برہمنوں کے علوم کو پڑھا اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر عمل پیرا ہو کر خوب جی بھر کر تپسیا کی اور اپنے جسم کو ایذا رسانی دی لیکن اسے سکون قلب نصیب نہ ہوا۔ آخر کار وہ جنگلوں میں گھومنے لگا اور متواتر چھ سال غور و فکر کرتا رہا۔

ایک روز وہ گیا یاگوا کے قریب ایک برگد کے درخت نیچے بیٹھا ہوا گیان دھیان میں مگن تھا جب اسے نجات کا راستہ مل گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس راستے پر گامزن ہو کر دنیا کے دکھ درد سے نجات ہو سکتی ہے چنانچہ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ عوام کو بھی اپنی روشن دماغی سے روشناس کرائے گا اور انسانوں کو نروان یعنی نجات کا راستہ بتائے گا اس وقت سے وہ مہاتما بدھ یعنی عارف یا روشنی یافتہ کہلایا مورخ عام طور پر اُسے گوتم بدھ کہتے ہیں اس وقت اس کی عمر تقریباً چھتیس سال تھی اور اس نے بقایا عمر اپنے نئے مذہب کے پرچار کے لئے وقف کر دی۔

گوتم بدھ نے سب سے پہلے بنارس کے قریب سارناتھ کے مقام پر اپنا پہلا وعظ کیا اور پانچ اشخاص اس کے چیلے بنے یہ اس کے پہلے مبلغ تھے اس جماعت کو گوتم بدھ نے سنگ کا نام دیا اور اپنے ہمراہیوں سمیت وہ تبلیغ کرتا ہوا مگدھ پہنچا جہاں اس کی سادہ تعلیم کی بنا پر لوگ بہت بڑی تعداد میں اس کے پیروکار بن گئے۔ مگدھ اس کے مذہب کا مرکز بن گیا اور دور دراز علاقوں میں اس کا مذہب پھیل گیا۔

بدھ مذہب نے اتنی سرعت سے ترقی کی کہ دنیا کے مورخین کے لئے یہ امر باعث حیرت ہے دراصل یہ مذہب سادہ تھا اور مبلغین اسے عام فہم زبانوں میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے اس کے

علاوہ برہمنوں کی فوقیت اور ذات پات کی تمیز اور ان گنت قربانیوں سے ہندو عوام بیزار ہو چکے تھے۔ لہٰذا بدھ مت اس وقت ایک انقلابی مذہب ثابت ہوا اور لوگ جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگے۔

مہاتما بدھ نے اسّی برس کی عمر میں 483 ق م میں کوشی نگر (ضلع گورکھپور) میں وفات پائی اس کی وفات تک بدھ مت ہندوستان کے ہر گوشے میں پھیل چکا تھا اپنے باپ کی دعوت پر وہ کپل وستو بھی گیا تھا اس ریاست کے تمام لوگوں نے اس کے مذہب کو اختیار کر لیا تھا اس کی بیوی اور اس کے بیٹے نے بھی اس کے مذہب کو قبول کیا۔

بدھ مت کی تعلیمات اور اصول

مہاتما بدھ کا فلسفہ یہ تھا کہ دنیا کے دکھ درد خواہشات (ترشنا) سے پیدا ہوتے ہیں۔ خواہشات کا لامتناہی سلسلہ انسان کو دنیاوی محبت (ترشنا) سکھاتا ہے ان کی بدولت اعمال بدرونما ہوتے ہیں اور مسئلہ کرم اور تناسخ کی بنا پہ انسان بار بار جون بدل کر اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے اور آواگون کے چکر میں پھنس کر انسان دنیاوی مصائب سے نجات نہیں پا سکتا۔

لہٰذا خواہشات پر قابو پانے اور انہیں ختم کرنے کے لئے اشٹ مارگ یعنی نفس کشی لازم ہے۔ یہ نفس کشی برہمنوں کی طرح قربانیوں کی بدولت حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی اپنے جسم کو ایذا دینے والی عبادت کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ خواہشات سے بے نیاز ہونا روح کی پاکیزگی کا باعث ہے۔ روح پاکیزہ ہو کر دوبارہ انسانی قالب اختیار کر کے اس میں نہیں آتی اور اسے ابدی مسرت یا نروان یا نجات حاصل ہو جاتی ہے پس دنیاوی خواہشات پر

قابو پانا نجات حاصل کرنے کے لیے بنیادی چیز ہے خواہشات پر قابو پانے کے لیے آٹھ مقدس اصولوں پر عمل کرنا لازم ہے۔ ان اصولوں کو ("Path of virtue and duty") یا ("The Noble Eight-fold Path".) بھی کہتے ہیں یہ مقدس آٹھ اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) راست گفتار (۲) راست خیال (۳) راست ادراک یا اعتقاد (گیان) (۴) راست کردار (۵) راست انند یا سرور یعنی تلاش راحت (۶) راست سعی (یا کوشش) (Effort) (۷) راست عزم (Resolve) (۸) راست عمل۔

اس مقدس راستے کو نجات کا راستہ کہا جاتا ہے مہاتما بدھ کا خیال تھا کہ انسان محض خواہشات دنیا سے بے نیاز ہو کر دنیاوی غم اندوہ سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ بلکہ زندگی کا اصل مقصد یہ ہے کہ جون بدلنے سے نجات حاصل کی جائے اور وہ صرف ان آٹھ اصولوں پر کاربند رہنے سے ممکن ہے ان آٹھ اصولوں کی بناء پر بعض مورخ یہ کہتے ہیں کہ

"The teachings of Buddha were just a code of morality and nothing else".

(۲) بدھ مت میں کرم اور تناسخ کے مسئلوں پر اعتقاد لازم ہے یعنی نیک یا بد اعمال کی سزا اور جزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے کیونکہ انسان اپنے اعمال کے مطابق جون بدل کر بار بار جنم لیتا ہے آخرکار نیک اعمال کی بدولت انسانی روح پاکیزہ ہو کر آواگون کے چکر سے نجات پا جاتی ہے جسے نروان یا نجات کہتے ہیں ان اعتقادات کی بدولت اکثر مورخ یہ کہتے ہیں کہ بدھ مت کوئی نیا مذہب نہ تھا بلکہ ہندوؤں کے اندر اصلاحی تحریک تھی جس کا مقصد پیچیدہ رسوم

ذات پات کے نظام اور دیگر برائیوں کا دور کرنا تھا (Haveil)

(۳) مہاتما بدھ خدا کی ہستی کے بارے میں خاموش ہے لیکن آٹھ اصولوں کے علاوہ اس نے اپنے چیلوں کو دس ہدایات (Ten Commandments) بھی دی ہیں اور یہ ہدایات در اصل اعلیٰ اخلاق کا نچوڑ ہیں۔ ان ہدایات کو بعض اوقات (Christian virtues) بھی کہتے ہیں یہ ہدایات مندرجہ ذیل ہیں۔

چوری سے اجتناب۔ جھوٹ سے باز رہنا۔ شراب نہ پینا کسی کی جان نہ لینا (Do not kill) دولت جمع نہ کرنا نفسانی لذات میں کھو کر تعیشی کی زندگی سے پرہیز ہر قسم کی پاکیزگی اختیار کرنا پھولوں اور عطریات کے استعمال سے اجتناب خوراک کے استعمال میں بے قاعدگی اختیار نہ کرنا۔

ان ہدایات کی بدولت یہ کہا جاتا ہے کہ بدھ مت کا مقصد نیا ضابطہ اخلاق پیش کرنا تھا۔

"Buddhism was only a reform movement aiming at raising the moral standards of the people.'

(۴) مہاتما بدھ نے ویدوں کو الہامی کتابیں ماننے سے صریحاً انکار کر دیا وہ قدیم ہندومت کی رسومات اور قربانیوں کے سخت مخالف ہے نہ تو وہ برہمنوں کی فوقیت کو مانتا ہے اور نہ ہی ذات پات کی تمیز کو روا رکھتا ہے اس کے برعکس اس کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان یکساں اور برابر ہیں نروان حاصل کرنے کے لئے مذہبی رسومات یا پروہت کا وجود بے معنی ہے یہی وہ کشش تھی جس نے بدھ مت کو جلد ہی عالمگیر مذہب بنا دیا۔

(۵) **اہنسا کا اصول**:۔ مہاتما بدھ نے اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ کسی جاندار کو کسی قسم دکھ نہ دیا جائے ایذا رسانی سے اجتناب کی بدولت گوشت

خوری ختم ہوئی اور برہمنوں کی بتائی ہوئی قربانیاں یک قلم موقوف ہو گئیں ۔ اس اصول کو (Doctrine of Ahimsa) کہتے ہیں ۔ بعض مورخ اس اصول کو اہنسا (Ahin sa) بھی کہتے ہیں ۔

(۶) مہاتما بدھ ہندوؤں کے تمام دیوتاؤں کا منکر ہے وہ پیچیدہ مذہبی رسوم کا بھی مخالف ہے اس کی تعلیمات از حد سادہ ہیں اور وہ اعلیٰ اخلاق اور پاک دامنی کا علمبردار ہے ۔

(۷) مہاتما بدھ سنسکرت زبان کو مقدس زبان نہیں گنتا تھا بلکہ عام فہم زبانوں یعنی پالی اور پراکرت میں اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتا تھا

اپاسک اور تیاگی :۔ مہاتما بدھ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے پیروؤں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا پہلا فرقہ اپاسک کہلاتا تھا یعنی وہ لوگ جو ترک دنیا نہ کریں بلکہ عام دنیا دار لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے باوجود بدھ مت پر کاربند رہیں اس فرقے میں رہبانیت بالکل مفقود تھی ۔

دوسری جماعت تیاگی کہلاتی تھی تیاگیوں کی جماعت کو سنگھ (Sanga) بھی کہتے ہیں یہ لوگ دنیا سے تعلق قطع کر کے اپنے آپ کو محض عبادت کے لئے وقف کر دیتے تھے خیال کیا جاتا تھا کہ ان لوگوں کو نروان جلد حاصل ہوتا ہے اس جماعت کے ہر فرد کو (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) اپنے گرو کی نگرانی میں دس سال تک نفس کشی اور سخت قسم کی عبادت و ریاضت کرنی پڑتی تھی دس سال کے بعد وہ بھکشو یا مبلغ بن جاتا تھا ہر بھکشو اور بھکشنی کے لازم تھا کہ عمر بھر شادی نہ کرے یہ لوگ گیروا رنگ کے کپڑے پہنتے تھے اور ڈاڑھی اور سر کو منڈوائے رکھتے تھے ۔ کوئی مجرم ۔ سرکاری ملازم ۔ غلام ۔ مقروض شخص ۔ نابالغ یا متعدی بیماری کا مریض تیاگی جماعت میں شامل نہ ہو سکتا تھا ۔ سنگھ کا نظام بدھ مت کے عروج کے لئے از حد مفید ثابت ہوا

کیونکہ ان لوگوں نے جابجا خانقاہیں (یعنی تبلیغی مرکز) قائم کیں اور مہاتما بدھ کا پیغام برصغیر ہندوپاکستان کے ہر گوشے میں پہنچا دیا۔

بدھ مت میں مجالسِ عمومی (Buddhist Councils)

تیاگیوں کی جماعت کے لئے باقاعدہ نظام تھا اور ان کی زندگی قواعد و ضوابط کے تابع ہوتی تھی بھکشو بھی سال بھر یا تبلیغ میں مصروف رہتے تھے یا عبادت میں مگن رہتے تھے۔ ان کی خانقاہیں تبلیغی مرکز بھی تھیں اور عبادت گاہیں بھی تھیں سال میں تین مہینے رہبانیت کی زندگی گذارنا لازم تھا مقامی جماعت کا صدر علیحدہ ہوتا تھا لیکن مقامی سنگھ یا جماعتوں کی تنظیم کے لئے کوئی مرکزی ادارہ نہ تھا سنگھ کے افراد بدھ مت کے اصولوں کی تشریح کر سکتے تھے لیکن بنیادی اصولوں میں ردّ و بدل ان کے اختیار میں نہ تھا

جوں جوں وقت گذرتا گیا مذہبی قوانین کی تعبیر اور اصلی معانی کے بارے میں وقتاً فوقتاً اختلاف رونما ہوا چنانچہ بدھ مذہب کے حامیوں نے ان اختلافات کو ختم کرنے کے لیے ملک بھر کی مجلس عمومی یا جنرل کونسل بلائی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ صرف چار بار اس قسم کی مجلسیں بلائی گئیں پہلی کونسل مہاتما بدھ کی وفات کے چند ماہ بعد راج گرہی کے مقام پر طلب کی گئی اس مجلس میں مہاتما بدھ کی تعلیمات کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا فیصلہ کیا گیا پہلی کونسل کی محنت قابل داد ہے۔

دوسری کونسل ویسالی کے مقام پر بلائی گئی جس میں بھکشوؤں کے متعلق قوانین کو نرم کرنے کی تجویز پیش ہوئی اس کونسل میں اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور تیاگی جماعت دو حصوں میں بٹ گئی اس کونسل کے بعض فیصلے بدھ مذہب کی تعلیمات کے منافی تھے لہٰذا سنگھ کا تنزل اسی کونسل سے شروع ہوتا ہے۔

تیسری کونسل مہاراجہ اشوک نے پاٹلی پتر کے مقام پر طلب کی اس کی صدارت مشہور بدھسٹ عالم میگالی پتر نے کی اور اشوک کی کوششوں سے بدھ مذہب

کے حامیوں کے باہمی اختلافات کافی حد تک مٹ گئے یہ کونسل بدھ مذہب کی تاریخ میں اہم گنی جاتی ہے

چوتھی اور آخری کونسل ادتی پور اکے مقام پر مہاراجہ کنشک کے عہد میں منعقد ہوئی اسی میں اشواگھوش اور وشوامتر مشہور علماء نے بھی شرکت کی اور بہت سے اختلافی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی اشوک کے جمع کردہ مقدس اصولوں کی تفسیر بھی لکھی گئی۔

بُدھ مت کی حیران کن ترقی کے اسباب

بُدھ مت تھوڑی ہی مدت میں برصغیر ہند و پاکستان کا عوامی مذہب بن گیا اور صدیوں تک ملک بھر کا اہم ترین اور ہر دلعزیز مذہب بنا رہا قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مذہب اتنی سرعت سے کیوں پھیلا اور اس کی حیران کن ترقی کے اسباب کیا تھے۔ اس مذہب نے عروج کے بعد لوگوں کے دلوں میں دیرپا اثر چھوڑا لہٰذا اس مذہب کی ترقی کی وجوہ قابلِ غور ہیں۔

۱۔ **سادہ تعلیم**:۔ بدھ مذہب کی ترقی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس مذہب کی تعلیم سادہ تھی اور عوام اس کی جانب کھنچے چلے آتے تھے۔ مہاتما بدھ کی پیدائش کے وقت لوگ برہمنوں کی فوقیت اور اجارہ داری سے بیزار ہو چکے تھے برہمن کلاس نے مذہب کو پیچیدہ رسومات کا پلندہ بنا ڈالا تھا اور دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے جانوروں کی قربانیاں لازمی تھیں ذات پات کے نظام کی سختیاں انسانیت سوز مظالم ڈھا رہی تھیں ان حالات میں پرانے سوشل نظام کو ختم کر کے سادہ اخلاق کا سبق دینے والا شخص جاذب نظر ہوا اور لوگ جوق در جوق اس کے ہم خیال ہو گئے

۲- **انسانی برابری**:- ذات پات کے بندھنوں کے برعکس مہاتما بدھ نے یہ پیغام دیا کہ تمام انسان یکساں اور برابر ہیں کسی انسان کے لئے ترقی کے دروازے بند نہیں ہوسکتے اس کا یہ پیغام گویا انسانی آزادی - حریت اور برابری کا اعلان تھا۔ اور اس انقلابی آواز کو سنتے ہی برہمن مت کا طلسم ٹوٹ گیا۔

۳- **عام فہم زبان**؛ اس زمانے میں ہندوؤں کی مقدس زبان سنسکرت تھی لیکن عوام اس سے بے بہرہ تھے مہاتما بدھ نے ویدوں کو الہامی کتاب نہ مانا اور کسی زبان کو مقدس خیال نہ کیا - دیوتاؤں اور خداؤں کی ضرورت نہ سمجھی اپنے مذہب کے سادہ سے اصول لوگوں کی عام فہم زبان یعنی پالی اور پراکرت میں بیان کئے لہٰذا عوام جلد ہی اسکے پیروکار بن گئے۔

۴- **تبلیغ کا نظام**:- مہاتما بدھ نے اپنے مذہب کے فروغ کے لئے اپنی زندگی ہی میں سنگھ کا نظام قائم کیا تیاگی جماعت کا وجود مذہب کی ترقی کا باعث ہوا بھکشو اور بھکشنیاں ملک کے ہر کونے میں پھیل گئے اور انہوں نے اپنی زندگیاں مذہب کی تبلیغ کے لئے وقف کر ڈالیں اس تبلیغی نظام کی بدولت بدھ مذہب ہندوستان کی حدود سے نکل کر چین جاپان اور جاوا سماٹرا تک پھیل گیا ہر مبلغ سال بھر میں نوماہ تبلیغ کرتا تھا اور برسات کے تین مہینے خانقاہ میں بیٹھ کر عبادت اور مطالعہ میں مگن رہتا تھا۔

۵- **شاہی سرپرستی**:- مہاراجہ اشوک نے بدھ مذہب اختیار کرتے ہی اس کی ترقی و ترویج کے لئے خاص ذرائع اختیار کئے اور اس زمانے سے یہ مذہب عالمگیر مذہب بن گیا اس کے بعد صدیوں تک بدھ مت کو شاہی سرپرستی حاصل رہی - چنانچہ مہاراجہ کنشک اور ہرش بھی اس مذہب کے سرپرست تصور ہوتے ہیں - شاہی تائید و حمایت کی بدولت اس مذہب کو مزید ترقی

نصیب ہوئی۔

۶۔ خاص حالات:۔ بعض مورخ یہ خیال کرتے ہیں کہ بدھ مذہب کی ترقی میں خاص حالات یہ کارفرما تھے کہ مہاتما بدھ خود کشتری خاندان سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا اعلیٰ ذات کے لوگوں نے بھی اس کی بات پر کان دھرا کشتری اس زمانے میں برہمنوں کے حریف تھے لہٰذا ان کی فوقیت کو ختم کرنے کے جذبہ کے ماتحت انہوں نے نئی تعلیمات پہ توجہ کی مہاتما بدھ کا خلوص اور اس کا انداز بیان جادو کا کام کرتا تھا لہٰذا شخصی کشش بھی مذہب کی ترقی کا باعث ہوئی عوام خاص طور پر مہاتما بدھ کی جانب اس لئے متوجہ ہوتے تھے کہ اس نے تخت و تاج کو چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی تھی۔ اور عوام اس کو نجات دہندہ سمجھتے تھے مشہور ہے کہ:۔

"Lord Buddha had a very sweet and persuasive tongue, and he won over hundreds of converts by sheer sweet reasoning and telling logic".

یعنی مہاتما بدھ کی جادو بیانی اور منطقی استدلال اور شخصی کشش اہم امور تھے جو بدھ مت کی ترقی و ترویج کا باعث بنے

۷۔ دیگر اہم مذاہب کی کمی:۔ بدھ مذہب کی ترقی کا ایک اہم باعث یہ تھا کہ اس زمانے میں برہمن مت کے سوا کوئی اہم مذہب مقابلے میں نہ تھا برہمن مت اکیلا ہندو ازم کی مسخ شدہ صورت میں موجود تھا اور اپنی جاذبیت کھو چکا تھا عیسائیت اور اسلام ابھی معرض وجود میں نہ آئے تھے لہٰذا بدھ مت کے لئے میدان صاف تھا اور سادہ تعلیمات اعلیٰ اخلاق اور انسانی برابری کے پیغام کی بدولت یہ مذہب جلدی ہی ترقی و ترویج پا گیا اور عالمگیر مذہب بن گیا۔

بدھ مذہب جین ازم اور برہمن مت کے باہمی اختلافات اور مشابہت والے اصول

Points of Difference and Agreement

یکساں نکتے: تینوں مذاہب میں مندرجہ ذیل نکتے اور اصول ایک جیسے اور کافی حد تک ایک دوسرے سے یکسانیت اور مشابہت رکھتے ہیں

(۱) تینوں مذاہب مسئلہ کرم اور تناسخ پر یقین رکھتے ہیں تینوں مذاہب کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ جزا اور سزا اسی دنیا میں آواگون کے چکر میں پھنس کر ہی مل جاتی ہے اور آخرت یا بہشت دوزخ کوئی شے نہیں۔

(۲) تینوں مذاہب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بار بار جون بدل کر جنم لینے کی بجائے پیدائش کے چکر سے نجات حاصل کرنی چاہیئے اسے نروان حاصل کرنا کہا جاتا ہے۔ اگرچہ تینوں مذاہب میں نروان حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہیں لیکن منتہائے مقصود ایک ہی ہے۔

بدھ مت اور جین ازم کے مشترک اور یکساں نکتے

یدھ مت اور جین مذہب ایک دوسرے سے کافی حد تک ملتے جلتے ہیں ان کے یکساں نکتے مندرجہ بالا امور کے علاوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) دونوں مذاہب دراصل برہمن مت کے خلاف احتجاج اور بغاوت کے مترادف ہیں کیونکہ دونوں مذاہب نے برہمنوں کی فوقیت کو ختم کر ڈالا ہے۔

(۲) دونوں مذاہب انسانی برابری اور یکسانیت کا سبق دیتے ہیں اور اسی بات

پر زور دیتے ہیں کہ ہر شخص نجات حاصل کر سکتا ہے اس کے برعکس برہمن مت میں شودر کے لئے کسی صورت میں نجات ممکن نہیں وہ ہمیشہ آواگون کے چکر میں پھنسا رہے گا۔

(۳) دونوں مذاہب اہنسا کے اصول پر زور دیتے ہیں اور کسی جاندار کو تکلیف دینے یا کسی رنگ میں خون گرانے کے مخالف ہیں۔

(۴) دونوں مذاہب نے برہمنوں کی بتائی ہوئی خونی قربانیوں کو بند کیا اور برہمن مت کے برعکس پیچیدہ رسومات کی بجائے سادہ تعلیم پہ زور دیا۔

(۵) دونو مذاہب ویدوں کو الہامی کتابیں نہیں مانتے اور نہ ہی ہندوؤں کے دیوتاؤں یا اوتاروں کو مانتے ہیں نیز دونوں مذہب یہ عیاں طور پہ بتاتے ہیں کہ قربانیوں سے دیوتاؤں کو خوش نہیں کیا جا سکتا۔

(۶) دونوں مذاہب تبلیغی مذہب ہیں اگرچہ تبلیغ کے لئے ان مذاہب کے اپنے اندر تنظیم موجود ہے لیکن دونوں مذاہب نے برہمن کو کسی صورت میں نجات کا ذریعہ نہیں بتایا اور نہ ہی خاص پروہت کلاس کو فروغ دیا۔

(۷) دونوں مذہب خدا کی ہستی کے بارے میں خاموش ہیں اور ان مذاہب کا فلسفہ محض دنیاوی آلام سے انسانی روح کی نجات تک محدود ہے یہ امر واضح رہے کہ یہ دونوں مذہب خدا کی ہستی کا نہ ہی اقرار کرتے ہیں نہ انکار بلکہ خدا کے بارے میں ان دونوں مذاہب میں ذرہ بھر بھی ذکر موجود نہیں ہے

(۸) یہ دونوں مذاہب ذات پات کے سخت مخالف ہیں اور تمام انسانوں کو برابر اور یکساں گنتے ہیں۔

(۹) دونوں مذاہب کسی زبان کو الہامی زبان نہیں گنتے بلکہ ان مذاہب کے بانی عوامی زبانوں میں لوگوں تک اپنا پیغام پہنچاتے رہے ان کے اکثر وعظ پالی

اور پراکرت زبانوں میں ہیں۔

(۱۰) دونوں مذاہب کے بانیان کشتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی زندگیاں عوام کی بھلائی کے لیے وقف کر دیں اور تخت و تاج کو لات ماری دونوں نے اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ تقریباً ایک ہی علاقے میں کی

(۱۱) دونوں مذاہب کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ دنیا دکھ اور درد کا گھر ہے اس میں بار بار پیدا ہونے سے مصیبت اور بدی (Evil) میں اضافہ ہوتا ہے لہٰذا نروان حاصل کرنا انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے

ان مذاہب میں مشابہت اس قدر زیادہ ہے کہ بعض اشخاص غلطی سے جین مت کو بدھ مذہب کی شاخ قرار دیتے ہیں۔

بدھ مذہب اور جین مت کے اختلافی امور

(۱) دونوں مذاہب کے بانی مختلف تھے اور دونوں کا مذہبی لٹریچر بھی ایک دوسرے سے جدا اور مختلف ہے جینی لوگوں کی مقدس کتابیں تالیف ہونے کے بعد انگ (Angas) کہلاتی ہیں۔ اور بدھ مذہب کے بنیادی جمع شدہ اصولوں کو تری پاتکا (Tripitakas) کہتے ہیں۔

(۲) دونوں مذاہب کے طریق عبادت مختلف ہیں جینی مذہب میں ترک دنیا اور راہبانہ زندگی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ خودکشی، نفس کشی، اور اپنے جسم کو ایذا رسانی کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کے برعکس بدھ مت برہنگی کے سخت مخالف ہے اور سادھوؤں کو ستانے کی ترغیب دیتا ہے بدھ مت حد اعتدال سے تجاوز نہیں کرتا بدھ مذہب کی اصلی تعلیمات کی رو سے نہ تو راہبانیت کی زندگی درست ہے اور نہ ہی لہو ولعب کی زندگی نیز بدھ مت

اہنسا کے اصول کو انتہا پسندی تک نہیں لے جاتا۔

(۳) دونوں مذاہب کے رشی منی بالکل مختلف ہیں بدھ مت کے پیرو اپنے رشی منیوں کی یادگاروں پر سٹوپا (Stupas) تعمیر کراتے ہیں لیکن جینیوں میں یہ رواج نہیں جینی فن تعمیر بھی بدھ فن تعمیر سے بالکل مختلف ہے۔

(۴) بدھ مذہب مقدس آٹھ اصولوں پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے ہوئے پاکیزگی روح اور نیک اعمال پر زور دیتا ہے اس کے برعکس جین مت کا عقیدہ یہ ہے کہ کائنات عالم میں ہر جاندار اور بے جان چیز میں روح پایا جاتا موجود ہے بدھ مذہب اس قسم کے صوفیانہ خیالات سے خالی ہے اور وہ نیک اعمال پر زور دیتا ہے۔

(۵) بدھ مت کسی رنگ میں بھی ذات پات کو گوارا نہیں کرتا لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا جینی ہندوؤں کی دیکھا دیکھی دوبارہ ذات پات کی الجھنوں میں پھنس گئے

(۶) بدھ مت جلدی ہی برصغیر ہندو پاکستان کی حدود کو پھاند کر عالمگیر مذہب بن گیا۔ لیکن جین مت اس برصغیر سے باہر کبھی بھی نہ پھیل سکا نیز بدھ مت کی کی طرح جین مت کو کبھی بھی ہندو پاکستان میں ہر دلعزیزی اور فوقیت حاصل نہ ہو سکی

(۷) بدھ مت اپنے اصلی وطن سے آخر کار حرف غلط کی طرح مٹ گیا لیکن جین مت کی جڑیں اتنی مضبوط ثابت ہوئیں کہ یہ مذہب تاہنوز زندہ جاوید ہے اور برصغیر میں اب بھی جین مت کے پیرو دس لاکھ کی تعداد میں موجود ہیں۔

ان مذاہب کا برہمن مت سے اختلاف

(۱) ہندوؤں کا قدیم مذہب یعنی برہمن مت ویدوں کو الہامی کتابیں مانتا ہے اور کئی ایک خداؤں دیوتاؤں اور اوتاروں میں اعتقاد رکھتا ہے اور اس کے برعکس بدھ مت

اور جین مت ویدوں کو الہامی کتب نہیں مانتے اور برہمنوں کے دیوتاؤں اور ویدوں کی رسومات اور قربانیوں سے شدید مخالف ہیں بدھ مت اور جین مت خدا کی ہستی کے بارے میں خاموش ہیں۔

(۲) ذات پات برہمن مت کا اہم جزو ہے اور ہندو نظام میں برہمن کو فوقیت حاصل ہے انسانی برابری مفقود ہے حتیٰ کہ شودر کے لئے نروان یعنی نجات کے دروازے بھی بند ہیں بدھ مت اور جین مت اس تمام نظام کے مخالف ہیں اور ان کے نزدیک ہر شخص کو نروان حاصل ہو سکتا ہے۔

(۳) اگرچہ تینوں مذاہب کرم اور تناسخ کے مسائل پر متفق ہیں لیکن ان کی عبادات مختلف ہیں اور نجات (نروان) حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہیں ان کی عبادت گاہیں بھی مختلف قسم کی ہیں۔

(۴) جین مت سے تصوف جھلکتا ہے۔ بدھ مت نیک اعمال اور صرف اعمال (Karma Morga or Path of deeds) پر زور دیتا ہے اس کے برعکس ہندو مت محض علم پر اکتفا کرتا ہے Gyan Morga or Path of knowledge یعنی برہمنوں کا فلسفہ یہ ہے کہ دنیا ایک بے حقیقت خواب یا مایا ہے اور تسکین قلب مذہبی رسوم پر عمل پیرا ہونے سے اور قربانیوں کی ادائیگی سے حاصل ہوتی ہے روحانی روشنی دنیا کی حقیقت کو سمجھ لینے سے حاصل ہوتی ہے۔

(۵) بدھ مت کے نزدیک دنیا مصیبت کا گھر ہے۔ جین مت اس دنیا کو بدی کا سرچشمہ کہتا ہے ہندو مذہب کا عقیدہ ہے کہ بزرگی اور فوقیت کی اصل جنم سے وابستہ ہے۔ اور محض نیک اعمال نرک یا پلیدی سے انسان کو بچا نہیں سکتے مثلاً شودر حتیٰ کہ داگوں کے چکر میں ہی مبتلا رہے گا یہی مشیت ایزدی ہے یعنی نجات (نروان) صرف آریہ قبیلوں اور اعلیٰ ذاتوں کے لئے مخصوص ہے۔

(۱۱) ہندو مت میں تبلیغ کے لئے کوئی نظام نہیں ہے کیونکہ یہ مذہب تبلیغی مذہب ہی نہیں ہے۔ اس کے برعکس بدھ مت کے بھکشو اور بھکشنیاں باقاعدہ طور پر منظم تھے۔ جین مت میں بھی تبلیغ کے لئے باقاعدہ تنظیم ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ ان شدید اختلافات کے باوجود یہ تینوں مذاہب ایک دوسرے کے دوش بدوش پنپتے رہے اور آج ان تینوں مذاہب کے عقائد ایک دوسرے سے بہت نزدیک آچکے ہیں بلکہ موجودہ ہندومت میں مدغم معلوم ہوتے ہیں۔

بدھ مت کے زوال کے اسباب

مہاتما بدھ کی وفات کے بعد تقریباً پانچ سو برس تک بدھ مذہب کو خوب عروج حاصل ہوا اور اس مذہب نے حیران کن سرعت سے ترقی کی چنانچہ یہ مذہب عالمگیر مذہب بن گیا لیکن اوج کمال پر پہنچتے ہی اس مذہب میں فرقہ بندیاں شروع ہو گئیں اور آہستہ آہستہ یہ مذہب زوال پذیر ہونا شروع ہوا آخر کار گیارہویں صدی تک یہ مذہب برصغیر ہند و پاکستان سے بالکل معدوم ہو گیا۔

اس مذہب کے زوال کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ **شاہی سرپرستی کا خاتمہ** :۔ بدھ مذہب کی ترقی و ترویج میں شاہی سرپرستی نے اہم کام کیا تھا لیکن گپتا خاندان کے عروج کے ساتھ اس مذہب کی ہر دلعزیزی ختم ہوئی کنشک کے بعد بدھ مت کو کسی حکمران کی تائید و حمایت حاصل نہ ہوئی لہٰذا عوام نے حکمرانوں کی دیکھا دیکھی ہندومت کی جانب رجوع کیا۔

ہندومت میں ترمیم اور سنسکرت کی ترویج :۔ گپتا خاندان کے عروج کے ساتھ ہی سنسکرت زبان کو دوبارہ ترقی اور ترویج ہوئی چنانچہ اسی دور کے

ہندوؤں کے علوم کے احیا کا زمانہ گنا جاتا ہے کالیداس جیسے انشا پرداز پیدا ہوئے اور سنسکرت زبان عوامی زبان بن گئی اس بنا پر ویدوں کو دوبارہ پڑھنے کا شوق پیدا ہوا برہمنوں کی خود ساختہ رسومات کو ختم کر دیا گیا ان کی فوقیت کا دور بھی ختم ہوا اور ہندو مت میں ترمیم کر کے اسے اس قدر وسیع کر دیا گیا کہ بدھ مت اسی میں جذب ہو کر رہ گیا۔

(۳) **فرقہ بندیاں:** جوں جوں زمانہ گذرتا گیا بدھ مذہب سے کئی ایک فرقے پیدا ہو گئے بدھ مت کے پیروؤں نے مختلف اوقات جنرل کونسلوں کے ذریعے اختلافات مٹانے کی کوشش کی لیکن یہ اختلافات وسیع تر ہوتے چلے گئے آخر کار بدھ مت دو بڑی شاخوں میں منقسم ہو گیا یعنی ھنایانا اور مہایانا فرقہ مہاتما بدھ کو ایک دیوتا کی طرح پوجنے لگا۔ گاندھارا فنِ تعمیر نے بھی بت پرستی کو فروغ دیا نتیجہ یہ ہوا کہ بدھ مذہب کی سادگی جاتی رہی۔ اور یہ مذہب نئے ہندو مت میں مدغم ہو گیا۔

(۴) **بھکشوؤں کی اخلاقی کمزوری** (Degeneration)

مہاتما بدھ کی وفات کے صرف ایک سو سال بعد جب دوسری کونسل منعقد ہوئی تو بھکشوؤں کے قواعد و ضوابط میں ترمیم کر دی گئی اور ان پر پابندیاں کافی حد تک نرم کر دی گئیں۔ اس سے مختلف فرقے بھی پیدا ہوئے اور بھکشوؤں کی جماعت میں اخلاقی کمزوریاں داخل ہو گئیں ان میں پہلا سا مذہبی جوش جاتا رہا یہ لوگ ترک دنیا کی بجائے دنیاوی مال و دولت کے متوالے بن گئے اور آخر نوبت اس حد تک پہنچی کہ لوگ ان مبلغین سے بیزار ہو گئے اور ہندو مت میں شامل ہونے لگے

۵۔ **سفید ہن اور راجپوت:**۔ بدھ مت کے پیروؤں کے لئے امن

کے زمانے میں تو اہنسا کے اصول پر کاربند رہنا ممکن تھا لیکن جنگ اور سافراتفری کے دور میں ان پر بدھ مت کی بنیادی خامی (جذبہ جہاد کا فقدان) واضح ہوگئی اگر وہ دشمن سے لڑیں تو مذہب کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور اگر نہ لڑیں تو بیوی بچے قتل وغارت ہوتے ہیں ادھر سفید ہن قوم متواتر حملوں سے تمام ملک پر چھا گئی تھی لہذا عوام بدھ مت سے بددل ہو گئے اسی طرح راجپوت پیدائشی طور پر جنگجو اور بہادر تھے انہوں نے بھی بدھ مت کو کمزور کرنے میں نمایاں کام کیا۔

۶۔ **خدا کا تصور:۔** بدھ مذہب خدا کی ہستی کے بارے میں بالکل خاموش تھا اس کے برعکس ہندومت میں خدا کی ہستی کے علاوہ دیوتاؤں کا باقاعدہ جال تھا گاندھارا آرٹ کے فروغ کے ساتھ جب بت پرستی عام ہوئی تو خدا کے تصور سے عوام کو کشش اور جاذبیت ہوگئی یہ امر بھی بدھ مت کو مزید کمزور کر گیا۔

اس کے برعکس نئے ہندو مذہب میں عالیشان مندر اور دلکش قسم کی عبادات موجود تھیں لہذا عوام اس جانب رجوع ہوئے

"Buddhism was a cold and austere religion, wanting in all attractions which a pompous worship of the Almighty and gay outlook on life have.

۷۔ **ہندو مت کی لچک:۔** ہندو مت شروع ہی سے لچکدار رہا ہے اور اس نے اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب کو اپنے اندر جذب کر لیا لہذا بدھ مت کو بھی ہندوؤں کے اصلاح شدہ مذہب نے آہستہ آہستہ اپنے اندر جذب کر لیا ہندوؤں نے نہ صرف قربانیوں کا خاتمہ کر دیا بلکہ گوشت خوری بند کر دی اور اہنسا کا اصول (جس پر بدھ مت والوں کو ناز تھا) اپنے مذہب میں

شامل کر لیا ہندوؤں نے مہاتما بدھ کو بھی اپنے دیوتاؤں شامل کر لیا اور اس طرح بدھ مت کو انہوں نے اپنے مذہب کی شاخ بنا کہ اس کی علیحدہ ہستی کو فنا کر دیا۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان کی ریاستیں

مہاتما بدھ کے زمانہ یعنی چھٹی صدی قبل مسیح کی سیاسی حالت کافی دلچسپ ہے اس وقت برصغیر تین الگ تھلگ حصوں میں منقسم تھا۔

(ا) شمالی ہند (ب) وسط ہند (ج) جنوبی ہند ان تینوں خطوں میں سولہ ریاستیں قائم تھیں جن میں سے چار سلطنتیں کافی وسیع اور اہم تھیں ان عظیم الشان ریاستوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ریاست مگدھ۔ اس کا پایۂ تخت بہار میں راجہ گرھ تھا

(۲) ریاست کوسالہ یا کوشل۔ اودھ کا علاقہ اس ریاست میں شامل تھا ریاست مگدھ نے آخر کار اس کا خاتمہ کر ڈالا سرسوتی اس کا دارالخلافہ تھا۔

(۳) ونسا ریاست جس میں موجودہ بندھیلکھنڈ کا علاقہ شامل تھا اور جس کا پایہ تخت کوسمبی تھا۔

(۴) اونتی (ONTIE کی ریاست جو مالوہ میں تھی اس کا دارالخلافہ اجینی تھا۔

جمہوری ریاستیں:۔ اس زمانے میں بعض چھوٹی ریاستیں جمہوریہ REPKBLICS تھیں ان پر مختلف قبیلوں کے اپنے اپنے سردار حکمران تھے یہ جمہوری ریاستیں پنجاب اور دوآبہ کے علاوہ بہار میں پائی جاتی تھیں مشہور جمہوری ریاستیں۔ ساکا یا (SAKA (

ودھیاد VIDHIYA) لچھوی کو سنگارا اور پاوا نہیں لچھوی اور ۔ ودھیا ریاستوں کو بعض اوقات مشترکہ طور پر وراجین (VRAJIAN) کہا جاتا ہے۔

بدھ مت کی روایات میں یہ ذکر ملتا ہے کہ مہاتما بدھ نے وراجین جمہوری ریاستوں کی تنظیم اور ڈسپلن سے متاثر ہو کر بھکشوؤں کو یہ نصیحت کی وہ بھی ان جمہوری ریاستوں کی مانند اسمبلی بلا کر باہمی صلاح مشورہ سے کام کیا کریں اور حکمرانی کے لئے من مانی کارروائی سے پرہیز کیا جائے قدیم رواج کے مطابق عمل کیا جائے اور بدھ سنگھ (BUDH SUNGH) کو منظم کرنا چاہیے مورخین کا خیال ہے کہ جمہوری ریاستیں قدیم ترین زمانے کی یادگار تھیں باقی ریاستوں میں بادشاہت کا رواج تھا لیکن بعض اوقات بادشاہ کا انتخاب ہوتا تھا موروثی بادشاہ بھی وزرا کی کونسل سے صلاح مشورہ کرتے تھے حکمرانوں کو خاص اختیارات حاصل تھے۔ اور وہ مخصوص ٹیکس وصول کر سکتے تھے

جمہوری ریاستوں کا انتظام یونان کی شہری ریاستوں کے مانند عوام کی اسمبلی کے پاس ہوتا تھا۔ ریاست کا ہر فرد اسمبلی میں حاضر ہو کر تمام معاملات میں رائے دیتا تھا انتظامی امور کے لئے ایک افسر چنا جاتا تھا جس کے عہدے کی میعاد مقرر تھی لچھوی جمہوری ریاست (State) انتظامیہ کے لئے تین افسر چنتی تھی مہاتما بدھ نے کپل وستو میں جب وعظ و نصیحت کا آغاز کیا تو یہی مقام ریاست کے انتظامی امور کے لئے گویا اسمبلی ہال بن گیا۔

ریاست مگدھ کا عروج :- مہاتما بدھ کی وفات کے چند سو سال بعد مگدھ کی سلطنت بہت زبردست ہو گئی ہندوستان کے بیشتر علاقے اس ریاست کے قبضے میں آ گئے۔ گوتم بدھ کا ہم عصر مگدھ کا راجہ بمب سار

تھا۔ جو کافی طاقتور تھا اس نے کوشل کے راجہ کی لڑکی سے شادی کی بعد ازاں اس نے ویسالی ریاست کے شہزادے کو اپنا داماد بنا لیا ان رشتے ناطوں سے اس کی طاقت بہت بڑھ گئی بمب سارنے باون برس حکومت کی۔ ۴۹۱ ق۔م میں اسکے بیٹے اجیت سترو (Ajatsatru) نے بمب سار کو قتل کر ڈالا اور خود تخت نشین ہوا کوشل کا راجہ پرسین اپنے بہنوئی کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے حملہ آور ہوا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد دونوں میں صلح ہو گئی اور اجات سترو ۴۵۹ ق۔م تک مگدھ پر حکمران رہا صلح کے بعد کاشی کے علاقہ پر بھی اجات سترو کا قبضہ ہو گیا۔

اس کے بعد اجات سترو نے لچھوی قوم پر حملہ کر کے ان کا علاقہ بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اس نے ویسالی کے حکمرانوں کو بھی شکست دے کر اپنی سلطنت کو وسیع تر کیا۔ اجات سترو کی وفات کے بعد اس کے جانشین اودان نے راج گرھیہ کی بجائے پاٹلی پتر کو ریاست مگدھ کا پایہ تخت بنایا اس کے بعد یہ شہر کئی صدیوں تک ہندوستان کی مرکزی طاقت کا پایہ تخت رہا موریا خاندان کے حکمرانوں کا پایہ تخت یہی شہر تھا۔

ناگا خاندان :۔ اجات سترو اور اودائن کے بعد بمب سار کے خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور ۴۱۱ ق۔م میں کاشی کے گورنر شیشو ناگ نے مگدھ پر قبضہ جما لیا اس نے مالوہ فتح کر کے اونتی کی ریاست کا بھی خاتمہ کر ڈالا اس نے ۳۹۳ ق۔م میں وفات پائی ہندوؤں کی رزمیہ نظموں میں مگدھ کے نئے حکمرانوں کو ناگا خاندان لکھا گیا ہے لیکن پران کی رو سے اس خاندان کا نام شیشو ناگ ہے جو دراصل شیش ناگ (یا ناگا) کی بدلی ہوئی شکل ہے۔

ناگا خاندان کا آخری حکمران مہانند تھا جس نے ایک نیچ ذات کی عورت سے

شادی کر لی اس بنا پر اس کے بیٹے مہا پدم نندا کو ناگا خاندان کا فرد نہیں گنا جاتا بلکہ اس کی تخت نشینی سے نندا خاندان کی ابتدا ہوئی پران میں تحریر ہے کہ شیشوناگ خاندان کے حکمران کھشتری تھے لیکن نندا خاندان کے حکمرانوں نے پنچ ذات ہونے کی وجہ سے کھشتریوں پر بہت ظلم ڈھائے۔

نندا خاندان :۔ مہا پدم نندا کی ماں شودر تھی لیکن عظیم الشان فتوحات کی بدولت اس نے اپنی سلطنت کو وسعت دی اس نے پنجاب۔ کشمیر اور سندھ کا الحاق کر کے تمام شمالی ہند کو زیر کر لیا اس نے دکنی علاقہ پر بھی فوج کشی کر کے کئی حکمرانوں کو اطاعت پر مجبور کیا اس کی وفات کے بعد نندا خاندان اکیانوے برس تک حکمران رہا مہا پدم نندا کے آٹھویں جانشین سے چندر گپت موریا نے اپنے برہمن اتالیق چانکیا یا کوٹلیا کی مدد سے سلطنت چھین لی اور ۳۲۲ ق-م میں وہ خود مگدھ کا بادشاہ بن بیٹھا۔ اس کے حالات دسویں باب میں بیان کئے جائیں گے۔

Typical Questions

Q. 1. Describe the chief political and social causes which led to the spread and subsequent decline of Buddhism.

Q. 2. Give a short account of the life and teachings of Lord Buddha. How do you account for the popularity and rapid spread of Buddhism in India?

Q. 3. Give a short account of the rise and growth of Jainism. How far did it agree with and differ from Buddhism?

Q. 4. Sketch briefly the career of Gautam Buddha and discuss his teachings.

Q. 5. Bring out the main points of agreement and difference between Buddhism and Brahmanical Hinduism.

امتحانی سوالات

1- کون کون سی سیاسی اور معاشرتی وجوہات بدھ مت کے عروج و زوال کا باعث ہوئیں؟

2- مہاتما بدھ کی زندگی اور تعلیمات کا مختصر حال بیان کیجئے۔ بدھ مت کی ہر دلعزیزی اور سرعت سے ترقی و ترویج کی وجوہات کیا تھیں؟

3- جین مت کی ابتدا اور اشاعت کا مختصر حال بیان کیجئے بدھ مت سے اس کی مشابہت اور اختلافات کی وضاحت کیجئے۔

4- گوتم بدھ کی زندگی کے حالات لکھئے اور اس کی تعلیمات پر تبصرہ کیجئے۔

5- بدھ مت اور برہمنوں کے ہندو مت میں کیا فرق ہے؟ دونوں مذاہب کن کن امور میں مشابہت رکھتے ہیں؟

6- ان اہم سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لیجئے جن کی بنا پر ہندوستان میں بدھ مت زوال پذیر ہوا۔

7- متحدہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ پر بدھ مت کیسے اثر انداز ہوا؟ واضح کیجئے۔

8- جین مت کے بنیادی اصولوں اور تعلیمات کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں بدھ مت اور جین مت کی تعلیمات کا فرق بیان کیجئے

9- مہاویر اور اس کی تعلیمات پر ایک شذرہ سپرد قلم کیجئے۔

10- بدھ مت کی تعلیمات کیا تھیں؟ ہندوستان میں اس مذہب کی کامیابی و اشاعت کی وجوہات کیا تھیں؟

11- جین مت کی تعلیمات کیا تھیں؟ مہاویر نے اس مذہب کی ترقی میں کیا حصہ لیا؟ مہاویر کی زندگی کا مختصر حال بیان کیجئے۔

12- بدھ مت کے اہم اصول اور عقائد کیا ہیں؟ جین مت۔ بدھ مت اور برہمنوں کے ہندو مت کا موازنہ و مقابلہ کیجئے۔

13- بدھ مت یا جینی مذہب کے بانی کی زندگی کے حالات اور تعلیمات قلمبند کیجئے

14- تاریخ ہند میں بدھ مت کے زوال کے اسباب بیان کیجئے۔

15- چھٹی صدی قبل مسیح سے لے کر چوتھی صدی قبل مسیح تک ہندوستان کی اہم ریاستوں کا حال بیان کیجئے۔

نواں باب

ایرانیوں اور یونانیوں کی یورش اور سکندر اعظم کا حملہ

قدیم زمانے سے ہی دُنیا کے مختلف خطوں کے لوگ برصغیر ہندو پاکستان کو سونے کی چڑیا سمجھتے رہے ہیں۔ اور ان علاقوں پر چھا جانے کے لئے بیقرار تھے۔ لیکن ایران پہلا ملک ہے۔ جس نے مغربی پاکستان کے بعض حصّوں پر اپنا تسلط قائم کیا اور پھر ایران و پاکستان کے روابط بہت گہرے ہو گئے۔ بعد میں یہی میل جول یونانیوں کی یورش کا باعث ہوا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔ کہ ایران میں کیانی خاندان کے بانی شہنشاہ کورش یا کیخسرو (Cyrus) نے پہلی بار اس برصغیر کی فتوحات کی جانب توجہ مبذول کی۔ اس کی حکومت 558 ق۔م سے لے کر 530 ق۔م تک تھی۔ اُس نے ایشیائے کوچک اور بابل پر غلبہ حاصل کیا۔ اور بعد ازاں اپنی سلطنت کی حدود کو عبور کر کے ٹیکسلا گاندھارا (قندھار) اور دریائے سندھ کے اس پار تک کے تمام علاقے فتح کر لئے اس دور میں مغربی پاکستان کا بیشتر حصّہ ایرانیوں کے قبضہ میں تھا۔

ایرانی شہنشاہ دارا (Darius) کے زمانے میں اس کے مشہور جرنیل سکائی لیکس (Skylax) نے دریائے سندھ سے ایک بحری بیڑہ روانہ کیا۔ اور یہ بیڑہ بحیرۂ عرب اور بحر قلزم سے گزر کر مصر پہنچا۔ دارا کی حکومت 485 ق م تک تھی۔ اس عہد میں جہلم اور ملتان بھی فتح ہوا۔

ایرانی بادشاہ خسرو پرویز نے 486 ق۔م میں جب یونان پر حملہ کیا تو اس کی فوج میں ہندو پاکستان کے سپاہی بھی موجود تھے۔ یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس لکھتا ہے۔ کہ یہ

سپاہی تیر و کمان سے لڑتے تھے اور سوتی کپڑے پہننے کے شوقین تھے۔
ہندوپاکستان پر ایرانی اقتدار ثابت تو ہے لیکن اس کی تفصیلات محدود ہیں جب ۳۳۰ ق م میں سکندر اعظم نے چڑھائی کی تو اس کی فوج میں ہندوستانی سپاہی موجود تھے۔ لیکن تاریخ اس بارے میں خاموش ہے کہ آیا ہندوپاکستان کے بعض علاقوں پر ایرانی قابض تھے یا اس برصغیر کی بعض ریاستیں ایران کی باجگذار تھیں۔ سکندر کے حملے کے وقت یعنی چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوپاکستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اور ایرانی فوقیت مفقود تھی۔
ہندوستانی تمدن پر ایرانی اقتدار کے دیرپا تمدنی اور ثقافتی اثرات ہوئے ہیں فنِ عمارت اور سنگ تراشی میں ایرانی اثرات نمایاں ہیں۔ ایرانی بادشاہوں کی دیکھا دیکھی ہندوستانی حکمرانوں نے چٹانوں اور لاٹھوں پر اپنے عہد کے مشہور واقعات لکھوانے شروع کئے۔ یہ چیزیں بعد میں تاریخ ہندوپاکستان کا اہم ماخذ بن گئیں۔ لوگوں کی بودوباش پر بھی ایرانی تمدن اثر انداز ہوا۔ بادشاہت اور متحدہ سلطنت کا تصور بھی ہندوؤں نے ایرانی حکمرانوں سے لیا۔ ٹیکسلا سے ایک کتبہ ملا ہے۔ جو آرامی رسم الخط میں ہے۔ یہ رسم الخط مدتوں تک ایران میں رائج رہا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ برصغیر ہندوپاکستان پر بھی آرامی رسم الخط نے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ ایرانی اور ہندوستانی ایک ہی نسل کے باشندے تھے یعنی انڈوایرین یا آریہ نسل۔ ایرانی سیاسی غلبہ ختم ہونے کے بعد بھی دونوں ممالک میں تجارتی تعلقات قائم رہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ایران کو فتح کرنے کے بعد سکندر نے پنجاب پر حملہ لازمی سمجھا کیونکہ یہ علاقہ کافی مدت تک ایرانی صوبہ رہا تھا۔ ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ سکندر فتوحات کا شوقین تھا اور دنیا بھر کو فتح کر لینے کا خیال اس کے دل میں سمایا ہوا تھا اس کے

علاوہ ہندوستان کی دولت و ثروت بھی اسے کھینچ لائی۔

سکندر اعظم اور اس کا حملہ

سکندر اعظم یونان کے بادشاہ فیلقوس کا بیٹا تھا اور جوانی میں ہی تخت و تاج کا وارث ہوا۔ آس پاس کی ریاستوں کو فتح کر کے ایران پر حملہ آور ہوا اور دارا سوئم کو شکست دے کر کیانی سلطنت کو تباہ و برباد کیا۔ اس کے بعد وہ ۳۲۶ ق م میں برصغیر ہند و پاکستان پر حملہ آور ہوا وہ آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا۔ ۳۲۳ ق م میں ایران واپس پہنچا اور عین عالم شباب میں فوت ہوا مشہور یونانی فلاسفر ارسطو اس کا استاد تھا۔ سکندر اعظم کا حملہ سمتھ صاحب کے قول کے مطابق ایک اہم نکتہ ہے جس سے ہند و پاکستان کی قدیم تاریخ متاثر ہوئی۔ اور شمال مغرب کی جانب سے حملہ آوروں کے لئے راستہ کھل گیا۔

سکندر کی یورش کے وقت برصغیر کی سیاسی حالت: سکندر کے حملے کے وقت برصغیر ہند و پاکستان میں کوئی متحدہ مرکزی حکومت نہ تھی۔ بلکہ یہ برصغیر چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ بعض ریاستیں جمہوری تھیں۔ لیکن بعض میں جابرانہ ملوکیت تھی۔ شمالی بھارت میں سب سے مشہور مگدھ کی ریاست تھی۔ اس کے علاوہ کوشل، اونتی اور نندا کی ریاستیں بھی تھیں۔ پنجاب میں مختلف قبیلے خود مختار چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی شکل میں حکمران تھے۔ ان میں سے اہم ریاستیں مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ **مساگا کی اساکانی حکومت:** پاکستان کے قبائلی علاقے میں اساکانی قبیلہ حکمران تھا۔ اس سلطنت کا دارالخلافہ مساگا تھا۔ یہ جگہ درہ مالاکنڈ کے قریب

ہے۔ یہاں ایک مضبوط قلعہ بھی موجود تھا۔ اور ریاست کی فوج میں بیس ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہی تھے۔ سکندر اور اس کے جرنیل پیری ڈیکس انیس دن تک اس قبیلے کے خلاف نبرد آزما رہے۔

۲۔ **کشمیر کی سلطنت** :- اس زمانے میں کشمیر اور ہزارہ پر راجہ ابھی سارا حکمران تھا۔ لیکن اس کی ریاست میں موجودہ کشمیر کے اکثر علاقے شامل نہ تھے۔ یہ حکمران اگرچہ طاقت ور نہ تھا۔ لیکن راجہ پورس کا دوست تھا۔

۳۔ **ٹیکسلا کی ریاست** :- یہ مشہور ریاست دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقے پر مشتمل تھی۔ اور علم و فنون کا مرکز تھی یہاں کے حکمران کا نام راجہ امبھی تھا۔

۴۔ **راجہ پورس** :- دریائے چناب اور جہلم کے درمیانی دوآبہ میں راجہ پورس حکمران تھا۔ اس کی سلطنت میں موجودہ اضلاع جہلم۔ گجرات اور شاہ پور شامل تھے راجہ بہادر تھا اور اس کے پاس ایک زبردست فوج موجود تھی۔ راجہ کے پاس سو سے زیادہ جنگی ہاتھی۔ ایک ہزار رتھیں۔ تیس ہزار سوار اور پچاس ہزار پیدل فوج موجود تھی دریائے چناب سے لیکر راوی تک کے علاقے پر اس کا کوئی عزیز حکمران تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس راجہ کا نام بھی پورس تھا۔ لیکن مورخین اسے (Younger Porus) کہتے ہیں۔

۵۔ **سانگلا کا کتھائی قبیلہ** :- دریائے راوی اور بیاس کے درمیانی علاقے پر کتھائی قبیلہ حکمران تھا۔ اور سانگلا ان کا دارالخلافہ تھا۔ یہ جگہ موجودہ شہر سیالکوٹ کے قریب ہے۔ یہ قبیلہ جفاکش اور دلاور تھا۔ اور باقی قبائل پر اس اقتدار تھا۔

۶۔ **جھنگ** :- موجودہ ضلع جھنگ میں ایک الگ چھوٹی سی ریاست تھی جس پر SHivis قبیلہ حکمران تھا۔

۷۔ **سبوئی ریاست:** جھنگ اور شورکوٹ کے درمیان میں سبوئی قبیلہ کی علیحدہ حکومت تھی اور راجہ کی فوج چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

۸۔ **خوبصورت لوگوں کی ریاست:** جہلم کے مشرقی علاقے کی جانب ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ جہاں سبھوتی قبیلہ حکمران تھا۔ یہ لوگ خوبصورتی کے شوقین تھے۔ چنانچہ بدصورت بچوں کو جان سے مار ڈالتے تھے۔ لہذا اس علاقے کو خوبصورت لوگوں کی ریاست کہتے تھے۔

۹۔ موجودہ ضلع منٹگمری میں (Kushudrakas) نامی ایک قبیلہ حکمران تھا اور یہ ریاست بالکل چھوٹی تھی۔

۱۰۔ موجودہ ضلع ملتان میں (Mallavas) نامی ایک قبیلہ حکمران تھا۔ اسے مالوئی یا ملاد قبیلہ بھی کہتے ہیں۔

دریائے بیاس کو عبور کرنے کے بعد نندا خاندان کی حکومت شروع ہو جاتی تھی۔ جس کا دارالخلافہ پاٹلی پتر تھا۔

حملے کی وجوہات: سکندر کے حملے کی اصل وجوہات کے بارے میں مورخین میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ حملہ اس لئے ہوا کہ سکندر کو ملک گیری کا شوق تھا اور وہ دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ خرد یرد یز ایرانی شہنشاہ نے یونان فتح کیا تھا۔ اور اس کا بدلہ لینے کے لئے سکندر ایران کے بادشاہ دارا پر حملہ آور ہوا۔ پنجاب چونکہ ایرانی صوبہ تھا۔ اس لئے ایران کے بعد پنجاب کی نوبت آئی۔ اس نظریئے کے خلاف یہ بات نہایت وزنی ہے۔ کہ پنجاب اس زمانے میں چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ایران کے ماتحت نہ تھا۔ لہذا اقرین قیاس یہی بات ہے کہ سکندر کو محض فتوحات کا شوق مغربی پاکستان کے علاقوں میں کھینچ لایا۔

واقعات:- سکندر ۳۲۶ ق۔م میں برصغیر ہند و پاکستان پر حملہ آور ہوا وہ کابل میں ہی تھا۔ کہ ٹیکسلا کے راجہ امبھی کا دعوت نامہ اسے ملا۔ امبھی کی خواہش تھی کہ سکندر راجہ پورس کی سلطنت کو تباہ کر دیوے تاکہ امبھی کا سینہ ٹھنڈا ہو جائے اس نفاق نے سکندر کے کام کو اور بھی آسان کر دیا۔ اس نے اپنی فوج کے دو حصے کئے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے پہلے اُس نے آزاد سرحدی قبائل کی سرکوبی کی اور آخر کار اپنی فوج کو لے کر

دریائے سندھ کے کنارے پہنچا۔ اس نے اوہند (Ohind) کے مقام پر اٹک سے بارہ میل اوپر کشتیوں کا ایک پل بنوایا اور ٹیکسلا کی جانب بڑھا۔ وہاں کے راجہ امبھی نے فوراً اطاعت قبول کی۔ اور سکندر کی فوج کو سستانے کا موقع مل گیا۔ سکندر کو راجہ امبھی نے روپیہ۔ خوراک اور فوج سے مدد بھی بہم پہنچائی اور اسے راجہ پورس پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ کشمیر اور ہزارہ کے راجہ ابھی سارا نے بھی سکندر کی اطاعت قبول کر لی۔ اور سکندر پورس کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھا۔

راجہ پورس سے لڑائی:- ان دنوں دریائے جہلم طغیانی پر تھا اور اسے عبور کرنا آسان امر نہ تھا۔ دریا کی دوسری طرف راجہ پورس اپنی عظیم الشان فوج لئے کھڑا تھا۔ اس کی فوج میں تیس ۳۰ ہزار پیادے۔ چار ہزار سوار تین سو رتھیں اور دو سو جنگی ہاتھی تھے۔ دونوں فوجیں دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر جمی رہیں آخر کار ایک اندھیری رات کو سکندر اپنی فوج کو لے کر دریائے جہلم کے کنارے بیس میل اوپر پہنچا اور دریا کو عبور کر کے پورس کی فوج پر پیچھے سے حملہ آور ہوا۔ اس وقت سکندر کی فوج میں بارہ ۱۲ ہزار پیادے اور پانچ ہزار سوار موجود

تھے۔ اچانک حملے سے راجہ پورس کی فوج پریشان ہوئی اور اس کے ہاتھیوں نے اپنی ہی فوج کو روند ڈالا۔ راجہ پورس کو شکست ہوئی اور اسے گرفتار کرکے سکندر اعظم کے حضور میں پیش کیا گیا۔ پورس کے چہرے پر اب بھی شان بے نیازی تھی۔ سکندر اس کی بہادری اور اس کے دلیرانہ جواب سے بہت خوش ہوا اور نہ صرف پورس کی سلطنت اس کو بخش دی۔ بلکہ مزید علاقہ بھی اسے دیا۔

پورس کو زیر کرنیکے بعد سکندر آگے بڑھا اور وسطی پنجاب کی فتوحات کی جانب متوجہ ہوا۔ موجودہ شہر جہلم سکندر نے آباد کیا تھا۔ اور اس زمانے میں اس شہر کا نام بیوسی فیلا تھا۔ یہ نام سکندر کے گھوڑے کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جو پورس کے خلاف جنگ میں مارا گیا۔ سکندر کا گھوڑا شہر جہلم سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے دفن ہے اور جاہل لوگ اس مقام کو کسی پیر کی قبر شمار کرتے ہیں۔

پورس پر فتح پانے کے بعد سکندر دریائے بیاس تک جا پہنچا۔ راستے میں اسے مختلف مقامات پر کئی ایک قبائل سے لڑنا پڑا۔ جب اس نے دریائے راوی پار کیا تو سب سے اہم لڑائی سانگلا کے مقام پر قبیلہ کتھائی سے ہوئی۔

دریائے بیاس کے کنارے پہنچ کر سکندر کی فوج نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا یونانی فوج کو وطن کی یاد ستا رہی تھی۔ ان لوگوں کو یونان چھوڑنے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ اور دن رات ان کو لڑائی بھڑائی میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ پنجاب میں یونانی فوج کو زمین کے چپہ چپہ کے لئے لڑنا پڑا تھا۔ لہذا سپاہیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ رعب دینے کا وقت نہ تھا لہذا سکندر رائے عامہ کے سامنے جھکا اور فتوحات کی حسرتوں کو دل میں دبائے واپس لوٹا۔

واپسی اور موت :- بیاس سے سکندر خشکی کے راستے دریائے جہلم واپس پہنچا۔ یہاں وہ کشتیوں میں بیٹھ کر پنج ند کے مقام پر فوج سمیت پہنچا۔ یہاں فوج کے دو حصے کئے۔ ایک حصے کو سمندر کے راستے خلیج فارس بھیج دیا۔ اور فوج کے دوسرے حصے کو بلوچستان۔ سیستان اور مکران کے راستے خود لے گیا۔ راستے میں اس نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور ان تمام علاقوں کی خاک چھانی۔ اس کے سپاہیوں کو بیشمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار ۳۲۳ ق م میں وہ بابل پہنچا۔ جہاں اچانک بیمار پڑ گیا۔ چند روز بخار میں مبتلا رہ کر وہ ۳۲ برس کی عمر میں عین جوانی کے عالم میں راہی ملک عدم ہوا۔

سکندر کے حملے کے اثرات

سکندر کی فتوحات فوجی لحاظ سے حیران کن تھیں اور معجزہ سے کم نہ تھیں۔ لیکن عسکری فتوحات عارضی ثابت ہوتی ہیں۔ یونانی سلطنت پائیدار طور پر ہندو پاکستان میں قائم نہ ہو سکی۔ ویسے بھی سکندر قلیل عرصے کے لئے اس برصغیر میں رہا تھا۔ اور تمام مدت جنگ و جدل میں مصروف رہا۔ اسے انتظام ملکی اور استحکام سلطنت کی مہلت نہ ملی لہذا اس کی آمد آندھی کی مانند تھی۔ اور واپسی بگولے کی مانند۔ مطلع صاف ہونے کے بعد اس کے حملے کے اثرات مفقود ہو چکے تھے۔ ہندو مورخ خاص طور پر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سکندر کے حملے نے اس برصغیر پر کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ سکندر کی واپسی اور موت کے بعد اس کے گورنروں اور سپاہ کو مقامی لوگوں نے ختم کر ڈالا اور اس کا حملہ سیاسی طور پر بے اثر ثابت ہوا۔

"Alexander's Indian Campaign, though a grea[t] military feat, proved to be a failure from the politic[al] standpoint."

سکندر صرف بیاس تک پہنچا اور بقایا ہندوستان کے وسیع علاقوں میں اس کی آمد کی خبر بھی نہ ہوئی۔ چنانچہ اس دور کے ہندوستانی ادب میں سکندر کا ذکر تک نہیں ملتا۔ وہ اس برصغیر میں اٹھارہ ماہ کے قریب رہا۔ اور وہ بھی جنگ و جدال میں مصروف رہا۔ لہٰذا سکندر کے حملے کی بدولت ہندوستانی تمدن یا آرٹ پر چنداں اثر نہ ہوا۔ تاہم سکندر کے حملے کے چند دوررس نتائج پیدا ہوئے اور وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ سکندر کے حملے کی بدولت موریا خاندان کی حکومت کا عروج آسان ہو گیا پنجاب پر فوجی یلغار کی بدولت حالات سازگار تھے۔ اور چندر گپت موریا فوراً بادشاہ بن گیا۔ بعد میں چندر گپت موریا نے مقامی لوگوں کو غیر ملکیوں کے خلاف متحد اور منظم کیا۔ اور اسی جذبے کی بنا پر اس نے نند خاندان پر فتح حاصل کی۔

۲۔ سکندر کے حملے کی بدولت ایک متعین سال (Definite date) ہمیں تاریخ برصغیر میں مل جاتا ہے۔ یعنی ۳۲۶ ق م۔ اس حملے کے بغیر اکثر سن اور تاریخیں مبہم رہتیں۔ اور واقعات کی ترتیب میں کافی مشکلات پیش آتیں۔

۳۔ سکندر کی فوج کے ساتھ کئی پڑھے لکھے لوگ بلکہ علما بھی تھے۔ انہوں نے ہند و پاکستان کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ یونانی تحریروں سے اس دور کی تاریخ پر قابل قدر روشنی پڑتی ہے۔ اس دور کے سیاسی، مذہبی اور سوشل حالات کا پتہ بھی آسانی سے چل جاتا ہے۔

۴۔ سکندر کے حملے کے بعد یونان اور ہند و پاکستان کے درمیان دیرپا تجارتی تعلقات قائم ہوئے اور ایک دوسرے سے میل ملاپ کی بنا پر علمی ترقی بھی ہوئی۔

۵۔ ہندو مورخ یہ کہتے ہیں کہ اس دور میں ہندوؤں کا تمدن یونانیوں کی نسبت
اعلیٰ تھا۔ لہٰذا یونانی ان کو کچھ بھی نہ سکھا سکے۔ لیکن ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ یونان
ہمیشہ علم و فن کا مرکز رہا ہے۔ لہٰذا یونانی فلسفے اور طب کا ہند و پاکستان پر خاص طور
پر اثر ہوا۔

۶۔ یونانی اعلیٰ قسم کے مصوّر اور سنگ تراش تھے۔ اور نہایت خوبصورت بُت بناتے
تھے۔ یونانی اثرات کی بنا پر ہندوستان کے آرٹ نے ترقی کی۔ ہندوؤں اور
یونانیوں کے باہمی ملاپ سے گاندھارا سکول آف آرٹ پیدا ہوا جس نے ہندوستان
کی ثقافت پر گہرا اثر چھوڑا ہے

۷۔ یونانیوں نے اس برصغیر میں عمدہ قسم کے سکے رائج کئے۔ ہندوؤں کے سکے
بے ڈھنگے اور بھدّے ہوتے تھے۔ لیکن یونانیوں نے بالکل گول ساخت کے سکے
عام کر دیئے۔ باختری یونانی حکام کے سکے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

Typical Questions

Q. 1. What do you know of the Persian invasion of India? Did it leave any permanent traces?

Q. 2. "Alexander's Indian campaign though a great military feat, proved to be a failure from the political standpoint." Discuss.

Q. 3. Give a brief account of the political condition of Northern India on the eve of Alexander's invasion. Estimate the effects of the invasion.

Q. 4. "The importance of the Indian campaign of Alexander has been both exaggerated and underestimated." Discuss.

Q. 5. Give an account of the invasion of India by Alexander the Great. How did his invasion affect the history of India?

امتحانی سوالات

۱۔ اس ملک پر ایرانی حملے کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ کیا اس حملے کے کوئی مستقل اثرات تھے۔

۲۔ "برصغیر پر سکندر اعظم کا حملہ اگرچہ عسکری لحاظ سے ایک اہم کارنامہ تھا۔ لیکن سیاسی نکتۂ نظر سے یہ حملہ بالکل ناکام اور بے اثر ثابت ہوا۔" تبصرہ کیجئے۔

۳۔ سکندر کے حملے کے وقت شمالی ہندوستان کی سیاسی حالت کیا تھی۔ اس حملے کے اثرات کا جائزہ لیجئے۔

۴۔ "سکندر اعظم کے حملے کی اہمیت کو مبالغہ آمیزی کا رنگ دیا گیا ہے اور اس کے برعکس اسے نظر انداز کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔" تبصرہ کیجئے۔

۵۔ ہندوستان پر سکندر اعظم کے حملے کا حال بیان کیجئے۔ برصغیر کی تاریخ پر اس حملے کے کیا کیا اثرات ہوئے۔

۶۔ مقدونی حملے کے وقت شمالی ہندوستان کی سیاسی حالت پر طائرانہ نظر ڈالئے اور اس حملے کے اثرات واضح کیجئے۔

۷۔ ہندوستان پر اہم ترین ایرانی اور یونانی حملوں کا مختصر حال بیان کیجئے۔ ان حملوں کے نتائج کیا کیا تھے۔

دسواں باب

موریا خاندان کا عروج

سکندر کے بعد چندر گپت موریہ نے پنجاب پر قبضہ جما لیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے شمالی ہندوستان کی سلطنتوں کا صفایا کر کے ہند و پاکستان میں ایک زبردست مرکزی حکومت قائم کر لی۔ اس نے نندا خاندان کے آخری راجہ دھن نند کو بھی تخت سے اتار دیا۔ اور مگدھ کی ریاست پر قبضہ کر لیا چندر گپت پہلا شخص ہے جس نے ہندوؤں کے سامنے ایک مضبوط ریاست کا تخیل پیش کیا۔ اور جس نے لاتعداد مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد ملک بھر میں ایک مستحکم حکومت قائم کی۔ چندر گپت موریا ہندوستان اور پاکستان کا پہلا خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اس نے برصغیر کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا خاتمہ کر دیا۔ اور سیاسی اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کی حکومت کا دور 322 ق م سے شروع ہوتا ہے۔ اور موریہ خاندان کا زوال 185 ق م میں ہوا۔ اگرچہ برصغیر کی قدیم تاریخ کے کئی ایک واقعات اس سے پہلے کے ہیں۔ لیکن چندر گپت کے زمانے سے تاریخی واقعات میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ مختلف واقعات کے سن حتمی طور پر ہمیں معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور تاریکی کا دور مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے اس لحاظ سے موریہ خاندان کا عروج تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے چنانچہ سمتھ صاحب کا قول ہے۔ کہ موریا خاندان کے آغاز سے مورخ تاریکی کے تنگ و تار راستے سے نکل کر روشنی حاصل کر لیتا ہے۔

"The advent of the Mauryan dynasty marks the passage from the darkness to light for the historian"

چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حالات کی بجائے ملکی تاریخ باقاعدگی سے شروع ہو جاتی ہے۔ آرٹ، کلچر، اور مذہبی رواداری کی شاندار مثالیں ملتی ہیں۔ اس دور کے تاریخی ماخذ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱:۔ کوٹلیا یا چانکیہ کا ارتھ شاستر:۔ کوٹلیا یا چانکیہ چندر گپت موریہ کا اتالیق تھا۔ اور اسی کی چالاکی اور ہوشیاری کی بدولت چندر گپت کو مگدھ کا تخت و تاج نصیب ہوا۔ چنانچہ چانکیہ کو چندر گپت نے وزیر اعظم مقرر کیا۔ جاسوسی نظام بھی چانکیہ کے سپرد تھا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ چانکیہ ذات کا برہمن تھا۔ اور وشنو گپت اس کا اصلی نام تھا۔ یہ شخص بلا کا ذہین اور شاعر تھا۔ چندر گپت کی ترقی اسی شخص کی مرہون منت ہے۔ چانکیہ نے ایک اہم کتاب تصنیف کی جسے ارتھ شاستر کہتے ہیں۔ اس کتاب میں فن سیاست پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن نظام الملک کے سیاست نامے کی مانند اس کتاب میں اس دور کے مکمل حالات بھی درج ہیں چنانچہ اس دور کے سیاسی۔ انتظامی اور مجلسی حالات پر یہ کتاب اچھی طرح سے روشنی ڈالتی ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں بادشاہ کو پند و نصیحت کرتے ہوئے مصنف نے اپنا نظریہ اخلاق پیش کیا ہے۔ اس کا فلسفہ اخلاق یہ ہے۔ کہ کامیابی دنیا میں اصل چیز ہے۔ خواہ کامرانی کے حصول کے لئے کوئی سے ذرائع اختیار کئے جائیں۔ اس کا فلسفہ اخلاق مشہور یورپی مفکر میکاولی سے ملتا جلتا ہے۔ چنانچہ چانکیہ کئی بار اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ

(Ends justify the means)

یعنی روحانیت اور مذہب کی قیود کو بالائے طاق رکھ کر جو راستہ بھی اختیار کر لو۔ وہی درست ہے۔ اصل مقصد کامیابی ہے۔ یاد رہے کہ اسلام اس نظریے

کا شدید مخالف ہے۔

ارتھ شاستر میں امپیریلیزم پر خوب زور دیا گیا ہے۔ اور بادشاہ کا اہم ترین فرض یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ ہمسایہ ممالک کے خلاف مسلسل جنگ کی جائے۔ اور اگر کوئی حیلہ بہانہ نہ بھی ملے تو بھی جنگ کی جائے۔ اس تلقین کی بدولت چندر گپت کی سلطنت کی حدود بہت زیادہ وسیع ہو گئیں۔

۲:- میگستھینز کی کتاب "انڈیکا":- میگستھینز ایک یونانی سفیر تھا۔ جسے سلوکس نے چندر گپت کے دربار میں بھیجا۔ یہ شخص کئی سال پاٹلی پتر میں مقیم رہا۔ اور اس نے برصغیر ہندو پاکستان کے چشم دید حالات اپنی کتاب انڈیکا میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب آجکل مفقود ہے۔ لیکن اگر اس کے اقتباسات کو اکٹھا کیا جائے تو اب بھی ایک ضخیم کتاب بن جاتی ہے۔ میگستھینز ایک عالم شخص تھا۔ اور ہر چیز کی تہ تک پہنچ جاتا تھا چنانچہ اس نے کوئی بھی سطحی چیز بیان نہیں کی۔ موریا دور کی تاریخ پر اس کی تحریریں قابلِ قدر ماخذ ہیں۔ اور مستند مانی جاتی ہیں۔ اس نے اس دور کی سوسائٹی، طرزِ حکومت صوبائی اور ملکی نظام اور فوجی نظام کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ لہٰذا اس کی کتاب اس دور کی اہم تاریخ ہے۔

۳۔ مدرا راکشاسا:- پانچویں صدی عیسوی میں وِیشاکھ دت سنسکرت زبان کا ایک مشہور ڈرامہ نویس ہو گزرا ہے۔ اگرچہ یہ ڈرامہ پانچویں صدی میں لکھا گیا۔ لیکن اس ڈرامے کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ ڈرامہ نندا خاندان کے آخری وزیر راکشش کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور چندر گپت اور اس کے وزیر چانکیہ کے حالات بھی اس کتاب میں ملتے ہیں۔

۴۔ مہاراجہ اشوک کے کتبے۔ مہاراجہ اشوک نے (جو موریہ خاندان کا مقتدر شہنشاہ ہو گزرا ہے) اپنے عہد کے واقعات مختلف چٹانوں، کتبوں اور لاٹھوں

پر لکھوائے۔ یہ کتبے موریہ دور کی تاریخ پر اہم ترین ماخذ ہیں۔ اور خاص طور پر مہاراجہ اشوک کے زمانے کے تمام حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشوک کی مذہبی پالیسی کیا تھی۔ اور اس نے بدھ مذہب کی ترویج کے لئے کیا کیا ذرائع اختیار کئے۔

۵۔ مذہبی کتابیں: چندر گپت کو جینی تحریروں میں جین مت کا حامی گنا گیا ہے۔ لیکن مورخین کو اس بارے میں کوئی مزید تاریخی ثبوت نہیں ملا۔ اس کے باوجود جینی کتابوں میں موریہ دور پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں پران میں بھی موریہ خاندان کے بادشاہوں کا ذکر ہے۔ بلکہ ان بادشاہوں کی فہرست اور ان کی حکمرانی کے سن بھی پران میں محفوظ ہیں نیز بدھ مت کے مذہبی ادب میں اشوک کا ذکر خاص طور پر ملتا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ موریا دور پر مذہبی کتابوں نے بھی خوب روشنی ڈالی ہے۔

پس سمتھ صاحب نے درست فرمایا تھا کہ موریا دور ایک ایسا زمانہ ہے کہ تاریکی چھٹ جاتی ہے۔ اور روشنی نمودار ہو جاتی ہے۔ یعنی برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ سلسلہ وار واضح اور متعین ہو جاتی ہے۔

چندر گپت کا ابتدائی دور: چندر گپت موریا کے اصلی خاندان کے بارے میں صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس کے باپ کے بارے میں بھی سخت اختلاف ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب پران میں درج ہے کہ اس کا باپ مگدھ کے نندا خاندان کا ایک فرد تھا۔ لیکن اس کی ماں ایک نیچ ذات کی عورت تھی جسے مورا کہتے تھے۔ اسی لئے چندر گپت کے تخت نشین ہونے پر نئے شاہی خاندان کو موریا کہا جاتا ہے۔ بعض ہند و مورخ اسے کشتری تسلیم کرتے ہیں۔ اور موریا اس کے قبیلے کا نام تصور کرتے ہیں۔ بدھ مت کی تحریروں میں بھی درج ہے۔ نیپال کے

کا خیال یہ ہے کہ چندر گپت شودر تھا۔ اور اس کی ماں شاہی محل میں ملازم تھی جینی کتابوں میں یہ درج ہے۔ کہ اس کے والدین ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی ماں مور چرایا کرتی تھی۔ اور شاہی محل میں ملازم تھی۔

موجودہ دور کے اکثر مورخ بدھ مت کی کتابوں میں درج شدہ حالات کو معتبر خیال کرتے ہیں۔ بدھ مت تحریروں سے یہ بات ظاہر ہے کہ چندر گپت کے قبیلے کی ایک چھوٹی سی جمہوری حکومت تھی۔ جسے مگدھ کے نندا خاندان نے فتح کر لیا۔ چندر گپت نے انتقام کی ٹھانی اور سازگار حالات کا منتظر رہا۔ نندا خاندان کا آخری تاجدار مہاپدم رعایا میں غیر دلعزیز تھا۔ ٹیکسوں کی زیادتی سے رعایا بیزار تھی۔ اور اس کی برہمن آزاری کی بدولت اس سے نفرت کرتی تھی۔ چندر گپت بادشاہ کی مخالف جماعت کا سرغنہ بن گیا۔ لیکن بادشاہ کی ناراضگی سے خائف ہو کر پنجاب چلا گیا۔ ٹیکسلا کے مقام پر چانکیہ سے اس کے تعلقات قائم ہوئے۔ چانکیہ کو نندا خاندان نے ذلیل کر کے نکال دیا تھا۔ لہٰذا اس برہمن نے چندر گپت کو اپنے صلاح و مشورہ سے خوب مدد دی۔ مورخین کا خیال ہے کہ چندر گپت کا عروج چانکیہ کی چالاکی کا نتیجہ ہے۔ چندر گپت سکندر کی فوج میں شامل رہا تاکہ اسے مگدھ پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائے۔ سکندر کی واپسی پر چندر گپت نے مقامی سرداروں کو منظم کیا۔ اور پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اس نے یونانیوں کے خلاف فوجی جذبے کو ابھارا۔ اور سکندر کی وفات کے بعد اس نے یونانی حکمرانوں کو مغربی پاکستان سے نکال دیا۔ غیر ملکیوں کے خلاف تحریک شروع کر کے چندر گپت نے عمدہ چال چلی تھی۔ اور سرحدی علاقوں کے جنگجو قبیلوں کی قیادت اس کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ مغربی پاکستان پر قبضہ کرنے کے بعد چندر گپت نے مگدھ پر حملہ کر دیا۔ اور نندا خاندان کا خاتمہ کیا۔ چندر گپت کی تاجپوشی 322 ق م میں ہوئی۔ اس وقت اس نے تمام شمالی

ہند پر قبضہ جما لیا تھا۔ اور ہند ھیاچل تک اس کی حکومت تھی پاٹلی پتر کو اس نے دارالخلافہ بنا لیا۔ اور چانکیہ اس کا وزیر بنا۔

سیلوکس سے جنگ :۔ سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت اس کے جرنیلوں میں بٹ گئی تھی۔ ان میں قابل ترین جرنیل سیلوکس نکوٹر تھا۔ جس نے اپنے آقا کی ایشیائی سلطنت کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ چندر گپت کا عروج سن کر سیلوکس نے پنجاب دوبارہ چھین لینے کی ٹھانی۔ اور چندر گپت پر حملہ کیا۔ پشاور کے قریب سیلوکس کو شکست ہوئی۔ اور اسے بے بسی کے عالم میں چندر گپت سے صلح کرنی پڑی۔ سیلوکس نے چندر گپت کو مغربی پاکستان و بھارت کا مالک تسلیم کیا۔ اور کابل، قندھار، اور بلوچستان کے علاقے بھی اس کے حوالے کئے نیز اپنی لڑکی کی شادی چندر گپت سے کر دی۔ اور اپنے سفیر میگستھینز کو برصغیر میں چندر گپت کے دربار میں بھیجا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ میگستھینز نے برصغیر کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ اور اس کی تحریریں قابل قدر ہیں۔ اور اہم تاریخی ماخذوں میں سے ہیں۔ یہ سفیر ۲۹۸ ق م تک چندر گپت کے دربار میں رہا۔ چندر گپت نے پانچ سو ہاتھی تحفے کے طور پر سیلوکس کو دیئے۔

چندر گپت نے اس کے بعد اپنی سلطنت کی حدود کو اور بھی وسیع کیا چنانچہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ بھارت میں صرف کالنگا کی حکومت اس کی یلغار سے بچ سکی ورنہ تمام بھارتی علاقہ اس کے قبضے میں تھا۔ ادھر مغربی پاکستان میں کشمیر اور سندھ کے علاوہ تمام علاقہ اس کے قبضے میں تھا۔ بلکہ چندر گپت کی سلطنت کو قدرتی سرحدیں میسر تھیں۔ یعنی کابل اور قندھار بھی اس کے قبضے میں تھا۔ یعنی اس کی حکومت کوہ ہمالیہ سے لے کر بندھیاچل تک اور خلیج فارس سے لے کر خلیج بنگال تک تھی۔ وہ پہلا بادشاہ ہے۔ جس نے ہند و پاکستان میں مرکزی حکومت قائم کی اور

اس برصغیر کو غیر ملکیوں کے پنجے سے نجات دلائی۔ وہ ایک کامیاب سیاسی راہنما ثابت ہوا۔ بہادر اور فاتح تو تھا ہی، وہ ایک عمدہ سیاست دان اور منتظم بھی تھا۔ اگرچہ وہ مطلق العنان اور سخت گیر تھا۔ لیکن ظالم نہ تھا۔ اس کا انتظام سلطنت اتنا عمدہ تھا کہ اس دور کے مبصر بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ مرکز میں مضبوط حکومت تھی۔ لیکن رعایا کو مقامی آزادی بھی حاصل تھی۔ اس کا میونسپل انتظام حیران کن ہے۔ مختلف گاؤں میں اس نے پنچایت سسٹم کو رائج کیا۔ قحط کا قلع قمع کیا۔ اور حفظان صحت کے لئے قابل تعریف انتظام کیا۔ لہٰذا ہم اسے ایک ممتاز اور کامیاب حکمران سمجھتے ہیں۔ سمتھ صاحب اسے ظالم گردانتے ہیں۔ لیکن یہ رائے غلط معلوم ہوتی ہے۔

وفات: چندر گپت کے آخری ایام کے بارے میں سخت اختلاف ہے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ جینی تھا اور تخت سے دست بردار ہونے کے بعد اس نے دنیا ترک کر دی۔ حکومت بیٹے کے سپرد کی اور خود ایک راہب بھدر باہو کے ساتھ جنگلوں میں چلا گیا۔ وہاں جین مت کے اعتقاد کے مطابق اس نے فاقہ کشی اور عبادت اختیار کی اور نجات حاصل کرنے کے لئے فاقہ کشی سے اپنی زندگی کو ختم کیا اس کی وفات ۲۹۸ ق م میں ہوئی۔ لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ اس سن میں تخت سے دست بردار ہوا تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ بارہ سال تک زندہ رہا اور عبادت و ریاضت میں مگن رہا۔

چندر گپت موریا کا انتظام سلطنت

میگستھنیز اور چانکیہ نے چندر گپت کے انتظام سلطنت کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور ان کی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس کی رعایا بڑی خوش اور عمدہ

انتظام سلطنت کی خوب دھوم تھی۔ بادشاہ مطلق العنان اور فرامین کا سرچشمہ تھا۔ لیکن صلاح و مشورہ کے لئے اس کے دربار میں وزراء کی ایک کونسل تھی۔ جس کا صدر چانکیہ تھا۔ ہیول کی رائے یہ ہے کہ چندر گپت آئینی حکمران تھا۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ ہیول کی رائے درست نہیں، چندر گپت نے دفتری نظام کو درست رکھنے کے لئے اور انتظام سلطنت کی عمدگی کے لئے مختلف شعبے قائم کئے ہوئے تھے اور اختیارات کی تقسیم کی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ سخت گیر تھا۔ اور ہر محکمے کے وزیر کو بادشاہ کی منظوری لینی پڑتی تھی۔ بادشاہ ہر محکمے کا خود نگران تھا۔ اور رعایا کے حقوق کی خود نگہداشت کرتا تھا۔ انتظام سلطنت میں چھوٹے چھوٹے امور کی جانب بھی توجہ دیتا تھا۔ اس کا ہر حکم ملکی قانون تھا۔ رواج Customary Law کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور بادشاہ بھی رواج کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ مذہبی قانون کا بھی احترام کیا جاتا تھا۔ رواج اور مذہب کے سوا بادشاہ کی طاقت پر کوئی قید (Limitation) نہ تھی۔

صوبائی اور مرکزی حکومت:۔ یہ امر اب مسلم ہو چکا ہے۔ کہ چندر گپت ایک مطلق العنان اور جابر بادشاہ تھا۔ چانکیہ کی نصیحت کے مطابق وہ کسی افسر پر کامل اعتماد نہ رکھتا تھا۔ لہٰذا وہ تمام شعبوں کی کڑی نگرانی کرتا تھا۔ اگرچہ وہ مذہب اور رواج کا پابند تھا۔ لیکن باقی تمام امور میں وہ اپنی من مانی مرضی کے قوانین بنا سکتا تھا۔ اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ وہی تھا۔ بادشاہ چونکہ روشن خیال تھا۔ اور وزراء سے صلاح و مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اس لئے بعض مورخ اس کی حکومت کو دستوری یا آئینی حکومت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ چندر گپت مطلق العنان بادشاہ تھا۔ اور سلطنت کے انتظام میں شعبہ وار تقسیم محض اس لئے کی گئی تھی۔ کہ بادشاہ کے لئے آسانی رہے۔ بادشاہ سلطنت کے مختلف کاموں

کی نگرانی خود کرتا تھا۔ اور فرصت کے اوقات اسے کم ملتے تھے۔ رعایا کی بہبودی اور عدل و انصاف کا خاص خیال رکھتا تھا۔

ہر شعبے کے لئے الگ وزیر ہوتا تھا۔ اور اس کا تقرر بادشاہ خود کرتا تھا۔ وزراء کی کونسل مجموعی طور پر مل بیٹھتی تھی۔ اور اسے منتری پرشاد کہتے تھے۔ یہ مجلس حکومت کی پالیسی وضع کرتی تھی۔ اور بادشاہ کی خواہش کے خلاف کوئی بات بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اس کونسل کی اہمیت یہ تھی کہ مختلف شعبوں کے کاموں میں ہم آہنگی (Co-ordination) پیدا ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی حکومت کو لازمی طور پر (Despotic) ہی کہا جا سکتا ہے۔

چانکیہ کے ارتھ شاستر میں لکھا ہے کہ حکومت کا انتظام مختلف شعبوں میں منقسم تھا۔ اور ہر شعبے میں باقاعدہ اہل کار اور ناظم موجود تھے۔ انتظام سلطنت کے لئے ملک صوبوں میں منقسم تھا۔ اہم صوبے کی حکومت کے لئے شاہی خاندان کے کسی فرد کو بھیجا جاتا تھا۔ ایسے صوبوں کی تعداد چار تھی میگستھنیز صوبائی حکومت کے بارے میں خاموش ہے۔ لیکن باقی ذرائع سے تمام حالات کا پتہ چلتا ہے۔ گورنر اگرچہ صوبے کا حاکم اعلےٰ ہوتا تھا۔ لیکن مرکزی حکومت سے متواتر ہدایات نافذ ہوتی تھیں۔ اور جاسوسی کے اعلےٰ انتظام کی بدولت صوبے کے متعلق تمام اطلاعات بادشاہ کو پہنچ جاتی تھیں۔ مشہور صوبوں میں سے ٹیکسلا، اجین، سوارنگہری اور توسالی خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ چندر گپت نے اپنی قلمرو میں چند خود اختیاری (Autonomous) ریاستیں بھی شامل کی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کوسمبھی، مالوہ کمبوج اور سوراشٹر مشہور ہیں۔ ایسی ریاستوں کے حکمران کو مہا منتر کہتے تھے۔ ہر صوبہ کئی ایک اضلاع میں منقسم تھا۔ اور انتظامی امور کے لئے باقاعدہ افسر موجود تھے۔ جو انگریزی سول سروس کی مانند تھے۔ یہ افسر آیتیہ یا سچیوا کہلاتے تھے۔ سول افسران ترقی کر کے

وزیر بھی بن جاتے تھے۔ وزیر کو منتری کے نام سے یاد کرتے تھے۔ مہاراجہ کے خاص مشیروں کو منتری پریشد کہتے تھے۔

پاٹلی پترا:- یہ مشہور شہر چندر گپت موریا کا دارالخلافہ تھا۔ شہر کے گرداگرد ایک مضبوط فصیل تھی۔ جس میں 64 دروازے اور 570 برجیاں تھیں۔ شہر کے باہر ایک خندق بھی تھی۔ جس کی چوڑائی 600 فٹ تھی۔ شہر ازحد بارونق اور وسیع تھا۔ اور دریائے سون اور گنگا کے سنگھم پر واقع تھا۔ دریائے سون کے ایک کنارے کی جانب یہ شہر نو میل تک پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے درمیان میں شاہی محل تھا جو لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ میگستھینز نے اس شہر اور شاہی محل کی خوب تعریف کی ہے محل کے علاوہ اکثر عمارات لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ اینٹ اور چونا کم استعمال ہوتا تھا۔ شاہی محل کے قریب عمدہ باغات کا سلسلہ تھا۔ جن میں پھل پھول اور سایہ دار درخت کثرت سے تھے۔ زیبائش کے لئے پانی کے تالاب اور ان میں رنگ دار مچھلیاں بھی ہوتی تھیں بادشاہ کو پالتو جانوروں کا بھی شوق تھا۔ ہاتھیوں کی لڑائی اور بیلوں کی دوڑ بادشاہ کی دلپسند تفریح تھی۔ بادشاہ جب سفر کو نکلتا تو سڑکوں پہ باقاعدہ پہرہ ہوتا تھا شاہی محل میں کئی ایک پہرہ دار عورتیں تھیں۔ چندر گپت کا خیال تھا۔ کہ مرد پہرہ دار بادشاہ کو قتل کر کے تخت و تاج کے لئے کوشش کر سکتا ہے۔ اس لئے شاہی محل میں صرف عورتوں کو پہرہ پر مامور کرنا چاہیئے۔ ان عورتوں کو فنونِ جنگ میں باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ مزید احتیاط کی بنا پر بادشاہ ہر رات کو مختلف کمروں میں سوتا تھا۔

میونسپل نظام:- اگرچہ میگستھینز نے صرف پاٹلی پتر کے میونسپل نظام کا ذکر کیا ہے لیکن مورخین کا خیال ہے۔ کہ چندر گپت موریہ کے زمانے میں کئی ایک بڑے شہر آباد تھے۔ اور اس کی سلطنت میں شہری زندگی خوب منظم تھی۔ اور باقی شہروں

کا میونسپل نظام بھی پاٹلی پتر سے ملتا جلتا تھا۔

شہری انتظام کے لئے تیس آدمیوں پر مشتمل ایک کمیٹی تھی اور مزید سہولت کے لئے اس کمیٹی کے ممبران چھ بورڈوں میں منقسم تھے۔ یعنی ہر بورڈ کے پانچ ممبر تھے اور یہ بورڈ ایک الگ شعبہ یا محکمہ تھا۔ شہری انتظام کے متعلق تمام فرائض ان بورڈوں کے سپرد تھے۔ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آیا ابتدا یہ تیس ناظم منتخب ہوتے تھے۔ یا ان کو حکومت خود نامزد کرتی تھی۔ میگستھنیز کی تحریروں سے یہ واضح ہے کہ یہ ارکان شہری انتظام کے لئے مکمل طور پر ذمہ دار تھے۔ حفظان صحت شہری منڈیوں کا انتظام، مندروں کی نگرانی۔ قیمتوں کا تعین۔ لوکل ٹیکس۔ بکری ٹیکس پبلک مفاد کی عمارات کی تعمیر اور مرمت سبھی کچھ اسی کمیٹی کے سپرد تھا۔ گویا موجودہ دور کی میونسپل کمیٹی کے فرائض ان بورڈوں کے سپرد تھے۔ یہ بورڈ مندرجہ ذیل تھے

۱۔ صنعت و حرفت (Board of Labour) اس بورڈ کا فرض یہ تھا کہ صنعت و حرفت کی نگرانی کرے۔ قیمتوں کی پڑتال کر کے ان کا تعین کرے۔ مزدوروں کی اجرت کا بھی تعین کرے۔ خالص خوراک کی بہم رسانی کا بندوبست کرے۔ اور صنعت و حرفت کی ترقی کے وسائل سوچے۔

۲۔ غیر ملکیوں کے لئے بورڈ۔ دوسرے بورڈ کا فرض یہ تھا۔ کہ غیر ملکی باشندوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ ان کی محض نگرانی کرنے کی بجائے ان کو آسائشیں مہیا کی جاتی تھیں۔ اگر کوئی مسافر فوت ہو جاتا تو اس کے مال و اسباب کو اس کے ورثاء کے پاس پہنچا دیا جاتا تھا۔

۳۔ اعداد و شمار (Census) تیسرا بورڈ اعداد و شمار کا حساب رکھتا تھا۔ اس بورڈ میں اموات کا رجسٹر تھا۔ اور پیدائش بھی باقاعدہ درج ہوتی تھی۔ ان رجسٹروں سے ملکی آبادی کا پتہ چل جاتا تھا۔ گویا یہ مردم شماری کا ابتدائی

طریقہ تھا۔

۴ :۔ تجارتی امور :۔ چوتھا بورڈ نہایت اہم تھا۔ اور تجارتی امور اس کے سپرد تھے۔ بٹے اور پیمانے اسی بورڈ کی نگرانی میں تھے۔ تاجروں سے ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ شرح تبادلہ مقرر کی جاتی تھی۔ اور خرید و فروخت کے متعلق تمام مسائل کا خیال رکھا جاتا تھا۔

۵۔ محصول :۔ یہ بورڈ بکری ٹیکس اور باقی محصولات وصول کرتا تھا۔ اور محصول ادا نہ کرنے والوں کو سزا دیتا تھا۔ یہ سزائیں وحشیانہ تھیں۔ مثلاً بکری ٹیکس ادا نہ کرنے والے کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔

۶۔ متفرق امور :۔ چھٹے بورڈ کے پاس متفرق امور تھے۔ یہ بورڈ تاجروں کے خاص حقوق کی نگہداشت بھی کرتا تھا۔ اور مختلف اشیا کی تیاری (Manufacture) اور فروخت کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اس بورڈ کا فرض تھا کہ اس بات کا خیال رکھے۔ کہ کارخانہ دار ویسی ہی اشیا بنائیں۔ جیسی مختلف اشخاص نے ان سے طلب کی ہیں یعنی اس بورڈ کا اہم کام (Co-ordination) اور عام نگرانی تھی۔

اپنے اپنے بورڈوں میں کام کرنے کے علاوہ بلدیہ کے تمام ارکان مجموعی طور پر بھی رفاہِ عام کے کاموں کے نگران تھے۔ بورڈوں کے علاوہ شہری انتظام کے لئے ایک علیحدہ حاکم بھی ہوتا تھا۔ شہر کے لوگوں کے لئے سہولت مہیا کرنا۔ عمارات، تعلیم، زراعت، جنگلات اور آب پاشی کے ذرائع کی بہتری اس کے فرائض میں شامل تھی۔ گویا برطانوی دور کے ڈپٹی کمشنر کے مترادف تھا۔

حکومت کے مختلف شعبے :۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کہ مرکزی حکومت خوب مضبوط تھی۔ لیکن حسنِ انتظام کے لئے ملک صوبوں میں بٹا تھا۔ صوبوں کے بعد ضلع وار تقسیم تھی۔ اور پھر ملکی دفاع کے لئے مختلف دیہات کی گروہ بندی کی گئی

تھی۔ گاؤں کا افسرِ اعلیٰ گرامنی کہلاتا تھا۔ ہر گاؤں میں پنچایت کا رواج تھا پنچایت میں گاؤں کے مقتدر افراد ہوتے تھے۔ انتظامی امور میں پنچایت حاکم اعلیٰ کی ممد و معاون ہوتی تھی۔

جاسوسی نظام:۔ چانکیہ نے جاسوسی نظام پہ بہت زور دیا ہے۔ چندر گپت کے زمانے میں وہ خود جاسوسی نظام کا انچارج تھا۔ شاہی جاسوس خاص طور پر سرکاری حکام کے متعلق اطلاعات پہنچاتے تھے۔ ملک کے عام حالات سے بھی جاسوس بادشاہ کو باخبر رکھتے تھے۔ جاسوسی کا محکمہ ہر حالت میں قابلِ اعتماد اور معاملہ فہم لوگوں کے سپرد تھا۔ عورتوں کو بھی اس محکمے میں ملازم رکھا جاتا تھا۔ میگستھنیز اس محکمے کے کارناموں کی از حد تعریف کرتا ہے۔

عدالتی نظام:۔ چندر گپت موریا عدل و انصاف کا دلدادہ تھا لیکن اس کا یہ نظریہ تھا۔ کہ مجرموں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ تاکہ باقی لوگ عبرت پکڑیں۔ مورخ اس کی سزاؤں کو وحشیانہ اور ظالمانہ گنتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سختی کی بدولت رعایا قانون کا احترام کرنے لگی۔ اور جرائم کی تعداد گھٹتے گھٹتے بالکل قلیل ہو گئی۔ میگستھنیز کا بیان ہے کہ معمولی جرم کی سزا پھانسی تھی اور سزا کے طور پر جسم کے عضو کاٹ ڈالنا عام رواجی سزا تھی۔

چندر گپت موریا پہلا بادشاہ ہے۔ جس نے برصغیر میں باقاعدہ عدالتی نظام رائج کیا۔ یہ عدالتیں ملک کے ہر خطے میں موجود تھیں۔ ججوں کا تقرر بادشاہ خود کرتا تھا ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف بادشاہ کے حضور میں اپیل ہو سکتی تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ بادشاہ عدل و انصاف کا سرچشمہ تھا۔ اور اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون تھا۔ چندر گپت محکمۂ انصاف کی نگرانی خود کرتا تھا۔ گاؤں کے جھگڑے چکانے کے لئے پنچایت سسٹم موجود تھا۔ صرف اہم مقدمات ہی

عدالتوں میں پہنچتے تھے۔ ورنہ رواج کے مطابق پنچایت میں ہی جھگڑے ختم ہو جاتے تھے۔ منوسمرتی کے قوانین کو سامنے رکھتے ہوئے ملکی قانون رائج کیئے گئے تھے۔

فوجی نظام:۔ چندر گپت موریا کے پاس ایک زبردست تربیت یافتہ فوج تھی۔ اور فوجی معاملات کے انتظام کے لئے الگ شعبے موجود تھے۔ فوجی افسران اور تمام لشکری براہِ راست بادشاہ کے ماتحت تھے۔ شاہی فوج میں چھ لاکھ پیادے تیس ہزار سوار۔ نو ہزار جنگی ہاتھی۔ آٹھ ہزار رتھ موجود تھے۔ بحری فوج بھی موجود تھی۔ رسل و رسائل کے نگہران دستے اس تعداد کے علاوہ تھے چانکیہ کی تحریروں سے چندر گپت کی فوج پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شاہی فوج کے ہتھیار تلوار۔ نیزہ اور بھالے پر مشتمل تھے۔ تیر اندازی نہایت مقبول تھی۔ چنانچہ ہر جنگی ہاتھی پر مہاوت کے علاوہ تین تیر انداز ہوتے تھے۔ ڈھال کا رواج تھا۔ اور سپاہی زرہ بکتر بھی پہنتے تھے۔ رتھوں کا استعمال عام تھا۔ رتھوں میں بیل جتتے تھے۔

فوجی امور کی نگہداشت کے لئے ایک باقاعدہ کونسل تھی جس کے ارکان کی تعداد تیس تھی۔ یہ افراد چھ بورڈوں میں منقسم تھے اور ہر بورڈ اپنے فرائض کو تندہی سے بجالاتا تھا۔ ہر بورڈ مندرجہ ذیل امور کا نگران تھی۔

(۱) پیدل فوج (۲) رسالہ (۳) رسد رسانی (۴) جنگی رتھیں (۵) جنگی ہاتھی (۶) بحری فوج۔

فوج کو نقد تنخواہ دی جاتی تھی۔ اور ایشیا بھر میں چندر گپت کی فوج بہترین اور بہادر ترین خیال کی جاتی تھی۔

مالی نظام:۔ زرعی زمینوں کا مالیہ حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔ اور

مالیہ کی شرح وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی۔ عام طور پر مالیہ کی شرح کل پیداوار کے تیسرے حصے سے لے کر پانچویں حصے تک ہوتی تھی۔ رعایا کو اجازت تھی۔ کہ نقدی کے علاوہ مالیہ کی ادائیگی جنس یا مویشیوں کی صورت میں بھی کر دیں۔ حکومت زراعت کے لئے خاص اقدام کرتی تھی۔ آب پاشی کے لئے نہریں اور تالاب حکومت کے خرچ پر بنائے گئے تھے۔ لیکن آبیانہ وصول نہ کیا جاتا تھا۔

حکومت کی بقایا آمدنی کا ذریعہ مختلف ٹیکس تھے۔ جو سختی سے وصول کئے جاتے تھے۔ بکری ٹیکس کی ادائیگی ہر دکاندار کے لئے لازم تھی۔ ہر شہر میں داخل ہوتے وقت درآمد شدہ اشیاء پر محصول چونگی لیا جاتا تھا۔ مختلف پلوں پر سے گزرتے وقت (To lls) ادا کرنے پڑتے تھے۔ یہ ٹیکس فی کس کے حساب سے لیا جاتا تھا۔ موجودہ دور کے (Excise) ٹیکس بھی موجود تھے۔ یعنی شراب کی فروخت پر خاص ٹیکس تھا۔ اس کے علاوہ قمار بازی کے اڈوں اور چکلوں پر بھی ٹیکس لاگو تھا۔ معدنیات کی کانوں اور جنگلات سے بھی حکومت کو معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ رعایا میں سے اگر کوئی لاوارث مر جائے۔ تو اس جائداد پر حکومت قبضہ کر لیتی تھی۔

ذرائع آمد و رفت:۔ چندر گپت موریا کے زمانے میں پہلی بار حکومت نے ذرائع آمد و رفت کی جانب توجہ مبذول کی۔ چنانچہ ملک بھر میں سڑکوں کا جال بچھایا۔ سڑکوں کی مرمت مقامی باشندوں کا فرض تھا۔ چانکیہ نے شاہی سڑکوں کا طویل حال بیان کیا ہے۔ ارتھ شاستر میں یہ لکھا ہے۔ کہ شاہی سڑکوں پر دو رویہ سایہ دار درخت لگوائے ہوئے تھے۔ مسافروں کی سہولت کیلئے سرائیں اور کنوئیں بھی تعمیر کئے گئے تھے۔ دریاؤں اور نہروں پر پل باندھے گئے۔ دریائی تجارت کو فروغ دینے کے لئے شاہی کشتیاں بھی بنوائی گئیں سمندری جہاز

بھی موجود تھے۔ جو کرایہ پر عوام کو مل سکتے تھے۔ سمندری ڈاکوؤں سے تاجروں کے بچاؤ کے لئے حکومت کی جانب سے خاص انتظامات تھے۔ آمدورفت کے ذرائع کی بدولت تجارت کو خوب فروغ ہوا۔

موریا دور کے متعلق میگستھنیز کے بیان کردہ خاص حالات

چندر گپت موریا کی حکومت اور انتظام سلطنت کے بارے میں میگستھنیز اور چانکیہ کے بیانات میں بہت کم فرق ہے۔ چندر گپت کے بیان کردہ حالات اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ لیکن میگستھنیز نے اپنی تحریر میں برصغیر ہند و پاکستان کے بارے میں چند خاص حالات کا ذکر کیا ہے۔ ان کا مختصر سا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس کی بیان کردہ خاص چیزیں درج ذیل ہیں۔

مذہب:۔ میگستھنیز بیان کرتا ہے کہ لوگ ضعیف الاعتقاد تھے۔ اور فال، رمل، اور جادو میں پکا یقین رکھتے تھے۔ ملک میں برہمنوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ لیکن بدھ مت اور جین مت کا اثر عوام پر کافی تھا۔ اسی بنا پر ترکِ دنیا کا عام رواج تھا۔ اور یوگی بھی کثرت سے پائے جاتے تھے۔ مذہبی راہنماؤں میں فلسفی اور راہب طبقہ اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ راہب اکثر ننگے رہتے تھے۔ اور تپسیا یا عبادت میں وقت گذارتے تھے۔ یونانی فلسفہ اور ہندی فلسفہ میں زبردست مشابہت موجود تھی۔

ذات پات:۔ میگستھنیز نے دلچسپ ترین بات یہ بیان کی ہے۔ کہ ذات پات کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اور قدیم برنوں کی بجائے ہندو سوسائٹی سات جماعتوں میں منقسم تھی۔ یہ نئی تقسیم یوں تھی۔

۱۔ فلسفی، راہب اور علماء۔ ان کا گروہ اکثر ننگا رہتا تھا۔ اور عبادت میں وقت

گذارتا تھا۔ عالم لوگ بعض اوقات بادشاہ کو بھی اپنے مشوروں سے نوازتے تھے

۲۔ راجہ کے درباری امرا ۔ وزراء اور مشیر۔

۳۔ کھشتری یا فوجی ملازم۔ یہ جماعت نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ کیونکہ ملکی حفاظت ان کے سپرد تھی۔

۴۔ کاشت کار اور زمیندار۔

۵۔ چرواہے اور شکاری۔ حکومت چرواہوں کی مدد کرتی تھی تاکہ ملک بھر میں مویشیوں کی حالت اچھی رہے

۶۔ تاجر۔ کاریگر اور صناع۔

۷۔ جاسوس اور مخبر

قدیم قسم کی ذات پات کے مطابق موریا دور میں اعلیٰ ذات اور گھٹیا ذات کی تمیز نہ تھی۔ بلکہ پیشوں کے مطابق سوسائٹی مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔

سوشل حالات :۔ میگستھنیز بیان کرتا ہے کہ لوگ خوشحال اور فارغ البال تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دراز قد اور توانا جسم والے تھے۔ شراب سے اجتناب کرتے تھے۔ لیکن بھنگ پینے کا رواج عام تھا۔ لوگ وعدے کے پکے تھے۔ اسی لئے تجارت میں بھی تحریر کی بجائے زبانی اقرار کافی سمجھا جاتا تھا۔ مقدمہ بازی کم تھی۔ فیشن مفقود تھے۔ لیکن زیورات کا شوق زیادہ تھا۔ پردہ اور ستی کا رواج بالکل نہ تھا۔ عورتوں کو کافی آزادی حاصل تھی عوام ایک ہی شادی پر اکتفا کرتے تھے۔ لیکن امیر لوگ ایک ہی وقت میں زیادہ بیویاں رکھ سکتے تھے۔ عوام اکثر سوتی کپڑے پہنتے تھے۔ لیکن امرا کے کپڑے ازحد قیمتی ہوتے تھے اور ان میں جواہرات بھی لگے ہوتے تھے۔ مختلف تہواروں کے موقع پر شاندار جلوس نکالے جاتے تھے۔ لوگ لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے تھے۔

میگستھینز کا بیان ہے کہ عوام دیانت دار تھے۔ چوری، ڈاکہ اور جھوٹ کا نام و نشان نہ تھا۔ لوگ گھروں میں قفل نہ لگاتے تھے۔ چوری کی سزا موت تھی۔ ملک بھر میں گانے اور ناچنے کا شوق بہت زیادہ تھا۔ بعض لوگ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے۔ اور کاغذ کے استعمال سے واقف تھے۔ میگستھینز نے بہت سی بے بنیاد باتیں بھی لکھ ڈالی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ اس ملک میں غلامی مفقود تھی حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ اسی طرح سے اس نے لوگوں کی ضعیف الاعتقادی کے ناقابل یقین قصے بیان کئے ہیں۔ جو محض خیالی معلوم ہوتے ہیں۔

شفا خانے:۔ میگستھینز کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چندر گپت موریا کے زمانے میں حکومت کی جانب سے شفاخانے موجود تھے۔ ان سرکاری شفاخانوں میں غیر ملکیوں کا بھی علاج ہوتا تھا۔ ہسپتالوں میں مرنے والے لاوارث اشخاص کی کریاکرم یعنی آخری مذہبی رسوم بھی حکومت کے خرچ سے ادا کی جاتی تھیں۔ میگستھینز کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کو عوام کی صحت کا خاص خیال تھا۔

رفاہِ عام اور ذرائع آمد و رفت:۔ میگستھینز لکھتا ہے۔ کہ چندر گپت موریا نے رفاہِ عام کے امور پر خاص زور دیا تھا۔ اس نے ملک بھر میں سڑکوں کا جال بچھا کر تجارت کو فروغ دیا۔ اور عوام کے لئے ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس کے علاوہ اس نے جابجا پانی کے کنوئیں اور مسافر خانے بنوائے۔ سڑکوں پر دو رویہ سایہ دار درخت لگوائے۔ مختلف علاقوں میں سڑکوں کی چوڑائی یکساں نہ تھی۔ جنوبی ہند کو ملانے والی سڑک ازحد اہم تھی۔ مشہور سڑکیں شمالی ہند میں تھیں۔ سڑکوں سے پشاور اور ٹیکسلا، ہستناپور، قنوج، پریاگ، کاشی اور پاٹلی پتر کو ملایا ہوا تھا۔ سڑکوں کی مرمت مقامی باشندوں کے سپرد تھی۔ اور بعض دفعہ اس صلے میں ان کے ٹیکس معاف کر دیئے جاتے تھے۔

مختلف تفصیلات: میگستھنیز لکھتا ہے کہ ملک بھر میں مختلف قبیلے بستے تھے۔ بعض قبیلے محض باجگذار تھے۔ اور ان کی اپنی فوج تھی۔ ملک کا اکثر حصہ زیر کاشت تھا۔ بارش خوب ہوتی تھی لیکن پھر بھی آبپاشی کا معقول انتظام تھا۔ بادشاہ اور رعایا دونوں شکار کے شوقین تھے۔ اور مخصوص شکار گاہوں میں شکار کے متعلق خاص قوانین بھی تھے۔

میگستھنیز اس بات پر حیران ہے۔ کہ اس ملک میں معدنیات کی فراوانی ہے۔ معدنیات میں وہ سونے چاندی کے علاوہ تانبے اور لوہے کا ذکر بھی کرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوہے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ وہ جنگلی جانوروں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اور خاص طور پر شیر، چیتا اور ہاتھی کا ذکر کرتا ہے۔ اڑنے والے جانوروں کا کثرت سے ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہ بات محض خیالی معلوم ہوتی ہے۔

میگستھنز نے برصغیر ہند و پاکستان کی زرعی پیداوار کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ایک دلچسپ بات جو اس نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ اس ملک میں نباتاتی اون پیدا ہوتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دراصل وہ کپاس کا ذکر کر رہا ہے اسی طرح وہ یہ بھی لکھتا ہے۔ کہ اس ملک میں ایک خاص قسم کا سرکنڈا بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ جس سے شہد کی مکھیوں کے بغیر شہد نکلتا ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ دراصل گنے کا ذکر ہے۔

میگستھنیز یہ بھی لکھتا ہے۔ کہ اس ملک کے دریاؤں میں بڑے بڑے جہاز چل سکتے ہیں۔ یہ مبالغہ آمیزی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ میگستھنیز نے جلد بازی میں عام کشتیوں کو جہاز لکھ ڈالا ہو۔

بندوسار: چندر گپت کے بعد 298 ق م میں اس کا بیٹا بندوسار تخت نشین ہوا۔ اور 273 ق م تک حکمران رہا۔ بندوسار کو سنسکرت کی کتابوں

ہیں متراجیت لکھا ہے۔ یونانی مورخ بھی بندوسار کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں لیکن متراجیت اس کا لقب تھا۔ نام نہیں تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بندوسار کے پچیس سالہ عہد حکومت کے حالات کہیں سے دستیاب نہیں ہوتے مورخین کا قیاس ہے کہ بندوسار کا دور واقعات کے لحاظ سے خالی تھا۔ کیونکہ اس نے محض اپنے باپ کے رائج کردہ انتظام سلطنت کو قائم رکھا۔ اور حکومت کا کاروبار خود بخود چلتا گیا۔

بندوسار کے عہد حکومت میں راجکمار اشوک کو ٹیکسلا کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اور اشوک نے ٹیکسلا کی بغاوت کو بھی فرو کیا۔ بندوسار کے زمانے میں دکن میں بھی بغاوت ہوئی۔ اور دکنی علاقوں کو دوبارہ فتح کیا گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ دکن کی تسخیر کے بعد بندوسار نے امتراکھٹے (متراجیت) (Amitraght i. e. slayer of foes) کا لقب اختیار کیا۔ اس لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں حدود سلطنت کو مزید وسیع کیا گیا۔ اور خیال کیا جاتا ہے۔ کہ وہ جنگ و جدال کا از حد شوقین تھا۔ لیکن ہمسایہ ممالک سے اس کے تعلقات نہایت اچھے تھے۔ چنانچہ یونان، مصر، شام اور ایران کے سفیر اس کے دربار میں موجود تھے۔ اس کے باوجود بندوسار کے بارے میں تاریخی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی وفات پر مہاراجہ اشوک تخت نشین ہوا

Jump. ✻

مہاراجہ اشوک

اشوک ہند و پاکستان کی تاریخ میں ایک جلیل القدر شہنشاہ ہو گزرا ہے اور دنیا بھر کے ممتاز تاجداروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ تاریخ عالم میں وہ پہلا تاجدار ہے۔ جس نے مذہبی رواداری کا سبق دیا۔ اس نے کشت و خون کو ترک کر کے

رعایا کی فلاح وبہبودی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ اور عوام کی روحانی ترقی اور اخلاقی بہتری کا خیال بھی رکھا۔ اشوک کو بجا طور پر امن و رواداری کا دیوتا کہا جاتا ہے۔

مہاراجہ اشوک کے دورِ حکومت کے بارے میں تاریخی ماخذ کئی ایک ہیں۔ برہمن، جینی اور بدھ علماء کی تحریروں میں مہاراجہ اشوک کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع ہے۔ برہمن اور جینی اس کے سخت مخالف ہیں۔ لیکن بدھ علماء کی تحریروں نے اسے فرشتہ سیرت ظاہر کیا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ دونوں نے حدِ اعتدال سے کام نہیں لیا ہے۔ اس کے برعکس اشوک کے اپنے کتبے مستند ہیں۔ یہ کتبے ملک بھر میں لاٹھوں، چٹانوں، اور غاروں کے پتھروں پر کندہ ہیں۔ اور اشوک کے عہدِ حکومت کے بارے میں اہم ترین ماخذ ہیں۔

ابتدائی دور اور کالنگا کی جنگ :۔ اشوک ۲۷۳ ق۔م میں تخت نشین ہوا۔ اور ۲۳۲ ق۔م تک اس کا عہدِ حکومت رہا۔ بدھ مت کی تحریروں میں یہ ذکر ہے کہ شہزادگی کے زمانے میں وہ ٹیکسلا کا گورنر رہا۔ اور بعد میں اجین کا وائسرائے بھی بنا۔ نیز یہ بھی ذکر ہے کہ بندوسار نے اپنی زندگی میں ہی اسے اپنی جانشینی کے لئے نامزد کر دیا تھا۔ لنکا کی روایات میں یہ ذکر ہے کہ بندوسار کی وفات کے بعد اشوک اور اس کے بھائیوں میں تخت نشینی کی خونریز جنگ ہوئی جس میں اشوک کے ہاتھوں اس کے ننانوے بھائی مارے گئے۔ مورخین اس روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے۔ بعض روایات میں یہ ذکر ہے کہ تخت کے لئے کشمکش محض اشوک اور اس کے بڑے بھائی سوسیم کے درمیان ہوئی اور اس جنگ میں چار سال صرف ہوئے۔ اسی بنا پر ۲۷۳ ق۔م کی بجائے اشوک

کی تاجپوشی 269 ق م میں ہوئی۔ موجودہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہے۔ کہ اشوک نے اپنے بھائیوں کے قتل کے بعد تخت حاصل نہیں کیا بلکہ بندوسار نے اسے ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ اس کی تاجپوشی چار سال بعد ہوئی۔ کیونکہ اس زمانے کے رواج کے مطابق کسی حکمران کی تاجپوشی چھبیس برس کی عمر سے پہلے نہ ہو سکتی تھی۔ اور تخت نشینی کے وقت اشوک کی عمر اکیس سال کی تھی۔

اشوک نوجوان تو تھا ہی۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے باپ دادا کی مانند مزید علاقے فتح کرنے کی ٹھانی۔ وہ جنگ و جدل اور سیر و شکار کا شوقین تھا اور علوم و فنون کے علاوہ اس نے فنون جنگی میں بھی اعلےٰ تعلیم پائی تھی۔

261 ق م میں اشوک نے محض فتوحات کے شوق میں کالنگا کی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ یہ مضبوط سلطنت دریائے گوداوری اور مہاندی کے درمیان مشرقی گھاٹ کی طرف واقع تھی۔ مورخین کا خیال ہے۔ کہ اس علاقے کو آجکل اڑیسہ کہتے ہیں۔ یہ خود مختار ریاست اگرچہ چھوٹی سی تھی۔ لیکن اس ریاست کے عوام نے بھی فوج کے دوش بدوش لڑ کر اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن اشوک کے ایک لشکر جرار کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ اشوک کو فتح ہوئی اور کالنگا کے ایک لاکھ سپاہی مارے گئے۔ اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی اسیر ہوئے۔ فتح کے بعد اشوک جب میدان جنگ سے گزرا تو کشت و خون کا بھیانک منظر دیکھ کر اس کا دل ہل گیا۔ اور اس نے جنگ سے توبہ کر لی۔ اس نے سمجھ لیا کہ جنگ کی بدولت خلق خدا کا ناحق خون ہوتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ پسماندگان کے لئے بھی تباہی اور زبوں حالی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کالنگا کی فتح کے بعد وہ آہستہ آہستہ بدھ مت کی جانب راغب ہوا۔ کیونکہ آہنسا کے اصول میں اس کے لئے کشش تھی۔ اتفاق سے مشہور بدھ بھکشو اُپا گپتا کی صحبت اشوک کو میسر ہوئی۔ جس نے آخرکار اسے بدھ مذہب

کا پیرو کار بنا دیا۔

کالنگا کی جنگ نے اشوک کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب بپا کر دیا۔ اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست اس کے قبضہ میں آگئی۔ لیکن اس کے بعد اشوک نے ملک گیری کی پالیسی ترک کر دی۔ امپیریلزم کی بجائے خدمت خلق کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی شمشیر زنی کی بجائے اس نے دھرم کی اشاعت سے لوگوں کو مسخر کرنے کا عزم کر لیا۔ عوام کی روحانی ترقی اور اخلاقی بہتری پر زور دیا۔ اور دنیا کو امن و آشتی کا پیغام دیا وہ پہلا شہنشاہ ہے۔ جس نے رواداری کی پالیسی اختیار کی۔ اور رعایا کو راست بازی اور نیکی کا سبق دیا۔ بعد میں اشوک نے اپنی تمام زندگی بدھ مت کی ترقی و ترویج کیلئے وقف کر دی۔ اور اس مذہب کو عالمگیر مذہب بنا دیا۔ پس کالنگا کی جنگ نتائج کے لحاظ سے معمولی جنگ نہ تھی۔ بلکہ برصغیر کی تاریخ پر اس کے دوررس اثرات ہوئے اشوک نے اپنے ایک کتبے میں کالنگا کی جنگ کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس کتبے میں اشوک نے جنگ کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ دھرم کی پناہ میں آکر اسے سچی خوشی ملی۔ اور سکون قلب حاصل ہوا ہے۔

بدھ مذہب اختیار کرنے کے بعد اشوک نے شکار ترک کر دیا۔ اور گوشت خوری بند کر دی۔ بلکہ یہ حکم دے دیا کہ شاہی مطبخ کے لئے بھی جانوروں کو ذبح کرنا بند کر دیا جائے۔ سیر و شکار کی بجائے اس نے آئندہ کے لئے مذہب کی اشاعت کے لئے سفر اختیار کئے۔ اور ان (Inspection Tours) کے ذریعے ملکی حالات معلوم کئے۔ تاکہ رعایا کی بہبودی کا خیال رکھا جائے۔

ضابطۂ اخلاق یا دھمہ (Laws of Piety): بدھ مذہب قبول کرنے کے بعد اشوک نے رعایا کے لئے ایک نیا ضابطۂ اخلاق نافذ کیا۔ یہ اصول نیکی اور راستبازی سکھاتے تھے۔ اس لئے ان کو Laws of Piety کہتے ہیں۔ بدھ مت کی اصطلاح میں ان

اصولوں کو دھرم (Dhama) کہا جاتا ہے۔ یہ اصول بالکل سادہ تھے۔ یہ مذہبی جھگڑوں سے پاک تھے۔ اور ان میں فلسفیانہ بحث مطلق نہ تھی۔ یہ اصول صرف روزمرہ زندگی کو بہتر بنانے کے لئے تھے۔ لیکن ان اصولوں کی بنیاد بدھ مت کی تعلیمات پر تھی۔ عوام میں اشوک نے اپنے وضع کردہ اصولوں کی تبلیغ کی لیکن رعایا کو محض یہی پتہ تھا کہ نیک دل بادشاہ رحمت باری کے چند اصول رائج کرنا چاہتا ہے۔ نیز مذہبی معاملات میں اشوک نے کامل رواداری برتی اور کسی شخص پر جبر نہ کیا۔ اس ضابطہ اخلاق کی اہم باتیں یہ تھیں۔

(۱) اہنسا کی پابندی :۔ یعنی کسی جاندار کو اذیت نہ دی جائے۔ بلکہ ہر ایک سے شفقت و مہربانی کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اشوک نے سب سے پہلے خود اس اصول پر سختی سے عمل کیا۔ شاہی محکمہ شکار بند کر دیا۔ شاہی مہمان خانے اور مطبخ کے لئے جانوروں کا ذبح کرنا بند کر دیا۔ بعد میں تمام ملک بھر میں مختلف دنوں میں جانوروں کی قربانی بند کر دی۔ پالتو جانوروں کو بھی آزاد کر دیا۔ کالنگا کی جنگ کا اثر اس کے دل پر اس قدر گہرا ہوا تھا۔ کہ اس نے نہ صرف بدھ مذہب قبول کر لیا۔ بلکہ اہنسا کے اصول کو حق شناسی اور راستی کا بنیادی اصول سمجھا۔

(۲) نیک اوصاف :۔ اشوک نے اپنے ضابطہ اخلاق میں نیک اوصاف پر خاص زور دیا۔ اس کے کتبوں سے بار بار یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہر انسان کو چاہیئے۔ کہ بزرگوں کی عزت کرے۔ چھوٹوں سے مشفقانہ سلوک روا رکھے اور والدین کی اطاعت کرے۔ اسی قسم کے کئی ایک نیک اوصاف اس نے گنوائے ہیں

(۳) راستی :۔ اشوک بار بار اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ انسان کو اپنے قول و فعل اور خیالات میں راستی اختیار کرنی چاہیئے۔ سچ بولنا اور راستی ہنگر زندگی کو پاکیزہ بنانے کے لئے بنیادی اصول ہیں۔

(۱۷) مذہبی رواداری :- اشوک نے عوام کو نیکی کی جانب ترغیب دی۔ لیکن مذہبی رواداری پر خوب زور دیا وہ چاہتا تھا۔ کہ کسی شخص کے مذہب یا طریقہ عبادت پر نکتہ چینی نہ کی جائے۔

مندرجہ بالا امور سے ظاہر ہے کہ اشوک کا ضابطہ اخلاق محض نیک دلی اور پرہیزگاری سکھاتا تھا۔ اور معاشرے کو بہتر بنانا چاہتا تھا۔ اس نے عوام کو انصاف رحم دلی، اور محبت کا پیغام دیا۔ گویا اس نے چاہا کہ سوسائٹی کی بنیاد حسنِ اخلاق پر ہو۔ اور عوام کی روزمرہ زندگی سنور جائے۔ اشوک کے ضابطہ اخلاق کے بارے میں ایک مشہور مورخ کا قول ہے کہ :-

It talks of no gods, prescribes no worship, and enjoins to be abstemious. It was just a code of morality acceptable to all and sundry."

اشوک نے دھمہ کے اصول کتبوں اور لاٹھوں پر کندہ کرائے۔ اور ان کی پرچار کی۔ اس کے علاوہ اس نے ان پر خود بھی عمل کیا۔ اور ان اصولوں کو اپنی سیاسی حکمتِ عملی کی اساس قرار دیا۔ چونکہ وہ ضبط نفس اور راست بازی کی تلقین کرتا تھا۔ اس لئے دھمہ کے اصول عوام میں ہر دل عزیز ہوئے۔

اشوک نے مذہبی رواداری کی جو لاثانی مثال پیش کی ہے۔ اس کی بنا پر بعض مورخ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ کسی خاص مذہب کا حامی نہ تھا۔ بلکہ وہ ان اخلاقیات کا متوالہ تھا۔ جو تمام بھارتی مذاہب نے مشترک طور پر پیش کئے ہماری رائے ہے کہ اشوک یقینی طور پر بدھ مت کا پیرو تھا۔ وہ کئی ایک کتبوں میں عیاں طور پر بدھ مت کو اپنا مذہب بتاتا ہے۔ خاص طور پر بھابسبرو (Bhasbru) کے کتبہ سے ظاہر ہے۔ کہ وہ بدھ مت کی تعلیم کا گرویدہ تھا۔

بدھ مت کو عالمگیر مذہب بنانا۔ مہاراجہ اشوک نے بدھ مت کی ترقی و ترویج کے لئے نمایاں کام کیا۔ اس نے کسی پر جبر تو نہ کیا۔ لیکن پھر بھی شاہی طاقت اور رسوخ کے تمام ذرائع بدھ مت کی اشاعت میں صرف کئے۔ مندرجہ ذیل طریقوں سے اس نے بدھ مذہب کو عالمگیر مذہب بنا دیا۔

۱۔ مقدس مقامات کی یاترا اور مذہبی پرچار۔ اشوک نے مختلف اوقات میں ملک کے طول و عرض میں مذہبی نوعیت کے سفر (Religious tours) اختیار کئے۔ اور سفر کے دوران میں بدھ مت کا خوب پرچار کیا۔ وہ بدھ مت کے مقدس مقامات کی یاترا کے لئے بھی گیا۔ خاص طور پر گیا۔ سارناتھ۔ کپل وستو اور لمبنی باغ (Limbini Garden) کی زیارت کو گیا۔ راستے میں اس نے کئی تبلیغی جلسے کئے۔ اور بدھ مت کے علماء سے مذہبی مباحثے کرائے۔ اس طریقے سے ہزاروں لوگوں نے بدھ مت اختیار کر لیا۔

۲۔ مہاماترا اور دیگر افسران:۔ اشوک نے بدھ مت کی اشاعت کے لئے خاص شاہی افسر مقرر کئے جن کو مہاماترا کہتے ہیں۔ ان کا فرض یہ تھا کہ عوام میں بدھ مت کا پرچار کریں۔ اور عوام سے ضابطۂ اخلاق پر عمل کرائیں۔ اس کے علاوہ اشوک نے تمام سرکاری افسران کو حکم دیا تھا کہ اپنے محکمانہ فرائض کے علاوہ اپنے اپنے علاقے میں اشوک کے ضابطۂ اخلاق کا پرچار بھی کریں۔

۳۔ مبلغ اور بھکشو۔ اشوک نے بدھ مت کے بھکشوؤں کے نظام میں نئی روح پھونک دی اور تبلیغی سرگرمیوں کو ملک بھر میں تیز کیا۔ اس کے بعد اس نے غیر ممالک میں بھی تبلیغی مشن بھیجے اور ان مشنریوں کی کوشش سے بدھ مت عالمگیر مذہب بن گیا۔ شاہی خاندان کے افراد بھی ان تبلیغی سرگرمیوں

میں شامل رہے۔ چنانچہ لنکا میں اشوک کا بھائی مہندرا اور اس کی بیٹی سنگھامترا نے بھی تبلیغی کام میں حصہ لیا۔ لنکا میں اب تک مہندر کا سٹوپا موجود ہے۔ ان تمام سرگرمیوں کی بدولت بدھ مت کو عظیم الشان ترقی حاصل ہوئی۔ اور برصغیر ہند و پاکستان کی حدود کو پھاند کر یہ مذہب عالمگیر بن گیا۔

۴۔ **خانقاہیں اور عطیہ جات:** ۔ اشوک نے برصغیر میں مختلف مقامات پر خانقاہیں تعمیر کرائیں اور ان علمی مرکزوں کو گراں قدر عطیے بخشے۔ ان خانقاہوں میں بدھ مت کے راہب اور بھکشو مقیم تھے۔ اور مذہب کا پرچار کرتے تھے۔ یہ خانقاہیں بدھسٹ تبلیغی مرکز بن گئیں۔ اس کے علاوہ اشوک نے کئی ایک سٹوپا (Stupas) تعمیر کروائے جہاں لوگ یاترا کے لئے آتے تھے۔ اور اس طریقے سے بھی بدھ مت کی ترقی و ترویج ہوئی۔

۵۔ **تیسری مذہبی کونسل کا انعقاد:** ۔ اشوک نے پاٹلی پتر کے مقام پر بدھ مت کی تیسری مذہبی کونسل بلائی۔ یہ جلسہ عظیم الشان تھا۔ اور اشوک کی کوششوں سے بدھ مت کے مختلف علماء کے باہمی اختلافات اس کونسل میں ختم کر دیئے گئے۔ اور مذہب کو یکجہتی حاصل ہوئی۔ اس کونسل کے انعقاد کے بعد بدھ مت کی تبلیغ نئے جوش و خروش سے شروع ہوئی۔

۶:۔ **کتبے۔ لاٹھیں اور فرمان:** ۔ اشوک نے عوام پر اپنا ضابطۂ اخلاق واضح کرنے کے لئے کئی ایک فرمان جاری کئے۔ اور اپنے اصولوں کی تمام تفصیلات کتبوں کی صورت میں مختلف چٹانوں پر کندہ کرادیں۔ بعض اوقات اس نے نمایاں مقامات پر لاٹھیں بھی نصب کرائیں۔ اور ان پر اپنے فرمان لکھوائے کئی ایک کتبے اور لاٹھیں اب تک موجود ہیں۔ اور اس بات کی زندہ شہادت ہیں۔ کہ اشوک کو بدھ مذہب کے لئے کس قدر شیفتگی تھی۔

۷۔ شاہی سرپرستی :۔ اشوک کے زمانے میں محض شاہی سرپرستی کی بنا پر بدھ مت کو بے مثال عروج حاصل ہوا۔ محض اشوک کی بدولت یہ مذہب چین، جاپان، لنکا اور برما تک پھیل گیا۔ اشوک کی خدمات کے بغیر بدھ مت بھی جین مت کی مانند مقامی مذہب ہی رہتا۔ لیکن اشوک نے اپنی سرفروشانہ سرگرمیوں کی بدولت اس مذہب کو لازوال بنا دیا۔ بعد میں برصغیر ہند و پاکستان سے بدھ مت مفقود ہو گیا۔ لیکن دنیا کے باقی ممالک میں اب تک بدھ مت کے کے ہزاروں حامی موجود ہیں۔ اس امر کا سہرا اشوک کے سر پر ہے۔

اشوک کی عظمت :۔ مہاراجہ اشوک قدیم تاریخ عالم کے ممتاز ترین تاجداروں میں سے ہے۔ اسے بجا طور پر امن کا پیغامبر کہتے ہیں۔ اس نے اکتالیس برس برصغیر ہند و پاکستان پر حکومت کی۔ اور ملک کے کسی کونے سے بغاوت کی بو پیدا ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رعایا میں ہردلعزیز تھا۔ یاد رہے کہ اس کی سلطنت بڑی وسیع تھی۔ آسام اور دکن کے تھوڑے سے علاقے کو چھوڑ کر باقی تمام برصغیر ہند و پاکستان پر اشوک کی حکومت تھی۔ نیپال اور بلوچستان کے علاوہ افغانستان کا بیشتر حصہ بھی اس کی قلمرو میں شامل تھا۔ اتنے وسیع علاقے میں مکمل امن وامان اتنے لمبے عرصے کے لئے قائم رہنا ایک معجزہ ہے اشوک کا انتظام سلطنت چندرگپت کی مانند تھا۔ لیکن قوانین میں وحشیانہ سختی نہ تھی۔ کیونکہ آہنسا کے عقیدہ نے اصول سلطنت بدل ڈالے تھے۔ اس کے علاوہ اشوک رعایا سے عمدہ سلوک کرتا تھا۔ اور ان سے اس طرح پیش آتا تھا۔ جیسے والدین اولاد سے۔ اس کا نظریہ بادشاہت یہ تھا کہ رعایا کی فلاح وبہبودی بادشاہ کا اولین فرض ہے۔ عدل وانصاف پر خاص زور دیتا تھا۔ اور عوام کی شکایات سننے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ جی کھول

کم خیرات کرتا تھا۔ اور رفاہِ عام کے کاموں کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کرتا تھا چنانچہ اس نے سڑکیں بنوائیں۔ کنوئیں کھدوائے سرائیں تعمیر کرائیں۔ پھلدار درخت لگوائے اور کئی ایک شفاخانے کھولے۔ یتیموں اور بیواؤں کی مدد کا خاص انتظام کیا۔ اس نے سوسائٹی کی بنیاد محبت اور شفقت پر ڈالی۔ اور ایذا رسانی کو ختم کر ڈالا مویشیوں کے لئے بھی پہلی بار شفاخانے کھولے۔ وہ افسروں کی کڑی نگہداشت کرتا تھا۔ تاکہ عوام پر کسی قسم کا ظلم نہ کر سکیں۔

اس نے رعایا کو عمدہ اخلاق اور نیکی کی ترغیب دلائی۔ سب سے عمدہ بات یہ ہے۔ کہ اس نے مذہبی رواداری کی پالیسی اختیار کی۔ اگرچہ وہ بدھ مت کا متوالا تھا۔ لیکن اس نے کسی پر جبر نہ کیا۔ اور فراخدلی سے کام لیتے ہوئے باقی مذاہب کے پیرواؤں کو اجازت دی کہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں اشوک کے شاہی فرمان جن سے ملک میں ضابطۂ اخلاق رائج کیا گیا بے ضرر سے تھے۔ اور ان کو محض عمدہ اصولوں کی صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ بدھ مت کے نام پر پیش نہیں کیا گیا۔ رواداری کی اس شاندار مثال کی بنا پر اشوک کو بلند ترین شخصیت کا مالک گنا گیا ہے۔

اشوک نے بدھ مت کو عالمگیر مذہب بنایا اور اس کی ترقی و ترویج کے لئے بے مثال کام کیا۔ اس نے جنگ و جدل کے نظریئے بدل ڈالے۔ اور بادشاہت کا نیا نظریہ پیش کیا۔ یعنی رعایا کی بہبودی، عوام کے اخلاق کو سنوارا اور سوسائٹی کی بنیاد نئے سرے سے شفقت و محبت پر رکھی۔ ان وجوہات کی بنا پر اشوک کو دنیا بھر کی تاریخ میں ممتاز ترین شخصیت گنا جاتا ہے۔ لہٰذا اسے اشوک اعظم کہنا بجا ہے۔

میں اہم ترین باب ہیں۔

موریا آرٹ:۔ مہاراجہ اشوک کے زمانہ میں فنِ تعمیر کو بھی ترقی ہوئی اور ہندی آرٹ باقاعدگی سے شروع ہوا۔ اشوک سے پہلے برِّ صغیر کی عمارات لکڑی کی بنی ہوتی تھیں۔ اشوک نے چونے کے استعمال کو رائج کیا۔ اور اس طرح سے نہ صرف فنِ تعمیر میں انقلاب بپا کیا۔ بلکہ عمارات کو پائیداری بھی بخشی۔ چنانچہ اس دور کی بعض عمارات اب تک موجود ہیں۔ اشوک نے صدہا سٹوپے تعمیر کرائے اس کے علاوہ عمدہ محل اور لاٹھیں بھی تعمیر کرائیں۔

کہا جاتا ہے کہ اشوک کے زمانے میں اینٹ، پتھر اور چونے کا استعمال ایرانی اور یونانی اثرات کی بنا پر شروع ہوا۔ لیکن ہیول صاحب کی رائے یہ ہے کہ موریا آرٹ غیر ملکی اثرات سے مبرا ہے۔

موریا سلطنت کا زوال

اشوک کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کے حالات حتمی طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔ اور ان میں تاریخی تسلسل بھی مفقود ہے۔ صرف اسی قدر واضح ہے کہ اشوک نے کافی اولاد چھوڑی تھی۔ مشہور مورخ سمتھ صاحب کا قیاس یہ ہے کہ اشوک کی سلطنت اس کے دو پوتوں میں بٹ گئی تھی۔ اور ان میں سے ایک پوتا جس کا نام سامپراتی تھا جین مذہب اختیار کر چکا تھا۔ قدیم روایات سے اشوک کے بعد پانچ غیر معروف حکمرانوں کے نام ملتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اشوک کی وفات کے بعد اس کی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ مرکزی حکومت ختم ہو گئی۔ اور اس کے وارث مختلف علاقوں پر قابض ہو گئے شاہی خاندان کے افراد چونکہ متحد نہ تھے۔ لہذا حصولِ اقتدار اور باہمی چپقلش کی

کی بنا پر سلطنت کو زوال ہوا۔ اور 185 ق م میں موریا خاندان کے آخری تاجدار برہادرت کو اس کے جرنیل پشی متر نے قتل کر ڈالا۔ اور یوں موریا خاندان کا خاتمہ ہوا۔ موریا خاندان کے زوال کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ وسعت سلطنت:۔ موریا سلطنت از حد وسیع تھی۔ تمام افغانستان پاکستان اور بھارت کے علاقے اس میں شامل تھے۔ صرف دکن کا کچھ حصہ موریا سلطنت میں شامل نہ تھا۔ ان ایام میں جبکہ جدید قسم کے ذرائع نقل و حرکت موجود نہ تھے۔ اتنی وسیع سلطنت میں امن و امان قائم رکھنا محال تھا۔ اشوک چونکہ ہر دلعزیز تھا۔ اس لئے اس کے عہد حکومت میں کوئی بغاوت نہ ہوئی۔ لیکن اس کی وفات پر سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایک مؤرخ کا قول ہے۔ کہ اشوک سلطنت کی عظمت کو اپنے ساتھ قبر میں لے گیا۔

"With Asoka passed away all the strength and solidarity of the Mauryan Empire"

۲۔ نیم آزاد حکمران یا وائسرائے:۔ اشوک نے اپنی سلطنت میں بہت سے نیم آزاد مقامی حکمرانوں کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ یہ حکمران اشوک کے فرمانبردار ضرور رہے۔ لیکن اس کے مرتے ہی اولین فرصت میں خود مختار بن بیٹھے۔ بلکہ آس پاس کے علاقوں پر بھی ہاتھ مارا۔ نیز اس زمانے میں رواج تھا۔ کہ دور دراز صوبوں کی حکومت کے لئے شاہی خاندان کے افراد کو بطور وائسرائے بھیجا جاتا تھا اور ان کو تقریباً صوبائی خود مختاری حاصل ہوتی تھی۔ یہ امر سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوا۔ اور اشوک کے مرتے ہی ہر وائسرائے خود مختار حاکم بن بیٹھا۔

۳۔ نالائق جانشین:۔ چندر گپت موریا۔ بندوسارا اور اشوک کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ اور اصول جہانبانی سے واقف تھے۔ لیکن اشوک کے جانشینوں

میں سے کوئی بھی لیاقت نہ رکھتا تھا۔ انتظام سلطنت کی جانب توجہ مبذول کرنے کی بجائے اشوک کے جانشین آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ اور ہر شخص نے سلطنت کے کسی نہ کسی حصے پر قبضہ جما لیا۔ ان حالات میں سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اور مرکز کا اقتدار ختم ہوا۔

۴۔ **برہمنوں کا عناد**:۔ اشوک نے بدھ مت کو عظیم الشان ترقی بخشی تھی۔ اور بعد میں شاہی فرمانوں کے ذریعے جانوروں کی قربانی بالکل منع کر دی جس کی وجہ سے برہمنوں کے لئے مذہبی قربانیاں بھی مشکل ہو گئیں۔ برہمن آہنسا کے اصول اور بدھ مت کے سخت مخالف تھے۔ اشوک کے مرتے ہی انہوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی سخت کوشش کی۔ پس برہمنوں کی مخالفت کی بنا پر موریا خاندان کی ہر دلعزیزی ختم ہو گئی۔ اور حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ پھیل گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ آخری موریا تاجدار کا قاتل پشی متر اگرچہ اس کا جرنیل تھا۔ لیکن وہ برہمن تھا۔ اور آہنسا کے اصول کا قائل نہ تھا۔

۵۔ **فوجی طاقت میں کمی**:۔ اشوک نے جنگ و جدل کی پالیسی کو ترک کر کے آہنسا کے اصول کو اہمیت دی تھی۔ اس نے زبردست فوج قائم کرنے کی بجائے محبت و شفقت سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ لیکن امن و امان کی پالیسی طویل عرصے تک کامیاب نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اس کے مرتے ہی جنگ و جدل شروع ہوا۔ اور موریا حکومت کی فوجی طاقت کمزور ہو چکی تھی۔ اور محض آہنسا کا اصول ان کو دشمنوں پر فوقیت دینے سے قاصر رہا۔

"Mighty Empires can never endure without the support of military establishments."

۶ غیر ملکی حملے: مرکزی حکومت کے کمزور ہوتے ہی طاقتور قبائل مثلاً اندھرا اور کالنگا کے لوگوں نے بغاوت کر کے آزادی حاصل کر لی۔ ان کے آزاد ہوتے ہی موریا سلطنت جو حیرت انگیز سمجری کی مانند تھی بالکل سٹ گئی۔ اس موقع پر کئی ایک غیر ملکی حملے بھی ہوئے۔ مثلاً باختری یونانیوں اور پارتھی اقوام نے حالات سے فائدہ اٹھایا۔ اور مغربی پاکستان اور شمالی بھارت پر متواتر حملے کر کے موریا سلطنت کا قلع قمع کر دیا۔ اشوک کی موت کے تقریباً پچاس سال بعد 185 ق م میں موریا خاندان کی حکومت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

INDO-GREEK KINGS

موریا خاندان کے بعد غیر ملکی حملہ آور۔ موریا خاندان کے زوال کے بعد تقریباً دو سو سال کی تاریخ طوائف الملوکی اور سیاسی انتشار کی تاریخ ہے۔ برصغیر ہند و پاکستان میں اس وقت کئی ایک چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم تھیں۔ مغربی پاکستان اور شمالی بھارت میں غیر ملکی قبائل اور حکمرانوں کا زور تھا۔ ان حکمرانوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ لیکن ان سب کو مورخ (Indo-Greek Kings) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان بادشاہوں کے مختصر حالات درج ذیل ہیں۔

ا۔ باختری حکمران: سکندر کے مشہور جرنیل سیلوکس کے زوال کے بعد 250 ق م کے قریب باختر کا صوبہ خود مختار بن بیٹھا اور یہاں کے یونانی مقامی حکمرانوں نے آزادی کا اعلان کرتے ہی بلخ کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ موریا خاندان کے زوال پر باختری یونانیوں نے ہندوکش کی پہاڑیوں کو عبور کر کے برصغیر ہند و پاکستان پر یلغار شروع کر دی۔ باختریوں کے متواتر حملوں کی بدولت کابل، پنجاب، اور شمالی بھارت کا کچھ علاقہ غیر ملکیوں کے قبضے میں آگیا۔ بعد میں باختری سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور تمام علاقے پر کئی ایک باختری تاجدار حکومت کرنے لگے۔ برصغیر

کے باختری حکمرانوں میں بھی مرکزی حکومت کا فقدان تھا۔ لہٰذا ان کی حکومت بھی دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ باختری حکمرانوں میں صرف مناندر (Menander) کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص ملنڈا (Milinda) کا حکمران تھا۔ لیکن فتوحات کرتے ہوئے اس نے پنجاب پر قبضہ جما لیا۔ اور بعد میں پاٹلی پتر تک کا تمام علاقہ مسخر کر لیا۔ اس کا دور تقریباً 5 ا ق م میں تھا

۲۔ انڈو پارتھین :۔ باختریوں کی مانند پارتھین قبیلے نے بھی مہاراجہ اشوک کے زمانے میں پارتھیا کی سلطنت قائم کی تھی۔ ان کی سلطنت میں خراسان، سمرقند اور آس پاس کے علاقے شامل تھے۔ پارتھی حکمرانوں نے ایرانی سیاست میں ایک عظیم الشان انقلاب بپا کیا۔ اور پارتھیا میں تقریباً ۵۰ سال حکومت کی۔ یہ قبیلہ بلا کا جنگجو تھا۔ یہ لوگ جاہلِ مطلق، سفاک لیکن عمدہ شہ سوار تھے۔ بعد میں پارتھی قبیلہ نے باختری حکومت کا خاتمہ کر ڈالا۔ اور کابل، وادیٔ سوات اور پنجاب پر قبضہ جما لیا۔ پارتھی بادشاہ جس نے پہلی بار مغربی پاکستان اور شمالی بھارت کو فتح کیا۔ اس کا نام متھراڈاٹس (Mithridates) تھا۔ 38 ا ق م تک اس نے مغربی پاکستان پر تسلط جمالیا تھا

اس کے بیٹے متھراڈاٹس دوم کے زمانے میں ساکا نامی ایک نئے غیر ملکی قبیلے نے برصغیر پر حملہ کیا۔ ساکا قبیلے کو سیتھین (Scythians) بھی کہتے ہیں۔ متھراڈاٹس دوم نے ساکا قبیلے کو شکست دی۔ اور مغربی پاکستان پر اپنا تسلط دوبارہ قائم کیا۔ پارتھی حکمرانوں میں گونڈوفرنیز نامی ایک بادشاہ کافی مشہور ہے۔ اس کی سلطنت ٹیکسلا تک تھی۔ اس کے عہدِ حکومت میں عیسائیت کو کافی فروغ ہوا۔ اس کا دور ۲۰ء سے ۴۸ء تک تھا۔

پہلی صدی عیسوی میں پنجاب کا علاقہ پارتھیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اور ان کی جگہ کشان قبیلہ برسرِ اقتدار آیا۔ کشان قبیلے کا حال اگلے باب میں بیان ہوگا۔

ساکا یا سیتھین قبیلہ :۔ ساکا قبیلے کا اصلی وطن سیستان تھا۔ جو پہلی صدی عیسوی میں پارتھین کے ماتحت تھا۔ ساکا قبیلے کے لوگ خانہ بدوش تھے۔ اور یوچی یا کشان قبیلے سے ان کو سخت دشمنی تھی۔ یوچی قبیلے کی بدولت یہ لوگ ترک وطن پر مجبور ہوئے ہند و پاکستان کے مختلف علاقوں پر قابض ہونے کے بعد بھی ساکا قبیلہ ہمیشہ پارتھین حکمرانوں کے تابع رہا۔ اور اپنی سلطنت کو محض صوبہ یا (Satrap) کہنے پر اکتفا کی۔

سیتھین قبیلے کی کئی ایک "خود مختار" حکومتیں برصغیر میں تھیں۔ ایک ریاست متھرا کی تھی۔ ایک اور سیتھین تھی جس کا صدر مقام ٹیکسلا تھا۔ اسی طرح سوراشٹر یا کاٹھیاواڑ میں بھی ساکا قبیلہ کی حکومت تھی۔ سندھ کا علاقہ اسی سلطنت کے ماتحت تھا۔ ساکا قبیلہ نے اُجین یا مالوہ کی ایک اور ریاست قائم کی جو بھی سیتھین قبیلے بعض علاقوں پر ۴۰۰ سال حکمران رہے۔ اور آخرکار گپت خاندان کے ہاتھوں ان کا خاتمہ ہوا۔

اس طوائف الملوکی کے دور میں یوچی نامی منگول قبیلے کا عروج ہوا۔ اسی قبیلے کو کشان یا کشن خاندان بھی کہتے ہیں۔ اسی قبیلے سے مہاراجہ کنشک ہوا جس کا حال اگلے باب میں درج ہے۔ یہ غیر ملکی قبائل تقریباً دو سو برس تک برصغیر کے مختلف علاقوں پر قابض رہے۔ اور ان کی بدولت یونانی اثرات اس ملک کی تاریخ پر نمایاں ہیں۔

ملکی کلچر پر انڈو گریک (Indo-Greek) اثرات :۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ موریا خاندان کے زوال کے بعد تقریباً دو سو برس تک برصغیر پر کئی ایک غیر ملکی قبیلے حکمران رہے جن میں باختری یونانی۔ پارتھی اور سیتھین خاص طور پر مشہور

ہیں۔ ان سب قبیلوں کو (Indo-Greek) کہتے ہیں۔ ان میں سے باختری چونکہ یونانی کلچر میں مدغم ہو چکے تھے۔ لہٰذا ان کی وساطت سے یونانی کلچر ہند و پاکستان میں عام ہوا۔ مختلف قبیلے اگرچہ جنگ و جدل کے شوقین تھے۔ لیکن دو سو سال کی مدت کافی طویل ہوتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے غیر ملکی تمدن اور خاص طور پر یونانی کلچر کو ہند و پاکستان میں رائج کیا۔ اور فاتح اور مفتوح لوگوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا۔ ان اثرات کا مختصر حال درج ذیل ہے۔

۱۔ برصغیر اور یونانیوں کے باہمی میل جول کی بنا پر دونوں اقوام نے ایک دوسرے کی زبان سیکھی۔ اور رائج الوقت علوم سے استفادہ کیا۔ بھارت کے لوگوں نے خاص طور پر یونانیوں سے علم ہیئت اور نجوم سیکھا اور جنم پتری کا تیار کرنا اسی دور سے شروع ہوا۔

۲۔ ان غیر ملکی بادشاہوں کی وساطت سے یونانی سکے برصغیر میں پہنچے۔ اور بھارت کے لوگوں نے پہلی بار خوبصورت اور گول سکے بنانے شروع کیے۔ پس سکوں کی ساخت میں یونانی اثرات نمایاں ہیں۔

۳۔ برصغیر ہند و پاکستان کے لوگوں نے فن سنگ تراشی خاص طور پر یونانیوں سے سیکھا۔ یہ فن غیر ملکی حکمرانوں کے ذریعے اس برصغیر میں پہنچا۔ نئے فن سنگ تراشی کی بدولت بت تراشی نے عمدگی اختیار کی۔ ٹیکسلا اور پشاور سے صد ہا بت اس دور کے ملے ہیں۔ اگرچہ یہ بت بدھ مت کے بارے میں ہیں۔ لیکن یونانی تخیل ان بتوں سے واضح ہے۔ اس دور کے چند بت لاہور کے عجائب گھر میں بھی محفوظ ہیں۔

اس نئے فن کو گاندھارا سکول آف آرٹ کہتے ہیں۔ یہ فن پہلے پہل افغانستان میں عام ہوا۔ بعد میں شمالی پنجاب میں اسے فروغ حاصل ہوا۔ ان

دونوں علاقوں کو اس زمانے میں گاندھارا کہتے تھے۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ گاندھارا آرٹ کا نام قندھار کی بدولت ہے جسے قدیم زمانے میں گاندھارا کہتے تھے۔ بہر حال یونانی اثرات ہندی آرٹ پر اس قدر زیادہ ہوئے کہ مورخین حیران ہیں۔

۴۔ ہندو مورخین کا خیال ہے کہ ان غیر ملکی حکمرانوں نے جن کو Indo-Greeks کہتے ہیں۔ یونانی کلچر کے غلبے کے باوجود برصغیر کے مذہب یا فلسفہ پر کوئی اثر نہ چھوڑا تھا۔ اسی طرح برصغیر کے ادب پر بھی یونانی اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس کے برعکس بدھ مت اتنا اہم مذہب ثابت ہوا۔ کہ مناندر (Menander) نے یہ مذہب قبول کر لیا۔ بدھ روایات میں اسے ملندراجہ Malinda کہتے ہیں

۵۔ غیر ملکی کلچر اور آرٹ کی بدولت (خاص طور پر گاندھارا اسکول آف آرٹ کی بنا پر) بدھ مت دو فرقوں میں منقسم ہو گیا۔۔۔۔اور مہایانہ فرقے نے یونانی آرٹ کا گہرا اثر قبول کیا۔

Typical Questions.

Q. 1. Explain how Chandra Gupta rose to power. Describe his administra tion as recorded by Magasthenese.

Q. 2. What light does Magasthenese throw on the administration of Chander Gupta Maurya? Give a brief account of the latter's life.

Q. 3. What light does Magasthense throw on the administration of Chandra Gupta Maurya?

Q. 4. Write a brief note on the achievements of Chandra Gupta Maurya.

Q. 5. Enumerate the main sources of information for the history of the Mauryan period and write an explanatory note on each source.

Q. 6. Write short notes on Seleucus, Magasthanese, Chankia and Mudra Rakshasa.

Q. 7. "The advent of Maurya dynasty marks the passage from darkness to light for the historian." Explain and illustrate.

Q. 8. Give a brief account of the civil and military administration of India under Chandergupta Maurya.

Q. 9. Describe the methods adopted by Asoka for propagation and enforcement of the Law of Piety.

Q. 10. State clearly what Asoka meant by the term "Dhamma" and show how his notion of "Dhamma" influenced his imperial policy.

Q. 11. What steps were taken by Asoka to promote the cause of Buddhism? How far was he successful?

Q. 12. Describe the measures adopted by Asoka to promote and universalize the cause of Buddhism.

Q. 13. Write a critical note on Asoka as a man and a monarch.

Q. 14. Asoka has been acclaimed as one of the greatest monarchs of the world. What is the justification for this reputation?

Q. 15. What do you know about the Laws of Piety of Asoka?

Q. 16. Write a short-note on the Indo-Greek kings. Estimate also the Greek influence on Indian culture and vice versa.

امتحانی سوالات

1 - چندر گپت موریہ کو کیسے عروج حاصل ہوا ۔ میگستھینز کی تحریروں سے اس کے انتظام سلطنت پر کیا روشنی پڑتی ہے ؟ ۔

2 - میگستھینز نے چندر گپت موریا کے نظام سلطنت کے بارے میں کیا لکھا ہے ؟ ۔ چندر گپت کی زندگی کے حالات تحریر کیجئے ۔

3 - میگستھینز کے بیان کردہ حالات کا مختصر جائزہ لو ۔

4 - چندر گپت موریا کے کارنامے مختصر طور پر بیان کیجئے ۔

5 - موریا خاندان کی تاریخ کے ماخذ کون کون سے ہیں ؟ ہر ایک ماخذ کی وضاحت کیجئے ۔ ؟

6 - مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیں

(ا) سیلوکس ۔ (ب) میگستھینز ۔ (ج) چانکیہ ۔ (د) مُدرا راکشا ۔

7 - " موریا خاندان کے عروج سے برصغیر کی تاریخ سے تاریکی کے پردے چھٹ جاتے ہیں اور روشنی دکھائی دیتی ہے " تبصرہ کیجئے ۔

8 - چندر گپت موریا کے ملکی اور فوجی انتظام کے حالات بیان کیجئے ۔

9 - مہاراجہ اشوک نے ضابطہ اخلاق کو نافذ کرنے اور اس کی ترویج کے لئے کون کون سے ذرائع اختیار کئے ۔

10 - واضح کیجئے کہ مہاراجہ اشوک " دھرم " سے کیا مراد لیتا تھا ۔ " دھرم " کے اصولوں کا اس کی شاہی پالیسی پر کیا اثر ہوا ۔

11 - اشوک نے بدھ مت کی اشاعت کے لئے کون سے ذرائع اختیار کئے ۔ اسے کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی ۔

12۔ مہاراجہ اشوک نے بدھ مت کو کیسے عالمگیر مذہب بنایا؟

13۔ اشوک پر ایک مضمون لکھئے۔ جس میں مندرجہ ذیل عنوانات قائم کیجئے۔

(ا) اشوک بطور انسان (ب) اشوک بطور شہنشاہ۔

14۔ مہاراجہ اشوک کو کس بنا پر دنیا کی عظیم الشان ہستی تصور کیا جاتا ہے۔ کیا مہاراجہ اشوک اس عزت افزائی کا مستحق ہے؟

15۔ مہاراجہ اشوک کے کتبوں سے ہمیں کیا کیا حالات معلوم ہوتے ہیں۔ مختصراً بیان کرو۔

16۔ مہاراجہ اشوک کے ضابطہ اخلاق کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔

17۔ ہندو پاکستان کے پارتھی، سیتھین اور باختری، یونانی حکمرانوں کا مختصر حال بیان کیجئے۔ اس برصغیر کے کلچر پر ان کے اثرات کیا تھے۔ واضح کیجئے۔

گیارھواں باب

کشان خاندان - راجہ کنشک

پہلی صدی عیسوی میں برّصغیر ہند و پاکستان میں کشان خاندان کا عروج ہوا - کشان یو - چی قبیلے کی ایک شاخ تھے جو منگول نسل کے تھے اور چین اُن کا آبائی وطن تھا - یو - چی در اصل تاتاری خانہ بدوش تھے اور جفاکشی اور خوبصورتی میں مشہور تھے - ہُن قبیلہ کی تاخت و تاج کی بدولت یو - چی قبائل جو تعداد میں پانچ تھے اپنے وطن سے نکلے اور صحرائے گوبی کو عبور کر کے دریائے آمو (یا جیحوں) کے قریب آباد ہو گئے - انہوں نے ساکا قوم کو مار بھگایا اور خود باختر کی سلطنت کے مالک بنے - ساکا قوم نے برّصغیر ہند و پاکستان کا رُخ کیا - باختری تمدّن نے یو - چی قبائل پر گہرا اثر چھوڑا - ان قبائل نے خانہ بدوشی ترک کر دی اور ایک زبردست سلطنت قائم کر لی ان قبائل میں کشان قبیلہ سب سے زیادہ طاقتور تھا - چنانچہ تمام یو - چی قبائل اُس کے مطیع ہو گئے - کچھ عرصہ بعد کشان قبیلہ کے لیڈر کیڈفاسس اوّل (Kadphises I) نے اپنے تمام قبائل کو متحد اور منظم کر کے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا - کابل اور قندھار کو فتح کرنے کے علاوہ اس نے پارتھیا کی ایرانی سلطنت کا بھی خاتمہ کر ڈالا - باختر اُس کا صدر مقام تھا -

کیڈفاسس دوئم ۷۸ء میں تخت نشین ہُوا اور اُس نے فتوحات

کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُس نے ایک زبردست جنگ کے بعد ساکا سلطنت کو تباہ کیا جس کی راجدھانی ٹیکسلا تھی۔ مغربی پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد اُس نے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا اور مزید فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ٹیکسلا اور ہزارہ سے اُس کے سکّے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے علاوہ بھارت کے بعض علاقے بھی اُس کی قلمرو میں شامل تھے۔ بعض سکّوں پر شوجی کی تصویر ہے اور بعض پر بیل کی۔ ان سکّوں کی بدولت مؤرخین کا قیاس ہے کہ کشان قبیلہ نے ہندومت اختیار کر لیا تھا۔

کنشک کی تخت نشینی:۔ کشان خاندان کا تیسرا اہم حکمران کنشک تھا۔ یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ کنشک اور کیڈفائسس دوئم کا آپس میں کیا رشتہ تھا۔ لیکن کنشک اس خاندان کا مشہور ترین حکمران ہو گذرا ہے۔ کنشک کی تخت نشینی اور تاریخ وفات کے بارے میں مؤرخین میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے ڈاکٹر رائے اور ریپسن د (Rapson) کا خیال ہے۔ کہ کنشک سنہ 78ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے برعکس مارشل اور سمتھ صاحب کی رائے یہ ہے۔ کہ کنشک کا سن جلوس سنہ 120ء ہے۔

حدود سلطنت:۔ کنشک کا دارالحکومت پرش پور تھا۔ موجودہ زمانے میں یہ مقام پشاور کے نام سے مشہور ہے۔ اس شہر کو کنشک کی سلطنت میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ کنشک کی سلطنت کی حدود بڑی وسیع تھیں۔ اُس نے دوبار چین سے بھی جنگ آزمائی کی تھی۔ کنشک کا مقصد اپنے آبائی وطن پر قبضہ جمانا تھا۔ پہلی جنگ میں کنشک کی فوجوں

کو شکست ہوئی - اور کنشک کو چینی شہنشاہ کا باجگذار ہونا پڑا۔ جب چینی جرنیل پان چاؤ نے وفات پائی تو کنشک نے چین پر پھر فوج کشی کی اور پان چاؤ کے بیٹے چان یانگ کو شکست دی - اس فتح کی بدولت کنشک کو خود مختاری حاصل ہوئی اور اس کے علاوہ کاشغر یارقند اور ختن کے علاقے بھی اس کی سلطنت میں شامل ہو گئے۔

کنشک کی سلطنت کی صحیح حدود کا تعیّن کرنا مشکل ہے۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم الشان جرنیل اور فاتح تھا۔ مغربی پاکستان اور افغانستان کا تمام علاقہ یقینی طور پر اُس کی سلطنت میں شامل تھا۔ اُس نے بالائی سندھ اور مگدھ کے بعد کشمیر بھی فتح کیا۔ چنانچہ یہ بات ثابت ہے کہ کنشک کو کشمیر کے علاقے سے ازحد محبّت تھی۔ جب کنشک نے پاٹلی پتر کو فتح کیا تو بُدھ مت کا مشہور عالم اشوا گھوش اس کے دربار سے وابستہ ہوا۔ شمال مغرب میں اُس کی سلطنت کی حدود چین سے جا ملتی تھیں۔ کنشک کی سلطنت کی مشرقی سرحد صحیح طور پر متعین نہیں ہو سکی۔ لیکن اس کے سکّے برّصغیر ہندو پاکستان میں اکثر مقامات سے ملے ہیں۔ ان سکّوں کی بدولت بعض مورّخین کی یہ رائے ہے کہ مشرق میں کنشک کی سلطنت صُوبہ بہار تک تھی۔ جنوب میں کوہ بندھیاچل تک بھارت کا تمام علاقہ اس کے ماتحت تھا۔ پس کنشک ہندو پاکستان کا ایک عظیم الشان شہنشاہ ہو گذرا ہے۔ اس کی سلطنت کو قدرتی سرحدیں حاصل تھیں۔

پس ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ کنشک کی سلطنت چینی ترکستان سے لے کر صُوبہ بہار تک - اور کوہ ہمالیہ سے لے کر بندھیاچل تک بلکہ دریائے

زیر اثر تک پھیلی ہوئی تھی وہ چندر گپت موریا جیسا فاتح اور منتظم تھا اور اشوک جیسا مذہبی سرپرست تھا۔ برصغیر کی تاریخ میں اُسے بہت بلند مرتبہ حاصل ہے۔

کنشک کا مذہب:۔ کنشک کے مذہب کے بارے میں مؤرخین میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اُس کے آباو اجداد کا مذہب کئی مذاہب کا مجموعہ (eclectic) تھا جس میں زرتشت مذہب کے علاوہ کئی ایک دیوتاؤں کی پرستش موجود تھی۔ اس بنا پر بعض مؤرخ یہ سمجھتے ہیں کہ کنشک کا مذہب ہندو مت، جینی اور بُدھ مت کے اعتقادات پر مشتمل تھا۔ سمتھ صاحب کا خیال ہے کہ کنشک کا بنیادی مذہب زرتشت خیالات کا حامل تھا۔ لیکن دوسرے مذاہب کے دیوتاؤں کی شمولیت کی بنا پر اُس کی شکل بگڑ چکی تھی۔

ہماری رائے یہ ہے کہ کنشک ابتدا میں کشان خاندان کی تقلید میں مختلف مذاہب کے مجموعی اعتقادات کا پیرو تھا۔ لیکن بعد میں اُس نے بُدھ مت اختیار کر لیا اور اُس کا سرگرم پیروکار بن گیا۔ چنانچہ اُس نے بُدھ مت کی اشاعت اور ترقی کے لیے خوب کوشش کی۔ بُدھ روایات میں کنشک کو اس مذہب کا زبردست حامی بتایا گیا ہے۔ نیز یہ بات بھی ثابت ہے کہ اُس نے بُدھ مت کی چوتھی کونسل بلائی تاکہ مذہبی اختلافات دُور کر دئے جائیں۔ اس اجتماع میں ملک بھر سے پانچ صد بُدھ علما نے حصہ لیا۔ اور اس کا اجلاس سرینگر یا جالندھر میں منعقد ہُوا۔ اس مذہبی کونسل کے فیصلوں کو تانبے کی تختیوں پر لکھوا کر محفوظ مقامات پر دفن کیا گیا۔

کنشک کی سرپرستی کی بدولت بدھ مت وسط ایشیا میں پھیل گیا لہٰذا کنشک کو بجا طور پر بدھ روایات میں قابل تعریف ہستی گنا گیا ہے لیکن کنشک کے خاص مذہبی خیالات بعض لحاظ سے بدھ مت سے مختلف تھے۔

۱۔ بدھ مت قبول کرنے کے باوجود کنشک نے جنگ و جدل کو ترک نہ کیا اور اس طرح سے اس نے آہنسا کے اصول کی خلاف ورزی کی۔

۲۔ کنشک مہاتما بدھ کو اوتار مانتا تھا۔ حالانکہ بدھ مت خدا کی ہستی کے بارے میں بالکل خاموش تھا۔ کنشک کے اس عقیدے سے جدید رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

۳۔ کنشک کے مذہب میں مہاتما بدھ کے بت بنانا جائز تھا۔ اور وہ سنسکرت زبان کو مقدس زبان سمجھ کر استعمال کرتا تھا۔ ان نئے خیالات سے ہندو مت کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔

بدھ مت کے فرقے:۔ کنشک کے زمانے میں کئی ایک وجوہات کی بنا پر بدھ مذہب کی اصلی پاکیزگی جاتی رہی اور اس میں نئے نئے خیالات آ گھسے۔ مذہب دو بڑے فرقوں میں بٹ گیا۔ مہایانہ اور ہنایانہ کنشک مہایانہ فرقے کا حامی تھا۔ در اصل بدھ مت کی چوتھی کونسل نے مہایانہ فرقے کو بدھ مت کی صحیح صورت قرار دیا تھا۔ احکام مذہب کے بارے میں نئی تفسیر کی گئی اور جنہیں ایک خاص (Stupa) اسٹوپا میں دفن کیے گئے۔ مذہب کی شکل میں تبدیلی (Transformation) کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مذہبی احکام کی متضاد تاویلیں کی گئی تھیں۔ چوتھی مذہبی کونسل کے فیصلوں میں حصہ لینے والوں میں سے وشوامتر اور اشوا گھوش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کونسل کے بعد مہایانہ شمالی بھارت اور

پاکستان کا مذہب بن گیا۔ اس میں جدید خیالات اور بُدھ مت کے فلسفہ کا امتزاج تھا۔ ہندو مت کے تاثرات بھی تھے۔ اور نئے فنِ سنگ تراشی (یعنی گاندھارا آرٹ) کا اثر بھی تھا۔ لیکن بُدھ مت کی تعلیمات کی سادگی جاتی رہی اور مہایانہ فرقہ ہندو مت کے بہت قریب آگیا۔ اسی بنا پر کنشک کے مذہب کے بارے میں عوام کے دل میں شک و شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ دراصل وہ بدھ مت کے فرقہ مہایانہ کا حامی تھا لیکن بُدھ مت میں زبردست تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ کنشک نے صرف مہایانہ فرقے کے عقائد کو فروغ دیا۔ اور اسی لیے بدھ روایات میں اُس کی بے حد تعریف کی گئی ہے۔ یاد رہے کہ مہاراجہ اشوک ہنایانہ فرقے کا حامی تھا اور اسی کی ترقی و ترویج میں اُس نے زندگی وقف کی۔ اس کے برعکس کنشک مہایانہ فرقے کا علمبردار تھا۔

کنشک کے دور سے بُدھ مت کے صاف طور پر دو ٹکڑے ہو گئے۔ ہنایانہ فرقہ زیادہ تر دکنی علاقوں میں مقبول تھا۔ اس فرقے کے حامی انتہا پسند تھے ننگے پاؤں رہتے تھے۔ سُورج ڈھلے کھانے پینے سے پرہیز کرتے تھے۔ اور اہنسا کے اصول کو ناقابلِ عمل حد تک لے گئے تھے۔ اس فرقے کے لوگ راہبانہ زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ اور فاقہ کشی سے زندگی ختم کر دینے کو عمدہ بات سمجھتے تھے۔ اس افراط و تفریط کی بدولت بُدھ مت آخر کار زوال پذیر ہوا۔

مہایانہ اور ہنایانہ کا مقابلہ

۱۔ مہایانہ فرقہ یہ سمجھتا تھا کہ مہاتما بُدھ محض ایک انسان ہی نہیں بلکہ

دیوتا تھا۔ اور اُس کے بعد اُس کے اوتار آتے رہتے ہیں۔ ان کو بودھی ستوا کہتے ہیں۔ اس فرقہ کے نزدیک یہ اوتار بعض اوقات ازحد اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس ہنایانہ فرقہ نے گیان، دھیان اور عبادت پر حد سے زیادہ زور دیا اور بدھ کی تعلیمات اور عقائد کو نیا فلسفیانہ رنگ دیا۔ انتہا پسندی کی بدولت اس فرقہ نے مہاتما بدھ کو خدا کی ہستی میں مدغم کر دیا۔

۲۔ مہایانہ فرقہ اشوک کے دھرم کی مانند خدمتِ خلق پر اعتقاد رکھتا تھا۔ اور اس بات پر زور دیتا تھا کہ دوسرے لوگوں کی روحانی ترقی ہو اور اُن کو بھی راہِ نجات کی جانب راغب کیا جائے۔ اس کے برعکس ہنایانہ فرقہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہر شخص تیاگ و تپسیا کے ذریعہ نجات حاصل کرے۔ یعنی ہنایانہ فرقہ صرف ذاتی نجات پر زور دیتا تھا اور مہایانہ سوسائٹی بھر کے لیے رُوحانی تسکین کا متلاشی تھا۔

۳۔ مہایانہ فرقہ میں نت نئی پیچیدہ رسومات داخل ہو گئیں۔ اور قدیم ہندو مت کی مانند یہ مذہب بھی رسومات کا پلندہ بن کر رہ گیا۔ مہاتما بدھ رسومات کا سخت مخالف تھا لیکن مہایانہ فرقہ نے نئی تاویلات سے کئی ایک رسومات کو لازمی قرار دیا اس کے برعکس ہنایانہ فرقہ نے بدھ مذہب کے بنیادی عقاید کو انتہا پسندی کی بدولت عمل کے ناقابل بنا دیا اور سادہ تعلیمات کو جدید میلانات کی روشنی میں ترمیم کر دیا۔ اس فرقے نے خاص طور پر ترکِ دنیا پر زور دیا اور اہنسا کے اصول کو لایعنی حد تک پہنچا دیا۔

۴۔ مہایانہ فرقہ نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مہاتما بُدھ اور اُس کے اوتاروں کے بُت بنائے اور بعد میں مندروں میں ان کی عبادت بھی ہونے لگی۔

گاندھارا آرٹ نے خوبصورت بتوں کی ساخت کو اور بھی فروغ دیا۔ اور بُت پرستی اختیار کرنے سے بُدھ مت کی شکل مسخ ہو گئی۔ اس کے برعکس ہنایانہ فرقہ کے پیرو بُت پرستی سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن باقی امور میں اُن کی انتہا پسندی نے مذہب کی صحیح روح کا خاتمہ کر ڈالا۔

۵۔ شروع سے ہی پالی زبان بُدھ مت کے عقاید کے اظہار کے لئے استعمال کی جاتی تھی لیکن کنشک کے زمانہ سے مہایانہ فرقہ نے سنسکرت زبان کی جانب دوبارہ رجوع کیا۔ اور اسے مذہبی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا اُس کے برعکس ہنایانہ فرقہ پہلے کی طرح پالی زبان کا علمبردار رہا۔

۶۔ ہنایانہ فرقہ کے لوگ زیادہ تر زاہد خشک تھے۔ اُن کے اصول بھی نسبتاً سادہ تھے۔ لیکن اُس دور میں عوام میں رسومات کی جانب خاص رغبت تھی لہٰذا مہایانہ کو فروغ حاصل ہوا۔ غیر ملکی قبائل کے ورود سے بھی نئی رسومات عام ہو گئیں۔ اور بُدھ مت کی قدیم سادگی قائم نہ رہ سکی۔ کشان خاندان کے مذہبی خیالات بھی بُدھ مت پر اثر انداز ہوئے اور یہ سب امور مہایانہ فرقہ کے عروج کا باعث بنے۔

۷۔ اشوک کے زمانے میں ہنایانہ فرقہ کو خاص عروج حاصل ہوا تھا۔ اور صُوبہ بہار اُن کے تفکر کا مرکز مانا گیا تھا۔ کنشک کے زمانہ میں گاندھارا کو برتری حاصل ہوئی اور وسط ایشیا کے علاقوں میں بھی مہایانہ فرقے کے مذہبی خیالات مقبول ہوئے۔

۸۔ کالنگا کی جنگ کے بعد اشوک نے تلوار کو اس طرح ترک کیا کہ پھر جنگ سے توبہ کر لی۔ اور اہنسا کے اُصول پر کاربند رہا۔ لیکن کنشک نے بُدھ مت اختیار کرنے کے باوجود اہنسا کے اُصول کو اہمیت نہ دی۔

اُسی طرح جنگ و جدل کا شوقین رہا۔ اور فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُس کی تیغ زنی سے تنگ آکر کنشک کے اپنے ساتھیوں نے ہی اُسے قتل کر ڈالا۔

پس مہایانہ اور ہنایانہ عقاید میں بنیادی امور کا فرق ہے۔ اسی طرح اشوک اور کنشک کی پالیسی میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اشوک امن اور سلامتی کا پیغامبر تھا۔ لیکن کنشک ایک زبردست فاتح اور جنگ و جدل کا شیدائی تھا۔ وہ ایک کامیاب سیاست دان اور شہنشاہ بھی تھا محض مذہبی راہنما نہیں تھا۔

علوم و فنون اور آرٹ کی سرپرستی:۔ کنشک علوم و فنون کا سرپرست تھا۔ اور وہ دل سے آرٹ کی جانب گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔ فن تعمیر کا بھی شوقین تھا اُس نے ٹیکسلا اور متھرا میں کئی عمارات اور وہارہیں (Viharas) بنوائیں پشاور میں ایک سٹوپا تعمیر کرایا جس میں مہاتما بدھ کی ہڈیاں مختلف مقامات سے جمع کر کے ایک صندوقچہ میں بند کر کے رکھیں یہ صندوقچہ انگریزی دور میں شاہ جی کی ڈھیری کے مقام سے (پشاور کے قریب) دریافت ہوا۔ اور برما کے بدھسٹ عقیدت مند اس مقدس یادگار کو اپنے ملک میں لے گئے۔ لیکن سونے کی وہ ڈبیا جس میں سے مہاتما بدھ کی سوختہ ہڈیاں نکلی تھیں۔ پشاور کے عجائب گھر میں موجود ہے۔

ٹیکسلا کے قریب کنشک نے ایک نیا شہر بسایا تھا۔ اس کے کھنڈرات محکمہ آثار قدیمہ نے دریافت کرلئے ہیں۔ کنشک پورہ خاص طور پر قابل ذکر ہے اس مقام کو آجکل کانشی پورہ کہتے ہیں۔

کنشک کے زمانے میں ٹیکسلا اور نالندہ کی یونیورسٹیاں خاص طور

پر مشہور تھیں یہاں تعلیم پانے کے لیے دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ چنانچہ چینی طلبا ان دونوں یونیورسٹیوں میں موجود تھے۔ اُس زمانے میں گاندھارا آرٹ کا مرکز تھا۔ کنشک کے عہد میں فن سنگ تراشی کو بہت ترقی ہوئی کنشک کے دور میں مہاتما بدھ کے قد آدم بت تراشے گئے۔ جن سے اُس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس دور کے اکثر بُت لاہور اور پشاور کے عجائب گھروں میں موجود ہیں۔

مختلف مقامات سے کنشک کے زمانے کے سکے بھی دریافت ہوئے ہیں۔ یہ سکے اپنی ساخت اور خوبصورتی کی بنا پر عمدہ سکوں میں شمار ہوتے ہیں۔

کنشک علوم وفنون کا شوقین تھا۔ کئی ایک علما اس کے دربار کی زینت تھے۔ مشہور علما میں سے اشوا گھوش، وشوا متر، ناگرجن اور چرک قابل ذکر ہیں۔ چرک شاہی طبیب تھا۔ اور آیور ویدک طریقۂ علاج کا مُوجد تھا۔ چرک سنگھتا اُس کی مشہور تصنیف ہے۔ اسے چرک شاستر بھی کہتے ہیں یہ بات یاد رہے کہ کنشک کے زمانے میں علما کی زبان سنسکرت تھی۔ جسے کنشک نے سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا۔

کنشک کے زمانے کے تمام علما کا نگینہ اشوا گھوش تھا۔ شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ وہ علمِ موسیقی میں بھی ماہر تھا۔ یہ شخص بدھ مذہب کا بھی زبردست عالم تھا۔ اس نے بدھ چرتر یعنی مہاتما بدھ کی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔ اس نے کئی ایک مذہبی کتابیں لکھیں ہیں۔ جن میں سے سوترا النکارا (Sutra Lankara) کافی مشہور رہی ہے۔

وشوا متر وہ مشہور مذہبی راہنما تھا۔ جس نے کنشک کے زمانے میں چوتھی بُدھسٹ کانفرنس کی صدارت کی۔ اسی نے بُدھ مت کی اکثر کتابوں کی

تفسیریں لکھی ہیں۔

مہاراجہ کنشک برصغیر کی تاریخ میں ایک ممتاز ہستی ہے۔ وہ بدھ مت کا دلدادہ۔ جنگ وجدل کا شوقین۔ علما کا سرپرست۔ آرٹ کا شیدائی۔ فنِ تعمیر کا زبردست حامی ہو گذرا ہے۔ الغرض وہ کئی ایک صفات کا حامل تھا۔ اُس نے بدھ مذہب کی تبلیغ کے لئے پوری کوشش کی۔ لیکن اُس کے عہدِ حکومت میں بدھ مت دو الگ الگ فرقوں میں بٹ گیا۔

کنشک کی وفات کے بارے میں اکثر مورخین کا خیال یہ ہے کہ وہ فتوحات کا شوقین تھا۔ اور دن رات جنگ وجدل میں مصروف رہتا تھا۔ لہٰذا اُس کے فوجی افسروں نے بیزار ہو کر ۱۶۲ء میں سازش کر کے اُسے قتل کر ڈالا۔ اُس کے جانشین غیر معروف تھے۔ لیکن عیش وعشرت کے دلدادہ تھے۔ کنشک کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد ساسانی حملہ آوروں کی یورش اور شاک قوم کے پے درپے حملوں کی بدولت کشان سلطنت تباہ و برباد ہو گئی۔ کنشک کے بعد وسشک۔ ہوشک اور واسو دیو تخت نشین ہوئے لیکن کشان خاندان کی مرکزی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ اور آخر کار اس خاندان کی حکومت مغربی پنجاب تک محدود ہو کر رہ گئی۔ گپت خاندان کے عروج پر کشان خاندان کے افراد صرف وادئ کابل اور بعض دوسرے غیر معروف علاقوں پر قابض رہے اور آخر میں اُنہوں نے سفید ہن قوم کا مقابلہ بھی کیا۔

ہندوؤں کے سنہری زمانے اور گپت خاندان کے حالات اگلے باب میں بیان ہوں گے۔ اس باب کے خاتمہ سے قبل ہندوؤں کی چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی تفصیلات پیش کی جائیں گی۔

سنگھا اور کانوا ریاستیں

۱۔ سنگھا ریاست :۔ موریا خاندان کے زوال کے بعد ۱۸۴ ق-م سے لے کر ۷۲ ق-م تک وادیٔ گنگا میں سنگھا حکمرانوں (Sungas) نے ایک مضبوط ریاست قائم کرلی۔ وہ پنجاب پر قبضہ نہ کرسکے لیکن انہوں نے یونانی حملہ آوروں کا منہ توڑ جواب دیا۔ بعض مؤرخین سنگھا خاندان کو ایرانی گنتے ہیں اور قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ سورج کی پرستش کرتے تھے۔ مؤرخین کا ایک اور گروہ سنگھا حکمرانوں کو برہمن خیال کرتے ہیں۔ گرامر کے مشہور مؤلف پنینی (Panini) نے بھی سنگھا حکمرانوں کو برہمن قرار دیا ہے۔

اس خاندان کا بانی پشوا متر تھا جس کی ابتدا کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ اس نے دریائے نربدا تک اپنی سلطنت کو وسعت بخشی۔ اس کا بیٹا ودیسا (Vidisa) یعنی بھلسہ کا گورنر تھا۔ بعد میں یہ علاقہ گوالیار کہلایا۔ پشوا متر کے عہد حکومت میں مگدھ پر کالنگا کے حکمرانوں نے حملہ کیا۔ کالنگا کے حکمران کھارویلا (Kharvela) خاندان کے تھے۔ اڑیسہ میں ایک غار سے اودے گرگھی کے کتبے کی بدولت کھارویلا خاندان کی تفصیلات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس خاندان کے بانی کا نام کھارویلا تھا۔ اس نے پشوا متر کو شکست دے کر کچھ علاقے اس سے چھین لیئے اور یونانی حملہ آوروں یعنی باختریوں کو بھی شکست دے کر متھرا کی جانب پسپا کردیا۔ کتبے سے مزید یہ تفصیلات ملتی ہیں کہ کھارویلا نے دکن میں

بھی شاندار فتوحات حاصل کیں۔ اُس نے جینی پروہتوں کی جنرل اسمبلی بلا کر جین مت کے انگ (Angas) جمع کروائے۔ کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ آندھرا ست واہن خاندان کا مشہور حکمران سری ستّا کارنی اُس کا ہم عصر تھا۔ نیز سنگھا خاندان کے ابتدائی حکمران اُس کے ہم عصر تھے۔ دیمیتریس (Demetrias) مشہور یونانی یا باختری حکمران بھی اُسی زمانے میں ہو گذرا ہے۔

کھار ویلا کے حملے سے قبل پشوا متر اور اُس کے ولیعہد نے یونانیوں کو شکست دے کر پسپا کر دیا تھا اور راجہ ودھاربا (Vidhariba) کو بھی شکست دی تھی۔ پشوامتر نے اشومدھیہ یگیہ (گھوڑے کی قربانی) کی رسم ادا کرکے اپنی فتوحات پر فخر کیا تھا۔ پشوا متر کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں ملتیں۔ اُس کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا اگنی متر (Agnimitra) تخت نشین ہوا۔ وہ جنگ وجدل کا دلدادہ تھا۔ اس کے بعد اسی خاندان کے آٹھ حکمران تخت نشین ہوئے۔ پشوا متر کے پوتے وسیا متر نے یونانیوں کو شکست دے کر مار بھگایا۔ بعد ازاں سنگھا خاندان اور پنجاب کے یونانی حکمرانوں نے صلح کرکے سفارتی تعلقات بھی قائم کر لیئے۔ ایک کتبے سے ثابت ہوتا ہے کہ سنگھا حکمران بھاگ بھدرا کے عہد میں ایک سفیر ٹیکسلا کے یونانی حکمران کی جانب سے بھاگ بھدرا کی خدمت میں آیا تھا۔ سر جان مارشل کا خیال ہے کہ بھاگ بھدرا سنگھا خاندان کا پانچواں حکمران تھا۔ دسواں حکمران دیو بھُتی تھا۔ اُس کے وزیر واسو دیو نے ۷۲ ق۔م میں اُسے معزول کرکے کانوا

(Kanvas) خاندان کی بنیاد ڈالی۔ سنگھا دور میں پتنجلی ہو گذرا ہے۔ اس دور میں ادب اور آرٹ کو خوب فروغ ہوا۔ برہٹ کے مشہور سٹوپا میں پتھر کا جنگلہ اِسی دَور کا ہے۔

۲۔ کانوا خاندان :۔ پران کی رو سے کانوا خاندان کا بانی وسیو دیو تھا اُس کے تین جانشین تھے اور اُن سب نے کل ۴۵ برس حکومت کی۔ کانوا خاندان کے تاریخی واقعات یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکے البتہ پران کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنگھا خاندان کے بعد کانوا خاندان نے ۷۲ ق۔م سے لے کر ۲۸ ق۔م تک حکومت کی یہ بھی ممکن ہے کہ کانوا خاندان کے عروج کے بعد بھی چند علاقوں پر سنگھا خاندان کے چند چھوٹے موٹے شہزادگان حکومت کرتے رہے ہوں۔ آندھرا خاندان کے عروج سے وہ سب ملیا میٹ ہو گئے۔ آندھرا خاندان اور ست واہن حکمرانوں کے حالات چودھویں باب میں بیان ہوں گے۔

تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں شمالی ہند کی ریاستیں

کشان خاندان کے زوال کے بعد گپت خاندان کے عروج سے قبل ہندوستان کے تاریخی حالات غیر یقینی ہیں اور شمالی ہند کی تاریخ تقریباً تاریک ہے۔ جو تھوڑی بہت تاریخی معلومات میسر ہو گئی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں شمالی ہند میں دو زبردست خاندان حکمران رہے۔ اُن میں سے ایک خاندان ناوا ناگا (Nava Naga) کہلاتا ہے اور

دوسرے خاندان کو وکاتکا (Vakataka) کہتے ہیں۔

ناوا ناگا:۔ اصل ناگا خاندان کے حکمرانوں کو کشان خاندان نے شکست دے کر پہلی صدی عیسوی میں وسط ہند کی جانب دھکیل دیا تھا۔ لیکن تیسری صدی عیسوی میں ناگا خاندان کی طاقت کو از سر نو عروج حاصل ہوا۔ البتہ کشان خاندان کے زوال کے بعد ناگا حکمرانوں کا خاندان ناوا ناگا (Nava Naga) کہلانے لگا۔ نئے خاندان نے سات پشت تک حکمرانی کی۔ اس خاندان کا اہم حکمران ویرسین تھا جس نے غالباً متھرا اور دوآبہ کے علاقے کو زیر کیا اور وہ کشان خاندان کے آخری حکمرانوں کا ہم عصر تھا۔ اس کی اولاد کو بھارسیوا حکمران (Bharasivas) بھی کہتے ہیں جن کا ذکر وکاتکا کی تحریروں میں ہے۔ ویرسین کے بعد پانچواں حکمران بھاوا ناگا تھا۔ اس خاندان نے بنارس کے قریب اشومیدھ یگیہ رچا کر اپنی فوجی عظمت کا اعلان کیا تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس خاندان کی سلطنت میں وسط ہند۔ ملہار۔ متھرا سے لے کر چمپا تک تمام علاقہ اور گنگا سے لے کر وسط ہند تک تمام خطہ شامل تھا۔ ناگا خاندان بعد میں تین شاخوں میں بٹ گیا۔ بھاراسیوا خاندان کو باقی شاخوں پر فوقیت حاصل تھی۔ دوسری شاخیں پدماوتی اور متھرا کے صدر مقاموں سے حکومت کرتی تھیں۔ مالوہ اور راجپوتانہ میں اُن دنوں بعض جمہوریہ پسند قبائل کی حکومت تھی لیکن یہ قبائل ناوا ناگا خاندان یا بھاراسیوا خاندان کے مطیع تھے۔ شوجی کی پوجا بھاراسیوا خاندان کی بدولت ترقی

پاگئی۔ اس خاندان کے سکّے قدیم ہندو طرز کے تھے۔ اُن کے زمانے میں دریائے گنگا کا تقدس بحال ہوا۔ نیز اُن کے مندروں میں منّت ماننے اور چڑھاوے کا رواج شروع ہوا۔ ...ء میں اس خاندان کے آخری حکمران بھاوا ناگا کے مرنے پر یہ خاندان وکاٹکا خاندان میں مدغم ہو گیا۔

وکاٹکا خاندان:۔ اس خاندان کا بانی وندھیا ساکتی تیسری صدی عیسوی کے وسط میں ہو گذرا ہے۔ قیاس ہے کہ وہ بندھیلکھنڈ کا برہمن تھا اور اُس کی طاقت کی ابتدا قیلا قیلا مقام (Kilakila) سے ہوئی۔ اُن کا اصلی عروج چونکہ وکاٹکا نامی قدیم شہر سے ہوا تھا اس لئے اس خاندان کو وکاٹکا خاندان کہتے ہیں۔ وندھیا ساکتی کا بیٹا پراورسین تھا جس نے اپنے طویل عہد میں کئی بار گھوڑے کی قربانی کر کے عظمت حاصل کی۔ اُس کا بیٹا چونکہ اُس کے جیتے جی مرگیا تھا لہٰذا اُس کا پوتا رُدرا سین اوّل (Rudrasena I) تخت نشین ہوا جس کی ماں بھوا ناگا کی نسل سے تھی۔ رودرا سین اول کا بیٹا پرتھوی سین تھا جو سمندر گپت۔ رچندر گپت اور بکرماجیت کا ہم عصر تھا۔ اس کے جانشین رودرا سین ثانی کی شادی چندر گپت بکرماجیت کی لڑکی سے ہوئی۔ یہ بات مسلّم ہے کہ پرتھوی سین کے عہد سے وکاٹکا خاندان کی عظمت کھو گئی اور اُن کی حیثیت معمولی حکمرانوں جیسی ہو گئی رودرا سین ثانی کے بعد بھی وکاٹکا خاندان کے غیر معروف حکمران تقریباً سو سال تک حکومت کرتے رہے لیکن گپت خاندان کے

دوسرے خاندان کو وکاتکا (Vakataka) کہتے ہیں۔

ناوا ناگا:- اصل ناگا خاندان کے حکمرانوں کو کشان خاندان نے شکست دے کر پہلی صدی عیسوی میں وسط ہند کی جانب دھکیل دیا تھا۔ لیکن تیسری صدی عیسوی میں ناگا خاندان کی طاقت کو از سر نو عروج حاصل ہوا۔ البتہ کشان خاندان کے زوال کے بعد ناگا حکمرانوں کا خاندان ناوا ناگا (Nava Naga) کہلانے لگا۔ نئے خاندان نے سات پشت تک حکمرانی کی۔ اس خاندان کا اہم حکمران ویرسین تھا جس نے غالباً متھرا اور دوآبہ کے علاقے کو زیر کیا اور وہ کشان خاندان کے آخری حکمرانوں کا ہم عصر تھا۔ اُس کی اولاد کو بھارسیوا حکمران (Bharasivas) بھی کہتے ہیں جن کا ذکر وکاتکا کی تحریروں میں ہے۔ ویرسین کے بعد پانچواں حکمران بھاوا ناگا تھا۔ اس خاندان نے بنارس کے قریب اشومیدھ یگیہ رچا کر اپنی فوجی عظمت کا اعلان کیا تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس خاندان کی سلطنت میں وسط ہند۔ ملہار۔ متھرا سے لے کر چمپا تک تمام علاقہ اور گنگا سے لے کر وسط ہند تک تمام خطہ شامل تھا۔ ناگا خاندان بعد میں تین شاخوں میں بٹ گیا۔ بھارا سیوا خاندان کو باقی شاخوں پر فوقیت حاصل تھی۔ دوسری شاخیں پدماوتی اور متھرا کے صدر مقاموں سے حکومت کرتی تھیں۔ مالوہ اور راجپوتانہ میں اُن دنوں بعض جمہوریہ پسند قبائل کی حکومت تھی لیکن یہ قبائل ناوا ناگا خاندان یا بھارا سیوا خاندان کے مطیع تھے۔ شو جی کی پوجا بھارا سیوا خاندان کی بدولت ترقی

پا گئی۔ اس خاندان کے سکّے قدیم ہندو طرز کے تھے۔ اُن کے زمانے میں دریائے گنگا کا تقدس بحال ہوا۔ نیز اُن کے مندروں میں منّت ماننے اور چڑھاوے کا رواج شروع ہوا۔ ۳۳۵ء میں اس خاندان کے آخری حکمران بھاوا ناگا کے مرنے پر یہ خاندان وکاٹکا خاندان میں مدغم ہو گیا۔

وکاٹکا خاندان:۔ اس خاندان کا بانی وندھیا ساکتی تیسری صدی عیسوی کے وسط میں ہو گزرا ہے۔ قیاس ہے کہ وہ بندھیلکھنڈ کا برہمن تھا اور اُس کی طاقت کی ابتدا قیلا قیلا مقام (Kilakila) سے ہوئی۔ اُن کا اصلی عروج چونکہ وکاٹکا نامی قدیم شہر سے ہوا تھا اس لئے اس خاندان کو وکاٹکا خاندان کہتے ہیں۔ وندھیا ساکتی کا بیٹا پرا ورسین تھا جس نے اپنے طویل عہد میں کئی بار گھوڑے کی قربانی کر کے عظمت حاصل کی۔ اُس کا بیٹا چونکہ اُس کے جیتے جی مر گیا تھا لہٰذا اُس کا پوتا رُدرا سین اوّل (Rudrasena I) تخت نشین ہوا جس کی ماں بھاوا ناگا کی نسل سے تھی۔ رودرا سین اول کا بیٹا پرتھوی سین تھا جو سمندر گپت۔ چندر گپت اور بکرماجیت کا ہم عصر تھا۔ اس کے جانشین رودرا سین ثانی کی شادی چندر گپت بکرماجیت کی لڑکی سے ہوئی۔ یہ بات مسلّم ہے کہ پرتھوی سین کے عہد سے وکاٹکا خاندان کی عظمت کھو گئی اور اُن کی حیثیت معمولی حکمرانوں جیسی ہو گئی رودرا سین ثانی کے بعد بھی وکاٹکا خاندان کے غیر معروف حکمران تقریباً سو سال تک حکومت کرتے رہے لیکن گپت خاندان کے

عروج سے اُن کی اہمیت ختم ہو گئی تھی۔ وکاٹکا خاندان کے آخری حکمران پرتھوی سین دوئم اور ہری سین تھے۔ ۵۲۰ء تک یہ خاندان ختم ہو گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس خاندان کو دکن کے چالوکیہ خاندان نے ختم کیا جس کا حال چودھویں باب میں دیا جائے گا۔ وکاٹکا خاندان نے بدھ مت کے پیرو کاروں سے رواداری کا سلوک کیا لیکن اُن کے زمانے میں ذات پات کے بندھن دوبارہ سخت ہو گئے۔ نیز انہوں نے ہندو آرٹ کو خوب فروغ دیا۔

Typical Questions

Q. 1. How did Hinayana Buddhism come to be transformed into Mahayanism ? Point out the chief differences between the two creeds ?

Q. 2. Compare Kanishka and Asoka as patrons of Buddhism.

Q. 3. Describe Kanishka as (*a*) a conqueror and (*b*) a patron of Buddhism.

Q. 4. Briefly describe the character and achievements of Kanishka.

Q. 5. Write a short note on the transformation of Buddhism.

How would you distinguish between Hinayanism and Mahayanism ?

Q. 6. What do you know about the Sungas, Nava Nagas and the Vakatkas ?

امتحانی سوالات

1۔ بُدھ مت میں تبدیلی کیسے رُونما ہوئی۔ اور مہایانہ فرقہ کا عروج کیسے ہوُا
بُدھ مت کے دونوں فرقوں میں عقاید کے فرق کو واضح کرو۔

2۔ مہاراجہ کنشک اور مہاراجہ اشوک دونوں بُدھ مت کے سرپرست تھے
اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کیجئے۔

3۔ مہاراجہ کنشک کی فتوحات اور بُدھ مت کی سرپرستی کا حال بیان کیجئے۔

4۔ مہاراجہ کنشک کا کردار واضح کرتے ہوئے اُس کے کارنامے بیان کیجئے۔

5۔ بُدھ مت کی تبدیلیٔ شکل پر شذرہ سپُرد قلم کیجئے۔ اور مہایانہ اور ہنایانہ
فرقوں کے باہمی فرق کی وضاحت کیجئے۔

6۔ سنگھا۔ ناوا ناگا اور وکاتکا حکمرانوں کے بارے میں اپنی معلومات
مختصر طور پر قلمبند کیجئے۔

بارھواں باب

گپت خاندان۔ ہندوؤں کا سنہری زمانہ

مہاراجہ کنشک کی وفات کے بعد تین صدیوں کی طویل مدت کی تاریخ بالکل تاریک ہے۔ مختلف ذرائع سے صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ برصغیر ہندو پاکستان چھوٹے چھوٹے حکمرانوں میں بٹا ہوا تھا جن میں سے اکثر ناگا کہلاتے تھے۔ مرکزی حکومت مفقود تھی اور یہ چھوٹے موٹے حکمران آپس میں برسرپیکار رہتے تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں چندر گپت اوّل نے ایک مضبوط حکومت قائم کر لی۔ اور ملک کو ایک بار پھر سیاسی وحدت حاصل ہوئی۔ گپت خاندان کے تمام حکمران طاقتور تھے۔ اور ان کی بدولت قدیم ہندوستان نے ایک بار پھر حیران کن ترقی کی۔ گپتا شہنشاہوں کے دور کو ہندو مت کے احیاء کا زمانہ گنتے ہیں۔ جدید ہندو مت اسی دور میں معرض وجود میں آیا۔ اور اس مذہب نے برصغیر کے قدیم مذاہب کو ملیامیٹ کر کے عوامی مذہب کا درجہ حاصل کر لیا۔ گپت خاندان کے مشہور حکمران مندرجہ ذیل تھے:۔

1۔ چندر گپت اوّل 320ء تا 335ء۔

2۔ سمندر گپت 335ء تا 375ء۔

3۔ چندر گپت ثانی (بکرماجیت) 375ء تا 414ء۔

4۔ کمار گپت 414ء تا 455ء۔

5۔ سکندا گپت 455ء تا 468ء۔

سمندر گپت کو ہندی نپولین گنا جاتا ہے۔ اور بکرما جیت کے دور کو ہندوؤں کا سنہری زمانہ گردانا جاتا ہے۔ گپت خاندان کے تمام حکمران فتوحات کے علاوہ علوم و فنون کی سرپرستی کے ازحد شوقین تھے۔ گپت دور میں ٹیکسلا اجنٹا اور نالندہ یونیورسٹیاں شہرہ آفاق تھیں۔

چندر گپت اوّل:۔ مؤرخین اس بات کا یقینی طور پر پتہ نہیں لگا سکے۔ کہ گپت خاندان کی ابتدا کیسے ہوئی۔ مشہور مؤرخ جیسوال ان کو جاٹ قبیلے سے متعلق سمجھتا ہے۔ بعض مؤرخین گپت خاندان کو ویش گردانتے ہیں۔ لیکن موجودہ تحقیق سے یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔ بعض روایات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ گپت خاندان کے افراد ابتدا میں اندھرا حکمرانوں کے ملازم تھے۔ بعد میں اُن کو سیاسی اقتدار حاصل ہوا۔

بعض ہندو مؤرخین کا خیال یہ ہے کہ چندر گپت ابتدا میں مگدھ کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست کا سردار تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے آریہ قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر خود مختار حکومت قائم کر لی۔ 308ء میں اُس نے لچھوی قبیلے کی ایک شہزادی سے شادی کر لی۔ اس شادی کی بدولت چندر گپت کی سیاسی طاقت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اور آخر کار اُس نے اپنے سسرال کی مدد سے پاٹلی پتر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اُس نے 320ء میں تاجپوشی کی اور مہاراجہ کا لقب اختیار کیا۔ مؤرخ اُس کے عہد حکومت کو 320ء سے شروع کرتے ہیں۔ اور اس سے پہلے عرصے کو اُس کا ابتدائی دور گنتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد چندر گپت نے اپنی سلطنت کی حدود کو مزید وسعت دی۔ تاجپوشی پر یعنی 320ء میں چندر گپت نے گپت سمت

جاری کیا۔ اور اس اہم واقعہ کی یادگار کے طور پر نئے سکے بھی جاری کئے۔ ان سکوں پر ایک جانب چندر گپت کا اپنا نام درج ہے اور دوسری جانب اُس کی بیوی کمار دیوی کا نام کندہ ہے۔ جو لچھوی خاندان کی شہزادی تھی۔ بعض دیگر سکوں سے چندر گپت کے عروج اور کمار دیوی سے شادی کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ چندر گپت کے بعض سکوں پر لکشمی دیوی کی تصویریں بھی موجود ہیں۔

چندر گپت نے 335ء میں وفات پائی۔ اُس نے مرتے دم تک فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور اپنی سلطنت کو خوب وسعت دی اُس کی سلطنت کی حدود الٰہ آباد۔ ترہٹ اور اودھ تک تھیں۔ وہ گپت خاندان کا بانی ہے اور اُس نے ملک کو دوبارہ سیاسی وحدت اور مضبوط حکومت عطا کی۔

سمندرگپت :۔ گپت خاندان کا دُوسرا حکمران سمندر گپت 335ء میں اپنے باپ کی وفات پر تخت نشین ہُوا اور اپنی فتوحات کی بنا پر ہندی نپولین (Indian Napolean.) کہلایا۔ وہ اس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ اُس کی ماں لچھوی خاندان کی شہزادی تھی۔ بھارت کے دیگر حکمران بھی اس کے اعلیٰ حسب نسب کی بدولت اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ الٰہ آباد کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ اعلیٰ فوجی قابلیت کا مالک تھا He was a military genius اسی بنا پر سمندر گپت کو اُس کے بڑے بھائیوں پر ترجیح دی گئی۔ اور اُسے تاج پہنایا گیا۔ یہ انتخاب خوب موزوں ثابت ہوا۔ کیونکہ سمندر گپت نے اپنے خاندان کی شہرت کو دُور دُور تک پھیلایا۔ اور سلطنت کو نہ صرف

مستحکم کیا۔ بلکہ اسے وسعت بھی بخشی۔

سمندر گپت بڑا نامور اور شجاع راجہ ہو گذرا ہے۔ ہندوؤں میں اُس سے بہتر جنگجو اور فاتح آج تک پیدا نہیں ہوا۔ چانکیہ کے دونوں اُصول اس کے دل میں گھر کر گئے تھے کہ:۔

۱۔ "جس شخص کے پاس ضروری جنگی سامان موجود ہو گا۔ وہ دشمن کے خلاف مقابلے کی ضرور ٹھانے گا۔"

۲۔ "جس شخص کی (فوجی) طاقت دُوسروں کی نسبت زیادہ ہو گی وہ ضرور جنگ شروع کرنے میں پہل کرے گا۔"

سمندر گپت تمام ملک کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ اور مہاراجہ ادھیراج کا لقب اختیار کرنا چاہتا تھا۔ اس ہوس میں اُس نے اپنی تمام زندگی جنگ وجدل میں صرف کی اور چند سالوں میں اُس نے بہت زیادہ فتوحات حاصل کیں۔ چنانچہ وہ ایک وسیع سلطنت کا مالک بنا۔ ڈاکٹر مکرجی کا قول نہایت درست ہے۔ کہ "اشوک اگر امن پسندی عدم تشدد اور آہنسا کا دیوتا تھا تو سمندر گپت جنگ وجدل اور فتوحات کا علمبردار تھا۔"

سمندر گپت محض جرنیل اور فاتح ہی نہیں تھا بلکہ وہ اعلیٰ سیاستدان اور مذہب کا شیدائی بھی تھا۔ سمندر گپت آرٹ کا بھی دلدادہ تھا موسیقی کا خاص طور پر شوقین تھا۔ بعض سکوں پر سمندر گپت کو ستار بجاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ شہنشاہ کو ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اُس نے تین عدد منظوم کتابیں بھی لکھیں۔ الٰہ آباد کے کتبے میں جب سمندر گپت کی خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تو اُسے کوی راج کے

نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یعنی سلطنت کا عظیم الشّان شاعر۔

سمندر گپت کی فوجی عظمت کی بنا پر ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں نے بھی اُس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اُس سے سفارتی تعلقات قائم کیے۔ چنانچہ الٰہ آباد کے کتبے سے ثابت ہوتا ہے کہ لنکا کا راجہ میگھ ورن اُس کا نیاز مند تھا۔ گجرات سوراشٹر اور افغانستان کے حکمرانوں سے سمندر گپت کے سفارتی تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کے جزائر کے حکمران اُس سے ڈرتے تھے انہوں نے تحفے تحائف بھیج کر سمندر گپت کو خوش کر لیا تھا۔ اور اُس سے دوستی قائم کر لی تھی۔ ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سمندر گپت کا دبدبہ نہ صرف اندرونِ ملک میں تھا۔ بلکہ غیر ملکی حکمرانوں میں بھی اس کا وقار بہت بڑھا ہوا تھا۔ پیدائشی سپاہی تو وہ تھا ہی لیکن وہ غیر ممالک سے تجارتی اور تمدّنی تعلقات بھی قائم کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی خارجہ پالیسی ازحد کامیاب تھی۔

سمندر گپت کی فتوحات

تخت نشین ہوتے ہی سمندر گپت نے شمالی ہند میں فتوحات کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ اُس نے ہر حکمران کو ملیامیٹ کر کے اُس کی سلطنت کا الحاق کر لیا۔ اور اس کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ یکے بعد دیگرے سمندر گپت نے نو مختلف راجاؤں کو مسخّر کیا۔ ان تمام فتوحات کو شمالی ہند کی تسخیر کہتے ہیں۔ ان فتوحات کی بدولت پنجاب۔ سندھ۔ وسط ہند۔ اُڑیسہ کے علاوہ

چھوٹا ناگپور بھی اس کے قبضے میں آگیا۔ شمالی ہند کی فتوحات میں سب سے زیادہ خوفناک لڑائی ناگ راجاؤں کے خلاف کوسمبھی کے مقام پر لڑی گئی۔ یہ جگہ الہ آباد کے قریب تھی۔ اس لڑائی میں تینوں ناگ راجاؤں کی فوجوں نے متحدہ محاذ قائم کیا لیکن سمندر گپت نے ان کو شکست دے کر تمام لشکر کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس فتح کی یاد میں سمندر گپت نے کوسمبھی کے مقام پر مہاراجہ اشوک کے نصب کردہ مینار پر ایک کتبہ کندہ کروایا۔ مغل شہنشاہ اکبر اس مینار کو اکھاڑ کر الہ آباد کے قلعہ میں لے گیا۔ سمندر گپت نے وسط ہند کی فتوحات اس کے بعد شروع کیں۔ اُس زمانے میں جنگلوں کی بہتات تھی لہٰذا وسط ہند کو "جنگل کا ملک" کہتے تھے۔ کوسمبھی کی لڑائی کے بعد راجپوتانہ۔ نیپال آسام اور بنگال کے راجاؤں نے دانش مندی سے کام لے کر خود بخود سمندر گپت کی اطاعت قبول کر لی۔ پس تمام شمالی ہند اور مغربی پاکستان میں سمندر گپت کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہو گیا۔

دکن کی فتح:۔ دُنیا کے بڑے بڑے فاتحین کی مانند راستے کی مشکلات سے بے نیاز ہو کر سمندر گپت نے دکن کی فتح کا عزم کیا۔ ذرائع آمد و رفت ناکافی تھے۔ تقریباً تین ہزار میل کا سفر تھا۔ اور راستہ جنگلات سے بھرپور تھا۔ لیکن سمندر گپت کے آہنی عزم میں فرق نہ آیا۔ اور اُس نے تمام مشکلات پر قابو پا کر دکن پر حملہ بول دیا۔ سب سے پہلے کوسلہ کے راجہ مہندر کو شکست دی۔ اُس کی سلطنت دریائے مہاندی کے قریب تھی اس کے بعد مشرقی ساحلی علاقے کو فتح کرتا ہوا اُس علاقے میں جا نمودار ہوا۔ جسے آجکل مدراس کہتے ہیں۔ پھر اُس نے وہ تمام علاقے

فتح کر لیے جو آجکل میسور اور حیدر آباد کے نام سے مشہور ہیں۔ بعد ازاں کوہ بندھیاچل کو عبور کر کے خاندیش کی سلطنت کو فتح کیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی سلطنت کا رُخ کیا۔ کہا جاتا ہے اُس نے یکے بعد دیگرے ایک درجن دکنی راجاؤں کو شکست دے کر مطیع و باجگذار بنایا۔

دکن کی فتح کے بعد اُس نے کوہ بندھیاچل کو اپنی سلطنت کی آخری سرحد بنایا۔ اور بقایا دکنی راجاؤں کے علاقوں کا الحاق کرنے کی بجائے اُن کو باجگذار رہنے دیا یہ حکمت عملی دانشمندانہ تھی کیونکہ دُور دراز علاقوں کا الحاق حکومت کے لیے مشکلات کا باعث ہوتا۔ دکن کی فتح کے بعد سمندر گپت نے پاٹلی پتر کی بجائے اجدھیا یا اُجین کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اسی مقام پر اس نے اشومیدھ یگیہ رچایا اور مہاراجہ ادھیراج کا لقب اختیار کیا۔ اشومیدھ یگیہ یعنی گھوڑے کی قربانی ایک قدیم رسم تھی۔ جس کے مطابق اس رسم کا منانے والا تمام برصغیر کا شہنشاہ تصور کیا جاتا تھا اس تقریب کے موقع پر سونے کا ایک نیا سکہ جاری کیا گیا۔ جو برہمنوں میں مفت تقسیم کیا گیا۔

وُسعتِ سلطنت:۔ سمندر گپت کی سلطنت نہایت عظیم الشان تھی اُس میں ہندو پاکستان کے بیشتر علاقے شامل تھے۔ سندھ کا کچھ علاقہ اس کی سلطنت میں شامل نہ تھا۔ اسی طرح مالوہ اور گجرات کے علاقے اس کی سلطنت میں شامل نہ تھے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ شمال میں دریائے چناب اُس کی سلطنت کی حد تھی۔ مشرق میں اُس کی سلطنت دریائے برہم پترا تک پھیلی ہوئی تھی۔ جنوب میں نربدا

دور میں سنسکرت زبان کی دوبارہ ترویج و ترقی ہوئی۔ اور علوم و فنون کو اس زمانے میں بے حد ترقی ہوئی۔ احیائے علم کی بدولت لوگوں نے مذہب کا از سر نو مطالعہ کیا۔ اور جدید ہندو مت عالم وجود میں آیا۔ ہندو تہذیب نے اس دور میں ہر لحاظ سے ترقی کی۔ بدھ مت اور جین مت کی بجائے جدید ہندو ازم دوبارہ عوامی مذہب بن گیا۔ اسی زمانے میں مشہور چینی سیاح فاہیان ہندوستان پہنچا۔ لٹریچر اور آرٹ میں بے مثال ترقی کے علاوہ جاوا۔ سماٹرا اور ہند چینی میں ہندوؤں نے نو آبادیات بھی قائم کیں۔ اور تجارتی ترقی کی بدولت ملک خوشحال ہو گیا۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر چندر گپت بکرماجیت کے دور کو ہندوؤں کا سنہری زمانہ گنا جاتا ہے۔ اب ہم چندر گپت ثانی کے عہد حکومت کا تفصیلی حال بیان کریں گے۔ جس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ ہندوؤں کی تاریخ میں فی الواقع ایک درخشاں ہستی ہے۔ اور اس کا زمانہ ہندوؤں کا سنہری دور کہلانے کا مستحق ہے۔

فتوحات:۔ سمندر گپت نے ایک وسیع سلطنت چھوڑی تھی۔ چندر گپت بکرماجیت نے نہایت عمدگی اور خوبی سے اس کا انتظام کیا۔ اس کے علاوہ اُس نے مزید فتوحات سے اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ سمندری تجارت کو اپنے ہاتھ میں کرنے کے لیٔے اس نے گجرات اور مالوہ کو فتح کرنے کی ٹھانی اور قدیم دوستانہ تعلقات قطع کر لیئے۔ اُس زمانے میں گجرات اور مالوہ میں شاکا قوم کے افراد حکمران تھے اور یہ علاقہ تین سو سال سے اُن کے قبضے میں

چلا آرہا تھا۔ چندر گپت بکرما جیت نے بڑی تیزی سے حملہ کیا۔ اور شاکا حکمرانوں کو شکست دے کر ان کے تمام علاقے کا الحاق کر لیا۔ اس سے نہ صرف ملکی تجارت کو ترقی ہوئی۔ بلکہ گپت سلطنت کی حدود بحیرہ عرب تک جا پہنچیں۔ مغربی ہند کی بندرگاہیں اُس زمانے میں اہم تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان علاقوں کی تسخیر کی بدولت سکندریہ اور بحیرہ قلزم کی بندرگاہوں کا مال ہندوستان کے شہروں میں آسانی سے پہنچنے لگا۔

چندر گپت ثانی کی تخت نشینی سے پہلے ہی اجین گپت سلطنت کا دارالخلافہ بن چکا تھا۔ چندر گپت ثانی کو یہ شہر بہت پسند تھا۔ لہٰذا اُس نے اس شہر کو خوب ترقی دی۔ اور یہ شہر علمی مرکز بن گیا۔ بکرماجیت نے یہاں ایک عظیم الشان مندر بھی تعمیر کرایا۔

فاہیان کی آمد:۔ چندر گپت بکرما جیت کے عہد حکومت اور انتظام سلطنت کے حالات ہمیں زیادہ تر فاہیان کی تحریروں سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ چندر گپت ثانی کے بعض سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ فاہیان مشہور چینی سیاح تھا۔ وہ ۴۰۵ء میں بھارت پہنچا۔ اور آٹھ سال اس ملک میں گھومتا پھرتا رہا۔ وہ بدھ مذہب کا سرگرم پیروکار تھا اور اس ملک میں اُس کی آمد کا مقصد مقدس مقامات کی زیارت کرنا تھا۔ اُس نے برّصغیر کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ اور گپت انتظام سلطنت پر بھی قابل قدر روشنی ڈالی ہے۔

فاہیان کے زمانے میں ملکی حالات

انتظامِ سلطنت:۔ فاہیان نے اس دور کے انتظامِ سلطنت

قول ہے۔ کہ سنسکرت زبان اور ہندومت کا احیاء ایک ساتھ ہوا۔ سنسکرت کی ہر دلعزیزی کی بدولت برہمن مت کا دوبارہ مطالعہ ہونا لازمی تھا۔ لیکن چندرگپت بکرماجیت کے زمانے میں پران کی دوبارہ تدوین کی گئی۔ برہمن مت کی تنگ نظری کو ختم کیا گیا۔ چند نئے اصول مذہب میں شامل کئے گئے اور نئے مذہب کو ازحد وسیع کر دیا گیا اسے جدید ہندومت کہتے ہیں۔ مورخ اس کو (Religious Revival) کہتے ہیں۔ یعنی احیائے مذہب ۔نئے مذہب کو جدید ہندومت کا نام دیا گیا۔ لیکن در اصل یہ مذہب برہمنوں کے قدیم مذہب سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا بڑا مقصد صرف یہی تھا کہ باقی تمام مذاہب کو کسی نہ کسی طرح جذب کر لیا جائے۔ چنانچہ آجکل ایک ہی گھر کے مختلف افراد کے لئے جائز ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے دیوتا کی پوجا کر لیوے۔ نئے مذہب میں قربانیوں کو ترک کر دیا گیا۔ اور آہنسا کے اصول کو اپنا لیا گیا۔ مہاتما بدھ کو بھی محض ایک دیوتا کا درجہ دے کر بدھ مت کی اصلی شکل کو مسخ کر دیا گیا۔ نیا مذہب ہندومت کہلایا لیکن دراصل یہ مذہب قدیم ہندومت سے بالکل مختلف تھا۔

تجارت اور نو آبادیات :۔ مورخین کا خیال ہے کہ چندرگپت ثانی کے زمانے میں ہندوؤں نے سمندری سفر اختیار کرنا شروع کر دیا اور ان کے تجارتی تعلقات مغربی ممالک سے استوار ہوئے چنانچہ سکندریہ اور بحیرہ قلزم کی بندرگاہوں کا مال آزادی سے ہندوستان کے شہروں میں میسر آتا تھا۔ اسی دور میں ہندی نوآبادیات

بھی قائم ہوئیں اور (Greater India) یا (Farther India) کی بنیاد رکھی گئی۔ چنانچہ ہندوستانیوں نے جاوا۔ سماٹرا اور ہندچینی میں پہنچ کر نوآبادیات قائم کیں۔ ان نوآبادیات کی بدولت گپت سلطنت میں خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔ اور تجارتی ترقی بے مثال درجے تک پہنچ گئی۔

پس چندر گپت بکرماجیت کے زمانے میں ہر گونہ ترقی ہوئی۔ اور ان تمام امور کی بنا پر اُس کے عہد حکومت کو ہندو تاریخ کا سنہری دور گنتے ہیں۔ مؤرخین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ گپت خاندان ہندوؤں کا سنہری زمانہ ہے۔

سنہ ۴۱۴ء میں چندر گپت بکرماجیت نے وفات پائی۔ اُس کا عہد حکومت ہندوؤں کی تاریخ میں از حد شاندار ہے۔

بکرماجیت کے جانشین:- چندر گپت بکرماجیت کے جانشینوں کے اصلی حالات آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ اس کے بعد اُس کا لڑکا کمار گپت تخت نشین ہوا۔ اور اُس کے زمانے میں بھی رعایا خوشحال تھی۔ اُس نے سنہ ۴۵۵ء میں وفات پائی۔ اس کے آخری دنوں میں ہُن قوم کی تاخت و تاراج شروع ہوئی۔ کمار گپت کے بعد اس کا بیٹا سکندا گپت تخت نشین ہوا۔ اُسے ایک ہی وقت میں ہُن قوم اور پشیا مترا سے جنگ کرنی پڑی۔ ہُن قوم کے پے در پے حملوں کا مقابلہ آسان امر نہ تھا۔ لہٰذا سکندا گپت کو اپنی سلطنت کے تمام ذرائع صرف کرنے پڑے۔ سکندا گپت اس خاندان کا آخری تاجدار تھا۔ اُس کے بعد گپت خاندان کو

زوال ہوا۔ اس کی بڑی وجہ ہن قوم کی آمد تھی۔

ہن قوم کی تاخت و تاراج

ہن قوم کا اصلی وطن شمال مغربی چین تھا۔ 165ء ق۔م میں یوچی قبائل نے انہیں شکست دے کر ترکستان کی جانب دھکیل دیا۔ یہاں پہنچ کر یہ لوگ خانہ بدوش ہو گئے۔ لیکن بلا کے بہادر ظالم اور خونخوار تھے۔ یہاں سے ان کا ایک حصہ یورپ پر حملہ آور ہوا۔ ان کو رومی مؤرخ سفید ہن (White Huns) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کا سردار اٹیلا (Attila) تھا جو سفاکی اور خونریزی میں دنیا بھر میں مشہور ہے۔ سفید ہن قوم کے حملوں سے روما کی سلطنت برباد ہوئی۔

ہن قوم کی دوسری شاخ نے افغانستان کا رخ کیا۔ اور کشان خاندان کے راجاؤں کو زیر کر کے وہاں قابض ہو گئے۔ یہاں سے انہوں نے برصغیر ہند و پاکستان پر پے در پے حملے کئے۔ اور گپت سلطنت کا خاتمہ کر ڈالا۔ ان کا پہلا حملہ 455ء میں تھا لیکن سکندا گپت نے ان کو شکست دی۔ اگلے سال ہن قوم نے پھر حملہ کیا۔ اور سکندا گپت کو شکست دی۔ مؤرخ ان نئے حملہ آوروں کو ہن یا سفید ہن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے حملوں نے نہ صرف اس ملک کی سیاسی وحدت کو ختم کیا۔ بلکہ گپتا تہذیب و تمدن کو بھی ملیامیٹ کر ڈالا۔

تورمان:۔ سکندا گپت کے بعد برصغیر پر ہن قوم نے تورمان کی

سرکردگی میں متواتر حملے کیے۔ ۵۰۰ء تک تورمان نے پنجاب۔ راجپوتانہ۔ سندھ اور مالوہ کو فتح کر کے خود مختار سلطنت قائم کر لی۔ اور مہاراجہ ادھیراج کا لقب اختیار کیا۔ تورمان کے سکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سورج کی پرستش کرتا تھا۔ اُس نے ۵۱۵ء میں وفات پائی۔ اُسے وسط ہند کے اکثر چھوٹے چھوٹے راجوں نے حاکم اعلیٰ مان لیا تھا۔

مہرگل:۔ تورمان کے بعد اُس کا لڑکا مہرگل تخت نشین ہوا جو ظلم وستم اور خونخواری میں بے مثال تھا۔ اس کی سلطنت میں افغانستان بھی شامل تھا۔ سیالکوٹ اس کا دارالخلافہ تھا۔ رعایا اُس کے ظلم وستم سے تنگ آگئی۔ اور اس نے بدھ مت خانقاہوں کو بالکل برباد کر ڈالا۔ مگدھ کے راجہ بالا دتیہ نے 528ء میں مہرگل کو شکست دی۔ یہ لڑائی ملتان کے قریب کہروڑ کے مقام پر لڑی گئی۔ اور مہرگل کی ہندو رعایا نے بھی بالادتیہ کا ساتھ دیا۔ مہرگل شکست کھا کر کشمیر بھاگ گیا۔ اور وہاں کے راجہ نے اُسے پناہ دے کر جاگیر عطا کی۔ لیکن مہرگل نے موقع پا کر راجہ کو قتل کر ڈالا۔ اور خود کشمیر پر قابض ہو گیا۔ یہاں سے اُس نے گاندھارا پر حملہ کر کے بدھ مت کے حامیوں کو بے دردی سے تہ تیغ کیا۔ مہرگل کے چھ سو سال بعد ایک کشمیری برہمن نے اپنی کتاب راج ترنگنی میں مہرگل کے ظلم وستم کی لرزہ خیز داستانیں بیان کی ہیں۔ اس کتاب میں یہ ذکر ہے کہ مہرگل کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ کشمیر کی پہاڑیوں سے ہاتھیوں کو لڑھکا دیا کرتا

تھا۔ ہاتھی جب زخمی اور بے بس ہو کر چنگھاڑتے تھے تو مہر گل خوش ہوتا تھا۔ مہر گل نے ۵۴۲ء میں وفات پائی۔ مہر گل کے اصلی مذہب کا یقینی طور پر پتہ نہیں چل سکا۔ بعض سکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سورج دیوتا۔ شیو جی مہاراج اور اس کے نندی بیل کا عقیدت مند تھا۔

ہن قوم کی حکومت برصغیر ہندو پاکستان میں دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی حکومت زیادہ عرصے کے لیئے فوجی طاقت اور ظلم و ستم کی بدولت قائم نہیں رہ سکتی۔ وسط ایشیا کے سفید ہنوں کو ۵۶۵ء میں ایرانی شہنشاہ نوشیرواں نے شکست دے کر منتشر کر دیا اور انہیں امن پسندی پر مجبور کیا۔ مہر گل کے بعد برصغیر کے ہن حکمرانوں کو بیرونی مدد منقطع ہو گئی۔ لہٰذا ہندوؤں نے اتحاد کر کے اُن کا خاتمہ کر ڈالا۔ ہن قوم مفتوح ہو کر تتر بتر ہو گئی۔ کچھ لوگ برصغیر سے باہر بھاگ گئے اور باقی ماندہ لوگوں نے ہندومت اختیار کر کے اسی علاقے میں سکونت اختیار کر لی۔

ہن حملوں کے اثرات:۔ ہن قوم کے حملوں نے ہندو پاکستان کی تاریخ پر دور رس اور گہرے اثرات چھوڑے۔ ان کے حملوں کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ گپت خاندان کو زوال ہوا اور اس عظیم الشان سلطنت کی بجائے برصغیر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ نئے مقامی راجاؤں میں سیاسی شعور یا وحدت و اتفاق کا جذبہ مفقود تھا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے تھے اور اس سے ملک میں سیاسی انتشار بڑھتا تھا۔

۲۔ مؤرّخین کا خیال ہے کہ ہُن قوم کے حملوں کی بدولت برّصغیر کے آئندہ حکمرانوں نے مطلق العنانی سیکھی۔ اس سے قبل قدیم تاریخ میں جمہوری اُصولوں کے نشان ملتے ہیں۔ مثلاً سمتی اور سبھا۔ لیکن چھٹی صدی کے برّصغیر کا ہر حکمران جابر اور مطلق العنان ثابت ہُوا یہ تبدیلی ہُن قوم کی بدولت ہوئی۔

۳۔ ہُن قوم کے حملوں سے نادر تاریخی یادگاریں اور دستاویزیں تلف ہوئیں۔ گاندھارا کی خانقاہوں کی بربادی سے خاص طور پر کئی ایک علمی ذخیرے ضائع ہوئے۔ اُن کے ہاتھوں سے بعض کتبے بھی نہ بچے۔ پس علم تاریخ کو ہُن قوم کے حملوں سے سخت نقصان پہنچا ہے۔

۴۔ مہرگل کی وفات کے بعد شکست خوردہ ہُن قوم نے جب برّصغیر میں امن پسندانہ زندگی بسر کرنا شروع کی۔ تو انہوں نے ہندو مذہب اختیار کر لیا۔ ہندوؤں نے اُن کی فوجی قابلیّت سے فائدہ اٹھا کر اُن سے ملکی حفاظت کا کام لیا۔ اور ہُن قوم کو کھشتری کا درجہ دیا۔ بعد میں یہ لوگ راجپوت کہلائے۔ چنانچہ راجپوتوں کے اکثر قبیلے (Clans) ہُن قوم کی نسل سے ہیں۔

۵۔ ہُن قوم نے برّصغیر میں سکونت اختیار کرنے کے بعد مقامی لوگوں میں شادیاں رچائیں۔ اس طرح ہندی سوسائٹی میں نیا سپاہیانہ خون داخل ہُوا ٭

Typical Questions

Q. 1. Why is the Gupta period known as the "Golden Age" of Hindu India?

Q. 2. "The Gupta period was an era of Hindu revival." Discuss.

Q. 3. Write a short note on Fa-hien and narrate briefly the social and religious conditions of the country as recorded by him.

Q. 4. Give a short account of the reign of Chandergupta II. What light does Fa—hien throw on this period?

Q. 5. " Probably India has never been governed better after the oriental manner than it was during the reign of Vikramditya (Chandergupta II)". Justify this statement.

Q. 6. Describe the campaigns of Samudra Gupta in Northern and Southern India.

Q. 7. " Samudragupta, the Second Gupta monarch, was one of the most remarkable kings who ever ruled India." Discuss.

Q. 8. Give a brief description of the cultural achievements of the Gupta period.

Q. 9. Who were the Huns? Where did they come from? What effect did they leave on Indian history?.

Q. 10. Explain the importance of the Allahabad Inscription.

امتحانی سوالات

1۔ گپتا دور کو ہندوؤں کا سنہری زمانہ کیوں گنا جاتا ہے؟

2۔ "گپتا دور میں ہندو علوم و تمدن کی ازسرِنو ترویج ہوئی"۔ تبصرہ کیجئے۔

3۔ فاہیان پر مختصر نوٹ قلمبند کیجئے۔ اس ملک کے بارے میں اس کی تحریر کردہ مذہبی اور سیاسی حالت سپردِ قلم کیجئے۔

4۔ چندر گپت ثانی کے عہد حکومت کا حال بیان کیجئے۔ اس دور پر فاہیان نے کیا روشنی ڈالی ہے؟

5۔ "وکرمادتیہ یعنی چندر گپت ثانی سے بہتر کوئی بھی مشرقی شہنشاہ ہندوستان بھر کی تاریخ میں نہ ہوا ہوگا" ثابت کیجئے۔

6۔ شمالی ہند اور دکنی علاقوں میں سمندر گپت کی فتوحات کا حال بیان کیجئے۔

7۔ "گپت خاندان کا دوسرا شہنشاہ یعنی سمندر گپت اس برّصغیر کے حکمرانوں کی صفِ اوّل میں شمار ہوتا ہے"۔ تبصرہ کیجئے۔

8۔ گپتا دور میں ثقافتی اور علمی و ادبی ترقی کا حال بیان کیجئے۔

9۔ ہن کون لوگ تھے؟ وہ کس علاقے سے وارد ہوئے؟ برّصغیر کی تاریخ پر ان کے حملوں کے اثرات کیا ہوئے؟

10۔ الہ آباد کے کتبے کی اہمیت واضح کیجئے۔

تیرھواں باب

مہاراجہ ہرش

ہُن قوم کی تاخت و تاراج کی بدولت جب گپت سلطنت کا خاتمہ ہوا تو برصغیر ہندو پاکستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا ان ریاستوں میں سے قنوج۔ مالوہ۔ تھانیسر، ولبھی اور بنگال اہم تھیں۔ لیکن ان کے حالات مفقود ہیں۔ چنانچہ قدیم تاریخ میں چھٹی صدی عیسوی مکمل تاریکی کا دور ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں تھانیسر کی ریاست نے ایک جلیل القدر شہنشاہ پیدا کیا جسے ہرش وردھن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہندو تاریخ میں یہ آخری تاجدار ہے جس نے برصغیر کے بیشتر حصے پر حکومت کی۔ اس کی حکومت کا زمانہ 605ء سے لے کر 647ء تک ہے۔

ہرش کا خاندان :- ہرش وردھن تھانیسر کے راجہ پربھاکر وردھن کا چھوٹا لڑکا تھا۔ ہرش کی والدہ مالوہ کے راجہ کی لڑکی تھی اور ہرش کی بہن راجیہ سری (راجیشوری) کی شادی قنوج کے راجہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ پربھاکر وردھن نے مالوہ اور پنجاب میں سے ہُن قوم کا اثر ورسوخ ختم کیا۔ 604ء میں پربھاکر نے ایک بار پھر ہُن قوم کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی اور اپنے بڑے لڑکے راجیہ وردھن کو اُس فوج کا جرنیل مقرر کیا۔ ہرش بھی اس فوج میں شامل تھا۔ فتح کے فوراً بعد دونوں

بھائیوں کو پربھاکر کے مرنے کی خبر ملی اور وہ تیزی سے تھانیسر واپس آ گئے۔ اس دوران میں مالوہ کے راجہ دیوگپت نے ان کے بہنوئی پر حملہ کر کے اُسے قتل کر ڈالا۔ اور قنوج پر قبضہ کر لیا اور راجیہ سری کو گرفتار کر لیا۔ راجیہ وردھن نے تخت نشین ہوتے ہی بہنوئی کا بدلہ لینے کے لئے تیاری کی۔ بنگال کے راجہ سے مل کر اُس نے مالوہ پر چڑھائی کی۔ لیکن عین وقت پر بنگال کے راجہ ششانکا نے غداری کی اور راجیہ وردھن کو موت کے گھاٹ اُتار ڈالا۔

ہرش کی تخت نشینی :- ہرش وردھن اُس وقت سولہ[16] برس کا تھا۔ لیکن وُہ بڑا غیور انسان تھا۔ جب تک اُس نے بھائی کی موت کا بدلہ نہ لیا اور بہن کو دشمن کے چنگل سے آزاد نہ کرایا۔ اُسے چین نہ پڑا۔ چنانچہ پانچ سال کی متواتر جنگ کے بعد اُسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ یہ پنج سالہ جنگ جارحانہ نہ تھی بلکہ خاندانی ناموس کی خاطر تھی۔ خاوند کی موت کی وجہ سے راجیہ سری تخت سے دستبردار ہو گئی۔ اور ہرش نے بہن کے کہنے پر قنوج کی ریاست کا الحاق کر لیا اور اس موقع پر قنوج کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کی فوج ستّر ہزار کے قریب تھی۔ اور از حد منظم اور تربیت یافتہ تھی۔ اسی فوج کی بدولت ہرش نے تھوڑے ہی عرصے میں شمالی بھارت کو فتح کیا اور اپنی اعلیٰ فوجی قابلیّت کا ثبوت دیا۔

مزید فتوحات :- ہرش نے تخت پر بیٹھتے ہی مالوہ کے راجہ دیوگپت کا قلع قمع کیا اور اُس کی ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ بعد ازاں اُس نے ولبھی (گجرات) کے راجہ پر بھی حملہ

کیا تا کہ سمندری علاقہ ہرش کے قبضے میں آجائے۔ ولبھی کے راجہ نے شکست کھائی اور بھراؤچ کے راجہ سے مدد مانگی۔ لیکن بھراؤچ کے راجہ داد دوئم نے دونوں کی صلح کرا دی۔ اور ولبھی کا راجہ دھروسین ہرش کا مطیع ہو گیا۔ بعد میں ان دونوں کے تعلقات اتنے خوشگوار ہو گئے کہ ہرش نے اپنی لڑکی کی شادی اس سے کر دی۔

ولبھی کی جنگ کے بعد ہرش نے بنگال پر متواتر حملے کئے لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ ہرش نے بنگال کے راجہ کو تنگ کرنے کے لئے اس کے دشمن راجہ بھاسکر ورمن سے دوستی کا رشتہ قائم کیا۔ یہ راجہ کامروپ یا آسام کا حکمران تھا۔ بنگال کے راجہ ششانکا نے اپنے بچاؤ کے لئے ملک کو چھوڑا اور اڑیسہ میں نمودار ہوا۔ لیکن 625ء میں ششانکا فوت ہو گیا۔ اس کی سلطنت پر دشمنوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور اس کے تمام علاقے مہاراجہ ہرش اور بھاسکر ورمن نے آپس میں بانٹ لئے۔ اڑیسہ مہاراجہ ہرش کو ملا۔ اس موقع پر ہرش کی سلطنت کافی وسیع ہو چکی تھی اور وہ تھانیسر۔ قنوج۔ اڑیسہ۔ بہار۔ مالوہ۔ اور صوبہ دہلی و انبالہ ڈویژن (مشرقی پنجاب) کا مالک تھا۔ ولبھی راجہ بھی اس کا مطیع تھا۔ پس تمام شمالی بھارت اس کے قبضے میں آ چکا تھا۔

دکن پر حملہ:۔ کامرانی کے نشے میں مہاراجہ ہرش نے دکن فتح کرنے کی ٹھانی۔ یہ حملہ محض ملک گیری کی ہوس کی بدولت تھا۔ اس زمانے میں دکن پر چالوکیہ خاندان کا راجہ پلک سین دوئم حکمران تھا اور تمام دکن اس کے زیر نگیں تھا۔ پلک سین کی فوجی طاقت بھی معمولی نہ تھی۔ مہاراجہ ہرش کو دکن کی مہم میں کامیابی نہ ہوئی۔ اور اسے

نے مجبور ہو کر پلک سین سے صلح کر لی۔ دریائے نربدا مہاراجہ ہرش کی سلطنت کی سرحد مقرر ہوئی۔ یہ جنگ سنہ 633ء میں لڑی گئی۔ اس شکست کے بعد ہرش نے دکن کو فتح کرنے کا خیال اپنے دل سے نکال دیا اور شمالی ہند کی حکومت پر ہی قناعت کی۔ یہ اقدام دانشمندانہ تھا۔ کیونکہ دکن کو فتح کرنا آسان امر نہ تھا۔ دکن کی مہم کے بعد اُس نے سندھ فتح کیا۔ لیکن مؤرخین کا خیال ہے کہ سندھ۔ راجپوتانہ۔ نیپال۔ آسام اور کشمیر کے علاقے اُس کے قبضے میں نہ تھے محض اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے تھے۔ بان بھٹ کی کتاب ہرش چرتر میں البتہ یہ ذکر ہے کہ مہاراجہ ہرش نے اپنی زندگی کے آخری ایّام میں سندھ کو فتح کر لیا تھا۔

ہرش کی علم پروری:۔ دکن کی مہم کے بعد ہرش نے اپنی تمام توجہ علمی و ادبی امور کی جانب مبذول کی۔ وہ علوم و فنون کا دلدادہ تھا۔ اور اس کے دربار میں نامور فلسفی۔ مصوّر۔ شاعر اور نجومی موجود تھے۔ اُس کے درباری شاعر بان بھٹ نے "ہرش چرتر" تصنیف کی ہے۔ جس میں مہاراجہ ہرش کے عہد کے مکمّل حالات ملتے ہیں۔ ہرش خود عالم شخص تھا۔ اُس نے خود سنسکرت زبان میں تین ڈرامے لکھے۔ جن سے اُس زمانے کے ماحول پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ ڈرامے رتناولی۔ ناگانندا اور پریادرسکا سنسکرت لٹریچر میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُس نے سنسکرت گرامر پر بھی ایک کتاب لکھی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ ڈرامے کسی اور شخص نے ہرش کی فرمائش پر لکھے۔

مہاراجہ ہرش نے زرعی زمینوں کی کل آمدنی کا چوتھا حصّہ علم وفن کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اس سے اُس کی علم دوستی ظاہر ہوتی ہے۔

ہرش کے زمانے میں ملک میں کئی ایک یونیورسٹیاں تھیں اور بے شمار تعلیمی ادارے تھے۔ بُدھ خانقاہیں بھی علم وادب کا مرکز تھیں۔ نالندہ اور کانشی کی یونیورسٹیاں خاص طور پر اہم تھیں۔ صرف نالندہ یونیورسٹی میں دس ہزار طلبا تعلیم پاتے تھے۔ اور ڈیڑھ ہزار اساتذہ موجود رہتے تھے۔ سنسکرت ذریعہ تعلیم تھی۔ اسی طرح ٹیکسلا یونیورسٹی علم طب کے لئے خاص مشہور تھی۔ اُجین یونیورسٹی علم نجوم میں شہرۂ آفاق تھی۔

ہرش کی مذہبی پالیسی :۔ ابتدا میں مہاراجہ ہرش شِو کا پجاری تھا۔ لیکن اُس کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں اُس نے ہنایانہ بُدھ مت اختیار کر لیا۔ ہیون سانگ کی آمد کے بعد اُس کے مذہبی خیالات میں پھر تبدیلی واقع ہوئی اور ہیون سانگ سے متاثر ہو کر اس نے مہایانہ فرقہ کے اُصول اختیار کر لئے۔ لیکن مہاراجہ ہرش تنگ دل اور متعصب نہ تھا۔ بُدھ مت اختیار کرنے کے بعد بھی وہ ہندوؤں کے چند دیوتاؤں کی پُوجا کرتا تھا۔ اور برہمنوں کا بے حد احترام کرتا تھا۔ چنانچہ بعض مؤرّخین کا خیال یہ ہے کہ اُس کا مذہب اکبر اعظم کی طرح "صلح کل" تھا یعنی ہر مذہب کے بنیادی اُصولوں کی قدر کرنا۔

بُدھ روایات اور ہیون سانگ کی تحریروں سے ثابت ہے کہ مہاراجہ ہرش نے بُدھ مت کی اشاعت کے لئے خاص اقدام کیا۔ اُس نے ہیون سانگ کی صدارت میں قنوج میں ایک مذہبی مجلس قائم کی جس میں اکیس

راجاؤں نے شرکت کی۔ اٹھارہ دن تک مذہبی اُمور پر بحث ہوتی رہی اس کانفرنس کا مقصد بُدھ مت کی اشاعت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسی کانفرنس میں مہاتما بُدھ کا قدِ آدم سُنہری مجسّمہ بھی رکھا گیا اور ایک شاندار جلوس بھی نکالا گیا۔

مہاراجہ ہرش نے گنگا کے کنارے ہزاروں کی تعداد میں بدھ خانقاہیں اور سٹوپے بنوائے اور قنوج بدھ مت کا اہم ترین مرکز بن گیا۔ اُس نے کشمیر سے مہاتما بدھ کا ایک دانت بھی منگوایا اور ایک خاص خانقاہ اس کے لئے تعمیر کرائی۔

ہرش کے زمانے میں پریاگ یا الٰہ آباد کے مقام پر ہر پانچ سال کے بعد ایک عظیم الشّان مذہبی میلہ منایا جاتا تھا اور دُور دُور سے لوگ آ کر اس میلے میں شامل ہوتے تھے۔ قنوج کی بدھسٹ کانفرنس کے فوراً بعد بھی یہ میلہ منایا گیا اور ہیون سانگ نے بھی اس میلہ میں شرکت کی۔ اس میلے کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ ہرش ہر مروّجہ مذہب کا عقیدت مند تھا۔ (His religion was ecclectic)۔ اس میلے میں تیس دن تک مہاراجہ ہرش نے پُوجا کی۔ پہلے روز مہاتما بُدھ کی پرستش ہوئی۔ دوسرے روز سُورج دیوتا کی اور تیسرے دن شِوجی کی پُوجا کی گئی۔ پس ہرش کا مذہب مختلف مذاہب کا عجیب وغریب مجموعہ تھا لیکن اُس کا زیادہ رجحان بُدھ مت کی جانب تھا۔ نیز اس میلے میں بُدھ مت کے پیروؤں کے علاوہ جینی اور ہندوؤں نے بھی شرکت کی۔ پس مہاراجہ ہرش ملک کو قومی مذہب دے کر یکجا کرنا چاہتا تھا۔

نظامِ حکومت:۔ ہرش چرتر اور ہیون سانگ کی تحریروں سے ہرش

انتظام کی نگرانی کرتا تھا اور ملک بھر کے دورے کرتا تھا۔ رعایا کی بہبودی کا خاص خیال رکھتا تھا اور رفاہ عام کے کاموں میں خاص دلچسپی لیتا تھا۔ سرکاری ہسپتالوں میں مفت علاج ہوتا تھا۔ ٹیکس نرم تھے اور مالیہ کی شرح پیداوار کا ۱/۶ حصّہ تھی۔ محصول درآمد بھی لیا جاتا تھا۔ ہیون سانگ لکھتا ہے کہ سزائیں گپت خاندان کی نسبت سخت تھیں۔ اکثر اعضا کاٹ دیئے جاتے تھے۔ موت کی سزا دینے کا رواج دوبارہ رائج کر دیا گیا تھا۔ سڑکوں پر مسافر اکثر لٹ جایا کرتے تھے۔ دو بار ہیون سانگ کو بھی لوٹ لیا گیا۔

مہاراجہ ہرش کے دور کے تاریخی ماخذ

مہاراجہ ہرش کی تخت نشینی سے پہلے تقریباً ایک صدی تک برّصغیر کی تاریخ بالکل تاریک ہے لیکن ہرش کے عروج کے ساتھ ہی ہر بات دوبارہ روشن ہو جاتی ہے۔ ہرش کے دور کے کئی ایک اہم تاریخی ماخذ ہیں۔ اُن کا مختصر حال درج ذیل ہے:۔

۱۔ ہرش چرتّر:۔ ہرش کے زمانے کی زیادہ تر معلومات بان بھٹ کی مشہور کتاب "ہرش چرتّر" سے حاصل ہوتی ہیں۔ بان بھٹ سنسکرت کا جیّد عالم تھا اور ہرش کا درباری شاعر تھا۔ اُس نے "ہرش چرتّر" نامی کتاب لکھی۔ یعنی "ہرش کے کارنامے"۔ اس کتاب میں اُس نے سیاسی۔ مذہبی اور اقتصادی حالات لکھے ہیں۔ کتاب مستند ہے اور چشم دید حالات ناقدانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ بان بھٹ نے کادمبری نامی ایک عشقیہ داستان بھی لکھی ہے۔

۲- ہرش کے ڈرامے :- ہرش خود عالم شخص تھا۔ اُس نے سنسکرت زبان میں تین ڈرامے تصنیف کئے جن کے نام رتناولی۔ ناگانندا اور پریادرسکا ہیں۔ یہ ڈرامے نیم تاریخی (Semi-Historical.) ہیں یعنی ان ڈراموں سے اُس دور کی مجلسی زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ ڈرامے دراصل ہرش کی تصنیف نہیں ہیں۔ لیکن اس بارے میں کوئی پکا ثبوت نہیں ملتا۔

۳- ہیون سانگ :- مشہور چینی سیّاح ہیون سانگ تقریباً پندرہ برس اس برصغیر میں رہا۔ اُس نے ڈائری کی صُورت میں اپنا سفرنامہ لکھا ہے۔ اس سفرنامے سے مہاراجہ ہرش کے دور کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ کتاب ازحد دلچسپ اور اہم ہے۔ ہرش چرتر اور اس سفرنامے کے گہرے مطالعہ سے ہرش کی تاریخ مکمل طور پر تدوین ہو جاتی ہے۔

۴- چینی ذرائع :- چینی حکومت سے ہرش کے سفارتی تعلقات بھی قائم تھے۔ لہٰذا چینی سرکاری ریکارڈ سے بھی بعض قابلِ قدر معلومات میسّر ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہیون سانگ کے شاگرد "ہیوئی لی" (Hwui-li) نے بھی اپنے اُستاد کی سوانح حیات لکھی ہے۔ یہ کتاب ہرش کے دور کے مزید واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ بعض مؤرخ اس کتاب کو ہرش کے دور کا بہترین ماخذ گنتے ہیں۔

۵- کتبے وغیرہ :- ہرش کے زمانے کی ایک مُہر اور دو عدد تانبے کی تختیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ ان پر کندہ عبارت ہرش کے

نظام حکومت پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ مہر سونی پت سے دستیاب ہوئی ہے۔ یہ مقام پانی پت کے قریب ہے۔ دونوں تختیاں بنس کھیڑا (ضلع شاہجہاں پور) اور مادھوبن (ضلع اعظم گڑھ) سے ملی ہیں۔

مہاراجہ ہرش کی سلطنت کی حدود

مہاراجہ ہرش کی سلطنت کی صحیح حدود متعین کرنا مشکل امر ہے۔ ماخذ اس بارے میں واضح نہیں لیکن مختلف مؤرخین نے مبالغہ آمیزی سے خوب کام لیا ہے۔ ہیون سانگ کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ ہرش نے پنجاب۔ قنوج۔ گوڈا (Gauda) متھلا (Mithila) اور اڑیسہ کو اپنی مملکت میں شامل کیا۔ دکنی کتبوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہرش صرف اُترپاتھا یعنی شمالی ہند کا مالک تھا۔ ڈاکٹر موجمدار کا خیال ہے کہ ابتدا میں اس کی سلطنت میں صرف تھانیسر اور قنوج کی ریاستیں شامل تھیں نیز اس نے چند ملحقہ علاقے الحاق کر لئے۔ اپنے عہد کے آخری دنوں تک اس نے مگدھ کا الحاق کر لیا اور اڑیسہ کے علاوہ کونگوڈا کا علاقہ بھی فتح کر لیا۔

سمتھ صاحب کی رائے یہ ہے کہ ولبھی کا حکمران ہرش کا باجگذار تھا اور مہاراجہ ہرش کی سلطنت میں مالوہ۔ گجرات کاٹھیاوار اور کوچ برار بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر موجمدار سمتھ صاحب

کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔

بان بھٹ یوں لکھتا ہے کہ ہرش نے سندھو حکمران کا کچومر نکال دیا اور اس کے علاقوں کا الحاق کر لیا۔ اس کے برعکس ہیون سانگ یہ لکھتا ہے کہ ہرش سندھ نہ فتح کر سکا۔ سندھ کی ریاست مضبوط اور خود مختار تھی اور ہیون سانگ نے اس ریاست کی سیاحت بھی کی۔ پس ہماری رائے یہ ہے کہ بان بھٹ کی تحریر درست نہیں۔ ہیون سانگ کی رائے زیادہ قابل اعتماد ہے۔

بان بھٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مہاراجہ ہرش نے دشوار گذار پہاڑی علاقہ فتح کیا جس کی پہاڑیاں برف سے مستور رہتی تھیں مؤرخین نے ان الفاظ کا مطلب یہ لیا ہے کہ نیپال کا علاقہ ہرش نے فتح کر لیا تھا۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مہاراجہ ہرش کا رائج کردہ سن نیپال میں مروج تھا۔ ڈاکٹر مکرجی کی رائے یہ ہے کہ برفانی پہاڑوں سے مراد خطۂ کشمیر ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ برفانی پہاڑوں کا تعیّن ممکن نہیں کیونکہ دوسرے ماخذ اس بارے میں خاموش ہیں۔

البتہ اڑیسہ کے بارے میں یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ مہاراجہ ہرش نے اس علاقے کو فتح کر کے الحاق کر لیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مہاراجہ ہرش خود فوج لے کر گنجن پر حملہ آور ہوا جسے کونگوڈر بھی کہتے ہیں۔ فتوحات کے بعد اس نے اڑیسہ میں مقام کیا اور مہایانہ کانفرنس بھی طلب کی۔ اس کانفرنس میں نالندہ سے بدھ مت کے علماء کو بھی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دے کر بلوایا

گیا۔ بدھ مت کے مشہور عالم جے سین کو مہاراجہ ہرش نے اُڑیسہ میں ہی اسّی گاؤں کی آمدنی عطا کی تھی۔

پلک سین ثانی اور مہاراجہ ہرش کی جنگ کے بارے میں بھی کئی قسم کی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ ہیون سانگ لکھتا ہے کہ ہرش زبردست فوج لے کر گیا لیکن پلک سین پر فتح نہ پا سکا۔ چنانچہ پلک سین ثانی کے جانشین بھی ہرش کی ہزیمت فخر سے بیان کرتے تھے۔ سب سے اہم شہادت یہ ہے کہ آئی ہول (Aihole) کے کتبے سے جو ۶۳۴ء میں لکھا گیا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہرش کو شکست ہوئی۔ کتبے کے الفاظ یوں ہیں۔

میدان جنگ میں ہرش کے شاہی ہاتھی خون میں لت پت مردہ پڑے تھے اور اُس کی خوشیاں برباد ہو گئیں اور وہ خوف سے لرزنے لگا۔ پس ہماری رائے یہ ہے کہ مہاراجہ ہرش کو پلک سین ثانی نے شکست دے کر پسپا کر دیا۔ یعنی دکن میں ہرش کی سلطنت کی آخری حد دریائے نربدا تھی۔ پس مہاراجہ ہرش کو شمالی ہند کا مالک گننا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بان بھٹ کے ہرش چرتر کی اہمیت

مہاراجہ ہرش کے عہد کے تاریخی ماخذوں پر اس سے پہلے مختصر تبصرہ ہو چکا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ ہیون سانگ کا سفرنامہ اہم ترین ماخذ ہے لیکن جدید تحقیق کی رو سے بان بھٹ کی مشہور کتاب ہرش چرتر بھی اہمیت میں کسی لحاظ سے کم نہیں۔

اس کتاب کے بارے میں اہم تفصیلات درج ذیل ہیں۔

بان بھٹ مشہور عالم تو تھا ہی۔ اُس نے اپنے سرپرست مہاراجہ ہرش کے بارے میں سنسکرت میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب ہرش چرتر لکھی جس کا اسلوب بیان پران کی مانند ہے یعنی کوئی باخبر ہوشمند انسان مکالمے کی شکل میں دوسرے اشخاص کے سوالات کے جوابات بیان کر رہا ہے۔

کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ بان بھٹ اپنے گاؤں میں اپنے ہم قوموں کے پاس بیٹھا ہے اور تمام اہالیان اُس سے بار بار درخواست کر رہے ہیں کہ ہم مہاراجہ ہرش کے حالات سننے کے مشتاق ہیں چنانچہ بان بھٹ تاریخی واقعات بیان کرتا ہے۔

یہ کتاب تاریخ کے جدید اُصولوں پر پوری نہیں اُترتی لیکن بان بھٹ نے خیالی افسانے درج کرنے کی بجائے مہاراجہ اشوک کی فتوحات اور جنگی کارناموں پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے آخری باب میں اُس دور کے مختلف مذہبی فرقوں کا حال بھی درج ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں کہیں ہیون سانگ کا سفرنامہ خاموش ہے۔ بان بھٹ نے تفصیلات مہیا کر دی ہیں۔ چنانچہ دونوں کتابوں کو یکجا کرنے سے مہاراجہ ہرش کے عہد کی تفصیلات کافی حد تک مکمل ہو جاتی ہیں۔

بعض اوقات بان بھٹ اپنے سرپرست کے بارے میں تعریفوں کے پل باندھتا ہے لیکن ان خامیوں کے باوجود بھی اُس دور کی مذہبی۔ سیاسی اور سماجی حالت کا نقشہ واضح ہو جاتا ہے

بان بھٹ نے ہرش کی ذات پات نہیں بتائی۔ لیکن ہیون سانگ صاف لکھتا ہے کہ مہاراجہ ہرش ویش ذات کا تھا۔ مہاراجہ ہرش کے اپنے عہد کے کتبوں میں بھی اُس کے آبا و اجداد کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی۔ جس سے ہم یہ قیاس کرتے ہیں کہ وہ کھشتری یا برہمن نہ تھا بلکہ ویش تھا۔

بان بھٹ کی کتاب میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ تاریخی سن کے بارے میں احتیاط سے کام نہیں لیتا بلکہ لاپرواہی سے کوئی سن دیتا ہی نہیں۔ لیکن اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ سوسائٹی کے تمام افراد کا جائزہ اس کتاب نے لیا ہے۔ وہ اگر تاجداروں اور شہزادگان کے حالات بیان کرتا ہے تو وہ درباریوں زاہدوں۔ جنگل کے باسیوں اور درختوں کی چھال پہننے والے غریبوں کی تفصیلات بھی دیتا ہے۔

"The book gives a wide range of historical personages from bejewelled kings, queens and princes to bark-clad ascetics, polished courtiers as well as wild foresters."

بان بھٹ کی تحریر میں عمدہ عکاسی ہے اور پوری تصویر کھینچ

جاتی ہے۔ نیز ہرش کا اپنا کردار نمایاں طور پر واضح ہو جاتا ہے۔
اس بات سے انکار نہیں کہ بان بھٹ اکثر واقعات کا چشم دید گواہ تھا۔ لہٰذا اُس کی کتاب کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے نیز وہ شاہی دربار میں اعلےٰ عہدے پر سرفراز تھا جس کی بدولت اُسے واقعات کا علم ہو جاتا تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اُس کے بیان کردہ اکثر واقعات دیگر ماخذوں کی شہادت سے سچے ثابت ہوتے ہیں۔ پس ہرش چرتر اُس دور کی مستند تاریخی کتاب ہے۔
اس کتاب کا ایک اور نقص یہ ہے کہ استعارات کی بدولت بعض اوقات تحریر مبہم ہو جاتی ہے۔ جگہ جگہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بان بھٹ نجوم اور شگون نکالنے پر اعتقاد رکھتا تھا۔ نیز جب وہ مہاراجہ ہرش کے خاندان کے حالات بیان کرتا ہے تو حقیقت پسندی کی بجائے وہ اصل واقعات کی رنگ آمیزی کے علاوہ افسانوی باتیں بھی شامل کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود ہرش چرتر اعلےٰ پایہ کا تاریخی ماخذ ہے۔ خاص طور پر اُس نے لوگوں کے اطوار اور طرزِ زندگی کا بے نظیر خاکہ کھینچا ہے۔

Typical Questions

Q. 1. Describe India's condition under Harshavardhana as narrated by Hioun Tsang.

Q. 2. Estimate the achievements of Harshavardhana.

Q. 3. Describe the conquests of Harsha and give an account of the religious and literary activities of his reign.

Q. 4. Sketch the career of Harsha and consider his claim to greatness.

Q. 5. Give an account of Harsha and estimate the importance of his reign for the history of ancient India.

Q. 6. Give a brief description of the military, cultural and religious activities of Harshavardhna.

Q. 7. Describe the condition of India under Harsha with special reference to the evidence of Yaun—chwang.

Q. 8. Give a critical account of the reign of Harsha Vardhana.

Q. 9. Who was Hiun Tsang? What does he tell us about India? How does his account differ from that of Fa-Hieun.

Q. 10. Describe briefly the life and work of Harsha.

امتحانی سوالات

1- ہرش کے عہد کی حالت جو ہیون سانگ نے بیان کی ہے۔ واضح طور پر لکھیئے۔

2- مہاراجہ ہرش کے کارناموں کا جائزہ لیجئے۔

3- مہاراجہ ہرش کی فتوحات کا حال لکھیئے۔ اور اُس کے عہد حکومت کے مذہبی اور ادبی حالات بیان کیجئے۔

4- مہاراجہ ہرش کی زندگی کے مفصل حالات بیان کیجئے۔ کیا اُسے عظیم الشان حکمرانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے؟

5- مہاراجہ ہرش کے عہد حکومت کا حال بیان کیجئے اور بتائیے کہ برّصغیر کی قدیم تاریخ میں اُس کے دور کی اہمیت کیا ہے؟

6- ہرش کے زمانہ کے عسکری، ثقافتی اور مذہبی کارناموں کا مختصر حال بیان کیجئے۔

7- ہرش کے زمانے میں برّصغیر کی حالت کا نقشہ کھینچئے۔ اور ہیون سانگ کے بیانات کا خصوصاً ذکر کیجئے۔

8- ہرش کے عہدِ حکومت کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

9- ہیون سانگ کون تھا؟ برّصغیر کے بارے میں وہ ہمیں کیا بتاتا ہے؟ اُس کے بیانات اور فاہین کی تحریروں میں کیا فرق پایا جاتا ہے۔

۱۰- مہاراجہ ہرش کی زندگی کے حالات لکھئے اور اُس کے کارنامے بیان کیجئے۔

چودھواں باب

راجپوتوں کا دَور

مہاراجہ ہرش کے جانشین اگرچہ چالیس برس تک حکمران رہے لیکن قنوج کی عظمت جلدی ہی ختم ہو گئی اور برّصغیر میں ایک بار پھر درجنوں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ نئی ریاستوں کے اکثر حکمران راجپوت تھے جو تقریباً پانچ سو برس ملک کے مختلف علاقوں پر قابض رہے لیکن راجپوتوں نے کبھی بھی مرکزی حکومت قائم کرنے کا خیال نہ کیا اور نہ ہی آپس میں متحد ہوئے۔ ہرش کی وفات سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک تمام دور کو راجپوتوں کا زمانہ گنا جاتا ہے۔ راجپوت از حد دلاور اور شجاع تھے اور ہندوؤں کے تہذیب و تمدن کو برقرار رکھنے کا باعث تھے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ "راجپوت" کا لفظ پہلی بار ساتویں صدی کے وسط میں استعمال ہُوا۔ اس سے پہلے راجپوتوں کے کسی قبیلے کا بھی ذکر نہیں ملتا۔ پس راجپوتوں کا آغاز ہرش کے بعد یعنی ساتویں صدی کے وسط سے شروع ہُوا۔

راجپوتوں کی ابتدا کے متعلق نظریئے

راجپوتوں کی ابتدا کے بارے مؤرّخین متفق نہیں ہیں اور اس بارے میں کئی ایک نظریئے پیش کیۓ جاتے ہیں۔ مشہور نظریئے

(Theories) درج ذیل ہیں:-

۱- پنڈت گوری شنکر اُجھا (Ojha) اور دیگر ہندی مؤرخین کا نظریہ یہ ہے کہ راجپوت غیر ملکی نہ تھے بلکہ اسی برصغیر کے قدیم کھشتری حکمرانوں کی اولاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندو دھرم کے لئے کٹ مرنے کو تیار تھے اور جنگ و جدل کے شوقین تھے۔ نیز یہ لوگ جسمانی طور پر قدیم آریاؤں سے ہو بہو مشابہت رکھتے تھے۔ پنڈت گوری شنکر کا بیان ہے کہ راجپوتوں کے مشہور قبیلے مثلاً سورج بنسی اور چندر بنسی دراصل رامائن اور مہا بھارت کے زمانے کے ہیں۔ لیکن تاریخی طور پر اس نظریئے کی حمایت میں کوئی مواد نہیں ملتا۔ کسی تاریخی ماخذ میں ساتویں صدی سے پیشتر راجپوتوں کا ذکر نہیں ہے۔ محض جسمانی مشابہت اس بات کا ثبوت نہیں کہ راجپوت کھشتریوں کی اولاد ہیں۔

۲- اگنی کنڈ راجپوت:- یہ نظریہ تاریخی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد مذہبی روایات پر ہے۔ صرف بعض متعصب ہندو مؤرخین اس نظریئے کی حمایت کرتے ہیں کہ ایک زمانے میں برصغیر کے تمام علاقوں میں ملیچھ اور ناپاک لوگ چھا گئے اور ہندو دھرم کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ رہا۔ ایک ناپاک ہستی پرس رام (Parshuram) نے تمام کھشتریوں کا صفایا کر ڈالا۔ صرف چند رشی منی اس کے ظلم سے بھاگ کر موجودہ راجپوتانے کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہوئے اور پرماتما سے پرارتھنا (التجا) کی کہ اُن کے دھرم کی حفاظت کا سامان پیدا کرے۔ ایشور نے اُن کو خواب میں حکم دیا۔ کہ آبو نامی پہاڑی (Mount Abhu) پر جا کر پوتر اگنی (پاک آگ) جلائیں۔ اُن رشیوں نے ایک

گڑھے میں جب آگ جلائی تو اُس میں سے چار سورما نکلے - جنہوں نے ملک کو ناپاک لوگوں اور ہندو دھرم کے دشمنوں سے صاف کیا- ان بہادروں کی نسل سے راجپوتوں کے چاروں اہم قبیلے شروع ہوئے یعنی پرمار- پریہار- چالوکیہ اور چوہان - یہ چاروں قبیلے اپنے آپ کو اگنی کنڈ راجپوت کہلاتے ہیں -

اس نظریئے پر تنقید کی ضرورت نہیں - کیونکہ یہ واقعہ تاریخی طور پر غلط ہے - اور اس کی بُنیاد محض مذہبی ضعیف الاعتقادی پر ہے - اس نظریئے پر ایک اہم اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ راجپوت ہمیشہ اپنی نسل کی پاکیزگی پر فخر کرتے رہے ہیں - لیکن چونکہ آگ کے گڑھے سے صرف مرد ہی نکلے - کوئی عورت نمودار نہ ہوئی - لہٰذا اُن کی نسل میں آمیزش لازمی ہو جاتی ہے -

۳- جدید نظریہ :- راجپوتوں کی ابتدا کے بارے میں جدید نظریہ جسے اکثر مؤرخین نے تسلیم کیا ہے - وہ سب سے پہلی بار مشہور مؤرخ کرنل ٹاڈ (Todd) نے ثابت کیا تھا کہ راجپوت غیر ملکی حملہ آوروں کی اولاد تھے مثلاً سیتھین - شاکا - ہُن وغیرہ - برصغیر میں آباد ہونے کے بعد انہوں نے ہندو مذہب اختیار کر لیا اور ملکی تہذیب کے علم بردار بن گئے - ہندوؤں نے ان جنگجو لوگوں کو بُدھ مت کے خلاف استعمال کیا اور اپنے دیگر دشمنوں کو بھی اُن کے ہاتھوں ختم کروا ڈالا - نئے جنگجو مذہبی جوش سے بھرپور تھے اور بلا کے لڑاکے تھے - لیکن ہندو مت کی رُو سے اُن کو کھشتریوں کا درجہ نہ دیا جا سکتا تھا - لہٰذا یہ لوگ "راجہ کے پوت" یا راجپوت کہلائے بعد میں ان لوگوں نے ملک بھر

ہیں اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں۔ مسلمانوں کی آمد پر راجپوتوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن اُن کی باہمی چپقلش اور نفاق کی بدولت مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ پیشتر اس کے کہ ہم راجپوت ریاستوں کا حال بیان کریں۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتوں کے خصائل مختصر طور پر بیان کر دئیے جائیں۔

راجپوتوں کے خصائل

بے مثال بہادری:۔ راجپوت بلا کے جنگجو اور دلاور تھے۔ راجپوت ہمیشہ قول کے پکے۔ تیغ زن اور اعلیٰ شہسوار تھے۔ خود داری اور جانبازی کے پتلے تھے۔ اور پیٹھ دکھانا اُن میں عار سمجھا جاتا تھا۔ بچپن سے ہی اُن کو سپہ گری کے فنون سکھائے جاتے۔ آن پر مرمٹنا قبیلے کی شان سمجھی جاتی تھی۔ مہمان نوازی اور سخاوت بھی ہر راجپوت قبیلے کی خصوصیت تھی۔ سپہ گری کے علاوہ کوئی اور پیشہ اختیار کرنا باعثِ ننگ گنا جاتا تھا۔

عورت کا درجہ:۔ راجپوتوں میں بچپن کی شادی کا عام رواج تھا۔ عورتیں پردہ نہ کرتی تھیں۔ لیکن مردوں سے میل جول کم تھا۔ راجپوت عورتوں کو اپنی پاکدامنی اور عصمت پر ناز ہوتا تھا۔ ستی کی رسم عام تھی۔ یعنی بیوی اپنے شوہر کی موت پر اُس کے ساتھ چتا میں جل مرتی تھی۔ راجپوتوں کے اکثر قبیلوں میں دُختر کشی کا رواج بھی تھا۔ راجپوت عورتیں "رسم جوہر" بھی ادا کرتی تھیں یعنی جب دشمن اُن کا محاصرہ کر لیتا اور کامیابی کی کوئی جھلک دکھائی نہ دیتی

تو راجپوت عورتیں اور شہزادیاں زندہ جل کر مرجاتیں تاکہ دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر ذلیل نہ ہوں۔ اس کے بعد مرد قلعے کے دروازے کھول کر بے جگری سے دشمن پر حملہ کر دیتے تھے اور اپنی آن پر کٹ مرتے تھے۔ اعلیٰ خاندان کی راجپوت عورتیں شوہر خود پسند کرتی تھیں اور اس انتخاب کے لئے ایک خاص جلسہ بلایا جاتا تھا۔ اس رسم کو سوئمبر کہتے تھے۔

راجپوتوں کے نقائص:۔ ستی اور دختر کشی کے علاوہ راجپوتوں میں نخوت اور غرور بہت زیادہ تھا۔ ذات پات کی قیود کی بدولت اُن میں دن بدن مزید ذاتوں (Sub-castes) کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ یہ لوگ آپس میں نفاق اور حسد کو اپنا شعار سمجھتے تھے اور دوسرے قبیلے کے جرنیل کے ماتحت لڑنا اپنی توہین خیال کرتے تھے۔ قومی خطرے کے موقع پر بھی راجپوتوں میں اتحاد اور یک جہتی مفقود تھی۔ اسی لئے مسلمانوں نے ایک ایک کرکے سب راجپوت ریاستوں کا خاتمہ کر ڈالا راجپوتوں میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ ہمیشہ انفرادیت کے حامی رہے اور مرکزی نظام سلطنت یا اجتماعی زندگی کے فطری طور پر مخالف تھے۔ پس اُن کی بدولت ہندوؤں کا قومی شیرازہ بکھرا رہا اور دشمن نے ہمیشہ اُن کے نفاق سے فائدہ اٹھایا۔ ہر راجپوت ریاست کا نظام جاگیردارانہ تھا۔ راجہ سب کا سردار تھا اور مالکانِ زمین وقت پڑنے پر فوجی خدمت کے لئے حاضر ہو جاتے تھے۔ اسے ہم فیوڈل گورنمنٹ (Feudal) کہہ سکتے ہیں۔

راجپوتوں کی مذہبی رسومات:۔ راجپوت اپنے زمانۂ اقتدار میں جدید

ہندومت کے علمبردار تھے۔ راجپوتوں کے زمانے میں برہمنوں کا اقتدار زیادہ تھا اور ذات پات کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا ہوتی تھی۔ خاص طور پر شیوجی۔ کالی ماتا اور درگا دیوی کی پرستش کی جاتی تھی۔ دیوالی اور دسہرہ کے تیوہار بھی منائے جاتے تھے۔ مذہبی مقامات کی یاترا (یعنی زیارت) کی جاتی تھی۔ تھانیسر میں وشنو کا ایک مشہور مندر تھا۔ سومناتھ شیوجی کا مندر تھا جس کی دولت شہرۂ آفاق تھی۔ راجپوت گوشت خوری سے پرہیز کرتے تھے لیکن مذہبی رسومات ادا کرتے وقت جانوروں کی قربانی جائز سمجھتے تھے۔

راجپوت آرٹ:۔ راجپوتوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرائیں اور نئے فن تعمیر کی بُنیاد رکھی۔ راجپوتوں کی مصوّری۔ زیبا کشی اور نقّاشی بھی نئی طرز کی ہے۔ اسے راجپوت آرٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ راجپوتوں کے زمانہ کی عمارات زیادہ تر جے پور بیکانیر۔ اودھے پور۔ جیسلمیر اور جودھپور میں ملتی ہیں۔ راجپوت حکمران علم دوست تھے اور آرٹ اور موسیقی کے دلدادہ تھے۔ اُن کے زمانے میں شاعری اور ڈرامہ نویسی نے کافی ترقی کی۔ ہر راجپوت خاندان کا ایک ملازم پیشہ ور بھاٹ ہوتا تھا۔ جو اُس خاندان کے حسب نسب بیان کر سکتا تھا اور خاندانی بزرگوں کے کارنامے بیان کیا کرتا تھا۔ کرنل ٹاڈ نے اپنی کتاب "راجستھان" میں راجپوتوں کے بارے میں تمام روایات جمع کی ہیں۔

اہم راجپوت ریاستوں کا حال

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ساتویں صدی کے وسط سے برصغیر میں درجنوں راجپوت ریاستیں قائم ہو گئیں۔ راجپوت ریاستوں کو تین خطوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (الف) شمالی ہند کی راجپوت ریاستیں (ب) دکن کی ریاستیں (ج) تامل علاقے (Far-Deccan) کی ریاستیں۔ ان خود مختار ریاستوں کا مختصر حال درج ذیل ہے:۔

شمالی ہند کی ریاستیں

۱۔ دہلی اور اجمیر:۔ اس ریاست کی بنیاد راجہ اننگ پال نے ۹۹۳ء میں رکھی تھی۔ یہ راجہ تنوار خاندان کا تھا اور اپنے آپ کو اگنی کل راجپوت گنتا تھا۔ بعض مورخ تنوار خاندان کو تومار بھی لکھتے ہیں۔ اس خاندان کے آخری راجہ اننگ پال ثانی کا کوئی بیٹا نہ تھا لہذا اُس نے اپنی ریاست اپنے نواسے پرتھوی راج والئے اجمیر کو سونپ دی جو چوہان راجپوت تھا چنانچہ اجمیر اور دہلی کی سلطنت متحد ہو گئی۔ جے چند راٹھور والئے قنوج پرتھوی راج سے حسد کرتا تھا۔ لیکن اُس کی لڑکی سنجوگتا دل و جان سے پرتھوی راج پر عاشق تھی۔ جب سنجوگتا کی شادی کے لئے سوئمبر رچایا گیا۔ تو تمام والیانِ ریاست کو دعوت دی گئی۔ لیکن پرتھوی راج کو نہ بلایا گیا۔ بلکہ اُسے ذلیل کرنے کے لئے اُس کا ایک بت محل کے باہر دروازے پر نصب کیا گیا۔ سنجوگتا نے تمام والیانِ ریاست کو ٹھکرا دیا۔ اور پرتھوی راج کے بُت کے پاس پہنچ کر پھولوں کا ہار

اُس کے گلے میں ڈال دیا۔ اُس وقت پرتھوی راج بھی اپنے سپاہیوں سمیت بھیس بدلے موجود تھا۔ یہ حال دیکھ کر اُس نے سنجوگتا کو اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا اور لڑتا بھڑتا واپس اپنے علاقے میں پہنچ گیا۔ مؤرخ اس قصّے کو محض عشقیہ داستان گنتے ہیں۔ جب ۱۱۹۲ء میں محمّد غوری نے دوبارہ دہلی اور اجمیر کی ریاست پر حملہ کیا۔ توجے چند الگ کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ پرتھوی راج کو ترائن کے مقام پر شکست ہوئی اور دہلی و اجمیر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

۲۔ قنّوج :۔ قنّوج ہرش کا دارالخلافہ تھا۔ ہرش کی وفات کے بعد قنّوج میں راجہ یش ورمن ۷۴۵ء تک حکمران رہا۔ محمّد بن قاسم کے حملے کے وقت قنّوج کی وسیع سلطنت اسی راجہ کے قبضے میں تھی۔ اس وقت اس ریاست میں مشرقی پنجاب۔ گاندھارا۔ تھانیسر۔ متھرا اور مالوہ شامل تھا۔ راجہ یش ورمن کے بعد قنّوج پر پرتہار خاندان کا قبضہ ہو گیا۔ اس خاندان کو گواجار یا گوجر بھی کہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ گوجر نسل سے تھے۔ قنّوج کا فاتح راجہ ناگ بھٹ ثانی تھا لیکن بنگال کے راجہ دھرم پال نے قنّوج پر قبضہ کر لیا اور راجہ ناگ بھٹ ثانی کو وہاں سے نکال دیا۔ پرتہار خاندان میں سے راجہ بھوج نے قنّوج پر پھر سے قبضہ کر لیا۔ یہ راجہ فتوحات کا شوقین تھا۔ اور اُس نے اپنی سلطنت کو وسیع کیا۔ مالوہ اور گجرات بھی اس کے باجگذار تھے۔ پرتہار خاندان ۹۱۵ء تک قنّوج پر حکمران رہا۔ اس خاندان کے مشہور حکمران مہندر پال۔ بھوج ثانی اور ماہی پال ہو گزرے ہیں۔ ۹۱۵ء میں گجرات اور مالوہ کے راجہ اِندر سوئم نے قنّوج پر قبضہ کر لیا لیکن پرتہار

خاندان نے اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کی اور قنوج پر پھر اپنا قبضہ جمایا۔ ۹۴۵ء کے بعد اس خاندان کی مخاصمت چنڈیل راجپوتوں سے شروع ہوئی۔ ۹۹۶ء میں پرتہاد حکمران راجیہ پال کے زمانے میں محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے۔ اسی راجیہ پال نے محمود غزنوی کی اطاعت قبول کر لی تھی اور اس بات پر باقی راجپوت خاندانوں کو سخت غصہ آیا۔ محمود جب واپس گیا تو گنڈا نامی چنڈیل راجہ نے راجیہ پال پر حملہ کر دیا۔ راجیہ پال میدانِ جنگ میں کام آیا۔ محمود نے انتقامی حملہ کر کے گنڈا کو بھگا دیا۔ اور پرتہاد خاندان کے راجہ ترلوچن پال کو قنوج میں تخت پر بٹھایا گیا۔ ۱۰۹۰ء میں پرتہاد خاندان کا خاتمہ کر کے قنوج پر گرھوال قبیلہ کے راجپوتوں نے قبضہ کر لیا۔ ان کو راٹھور بھی کہتے ہیں۔ بنارس اور اُجدھیا پر بھی اسی خاندان کی حکومت تھی۔ اس خاندان کا آخری حکمران جے چند راٹھور تھا جو پرتھوی راج کا خالہ زاد بھائی تھا۔ جے چند سخت حاسد تھا اور پرتھوی راج سے اس کے تعلقات کی کشیدگی کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ جے چند کو محمد غوری نے ۱۱۹۳ء چاندوارہ کے مقام پر شکست دی۔ جے چند مارا گیا اور قنوج کا الحاق اسلامی سلطنت سے ہو گیا۔

۳۔ گندھارا کا علاقہ :۔ مغربی پاکستان۔ قندھار اور کابل کے تمام علاقے کو اُس زمانے میں گندھارا یا گاندھارا کی سلطنت کہا جاتا تھا۔ اس سلطنت پر بھی مختلف ہندو راجپوت حکمران تھے یعنی افغانستان بھی راجپوتوں کے قبضے میں تھا۔ اس سلطنت کا دارالخلافہ بدلتا رہتا تھا

بھٹی راجپوتوں کا اقتدار تمام شمالی علاقے پر تھا۔ اور اُن کی سلطنت کی سرحدیں ملتان سے ستلج تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جنوبی کشمیر بھی اُن کے قبضے میں تھا۔ غزنی کے سلطان سبکتگین سے بھٹی راجپوتوں کے راجہ جے پال کی بار بار لڑائیاں ہوئیں۔ ۹۸۵ء میں جے پال کی مدد کے لئے دہلی۔ اجمیر۔ کالنجر اور قنوج کی فوجیں بھی موجود تھیں۔ لیکن سبکتگین کو فتح ہوئی۔ اور دریائے سندھ تک تمام علاقہ مسلمانوں کے قبضے آگیا۔ اُس زمانے میں لاہور کی ریاست علیحدہ تھی اور بیاس تک اُس کی سرحدیں تھیں۔ یہاں غالبًا پال خاندان کے راجپوت حکمران تھے۔ جے پال نے مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد لاہور کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران میں محمود غزنوی تخت نشین ہو چکا تھا۔ ۱۰۰۱ء میں اُس نے جے پال کو شکست دی جے پال اتنا شرمندہ ہوا۔ کہ چتا میں بیٹھ کر جل مرا۔ اس کے بعد انند پال یا اننگ پال تخت نشین ہوا جسے محمود کے ہاتھوں بار بار شکست ہوئی۔ ۱۰۲۱ء میں محمود نے اننگ پال کی سلطنت کا خاتمہ کر ڈالا اور پنجاب کا الحاق غزنی سلطنت سے ہو گیا۔

۴۔ مالوہ:۔ اس ریاست میں پرمار خاندان کے اگنی کنڈ راجپوتوں کی حکومت تھی اُجین اُن کا مرکزی مقام تھا اور یہ ریاست بہت اہم گنی جاتی تھی۔ نویں صدی عیسوی میں مالوہ کے حکمرانوں نے کوہ آبو پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس خاندان کا ساتواں راجہ منجا بڑا عالم تھا۔ وہ اعلیٰ فوجی قابلیت کا مالک تھا۔ چنانچہ اُس نے دکن کے چالوکیہ راجوں پر کئی ایک حملے کئے۔ ایک بار وہ دکن پر حملہ کرتے

ہوئے راجہ تیلا دوئم کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ جس نے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ پرمار خاندان میں راجہ بھوج بھی ہو گذرا ہے جو سنسکرت کا زبردست عالم تھا۔ اور شاعر بھی تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں دھار کے مقام پر ایک یونیورسٹی بھی قائم ہوئی۔ اس خاندان کے آخری راجہ بھوج دوئم کو علاؤالدین خلجی نے 1305ء میں شکست دی۔

۵۔ گجرات:۔ گجرات کے صوبے کا قدیم نام سوراشٹر تھا۔ گپت خاندان کے زمانے میں اس علاقے میں گوجر نسل کے لوگ آباد ہو گئے اور ان کی بدولت یہ علاقہ گجرات کے نام سے مشہور ہوا بھٹیارک نامی ایک سردار نے اس صوبے میں ایک خود مختار ریاست قائم کی۔ جس کا صدر مقام ولبھی تھا۔ یہ خاندان 766ء تک حکمران رہا۔ اس کے بعد چالوکیہ (سولنکی) خاندان نے گجرات کاٹھیاواڑ کے علاقے فتح کر لئے۔ 1242ء میں بگھیلے راجپوتوں نے گجرات۔ کاٹھیاواڑ اور انہلواڑہ پر قبضہ کر لیا۔ آخری بگھیلہ راجہ کرن دیو تھا۔ جسے 1304ء میں علاؤالدین خلجی کے زمانے میں شکست ہوئی اور گجرات پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

۶۔ بندھیل کھنڈ:۔ موجودہ بندھیل کھنڈ پر چنڈیل خاندان کے راجپوتوں نے نویں صدی عیسوی میں اپنی حکومت قائم کی بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ لوگ در اصل گونڈ نسل کے تھے۔ حکومت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ہندو مذہب اختیار کر لیا اور اپنے راجپوت ہونے کا اعلان کیا۔ اُن کو چنڈیل راجپوت کہتے ہیں۔ اس خاندان

کا بانی ننک تھا جو ۸۳۱ء میں راجہ بنا۔ محمود غزنوی کے زمانہ میں چنڈیل راجپوتوں نے قنوج کے حکمران راجیہ پال پر حملہ کیا تھا محمود جب قنوج پر حملہ آور ہوا تو گنڈا نامی چنڈیل راجہ بھاگ کھڑا ہوا اور اسے مجبور ہو کر محمود کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔ چنڈیل خاندان کا آخری راجہ پارمل تھا۔ جس نے ۱۱۸۲ء میں پرتھوی راج سے شکست کھائی۔ بعد میں قطب الدین ایبک نے بندھیل کھنڈ کے بیشتر علاقے پر قبضہ کر لیا۔ چنڈیل خاندان کا سیاسی اقتدار اکبر اعظم کے زمانے تک رہا رانی درگا وتی بھی چنڈیل راجپوت تھی۔

۷۔ بنگال :۔ آٹھویں صدی کے آخر میں سورج بنسی خاندان کے راجہ گوپال نے بنگال میں خود مختار ریاست قائم کی اور پال خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس کے پوتے دیوپال نے اڑیسہ اور کامروپ بھی فتح کیا۔ اس خاندان کا آخری حکمران مہی پال تھا جس نے ۱۰۴۵ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد مشرقی بنگال میں سین خاندان کی حکومت قائم ہوئی اور مغربی بنگال میں پال خاندان کی حکومت بدستور قائم رہی۔ یہ دونوں خاندان بنگال پر چار سو سال تک حکمران رہے۔ سین حکمرانوں کا صدر مقام ندیا تھا۔ پال راجاؤں کا صدر مقام پاٹلی پتر تھا اور وہ سب کے سب بدھ مت کے حامی تھے۔ سین خاندان میں وجیا سین اور لکشمن سین مشہور فرمانروا ہو گذرے ہیں۔ قطب الدین ایبک کے زمانے میں بختیار خلجی نے اچانک حملہ کر کے بنگال اور بہار پر قبضہ کر لیا۔ اور یکے بعد دیگرے پال اور سین خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

۸۔ میواڑ:۔ اس ریاست نے راجپوتوں کے کئی ایک ہیرو پیدا کیے ہیں چنانچہ رانا سانگا اور رانا پرتاپ بھی اسی علاقے کے حکمران تھے۔ ہرش کی وفات کے بعد سسوڈیا راجپوتوں نے میواڑ میں اپنی ریاست قائم کی۔ یہ خاندان سورج بنسی کہلاتا ہے اور اپنی نسل کی پاکیزگی پر فخر کرتا ہے۔ راجہ گوہیلا نے سب سے پہلی بار چتوڑ کو فتح کیا۔ اور اُسے میواڑ کا پایۂ تخت بنایا۔ گوہیلا کے باپ کا نام بپا راول تھا اور وہ بھی میواڑ کے مشہور ترین حکمرانوں میں سے ہو گذرا ہے۔

دکن کی ریاستیں

دکن سے مُراد دریائے کرشنا اور گوداوری کا درمیانی علاقہ ہے جو ہمیشہ سے الگ تھلگ رہا۔ لیکن آٹھویں صدی سے جب شمالی ہند میں سیاسی بے چینی پھیل گئی۔ تو دکن میں آریائی اثرات پھیل گئے چنانچہ اس دَور میں دکن نے ہندو دھرم کے زبردست ریفارمر پیدا کیے۔ قدیم زمانہ میں دکن میں اندھرا سلطنت قائم تھی۔ جو تیسری صدی عیسوی میں کمزور ہو گئی۔ اس کے بعد پلوا سرداروں نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں۔ اس دور میں دکن کی تاریخ پردہ تاریکی میں ہے۔ مختلف ذرائع سے صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے۔ کہ پلوا سردار ہمیشہ چالوکیہ خاندان سے برسرپیکار رہتے تھے۔ دکن کی مختلف ریاستوں کا مختصر حال درج کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قدیم ترین دکنی سلطنت یعنی ریاست اندھرا کا حال بیان کیا جائے۔

اندھرا سلطنت کی تاریخ

اندھرا خاندان کے حکمران دراوڑ نسل کے تھے اور تلیگو زبان بولتے تھے۔ یہ قدیم ترین دکنی حکمران ہیں جن کے حالات بھی مختلف ذرائع سے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو ست واہن (Sat vahanas) بھی کہتے ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے۔ کہ ابتدا میں اندھرا ریاست ست واہن خاندان کے ماتحت تھی۔ لیکن ہندو مورخین کی اکثریت ان دونوں خاندانوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔

اندھرا سلطنت قدیم ترین گنی جاتی ہے۔ اور اس کا ذکر پران میں بھی ہے۔ میگستھینز نے بھی یہ لکھا ہے۔ کہ اندھرا حکمران کافی طاقتور تھے۔ اور ان کی سلطنت میں تیس عدد مضبوط شہر تھے۔ جن کے گرد فصیل بھی تھی۔

پران میں اس سلطنت کے تیس حکمرانوں کا ذکر ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا عرصۂ اقتدار 450 سال تھا۔ اندھرا سلطنت کا عروج 230 ق۔م سے شروع ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ قدیم ترین دکنی سلطنت ہے۔ تیسری صدی عیسوی میں یہ سلطنت کمزور ہو گئی اور ۲۲۵ء میں پلوا خاندان کے حکمرانوں نے اس پر قبضہ جما لیا۔

اندھرا خاندان کی تاریخ عیاں نہیں ہے۔ مہاراجہ اشوک کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اندھرا حکمران اس کے مطیع تھے۔ اشوک کی وفات کے بعد اندھرا راجہ سیموکا Simuka نے خود مختار

بن بیٹھا۔ اکثر مورخ اُسے ست واہن خاندان کا حکمران تصور کرتے ہیں
اشوک کے بعد اندھرا خاندان کا دوسرا راجہ کرشنا تھا۔ اس نے فتوحات سے اپنے علاقے کو وسعت بخشی اور مغربی گھاٹ تک تمام علاقہ فتح کر لیا۔ ناسک کا مشہور شہر اُس کی سلطنت میں شامل تھا۔ کرشنا کے بعد سری ست کارنی مشہور فاتح تھا۔ جو کالنگا سے جنگ وجدل میں مشغول رہا۔ اس نے اُجین اور بھلسہ کو بھی فتح کیا۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک اندھرا خاندان کی تاریخ پردۂ تاریکی میں رہتی ہے۔ 28 ق۔م میں اندھرا خاندان کے حکمرانوں نے کنوا خاندان پر غلبہ حاصل کیا۔ اور شمالی بھارت پر اپنا اقتدار جمایا۔ اس کے بعد اس خاندان کے حکمرانوں کی تعداد سترہ تھی۔ اور ہر ایک حکمران ست کارنی کا لقب اختیار کرتا تھا۔ اندھرا خاندان کا ایک مشہور حکمران ہالا (Hala) تھا۔ جو علوم وفنون کا سرپرست تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مشہور کتاب سپت شٹاکا (Saptastaka) اُسی کی تصنیف ہے۔ ہالا کے جانشین ساکا قبیلے کے خلاف برسرپیکار رہے۔

دوسری صدی عیسوی کے آغاز میں اندھرا ریاست کا حکمران گوتمی پتر ست کارنی تھا۔ جس نے فتوحات کا عظیم سلسلہ شروع کیا۔ غیر ملکی وحشی قبائل کو مار بھگایا اور گجرات اور مالوہ پر قبضہ جما لیا۔ اس کے جانشین پلومائی کو اُجین کے ساکا حکمران (Sake) کے ہاتھوں شکست ہوئی اور اُسے مجبور ہو کر مہاراشٹر کے مفتوحہ علاقے واپس کرنے پڑے۔ اس زمانے میں اندھرا حکمران ذات پات کے علمبردار اور ہندو مت کے زبردست حامی تھے۔ اور عوام اُن کو نجات دہندہ شمار کرتے تھے۔

آخری دور میں اندھرا ریاست کے حکمرانوں میں سے گوتمی پترا یا جنا سری مشہور ترین فرمانروا ہو گذرا ہے۔ اُس کا عہدِ حکومت سنہ 166ء سے لے کر سنہ 196ء تھا۔ اُس کے سکوں پر جہاز کی تصویر ہے۔ اس نے سا کا حکمرانوں سے کچھ علاقے دوبارہ چھین لئے۔

گوتمی پترا یا جنا کے بعد اندھرا ریاست کے تین مزید حکمران تھے لیکن اُن کے بارے میں تاریخی معلومات صفر ہیں۔ اندھرا ریاست کے زوال کے حالات بھی مورخین کو صحیح طور پر معلوم نہیں ہیں۔

تیسری صدی عیسوی میں اندھرا سلطنت کو زوال ہوا۔ ابھی ہار خاندان نے مہاراشٹر پر تسلط جما لیا۔ میسور بھی اُن کے قبضہ سے نکل گیا۔ اور پلوا خاندان نے دریائے کرشنا کی وادی اندھرا خاندان سے چھین لی۔ عام مورخین کا خیال ہے کہ اندھرا ریاست کے زوال کا باعث پلوا خاندان تھا۔

اندھرا ریاست کے بارے میں ناسک اور جونار کے مقامات پر سے کتبے ملے ہیں۔ جو اس خاندان کے حالات پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

اندھرا ریاست دکن کی قدیم ترین ریاست تھی۔ مہاراجہ ہرش کے زمانے کے بعد کی مشہور دکنی ریاستوں کا حال درج ذیل ہے:-

۱۔ چالوکیہ حکمران:- چالوکیہ خاندان کے حکمران اُجدھیا کے چندر بنسی راجپوت تھے۔ اس خاندان کا سب سے پہلا اہم حکمران پلک سین تھا جس نے چھٹی صدی عیسوی میں موجودہ ضلع بیجاپور پر قبضہ کیا۔ اس کا پوتا پلک سین ثانی چالوکیہ خاندان کے مشہور ترین حکمرانوں میں سے ہے اور اس نے اپنی سلطنت کو خوب وسعت دی۔ اس نے پلوا اور سوا دول کے علاقے پر قبضہ جمایا اور کئی ایک دکنی حکمرانوں مثلاً چولا۔ پانڈیا اور

کرالا وغیرہ کو اپنا مطیع اور باجگذار بنا لیا۔ راجہ ہرش نے بھی اسی راجہ پلیک سین ثانی سے شکست کھا کر صلح کر لی تھی۔ اس کے بعد چالوکیہ خاندان کا اقتدار راس کماری تک ہو گیا۔ پلیک سین نے اپنے بھائی کو سلطنت کے مشرقی علاقوں کا گورنر بنا کر بھیجا۔ لیکن اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور مشرقی چالوکیہ سلطنت کی بنیاد رکھی یہ سلطنت 615ء سے لے کر 1127ء قائم رہی۔ وینگی (Vengi) اس کا صدر مقام تھا۔ بقایا چالوکیہ علاقے کا صدر مقام بدامی (Badami) تھا اور یہ ریاست مغربی چالوکیہ سلطنت کہلاتی تھی۔ 754ء میں مہاراشٹر کے راشٹرا کوتہ خاندان نے مغربی چالوکیہ سلطنت کا خاتمہ کر ڈالا۔ کئی سو سال بعد مشرقی چالوکیہ سلطنت چولا خاندان کے حکمرانوں کے قبضہ میں چلی گئی۔

۲۔ راشٹر کوتہ:۔ اس خاندان کا زمانہ اقتدار 764ء سے شروع ہوتا ہے اور تقریباً دو سو سال تک دکن میں اس خاندان کی سربلندی رہی۔ ابتدا میں راشٹر کوتہ حکمران نہ تھے بلکہ چالوکیہ خاندان کے جاگیر دار تھے۔ ان کے سردار دانتی درگا نے اپنے قبیلے کو منظم کر کے چالوکیہ خاندان سے حکومت چھین لی اور پے در پے فتوحات سے اپنی سلطنت کو خوب وسیع کیا۔ فتوحات کے شوق میں وہ اپنی وسیع سلطنت میں امن و امان قائم نہ رکھ سکا لہٰذا اس کا چچا کرشن اسے تخت سے علیحدہ کر کے خود حکمران بن بیٹھا۔ اس راجہ کے زمانے میں شوجی کے مشہور مندر کی تعمیر ہوئی جسے کیلاش مندر کہتے ہیں۔ یہ مندر ایک چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ اس خاندان کے مشہور حکمران گوبند سوئم۔ اموگھ ورش اور کرشن سوئم

تھے۔ کرشن سوئم نے چولا خاندان پر فتح حاصل کی۔ اور کانچی ورم اور تنجور پر قبضہ جمایا۔ راشٹرا کوتہ خاندان کا خاتمہ 973ء میں ہوا جبکہ مالوہ کے پرمار راجہ نے دکن پر حملہ کرکے اس سلطنت کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا۔

۳۔ ہوئے سالا (Hoysalas):۔ یہ خاندان موجودہ میسور پر حکمران تھا اور اس خاندان کا بانی وشنو وردھن تھا۔ جس نے مشہور ہندو ریفارمر رام نوج کو پناہ دی تھی اور خود اسی کی تبلیغ کی بدولت وشنو کا پرستار بن گیا تھا۔ اس ریاست کا دارالخلافہ دوار سمدر تھا۔ اس خاندان کا مشہور ترین حکمران ویر بیلالہ دوئم ہے۔ جس نے 1215ء میں وفات پائی۔ اس کے زمانے میں یہ سلطنت بڑی وسیع ہوگئی۔ اس خاندان کا آخری حکمران ویر بیلا سوئم تھا۔ جس کی سلطنت کو علاؤالدین خلجی کے جرنیل ملک کافور نے برباد کرڈالا اور راجہ ویر بیلالہ بھی گرفتار ہوا۔ اس ریاست کا خاتمہ 1310ء میں ہوا۔

۴۔ یادوا خاندان:۔ چالوکیہ خاندان کے زوال کے بعد یادوا خاندان کو اقتدار حاصل ہوا۔ ان کا پایۂ تخت دیوگری تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو چندربنسی راجپوت گنتے تھے۔ اس خاندان کا پہلا خود مختار راجہ بھلانہ تھا جس نے 1187ء میں چالوکیہ خاندان پر فتح حاصل کی۔ 1191ء میں یہ راجہ کسی جنگ میں مارا گیا لیکن اس کے جانشین 1310ء تک حکومت کرتے رہے اس خاندان کا مشہور ترین حکمران سنگھانہ تھا۔ یادوا خاندان کے راجہ رام دیو کو علاؤالدین خلجی نے 1294ء میں شکست دی اور رام دیو نے خراج ادا کرنا قبول کیا۔ 1312ء میں رام دیو کے لڑکے

شنکر دیو نے سالانہ خراج ادا کرنا بند کر دیا۔ چنانچہ علاؤالدین خلجی نے اپنے جرنیل ملک کافور کو شنکر دیو کے خلاف بھیجا۔ دیوگری پر ملک کافور کا قبضہ ہو گیا اور شنکر دیو مارا گیا۔ ملک کافور نے اس ریاست کا الحاق نہ کیا بلکہ اسی خاندان کے راجہ ہرپال کو باجگذاری کی شرط پر تخت پر بٹھا دیا لیکن 1318ء میں ہرپال نے بھی خراج بند کر دیا۔ ملک کافور دوبارہ حملہ آور ہوا اور راجہ کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد تمام ریاست کو خلجی سلطنت میں مدغم کر دیا گیا۔

۵۔ کاکاتیہ :۔ اس خاندان کے حکمرانوں کے حالات صحیح طور پر نہیں ملتے۔ لیکن اُن کی حکومت ورنگل کے علاقے پر تقریباً چار سو سال تک قائم رہی اس خاندان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ حکمران کاکاتی دیوی کی پوجا کرتے تھے تری بھووانا مالا اس خاندان کا پہلا حکمران ہے۔ جس کے بارے میں ہمیں تاریخی حالات ملتے ہیں۔ وہ ۱۱۵۵ء میں تخت نشین ہوا۔ اس خاندان کا پانچواں حکمران گناپتی دیو تھا۔ جس نے دیوگری کے راجہ کو شکست دی اور بعد ازاں اُس کی لڑکی سے شادی بھی کی۔ اس خاندان کے ساتویں راجہ کرشن کے زمانے میں بہمنی سلطنت نے ورنگل فتح کر کے راجہ کرشن کو اپنا باجگذار بنایا۔ اس کے بعد اگرچہ کاکاتیہ خاندان کی حکومت کافی عرصے تک رہی۔ لیکن اس کے تمام حکمران کمزور تھے۔ 1424ء میں یہ ریاست بہمنی سلطنت میں مدغم ہو گئی۔

تامل علاقہ کی ریاستیں

دکن کے انتہائی جنوبی علاقے کو تامل علاقہ کہتے ہیں۔ اس علاقے کی

تہذیب آریاؤں سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں تین اہم ریاستیں تھیں اور سمندر کے قرب کی بدولت یہ لوگ سمندری تجارت کے شوقین تھے اور غیر ممالک سے بھی ان کے تجارتی تعلقات تھے۔ یہ تینوں ریاستیں چولا۔ چیرا اور پانڈیا تھیں۔ ان کا مختصر حال درج ذیل ہے:۔

ا۔ چولا:۔ اس ریاست میں مدراس کے علاوہ میسور کا بیشتر علاقہ بھی شامل تھا۔ اور ترچناپلی اس ریاست کا پایۂ تخت تھا۔ چولا سلطنت کا عروج راجہ ادیتیہ کے زمانے میں ہوا۔ اس راجہ نے پلوا سرداروں کا قلع قمع کیا تھا۔ ادیتیہ نے ۹۰۷ء میں وفات پائی۔ چولا خاندان کے مشہور حکمرانوں میں سے راجا راجہ۔ راجندر اوّل۔ راجہ دھیراج خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۱۰۷۰ء میں راجہ تولنگ نے جو شرقی چالوکیہ سلطنت کا مالک تھا۔ اور راجندر کا نواسہ تھا۔ چولا سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اس کے جانشین ۱۳۲۷ء تک حکمران رہے۔ پانڈیا سلطنت کے عروج پر چولا خاندان زوال پذیر ہوا۔

چولا سلطنت کے بارے میں ہمیں کئی ایک کتبے دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ کتبے چولا نظام حکومت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ چولا ریاست چھ صوبوں میں منقسم تھی اور ہر صوبے میں انتظامیہ اُمور کے لئے ڈویژن اور ضلعے تھے۔ لوکل گورنمنٹ کافی زوروں پر تھی۔ موضع کی اسمبلی کو مہاسبھا کہتے تھے۔ رفاہ عام اور مندروں اور باغات کی نگرانی کے لئے علیحدہ کمیٹی موجود تھی۔ پیداوار کا ایک چوتھائی حصّہ مالیہ میں وصول کیا جاتا تھا جسے نقد یا جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا ریاست میں سونے کے سکّے رائج تھے تمام علاقے میں سڑکیں اور

مجلسیں موجود تھیں۔ جن کی نگرانی حکومت کرتی تھی۔ چولا ریاست کی علمی ادبی سرگرمیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ریاست بھر میں سنسکرت کے علاوہ تامل زبانوں کو خوب ترقی دی جاتی تھی۔

ریاست میں ملکی اور غیر ملکی تجارت خوب زوروں پر تھی اور لوگ خوشحال تھے۔ یونان اور روم سے بھی چولا ریاست کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ یونان سے درآمد کی اشیا میں شراب۔ پیتل۔ سکہ اور شیشہ تھا۔ چولا ریاست سے مرچ۔ گرم مصالحہ۔ سمندری موتی۔ ہاتھی دانت۔ پان اور ململ (سوتی کپڑا) دساور کو جاتا تھا۔ چولا ریاست میں روما کے سکّے بھی چلتے تھے اور اُس کی فوج میں بعض رومن سپاہی بھی موجود تھے۔

تاریخ میں چولا آرٹ اور فن تعمیر خاص طور پر مشہور ہے اس دور کے مندر عظیم الشان اور رفعت نشان (Gigantic) ہیں۔ تنجور کا مندر چولا دور کی عمارات میں سے اہم ترین ہے یہ مندر ازحد خوبصورت ہے اور چولا آرٹ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس مندر میں شوجی کے بُت عمدگی سے ڈھالے گئے ہیں۔ وضع قطع ہندی ہے لیکن دلکشی اور جاذبیت میں بے مثال ہیں۔

۲۔ **پانڈیا ریاست:۔** جنوب بعید کی ریاستوں میں سے پانڈیا ریاست قدیم ترین تھی۔ لیکن شروع سے ہی یہ لوگ بلوا سرداروں سے برسر پیکار رہتے تھے اور اُن کو نیچا دکھانے کے لئے انہوں نے چولا خاندان کی باجگذاری قبول کر لی۔ بارھویں صدی عیسوی تک پانڈیا سردار اسی طرح چولا خاندان کے مطیع رہے۔ اس دوران میں

وہ لنکا سے بھی جنگ آزمائی کرتے رہے۔ پانڈیا خاندان کا عروج تیرھویں صدی سے شروع ہوتا ہے اس خاندان کا مشہور ترین حکمران جٹی ورمن سندر تھا۔ جس نے 1272ء میں وفات پائی۔ لیکن آخرکار وجے نگر کی ریاست نے اس پر قبضہ کر لیا۔ پانڈیا ریاست میں مدورا اور تنوپلی کے علاوہ ٹراونکور کا کچھ علاقہ شامل تھا۔ مدورا اس ریاست کا پایۂ تخت تھا۔ کورکی (Korkai) مشہور بندرگاہ تھی۔ سنگم کا شہر مشہور علمی مرکز تھا۔

۳۔ چیرا خاندان:۔ چیرا (Cheras) اس سلطنت کیرالا پترا (Keralaputra) بھی کہتے ہیں۔ اس میں کوچین اور مالابار کے علاوہ ٹراونکور کے بعض علاقے شامل تھے۔ وانجی (کرورڈ) اس کا دارالخلافہ تھا۔ ماچوری مشہور بندرگاہ تھی۔ اور تجارت خوب زوروں پر تھی عوام جہاز رانی کے بڑے شوقین تھے۔ اور دُور دراز علاقوں تک تجارتی سفر اختیار کرتے تھے۔ اس ریاست کا ذکر کئی ایک قدیم کتبوں میں ملتا ہے۔ اشوک کے کتبوں میں بھی اس ریاست کا ذکر ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ریاست بہت قدیم تھی۔ چونکہ یہ ریاست دکن کے انتہائی جنوب میں تھی۔ اس لئے مسلمان حملہ آوروں کی یلغار سے بچی رہی اور اس کے تہذیب و تمدن میں کوئی نمایاں تغیر و تبدل نہ ہوا۔ دسویں صدی عیسوی کے آخیر میں اس ریاست پر چولا خاندان نے قبضہ جما لیا ؎

Typical Questions

Q. 1. Give an account of the two most important Hindu Kingdoms of the *Deccan*.

Q. 2. What do you know of the Deccan Kingdoms at the time of the Muslim invasion of the North?

Q. 3. Describe the origin of the Rajputs and write a careful note on their general character, social and Political institutions.

Q. 4. Who were the Rajputs? What were the Chief Rajput Kingdoms in Northern India in the 12th century?

Q. 5. Write a brief account of:

(*a*) The Chalukyas,

(*b*) The Rashtrakutas.

Q. 6. Breifly outline the condition of India on the eve of Muslim conquest.

امتحانی سوالات

1- ہندوؤں کی دو مشہور دکنی ریاستوں کا حال بیان کیجئے۔

2- مسلمانوں نے جب شمالی ہند پر حملہ کیا تو اُس وقت دکنی ریاستوں کی حالت کیسی تھی؟

3- راجپوتوں کی ابتدا کیسے ہوئی؟ راجپوتوں کے خصائل اور اُن کی سیاسی اور سماجی حالت بیان کیجئے۔

4- راجپوت کون تھے؟ بارھویں صدی عیسوی میں شمالی ہند میں اُن کی اہم ریاستیں کون کون سی تھیں؟

5- چالوکیہ ریاست اور راشٹراکوتہ خاندان کا حال قلم بند کیجئے۔

6- مسلمانوں کی آمد پر برّصغیر ہند و پاکستان کی حالت کیا تھی؟ اُس کا حال بیان کیجئے۔

7- اندھرا خاندان کی مختصر تاریخ بیان کیجئے۔

پندرھواں باب

ہندی نوآبادیاں

کافی عرصہ سے عوام میں یہ غلط خیال رائج رہا ہے کہ برّصغیر ہند و پاکستان کے لوگ اسی خطّے میں الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرتے رہے اور یہ کہ اُنہوں نے کبھی بھی سمندری سفر اختیار نہ کیا۔ ضعیف الاعتقادی کی بنا پر بعض ہندو بھی سمندری سفر کو پاپ (یا گناہ) سمجھتے تھے۔ لیکن تاریخی تحقیق نے اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ مسیح کی پیدائش سے قبل قدیم ترین زمانے سے اس ملک کے لوگ غیر ممالک کا سفر اختیار کرتے تھے۔ اور دُور دراز علاقوں سے اُن کے تجارتی تعلقات تھے۔ چنانچہ اہل روما کی مانند وہ اعلیٰ جہازران تھے۔ اگر اہل رُوما نے یورپ کو تہذیب و تمدن سے بہرہ وَر کیا۔ تو ہندیوں نے ایشیا کے بعض ممالک کو تہذیب اور اعلیٰ اخلاق سے آگاہ کیا۔ قدیم زمانہ میں اکثر ہندی تاجروں نے غیر ممالک میں رہائش اختیار کر لی اور اپنی تہذیب کو غیر ممالک میں پہنچا دیا۔ اس کے علاوہ بدھ مت کے مبلّغ بھی اپنے مذہب کی پرچار کے لئے دُور دراز خطّوں میں پہنچے۔ اس قسم کی نوآبادیوں میں مندرجہ ذیل ممالک شامل تھے لنکا۔ برما۔ سیام۔ انام۔ نیپال۔ تبت۔ وسط ایشیا۔ منگولیا۔ چین اور جاپان یہ بات یاد رہے کہ رگ وید میں بھی سمندری سفر کا ذکر موجود ہے۔

ہندوؤں میں جذبۂ ملوکیت (Colonism) صرف موریا دور سے پیدا ہوا۔ چنانچہ اس زمانے سے بعض ہندو آباد کار غیر ممالک میں جا پہنچے اور

اُن علاقوں کو اپنا مطیع بنا لیا۔ اس قسم کی نوآبادیاں قائم کرنے کا سلسلہ راجپوتوں کے عروج تک رہا۔ راجپوت اپنے ملک میں باہمی جنگوں میں مگن رہے اور نوآبادیوں کی جانب انہوں نے توجہ ہی نہ کی۔ ان نوآبادیوں میں مندرجہ ذیل ممالک شامل تھے۔ کمبوڈیا۔ چمپا۔ جاوا۔ سماٹرا۔ بورنیو اور بالی۔ ان تمام علاقوں میں ہندی تہذیب کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ ان نوآبادیوں کو (Greater India or Further India) کہا جاتا ہے

ان دونوں اقسام کی نوآبادیوں کا مختصر حال درج ذیل ہے:۔

تجارتی اور تبلیغی سرگرمیاں

مؤرخین کا خیال ہے کہ ۵۰۰ ق۔م سے ہندی تاجر اور مبلغین ملکی حدود کو پھاند کر غیر ممالک کو پہنچے اور انہوں نے پُرامن طریقے سے لنکا۔ برما۔ سیام۔ تبت۔ وسط ایشیا منگولیا اور چین۔ جاپان کو تلوار کے بغیر فتح کر لیا۔ یہ ممالک مکمل طور پر ہندی تہذیب اور مذہب کے زیر اثر آ گئے اُن کے رواج اور روایات نے بھی ہندی آباد کاروں سے اثرات قبول کئے۔ پس ہم اُن کو (Indianized) کہہ سکتے ہیں۔ ان ممالک میں سنسکرت زبان میں لکھے ہوئے کئی ایک کتبے ملتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ترین دور میں یہ ممالک برصغیر کے زیر اثر تھے۔ ان ممالک میں مختلف مقامات پر مندروں کے کھنڈرات ملتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدھ مت کے علاوہ ہندوؤں کے دیوتاؤں کی پرستش بھی ان ممالک میں ہوتی تھی۔ چنانچہ چمپا کے قدیم دارالخلافہ انگ کوروت (Angkorut) میں ایک عظیم ہندوانہ مندر موجود ہے۔

اور اسی شہر کی دوسری سمت میں مہاتما بدھ کا ایک بہت بڑا مجسمہ دستیاب ہوا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ہندو دھرم اور بدھ مت نو آبادیوں میں دوش بدوش موجود تھے۔

۱۔ لنکا:۔ ہندو روایات کے مطابق زمانۂ شجاعت میں رام چندرجی نے لنکا کو پہلی بار فتح کیا۔ اسی طرح بدھ مت کے حامی بھی خیال کرتے ہیں کہ مہاتما بدھ بذاتِ خود لنکا میں پہنچا۔ اور اس علاقے میں بھی اپنا پیغام پہنچایا۔ لیکن تاریخی واقعات میں ان دونوں امور کی شہادت نہیں ملتی۔ لنکا کا پہلا حکمران ٹیسا تھا۔ جو اشوک کا ہمعصر تھا۔ اُس زمانے میں بدھسٹ بھکشو لنکا پہنچے۔ اشوک کا لڑکا مہندر اور اُس کی لڑکی سنگ مترا بھی تبلیغ کے لئے لنکا پہنچے، چنانچہ لنکا کا راجہ اور اس کی تمام رعایا نے بدھ مت قبول کر لیا۔ اور ملک میں بدھسٹ خانقاہیں اور سٹوپے تعمیر کرائے۔ کہا جاتا ہے کہ ٹیسا راجہ نے گیا سے مقدس بڑ کی ایک شاخ منگوا کر اپنے ملک میں لگوائی اس شاخ کی بدولت ایک تناور بڑ کا درخت اُگ آیا جو اب تک موجود ہے اور دنیا کا قدیم ترین درخت گنا جاتا ہے۔ اس دور سے لنکا بدھ مت کا مرکز رہا ہے۔

۲۔ برما:۔ برما بھی قدیم زمانے سے بدھ مت کا مرکز رہا ہے۔ لیکن مورخین یہ پتہ نہیں لگا سکے کہ یہ مذہب کب اس ملک میں رائج ہوا۔ اسی طرح یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ برما اور برصغیر کے تعلقات کب سے اُستوار ہوئے۔ عام خیال یہ ہے کہ مہاراجہ اشوک کے زمانہ میں مبلغ اس علاقے میں پہنچے۔ اور ہندی تمدن اور مذہب

برما میں رائج ہو گیا۔ گیارھویں صدی عیسوی میں برما کے بیشتر علاقے میں بدھ مت کی شکل بگڑ گئی تھی۔ لیکن پیگو کے بادشاہ انوارت (Anwarit) نے تمام ملک کو دوبارہ فتح کر کے مذہب کی پاکیزگی کو برقرار رکھا۔

۳۔ سیام :۔ قدیم زمانے میں سیام دراصل چین کا صوبہ تھا۔ موجودہ سیامی لوگ دسویں صدی عیسوی میں یہاں آباد ہوئے اور چین سے بدھ مت اپنے ساتھ لائے لنکا اور برما کے راستے بھی بدھ مت اس ملک میں پہنچا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں سیام کی طاقت بام عروج پر تھی۔ اور ہندو مت بھی اس ملک میں سرایت کر چکا تھا۔ ہندو مورخین کا خیال ہے کہ ہندو تاجر تیسری صدی عیسوی میں سیام پہنچ چکے تھے۔

۴۔ وسط ایشیا :۔ مشہور مورخ سر آرل سٹین نے مختلف جگہوں پر کھدائی کر کے ایسے ایسے کھنڈرات دریافت کئے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ صحرائے گوبی اور ختن (وسط ایشیا) میں ہندی نو آبادیاں قدیم زمانے سے قائم تھیں۔ ان علاقوں میں مہاتما بدھ کے چند ایک بتوں کے علاوہ ہندو دیوتاؤں کے بت بھی ملے ہیں۔ بعض سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ جن پر سنسکرت کے حروف لکھے ہیں۔ دیگر ذرائع سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ختن اور یارقند چونکہ کنشک کی سلطنت میں شامل رہے۔ لہٰذا ہندی تہذیب اور مہایانہ بدھ مت اس دور میں ان دونوں علاقوں میں خوب پھیلے۔

۵۔ چین :۔ وسط ایشیا سے ہندی مبلغ چین جا پہنچے اور ملک بھر میں

اپنے مذہب کا پرچار کیا۔ مورخین کا خیال ہے۔ کہ چین میں بدھ مت پہلی صدی عیسوی میں رائج ہوا۔ چینی سیاح فاہیان اور ہیون سانگ ہندوستان کے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے آئے اور برصغیر کے چشم دید حالات قلم بند کئے۔ ان کی تحریریں اہم تاریخی ماخذ ہیں تاریخی ذرائع سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی روابط کے علاوہ چین سے برصغیر کی تجارت زوروں پر تھی۔

۶۔ مشرق بعید:۔ چین سے بدھ مت مشرق بعید یعنی کوریا اور جاپان میں بھی پہنچا۔ ان ممالک میں بدھ مت کی ترویج کی بدولت ہندی تہذیب کے گہرے اثرات بھی سرایت کر گئے۔ ان ممالک سے بھی ہندوستان کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ کوریا میں بدھ مذہب اگرچہ چوتھی صدی عیسوی میں پہنچا۔ لیکن اس علاقے میں بدھ مت کو اصلی عروج چھٹی صدی عیسوی میں حاصل ہوا۔ اسی صدی میں کوریا کے حکمران نے جاپان کے شہنشاہ کی خدمت میں مہاتما بدھ کا ایک مجسمہ اور بدھ مذہب کی چند قلمی کتابیں بھیجیں۔ چنانچہ چھٹی عیسوی سے جاپان میں بدھ مت کی اشاعت ہوئی۔

۷۔ تبت:۔ اس ملک میں بدھ مت کا تبلیغی مشن سب سے پہلی بار ۶۴۰ء میں پہنچا۔ اور آہستہ آہستہ لوگوں نے یہ مذہب قبول کرنا شروع کیا۔ اس سے پہلے تبت کے لوگ غیر مہذب اور وحشی تھے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ساتویں صدی میں تبت کے بادشاہ نے ایک چینی شہزادی سے شادی کی۔ جو بدھ مت کی پیروکار تھی۔ اس شہنشاہ کی دوسری بیوی نیپال کی تھی اور وہ بھی بدھ مت

کی شیدائی تھی ان دونوں بیویوں کی بدولت تبت کے شہنشاہ نے بُدھ مت کی سرپرستی کی اور یہ مذہب ملک کا عوامی مذہب بن گیا تبت میں آجکل بُدھ مت کی ایک خاص شکل رائج ہے۔ جس کے مطابق دلائی لامہ مذہبی پیشوا گنا جاتا ہے۔ اس مذہب کی ترویج آٹھویں صدی میں ایک مشہور مبلّغ پدما سمبھاؤ نے کی۔

۸۔ نیپال :۔ اس علاقے کے لوگ آج تک بُدھ مت کے پیرو ہیں۔ سب سے پہلے یہاں بدھ مت کی اشاعت اشوک کی بیٹی نے کی تھی۔ اس علاقے کے لوگوں نے تیزی سے ہندی تہذیب کو اپنا لیا۔ بعد میں ہندو مت اس ریاست میں بہت زیادہ اثر انداز ہوا۔ چنانچہ موجودہ دور میں نیپال میں بُدھ مت بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہے۔ اور ہندو دھرم سے ملتا جلتا ہے۔

۹۔ انام :۔ اس علاقے میں بدھ مت چین سے دسویں صدی میں پہنچا۔ عوام نے بدھ مت کو قبول کرنے کے علاوہ ہندی تہذیب کو بھی اختیار کر لیا۔ بعد ازاں انام کے حکمرانوں نے چمپا کو بھی فتح کر لیا۔ جہاں ہندی تمدّن عام ہو چکا تھا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ مندرجہ بالا ممالک میں ہندی سیاسی اقتدار کبھی بھی قائم نہ ہو سکا۔ لیکن بدھ مذہب اور ہندی کلچر نے ان ممالک کو بغیر تلوار کے فتح کر لیا۔ پس یہ ممالک سیاسی نو آبادیاں تو نہ تھیں۔ لیکن یہ ممالک ہندی تہذیب و تمدّن میں رنگے گئے۔ اس کے برعکس کمبودیا۔ چمپا۔ جاوا۔ سماٹرا۔ بورنیو اور بالی باقاعدہ ہندی نو آبادیاں تھیں۔ موریا خاندان کے دور میں جب

فن جہازرانی کو ترقی ہوئی۔ تو برصغیر کے لوگ قریبی جزیروں اور ملکوں میں تجارت کی غرض سے گئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ ان نوآبادیوں میں ہندی تہذیب کی خوب اشاعت ہوئی۔ ہندی آبادکاروں نے مقامی لوگوں کو اپنے مذہب زبان۔ آرٹ اور فن تعمیر سے روشناس کرایا یہ نوآبادیاں کبھی بھی کسی ہندی راجہ کے ماتحت نہ رہیں۔ بلکہ ہندی آبادکار ہی ان لوگوں پر حکومت کرتے رہے ان نوآبادیوں کا مختصر حال درج ذیل ہے۔

۱۔ کمبوڈیا:۔ یہ علاقہ خوب زرخیز اور شاداب ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں ہندی آبادکار یہاں پہنچے اور اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ انگ کورتھام دارالخلافہ تھا اور آٹھویں صدی تک ہندی تہذیب عروج پر تھی اس ملک کے اکثر راجاؤں کے نام ہندوؤں سے ملتے جلتے ہیں اور لوگ ہندوؤں کے دیوتاؤں کو پوجتے تھے۔ کمبوڈیا آرٹ خاص طور پر مشہور ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں اس نوآبادی پر سیام کا قبضہ ہو گیا۔ آجکل یہ علاقہ فرانسیسیوں کے چنگل میں ہے۔

۲۔ چمپا:۔ یہ نوآبادی کمبوڈیا کے شمال میں تھی۔ دارالخلافہ امراؤتی تھا اور یہاں کے باشندے چام کہلاتے تھے۔ دوسری صدی عیسوی کے آغاز میں ہندی آبادکار یہاں قابض ہوئے اور چودھویں صدی عیسوی تک تمام حکمران ہندی نسل کے تھے۔ اس علاقے میں ذات پات کا نظام رائج ہو گیا۔ بعد ازاں ہندو مت کے علاوہ بدھ مت بھی پھیل گیا۔ اس سرزمین میں شیوجی کی پوجا مقبول تھی اب چمپا کی اکثریت مسلمان ہو چکی ہے۔

۳- جاوا اور سماٹرا:- ان علاقوں میں قدیم زمانے سے ہندی تہذیب نے گھر کر لیا تھا۔ چنانچہ چینی سیاح فاہیان جب پانچویں صدی عیسوی میں جاوا سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ ہندومت خوب عروج پر تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں مقامی شاہی خاندان کے زیر اثر ان جزائر میں بدھ مت کی اشاعت ہوئی۔ اور ہندی علوم نے خوب ترقی کی۔ ہندی زبان۔ فن تعمیر اور آرٹ کا نمایاں اثر اب تک ان علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں جاوا کو یوودیپ اور سماٹرا کو سوورن دیپ کہتے تھے۔ دونوں جزیروں میں صدہا قدیم مندر موجود ہیں۔ جن سے ہندی تہذیب کے اثرات نمایاں ہیں۔ اب ان جزائر میں آبادی مسلمان ہو چکی ہے لیکن زبان میں ہندی الفاظ کی آمیزش ملتی ہے اور تہذیب کا رنگ ڈھنگ خالص ہندی کا ہے۔

۴- بورنیو اور بالی:- بورنیو میں ہندی تہذیب کے گہرے نقوش اب تک ملتے ہیں۔ اسی طرح بالی میں ہندومت کی بگڑی ہوئی شکل تاحال موجود ہے ہندوانہ مندر پائے جاتے ہیں۔ اور ہندو دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں مہابھارت بھی کافی مقبول ہے۔ الغرض ان دونوں علاقوں کی معاشرت ہندی تمدن کے بالکل مشابہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بورنیو اور بالی لازمی طور پر ہندی نوآبادیاں تھیں ؎

Typical Questions

Q. 1. Describe in outline only the history of the Indian colonies in Farther India.

Q. 2. Describe the objects, nature and extent of Hindu colonization of Farther India and the Malay Archipelago.

Q. 3. What do you know of the expansion of ancient Indian civilization beyond the geographical limits of India?

امتحانی سوالات

1- غیر ممالک میں ہندی نوآبادیوں کا مختصر حال بیان کیجئے۔

2- برصغیر ہندو پاکستان کے قریبی جزائر میں نوآبادیوں کا حال قلم بند کیجئے۔ یہ نوآبادیاں کہاں کہاں اور کیوں قائم ہوگئیں؟ ان کی نوعیت کیا تھی؟

3- غیر ممالک میں ہندی تہذیب کیسے پھیلی؟ وضاحت سے بیان کیجئے۔

سولھواں باب

جدید ہندو مت اور ہندو ریفارمرز

ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ بدھ مت اور جین مت کا عروج دراصل قدیم ہندو مت کے خلاف بغاوت تھی۔ اس مذہب میں برہمنوں کی فوقیت تھی۔ کئی ایک قربانیاں ادا کرنی پڑتی تھیں۔ اور دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے لا انتہا رسومات لازم تھیں۔ مذہب میں رواداری اور انسانی برابری کا نام نہ تھا۔ ذات پات کی بندشیں عذاب جان بنی ہوئی تھیں۔ اور نچلی ذات کے لوگوں کے لئے باعزت زندگی بسر کرنا محال تھی۔ ان حالات میں بدھ مت اور جین مت قدرتی طور پر عوامی مذاہب بن گئے اور صدیوں تک برہمنوں کی فوقیت اور مذہبی اجارہ داری کا خاتمہ ہو گیا۔

ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ گپتا خاندان کے دور میں سنسکرت کی دوبارہ ترویج کے ساتھ برہمنوں کے قدیم علوم کا بھی دوبارہ احیاء ہوا۔ اسی زمانے میں برہمنوں اور ہندو راہنماؤں نے نہایت چالاکی سے کام لے کر جدید ہندو مت کی بنیاد رکھی۔ نئے مذہب میں ہندو مت کی ظاہری شکل و صورت کو قائم رکھا گیا۔ لیکن اس کے عقائد کو بہت زیادہ لچک دار بنا دیا۔ اپنے مذہب کے اصول کے مطابق ہر شخص کو اختیار تھا۔ کہ وہ اپنے اپنے دیوتا کی پوجا کر

سکتا تھا۔ یعنی ہندوؤں نے ہر فرقے اور ہر مذہب کے دیوتاؤں کو ہندومت میں شامل کر لیا۔ اور مختلف دیوتاؤں کی اس کھچڑی کو جدید ہندومت کا نام دیا۔ چنانچہ جدید ہندومت کی رو سے برہما، وشنو اور شیو سب کو دیوتا یا اوتار مان لیا گیا۔ مہاتما بدھ کو بھی دیوتا بنا دیا گیا اور بعد میں اُسے وشنو کا دسواں اوتار تسلیم کر لیا گیا۔ نئے مندر تعمیر کئے گئے جن میں درجنوں دیوتاؤں کے بُت رکھے گئے اور اُن مندروں میں ہر شخص اپنی خواہش کے مطابق کسی ایک دیوتا کی پُوجا کر سکتا تھا۔ جدید ہندو دھرم نے برّصغیر کے تمام مذاہب کو اپنے اندر جذب کر لیا اور عقاید کے اس عجیب و غریب مجموعے کو ہندومت کا نام دیا۔ ان حالات میں ایک بار پھر "ہندو دھرم" برّصغیر کے ہر گوشے میں پھیل گیا۔ راجپوتوں کے دور میں جدید ہندومت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ اسی زمانے میں اٹھارہ پرانوں کو ترتیب دیا گیا۔ پران میں جدید ہندومت کے عقاید اور اُصول جمع کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ مختلف تہواروں کا ذکر ہے۔ یاترا۔ برت۔ دان اور پرارتھنا کا تفصیلی ذکر ہے۔ نیز شمالی ہند کے بیشتر حکمرانوں کے حالات درج ہیں۔ بعض حکمرانوں کے شجرے دیئے گئے ہیں۔ تاریخی اور نیم تاریخی حالات تفصیل سے پرانوں میں جمع کئے گئے ہیں۔ پس پران بھی اہم تاریخی ماخذ گنے گئے ہیں۔ ہندو مؤرخ پرانوں کو از حد قدیم کتابیں گنتے ہیں۔ لیکن پران صرف راجپوتوں کے دور میں ضبطِ تحریر میں لائے گئے۔ اس سے پہلے بھاٹ لوگ پرانوں کے مختلف حصے گاتے پھرتے تھے یا مذہبی راہنما وعظ کرتے وقت پرانوں

کی تلقین کرتے تھے اور پرانوں کے اہم حصے اُن کو زبانی یاد تھے۔

راجپوتوں کے دور میں پرانوں کے متن میں ایزادی کی گئی اور نئے مذہبی اُصول بھی وضع کئے گئے۔ قدیم مذہب میں وید کا ایک لفظ بھی شودر کے ناپاک کانوں میں پہنچنے کی اجازت نہ تھی لیکن جدید ہندومت کی رو سے ہر ہندو خواہ وہ اعلیٰ ذات کا ہو یا نیچ، پران کے ہر حصے کو پڑھ سکتا تھا۔ یہ بات یاد رہے کہ پرانوں میں شودروں کے قدیم دیوتاؤں کا حال بھی درج کر دیا گیا تھا۔ ایک لحاظ سے جدید ہندومت ایک قومی مذہب تھا اور اس نے رائج الوقت ہر مذہب کی شکل مسخ کر کے اُسے اپنے اندر جذب کر لیا۔ اسلام ابھی برصغیر میں نہ پہنچا تھا ورنہ خدا جانے پرانوں میں اس کا حلیہ کیا ہوتا۔

جدید ہندومت کی ترقی اور ترویج کے لئے ملکی حالات سازگار تھے۔ اس کے علاوہ اس دور میں ہندوؤں میں چند ریفارمرز پیدا ہوئے جنہوں نے نئے مذہب کی قابل قدر خدمت کی۔ ان کے مختصر حالات درج ذیل ہیں:۔

(۱) شنکر آچاریہ:۔ جدید ہندومت کے مبلّغین اور مصلحین میں شنکر آچاریہ کا نام ازحد اہمیّت رکھتا ہے۔ مالابار کے برہمن خاندان سے متعلق رکھتا تھا۔ 788ء میں پیدا ہوا اور چھوٹی عمر میں ہی سنیاسی بن کر ملک کے ہر گوشے کا سفر اختیار کیا۔ بنارس میں ہندومت کی تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں اہم مذہبی کتابوں کی تصنیف کی۔ شنکر آچاریہ نے اپنی تمام زندگی مذہب کے لئے وقف کر دی اور اسی بنا پر ساری عمر تجرّد زندگی بسر کی۔ جدید ہندومت کی دوبارہ اشاعت میں شنکر آچاریہ

نے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ شنکر آچاریہ نے ویدانت فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ یہ فلسفہ تصوّف سے ملتا جلتا ہے۔ اُس کی مشہور تصنیفات سے اُس کی عظمت اور علمیت ظاہر ہوتی ہے۔ شنکر آچاریہ نے اپنشد ویدانت سوترا اور بھگوت گیتا کی تفسیریں بھی لکھیں۔ ان تصنیفات کی بدولت جدید ہندو مت کو فروغ حاصل ہوا۔ نیز شنکر آچاریہ نے اس بات کا پرچار کیا کہ کوئی مذہب دوسرے مذاہب سے مخاصمت نہیں سکھاتا۔ صلح کل" کا پیغام جسے بعد میں مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے اپنایا سب سے پہلی بار شنکر آچاریہ کی زبان سے نکلا۔ وہ اس بات پر زور دیتا تھا کہ مختلف دیوتا اُسی خالق کے مظہر ہیں لہٰذا تمام دیوتاؤں کی پُوجا کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ وہ خود بھی کئی ایک دیوتاؤں کی پوجا کیا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں شوجی کی پرستش کا قائل ہو گیا۔ شنکر آچاریہ" جوانی کے عالم میں 32 برس کی عمر میں کشمیر میں کیدار ناتھ کے مقام پر فوت ہو گیا۔ اُس کا فلسفہ جدید ہندو مت کی ترقی و ترویج میں بہت زیادہ ممدو معاون بنا ہے۔ اُس نے سہری نگر۔ دوارکا۔ بدری ناتھ اور جگن ناتھ کے مقامات پر چار مٹھ (Maths) یا تبلیغی و علمی مرکز کھولے۔ یہ اس کی سب سے بڑی مذہبی خدمت ہے ہندوؤں میں آج تک شنکر آچاریہ کے کئی ایک چیلے پائے جاتے ہیں۔

۲۔ کمارلا بھٹ :- ہندو مصلحین میں سے کمارلا بھٹ بھی شہرۂ آفاق ہے۔ یہ شخص آسام کا باشندہ تھا اور ذات کا برہمن تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں ملک کے ہر گوشے میں مذہبی تبلیغ میں مگن تھا۔ اس غرض کے لئے اس نے ملک بھر کا سفر اختیار کیا اور بُدھ مت کے علماء سے

مباحثے اور مناظرے کرتا رہا۔ کمار لا بھٹ کی کوششوں سے صدہا لوگوں نے بُدھ مت ترک کرکے جدید ہندو دھرم اختیار کر لیا۔ وہ ویدوں کے قدیم مذہبی اُصولوں کی پرچار کرتا تھا اور وحدتِ خداوندی کا قائل تھا۔ لیکن برہمنوں کو سب انسانوں سے افضل گنتا تھا اور اُن کی روحانی عظمت کا پیام دیتا تھا۔ جدید ہندو مت میں چونکہ ہر قسم کے خیالات کی گنجائش ہے۔ لہٰذا کمار لا بھٹ کو بھی ہندو مؤرخ جدید ہندو مت کا اہم خادم گنتے ہیں۔

رامانج آچاریہ یا رام نوج :- ہندوؤں میں رام نوج یا رامانج آچاریہ بھی ایک زبردست مذہبی راہنما ہو گزرا ہے۔ دکن میں جدید ہندو مت کی ترویج کا سہرا اسی شخص کے سر پر ہے۔ نیز وشنو پرستی کو بھی اسی شخص نے مقبول بنا دیا۔ رام نوج ۱۰۵۰ء میں مدراس میں پیدا ہوا۔ کانچی ورم میں تعلیم پائی لیکن سرنگا پٹم (میسور) میں رہائش اختیار کر لی۔ رام نوج وشنو کی پرستش پر بہت زور دیتا تھا لیکن سرنگا پٹم کا راجہ چونکہ شوجی کی پوجا کرتا تھا لہٰذا رام نوج کو میسور سے نکلنا پڑا اور جب تک راجہ ادھی راجندر زندہ رہا رام نوج نے میسور کا رخ نہ کیا۔ اُس کی موت کے بعد رام نوج سرنگا پٹم واپس آگیا اور اس مقام سے اُس نے اپنے نئے مذہبی خیالات کی خوب پرچار کی۔ بارھویں صدی کے آخیر میں رام نوج نے وفات پائی۔ اس نے آس پاس کے راجاؤں کو بھی اپنا ہم خیال بنایا اور دکن میں جدید ہندو مت کو عوامی مذہب بنا دیا۔ رام نوج کی تعلیمات کی بنا پر تعلیم یافتہ طبقے نے جدید ہندو مت قبول کر لیا۔

۴۔ مادھو آچاریہ :۔ یہ شخص ۱۱۹۵ء میں مالا بار کے ساحل کے قریب کنارا کے مقام پر پیدا ہوا اور پچیس برس کی عمر میں دُنیا ترک کرکے سنیاسی بن گیا اور اپنی زندگی مذہبی سربلندی کے لئے وقف کر دی۔ وہ بہت بڑا عالم تھا اور جسمانی صحت کی عمدگی کی بدولت لوگ اسے بھیم کہتے ہیں۔ مادھو آچاریہ نے ویدانت فلسفہ یعنی شنکر آچاریہ کی تعلیمات سے بیزاری کا اظہار کیا اور ایک نئے مذہبی فلسفے کی بنیاد رکھی۔ اُس نے بہشت اور دوزخ کے تصوّر کو اپنا لیا اور بھگتی کی تعلیم دی۔ اُس کا نظریہ یہ تھا کہ وشنو روحِ کل ہے۔ وشنو ہی انسانی شکل اختیار کرکے اس دُنیا میں آیا تھا اور کرشن کے نام سے مشہور ہؤا۔ بھگتی سے مراد نجات حاصل کرنا ہے۔ یہ نجات صرف اس صورت میں حاصل ہوسکتی ہے کہ نیک عمل کئے جائیں۔ اور وشنو کے فرزند یایو (Yayu) سے محبت کی جائے۔ مادھو آچاریہ نے ملک بھر کا سفر اختیار کیا اور ویدانت اور بُدھ مت کے خلاف دلائل دے کر عوام کو وشنو پُوجا کی ترغیب دی۔ ہندو مؤرخ اُسے بھی جدید ہندو مت کا خادم گنتے ہیں۔ شنکر آچاریہ کی طرح مادھو آچاریہ نے بھی اپنے نکتۂ نگاہ کو پیش کرنے کے لئے ہندوؤں کی مذہبی کتب کی تفسیریں لکھیں ؛

Typical Questions

Q. 1. Give an account of the life and teachings of Shankaracharya.

Q. 2. Give a brief account of the famous teachers and preachers of Hindu Age.

Q. 3. Write Short Notes on the following :—

(*a*) Kumaria Bhatt.

(*b*) Ramanunj

(*c*) Madhuacharya.

امتحانی سوالات

1 - شنکر آچاریہ کی زندگی اور تعلیمات کا حال بیان کیجئے۔

2 - جدید ہندو مت کے مشہور راہنماؤں اور معلمین کا حال بیان کیجئے۔

3 - مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیئے :-

(الف) کمار لا بھٹ -

(ب) رام نوج -

(ج) مادھو آچاریہ

مُسلمانوں کا وُرود

سترھواں باب

سندھ پر عربوں کا حملہ

چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں یعنی ۵۷۱ء میں ہادیٔ برحق رسُولِ خُدا محمدؐ ملک عرب کے مشہور شہر مکّہ میں پیدا ہوئے اور چالیس برس کی عمر میں نبوت کا اعلان کیا۔ آپؐ نے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی۔ عرب سوسائٹی کی بُرائیوں کا قلع قمع کیا اور ملک عرب کے مختلف قبائل کو توحید پرستی اور رُوحانیت پر یکجا کر دیا۔ ملک سے بُت پرستی ختم ہوئی۔ اور خانۂ کعبہ جسے حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا، ایک بار پھر خُدائے قدوس کی عبادت کے لئے وقف ہُوا۔ عربوں میں ایک نئی رُوح پھونک دی گئی اور اُن میں قومیت و ریاست کا تصور بھی پیدا ہو گیا۔

رسُولِ کریمؐ کے بعد مسلمانوں کا امیر خلیفہ کہلاتا تھا۔ اسلام کے عروج پر جب اہل عرب متحد و یکجا ہوئے تو انہوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کا بیڑا بھی اُٹھایا اور اسی ولولے اور جوش میں قیصر و کسریٰ کی مغرور سلطنتوں کو ہلا دیا۔ قلیل مدّت میں مسلمانوں نے شام و فلسطین، شمالی افریقہ عراق۔ ایران اور وسط ایشیا پر قبضہ جما لیا۔ سپین کی فتح کے بعد مسلمان فوجیں جنوبی فرانس کی سرحد تک جا پہنچیں۔ یہ محض جذبۂ جہاد تھا جس

کی بدولت بحرِ ظلمات کی گہرائیاں اور وسعتیں بھی اسلامی لشکر کی راہ میں حائل نہ ہوسکیں۔ شہادت کے شوق میں مسلمان آگے بڑھے اور خدا کا نام سربلند کرنے کے لئے اطراف و اکناف کے ممالک پر چھا گئے۔ اشاعتِ مذہب کے سوا اُن کا کوئی اور مقصد نہ تھا لیکن یورپ کے مورخین مسلمانوں پر دوہرا الزام دھرتے ہیں۔ ایک جانب تو یورپی مورخ یہ کہتے ہیں کہ عرب کے مسلمان بھوکے تھے اور زر و مال کے حصول کے لئے وہ تیزی سے آس پاس کے ممالک کو فتح کر گئے۔ دوسری جانب شدومد سے یہ الزام تراشا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے ...... زور سے پھیلا ان دونوں الزامات کا جواب یہ ہے کہ مسلمان لوٹ کھسوٹ کے حامی نہ تھے بلکہ امن و آشتی سے انہوں نے اپنا مذہب پیش کیا اگر دشمن نے اسلام قبول کر لیا یا جزیہ ادا کر کے باجگذاری قبول کی تو اُن علاقوں کی حفاظت کی۔ جنگ صرف اُس صورت میں لڑی جاتی تھی جب مخالف مسلمانوں کی کوئی شرط قبول نہ کرتا تھا۔ جنگ میں بھی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر رحم کیا جاتا تھا۔ ان طبقوں کے لئے جزیہ بھی معاف تھا۔ نیز مسلمانوں کی مذہبی رواداری ضرب المثل ہے مشہور مورخ آرنلڈ بھی اسلامی رواداری کی صریح الفاظ میں تعریف کرتا ہے۔ لہٰذا یہ بہتان تراشی ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ بہادر فاتحین کی مانند مسلمانوں نے کمزور دشمن کو حقیر نہ جانا اور نہ کبھی اُن پر رحم کیا۔ اسی طرح فتح کے بعد رائج الوقت اُصول کے مطابق مالِ غنیمت سے استفادہ کیا۔ ہر فاتح قوم کی فوجیں دشمن کے زر و مال پر قبضہ جما لیا کرتی ہیں لہٰذا عربوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ مسلمان حکمرانوں کی رواداری اور ان کے عدل و انصاف

کی داستانیں آج تک تاریخ کے اوراق میں درخشاں و تابندہ ہیں۔

اسلام کے ظہور سے کافی پہلے عرب تاجر اور جہازران ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں اکثر آیا کرتے تھے اور بین الاقوامی تجارت عرب جہازرانوں کے ہاتھ میں تھی۔ جب عربوں نے اسلام اختیار کر لیا اور آس پاس کے مشرقی ممالک کو فتح کر لیا۔ تو اہل ہند سے اُن کے تجارتی تعلقات اور بھی اُستوار ہوئے۔ مسلمان ہمیشہ وعدے کے پکے اور لین دین کے کھرے ہوتے تھے اور مذہب کی تبلیغ میں بھی کوشاں رہتے تھے۔ ان حالات کی بنا پر برِّصغیر کے ساحلی علاقوں میں چند لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس سے کافی مدت کے بعد ۷۱۲ء میں اموی خلیفہ ولید اوّل کے زمانے میں عربوں نے سندھ کی فتح کا عزم کیا۔

اُس زمانے میں سندھ ایک معمولی صوبہ نہ تھا بلکہ یہاں ایک زبردست ریاست قائم تھی جس کی سرحدیں شمال میں میانوالی تک اور جنوبی سمت میں مالوہ اور گجرات تک تھیں۔ مشرق میں سندھ کی آخری سرحد پر دیپالپور تھا جو آجکل ضلع منٹگمری میں شامل ہے۔ مغرب میں سیستان اور مکران کا علاقہ تھا۔ جس پر عربوں کا قبضہ پہلے ہی سے ہو چکا تھا۔ سندھ کا پایۂ تخت الور تھا جسے آجکل روہڑی کہتے ہیں۔ برہمن آباد اور ملتان مشہور شہر تھے۔ کراچی کے قریب ایک اور بارونق شہر تھا جسے دیبل کہتے تھے۔ یہ صوبائی صدر مقام تھا۔ عوام اکثر جاٹ اور لوہانہ تھے۔ مسلمانوں کی آمد پر سندھ میں راجہ داہر حکمران تھا۔ جس کے ظلم و ستم کی عجیب و غریب داستانیں ملتی ہیں۔ رعایا کے لئے ریشمی کپڑے پہننا اور پگڑی کا استعمال ممنوع تھا۔ شاہی خاندان کے سوا کوئی شخص گھوڑے کی سواری بھی نہ

کر سکتا تھا۔ ملک اگرچہ شاداب اور زرخیز تھا۔ لیکن راجہ کے ظلم سے رعایا بیزار تھی لہٰذا عوام نے مسلمانوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور گھڑیال و ناقوس بجائے۔

سندھ کی مستند تاریخ:۔ مسلمانوں کی آمد کے کچھ عرصہ بعد کسی نامعلوم مصنف نے عربی زبان میں سندھ کی تاریخ مرتب کی۔ یہ کتاب سندھ کی مستند تاریخ ہے اور بعد کے مورخین کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ ناصر الدین قباچہ نے اس کا ترجمہ فارسی میں کروا دیا۔ اُس زمانے سے یہ کتاب چچ نامہ کے نام سے مشہور ہے۔ چچ دراصل سندھ کے کسی سابق ہندو راجہ کا نام ہے۔ یہ شخص بلبن کی مانند تخت حاصل کرنے سے پہلے راجہ ساہسی کا وزیر باتدبیر تھا۔ اُچ ملتان اور برہمن آباد اسی راجہ چچ نے فتح کئے۔ راجہ داہر چچ کا پوتا تھا اور ۶۹۷ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ وہ متعصب ہندو تھا لیکن اُس کی رعایا کی اکثریت بُدھ مت کی حامی تھی۔ داہر نے ان کو مذہبی تعصب کی بنا پر خوب تنگ کیا اور اُن پر کئی ایک پابندیاں عاید کیں۔

ابتدائی جھڑپیں:۔ سندھ کو فتح کرنے کے لئے مسلمانوں کا اہم حملہ 712ء میں محمد بن قاسم کی سرکردگی میں ہوا۔ خلیفہ ولید اوّل کا زمانہ تھا اور اس کا مشہور جرنیل حجاج بن یوسف مشرقی علاقوں کا وائسرائے تھا اسی وائسرائے نے سندھ کی فتح کا منصوبہ تیار کیا اور اپنے بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم کو راجہ داہر کے مقابلے کے لئے صرف چھ ہزار سپاہیوں کی معیت میں بھیجا۔ محمد بن قاسم کی آمد سے پہلے کئی ایک ابتدائی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ چنانچہ سندھی جاٹ ایرانیوں کی حمایت میں مسلمانوں کے خلاف قادسیہ کی جنگ میں بھی لڑے تھے۔ بعد میں ایرانی مجوسی جو سندھ

میں آباد تھے۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلاتے تھے۔ اُن کے بھڑکانے سے سندھی اکثر مسلمانوں کی سرحد یعنی سیستان پر ہلّہ بول دیتے تھے۔ چنانچہ اِس قسم کی کئی ایک سرحدی جھڑپیں محمدؐ بن قاسم کے حملے سے پہلے ہو چکی تھیں۔ مکران اور سیستان کو ۶۴۳ء میں عبداللہ بن عامر بن ربیع نے فتح کیا تھا۔ لیکن خلیفہ وقت حضرت عثمانؓ نے سندھ کی فتح کی اجازت نہ دی تھی۔ سرحدی جھڑپوں کی بنا پر حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں مہلب کی سرکردگی میں سندھ کے خلاف ایک تادیبی مہم روانہ کی گئی۔ اسی دور میں ایک تادیبی مہم منذر کی ماتحتی میں مکران سے روانہ کی گئی۔ لہٰذا محمدؐ بن قاسم سے پہلے سندھ پر مسلمانوں کے حملے محض سرحدی جھڑپیں کہلاتے ہیں۔ ان کا مقصد وسعتِ سلطنت نہ تھا۔ سندھ کی فتح محمد بن قاسم کے ہاتھوں ۷۱۲ء میں خلیفہ ولید اوّل کے زمانے میں ہوئی۔

عربوں کے حملے کی وجوہات:۔ سندھ پر مسلمانوں کے حملے کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ داہر نے عراق اور مشرقی علاقوں کے وائسرائے حجاج بن یوسف کو برافروختہ کر دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مکران کے چند باغی بھاگ کر سندھ میں پناہ گزین ہوئے اور راجہ داہر نے اُن کو حجاج کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ حجاج غصّہ پی کر چپ ہو گیا اُن ہی دنوں میں لنکا (سراندیپ) میں چند مسلمان تاجر فوت ہو گئے۔ لنکا کے راجہ نے ان کے اہل وعیال کو جہاز میں سوار کر کے بصرہ کی جانب روانہ کیا۔ اس جہاز پر چند مسلمان تاجر بھی تھے اور چند دیگر مسلمان حج کے ارادے سے جا رہے تھے۔ راستے میں سندھ کے سمندری علاقے میں ساحلی قزاقوں نے اس جہاز کو لوٹ لیا۔ اور چند مسلمان عورتوں

اور بچوں کو گرفتار کر لیا۔ بعد میں اُن کو دیبل اور برہمن آباد میں قید کر دیا۔
یہ قزاق میدھ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور راجہ داہر کی رعایا تھے اور لوٹ مار اُن کا پیشہ تھا۔ حجاج اگرچہ سخت گیر اور جابر تھا۔ اکثر مورخین اسے ظالم اور سفاک کہتے ہیں۔ لیکن وہ ایک غیور جرنیل تھا۔ وہ مسلمان عورتوں کی بےحرمتی برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ اُس نے داہر کو لکھا۔ کہ وہ تاجروں کے نقصان کی تلافی کرے اور مسلمان قیدیوں کو رہا کرانے کے بعد عراق روانہ کرے۔ نیز قزاقوں کو سزا دی جائے۔ یہ مطالبہ درست تھا۔ لیکن راجہ داہر نے غرور میں آکر اُسے مسترد کر دیا۔ اور حجاج کو لکھا۔ کہ "قزاق میری رعایا میں سے نہیں اور نہ ہی اُن کو تلاش کرنا میرا فرض ہے تم خود آکر اپنے قیدیوں کو رہا کر ڈالو۔ اور اپنا زر ڈنڈ نکلوا لو۔"

حجاج بہت برہم ہوا۔ اور اس نے خلیفۂ وقت سے سندھ فتح کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اس کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے دو سرداروں کو سندھ پر فوج کشی کے لئے بھیجا۔ لیکن یہ دونوں سردار عبیداللہ اور بدیل ناکام رہے اور میدان جنگ میں کام آئے۔ اس کے بعد حجاج نے سندھ کی جانب مکمل توجہ مبذول کی اور اپنے داماد عمادالدین محمد بن قاسم کو سندھ کی فتح کے لئے روانہ کیا۔

واقعاتِ جنگ:۔ محمد بن قاسم سترہ سال کا نوجوان تھا اور صرف چھ ہزار شامی سپاہیوں کی معیّت میں مکران اور سیستان کی راہ سے سندھ پر حملہ آور ہوا۔ سندھ کی سرحد پر پہنچتے پہنچتے مقامی آدمی اُس کی فوج میں شامل ہو گئے۔ اور مکران اور سیستان سے بھی فوجی دستے جذبۂ جہاد

میں آگے بڑھے۔ چنانچہ مورّخین کا خیال ہے کہ راجہ داہر سے لڑائی کے وقت محمّد بن قاسم کی فوج اٹھارہ ہزار تھی اور رسد بردار ملازمین چھ ہزار تھے۔ حجاج بن یوسف نے لڑائی کا نقشہ خود تیار کیا تھا اور جنگی چالوں کے بارے میں وہ خطوط کے ذریعے متواتر ہدایات بھیجتا رہتا تھا۔

محمّد بن قاسم کی بہادری قابل داد ہے اور مورّخ اُسے بہت بڑا ہیرو گردانتے ہیں (A hero indeed.) تین سال کے قلیل عرصے میں اُس نے سندھ کے بیشتر علاقے پر اپنا تسلّط جما لیا۔ ایک نوجوان کے لیئے یہ کارنامہ حیران کن ہے۔ محمّد بن قاسم کی فتح سندھ کو ایشوری پرشاد رومان (A romance of history) گنتا ہے۔

سب سے پہلے محمّد بن قاسم نے مکران اور سیستان سے گزر کر دیبل کے مشہور قلعے پر حملہ کیا۔ دیبل کا محاصرہ تین ماہ تک جاری رہا۔ اس قلعے کے اندر ایک مندر تھا۔ جس کے کلس پر ہندوؤں کا جھنڈا لہراتا تھا۔ محصورین ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ جب تک مندر پر جھنڈا لہراتا ہے دیوتا ہمارے ساتھ ہے اور مسلمانوں کو فتح نہیں ہو سکتی۔ حجّاج کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں نے منجنیق سے مندر پر پتھر برسائے۔ ایک پتھر لگنے سے کلس ٹوٹ گیا اور جھنڈا نیچے گرا۔ جھنڈا گرتے ہی دیبل کے محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے اور محمّد بن قاسم نے تمام مسلمان قیدیوں کو چھڑا کر عراق روانہ کیا۔ راجہ داہر نے صلح کی کوشش کرنے کی بجائے محمّد بن قاسم کو ایک خط لکھا۔ جس میں اُسے ڈانٹ پلائی کہ خبردار آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرنا۔ ان حالات میں محمّد بن قاسم نے داہر کے پایۂ تخت الور پر حملہ کرنے کی ٹھانی۔

محمد بن قاسم کو حجاج نے دو ہزار تازہ دم سپاہ کی کمک بھیجی۔ اس وقت عرب فوجوں نے کشتیوں کا پل باندھ کر دریائے سندھ عبور کیا۔ دریا کے اس پار راجہ داہر کی فوجیں موجود تھیں لیکن عرب تیر اندازوں نے تیروں کی بارش سے دشمن کو روکے رکھا۔ دریا کو عبور کرنے کے بعد راوڑ کے مقام پر ایک خون ریز جنگ ہوئی۔ داہر کا لڑکا جے سنگھ بزدل ثابت ہوا اور برہمن آباد بھاگ گیا۔ لیکن ہندو فوج نے ڈٹ کر مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ راجہ داہر کا ہاتھی پھنس گیا اور راجہ داہر مارا گیا۔ داہر کی رانی پندرہ ہزار فوج کے ساتھ تین دن تک لڑتی رہی لیکن آخر ہمت ہار کر جوہر کی رسم ادا کی یعنی چتا میں بیٹھ کر جل مری۔ راوڑ کی فتح کے بعد سندھ کے حکمران خاندان کی کمر ٹوٹ گئی۔ نیروان اور کھوان پر مسلمانوں کا قبضہ اس سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم برہمن آباد اور ملتان کی جانب بڑھا۔ برہمن آباد میں راجہ داہر کی شکست خوردہ فوج اس کے لڑکے کی سرکردگی میں جمع ہو چکی تھی۔ لیکن وہ محمد بن قاسم کی فوج کے سامنے جم کر لڑ نہ سکا اور بھاگ اٹھا۔ اسی مقام پر راجہ داہر کی دونوں لڑکیاں گرفتار ہو گئیں جنہیں محمد بن قاسم نے نہایت عزت سے دربارِ خلافت میں بھیجا۔ ہندو مؤرخین نے ان لڑکیوں کے بارے میں کئی ایک فرضی قصے گھڑے ہوئے ہیں اس کے بعد محمد بن قاسم نے الور فتح کیا جہاں داہر کا ایک اور لڑکا گوپی موجود تھا وعدہ کے مطابق محمد بن قاسم نے اس شہر کے بدھسٹ مندروں کے بتوں کو نقصان نہ پہنچایا۔ پھر موجودہ ریاست بہاولپور کے راستے محمد بن قاسم آگے بڑھا اور اسی پر قبضہ کر لیا اس طرح سے تمام سندھ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

لیکن صوبہ ملتان کی تسخیر ابھی باقی تھی۔ ملتان کا شہر اُس زمانے میں صنعت و حرفت کا مرکز تھا اور سندھ کے اکثر شکست خوردہ سردار اسی شہر میں پناہ گزیں تھے۔ ملتان میں ایک قدیم مندر بھی تھا جس میں سُورج دیوتا کی پُوجا ہوتی تھی اور اُس میں ایک بہت بڑا بُت بھی موجود تھا۔ ملتان میں جب محمدؐ بن قاسم کی فوجیں آگے بڑھیں تو گور سنگھ نے اُن کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ اس کے بعد گور سنگھ اور سندھ کے باقی سردار قلعہ بند ہو گئے۔ اس محاصرے نے خوب طول پکڑا۔ آخر کار مسلمانوں کو پتہ چل گیا کہ پانی کی ایک خفیہ نہر قلعے کے اندر جاتی ہے۔ مسلمانوں نے اس نہر کو بند کر دیا۔ اس سے قلعے میں پانی کی کمیابی ہو گئی اور ہندوؤں نے پیاس سے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دئے۔

اس کے بعد محمدؐ بن قاسم نے سرحدوں کا ملاحظہ کیا اور مختلف مقامات پر چوکیاں بٹھائیں اور قنوج کی سلطنت سے ٹکر لینے کی ٹھانی۔ یہاں ہرش کے جانشین حکمران تھے اور مشرقی پنجاب کے علاوہ یو۔پی پر بھی ان کا قبضہ تھا۔ ابھی محمدؐ بن قاسم ملتان میں ہی تھا کہ اُسے خلیفہ ولید کی موت کی خبر پہنچی۔ حجاج بن یوسف اس سے آٹھ ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ نوجوان جرنیل نے مزید فتوحات کرنے کی بجائے یہ مناسب سمجھا کہ نئے خلیفہ سلیمان کی پالیسی کا جائزہ لینا چاہیئے۔ چنانچہ محمدؐ بن قاسم سندھ کے پایۂ تخت الور میں چلا گیا۔

محمدؐ بن قاسم کی موت:۔ نیا خلیفہ سلیمان اُموی خاندان سے تھا اور ولید کا چھوٹا بھائی تھا۔ لیکن اُسے حجاج اور اس کے خاندان سے سخت نفرت تھی۔ نیز حجاج نے پوری کوشش کی تھی کہ ولید اپنے والد

کی وصیت کو ترک کر کے سلیمان کی بجائے اپنے لڑکے عبدالعزیز کو ولیعہد مقرر کر دے لیکن ولید نہ مانا تھا۔ سلیمان کو اس بات کا رنج تھا اور وہ حجاج سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ ایک اور بات نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ اس زمانے میں بنو امیہ دو پارٹیوں میں منقسم تھے۔ یمنی پارٹی اور بنو قیس۔ حجاج یمنی پارٹی کا سخت مخالف تھا۔ لیکن نئے خلیفہ سلیمان کی ماں یمنی نسل کی تھی۔ لہٰذا سلیمان نے ماں کو خوش کرنے کے لئے حجاج کے دشمن یزید بن مہلب کو عراق اور مشرقی علاقوں کا وائسرائے مقرر کیا یزید بن مہلب کا اقتدار در اصل محمد بن قاسم کا زوال تھا۔ چنانچہ نئے وائسرائے نے محمد بن قاسم کو معزول کر کے اُسے قید خانے میں ڈال دیا جہاں کچھ عرصے کے بعد وہ فوت ہو گیا۔ اتنے اعلیٰ جرنیل کا یہ حسرتناک انجام بنو اُمیہ کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔

محمد بن قاسم کو 715ء میں معزول کیا گیا اور وہ اس کے بعد چند مہینے زندہ رہا۔ اسے واسط کے قید خانے میں رکھا گیا اور اس پر کئی ایک مظالم توڑے گئے۔ یہ قید خانہ کوفہ اور بصرہ کے درمیانی علاقے میں تھا اور مجرموں کی طرح محمد بن قاسم کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر سندھ سے روانہ کیا گیا تھا۔

ہندو مؤرخین نے محمد بن قاسم کی موت کے بارے میں یہ کہانی گھڑ لی ہوئی ہے کہ برہمن آباد کی فتح کے موقع پر اس شہر سے راجہ داہر کی دونوں لڑکیاں گرفتار ہوئی تھیں ان کا نام سورج دیوی اور پرمل دیوی تھا اور دونوں کو محمد بن قاسم نے خلیفہ کے دربار میں بھیج دیا تھا۔ جہاں خلیفہ نے ان دونوں سے شادی کر لی۔ لیکن شہزادیوں نے خلیفہ سے

عرض کی کہ محمدؐ بن قاسم اُن کو نظرِ بد سے دیکھ چکا ہے۔ خلیفہ برہم ہوا اور اُس نے حکم دیا کہ محمدؐ بن قاسم کو معزول کر دیا جائے اور اُسے گائے کی کھال میں سی کر دمشق روانہ کیا جائے۔ محمدؐ بن قاسم کی لاش کو دیکھ کر دونوں لڑکیاں خوش ہوئیں اور اُنہوں نے خلیفہ کو اصلیت بتائی کہ اُن کی بیان کردہ کہانی غلط تھی۔ دراصل وہ اپنے باپ کا بدلہ لینا چاہتی تھیں۔ خلیفہ ایک بار پھر برہم ہوا اور اس نے حکم دیا کہ ان لڑکیوں کو گھوڑوں کی دُموں سے باندھ کر دمشق کے بازاروں میں چھوڑ دیا جائے چنانچہ اس طریقے سے ان لڑکیوں کا بھی خاتمہ ہوا۔

یورپ کے مورخ اور ہندو مورخین اس فرضی قصے کو خوب مزے لے کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن یہ قصہ سراسر بے بنیاد ہے۔ ہم عصر عرب مورخین نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ بنواُمیہ کے مخالف مورخین نے بھی اس قصے کو بیان نہیں کیا۔ نیز ایک ہی وقت میں کوئی مسلمان دونوں سگی بہنوں سے شادی نہیں کر سکتا۔ کہانی کے مختلف حصے ثابت کرتے ہیں۔ کہ یہ محض افسانہ ہے۔ محمدؐ بن قاسم کے زوال کا اصل باعث وہی ہے جو ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں یعنی خلیفہ سلیمان کی ناراضگی اور یزید بن مہلب کی دشمنی۔ سلیمان اور یزید اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ حجاج کے خاندان سے انتقام لیا جائے۔ اگر حجاج بن یوسف آٹھ ماہ پہلے فوت نہ ہو جاتا تو اُس کی بھی تذلیل ہوتی۔

داہر کی لڑکیوں والا قصہ اکبری دور کی تاریخ معصومی میں پہلی بار ملتا ہے یہ تاریخ محمدؐ بن قاسم کے آٹھ سو سال بعد لکھی گئی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہ کہانی مستند نہیں ہو سکتی۔

عربوں کا انتظام سلطنت:۔ محمدؐ بن قاسم سندھ میں صرف تین سال رہا۔ اور اس عرصے میں بھی وہ جنگ و جدل میں مصروف رہا لیکن اُس نے فتوحات کے ساتھ ساتھ سلطنت کا انتظام بھی کیا۔ اور مفتوحہ علاقے میں امن و امان قائم رکھا۔ فتح کے بعد بلاوجہ لوٹ مار یا خونریزی نہ کی۔ عرب فاتحین کے حسنِ سلوک سے مقامی باشندے دنگ رہ گئے۔

رعایا کے لئے حکومت کی اطاعت لازم تھی۔ غیر مسلموں کو جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور اس کے بعد اُن کو مذہبی اور مجلسی آزادی دے دی جاتی تھی۔ جزیہ ایک سالانہ ٹیکس تھا۔ جو آمدنی کے مطابق ہر ذمّی یا غیر مسلم کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ اُمراء 48 درہم فی کس ادا کرتے تھے درمیانی طبقہ 24 درہم اور عوام 12 درہم فی کس سالانہ ادا کرتے تھے بوڑھے اپاہج اور پادری اس ٹیکس سے مستثنےٰ تھے۔

جزیہ ادا کرنے والوں کو مسلمانوں کی مانند یکساں شہری حقوق حاصل تھے اور اُن کی جائیداد اور زمین اُن کے قبضے میں رہتی تھی۔ ان کی جانی اور مالی حفاظت مسلمانوں کا فرض تھا۔ رعایا کو مکمل مذہبی آزادی دی گئی چنانچہ الور کی فتح کے بعد کسی مندر کو نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ جو مندر جنگ کے ایّام میں مسمار ہوئے تھے انہیں ازسرِ نو تعمیر کرنے کی اجازت دی گئی۔ یہ بات یاد رہے کہ اُس زمانے کے مندر پتھر کے بنے ہوتے تھے اور ازحد مضبوط تھے۔ لہٰذا جنگ کے دوران میں لوگ مندروں کو فوجی اڈہ بنا لیتے تھے۔ مجبوراً مسلمانوں کو ان مندروں پر حملہ کرنا پڑتا تھا۔ عربوں نے سندھ کی فتح کے بعد جس فیاضی اور انسانیت کا ثبوت

دیا اُس کی مثال دُنیا بھر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

سندھ کے مقامی لوگوں کو ملک کے ہر شعبے میں ملازمتیں دی گئیں فوج میں بھی مقامی لوگوں کو ملازمت مل سکتی تھی۔ مختلف ٹیکس وصول کرنے کے لئے مقامی برہمنوں کو ملازم رکھا گیا۔ محمد بن قاسم نے حجاج سے ہدایات حاصل کرنے کے بعد اعلان کیا کہ مسلمان فوج بلا امتیاز مذہب و ملت کسی مقامی باشندے کو مرعوب نہیں کر سکتی۔ سندھ میں داہر کے زمانے میں بدھ مت پر کئی ایک پابندیاں تھیں۔ وہ سب کی سب ختم کر دی گئیں۔ چنانچہ عربوں کے زمانۂ اقتدار میں بدھ مت کے حامی وہارا میں اپنی مذہبی رسوم آزادانہ ادا کرتے تھے اور اپنی مرضی سے بھکشوؤں کو خیرات دیتے تھے۔

محکمۂ مال میں عرب افسروں کی کمی کی بدولت مقامی ملازمین بحال رہے۔ حساب کتاب بھی مقامی زبان میں ہی رکھا جاتا تھا۔ سندھی اہلکار دیانتدار نہ تھے اور کچھ بھی حکومت کے پلے نہ پڑتا تھا۔ اس کے باوجود حکومت کے احکام یہ تھے کہ انصاف اور دیانت داری سے حکومت کا حق وصول کیا جائے۔ زمین کا لگان پیداوار اور زرخیزی کے مطابق تھا۔ پھلدار باغات سے پیداوار کا ایک تہائی حصّہ وصول کیا جاتا تھا اور نہری زمین سے پیداوار کا ⅖ حصّہ۔ دیگر زمینوں سے مالیہ کی شرح عام طور پر پیداوار کا ایک چوتھائی حصّہ تھا۔ رعایا پر سختی نہ کی جاتی تھی اور شکایات رفع کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

عربوں نے سندھ میں اقطاع کا طریقہ بھی رائج کیا یعنی مسلمان فاتحین اور سرداروں کو زمین کے قطعے بطور جاگیر دئے گئے۔ ان زمینوں پر مالیہ

معاف تھا لیکن جاگیردار اپنی سالانہ آمدنی پر حکومت کو زکوٰۃ ادا کرتا تھا۔ جاگیردار امن و امان قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے اور بوقت ضرورت حکومت کو فوج مہیا کرتے تھے۔ ان جاگیرداروں کو ایرانِ سندھ کہتے تھے۔

عرب آباد کار یا تو فوجی تھے۔ یا جاگیردار۔ یہ لوگ بہت کم عورتیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ لہٰذا ان لوگوں نے مقامی باشندوں میں شادیاں کیں۔ باہمی میل ملاپ سے تبلیغ اسلام ہوئی۔ اس کے علاوہ مسلمان علما اور صوفیوں نے ملک بھر میں اشاعت اسلام کی اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ کسے پتہ تھا کہ یہی علاقہ ایک روز اسی تبلیغ کی بنا پر پاکستان کا اہم حصہ بن جائے گا۔

عربوں نے سندھ میں عدل و انصاف کے لئے باقاعدہ عدالتیں مقرر کیں۔ اسلامی عدالتوں کے جج کو قاضی کہتے تھے جو اسلامی قانون کا ماہر ہوتا تھا۔ فوجداری معاملات میں رعایا کے تمام افراد سے یکساں سلوک ہوتا تھا۔ اور اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ البتہ دیوانی مقدمات میں غیر مسلموں کو اجازت تھی۔ کہ وہ مقامی رسم و رواج یا مذہب کے مطابق پنچایت سے فیصلہ کروالیں۔ مسلمانوں کے دیوانی مقدمات کے فیصلے بھی اسلامی شریعت کے مطابق کئے جاتے تھے۔

سندھ میں اسلام کی اشاعت ہونے پر ملک کے ہر گوشے میں مسجدیں تعمیر کروادی گئیں اور ہر مسجد علمی مرکز بن گئی۔ مسجدوں کے نام پر زمین وقف کی گئی اور اس آمدنی پر کوئی ٹیکس لاگو نہیں ہوتا تھا۔ وقف زمین کی آمدنی سے مسجد کی دیکھ بھال اور مرمت ہوتی تھی اور طلبا اور اساتذہ کے قیام و طعام کا بندوبست کیا جاتا تھا۔

فوجی نظام :۔ ملک بھر میں عرب جاگیردار موجود تھے جو امن وامان کے ذمّہ دار تھے۔ جاگیرداروں کی مقامی فوج کے علاوہ ملک میں شاہی فوج (Standing army) بھی کافی تعداد میں موجود تھی۔ محمّد بن قاسم نے ملک بھر میں فوجی چھاؤنیاں قائم کی تھیں۔ اور اہم مقامات پر مضبوط قلعے بھی بنائے تھے۔ عرب فوج ان مقامات پر تعینات تھی فوج باقاعدہ تنخواہ دار تھی۔ ملتان۔ محفوظہ اور منصورہ اہم فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ اُس زمانے میں فوجی چھاؤنی کو جُند کہتے تھے۔

عرب فتوحات کی نوعیت :۔ مؤرخین میں یہ فیشن ہے کہ وہ عربوں کے ہاتھوں سندھ کی فتح کو غیر مستقل اور ناپائیدار گنتے ہیں حالانکہ عرب سندھ پر تقریباً دو سو سال تک حکمران رہے۔ عباسی خاندان کے زوال پذیر ہونے پر سندھ میں عربوں ہی کی دو خود مختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔ ان آزاد ریاستوں کو سلطان محمود غزنوی نے ختم کیا۔ لیکن بعد میں امیرانِ سندھ نے دوبارہ اقتدار حاصل کرلیا۔

دو سو سال کی حکومت کا عرصہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس عرصہ میں عربوں نے ملک بھر میں اہم تبدیلیاں کیں اور مذہبی عقاید میں عربوں کے اقتدار کی بدولت اس قدر انقلاب رونما ہوا کہ اس علاقے میں آج تک مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ان دُوررس نتائج کے باوجود یورپ کے مؤرخین عربوں کی فتح سندھ کو ناپائیدار۔ غیر مستقل اور محض ایک معمولی واقعہ گنتے ہیں۔ چنانچہ مشہور مؤرخ لینؔ پول (Lane Poole) کا قول ہے کہ سندھ پر عربوں کا حملہ مکمل طور پر ناکام تھا۔ یہ حملہ اسلامی فتوحات میں ایک معمولی واقعہ ہے :۔

"The Arab conquest of Sindh was a mere episode in the history of India and of Islam——a triumph without results."

یورپ کے دیگر مورخین کا خیال یہ ہے کہ عربوں نے غلط راستے سے برِّصغیر میں قدم رکھا یعنی شمال مغربی دّروں کی جانب سے نہ آئے۔ شمالی ہند کے زرخیز میدانوں کی بجائے انہوں نے سندھ کے ریگزار کو فتح کیا لہٰذا یہ امر اُن کی ناکامی کا باعث ہُوا۔

عرب محمّد بن قاسم کے بعد اپنی سلطنت کو مزید وسعت نہ دے سکے اور ممالکتِ سندھ کے علاقے بھی آہستہ آہستہ ان کے ہاتھ سے نکلنے شروع ہو گئے۔ محمود غزنوی کی آمد پر عربوں کی سلطنت کی بجائے سندھ میں دو خود مختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر عرب سندھ میں اپنی سلطنت کو مزید وسعت دینے میں ناکام رہے :-

۱۔ محمّد بن قاسم کی موت کے بعد عربوں نے برّصغیر میں کوئی اعلیٰ جرنیل نہ بھیجا۔ لہٰذا مزید علاقے فتح کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہُوا۔ عرب مشکل سے فتح شدہ علاقے پر اقتدار قائم رکھ سکے۔ اگر محمّد بن قاسم کو چند سال مزید مہلت ملتی تو وہ لازمی طور پر قنوج کی سلطنت کو بھی زیر کر لیتا اور شمالی بھارت پر بھی قبضہ جما لیتا۔ محمّد بن قاسم کی بے وقت موت نے توسیع کے کام کو روک دیا۔

۲۔ سندھ کی مملکت کا بیشتر حصّہ ریگزار تھا۔ اور اس کی ہمسائگی میں بھی راجپوتانے کا وسیع صحرا تھا۔ مرکزی حکومت کی لیے ایسے علاقوں

کی جانب توجہ کم رہی اور عربوں نے مزید علاقے فتح کرنے کا خیال نہ کیا۔
۳۔ محمدؐ بن قاسم نے انتظامِ ملکی کرتے ہوئے محکمۂ مال مقامی لوگوں کے ہاتھ میں ہی رکھا تھا۔ حتّٰی کہ حساب کتاب بھی سندھ کی مقامی زبانوں میں ہی رہنے دیا تھا۔ ٹیکس وصول کرنے والے مقامی برہمن تھے یہ لوگ دیانت دار نہ تھے اور انہوں نے عربوں کے پلّے کچھ نہ پڑنے دیا۔ سندھ سے آمدنی چونکہ از حد قلیل تھی۔ اس لئے مرکزی حکومت نے اس علاقے کی جانب توجہ بہت کم مبذول کی اور آخرکار عرب گورنر خود مختار بن بیٹھے۔
۴۔ عرب اگرچہ عمدہ جہازران تھے۔ لیکن آمدورفت کے دیگر ذرائع بالکل مفقود تھے۔ لہٰذا سندھ جیسے دُور دراز علاقے پر مؤثر طریق سے حکومت کرنا ممکن نہ تھا۔ اس بُعد کی وجہ سے سندھ پر عربوں کا اقتدار آہستہ آہستہ اُٹھ گیا۔
۵۔ سندھ کی فتح کے کچھ عرصہ بعد اُمیّہ خاندان کو زوال ہوا اور اُن کی بجائے عباسی خلفاء خلافت کے مالک بنے۔ نئے حکمران فتوحات کی نسبت علم و دانش کے متوالے تھے عباسیوں کے کمزور ہونے پر سندھ عربوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔
۶۔ سندھ کی فتح کے بعد برّصغیر کی سیاسی حالت مزید فتوحات کے لئے سازگار نہ تھی۔ راجپوتوں کی خود مختار ریاستیں ملک بھر میں موجود تھیں اور انہیں زیر کرنے کے لئے اعلیٰ فوجی کردار کی ضرورت تھی۔ نیز ایک راجپوت حاکم کو ختم کرنے کے بعد محض تھوڑا سا علاقہ ہاتھ آتا تھا۔ لہٰذا معمولی قابلیت کے عرب گورنر سندھ سے

آگے بڑھ کر عربوں کی سلطنت کو وسعت دینے میں سراسر ناکام رہے۔
اگرچہ عرب سندھ کے بعد اپنی سلطنت کو وسعت نہ دے سکے لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ سندھ کی فتح کو تاریخ کا محض معمولی واقعہ (an episode) نہیں کہا جا سکتا۔ عرب کسی نہ کسی صورت میں دو سو سال تک سندھ پر حکمران رہے اور فتح سندھ کے کئی ایک اثرات ہوئے۔ بلکہ عرب تمدن پر بھی ہندی اثرات ہوئے۔

فتح سندھ کے اثرات

سندھ پر عربوں کے تسلط سے کئی ایک اثرات رونما ہوئے۔ سندھ کی فتح نے عربوں کے روابط ہندی نژاد لوگوں سے اور بھی گہرے کر دئے اور دونوں قوموں کے تمدن نے ایک دوسرے پر گہرا اثر ڈالا۔ عباسی خلفاء کے زمانے میں علمی ادبی سرگرمیوں کی جانب توجہ چونکہ زیادہ تھی اس لئے سندھ کے علماء بھی بغداد پہنچے اور مسلمانوں نے ہندوانہ علوم بھی سیکھے تا کہ علمی تحقیق پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے مندرجہ ذیل علوم سیکھے:۔

۱۔ علم طب:۔ ہارون رشید کے زمانے میں ہندی طب یعنی ویدک طریقۂ علاج عربوں میں رائج ہوا۔ خلیفہ نے خود ایک بار ہندی طبیب سے اپنا علاج کروایا۔ عربوں کے ایک سرکاری ہسپتال میں علاج کے لیئے ایک ویدک طبیب کا تقرر ہوا۔ ہندی جڑی بوٹیوں کا جائزہ لیا گیا اور علم الادویہ کو توسیع دی گئی۔ عربی میں چرک کی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ پس عربوں نے علم طب میں ہندوستانیوں

سے بہت کچھ سیکھا اور اپنے ذوقِ علم کو تسکین دی۔

۲۔ علم حساب و ہندسہ :- ہندی ریاضی دان ہندسے اپنے علیحدہ طریقے سے لکھتے تھے۔ عربوں نے اس طریقے کو اپنا لیا اور ہندی حساب اور ہندسے کا عربی زبان میں ترجمہ کرڈالا۔ چنانچہ آج تک عربی میں ایک سے لے کر نو تک ہندسے بالکل ہندی طریقے سے لکھے جاتے ہیں۔ ان کو آجکل (Arabic Numerals) کہتے ہیں۔

۳۔ علم ہیئت اور نجوم :- اس علم میں ہندی علماء نے عربوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ دراصل ہند کے علماء جوتش۔ کیمیا۔ نجوم اور علم ہیئت میں از حد مہارت رکھتے تھے اور مسلمانوں نے تراجم کے ذریعے ان تمام علوم کو سیکھا اور پھر اسے اسلامی دنیا میں پھیلایا۔ سنہ ۷۷۱ء میں سندھ سے چند مشہور کتابیں بغداد پہنچیں اور چند پنڈت بھی بُلائے گئے جنہوں نے عباسی دارالترجمہ میں کافی عرصہ ملازمت کی اور ہندوستانی علوم کی مختلف کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا ان کتابوں میں علم ہیئت کی مشہور کتاب سدھانت بھی تھی۔ عربی میں ترجمے کے بعد اس کا نام "سندہند" رکھا گیا۔ عربوں نے اس کی شرحیں لکھیں اور باقاعدہ تحقیق سے اس کی غلطیاں درست کیں۔

۴۔ مختلف علوم :- مندرجہ بالا خصوصی علوم کے علاوہ عربوں نے اس ملک سے علم موسیقی سے استفادہ کیا۔ حکمت و دانش کی مشہور کتاب کلیلہ و دمنہ کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کتاب میں دلچسپ قصّے کہانیاں ہیں اور اس کتاب کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ عربی زبان میں مہابھارت کو منتقل کرکے اُس کی تلخیص بھی

شائع کی گئی۔ غرض عربوں نے ہندوستان کے تمام علوم سے استفادہ حاصل کیا۔

۵۔ **فلسفہ اور ویدانت:۔** ہندی فلسفہ اور وید انت کی اہم ترین کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہُوا۔ ان نئی کتابوں کے شائع ہونے سے اسلامی تصوّف پر گہرے اثرات ہوئے۔ چنانچہ ہندو فلسفہ ویدانت اور بدھسٹ تصوّف کے خدوخال آج تک اسلامی تصوّف میں ملتے ہیں۔

پس ہیول (Havel) کا قول درست ہے کہ عربوں نے اپنے ابتدائی دور میں یُونانی علما کی بجائے ہندوستان سے علوم و فنون سیکھے۔ اُن کے فلسفے اور مذہبی خیالات نے گہرے اثرات قبول کئے اور بعد ازاں ادب۔ آرٹ اور فن تعمیر میں بھی ہندی اثرات نمایاں ہیں:۔

"It was India not Greece, that t aught Islam in the impressionable years of its youth, formed its philosophy and religious ideas and inspired its most characteristic express-ions in literature, art and attchitecture."

مسلمانوں کی فوقیت کے اثرات

۱۔ قاعدہ ہے کہ محکوم لوگ اپنے حکمرانوں کی وضع قطع جلدی ہی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اُن کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ چنانچہ سندھ پر عربوں کے تسلّط کا عرصہ دو سو سال تک تھا۔ لہٰذا اس طویل

مدت میں سندھ کے لوگوں نے عربوں جیسی معاشرت اختیار کر لی۔ عربی لباس اور وضع قطع اختیار کی اور عربی زبان کے کئی ایک الفاظ سندھی مقامی زبان میں شامل ہوئے۔ یہ الفاظ آج تک رائج ہیں سندھی زبان کا رسم الخط بھی عربی ہے۔

۲۔ عربوں کے اقتدار کی بدولت سندھ کی اکثریت نے اسلام قبول کیا۔ عربوں کی آمد سے پہلے بُدھ مت کے حامیوں اور نچلی ذات کے لوگوں کا قافیہ تنگ تھا اور انہیں کوئی سیاسی یا سماجی حقوق حاصل نہ تھے۔ مسلمانوں نے رعایا کے ساتھ فیاضی اور انسانیت کا سلوک کیا۔ ان حالات میں عوام کو اپنے حکمرانوں کی جانب جاذبیت اور کشش ہوئی اور آہستہ آہستہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ کہ عربوں نے رعایا کو مکمل مذہبی آزادی دے رکھی تھی لیکن مسلمان علماء اور صوفیوں نے تبلیغ کو خوب اہمیت دی تھی۔ ان لوگوں کی بدولت سندھ کی اکثریت مشرف بہ اسلام ہوئی۔

۳۔ عربوں کی تقلید میں سندھ میں بھی اونٹ اور عربی نسل کے گھوڑے پالنے کا رواج ہو گیا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس علاقے میں بھی جزیرۂ عرب کی مانند عمدہ نسل کے گھوڑے اور اُونٹ میسّر آنے لگے۔ سندھ میں آج تک اُونٹوں سے کام لیا جاتا ہے۔ عربوں کی بدولت نئی قسم کے پھلدار درخت بھی اسلامی ممالک سے منگوا کر سندھ میں لگوائے گئے۔

۴۔ عربوں نے ملک بھر میں لاتعداد قلعے اور مسجدیں تعمیر کروائیں اور نئے شہر آباد کیے۔ افسوس یہ ہے کہ عربوں کے زمانے کی عمارات

اب منہدم ہو چکی ہیں۔ لیکن ان کے کھنڈرات عربوں کی عظمت کی
یاد دلاتے ہیں۔

۵۔ عربوں کی آمد سے پہلے سندھ کے لوگ رہزنی اور ڈاکہ کے شوقین تھے ساحلی علاقے کے لوگ جہازوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ نیز ملک بھر کے لوگ زیادہ تر خانہ بدوش اور غیر مہذب تھے۔ عربوں نے ان لوگوں کو قانون کا احترام سکھایا اور آہستہ آہستہ ان کو شائستہ اور مہذب بنا دیا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دیا اور سندھ کے لوگ باعزت شہری بن گئے۔

Typical Questions

Q. 1. Clearly describe the Arab administration of Sindh.

Q. 2. Give an account of the conquest of Sindh by Muhammad Bin Qasim. Why did the Arab fail to extend their dominion ?

Q. 3. Give a description of the internal administration of Sindh by the Arabs.

Q. 4. "The Arab conquest of Sindh was only an episode in the history of India and of Islam, a triumph without results." Discuss.

Q. 5. Describe the reasons and results of the Arab invasion of Sindh.

Q. 6. Describe the conquest of Sindh by the Arabs. How did the Arabs carry out the internal administration of the country ?

Q. 7. Why did the Arab conquest of Sindh fail to result in the conquest of the rest of India ?

Q. 8. Give an estimate of the effect of the civilization of the Hindus on that of the Arabs, as a result of the occupation of Sindh by the 8th century.

امتحانی سوالات

1- سندھ میں عربوں کے نظامِ سلطنت کا حال واضح طور پر بیان کیجئے۔

2- محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح سندھ کا حال بیان کرتے ہوئے وضاحت کیجئے۔ کہ عرب فاتحین اس ملک میں اپنی سلطنت کو وسعت دینے سے کیوں قاصر رہے ؟

3- سندھ میں عربوں کے نظامِ سلطنت کا حال قلمبند کیجئے۔

4- "تاریخ ہند میں بلکہ تاریخ اسلام میں بھی فتح سندھ محض ایک معمولی واقعہ گنا جاتا ہے۔ یہ علاقہ فتح بے شک ہوا لیکن یہ فتح نتائج سے خالی تھی"۔ تبصرہ کیجئے۔

5- سندھ پر عربوں کے حملے کی وجوہات کیا تھیں ؟ فتوحات کے نتائج اور اثرات لکھیئے۔

6- عربوں کی فتح سندھ کا حال بیان کیجئے۔ عربوں نے نظامِ حکومت چلانے کا کیا بندوبست کیا ؟

7- فتح سندھ کے بعد عرب حکمران ہند کا بقایا علاقہ کس بنا پر مسخر نہ کر سکے ؟

8- آٹھویں صدی عیسوی میں تسخیر سندھ کے موقع پر عرب فاتحین کے متعلق ہندوؤں کی تہذیب و تمدن کے اثرات کیا کیا ہوئے۔ وضاحت کیجئے۔

اٹھارھواں باب

غزنوی سلاطین

غزنی سلطنت کی تاریخ:۔ غزنی کی خود مختار سلطنت کی داغ بیل الپتگین نے 963ء میں ڈالی۔ یہ شخص ترکی غلام تھا اور سامانی حکمران نصر بن اسمٰعیل نے اُسے آزاد کیا تھا۔ اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کی بنا پر وہ ملکی افواج کا سپہ سالار بنا۔ سامانی خاندان نویں صدی عیسوی میں خراسان یعنی شمالی ایران میں خود مختار بن بیٹھا تھا لیکن بظاہر یہ حکمران خلفائے عباسیہ کے ماتحت تھے سامانی حکمرانوں کے دور میں بخارا علوم و فنون کا مرکز بنا اور انہوں نے افغانستان کے راجپوت حکمرانوں کو شکست دے کر پنجاب اور سندھ کی جانب دھکیل دیا۔

سامانی حکمران عبدالملک کی وفات کے بعد الپتگین نے چاہا کہ اُس کے نابالغ لڑکے کو تخت پر بٹھایا جائے لیکن وزیر سلطنت نے عبدالملک کے بھائی کی حمایت کی۔ تخت و تاج کی اس رسّہ کشی میں ناکام رہ کر الپتگین سامانی پایہ تخت کو چھوڑ کر چلا گیا اور غزنی کے گورنر کو شکست دے کر وہاں خود مختار ریاست قائم کر لی۔ غزنی اُن دنوں زابلستان کا پایہ تخت تھا یعنی نصف افغانستان الپتگین کے قبضے میں آگیا۔ غزنی کا قدیم شہر کابل سے 75 میل کے فاصلے پر جنوب کی جانب ایک پہاڑی گل کوہ پر واقع تھا۔ نئے سامانی حکمران امیر منصور نے الپتگین

کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ آخرکار اُس کی خود مختارانہ حیثیت کو تسلیم کر لیا البتگین نے چودہ سال حکومت کی اور ۹۷۶ء میں وفات پائی۔

البتگین کا لڑکا نااہل تھا اس لئے اُس کے دو غلام بلکتگین اور پری تگین یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ پری تگین کے زمانے میں غزنی کے سابق گورنر ابوبکر لادق نے ریاست پر حملہ کیا۔ اُس کے سیلابی حملے کو البتگین کے ایک اور غلام نے روکا اور ریاست کو تباہی سے بچایا اس ترکی غلام کا نام سبکتگین تھا۔ اور اُس کی ماں ایرانی نسل کی تھی سبکتگین کی فوجی قابلیت کے پیش نظر اُمرائے سلطنت نے پری تگین کو تخت سے علیحدہ کر دیا اور سبکتگین کو اپنا امیر تسلیم کیا۔ سبکتگین ۹۷۷ء میں تخت نشین ہوا۔ اور بیس سال حکومت کی۔ سبکتگین بلا کا ذہین اور عمدہ جرنیل تھا لیکن خون آشامی کی بجائے رحمدلی اور مروّت اس کا خاصہ تھا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ابتدائی دور میں ایک روز وہ شکار کو نکلا اور اپنا گھوڑا ایک ہرنی کے تعاقب میں ڈالا ہرنی تو بھاگ گئی لیکن اُس کا بچہ پیچھے رہ گیا اور سبکتگین نے اُسے زندہ پکڑ کر گھوڑے پر ڈال لیا۔ کچھ دیر کے بعد سبکتگین نے دیکھا کہ ہرنی سبکتگین کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ اور حسرت بھری نگاہوں سے اپنے بچے کو تک رہی ہے۔ سبکتگین نے ہرنی پر رحم کھا کر بچے کو چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ کو اُس کا یہ فعل پسند آیا اور خواب میں کسی شخص نے سبکتگین کو سلطنت کی بشارت دی۔ اس کہانی سے سبکتگین کا جذبۂ رحم ظاہر ہوتا ہے۔

سبکتگین کے زمانے میں افغان قبائل میں جذبۂ قومیت بیدار ہوا۔

سبکتگین نے اُن کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور وہ غزنی سلطنت کے وفادار بن کر ریاست کی فوج میں شامل ہو گئے۔ اس کے علاوہ بقایا افغان قبائل نے بھی اسلام قبول کیا اس سے پہلے افغان قبیلے کبھی مسلمانوں سے اتحاد کرتے تھے اور کبھی ہندو راجپوتوں سے مل جاتے تھے۔ سبکتگین کی نرمی اور فراخدلانہ پالیسی کی بنا پر افغان قوم مسلمانوں کا جزوِ لاینفک بن گئی اور اس بہادر قوم کی بدولت امیر سبکتگین کے لڑکے سلطان محمود غزنوی کو کئی ایک فتوحات حاصل ہوئیں۔

سبکتگین ازحد نیک دل۔ متقی اور پرہیزگار بادشاہ تھا لیکن خداداد فوجی قابلیت رکھتا تھا اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے کا خواہش مند تھا۔ اُن دنوں پنجاب پر راجہ جے پال کی حکومت تھی جو بھٹی راجپوتوں کے خاندان سے تھا۔ اُس کے آباؤ اجداد افغانستان پر بھی حکومت کرتے رہے تھے لیکن اُس کا باپ بھیم پال غزنوی خاندان کے عروج پر ڈر کے مارے بغیر لڑے کابل کو چھوڑ آیا تھا اور وہی ہند کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا۔ یہاں سے اُس نے ملتان۔ کانگڑہ اور سیالکوٹ کی ریاستوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ چنانچہ کشمیر سے ملتان تک اور سرہند سے لمغان (جلال آباد) تک تمام علاقہ اُس کے قبضے میں تھا۔ جے پال نے لاہور کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ جے پال کے خاندان کو مورخ کئی ایک ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ شروع میں لوگ انکو راجگان کابل یا ہندو شاہی خاندان کہتے تھے۔ بعد میں وُہ راجگان ہند یا راجگان وی ہند یا راجگانِ لاہور بھی کہلاتے تھے۔

سبکتگین اور جے پال کی لڑائیاں

سلطنتِ غزنی کا عروج جے پال کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔اس کے علاوہ اُس کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح کابل اور قندھار کے علاقے سبکتگین سے چھین لے۔ لیکن اُس کی پیش نہ جاتی تھی۔ آخرکار اُس نے مختلف ہندو راجوں سے مدد طلب کی۔ چنانچہ تھانیسر۔ قنوج۔ گوالیار اور کالنجر کے فوجی دستے جے پال کی مدد کو پہنچے۔ لڑائی کے لئے کوئی بہانہ موجود نہ تھا لیکن جے پال نے اعلان کیا کہ لمغان کا علاقہ دراصل اُس کی سلطنت کا حصہ ہے۔ لمغان کا علاقہ فوجی نکتۂ نگاہ سے اب تک اہم ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جو پشاور اور کابل کے درمیان ہے۔ جے پال نے یہ اعلان کرتے ہی اپنی فوجیں لمغان میں بھیج دیں۔ مجبوراً سبکتگین کو بھی مقابلے پر آنا پڑا۔ اس لڑائی میں سبکتگین کا نوجوان لڑکا سلطان محمود بھی شامل تھا اور اس نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ اُس کی جنگی چالوں اور ہمت کو دیکھ کر تجربہ کار جرنیل بھی دنگ رہ گئے جے پال بدقسمت تھا کیونکہ چند دنوں کی لڑائی کے بعد سخت برفباری شروع ہوگئی اور ہندوستانی فوج لحاف اور رضائیاں ڈھونڈنے لگی۔ جے پال کو مجبوراً صلح کرنی پڑی۔ محمود نے بضد ہو کر چند سخت شرطیں منوائیں جے پال نے سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ چند سرحدی قلعے سبکتگین کے حوالے کئے اور پچاس ہاتھی بھی بطور نذرانہ پیش کئے۔ لاہور پہنچتے ہی جے پال اپنے تمام وعدوں سے پھر گیا۔ لہٰذا سبکتگین کو ایک بار پھر فوج کشی کرنی پڑی۔ اس بار لڑائی پشاور کے قریب

ہوئی۔ اگرچہ جے پال کی فوج ایک لاکھ کے قریب تھی۔ لیکن اُسے پھر شکست ہوئی۔ جے پال نے خراج ادا کرکے اطاعت قبول کی اور پشاور اور دریائے سندھ کے پار کا تمام علاقہ مسلمانوں کے حوالے کیا۔ یہ لڑائی کافی اہم تھی۔ اس سے آیندہ فتوحات کی راہ کھل گئی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی کمزوری کا پتہ چل گیا۔ امیر سبکتگین کی وفات تک جے پال کو جرأت نہ ہوئی کہ یہ صلح نامہ توڑے۔

سلطان محمود غزنوی:۔ ۹۹۷ء میں امیر سبکتگین نے وفات پائی اور اس کے بعد سلطان محمود تخت کا وارث ہوا۔ اپنے بھائی اسمٰعیل پر فتح پانے کے بعد ۹۹۸ء میں سلطان محمود بادشاہ بنا۔ محمود بلا کا نڈر اور بہادر تھا۔ وہ دُنیا کا بہترین جرنیل گنا جاتا ہے۔ لیکن سیاست میں دُور اندیشی سے کام نہ لیتا تھا۔ اُس نے برّصغیر ہند و پاکستان پر سترہ حملے کئے۔ لیکن پنجاب کے سوا کسی علاقے کا الحاق اپنی سلطنت سے نہ کیا۔ گجرات کاٹھیاوار تک کا علاقہ اُس نے فتح کیا لیکن زر و مال کے حصول کے بعد وہ غزنی واپس لوٹ گیا اور ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم نہ کی۔ اُس کے برعکس محمدؐ غوری اتنا عمدہ جرنیل نہ تھا لیکن اُس نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

محمود کے تخت نشین ہونے کے ایک سال بعد امیر کاشغر نے سامانی سلطنت کا خاتمہ کر ڈالا۔ امیر کاشغر محمود کا سُسر تھا۔ اس کے بعد ایشیا کی تمام ریاستوں میں سلطان محمود نے سربلندی حاصل کی۔ سلطان محمود کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے پیشِ نظر خلیفۂ بغداد نے بھی محمود کو حکومت کی سند بخشی اور اُسے یمین الدولہ کا خطاب

دیا۔ اس لئے بعض مورّخ غزنوی سلاطین کو یمینی خاندان بھی کہتے ہیں۔ خلیفۂ بغداد سے خطاب حاصل کرنے کے بعد سلطان محمود کا وقار عوام میں بہت بڑھ گیا کیونکہ عوام خلیفۂ بغداد کو خلیفۂ رسولؐ گنتے تھے۔

سلطان محمود فتوحات کا ازحد شوقین تھا۔ برق رفتاری سے دشمن کے سر پر جا پہنچتا تھا اور وُہ دشمن کے کمزور نکات کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ خدا داد فوجی قابلیت کا مالک تھا (" He was a military genius.") اور بے پناہ قوتِ ارادی اور عزم رکھتا تھا۔ عسکری لحاظ سے دُور اندیش اور دُور بین تھا۔ موسم بہار میں وسط ایشیا کی فتوحات کی جانب توجّہ مبذول کرتا تھا لیکن موسم سرما میں ہندوستان پر حملہ آور ہوتا تھا اُس نے ہندوستان کے مختلف علاقوں پر سترہ بار حملے کئے لیکن اس برّصغیر میں اسلامی سلطنت قائم نہ کی۔ ہندو مورّخ اسے محض لٹیرا گنتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض جذباتی مسلمان اُسے مجاہد اور غازی کہتے ہیں۔ مسلمان عوام میں سلطان محمود ایک بہت بڑا ہیرو گنا جاتا ہے۔ لوگ اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ سومناتھ میں اُس نے اعلان کیا کہ وہ بُت شکن ہے۔ بُت فروش نہیں۔ ہندو مورّخ اُس کی بہادری اور فوجی قابلیّت کا اعتراف کرتے ہیں لیکن تعصّب کی بنا پر اُسے لالچی اور حریص لکھتے ہیں۔ بعض غیر مسلم مورّخ اُسے متعصّب فرمانروا شمار کرتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ اُس نے اندھا دُھند ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کیا۔ اُن کی دولت سمیٹ لی اور لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی۔ اُس کے سلوک

کی بنا پر ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے گہرے جذبات جاگزیں ہو گئے ہیں جو صدہا سالوں تک قائم رہے۔

سلطان محمود کے حملوں کی نوعیّت کے بارے میں مورّخین کے درمیان شدید اختلاف ہے۔ اُسے محض ایک ڈاکو یا لٹیرا کہنا زیادتی ہے تاریخ کے اوراق میں اس امر کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ محمود نے صرف اُن مندروں کی دولت کو سمیٹا جہاں لوگوں نے اُس کا مقابلہ کیا۔ جہاں کہیں ہندوؤں نے اطاعت قبول کی سلطان محمود نے اُن علاقوں کے مندروں یا بتوں سے تعرّض نہ کیا۔ نیز یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُس زمانے میں ہندوؤں کے مندر پتھر کے بنے ہوتے تھے اور مضبوط فوجی اڈے تھے۔ عوام مذہبی اعتقاد کی بنا پر بھی جنگ کے دنوں میں وہیں ڈیرے ڈالے رہتے تھے۔ لہٰذا ہر فتح کے بعد اُس زمانے کے رواج کے مطابق اُن مندروں کی دولت کو سمیٹا جاتا تھا۔ عقل اس بات کو نہیں مانتی، کہ ان حالات میں مندروں کی بے شمار دولت کو نہ چھیڑا جائے۔

سلطان محمود اپنے حملہ آور ساتھیوں کو اُبھارنے کے لئے ہندوستان کے ہر حملے کو جہاد کا نام دیتا تھا۔ اور یہ محض پراپگنڈا تھا ورنہ اُس کے حملوں کا اصل مقصد جہاد فی سبیل اللّٰہ نہ تھا۔ اُس زمانے کے شاعر بھی تعریف اور خوشامد کی بنا پر اُسے مجاہد اور غازی لکھنے لگے لیکن اس کے حملوں کی غرض و غایت اسلام کی اشاعت نہ تھی۔

جے پال نے اُس کی توجہ ہندوستان کی جانب مبذول کی۔ اور اُس کے بعد اُس نے سترہ متواتر حملے کئے۔ ان میں سے اکثر حملے محض فتوحات

کے شوق کی بنا پر کیئے گئے۔ چنانچہ مشہور مؤرخ الفنسٹن رقمطراز ہے کہ "ہندوستان پر سلطان محمود کے حملوں کی اصلی وجہ محض شہرت ناموری حصول دولت اور ملک گیری کی خواہش تھی" ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے بعض مذہبی مقامات پر دولت وافر تھی اور ان مقامات پر حملے کرنے کے بعد محمود اُس دولت کو سمیٹ کر غزنی لے گیا لیکن ہر فاتح کا دستور یہی ہے۔

پس وُہ محض حریص۔ لالچی یا لٹیرا نہ تھا بلکہ وہ دنیا کا ایک زبردست فاتح اور بہترین جرنیل تھا۔ فتوحات کے شوق میں اپنے پایۂ تخت سے نکلا اور کہیں بھی شکست نہ کھائی۔ اعلیٰ سیاست دان نہ تھا اور نہ ہی مجاہد تھا۔ وسط ایشیا میں اُس نے اپنی سلطنت کو وسعت دی لیکن ہندوستان میں محض کامیاب حملوں پر ہی قناعت کی برصغیر سے بے شمار دولت سمیٹ کر لے گیا۔ اور ہندوؤں کو ہر حملے میں شکست دی۔ وہ ایک عظیم الشان فاتح تھا۔ لیکن سلطنت کو بنانے والا نہ تھا۔

"A great conqueror but not an empire builder,"

برصغیر پاکستان و ہند پر اُسکے مشہور حملے

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ تخت نشین ہوتے ہی محمود نے فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سامانی خاندان کے خاتمے کے بعد اُس نے اعلیٰ اقتدار حاصل کرنے کے لئے وسط ایشیا میں لا تعداد فتوحات کیں۔ ان فتوحات کے حالات بیان کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ یہ وسط ایشیا کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ ۱۰۰۱ء سے صحیح معنوں میں اُس نے برصغیر

ہندو پاکستان کی جانب توجہ مبذول کی اور سترہ حملے کیے۔ اس نے صرف پنجاب کا الحاق کیا ورنہ ہر فتح شدہ علاقے کو اپنے حال پر چھوڑ کر واپس لوٹ گیا۔ پنجاب اپنی سلطنت میں محض اِس لیئے شامل کیا کہ برصغیر کے مختلف علاقوں پر حملے کرنے کے لئے یہ علاقہ (پنجاب) فوجی نکتہ نگاہ سے مفید تھا اور اُس کی فوجوں کو سستانے کا کام دیتا تھا۔
(Served as a military base) پس اس نے اپنی عظیم الشان فتوحات کو مُفت میں ضائع کیا۔ اسی بنا پر اُسے اعلیٰ سیاست دان نہیں گنا جاتا اُس کے مشہور حملوں کا حال درج ذیل ہے۔

لاہور پر حملہ ۱۰۰۱ء:۔ سلطان محمود کا پہلا مشہور حملہ جے پال شاہیہ لاہور پر تھا۔ محمود کی تخت نشینی پر وُہ پشاور اور لمغان کی واپسی کے لئے کوشاں ہوا۔ محمود اُس کی طاقت کو ایک بار پھر کچلنے کے لیئے ۱۰۰۱ء میں دس ہزار فوج لے کر حملہ آور ہوا جے پال بھی مقابلے کے لیے پشاور پہنچا اس کی فوج میں تیس ہزار پیدل سپاہی بارہ ہزار سوار تین سو جنگی ہاتھی تھے لیکن پھر بھی اُسے شکست ہُوئی اور جے پال خود بھی گرفتار ہو گیا۔ حسب سابق اُس نے خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور رہائی پائی۔ لیکن لاہور پہنچ کر وہ شرم کے مارے چتا میں بیٹھ کر جل مرا اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا اننگ پال یا آنند پال تخت و تاج کا وارث ہوا۔ اِس دوران میں سلطان محمود نے بھیرہ اور ملتان کو زیر کیا۔

ملتان پر حملہ ۱۰۰۵ء:۔ ملتان محمد بن قاسم کے زمانے میں سندھ کا ایک صوبہ تھا۔ عربوں کا اقتدار کمزور ہونے پہ اس صوبے میں الگ خود مختار ریاست قائم ہو گئی۔ ریاست ملتان کے خود مختار حاکم بھی

عرب تھے اور قرامطی عقاید رکھتے تھے۔ قرامطی شیعہ تھے اور اسمٰعیلی فرقہ کی ایک شاخ تھے۔ یہ لوگ یوم قیامت کے منکر اور مسئلہ تناسخ کے قائل تھے۔ قرامطی فرقہ کے لوگ عباسیوں کی خلافت کو تسلیم نہ کرتے تھے محمود کے زمانے میں ملتان کا حکمران ابوالفتح داؤد تھا۔ اس نے غزنی سلطنت سے روائتی دوستی ترک کردی اور بھیرہ کے راجہ سے مل گیا چنانچہ سلطان محمود نے بھیرہ کی تسخیر کے بعد ملتان پر حملہ کیا۔ ابوالفتح داؤد کو شکست ہوئی اور اس نے خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن محمود نے اُسے مجبور کیا۔ کہ وہ قرامطی عقاید سے توبہ کرے۔ محمود کا خیال تھا۔ کہ یہ عقائد غیر اسلامی ہیں۔ سلطان محمود نے ملتان کے سوائے (جو قرامطی عقائد کے باوجود مسلمان کہلاتا تھا) کسی حکمران کے مذہبی عقاید میں دخل نہ دیا۔

انندپال حاکم پنجاب پر حملہ 1008ء:۔ سلطان محمود کا چھٹا حملہ پنجاب کے ہندو راجہ اننگ پال یا انند پال پر تھا۔ محمود اننگ پال کی سازشوں سے بیزار تھا اور مشرقی سرحد پر امن وامان قائم کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے اننگ پال پر حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اننگ پال نے تمام ہندو راجاؤں سے ایک عظیم الشان اتحاد کرلیا اور دہلی۔ قنوج۔ گوالیار۔ کالنجر اور اُجین کے راجہ اپنی فوجوں سمیت اننگ پال کی مدد کو آئے پشاور کے قریب حضرو کے میدان میں دونوں فوجیں ایک ماہ سے زیادہ ایک دوسرے کے سامنے ڈیرے ڈالے پڑی رہیں۔ سرحدی علاقے کا غیر مسلم کھوکھر قبیلہ بھی اننگ پال سے آملا اور یہ معرکہ یوں معلوم ہوتا تھا گویا کفر اور اسلام کی جنگ ہے جنگ شروع ہونے پر

گھمسان کا رن پڑا اور سلطان محمود کی فوج کے پاؤں اُکھڑنے ہی والے تھے۔ جب کہ اننگ پال کا ہاتھی بدک کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا اُس کی فوج یہ سمجھی کہ ہندوؤں کو شکست ہو گئی ہے۔ لہٰذا کافروں کی لاتعداد فوجیں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیں اور ہندوؤں کو شکستِ فاش ہوئی۔ حضرو کی لڑائی برّصغیر ہند و پاکستان کی اہم ترین لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس فتح کی بدولت ہندوؤں کی کمر ٹوٹ گئی۔ بعد ازاں ان کو کبھی اتحاد نصیب نہ ہوا اور سلطان محمود کو بے انتہا مالِ غنیمت ملا۔ حضرو کا میدان اٹک کے شمال میں ہے۔ اننگ پال اِس شکست کے بعد گمنامی کی موت مرا۔ پنجاب میں ہندوؤں کی طاقت اگرچہ کچل دی گئی۔ لیکن سلطان محمود نے اننگ پال کے لڑکے تری لوچن پال کو پنجاب کا باجگذار راجہ رہنے دیا۔

مختلف حملے - محمود کا ساتواں حملہ ۱۰۰۹ء میں نگرکوٹ پر تھا جسے آج کل کانگڑہ کہتے ہیں۔ اِس علاقے میں جوالا مندر کی دولت لا انتہا تھی اور ریاست میں کانگڑہ۔ جالندھر اور ہوشیار پور کا تمام علاقہ شامل تھا۔ کانگڑہ کا قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر تھا اور اُسے فتح کرنا ایک دشوار امر تھا۔ لیکن محمود نے تین دن کی جنگ کے بعد کانگڑہ کے قلعے کو فتح کر لیا۔ کانگڑے کے مقدّس مقامات یعنی مندروں سے محمود کو بے اندازہ دولت ملی۔ سلطان محمود کا نواں حملہ ۱۰۱۴ء میں تھانیسر پر ہوا۔ راجہ لڑے بغیر بھاگ اٹھا اور محمود زر و مال سمیت کر غزنی لوٹ گیا۔ اس سال سلطان محمود نے کئی ایک راجاؤں کو مسخر کیا۔ اِس کا گیارھواں حملہ کشمیر پر تھا۔ یہ حملہ ۱۰۱۵ء میں ہوا۔

اس حملے کی وجہ یہ تھی کہ سلطان محمود کشمیر کے راجہ سنگرام کی گوشمالی کرنا چاہتا تھا کیونکہ اُس نے محمود کے دشمنوں کی مدد کی تھی۔ سلطان محمود نے کشمیر میں داخل ہوتے ہی راجوری کے مضبوط قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن قلعہ فتح ہونے سے پہلے شدید برفباری شروع ہو گئی اور محمود قلعہ بغیر فتح کئے واپس ہوا۔ پہاڑی علاقے میں راستہ بھول جانے سے محمود کی فوج کا بیشتر حصہ تلف ہوا۔ محمود نے ایک بار پھر ۱۰۲۱ء میں کشمیر پر حملہ کیا لیکن وہ پھر بھی اس ریاست کو فتح نہ کر سکا۔

سلطان محمود نے ۱۰۲۰ء میں کالنجر کے راجہ گنڈا یا نندا پر حملہ کیا۔ اس راجہ نے قنوج کے راجہ راجیہ پال پر حملہ کر کے اُسے قتل کر ڈالا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ گنڈا اس بات پر ناراض تھا کہ راجیہ پال نے لڑے بغیر محمود کی اطاعت کیوں قبول کی ہے۔ گنڈا کی سرکردگی میں بہت سے ہندو راجہ ایک بار پھر متحد ہو گئے۔ کالنجر، گوالیار اور قنوج کی فوجوں کے علاوہ پنجاب کے راجہ ترہی لوچن پال نے محمود کی اطاعت و وفاداری کا جوا اپنی گردن سے اُتار پھینکا۔ اس سے پہلے اُس کے باپ دادا نے بھی بار بار محمود سے نبرد آزمائی کی تھی۔ لیکن ہمیشہ منہ کی کھائی تھی۔ سلطان محمود نے وقت ضائع کئے بغیر دریائے سندھ کو عبور کیا۔ لیکن راجہ ترہی لوچن پال بغیر لڑے بھاگ اُٹھا محمود نے اُس کا تعاقب کیا اور راہب کے قریبی برساتی نالے کے کنارے اُس کی فوجوں کو جا لیا۔ ترہی لوچن پال کو شکست ہوئی اور اُس نے بھاگ کر کالنجر کے راجہ کے ہاں پناہ لی۔ اس کے بعد سلطان محمود نے کالنجر پر حملہ کیا۔ راجہ گنڈا اور اُس کے حلیفوں کی فوج تقریباً دو لاکھ تھی اور

اُس میں 650 جنگی ہاتھی بھی تھے۔ محمود اس لشکرِ جرّار کو دیکھ کر گھبرا گیا لیکن خدا پر بھروسہ کر کے سہ پہر کے قریب فوراً جنگ شروع کر دی رات پڑنے پر لڑائی بند ہوئی لیکن ہندوؤں کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ چنانچہ ہندوؤں کا ہیرو راجہ گنڈا تمام فوج سمیت رات کی تاریکی میں بھاگ گیا اور بے شمار مالِ غنیمت محمود کے ہاتھ لگا۔ محمود نے راجہ گنڈا کا تعاقب نہ کیا کیونکہ وہ اپنے ملک سے کافی دور نکل آیا تھا اور وسطِ ہند کے جنگلوں میں دشمن کا پیچھا کرنا مناسب بھی نہ تھا۔ چنانچہ کالنجر کی دولت سمیٹ کر محمود واپس لوٹا اور غزنی جا پہنچا۔

— پنجاب کا الحاق:۔ ۱۰۲۱ء میں محمود نے پنجاب کو اپنی سلطنت سے ملحق کرنے کی ٹھانی تاکہ ہندو شاہی خاندان اُس کے خلاف بار بار سازشیں نہ کرے۔ اِس وقت تری لوچن پال کا لڑکا بھیم پال لاہور کا راجہ تھا۔ موسم سرما میں محمود نے اُس پر حملہ کیا۔ اس ملک پر یہ اس کا چودھواں حملہ تھا۔ بھیم پال شکست کھا کر اجمیر کے راجہ کے پاس پناہ گزیں ہُوا اور چند سالوں کے بعد وہیں مر گیا۔ محمود نے اِس فتح کے بعد پنجاب کا الحاق غزنی سلطنت سے کر لیا۔ چنانچہ محمود کی اولاد تقریباً ڈیڑھ سو سال تک پنجاب پر حکمران رہی یہاں یہ بات یاد رہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں پر حملہ کرنے کے لیئے پنجاب کا الحاق از حد مفید ثابت ہُوا کیونکہ محمود کی فوجوں کو سستانے کا موقع مل جاتا تھا اور ہر قسم کی جنگی تیاری کی تکمیل ہو جاتی تھی۔

گوالیار و کالنجر کی تسخیر:۔ ۱۰۲۳ء میں محمود نے کالنجر پر حملہ کیا کیونکہ راجہ گنڈا دوبارہ فوجی تیاریاں کر رہا تھا۔ راستے میں محمود نے گوالیار کے قلعے کا محاصرہ کیا کیونکہ یہاں کا راجہ کالنجر کے راجہ کا باجگذار اور حلیف تھا۔ گوالیار کے راجہ نے تحفے تحائف دے کر صلح کر لی اور محمود نے بڑھ کر کالنجر کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ ہندوستان پر یہ اُس کا پندرھواں حملہ تھا۔ راجہ گنڈا نے صلح کی درخواست کی۔ محمود کی تعریف میں ہندی اشعار بھیجے اور تین سو ہاتھی نذر کیئے۔ محمود نے صلح کی درخواست قبول کی اور خرم و شاداں غزنی واپس لوٹا۔

سومناتھ پر حملہ:۔ ۱۰۲۵ء میں محمود نے ہندوؤں کے اہم ترین شہر سومناتھ پر حملہ کیا۔ یہ اُس کا سولھواں حملہ تھا لیکن محمود کے مشہور ترین حملوں میں شمار ہوتا ہے سومناتھ میں ہندوؤں کا اہم ترین مندر تھا۔ جس کی دولت کی دھاک دُور دُور تک تھی۔ سومناتھ کا شہر جہاں یہ مشہور مندر تھا۔ کاٹھیاواڑ میں تھا اور یہاں شوجی کی پُوجا ہوتی تھی۔ مندر کیا تھا گویا ایک قلعہ تھا اور اُس میں کئی ایک بُت اور مجسّمے تھے۔ شوجی کا بُت بہت بڑا تھا اور مندر کی گھنٹیاں بیس من وزنی سونے کی زنجیروں سے بندھی ہوئی تھیں۔ پانچ سو دیو داسیاں شولنگ کے سامنے ناچ کر کے اُسے خوش کرتی تھیں۔ مندر کی دیواروں میں بھی جواہرات لگے ہوئے تھے اور ہر وقت مندر جگمگ جگمگ کرتا رہتا تھا۔ مورّخین کا خیال ہے کہ سومناتھ کی دولت سلطان محمود کے حملے کا باعث ہوئی۔ لیکن اصلی بات یہ ہے کہ شوجی کی پُوجا اور سومناتھ کے مندر کے متعلق عجیب و غریب

قصے مشہور تھے نیز شو ہندوؤں کا اہم ترین دیوتا تھا اور ہندوؤں کا خیال تھا کہ محمود نے اگر سومناتھ پر حملہ کیا تو منہ کی کھائے گا۔ لہٰذا سلطان محمود نے بتوں کی عظمت ختم کرنے کی ٹھانی اور 17 اکتوبر 1025ء کو غزنی سے روانہ ہوا۔ اس کے اپنے لشکر کے علاوہ ترکستان خراسان اور غزنی کے تیس ہزار رضاکار بھی ساتھ ہو گئے یہ لوگ مجاہد تھے لیکن ہندو مورّخ ان کو "راستے کے لٹیرے" کہتے ہیں۔ جیسلمیر اجمیر اور پٹن کے راستے محمود نے سومناتھ کا رُخ کیا۔ راستے میں راجپوتانے کے صحرا کو بھی عبور کیا۔ ہر فوجی کو حکم دیا گیا کہ گھوڑوں کے لیے چارہ۔ اپنے لئے چند دن کی خوراک اور کافی مقدار میں پانی لازمی طور پر اپنے ساتھ رکھ لیا جائے۔ اِس کے علاوہ تیس ہزار اونٹوں پر پانی اور رسد لادا گیا اور لشکر کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ محمود کی فوج نے آسانی سے راجپوتانے کے صحرا کو عبور کیا اور وہ 6ر دسمبر 1025ء کو سومناتھ جا پہنچا۔ ہندوؤں نے یہاں ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کئی دن تک خونریز جنگ ہوتی رہی۔ آخرکار مسلمانوں کو فتح ہوئی اور محمود نے مندر کی بے اندازہ دولت کو سمیٹا۔ شولنگ کو بھی محمود نے توڑ دیا۔

شو جی کے بت کے بارے میں آج تک کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ یہ بُت پتھر کا تھا۔ بعض مورّخ غلطی سے اِس کو سونے کا کھوکھلا بت تصوّر کرتے ہیں۔ عوام میں یہ مشہور ہے کہ برہمنوں نے اس بُت کو بچانے کے لئے بہت سا مال محمود کی خدمت میں پیش کیا...... لیکن اس نے کہا میں بُت شکن ہوں بت فروش نہیں۔ یہ کہہ کر گُرز

مارا اور بُت کے ٹکڑے کر ڈالے۔ بُت کے اندر سے بے شمار زر و جواہر نکلے اور دولت کی اس فراوانی کو دیکھ کر محمود حیران رہ گیا۔ اصلی بات یہ ہے کہ اس مندر میں شولنگ کی پوجا ہوتی تھی۔ لنگ آلۂ تناسل کو کہتے ہیں۔ اور اُس بُت کی شکل و صورت لمبوتری تھی۔ محمود کب گوارا کرسکتا تھا۔ کہ فتح شدہ مندر میں یہ اخلاق سوز شکل موجود رہے اور ہندوؤں کے مشرکانہ خیالات قائم رہیں۔

سومناتھ کے متعلق تمام کہانیاں لوگوں نے محض عقیدت مندی کی بنا پر گھڑلی ہوئی ہیں۔ سومناتھ کی فتح کی بدولت مسلمان عوام آج تک سلطان محمود کو مجاہد۔ غازی اور قومی ہیرو تصوّر کرتے ہیں اور ہندو محمود کے نام سے بدکتے ہیں اور آج تک ہندوؤں کے دل میں اُس کے خلاف نفرت کے گہرے جذبات موجود ہیں۔

چند روز سومناتھ میں گذار کر سلطان محمود واپس ہُوا اور اپریل ۱۰۲۶ء میں سندھ سے گذر کر ملتان اور بھکّر کے راستے غزنی جا پہنچا۔ ملتان کے قریب سندھی جاٹوں نے حملے کر کے اُسے خوب ستایا اور مال و دولت لوٹنے کی کوشش کی۔

آخری حملہ ۱۰۲۷ء:۔ سومناتھ سے واپسی پر ملتان کے قریب سندھ کے جاٹوں نے سلطان محمود کو کافی پریشان کیا تھا اور شاہی زرو مال لوٹ لینے کی کوشش کی تھی لہٰذا ۱۰۲۷ء کے موسم سرما میں محمود جاٹوں

روایت ہے کہ سومناتھ کی فتح کے بعد غزنی میں مال و دولت کی اس قدر فراوانی تھی کہ زکوٰۃ لینے کے لئے کوئی غریب آدمی شہر بھر میں نہ ملتا تھا۔

کی گوشمالی کے لئے حملہ آور ہُوا۔ دریائے سندھ کے کنارے پہنچ کر سلطان محمود نے ایک زبردست جنگی بیڑا تیار کیا اور کشتیوں میں تیر اندازوں کے علاوہ آتش بار فوج بھی سوار کرائی۔ فوج کے بقایا حصّے کو دریا کے دونوں جانب خشکی پر کوچ کرنے کا حکم دیا اور جنوبی سندھ کی جانب روانہ ہُوا۔ جاٹوں نے بھی سلطان محمود کا مقابلہ کرنے کے لئے ۴ ہزار کشتیاں جمع کیں اور ایک زبردست بحری جنگ ہوئی محمود کے تیر اندازوں اور آتش باروں کی بدولت جاٹوں کو شکستِ فاش ہوئی اور بھاگنے والے جاٹوں پر سلطان محمود کی خشکی کی فوج نے حملہ کر کے اُن کو کچل ڈالا۔ اِس شکست کے بعد کافی عرصہ جاٹ سر نہ اٹھا سکے۔ جاٹوں کو قرار واقعی سزا دینے کے بعد سلطان محمود غزنی واپس چلا گیا۔

وفات۔ سندھ سے واپسی کے دوران میں سلطان محمود کو ملیریا ہو گیا اور یہ بخار اس قدر طویل ہُوا کہ محمود کی وفات تک بخار نے پیچھا نہ چھوڑا۔ شاہی طبیبوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور ہر قسم کا علاج معالجہ کیا۔ لیکن افاقہ نہ ہُوا آخرکار اِس بیماری نے سل اور دق کی صورت اختیار کی اور محمود چار سال بیمار رہنے کے بعد ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء کو راہی ملک عدم ہُوا۔ موت سے چند روز پہلے اُس کے حکم سے اُس کے خزانے کے تمام زر و مال اور جواہرات کو سجا کر اُسے دکھایا گیا۔ یہ تمام دولت دیکھ کر پاکباز سلطان کی آنکھوں کے سامنے دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پھر گیا۔ اور رقت چھا جانے کی بدولت آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ہندو مورخین نے

اس واقعہ کو متعصبانہ رنگ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود نے ہزاروں انسانوں کا کشت و خون کیا تھا اور صدہا شہروں اور مندروں کو برباد کرکے اس قدر دولت جمع کی تھی لہٰذا جب اسے چھوڑنے کا وقت آیا تو زر و مال کی حرص اور لالچ کی بنا پر پھوٹ کر رو دیا۔ ہندو مورّخ یہ نہیں سمجھتے کہ دین دار لوگ آخری وقت قریب آنے پر خدائے تعالیٰ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور دنیا کی بے ثباتی کو یاد کرکے اُن پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔

سلطان محمود کا کیریکٹر (کردار)

۱۔ سلطان محمود دنیا کے عظیم الشان جرنیلوں کی صفِ اوّل میں شمار ہوتا ہے۔ اُس کی فوجی قابلیت اور ذہانت بے مثال اور خداداد تھی۔ وہ بچپن سے ہی تلواروں کے سائے میں پل کر جوان ہوا تھا اور دشمن کی چالوں کو خوب سمجھتا تھا۔ امیر سبکتگین بھی اپنے نوجوان بیٹے کی جنگی قابلیت کا معترف تھا۔ مشرق و مغرب کے تمام مورّخین اس بات پر متفق ہیں کہ سلطان محمود بہترین جرنیل اور نامور فاتح تھا۔

۲۔ سلطان محمود کا قد درمیانہ تھا۔ صحت نہایت اعلیٰ تھی۔ جسم خوب مضبوط اور اعضا متناسب تھے۔ لیکن اُس کی شکل و صورت کے بارے میں مورّخین میں زبردست اختلاف ہے۔ ابن جوزی اور بعض دوسرے مسلمان مورّخ یہ لکھتے ہیں کہ سلطان ازحد خوبصورت تھا اور اُس کا جسم متناسب (Graceful) تھا۔ اس

کی ٹھوڑی خوبصورت اور گول تھی جس پر تھوڑی سی ڈاڑھی تھی۔ لیکن اکثر مورخین یہ لکھتے ہیں کہ وہ خوبصورتی سے عاری تھا۔ فرشتہ اور نظام الملک طوسی یہ لکھتے ہیں۔ کہ وہ بدصورت تھا۔ اس کے درباری شاعروں نے اس کے حسن و جمال۔ سخاوت۔ بہادری اور حسن سیرت کی خوب تعریف کی ہے لیکن شاعروں کی لفاظی کو اہمیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ وہ محض خوشامد کی بنا پر بھی بدصورت انسان کو خوبصورت لکھ سکتے ہیں۔ عام طور پر یہ بھی مشہور ہے کہ سلطان محمود کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ لیکن چہرہ بدنما نہ تھا۔

۳۔ سلطان محمود خوش اخلاق۔ شائستہ اور سادہ مزاج تھا معمولی سپاہیوں کی مانند سفر کی تکالیف خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ اس کے عزم کو دیکھ کر سپاہیوں کے حوصلے بڑھ جاتے تھے۔ اور وہ بے جگری سے لڑتے تھے۔

سلطان محمود کی فوجی قابلیت مسلم تھی وہ دلاور جوان تھا اور ہمیشہ خدا پر پورا بھروسہ رکھتا تھا اس کی اولوالعزمی اور شجاعت کی تعریف دشمن اور دوست سبھی کرتے ہیں۔ سلطان محمود ہر مہم کا نقشہ خود تیار کرتا تھا۔ اور پھر کامیابی سے اپنی سکیم پر عمل کرواتا تھا رفتہ رفتہ محمود نے جنگی ہاتھیوں کو سدھایا تاکہ میدان جنگ میں ڈر کر بھاگ نہ اٹھیں۔ یہ بات اس کی جنگی ذہانت کی دلیل ہے۔ چنانچہ غزنی میں ہاتھیوں کے لئے ایک خاص اصطبل تھا۔ جس میں تیرہ سو جنگی ہاتھی تھے۔

۴۔ محمود از حد انصاف پسند اور سخی تھا۔ غریبوں اور مظلوموں

کی فریاد بہ نفس نفیس سن کر اُن کی شکایات کو دُور کرتا تھا۔ رفاہِ عام کے کاموں میں دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے غزنی میں کئی ایک عمارتیں۔ مدرسے حمام اور مسجدیں بنوائیں اس کے زمانے میں غزنی "عروس البلاد" کہلاتا تھا۔ ملک بھر میں امن و امان تھا اور لاہور سے لے کر خراساں تک تمام سڑکیں محفوظ تھیں۔ رعایا خوشحال تھی اور تجارت زوروں پر تھی محمود منڈیوں کا خاص طور پر احتساب کرتا تھا۔ تاکہ چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی سے عوام کو تکلیف نہ ہو۔ اس کے برعکس مشہور مؤرخ ہیں پول لکھتا ہے۔ کہ سلطان محمود نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لئے ذرہ بھر کوشش نہ کی لہٰذا اُس کے مرتے ہی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور بہت سے علاقے خود مختار ہو گئے۔ یہ رائے درست نہیں ہے اور اصلی واقعات کو نظر انداز کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان محمود اعلیٰ منتظم اور مدبر تھا۔ اُس کی سلطنت اگرچہ وسیع تھی اس ملک کے ہر کونے میں امن و امان اور شاہی دبدبہ قائم تھا لیکن اُس کے جانشین محمود کی مانند بیدار مغز نہ تھے۔ اور حکومت کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ اِس کے علاوہ غوریوں کے عروج نے غزنی خاندان کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ اِن واقعات میں محمود کے انتظام سلطنت کو کوئی دخل نہ تھا۔

۵۔ سلطان محمود خود شریعت کا پابند تھا۔ اور مذہب کا شیدائی تھا۔ لیکن مذہبی رواداری کا قائل تھا۔ اُس کی سلطنت میں غیر مسلموں اور ذمیوں کو مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل تھی۔ امن کے دنوں میں اُس نے کسی مندر کو نقصان نہیں پہنچایا جہاں لوگوں نے ہتھیار

ڈال دیئے وہاں بھی مندروں سے تعرّض نہ کیا۔ صرف اُن علاقوں کے مندروں کی دولت کو لوٹا جہاں لوگوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اِس زمانے میں ہندوستان کے مندر دولت سے مالا مال تھے۔ اور فوجی اڈے بھی تھے۔ سلطان محمود نے لیاقت اور قابلیت کی بنا پر غیر مسلموں کو اعلیٰ عہدے بھی دیئے۔ چنانچہ اس کی فوج میں سکھ پال۔ ناتش اور تلک نامی تین ہندو جرنیل تھے اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمود میں مذہبی تعصّب نام کو نہ تھا۔

۶۔ اکثر مورّخین نے سلطان محمود کو حریص اور لالچی لکھا ہے۔ مرتے وقت تمام زر و جواہر کو حسرت سے دیکھ کر رونے کے واقعہ پر ہم تنقید کر چکے ہیں۔ ہندو مورّخین نے اس سے غلط نتیجہ نکالا ہے۔ سلطان محمود کے حملوں کی نوعیت بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ وہ ایک زبردست فاتح تھا۔ لہٰذا اِس زمانے کے رواج کے مطابق فتح شدہ علاقے کی دولت سمیٹنا ہر طرح سے جائز بات تھی۔ اِس بنا پر اُسے حریص اور لالچی نہیں گِنا جا سکتا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایک جانب تو سلطان محمود کو سخاوت کا پتلا گِنا جاتا ہے اور دوسری جانب اُسے حریص اور لالچی۔ یہ دونوں صفات متضاد ہیں۔ لہٰذا سلطان محمود کے کردار کو جان بوجھ کر داغدار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اکثر مورّخین نے محمود کو حریص اور لالچی ثابت کرنے کے لئے فردوسی سے محمود کی وعدہ خلافی کی بے بنیاد کہانی گھڑلی ہوئی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان محمود نے فارسی زبان کے مشہور شاعر فردوسی کو شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی اور

ہر شعر کے عوض ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا۔
فردوسی نے کئی سالوں کی محنت کے بعد ساٹھ ہزار اشعار لکھ کر شاہنامہ مکمل کیا اور محمود کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وقت محمود نے بخل سے کام لے کر فردوسی کو صرف چاندی کے ساٹھ ہزار سکے یعنی درہم دینے چاہے۔ اس حرص و آز کو دیکھ کر فردوسی دل برداشتہ ہوا۔ رقم لینے سے انکار کیا۔ اور رنجیدہ ہو کر شاہی دربار سے چلا گیا۔ اور محمود کی ایک ہجو بھی لکھی۔ بعد میں محمود نے ساٹھ ہزار سونے کے سکے بھیجے۔ تو فردوسی وفات پا چکا تھا اور اس کی غیور بیٹی نے بھی یہ رقم لینے سے انکار کر دیا۔ موجودہ تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ فردوسی کے متعلق یہ کہانی بالکل بے بنیاد ہے۔ محمود کی تخت نشینی سے اٹھارہ سال پہلے فردوسی نے شاہنامہ اسلام لکھنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اسے ایران کی قدیم روایات کو زندہ کرنے کا شوق تھا۔ لہٰذا ہر شعر کے عوض ایک اشرفی دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ فردوسی نے شاہنامہ محمود کی فرمائش پر نہیں لکھا۔ البتہ محمود کے دربار سے وابستہ ہونے کے بعد شاہنامہ مکمل ہوا۔ فردوسی کئی برس محمود کا درباری شاعر رہا اور محمود نے دل کھول کر اُس کو کئی بار انعام و اکرام سے سرفراز کیا مشہور مورخ لین پول رقمطراز ہے کہ "عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ محمود جیسا فیاض سلطان جو علماء۔ فضلاء اور شعراء کو سالانہ دو لاکھ پونڈ کے وظائف عطا کرتا ہو اور جس نے غزنی میں بلند پایہ یونیورسٹی قائم کی۔ اور شہر کو خوب سجا بنا کر پر رونق بنایا اور جو عدل و انصاف میں بے مثال ہو فردوسی جیسے

بلند مرتبہ شاعر کے ساتھ اس قسم کا بخیلانہ سلوک کرے (یہ بات ممکن نہیں)،،

ہجو کے بارے میں علما کا خیال یہ ہے کہ بعض اشعار فردوسی کے لکھے ہوئے نہیں کیونکہ ان اشعار کی زبان بعد کے دور کی ہے دیگر اشعار فردوسی کے ہیں۔ لیکن شاہنامے کے مختلف مقامات سے اکھٹے کر لیئے گئے ہیں۔ محمود سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

علوم و فنون کی سرپرستی اور سلطان محمود کے دور کی کلچرل اہمیت

سلطان محمود محض ایک فاتح ہی نہیں تھا۔ بلکہ علوم و فنون کا سرپرست تھا اور اس کی علم پروری کی شہرت بہت دُور دُور تک تھی۔ اہل علم پر وہ خوب دل کھول کر انعام و اکرام کی بارش کرتا تھا۔ چنانچہ اُس کے دربار میں علماء۔ فضلاء اور شعراء کا جمگھٹ رہتا تھا۔ ایک مورّخ کا قول ہے کہ محمود کے دربار میں چار سو سے زیادہ شاعر اور اہل علم اصحاب موجود تھے۔ سلطان محمود نے ہر ممکن طریقے سے اہلِ قلم کو اپنے دربار میں لانے کی کوشش کی۔ وسطِ ایشیا میں اُس نے کئی ایک جنگیں محض اس لئے لڑیں کہ وہ کسی عالم کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ لیوی صاحب (LEVY) کا قول ہے۔ کہ "وہ اہل علم کا اغوا کنندہ تھا۔

"He was a great kidnapper of literarymen."

لیکن کئی بار کوشش کرنے کے باوجود حکیم بوعلی سینا اپنے پہلے آقا کو چھوڑنے پر رضامند نہ ہوا۔ اور محمود کو اس بات کا افسوس

رہا کہ یہ جیّد عالم اس کے دربار کی زینت نہ بن سکا۔
سلطان محمود نے فتوحات تو بے شمار کیں لیکن اس کی اصلی شہرت کا باعث اُس کی علمی و ادبی خدمات ہیں۔ اُس کا علمی شوق بے مثال تھا۔ اور علما کی قدردانی اس کے لئے باعث فخر ہے فتوحات کی نسبت اس کے دہر کی کلچرل اہمیّت زیادہ ہے اُس نے غزنی میں ایک بلند مرتبہ یونیورسٹی قائم کی۔ ہزاروں مکتب اور مدرسے بنوائے۔ غزنی کا شاہی کتب خانہ اور عجائب گھر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غزنی کے علما کو دو لاکھ پاؤنڈ سالانہ کے وظائف ملتے تھے اور خاص انعام و اکرام اس کے علاوہ ہوتے تھے۔ غزنی کا شہر دنیا بھر میں اسلامی تمدن کا مرکز گنا جاتا تھا۔ سلطان رعایا کے اخلاق کی نگرانی بھی کرتا تھا اور شہر غزنی ہر لحاظ سے اسلامی کلچر کا اہم مرکز تھا۔ سلطان محمود کے زمانے کے ممتاز علماء مندرجہ ذیل ہیں۔

البیرونیؒ :۔ ابوریحان البیرونی سلطان محمود کے باکمال علماء کا سرتاج تھا۔ اور چاردانگ عالم میں اس کی علمیّت کا شہرہ تھا البیرونی علم کے مختلف شعبوں کا ماہر تھا اور ہر فن مولا (Versatile genius) تھا ریاضی اور فلسفے میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ اور اعلیٰ پایہ کا نجومی اور ہیئت دان تھا۔ اُس نے تاریخ جغرافیہ۔ طبیعات اور علم کیمیاء پر بھی قابل قدر کتابیں لکھیں البیرونی کئی ایک زبانیں جانتا تھا۔ عربی۔ فارسی اور ترکی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی کا بھی ماہر تھا۔ اُس کی سب سے

مشہور کتاب تحقیق ہند ہے۔ جو در اصل ہندوستان کا سفر نامہ ہے۔ اسے کتاب الہند بھی کہتے ہیں۔ اس کتاب میں البیرونی نے ہندوانہ علوم کا حال بیان کیا ہے اور اُن پر اعلیٰ پایہ کی تنقید کی ہے۔ ہندوؤں کے رسوم کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ البیرونی نے یوں تو کئی ایک کتابیں تصنیف کیں لیکن اس کی ایک اور کتاب قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب قانون مسعودی کے نام سے مشہور ہے لیکن علم نجوم اور ہیئت پر مستند کتاب ہے اور سلطان محمود کے لڑکے مسعود کے نام پر معنون ہے۔ اسی لئے قانونِ مسعودی کہلاتی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف پر البیرونی کو شہزادے نے دولت سے مالا مال کر دیا۔

عتبی:۔ ابو نصر محمد عتبی مشہور مؤرخ تھا اور سلطان محمود کا سیکرٹری تھا۔ تاریخ یمینی اُسی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب علماء میں از حد مقبول ہے۔ اور اُس کی طرز تحریر بھی پسندیدہ ہے۔

ابوالعباس فضل بن احمد۔ سلطان محمود کا وزیر ابوالعباس سیاست میں خاص طور پر مشہور ہے۔ لیکن وہ ایک جیّد عالم اور عمدہ دبیر تھا۔ اس نے غزنی سلطنت میں فارسی زبان کو پہلی بار سرکاری زبان قرار دیا۔ یہ شخص فارسی زبان کا زبردست ہوا خواہ تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ فردوسی کو اِسی شخص کی کشش محمود کے دربار میں کھینچ لائی۔

اہم ترین شعرا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ صدہا شعرا محمود کے دربار سے وابستہ تھے۔ اُن میں فارسی زبان کا ہومر یعنی فردوسی بھی

تھا۔ جس نے ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی لکھی جو شاہنامۂ ایران کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب قدیم ایّام سے لے کر فردوسی کے دور تک کی منظوم تاریخ ہے اور اِس کتاب کا مقصد ایران کی قدیم روایات کو زندہ کرنا ہے۔ فردوسی سے محمود کے سلوک کے قصّہ کے متعلّق ہم اس سے پہلے مکمل تنقید کر چکے ہیں۔ فردوسی کے علاوہ محمود کے مشہور ترین درباری شاعروں میں عنصری۔ عسجدی۔ فرخی منوچہری اور اسدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا نے محمود کی شان میں کئی ایک قصیدے لکھے ہیں۔ محمود کی وفات پر فرخی نے ایک دلگداز مرثیہ بھی لکھا۔ بعض قصاید سے اہم تاریخی معلومات بھی حاصِل ہوتی ہیں۔

مختلف علماء:۔ باکمال علما اور مشہور ترین اہل قلم میں سے حکیم فارابی محمود کے دور کا فلسفی تھا۔ بیہقی مشہور تذکرہ نویس تھا لیکن اُس کی تحریر شگفتہ تھی۔ لہٰذا وہ لطائف اور چٹکلوں کے لئے مشہور ہُوا۔ اُس کا اُستاد ابو نصر مشکال ایک بلند پایہ ادیب تھا اور اُس زمانے کا مورّخ بھی تھا اُس نے مقامات نامی ایک کتاب بھی لکھی محمود کے زمانے میں غزنی کا چیف جج (قاضی القضاۃ) ابو محمد عبداللہ بن تبسین فقہ۔ حدیث اور تفسیر کا زبردست عالم تھا۔

مقربین:۔ سلطان محمود کے ندیم اور مقرب بھی سلجھے ہوئے اور عالم اصحاب تھے۔ اُن میں سے محمود کے بچپن کا ساتھی ابوالقاسم احمد بن حسن میمندی شہرتِ خاص رکھتا ہے۔ فارسی اور عربی زبانوں کا ماہر تھا اور ہر دو زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ محمود کا ہمجولی بجائے

تھا۔ ابوالعباس کے بعد وزیر بنا۔ انتظام سلطنت میں خوب مہارت رکھتا تھا اور اعلیٰ سیاست داں تھا۔

سلطان محمود کے مقربین میں سے ملک ایاز کا نام مشرقی ادب میں ضرب المثل ہے۔ ابتدا میں محمود کا غلام تھا۔ لیکن اپنے فضل و کمال کی بدولت مقرب خاص ہؤا ایاز حسن و جمال اور دانش مندی میں یکتائے روزگار تھا۔

عنصری۔ فرخی اور رونی نے ایاز کی مدح میں کئی ایک قصاید لکھے ہیں۔ عوام میں ایاز کے بارے میں کافی دلچسپ قصے رائج ہیں۔

مشہور مبلغین :۔ غزنوی حکمرانوں کے دور میں کئی ایک مبلغ اور صوفی برصغیر ہند و پاکستان میں تشریف لائے اور انہوں نے پُرامن طریقے سے اسلام کا نور یہاں پھیلایا۔ ان بزرگوں کی کوششوں سے ہزاروں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ مبلغین میں سے سب سے اوّلین ہستی حضرت اسمٰعیل لاہوری تھے جو سیّد تھے اور بخاری کہلاتے تھے ان کا زہد اور تقویٰ ضرب المثل تھا۔ حضرت اسمٰعیل بخاری علوم و فنون میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ محدث اور مفسر بھی تھے۔ ۱۰۰۵ء میں لاہور آئے۔ لاہور میں اُن دنوں اننگ پال حکمران تھا اور سلطان محمود کا باجگذار تھا۔ آپ کا مزار ہال روڈ پر عیسائیوں کے گرجے کے قریب ہے اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ معمولی سا مزار اس مرد مومن کا ہے جس نے پہلی بار کفرستان میں کلمۂ حق کا اعلان کیا اور مغربی پاکستان کے پایہ تخت کو پاک لوگوں کی سرزمین بنایا۔

حضرت فخرالدین حسین زنجانی ایک مشہور مبلغ تھے جو اپنے مرشد کے

علم پر لاہور تشریف لائے۔ اُن کا مزار چاہ میراں لاہور میں واقع ہے
آپ حضرت مخدوم علی ہجویری کے پیر بھائی تھے اور جب علی ہجویری
لاہور پہنچے تو حضرت فخرالدین حسین کا انتقال ہو گیا۔

مخدوم علی ہجویری کا مزار بھی لاہور میں ہے آپ داتا گنج بخش رح
کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کے متعلق یہ بات غلط مشہور ہے کہ
آپ سلطان محمود کی فوج کے ساتھ لاہور آئے اور یہاں تالیف و
تصنیف اور تبلیغ میں مصروف رہے۔ دراصل علی ہجویری سلطان محمود
کی وفات کے بعد یعنی سلطان مسعود کے زمانے میں محض تبلیغ
کے لئے لاہور تشریف لائے۔ یہاں انہوں نے درس و تدریس کا
سلسلہ بھی شروع کیا۔ اور اپنے درس کے لئے ایک مسجد بھی تعمیر کی
آپ کی کتاب کشف المحجوب اسلامی تصوف میں سند مانی جاتی ہے۔

Typical Questions

Q. 1. Discuss the importance of Mahmud of Ghazni's reign in the cultural history of Indo-Pakistan.

Q. 2. Discuss Sultan Mahmud's principal invasions of India. State their nature and importance.

Q. 3. " Mahmud of Ghazni was a great King." Discuss.

Q. 4. Briefly discuss the character and achievements of Sultan Mahmud of Ghazni.

Q. 5. Give a character sketch of Mahmud of Ghazni as a military general, patron of arts and learning, and an empire builder.

Q. 6. Describe briefly the career and character of Mahmud of Ghazni. How does he stand comparison with Muhammad Ghauri ?

Q. 7. Give an account of three most important invasions of Sultan Mahmud Ghazni. Compare his invasions with those of Muhammad Ghauri with regard to their nature and results.

Q. 8. Discuss the importance of Sultan Mahmud of Ghazni and of his reign in the cultural history of Islam.

Q. 9. Write short notes on :—

(*a*) Albiruni.
(*b*) Ayyaz.
(*c*) Ali Hajveri.

Q. 10. What were the aims of the invasions of Mahmud of Ghazni? Describe some of his most important invasion.

امتحانی سوالات

1- برصغیر ہندو پاکستان کی کلچرل تاریخ میں سلطان محمود غزنوی کے عہد حکومت کی اہمیت کیا ہے؟

2- ہندوستان پر سلطان محمود کے اہم حملوں کا حال بیان کیجئے۔ ان حملوں کی نوعیت اور اہمیت کیا ہے؟

3- "سلطان محمود غزنوی ایک ممتاز شہنشاہ تھا" تبصرہ کیجئے۔

4- سلطان محمود غزنوی کے خصائل قلمبند کیجئے اور اس کے کارناموں کا حال بیان کیجئے۔

5- سلطان محمود غزنوی کے کردار کو بیان کرتے ہوئے مندرجہ ذیل

عنوانات قائم کیجئے:-

(ا) بہ حیثیت جرنیل (ب) علم و ادب کا سرپرست (ج) سیاستدان اور بانی سلطنت۔

۶- محمود غزنوی کی زندگی کے مختصر حالات لکھ کر اُس کے خصائل واضح کیجئے۔ اور اس کا مقابلہ محمد غوری سے کیجئے۔

7- سلطان محمود غزنوی کے تین اہم حملوں کا حال بیان کیجئے۔ نوعیت اور نتائج کے لحاظ سے اُس کے حملوں کا محمد غوری سے مقابلہ کیجئے۔

8- سلطان محمود کے عہد حکومت کی اہمیت اسلامی کلچر کی تاریخ میں واضح طور پر بیان کیجئے۔

۹- مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھئے:-

(ا) البیرونی (ب) ایاز (ج) حضرتِ مخدوم علی ہجویریؒ۔

۱۰- سلطان محمود غزنوی کے حملوں کی نوعیّت بیان کرتے ہوئے اُس کے اہم ترین حملوں کا حال قلمبند کیجئے:-

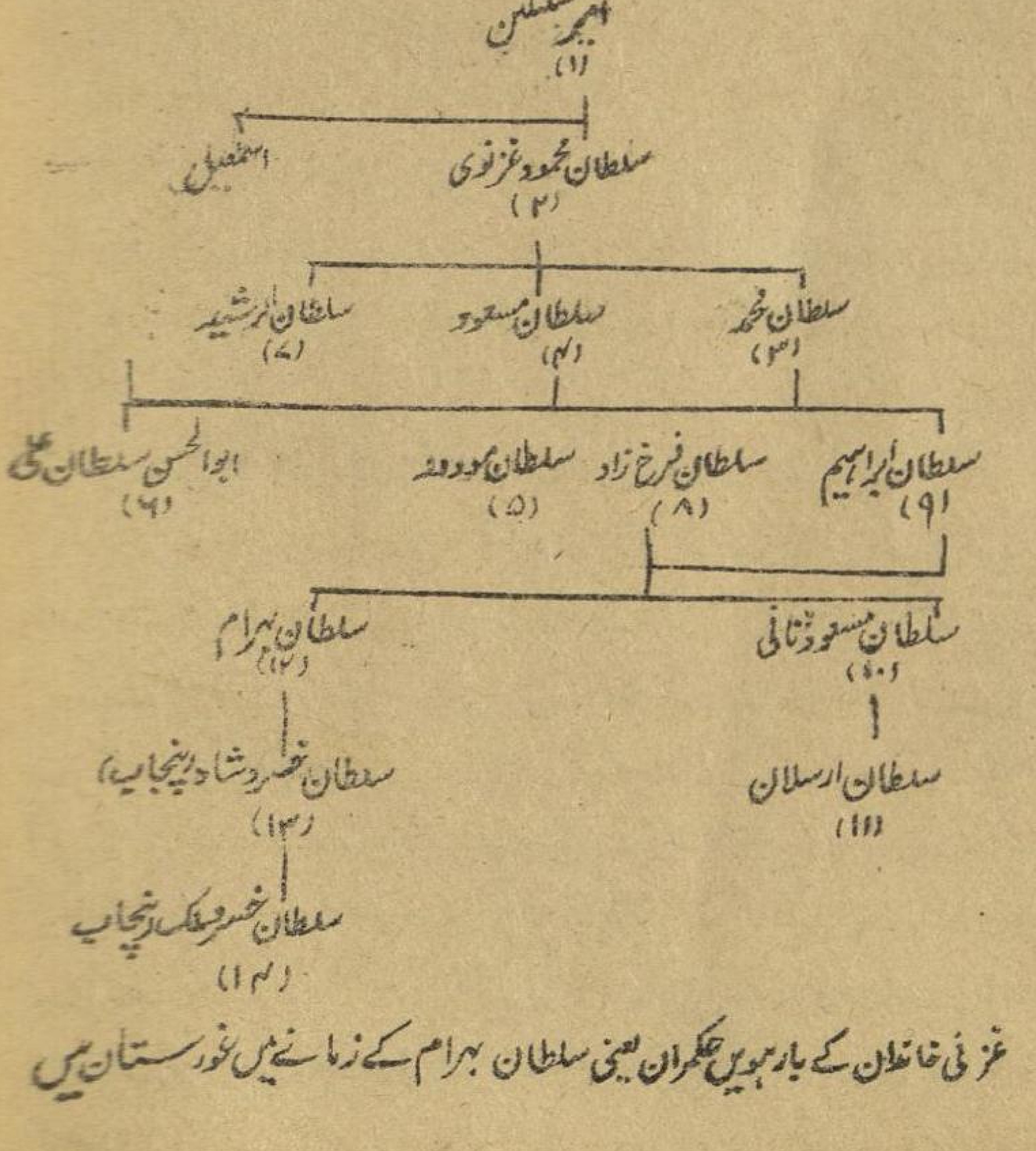
انیسواں باب

غوری خاندان یا آلِ شنسب

زمانہ قدیم سے غور کے علاقے میں نیم آزاد مقامی سردار حکمران تھے۔ غور کا علاقہ غزنی اور ہرات کے درمیانی حصے کو کہتے ہیں اور فیروز کوہ غوری سرداروں کا صدر مقام تھا۔ ان سرداروں میں شنسب نامی پہلا شخص تھا جس نے اسلام قبول کیا لہٰذا غوریوں کو بعض مورخ آل شنسب بھی کہتے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۱۰ء میں غورستان کو فتح کیا تھا لیکن باجگذاری کی شرط پر مقامی سرداروں کو برقرار رکھا تھا۔ بعد ازاں ان ہی غوری سرداروں کے ہاتھوں غزنوی سلطنت تباہ و برباد ہو گئی۔

سلطان محمود کی وفات پر اس کا لڑکا محمد تخت نشین ہوا لیکن صرف چار ماہ بعد اس کے بھائی مسعود نے اسے تخت سے اتار دیا اور اندھا کر ڈالا۔ لیکن سلجوقی ترکوں سے متواتر جنگ و جدل شروع ہو گئی اور وہ تخت و تاج نہ سنبھال سکا۔ دس سال کی حکومت کے بعد وہ سلجوقی ترکوں سے شکست کھا کر پنجاب کی جانب بھاگا لیکن اس کے چند سرکش فوجیوں نے اسے گرفتار کر کے سلطان محمد کے حوالے کیا جسے مسعود نے اندھا کر ڈالا تھا۔ یہ وقت سازشوں اور باہمی خانہ جنگی کا نہ تھا لیکن سلطان محمود کے تمام جانشین کمزور اور ناعاقبت اندیش ثابت ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خراسان اور ایران کے بعد تمام علاقے آہستہ آہستہ ان کے ہاتھوں سے نکل گئے اور غزنی کی سلطنت دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی۔ اگرچہ غزنوی سلاطین کی حکومت تقریباً ڈیڑھ سو سال تک رہی اور بعد میں ۱۱۸۶ء تک وہ پنجاب میں حکمران رہے لیکن تمام غزنوی شہزادوں میں سلطان محمود

جیسا منتظم اور نڈر جرنیل کوئی بھی پیدا نہ ہوا۔ محمد نے مسعود کو قتل ... کروا دیا اور اس کے بعد مودود بن مسعود غزنی میں بادشاہ بنا۔ اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے غزنوی خاندان کے کل چودہ سلاطین ہوئے۔ آخری دو بادشاہ خسرو شاہ اور خسرو ملک صرف پنجاب پر قابض تھے اور غزنی شہر اُن کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ غوری خاندان نے ۱۱۸۶ء میں خسرو ملک کو شکست دی اور غزنوی حکومت کو بالکل ملیا میٹ کر دیا۔ غزنوی سلاطین کا شجرہ نسب درج ذیل ہے:۔



غزنی خاندان کے بارھویں حکمران یعنی سلطان بہرام کے زمانے میں غورستان میں

قطب الدین غوری حکمران تھا۔ اس کی شادی بہرام کی لڑکی سے ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد غوری سردار غزنی پہنچا اور شاہی دربار میں رہنے لگا۔ لیکن قطب الدین اور اس کی بیوی میں ناچاقی ہوگئی۔ جب شدید اختلافات دور نہ ہوسکے تو سلطان بہرام نے اپنے داماد کو مروا ڈالا غزنوی سلطنت کو اس قتل کا خمیازہ بھگتنا پڑا کیونکہ دونوں خاندانوں میں گہری دشمنی پیدا ہوگئی۔ مرحوم سردار کے بھائی سیف الدین نے قطب الدین کا بدلہ لینے کے لئے غزنی پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ سلطان بہرام نے اسے بھی ذلیل کر کے قتل کروا ڈالا۔ اب اس کے چھوٹے بھائی علاؤ الدین نے انتقام کی ٹھانی اور زبردست جنگی تیاری کے بعد غزنی پر حملہ کیا۔ سلطان بہرام اس کے ہاتھوں شکست کھا کر پنجاب کی جانب بھاگا لیکن راستے میں ہی مرگیا۔ اس کا لڑکا خسرو شاہ پنجاب پہنچا اور لوگوں نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ عوام کو سلطان محمود کے نام سے عقیدت تھی۔ لہذا غزنوی نسل کے شہزادے خسرو شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا۔ اس وقت سے غزنی کا شہر غوریوں کے قبضے میں آگیا اور غزنوی خاندان کی وسیع سلطنت صرف پنجاب میں محدود ہوکر رہ گئی۔ علاؤ الدین غوری نے بھائیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے شہر غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور غزنوی دور کی ہر عمارت کو جلا ڈالا۔ مورخ اسے علاؤ الدین جہاں سوز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ علاؤ الدین نے ۱۱۶۱ء میں وفات پائی اور اس کے ایک سال بعد اُس کا لڑکا سیف الدین بھی وفات پا گیا۔ سیف الدین کی وفات کے بعد اُس کا بھتیجا غیاث الدین غوریوں کا امیر بنا۔ اُس کا لقب شمس الدین تھا۔ وہ خود تو علاقہ غور کی حکومت میں مصروف رہا لیکن غزنی کی حکومت اُس نے ۔۔۔۔۔ اپنے بھائی معز الدین محمد بن سام کو سونپی جس نے شہاب الدین کا لقب اختیار کیا۔ عام طور پر وہ محمد غوری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا اصلی نام معز الدین تھا۔ شہاب الدین محض اس کا لقب تھا۔ معز الدین محمد غوری اگرچہ نائب السلطنت تھا لیکن اُس کے

بڑے بھائی غیاث الدین نے اس پہ کامل اعتماد کیا اور اس کے کاموں میں کبھی دخل نہ دیا۔ محمد غوری نے برصغیر ہند و پاکستان پر گیارہ بار پے در پے حملے کئے اور ایک زبردست اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی لیکن وہ پھر بھی اپنے آپ کو غیاث الدین کا نائب ہی تصور کرتا تھا۔ غیاث الدین غوری تاریخ میں ملک الجبال کے لقب سے مشہور رہے۔ غوری خاندان کا شجرۂ نسب درج ذیل ہے:-

عزالدین حسین

شجاع الدین | شہاب الدین | علاؤ الدین جہاں سوز | قطب الدین (مقتول) | سیف الدین (مقتول) | فخر الدین مسعود (حاکم بامیان)

قطب الدین: سیف الدین | بہاؤ الدین سام

فخر الدین مسعود: شمس الدین محمد | حسام الدین

بہاؤ الدین سام: معز الدین محمد بن سام عرف محمد غوری (لقب شہاب الدین غوری) | سلطان غیاث الدین غوری (لقب شمس الدین)

سلطان غیاث الدین غوری نے ۱۲۰۳ء میں وفات پائی۔ چونکہ وہ لاولد تھا۔ اس لیے اُس کا بھائی شہاب الدین محمد غوری تخت و تاج کا وارث ہوا۔ بادشاہ بننے سے پہلے شہاب الدین محمد نے غوری سلطنت کو خوب وسعت دی تھی اور برصغیر ہند و پاکستان میں اسلامی سلطنت قائم کر چکا تھا۔ محمد غوری اعلیٰ جرنیل تو نہ تھا۔ لیکن وہ بلند پایہ سیاستدان تھا اگرچہ اسکی نرینہ اولاد نہ تھی۔ لیکن اُس نے کئی ایک ترکی غلاموں کو بیٹوں کی طرح پالا تھا اور ان کو اعلیٰ تربیت دی۔ چنانچہ اس کے غلاموں میں

سے کئی ایک ممتاز جرنیل پیدا ہوئے۔ دہلی سلطنت کا پہلا فرمانروا سلطان قطب الدین ایبک بھی اُس کا غلام تھا۔ بعد میں آزاد ہو کر امارت کے درجے پر پہنچا۔ اور پھر ہندی مقبوضات کا وائسرائے بنا۔ محمد غوری کی وفات کے بعد ہندوستان کا سلطان بنا۔

شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات

محمد غوری نے برِصغیر پر گیارہ بار پے در پے حملے کیے اور آخر کار اپنے عزائم میں کامیاب ہوا۔ یعنی پنجاب سے غزنی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور شمالی ہند کے بیشتر علاقے پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں اُس نے ہندوستان کے مختلف علاقے فتح کرنے کیلئے اپنے جرنیل مامور کئے جنہوں نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ اُس نے اپنی فتوحات کا سلسلہ ۱۱۷۵ء میں ملتان کی فتح سے شروع کیا۔ صوبہ ملتان میں قرمطی خاندان کے سردار حکمران تھے اور غزنوی تاجداروں کے باجگذار تھے۔ ملتان کی فتح کے بعد محمد غوری نے اُچ کے مشہور قلعے کو فتح کیا جو پنج ند کے بائیں کنارے واقع تھا اور بھٹی راجپوتوں کے قبضے میں تھا۔ ملتان اور اُچ اہم فوجی چھاؤنیاں تھیں اور ان مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد پنجاب پر آسانی سے حملہ ہو سکتا تھا لیکن محمد غوری عمدہ فوجی سکیمیں بنانے سے عاری تھا۔ کیونکہ وہ محمود غزنوی کی مانند خداداد فوجی قابلیت نہ رکھتا تھا۔ ملتان اور اُچ سے وہ صوبہ سندھ کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا اور تمام علاقہ فتح کرتے ہوئے ۱۱۸۲ء میں گجرات کاٹھیاوار جا پہنچا۔ لیکن انہلواڑہ کے راجہ مول راج سے شکست کھائی۔ اور پھر گجرات کا رخ نہ کیا۔ محمد غوری نے اگرچہ مول راج سے شکست کھائی لیکن سندھ اور ملتان پر اسکا مکمل قبضہ ہو گیا۔

پنجاب کی فتح: اس کے بعد محمد غوری نے پنجاب فتح کرنے کے ارادے سے لاہور پر تین متواتر حملے کئے۔ آخری یلغار سے پہلے محمد غوری نے پشاور اور سیالکوٹ

کی اہم فوجی چھاؤنیوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۱۸۶ء میں اس نے غزنوی خاندان کے آخری تاجدار خسرو ملک کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور پنجاب پر غوری خاندان کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ شمالی بھارت کو فتح کرنے کے لئے راجپوتوں سے نبرد آزما ہوا۔ بارہویں صدی میں ہندوستان میں کئی ایک خود مختار راجپوت ریاستیں تھیں۔ جن کا مختصر حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔ محمد غوری نے ایک ایک کر کے ہندو ریاستوں کو ختم کیا اور اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

ترائن یا تراوڑی کی پہلی جنگ

اس زمانے میں دہلی کی سلطنت کافی طاقتور تھی اور اس پر تومر یا تومار خاندان کے راجپوت حکمران تھے۔ یہ ریاست ۸۷۰ء میں راجہ اننگ پال تومر نے قائم کی تھی۔ تومر خاندان کے آخری راجہ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ اس کی ایک لڑکی اجمیر کے چوہان راجہ سے بیاہی گئی اور پرتھوی راج یا رائے پتھورا اس کا لڑکا تھا۔ جس کو نانا نے دہلی کی سلطنت بھی بخش دی۔ تومر راجہ کی دوسری لڑکی قنوج کے راجہ سے بیاہی گئی اور جے چند اسکی اولاد تھا۔ جے چند نے جب دیکھا کہ دہلی کی ریاست بھی پرتھوی راج کے قبضے میں آگئی ہے تو حسد کے مارے جل اٹھا اور بعد میں یہ رقابت گہری دشمنی کی صورت اختیار کر گئی۔

جے چند کی لڑکی سنجوگتا اور پرتھوی راج کے عشق کی داستان ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ جے چند نے پرتھوی راج کی دشمنی کی بنا پر محمد غوری کو دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ محمد غوری نے ۱۱۹۱ء میں سرہند کے سرحدی قلعے کو فتح کیا اور اس فتح کے ساتھ ہی پرتھوی راج سے جنگ چھڑ گئی۔ اس وقت محمد غوری کی جانب سے ملک ضیاء الدین تولک سرہند کے علاقے کا گورنر تھا۔

ترائن کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ محمد غوری کی فوج راجپوتوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پرتھوی راج کی فوج میں دو لاکھ

سوار اور تین ہزار جنگی رتھوں کے علاوہ ہاتھی بھی تھے۔ اس کا بھائی گوبند رائے بھی فوج میں شامل تھا۔ لیکن جے چند الگ کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔

گھمسان کی جنگ جاری تھی جبکہ محمد غوری اور گوبند رائے کا مقابلہ ہوا۔ محمد غوری نے نیزہ مار کر گوبند رائے کے سامنے کے دو دانت توڑ دئے۔ وہ جھنجھلا اٹھا اور اس نے تلوار کے وار سے محمد غوری کے کندھے کو بری طرح سے زخمی کر ڈالا۔ محمد غوری بیہوش ہو کر اپنے گھوڑے سے گرنے ہی والا تھا۔ جب کہ ایک خلجی غلام کود کر اس کے گھوڑے کے پیچھے جا بیٹھا اور محمد غوری کو اپنے بازوؤں میں تھام کر میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ اس پر محمد غوری کی فوج بھی بھاگ نکلی۔ شکست خوردہ فوج بڑی مشکل سے سرہند پہنچی۔ یہاں سے محمد غوری نے زخم کی مرہم پٹی کرائی اور غزنی چلا گیا۔ لیکن ہندوؤں کے ہاتھوں شکست کھانے پر بہت شرمسار تھا۔ محمد غوری کے بھاگ جانے پر پرتھوی راج نے سرہند کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ ملک ضیاءالدین نے تیرہ ماہ ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن محمد غوری کی جانب سے کوئی کمک نہ پہنچی۔ سامانِ رسد ختم ہو جانے پر مسلمان گورنر نے ہتھیار ڈال دیے اور سرہند بھی پرتھوی راج کے قبضے میں آ گیا۔ اس فوجی اڈے سے پرتھوی راج بآسانی پنجاب پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔

ترائن کی دوسری جنگ: محمد غوری نے اپنی ساکھ بحال کرنے کے لئے پرتھوی راج پر حملہ کیا۔ سال بھر وہ خوب جنگی تیاریاں کرتا رہا تھا اور میدان جنگ سے بھاگنے والے امراء کو اُس نے اچھی طرح سے ذلیل کیا تھا۔ بلکہ اُن کے منہ پر توبرے باندھ کر بازاروں میں گھمایا تھا۔ ۱۱۹۲ء میں وہ ایک زبردست فوج لے کر ترائن کے میدان میں پہنچ گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی فوج میں ایک لاکھ بیس ہزار جوان تھے۔ پرتھوی راج بھی باقی راجاؤں کی مدد لے کر مقابلے پر آ گیا۔ حسب سابق جے چند الگ کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ پرتھوی راج کی فوج ان گنت تھی۔

صرف جنگی ہاتھی تین ہزار تھے۔ اور سواروں کی تعداد تین لاکھ کے قریب تھی۔ جنگ خوب زور شور سے جاری تھی جبکہ پرتھوی راج ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کی فوج نے سمجھا کہ پرتھوی راج مارا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی فوج بھاگ اٹھی۔ گوبند رائے مارا گیا اور پرتھوی راج آخر کار بھاگ اٹھا لیکن سرسہ کے قریب گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ ترائن کی دوسری جنگ فیصلہ کن تھی۔ اس شکست نے ہندوؤں میں بددلی پھیلادی اور بعد میں وہ کبھی بھی مسلمانوں کے مقابلے پر جم نہ سکے۔ اس فتح کی بدولت اجمیر۔ ہانسی۔ سرسہ۔ ہریانہ اور شوالک کی پہاڑیوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس موقع پر محمد غوری نے قطب الدین ایبک کو اپنا وائسرائے مقرر کیا اور خود غزنی واپس لوٹ گیا۔ قطب الدین نہایت اعلیٰ جرنیل تھا اس نے بہت جلد میرٹھ۔ کول (علی گڈھ) اور دہلی کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔

چاندواڑا کی لڑائی ۱۱۹۳ء میں محمد غوری نے قنوج کے راجہ جے چند پر حملہ کیا۔ جمنا کے کنارے چاندواڑہ کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی اور جے چند شکست کھا کر میدان جنگ میں کام آیا۔ قنوج پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کے بعد محمد غوری نے بنارس پر بھی قبضہ جمایا اور ہندوؤں کی طاقت کو بالکل فنا کر دیا۔

اس کے بعد محمد غوری تو غزنی چلا گیا لیکن اس کے قابل جرنیلوں نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ اس کے وائسرائے قطب الدین ایبک نے یو۔پی۔سی۔پی اور گجرات کو فتح کر کے سلطنت کو وسعت بخشی۔ قطب الدین ایبک نے دہلی کو اسلامی سلطنت کا پایہ تخت بنایا اور اسی نسبت سے مغلوں کی آمد سے پہلے تمام مسلمان حکمران سلاطین دہلی کہلاتے ہیں۔

محمد غوری کے ایک اور جرنیل محمد بن بختیار خلجی نے بہار اور بنگال کو فتح کیا۔

اُس زمانے میں راجہ لکشمن سین بنگال کا راجہ تھا اور ندیا اس کا پایۂ تخت تھا۔ بختیار خلجی نے ندیا پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ اور راجہ گھبرا کر بھاگ اُٹھا تھا۔

۱۲۰۳ء میں سلطان غیاث الدین غوری فوت ہوا اور محمد غوری اپنے بھائی کی جگہ سلطان بنا۔ محمد غوری اپنے ہمسایہ ملک کے خوارزم شاہی حکمرانوں سے اُلجھ پڑا اور کئی بار شکست کھائی۔ ایک بار اُس کی شکست کے بعد غزنی کے شہر نے بھی سرکشی اختیار کر لی اور غزنی کے گورنر نے شہر کے دروازے بند کر دئے۔ ملتان پر ایک ترک غلام قابض ہو گیا۔ اور پنجاب میں کھوکھروں نے شورش بپا کر دی۔ ایسے نازک موقع پر صرف قطب الدین ایبک وفادار ثابت ہوا اور غزنی و ملتان کی شورش کو ختم کرنے میں اپنے آقا کو مدد دی۔ ان علاقوں پر دوبارہ اپنا تسلط جمانے کے بعد ۱۲۰۶ء میں محمد غوری کھوکھروں کی گوشمالی کے لیے آیا۔ کھوکھر جہلم اور کھیوڑہ کے درمیانی علاقے میں چھائے ہوئے تھے۔ محمد غوری نے قطب الدین ایبک کی مدد سے اُن کی اچھی طرح سے گوشمالی کی اور صدہا کھوکھر مارے گئے۔ چنانچہ اس کامیاب مہم کی خوشی میں لاہور میں ایک جشن منعقد ہوا اور محمد غوری نے برصغیر ہند و پاکستان میں قطب الدین ایبک کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اسی سال یعنی ۱۲۰۶ء میں جب محمد غوری غزنی واپس جا رہا تھا۔ تو جہلم کے قریب کسی کھوکھر سپاہی نے رات کے وقت سلطان کا خیمہ پھاڑ ڈالا اور چپکے سے اندر داخل ہو کر اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ محمد غوری کی لاش کو اُس کے اُمراء غزنی لے گئے۔ اور وہاں اُسے دفن کیا گیا۔ محمد غوری کی سلطنت کے مختلف حصوں پر اس کے جرنیل قابض ہو گئے۔

محمد غوری اور سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ۔

۱۔ محمد غوری خدا ترس۔ نیک دل۔ عادل اور مستقل مزاج سلطان تھا۔

وہ ہمیشہ باعمل اور صابر ثابت ہؤا۔ اُس نے ہر شکست اور ناکامی کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور مصائب کے باوجود کبھی ہمت نہ ہاری۔ محمد غوری بہادری اور شجاعت میں مشہور تھا لیکن محمود غزنوی کی طرح خداداد فوجی قابلیت نہ رکھتا تھا محمود غزنوی نے ہر میدان میں فتح و نصرت حاصل کی۔ اس کے برعکس محمد غوری نے نہ صرف پرتھوی راج سے شکست کھائی۔ بلکہ خوارزم شاہی حکمرانوں کے ہاتھوں اُسے پے درپے شکستیں ہوئیں۔ اس لحاظ سے محمود غزنوی بہت بہتر جرنیل ہے اور محمد غوری اُس کے مقابلے پر ہیچ ہے۔

(۲) محمد غوری عملی سیاستدان اور مدبر تھا۔ اس نے مشکل سے علاقوں کو فتح کیا لیکن مفتوحہ علاقے میں اسلامی سلطنت قائم کی۔ اس کے برعکس سلطان محمود آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح واپس چلا گیا۔ اس نے شاندار فتوحات کرکے خراج تحسین حاصل کیا۔ لیکن پنجاب کے سوا اس نے کہیں بھی اسلامی سلطنت کی بنیاد نہ رکھی۔ اس لحاظ سے محمد غوری محض فاتح اور جنگجو ہی نہیں بلکہ محمود غزنوی کی نسبت بہتر سیاست دان ہے۔

(۳) سلطان محمود نے سترہ حملے کئے اور ہندوؤں کے مال و زر کو سمیٹ کر مفتوحہ علاقے باجگذاری کی شرط پر مقامی حکام کے پاس ہی رہنے دئے۔ محمد غوری نے نہ کسی مندر کو لوٹا اور نہ مال و دولت سمیٹنے کی فکر کی۔ بلکہ ہر فتح شدہ علاقے پر مستقل قبضہ جمایا۔ پس دونوں حکمرانوں کے حملوں کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔

(۴) محمود غزنوی علم وادب کے آسمان پر ایک درخشاں چاند ہے۔ کئی سو شاعر۔ ادیب۔ مؤرخ۔ فقہ دان اور محدث اس کے دربار کی زینت تھے اس نے علوم و فنون کو خوب ترقی دی۔ غزنی میں اعلیٰ پایہ کی ایک یونیورسٹی قائم کی اور اسلامی کلچر کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔ اس کے برعکس محمد غوری کے

زمانے میں علم و ادب کا شہرہ نہ تھا۔ علمی اعتبار سے اُس کا عہد حکومت بالکل بنجر ہے۔
۵۔ محمد غوری لاولد فوت ہوا اور اس کے فوراً بعد غوری خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔
لیکن اُس کے ترکی غلام اُس کے وارث ہوئے اور اس کے اپنے الفاظ میں اس کا ہر غلام بیٹے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس کے غلاموں میں یلدوز، بختیار خلجی اور قطب الدین ایبک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے برعکس محمود غزنوی کی اولاد اس کی وفات کے بعد ایک سو سال سے زیادہ عرصے تک حکمران رہی۔

نتیجہ:۔ پس یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ محمد غوری ایک معمولی جرنیل تھا۔ محمود اس کے مقابلے پر اعلیٰ فوجی قابلیت کا مالک تھا۔ محمد غوری ایک دوراندیش سیاست دان تھا۔ اس نے مفتوحہ علاقوں میں مستقل اسلامی سلطنت قائم کی۔ محمود محض فتوحات کرنے اور دولت سمیٹنے پر اکتفا کرتا تھا۔ لہذا محمد غوری کی فتوحات کے نتائج پائیدار ثابت ہوئے۔

ہندوؤں کی شکست کے اسباب

راجپوت اگرچہ بہت بہادر اور جنگجو تھے لیکن تقریباً ہر معرکے میں اُن کو مسلمان حملہ آوروں سے شکست ہوئی۔ لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی پے در پے فتوحات اور ہندوؤں کی شکست کے اسباب کیا تھے۔ ہندوؤں کے پاس سازوسامان بھی زیادہ ہوتا تھا اور ان کی فوج بھی مسلمانوں کے مقابلے پر کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ لیکن ہر بار فتح و نصرت نے مسلمانوں کے قدم چومے اور ہندوؤں کی سطوت خاک میں ملی۔ مورخین نے مسلمانوں کی کامیابی کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کی ہیں۔

۱۔ جذبہ جہاد: مسلمانوں کی کامیابی کا اہم ترین راز اُن کا مذہبی جوش اور خلوص تھا۔ وہ جذبہ جہاد سے سرشار تھے اور میدان جنگ میں خندہ پیشانی سے شہادت کے طلب گار تھے۔ اگر مسلمان سپاہی زندہ بچ نکلتے۔ تو غازی کہلاتے ورنہ بہشت جاودانی کے مستحق ہوتے تھے۔ اس کے برعکس ہندو محض مادہ پرست تھے۔ اور کوئی روحانی فائدہ اُن کو جنگ کی جانب کھینچ کر نہ لاتے تھے۔ وہ محض اپنے نام و نمود اور ملکی بچاؤ کے لیے لڑتے تھے۔ مذہبی جذبے کی بدولت مسلمان بڑی بے جگری سے لڑتے تھے۔

۲۔ آب و ہوا کا فرق: مسلمان حملہ آور سرد علاقوں کے رہنے والے تھے اور پہاڑی زمینوں میں جفاکشی کے عادی تھے۔ لہذا وہ ہندوستانیوں کی نسبت جسمانی طور پر بہتر تھے۔ راجپوت چونکہ گرم مرطوب آب و ہوا میں پلے تھے لہذا وہ حملہ آوروں کی مانند تنومند نہ تھے۔ جسمانی صحت کی برتری اکثر فتح کا باعث ہوگی۔

۳۔ ذات پات: ہندوں میں ذات پات کے بندھن بہت گہرے تھے۔ جس کی بدولت حب الوطنی اور ملکی دفاع کا جذبہ مفقود ہو چکا تھا کیونکہ عوام کا مذہبی یقین یہ تھا کہ جنگ و جدل محض کھشتریوں کا فرض ہے۔ لہذا ہندوؤں کا صرف ایک طبقہ دشمن سے جنگ کرتا اور باقی لوگ الگ تھلگ رہتے۔ نیز نچلی ذات کے لوگوں نے مسلمانوں کی آمد کو بہتر سمجھا کیونکہ مسلمان رواداری کا سلوک کرتے تھے اور رعایا کے تمام افراد کو برابر حقوق دیتے تھے۔ مسلمانوں میں ذات پات یا اُونچ نیچ مفقود تھی۔ ان میں ہمیشہ نظم۔ تعاون اور اتحاد ہوتا تھا۔ وہ اپنے سالار کا حکم مانتے تھے۔ خواہ وہ غلام ہی کیوں نہ ہو۔

۴۔ راجپوتوں کے خصائل: ہرش کی وفات کے بعد سے لے کر مسلمانوں کے تسلط تک ہند و پاکستان میں راجپوتوں کا اقتدار تھا۔ یہ لوگ اگرچہ بلا کے

بہادر تھے اور جنگ و جدل ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا لیکن راجپوتوں کے بعض مخصوص خصائل تھے۔ جن کی بنا پر اُن کی طاقت کمزور ہو جاتی تھی اور مسلمانوں کے مقابلے پر اُن کو شکست ہو جاتی تھی۔ راجپوت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے تھے اور آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔ باہمی حسد اور رقابت کی بنا پر انہوں نے کبھی متحدہ محاذ پیش نہ کیا۔ نیز راجپوت قبائلی برتری کی بدولت کسی دوسرے قبیلے کے جرنیل کے ماتحت لڑنا اپنی توہین خیال کرتے تھے۔ لہذا ہندوؤں کی فوج کا ایک حصہ جب حملہ کرتا تھا۔ تو دوسرا چپکے کھڑا رہتا تھا۔ اس کے برعکس مسلمان فوج کا ہر سپاہی تندہی سے جنگ کرتا تھا۔ اُن میں یکسانیت اور وحدت تھی اور فوجی چالیں اس اتحاد کی بنا پر کارگر ہوتی تھیں۔

۵۔ جنگی ہاتھی:۔ ہندوؤں کی فوج جنگی ہاتھیوں پر بہت زیادہ بھروسہ کرتی تھی۔ جنگی ہاتھی یوں تو بڑے مفید تھے کیونکہ مسلمان اُن کے سامنے بے بس ہو جاتے تھے۔ لیکن شور و غل سے عین لڑائی کے دوران میں ہاتھی بدک کر دوڑ اٹھتے تھے اور اپنی ہی فوج کو روندتے ہوئے نکل جاتے تھے۔ ہاتھیوں کو بھاگتا ہوا دیکھ کر ہندوؤں کی فوج دل ہار دیتی تھی۔ اور فوج کی کثرت کے باوجود ہندوستانیوں کو شکست ہو جاتی تھی۔

۶۔ علاقائی فائدے:۔ مسلمانوں کو پہاڑی علاقوں سے ہر نازک موقع پر مزید تازہ دم فوج آسانی سے مل جاتی تھی۔ اور یہ لوگ ہمیشہ جنگ و جدل کے ماہر ہوتے تھے۔ ہندوستان کے عوام میں سوائے باقاعدہ فوج کے کوئی شخص لڑنا نہ جانتا تھا۔ مسلمان چونکہ وطن سے سینکڑوں میل دور آکر لڑتے تھے اس لئے وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے۔ اُن کو پتہ ہوتا تھا کہ شکست کی صورت میں اگر یہ بچ نکلیں بھی جائیں تو بھی وطن واپس پہنچنا ناممکن ہے۔ لہذا کتوں کی موت مرنے کی بجائے

شہادت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ جذبہ اُن کی فتح کا باعث ہوتا تھا۔
پہاڑی علاقے کی مشکلات کی بدولت ہندو کبھی بھی مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہو سکے۔
ہر پہاڑ ایک قدرتی قلعہ تھا لہذا انہوں نے میدانی علاقے کو ہی میدان جنگ
بنایا۔ جے پال نے ایک بار لمغان پر حملہ کیا۔ لیکن سردی شروع ہوتے ہی ہندوستانی
فوج برف باری کی بدولت اُس علاقے میں نہ ٹھہر سکی۔ اور جے پال کو مجبوراً صلح
کرنی پڑی۔ پس مسلمانوں کو کئی ایک علاقائی فائدے تھے۔ لیکن ہندو ان فائدوں
سے محروم تھے۔

۷۔ **اہنسا کا اُصول**:۔ بدھ مت اور جین مت نے ہندوؤں کے دل و
دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا چنانچہ ہندوؤں کی اکثریت جدید ہندو مت کی بدولت
اہنسا کے اصول کی قائل تھی۔ لہذا دشمن کے خلاف جنگ کرنا تو بجا وہ کسی جاندار
کو تکلیف دینے کے حق میں نہ تھے۔ لہذا صرف کھشتریوں اور راجپوتوں کو ہی
لڑنا پڑا اور ملک کے لاتعداد باشندوں نے محض تماشا دیکھا۔

۸۔ **مرکزی طاقت کا فقدان**:۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کہ مسلمانوں کی آمد پر
ہندو پاکستان میں درجنوں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں تھیں۔ چونکہ مرکزی
طاقت کا فقدان تھا اس لیے مسلمانوں نے ایک ایک کر کے ان تمام ریاستوں
کو ختم کر دیا۔ نیز ان ریاستوں میں خطرے کے وقت صحیح طور پر متحد ہو جانے کا
جذبہ کبھی نہ تھا۔ باہمی حسد اور قبائلی نفرت کی بنا پر صرف چند ایک راجہ اتحاد کر لیتے
تھے لیکن مسلمانوں کے مقابلے پر کبھی بھی ملک بھر کی فوج طاقت آزمائی کے لیے نہ آئی۔

۹۔ **جنگ کے اصول**:۔ ہندوؤں کا طریق جنگ اور ہتھیار دقیانوسی تھے
اُس کے برعکس مسلمان وسط ایشیا میں لڑائی بھڑائی کی بدولت نئی نئی جنگی چالوں
اور ہتھیاروں سے واقف تھے وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر تیزی سے لڑنے کے

لیے اِدھر اُدھر جا سکتے تھے اور تیر اندازی۔ آتش باری میں بھی ماہر تھے۔ ہندو شہ سواری سے بالکل عاری تھے۔ اور مسلمانوں کے فنون جنگ سے بھی ناواقف تھے وہ اسی پرانے بانکپن سے جنگ کرتے تھے کہ دشمن کو خبردار کر کے وار کیا جائے اُس کی پیٹھ میں کبھی چھرا نہ گھونپا جائے۔ نہتے دشمن پہ حملہ نہ کیا جائے۔ گرے ہوئے اور بھاگتے ہوئے دشمن پہ حملہ نہ کیا جائے۔ یہ پرانے اصول تبدیل شدہ حالات میں فائدہ بخش نہ ہوتے تھے۔ لہذا ہر جنگ میں مسلمانوں کی فوجی برتری ثابت ہو جاتی تھی۔

Typical Questions

Q. 1. Describe the conquest of India by Muhammad Ghauri and state the causes of his success.

Q. 2. Describe briefly Shahab-ud-Din Ghauri's campaigns. What contributed to his success over the Rajput rulers ?

Q. 3. Discuss briefly the causes of the success of the early Muslim invaders—Sultan Mahmud of Ghaznavi and Muhammad of Ghori.

Q. 4. Describe the battles of Taain. What is their importance in Indian history ?

Q. 5. What were the causes of Sultan Muiz-ud-Din bin Sam's success in establishing an empire in Northern India ?

Q. 6. Bring out the weakness of the Hindus to oppose their Muslim conquerors.

Q. 7. Describe the causes of the success of the invasions of Sultan Muiz-ud-Din Muhammad bin Sam's of Ghor.

امتحانی سوالات

۱۔ ہندوستان پر محمد غوری کے حملوں اور فتوحات کا حال بیان کیجئے اور اس کامیابی کی وجوہات واضح کیجئے۔

۲۔ برصغیر ہندو پاکستان پر محمد غوری کے حملوں کے حالات لکھئے۔ راجپوت حکمرانوں پر اس کی فوقیت کے اسباب کیا کیا تھے۔

۳۔ ابتدائی دور کے مسلمان حملہ آوروں یعنی سلطان محمود غزنوی اور محمد غوری کی کامرانی کے اسباب بیان کیجئے۔

۴۔ ترائن کی جنگوں کا حال بیان کیجئے۔ تاریخ ہند میں ان جنگوں کی اہمیت کیا ہے؟

۵۔ شمالی ہند میں کن وجوہات کی بنا پر سلطان معزالدین محمد بن سام نے سلطنت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی؟ واضح کیجئے۔

۶۔ کیا وجوہات تھیں کہ ہندو اس قدر کمزور ثابت ہوئے اور مسلمان فاتحین کا مقابلہ نہ کر سکے۔

۷۔ سلطان معزالدین محمد بن سام غوری کے حملوں کی کامیابی کے اسباب و علل بیان کیجئے۔

بیسواں باب

خاندان غلاماں

۱۲۰۶ء میں محمد غوری کی وفات پر قطب الدین ایبک دہلی کا سلطان ہوا وہ برصغیر ہندو پاکستان کا پہلا مسلمان بادشاہ ہے۔ اس سے پہلے محمود اور محمد غوری فاتح تو ضرور تھے لیکن وہ فتوحات کے بعد غزنی واپس چلے جاتے تھے چنانچہ محمد غوری کے زمانے میں اس برصغیر کے مفتوحہ علاقے محض ایک صوبے کی حیثیت رکھتے تھے۔ قطب الدین کے زمانے سے ہندوستان ایک خود مختار اسلامی ریاست بن گیا جس کا پایۂ تخت دہلی تھا۔ اس کی تخت نشینی سے اس ملک کا تعلق وسط ایشیا سے ختم ہوا۔ مغلوں کی آمد تک تخت دہلی پہ بیٹھنے والے حکمرانوں کو سلاطین دہلی کہتے ہیں۔

غلاموں کا دور

تیرہویں صدی میں جتنے شہنشاہ تخت دہلی پہ متمکن ہوئے وہ سب کے سب اپنے ابتدائی دور میں غلام تھے یا کسی غلام کی اولاد تھے۔ اس لئے خلجی خاندان کے عروج تک یعنی ۱۲۹۰ء تک دہلی کے تمام سلاطین کو خاندان غلاماں کہتے ہیں۔ یعنی وہ بادشاہ جو غلامی سے آہستہ آہستہ ترقی کر کے عروج پہ پہنچے اور تخت و تاج کے وارث ہوئے۔

بارہویں اور تیرہویں صدی میں غلامی کا رواج عام تھا۔ شاہی دربار میں ترکی

نسل کے غلاموں کو پسند کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس نسل کے غلام جنگجو اور بہادر ہونے کے علاوہ اپنے آقا کے جانثار اور چست و چالاک ہوتے تھے۔ مختلف سوداگر دور دراز کا سفر طے کر کے عمدہ غلام شاہی دربار میں لاتے تھے اور منہ مانگی قیمت وصول کرتے تھے۔ بعض غلام خوب پڑھے لکھے اور سلیقہ شعار ہوتے تھے اور جلدی ہی ترقی پاتے تھے۔ اُس زمانے کے رواج کے مطابق ان غلاموں کو فنونِ جنگ سکھائے جاتے تھے۔ شہسواری اور تیر اندازی خاص قابلیت کی نشانی تھی۔ شاہی دربار کے غلام اپنی لیاقت کے مطابق اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ عہدہ عنایت کرنے سے پہلے غلام کو آزاد کر دیا جاتا تھا۔ لیکن وہ اپنے محسن اور آقا کے وفادار رہتے تھے۔ ان ترکی غلاموں میں سے کئی ایک اعلیٰ جرنیل پیدا ہوئے۔ بعض اوقات یہ غلام ترقی کر کے سپہ سالار یا وزیر بھی بن جاتے تھے۔ تیرھویں صدی میں کئی ایک غلام ترقی کرتے کرتے آخر کار بادشاہ بھی بنے۔

سلطان التمش کے زمانے میں اکثر اُمراء ابتدا میں غلام رہے تھے۔ ان لوگوں نے جتھے بندیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ اس طبقے کے چالیس ترکی اُمراء نے اپنا عہدہ گروہ قائم کر لیا اور اُمرائے چہلگانی کہلائے۔ امراء کی یہ پارٹی از حد طاقتور تھی اور ان کی جاگیریں ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سیاسی انتشار یا کمزور بادشاہ کے زمانے میں یہ اُمراء وبالِ جان ثابت ہوتے تھے۔ نیز ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔ رضیہ کے خلاف بغاوت میں بھی یہ امراء پیش پیش تھے۔ امارت اور اعلیٰ عہدے وہ اپنے گروہ کی اجارہ داری سمجھتے تھے۔ یاقوت اور عمادالدین ریحان ان امراء کے گروہ سے نہ تھے لہٰذا ان کے خلاف شورش ہوئی موقع پا کر یہ اُمراء اپنی جاگیروں میں خود مختار بن بیٹھے اور آخر کار سلطنت دہلی کی کمزوری کا باعث بنے۔

قطب الدین ایبک

قطب الدین کی زندگی کے حالات قطب الدین ایبک ابتدائی ایام میں ترک کی نسل کا غلام تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بچپن سے ہی اپنے ماں باپ سے علیحدہ ہوا اور خراساں میں نیشاپور کے گورنر قاضی فخر الدین عبدالعزیز نے اسے خرید لیا۔ قاضی صاحب نے قطب الدین کو اپنے بچوں کی طرح پالا اور اعلیٰ تعلیم دلانے کے علاوہ تیر اندازی اور شہ سواری میں ماہر کر دیا قطب الدین اعلیٰ تربیت کی بدولت باکمال بن گیا۔ قاضی صاحب کی وفات پر اُس کے لڑکوں نے قطب الدین کو بیچ ڈالا اور غلاموں کا ایک سوداگر اسے غزنی لے گیا وہاں محمد غوری نے اُسے خرید لیا۔ قطب الدین کو قرب شاہی حاصل تھا۔ لہٰذا محمد غوری اُس کے سلیقہ اور لیاقت سے متأثر ہوا اور اُسے آزاد کر کے داروغہ اصطبل امیر آخور رہ بنا دیا۔ یہ امر قطب الدین کی مزید ترقی کا باعث ہوا۔ اُس زمانے میں رواج تھا کہ جنگ کے دوران میں داروغۂ اصطبل شاہی گھوڑے کے پاس رہتا تھا چنانچہ قطب الدین کو اپنی جنگی مہارت دکھانے کا موقع مل گیا اور محمد غوری نے اُسے اپنا مصاحب خاص بنا لیا۔ ترائن کی دوسری لڑائی کے بعد اس نے قطب الدین کو ہندوستانی مقبوضات کا وائسرائے بنا دیا۔

ترکی زبان میں ایبک سے مراد وہ شخص ہے جس کی چھوٹی انگلی ناکارہ ہو۔ قطب الدین کی چھنگلیا چونکہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ لہٰذا بچپن سے ہی لوگ اُسے ایبک کہتے تھے جب وہ جوان ہوا تو لفظ ایبک اس کے نام کا لازمی جزو بن گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس دور میں کئی ایک اُمراء کے ساتھ ایبک کا لفظ آتا ہے۔ لہٰذا اس سے مراد

ناکارہ انگلی نہیں ہے بلکہ ترکوں میں رواج تھا کہ اپنے خاندان کو ممیز کرنے کے لئے اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ زیادہ تر مورخین اسی بات پر متفق ہیں کہ قطب الدین کی چھوٹی انگلی خراب ہونے کی بنا پر لوگ اسے ایبک کہتے تھے۔ جدید تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترکوں میں ایبک پیارہ کا لفظ تھا جو "چاند" کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔

ایبک کی فتوحات بادشاہ بننے سے پہلے قطب الدین ۱۱۹۲ء سے لے کر ۱۲۰۶ء تک ہندوستانی مقبوضات کا وائسرائے رہا۔ اس دور میں اُس نے شاندار فتوحات حاصل کیں اور اپنے آقا کی سلطنت کو وسعت دی پانچ سال کے اندر اندر اُس نے ہانسی، میرٹھ، دہلی، رنتھمبور اور کول (علی گڑھ) کو فتح کر کے غوری سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس دوران میں یعنی ۱۱۹۷ء تک محمد غوری نے بہ نفس نفیس اجمیر، قنوج اور بنارس پر قبضہ جمایا۔ اسی سال یعنی ۱۱۹۷ء میں ایبک نے گجرات کاٹھیاواڑ پر حملہ بول دیا اور معرکہ خیز لڑائی کے بعد راجہ بھیم دیو کو آبو پہاڑ کے قریب شکست دی۔ راجہ مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ اسی راجہ بھیم دیو کے ہاتھوں محمد غوری نے ابتدائی ایام میں شکست کھائی تھی۔

ان فتوحات کے بعد بیدار مغز قطب الدین نے آئندہ پانچ سال سلطنت کے استحکام میں گذارے۔ اور مزید فتوحات ملتوی کر دیں۔ اس دوران میں محمد غوری کے ایک اور جرنیل بختیار خلجی نے بہار اور بنگال کو فتح کیا۔ یہ دور محمد غوری کے لیے پُرآشوب زمانہ تھا کیونکہ وسط ایشیا میں اُسے کئی ایک جنگیں لڑنا پڑیں۔

۱۲۰۲ء میں قطب الدین نے ایک بار پھر فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے اُس نے کالنجر کے راجپوت راجہ کو شکست دیکر باجگذار بنایا لیکن اگلے سال کالنجر کے راجہ نے بغاوت کر دی اور قطب الدین نے کالنجر کو فتح کر کے اسلامی سلطنت

میں شامل کر لیا۔ اس جنگ میں اُس کے غلام شمس الدین التمش نے بھی حصہ لیا جو بعد میں بادشاہ بنا۔ اس کے بعد ۱۲۰۳ء میں قطب الدین ایبک نے کالپی اور مہوبا پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح سے وسط ہند کا بیشتر حصہ بھی اُس کے قبضے میں آگیا۔

تخت نشینی ۱۲۰۶ء میں محمد غوری کی وفات پر قطب الدین ایبک ہندوستان کا خود مختار شہنشاہ بنا اور اس نے دہلی کو اپنی سلطنت کا پایۂ تخت بنایا۔ مرنے سے ایک برس پہلے محمد غوری نے خوش ہو کر اُسے ہندی مقبوضات کا ولیعہد مقرر کیا تھا اور اُسے ملک کا خطاب دیا تھا۔ یہ امر باعثِ دلچسپی ہے۔ کہ ہند و پاکستان کے پہلے سلطان کی تاجپوشی لاہور میں ہوئی (۲۶) جون ۱۲۰۶ء اور یہ عظیم الشان سلطان اسی شہر میں دفن ہے۔ محمد غوری لاولد تھا۔ لیکن اُس کے وارث محمود غوری نے قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا سلطان تسلیم کیا۔ محمود غوری نے غیاث الدین کا لقب اختیار کیا اور تاج الدین یلدوز کو غزنی کا گورنر اور ناصر الدین قباچہ کو سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ اسکے بعد ہندوستان کے سلاطین کا تعلق غزنی یا غور سے نہ رہا۔

سلطان قطب الدین ایبک نے صرف چار سال حکومت کی کیونکہ اُس کی زندگی نے وفا نہ کی۔ قطب الدین ایبک بڑا دور اندیش اور دانشمند تھا۔ اُس نے فوراً بھانپ لیا کہ یلدوز اور قباچہ تخت و تاج کے خواہاں ہیں اور وہ چپکے سے بیٹھنے والے نہیں بلکہ یلدوز نے تو ہاتھ پاؤں مارنے بھی شروع کر دئے تھے۔ اور لاہور پر قبضہ جما لیا تھا۔ قطب الدین نے یلدوز کو آگے بڑھنے کی مہلت نہ دی اور فوراً فوج لے کر اس کے مقابلے کے لیے لاہور پہنچا۔ یلدوز لاہور سے شکست کھا کر غزنی بھاگ گیا لیکن قطب الدین نے اُس کا تعاقب کر کے غزنی پر بھی قبضہ کر لیا۔ دشمن سے غافل ہو کر قطب الدین غزنی میں خوشیاں منا رہا تھا جب کہ یلدوز نے اچانک حملہ کر دیا اور قطب الدین کو پسپا ہو کر پنجاب آنا پڑا۔ یہاں پہنچ کر اُس نے سرحدوں کو خوب مضبوط کیا

تاکہ یلدوز کی روک تھام ہو سکے۔ چنانچہ قطب الدین جب تک زندہ رہا یلدوز کو پنجاب پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ غزنی سے پسپا ہونے کے بعد قطب الدین ایبک نے تاج الدین یلدوز سے رشتہ داری قائم کر کے تعلقات خوشگوار بنا لیے یعنی اُس کی لڑکی سے شادی کر لی اس طرح سے دونوں حکمرانوں میں یگانگت ہو گئی اور سرحدوں کا تعین بھی ہو گیا۔

قطب الدین ایبک نے دُور اندیشی سے کام لے کر دوسرے طاقتور اُمراء سے بھی رشتے ناطے کر لئے تاکہ وہ اُس کے معاون بنیں اور اُس کا سیاسی اقتدار قائم رہے چنانچہ اُس نے اپنی ایک لڑکی کی شادی ناصر الدین قباچہ حاکم سندھ سے کر دی قباچہ بھی محمد غوری کا لائق غلام تھا اور ترک نسل سے تھا قطب الدین نے دوسری لڑکی کی شادی شمس الدین التمش سے کر دی جو ابتدائی دور میں ترکی غلام تھا۔ لیکن اُس زمانے میں ذی اثر اُمراء کا سرغنہ تھا۔ ان رشتے ناطوں سے قطب الدین ایبک کی سلطنت اور بھی مستحکم ہو گئی ان حالات کو دیکھ کر بختیار خلجی حاکم بنگال نے بھی قطب الدین ایبک کو سلطان تسلیم کر لیا۔ اور اس کا باجگذار بن گیا۔

قطب الدین ایبک انتہا منصف مزاج اور رحم دل بادشاہ تھا۔ وہ ہندوؤں سے بھی اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس نے ملک کے تمام حصوں کو لٹیروں سے پاک کیا۔ اور مکمل امن و امان قائم کیا۔ وہ شریعت کا پابند تھا لہذا اُس نے غیر شرعی ٹیکس ختم کر ڈالے۔ مالیہ کی شرح بھی شریعت کے مطابق کر دی یعنی کل پیداوار کا دسواں حصہ۔ اس سے پہلے مالیہ کی شرح دگنی تھی۔ قطب الدین ایبک کے زمانے میں رعایا خوشحال تھی اور بادشاہ انصاف کی بدولت ہر دلعزیز تھا۔ قطب الدین ایبک سخاوت میں بے مثال تھا۔ لوگ اُسے دلکھ داتا دکہتے تھے یعنی لاکھوں روپے بخشنے والا۔ وہ متقی اور پرہیزگار تھا اور اعلیٰ سیاست دان اور مدبر بھی تھا۔

قطب الدین ایبک کو فنِ تعمیر کا از حد شوق تھا۔ چنانچہ اُس نے ملک بھر میں کئی ایک عمارتیں تعمیر کروائیں۔ اس کے دور میں ہندو طرزِ تعمیر اور مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا امتزاج ہوا۔

(Indo Muslim Architecture)

قطب الدین ایبک کی عمارات میں ستونوں کی وضع قطع اور چھت کی ساخت قدیم طرز کی ہے۔ پتھر وغیرہ بھی وہی ہیں۔ لیکن عمارتوں کی ساخت اور رنگ روپ کو بدل دیا گیا ہے۔ نئی ترتیب سے اسلامی ماحول ٹپکتا ہے۔ قطب الدین ایبک نے اس ملک میں اسلامی فنِ تعمیر کی اہم خصوصیات یعنی گنبد اور محراب رائج کیں۔ ہندو عمارتیں پُراسرار اور تاریک ہوتی تھیں۔ لیکن مسلمانوں کی عمارتیں کشادہ اور فراخ ہوتی ہیں اور مسلمان مجموعی تناسب اور حسن پہ زور دیتے ہیں۔ سلطان قطب الدین ایبک نے ہندوؤں کے برباد شدہ مندروں کے سامان کو نئی قسم کی اسلامی عمارات میں استعمال کیا اور ہندوانہ تصاویر پہ پلستر لگوا دیا۔ قطب الدین ایبک کے زمانے کی اہم عمارتیں مسجد قوت الاسلام۔ قطب مینار اور اجمیر کی ایک مسجد ہے۔ جسے اڑھائی دن کا جھونپڑا کہتے ہیں۔

مسجد قوت الاسلام دہلی کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ دہلی فتح کرنے کے بعد قطب الدین پرتھوی راج کے محل میں اترا جو قلعے کے اندر تھا۔ اسی محل کے قریب راجہ کے اپنے استعمال کے لیے ایک مندر تھا۔ قطب الدین نے اس مندر میں مناسب تبدیلیاں کر کے اُسے مسجد کی شکل دی اور اُسے مسجد قوۃ الاسلام کا نام دیا۔ چھتوں پہ گنبد نما طرز کے روشن دان بنائے اور محراب اور نئی قسم کے ستون قائم کئے۔ اجمیر کی جامع مسجد بھی اسی طرز پہ بنائی گئی۔ یہ مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا کہلاتی ہے۔ مشہور ہے کہ اس مسجد کی تکمیل اڑھائی دن میں ہوئی تھی یہاں ایک میلہ بھی لگتا ہے۔ جو اڑھائی دن تک رہتا ہے۔ اس مسجد کی آرائش اور طرزِ تعمیر میں کوہ آبو کے جینی مندر کی جھلک پائی جاتی ہے۔

قطب مینار کو بھی سلطان قطب الدین ایبک نے ہی شروع کرایا تھا۔ لیکن اِس مینار کی تکمیل سے پہلے ہی سلطان راہیِ ملکِ عدم ہوا لہٰذا سلطان شمس الدین التمش نے اس مینار کو مکمل کروایا۔ یہ مینار اسلامی دور کی ایک عظیم الشان یادگار ہے اور مسجد قوۃ الاسلام کے قریب واقع ہے۔ یہ مینار مخروطی شکل کا ہے۔ اور اس کی اونچائی ۲۳۴ فٹ ہے۔ اس وقت اس کی پانچ منزلیں موجود ہیں۔ آخری منزل جو چھتری نما تھی بجلی گرنے سے تباہ ہو گئی۔ زمین پر اس مینار کے گھیرے کا قطر ۴۸ فٹ ہے لیکن آخری منزل کا قطر صرف ۹ فٹ ہے۔ سیڑھیاں خوب کشادہ ہیں۔ اور دیواروں میں روشنی کے لئے جھروکے ہیں ہر منزل کے خاتمے پر نظارہ کرنے کے لئے مینار کے گرداگرد چبوترے بنے ہوئے ہیں۔ یورپ کے بعض مورخین اس مینار کو (Tower of Victory) یعنی فتح کی یادگار کہتے ہیں۔ عوام اسے سلطان قطب الدین کے اپنے نام کی نسبت سے قطب مینار کہتے ہیں۔ لیکن بعض مسلمان مورخین کا خیال یہ ہے کہ اس مینار کا نام اُس دور کے ایک مشہور ولی اللہ قطب الدین بختیار کاکی کے نام سے مشہور ہوا جن کا مزار اس مینار کے قریب واقع ہے۔

وفات

سلطان قطب الدین چوگان کھیلنے کا از حد شوقین تھا۔ ۱۲۱۰ء میں لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرا اور گردن کی ہڈی ٹوٹ جانے سے وہیں مر گیا۔ سلطان کی قبر پر ایک عالیشان مقبرہ بھی تھا لیکن رنجیت سنگھ کے دور میں سکھ گردی کی بنا پر اس مقبرے کو گرا دیا گیا اور اُس کی قبر کے تعویذ کی جگہ چھوڑ کر ایک ہندو نے وہاں مکان بھی بنا لیا۔

انگریز مورخ اس مقام کو قطب الدین ایبک کی اصلی قبر نہیں گنتے۔ یہ قبر کس مپرسی کی حالت میں انار کلی بازار کے قریب ایک روڈ پر ایک چھوٹی سی گلی میں واقع تھی

اب حکومت پاکستان نے اس قبر کے بالائی مکان کو گرا کر ارد گرد کا علاقہ بھی صاف کر دیا ہے اور ہندوستان کے فاتح اور پہلے مسلمان سلطان کی قبر پر ایک عالیشان مقبرہ بنا دیا جائیگا۔ سلطان قطب الدین ایبک کے جانشینوں کا حال بیان کرنے سے پہلے ہم خاندان غلاماں کے سلاطین کا نقشہ پیش کرتے ہیں تاکہ یادداشت میں آسانی رہے۔

سلاطین کے نام	عہد حکومت کا زمانہ
سلطان قطب الدین ایبک	سنہ ۱۲۰۶ء تا سنہ ۱۲۱۰ء
آرام ابن قطب الدین	سنہ ۱۲۱۰ء تا سنہ ۱۲۱۰ء صرف چند ماہ
سلطان شمس الدین التمش	سنہ ۱۲۱۰ء تا سنہ ۱۲۳۶ء
رکن الدین فیروز ابن التمش	سنہ ۱۲۳۶ء صرف چھ ماہ
رضیہ سلطانہ	سنہ ۱۲۳۶ء تا سنہ ۱۲۳۹ء
معز الدین بہرام ابن التمش	سنہ ۱۲۳۹ء تا سنہ ۱۲۴۱ء
علاؤ الدین مسعود ابن رکن الدین	سنہ ۱۲۴۱ء تا سنہ ۱۲۴۶ء
سلطان ناصر الدین محمود	سنہ ۱۲۴۶ء تا سنہ ۱۲۶۶ء
سلطان غیاث الدین بلبن	سنہ ۱۲۶۶ء تا سنہ ۱۲۸۶ء
کیقباد ابن بغرا خاں بن بلبن	سنہ ۱۲۸۶ء تا سنہ ۱۲۹۰ء

آرام ابن قطب الدین

نومبر سنہ ۱۲۱۰ء کو سلطان قطب الدین ایبک نے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا آرام تخت نشین ہوا لیکن اس میں انتظام سلطنت کی اہلیت نہ تھی۔ لہذا مختلف امراء من مانی کارروائیاں کرنے لگے اور صوبائی گورنر تقریباً خود مختار ہو گئے

ترکی اُمراء میں گروہ بندیاں اور سازشیں زیادہ ہو گئیں۔ اور ایک ہی سال میں آرام شاہ کی حکومت بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ آرام اگرچہ شہنشاہ تھا لیکن بنگال کے تمام خلجی اُمراء خود مختار بن بیٹھے۔ سندھ میں قباچہ نے تسلط جما لیا اور غزنی کے حاکم یلدوز نے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر لاہور پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ ان حالات میں دہلی کے ترکی اُمراء نے شمس الدین التمش کی سرکردگی میں سر اٹھایا اور جمنا کے کنارے چھوٹی سی جھپٹ کے بعد التمش نے تخت پر قبضہ کر لیا اور آرام شاہ کو نہایت آسانی سے تخت سے اتار دیا۔ آرام کا انجام صحیح طور پر معلوم نہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ یا تو میدانِ جنگ میں مارا گیا یا معزول ہونے کے کچھ عرصہ بعد گمنامی کی موت مرا۔ بعض مورخ آرام شاہ کو قطب الدین ایبک کا منہ بولا بیٹا تصور کرتے ہیں۔ لیکن ہم عصر مورخین اُسے قطب الدین ایبک کا بیٹا ہی لکھتے ہیں۔

شمس الدین التمش کا عہد حکومت

۱۲۱۰ء تا ۱۲۳۶ء

ابتدائی حالات

شمس الدین التمش ترکی نسل سے تھا اور البری قبیلے کے سردار کا لڑکا تھا۔ اُس کے سوتیلے بھائیوں نے بچپن میں ہی اُسے دھوکے سے بخارا کے ایک سوداگر کے پاس غلام ظاہر کر کے بیچ دیا۔ التمش نے بخارا میں ایک علم دوست خاندان کے ہاں پرورش پائی۔ اور بکتا بکتا آخر کار دہلی پہنچا۔ جہاں سلطان قطب الدین ایبک نے اُسے خرید لیا۔ التمش نہایت

حسین وجمیل تھا۔ اور از حد عاقل تھا۔ کھوکھروں کی بغاوت فرد کرنے میں التمش نے کارہائے نمایاں دکھائے اور اپنی جنگی قابلیت کا ثبوت دیا۔ لہذا سلطان نے اُسے میر شکار بنا دیا۔ بعد ازاں اپنی خدا داد ذہانت اور سلیقہ مندی کی بنا پر خوب ترقی کی۔ مختلف عہدوں پہ متمکن رہا۔ اور آخر کار سلطان نے خوش ہو کر بدایوں کی جاگیر اُس کو بخشی۔ اُس کے بعد وہ گوالیار کا گورنر بھی بنا سلطان قطب الدین ایبک کی زندگی ہی میں التمش اُمرائے چہلگانی کا سرغنہ تھا اور از حد طاقتور تھا لہذا قطب الدین نے اپنی لڑکی کی شادی التمش سے کر دی۔ بعض مورخین کا خیال یہ ہے۔ کہ یہ شادی قطب الدین کی وفات کے بعد آرام شاہ کی معزولی کے بعد ہوئی تاکہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں التمش کو آسانی رہے اور قباچہ قطب الدین کے وارث ہونیکا دعویٰ نہ کرے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ سلطان قطب الدین نے اپنی زندگی ہی میں شمس الدین التمش اور ناصر الدین قباچہ سے اپنی لڑکیاں بیاہ دی تھیں تاکہ بااثر اُمراء رشتے ناطوں کی بنا پر اس کے مخالف نہ ہو سکیں۔

اصلی بانی سلطان شمس الدین التمش کو خاندانِ غلاماں کا اصلی بانی (Real Founder) گنتے ہیں۔ اُس نے سلطنت کو مستحکم کرنیکے علاوہ مزید علاقے بھی فتح کئے۔ اس کے علاوہ لاانتہا مشکلات سے سلطنت کو بچایا۔ یہ محض اس کی دانشمندی اور تدبر کا نتیجہ تھا کہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے تمام دشمنوں کا قلع قمع کر دیا۔ اس کی بجائے اگر کوئی تیز مزاج یا بے صبر حکمران تخت پہ بیٹھ جاتا تو خاندان غلاماں آرام شاہ کے بعد ہی زوال پذیر ہو جاتا۔ التمش کی برتری اسی میں ہے کہ اُسنے سلطنت دہلی کو جو ہر طرف سے مشکلات میں گھری ہوئی تھی، اپنی دانشمندانہ پالیسی سے بچا لیا اور دشمنوں کے خاتمے کے بعد مزید فتوحات بھی کیں۔ اس بنا پر اُسے خاندانِ غلاماں کا اصلی بانی گنا جاتا ہے۔

لفظِ التمش: یہ مشہور مورخ لین پول لکھتا ہے کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ ایلتمش (Altamish) ہے۔ اور اس کے لغوی معنی ہیں دستگیر۔ ممدو معاون۔ چونکہ اس سلطان نے خاندانِ غلاماں کو گرتے ہوئے سنبھالا تھا اس لئے ترکی اُمراء اُسے ایلتمش کہنے لگے اور یہ لفظ اس کے نام کا حصہ بن گیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ترکی زبان میں ایلتمش کے معنی ہیں "چاند گرہن"۔ چونکہ شمس الدین چاند گرہن کے موقع پر پیدا ہوا تھا۔ اس لیے یہ لفظ اس کے نام کے ساتھ چسپاں ہو گیا۔ ہمارا خیال یہ ہے۔ کہ تاریخ میں کئی ایک اشخاص کے ناموں کے ساتھ التمش کا لفظ پایا جاتا ہے۔ لہذا یہ لفظ مخصوص خاندانی علامت ہے۔ سلطان کے سکوں پر یہ لفظ التمش۔ ایلتمش اور التمش تمام صورتوں میں موجود ہے۔ ہم اسے سلطان شمس الدین التمش لکھیں گے۔

مشکلات کا نرغہ۔ تخت نشین ہوتے ہی سلطان شمس الدین نے اپنے آپ کو لاانتہا مشکلات میں گھرا ہوا پایا۔ صوبائی گورنر اور ترکی امراء کھلم کھلا بغاوت پر آمادہ تھے۔ دہلی میں اُمراء کا ایک طاقتور گروہ اُس کا مخالف تھا۔ ہندو رعایا کے اکثر افراد موقع کی تلاش میں تھے تاکہ مسلمانوں کی اطاعت کا جُوا اپنی گردنوں سے اُتار پھینکیں۔ شاہی باڈی گارڈ کے سردار نے چند اُمراء کو ساتھ ملا کر دہلی کے گرد و نواح میں فوج جمع کرنی شروع کر دی۔ دراصل امراء میں سے ہر شخص اپنے آپ کو تخت کا جائز وارث اور حقدار سمجھتا تھا۔ محمد غوری کے اکثر غلام امراء کی صف میں شامل تھے۔ اور اپنے آپ کو معزّی اُمراء کہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ تخت کے لئے شمس الدین کی نسبت ان کا حق زیادہ فائق ہے۔ ان امراء نے ملک کے مختلف حصوں میں خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اور ان میں سے چند ایک دہلی پر قبضہ کرنے کی ٹھانے ہوئے تھے۔ ناصر الدین قباچہ سندھ کا حاکم تھا اور وہ بھی

قطب الدین ایبک کا داماد تھا۔ اس نے فوراً اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور صوبہ ملتان پر بھی قبضہ کر لیا۔ دہلی کے پایۂ تخت کو ہر وقت اس سے خطرہ تھا۔ غزنی کے حاکم تاج الدین یلدوز نے محمد غوری کا وارث ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس نے شمس الدین التمش کو اپنا مطیع ظاہر کرنے کے لئے اس کے نام فرمان بھی جاری کئے۔ بنگال اور بہار میں بھی حالات سازگار نہ تھے۔ بختیار خلجی کے مرنے کے بعد علی مردان کو خلجیوں نے سردار تسلیم کر لیا تھا۔ اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

التمش کی پالیسی

اس قدر مشکلات کے باوجود سلطان بالکل نہ گھبرایا۔ اس نے صبر و استقلال سے کام لے کر چپ سادھ لی اور ایک ایک کر کے تمام دشمنوں کا صفایا کیا۔ یہی صبر اس کے تدبر اور دانش مندی کی دلیل ہے۔ اس نے خوب سوچ بچار کے بعد مناسب موقعہ پر ہر دشمن کے خلاف کارروائی کی اور آخر کار ان سب کا خاتمہ کر ڈالا۔ مورخین التمش کی فہم و فراست (Calculating nature) کی داد دیتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے اس نے دہلی کے گرد و نواح میں امن و امان قائم کیا۔ سرکش امراء کا خاتمہ کیا اور ہندو رعایا کے دلوں میں شاہی دبدبہ پیدا کیا۔ ہندوؤں کے باغیانہ خیالات کو ختم کر دینے کے بعد دہلی سے لے کر بدایوں اور اودھ سے لے کر بنارس تک کے تمام علاقے میں امن و امان قائم ہو گیا اور سرکش امراء کا قلع قمع ہو گیا۔

(۲) التمش نے بنگال اور سندھ کو اپنے حال پر چھوڑا اور دہلی میں حالات سازگار ہوتے ہی وہ فوراً یلدوز کی جانب متوجہ ہوا۔ یلدوز ان دنوں جلال الدین خوارزم شاہ سے شکست کھا کر بھاگ آیا تھا اور پنجاب پر قبضہ جما بیٹھا تھا۔ اگر

شمس الدین ذرا غفلت کرتا تو یلدوز دہلی پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ لیکن التمش نے یلدوز کو پاؤں جمانے کی مہلت نہ دی اور فوراً فوج لے کر پنجاب کی جانب روانہ ہوا۔ ترائن کے قریب یلدوز شکست کھا کر گرفتار ہوا اور پنجاب پر التمش کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ یلدوز کو بدایوں کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ جہاں التمش نے اُسے مروا ڈالا۔ یلدوز کا خاتمہ ۱۲۱۵ء میں ہوا۔

(۳) ۱۲۱۷ء میں التمش نے ناصرالدین قباچہ پر چڑھائی کی اور ملتان کے قریب اُسے شکست دی۔ لیکن قباچہ سندھ بھاگ گیا اور التمش نے تعاقب میں وقت ضائع نہ کیا بلکہ التمش دہلی لوٹ آیا۔ اور قباچہ کو اپنے حال پر چھوڑا۔

(۴) **ایک نئی مصیبت**:۔ اس دوران میں التمش کی سلطنت کو چنگیز خاں کے حملے کا سخت خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنگیز خاں نے تیرھویں صدی عیسوی میں منگول قوم کو متحد کر کے نہ صرف چین فتح کیا بلکہ مغربی ایشیا کی اکثر اسلامی حکومتوں کا خاتمہ کر ڈالا تھا۔ چنگیزی منگول لامذہب اور وحشی تھے۔ تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے اور بلا کے جنگجو تھے۔ چنگیز خاں فتوحات کے شوق میں بڑھا چلا آتا تھا۔ کہ جلال الدین خوارزم شاہ سے اُس کی ٹکر ہوئی۔ یہی مسلمان سلطان ہے جس نے کئی بار منگولوں کا مقابلہ کیا۔ آخر کار جلال الدین خوارزم شاہ منگولوں سے شکست کھا کر بھاگا اور ہندوستان کا رخ کیا۔ اس نے ایلچی بھیج کر التمش سے پناہ مانگی۔ التمش کے لیے یہ بڑا نازک موقع تھا۔ اگر وہ جلال الدین کو پناہ دیتا تو ہندوستان پر چنگیز خاں کا حملہ یقینی تھا۔ کیونکہ منگول جلال الدین کے تعاقب میں آ رہے تھے۔ چنگیز خاں کی آمد کا مطلب سلطنت دہلی کی تباہی تھی۔ اس کے برعکس التمش پناہ دینے سے انکار کر کے جلال الدین کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کے دشمنوں سے مل کر لڑائی شروع کر دیتا۔ اس عظیم خطرے کے

زمانے میں سلطان نے اپنی دانشمندی اور دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ اس نے خفیہ طور پر جلال الدین کے ایلچی کو مروا ڈالا اور مشہور کر دیا کہ وہ بیمار ہو کر مر گیا ہے۔ ساتھ ہی التمش نے چند تحفے تحائف بھیج کر نہایت حلیمی سے جلال الدین کو کہلا بھیجا کہ اس ملک کی آب و ہوا درست نہیں ہے۔ نیز دہلی میں رہنا جلال الدین کے شایان شان نہیں البتہ جس قدر علاقہ وہ مخالفین سے صاف کرے گا۔ وہ سب کا سب جلال الدین کا ہو گا۔ جلال الدین سمجھ گیا۔ کہ یہ محض بہانہ ہے۔ لیکن التمش سے لڑائی مول لینے کی بجائے وہ سندھ کی جانب بھاگ گیا اور وہاں اس نے قباچہ سے کئی ایک جنگیں لڑیں۔ اس جنگ و جدل کی بنا پر قباچہ کی طاقت از حد کمزور ہو گئی۔

اس دوران میں چنگیز خاں اپنی فوج سمیت دریائے سندھ کے کنارے آپہنچا لیکن حالات نے بہت جلد پلٹا کھایا۔ عین اس وقت جلال الدین نے عراق کا رخ کیا کیونکہ اُسکے حامیوں نے اس ملک کا تخت اسے پیش کیا تھا۔ منگولوں کا دستور تھا کہ جہنم کے دروازے تک دشمن کا پیچھا کرتے تھے۔ جب جلال الدین نے عراق کا رُخ کیا تو چنگیز خاں بھی واپس ہؤا اور سلطنت دہلی چنگیزی چنگل میں گرفتار ہونے سے بال بال بچی۔ اگر چنگیز خاں ہندوستان پر حملہ کر دیتا تو التمش کی سلطنت پاش پاش ہو جاتی۔ لیکن سلطان شمس الدین التمش نہایت ہی خوش قسمت بادشاہ ثابت ہؤا۔ کیونکہ قدرت نے اسے وحشی اور سفاک منگولوں کے حملے سے بچایا۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ چنگیز خاں دریائے سندھ کو عبور کئے بغیر واپس ہؤا۔

(۵) چنگیز کی مراجعت کے بعد التمش سندھ پر حملہ آور ہؤا اور ۱۲۲۷ء میں اس نے قباچہ کی طاقت بالکل ملیامیٹ کر دی۔ قباچہ بھاگ اٹھا اور کشتی میں سوار ہو کر دریائے سندھ عبور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کی کشتی الٹ گئی اور قباچہ ڈوب کر مر گیا۔ اس کی موت سے التمش کے تمام دشمنوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور وہ اصلی معنوں میں تمام ملک کا بادشاہ ہؤا۔ دشمنوں کے

خاتمے پر التمش نے عمدہ انتظام سے سلطنت کو مستحکم کیا اور ملک بھر میں شاہی دبدبہ قائم کیا۔
(۴) قباچہ کی شکست سے پہلے ۱۲۲۵ء میں التمش نے خلجی سردار علی مردان کو شکست دے کر باجگذار بنا لیا تھا اور بنگال کا دورا فتادہ صوبہ بھی خود مختار نہ ہو سکا۔ پس یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ التمش نے کمال دانشمندی سے کام لے کر آہستہ آہستہ اپنے تمام دشمنوں کا خاتمہ کر ڈالا۔ اور سلطنت دہلی کو نیست و نابود ہونے سے بچا لیا۔ اس لیے اُسے خاندان غلاماں کا اصلی بانی گردانتے ہیں۔

مزید فتوحات اور سلطنت کی توسیع

سلطان شمس الدین التمش نے نہ صرف سلطنت کو خطرات سے بچایا بلکہ مزید فتوحات سے اس کی حدود کو وسعت دی۔ ابتدائے عہد میں اس نے مزید فتوحات کی جانب توجہ نہ دی بلکہ سلطنت کے استحکام و انتظام میں منہمک رہا۔ جب اُس کے پاؤں اچھی طرح سے جم گئے اور اس کے مخالفین کا قلع قمع ہو گیا۔ تو اس نے سلطنت کو وسیع کرنے کی ٹھانی۔ ۱۲۲۶ء میں اس نے رنتھمبور کے مضبوط قلعے کو فتح کر لیا۔ یہ قلعہ اہم فوجی اڈہ تھا اور مزید فتوحات کے لئے مفید تھا۔ چنانچہ قباچہ کے خاتمے کے بعد التمش نے مانڈو فتح کیا۔ اس کے بعد اس نے گوالیار اور اجین پر قبضہ جمایا۔ اس طرح سے مالوہ کی تمام ریاست اس کی سلطنت میں شامل ہو گئی۔ اس موقع پر التمش کی عظمت نصف النہار پر تھی۔ کیونکہ ہمالیہ سے بندھیاچل تک اور دریائے سندھ سے لیکر برہم پترا تک ہندو پاکستان کا تمام برصغیر اس کے قبضے میں تھا۔ وہ دہلی کے سلاطین میں سے پہلا مسلمان شہنشاہ ہے جس نے اس قدر وسیع علاقے پر حکومت کی ہو۔

خلیفہ بغداد کی جانب سے خلعت

مالوہ کی فتح کے بعد التمش کا اقتدار

بہت بڑھ گیا تھا اور اُس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی اور وہ بالکل خودمختار
تھا تمام ہندوستان میں اس کا خطبہ اور سکہ چلتا تھا۔ لیکن عوام عقیدت مندی
کی بناپر خلیفۂ بغداد کو روحانی پیشوا اور نائب رسول سمجھتے تھے۔ اگرچہ بغداد
کے عباسی حکمران از حد کمزور ہو چکے تھے لیکن مسلمان عوام کی نظروں میں ان کی
وقعت بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ التمش کی شہرت سنہ ۱۲۲۹ء میں خلیفۂ بغداد مستنصر
باللہ نے التمش کی خودمختارانہ حیثیت کو تسلیم کیا اور اس کے لئے خلعت بھیجی۔
اس عزت افزائی کی بدولت التمش رعایا میں از حد مقبول ہو گیا اور مسلمان عوام
اُس کے خلاف بغاوت کو گناہ سمجھنے لگے۔

وفات سلطان شمس الدین نے ۱۲۳۶ء میں وفات پائی اور مسجد قوۃ الاسلام کے
صحن میں جنوبی سمت دفن ہوا۔ سلطان خدا ترس۔ دیندار اور پارسا
تھا۔ تدبر۔ دور اندیشی اور شجاعت میں بے مثال تھا۔ انصاف پسند اور
علماء کی صحبت کا شوقین تھا۔ اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگ و جدل میں
گذرا لیکن اس نے سلطنت کا انتظام نہایت خوبی سے کیا۔ قوانین ملکی میں
وہ شرع کا پابند تھا۔ اور رعایا کے کسی فرد پر ظلم برداشت نہ کرتا تھا۔ اس کا
سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے۔ کہ اس نے اپنی وسیع سلطنت میں مکمل امن و
امان قائم رکھا۔ اور رعایا کو خوش حال بنایا۔

سلطان شمس الدین التمش علوم و فنون کا سرپرست تھا۔ اس نے ملک بھر میں کئی
سکول کھولے اور تعلیمی مرکز قائم کئے۔ سلطان تعمیرات کا بھی شوقین تھا۔ اُس نے
قطب مینار کو پایہ تکمیل تک پہنچایا اور قطب مینار کے گردونواح میں بہت سی عمارتیں
بنوائیں۔ ان میں حوض شمسی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ التمش کے دور کی عمارتوں
میں سے سلطان غازی کا مقبرہ اہم ترین ہے۔ یہ مقبرہ دہلی میں واقع ہے۔ اور اُس میں

التمش کا چھیتا لڑکا ناصرالدین دفن ہے جو لکھنوتی میں نوبت ہوا تھا لیکن اُس کی لاش دہلی منگوائی گئی تھی۔ یہ مقبرہ سلطان غازی کا مقبرہ کہلاتا ہے۔ مقبرے کے قریب ایک مسجد بھی ہے جس کا فرش سنگِ مرمر کا ہے۔ مسجد کے محراب میں زیبائش کے لئے قرآن مجید کی آیات نسخ رسم الخط میں لکھی ہوئی ہیں۔ اس شہزادے کی وفات کے بعد سلطان کے ہاں ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام بھی ناصرالدین رکھا گیا۔

شاہی ٹکسال:- التمش پہلا مسلمان ہے جس نے نئی وضع کے خالص اسلامی سکے رائج کئے اور مرکزی ٹکسال قائم کیا۔ اس نے سونے کے سکوں کے علاوہ چاندی کا روپیہ بھی جاری کیا جسے ٹنکہ کہتے تھے۔ التمش کے دور میں ٹنکہ معیاری سکہ تھا۔ غیر ملکی تجارت کے لیے سونے کے سکے مستعمل تھے۔ التمش کے سکے نہایت عمدہ تھے۔ اور ان پر صرف عربی حروف لکھے ہوتے تھے۔ یہ سکے عرب سکوں کی نقل تھے۔ التمش سے پہلے مسلمان حکمرانوں نے اپنے سکے جاری نہ کئے تھے۔ بلکہ پرانے مروجہ ہندوستانی سکوں پر چند عربی کے حروف کندہ کر دالئے تھے۔ ان قدیم سکوں پر ہندوانہ تصاویر بھی ہوتی تھیں۔ بعض سکوں پر بیل یا دیوتا کی تصویر ہوتی تھی۔ اور دیوناگری رسم الخط میں سکے کی قیمت درج ہوتی تھی۔ التمش نے سکوں کا پرانا انداز بالکل ختم کر ڈالا اور نئی وضع کے سکے جاری کئے۔ اسلامی دور کے سکوں میں التمش کا سکہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

رکن الدین فیروز:- التمش ایک عاقل اور صاحب فہم سلطان تھا۔ وہ اپنے بیٹوں کی تن آسانی سے نالاں تھا۔ اور ان سب کو نااہل سمجھتا تھا۔ اُس کے یہ خدشات حرف بحرف درست نکلے۔ وفات سے پہلے اُسنے اپنی لڑکی رضیہ سلطانہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اور اپنی زندگی ہی میں مقتدر اُمرا سے اُس کی اطاعت کے وعدے لئے تھے۔ رضیہ تیز فہم اور مردانہ صفات کی

مالک تھی سلطنت کے امور کو خوب سمجھتی تھی۔ باپ جب بھی دہلی سے کہیں باہر جاتا سلطنت کے تمام کاروبار رضیہ کے سپرد ہوتے تھے لیکن التمش کے مرتے ہی امراء اپنے وعدوں کو بھول گئے اور انہوں نے رضیہ کی بجائے اس کے بھائی رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھایا۔ نیا سلطان نہایت خوبرو اور فیاض تھا لیکن اپنی والدہ شاہ ترکان کے اشاروں پر ناچتا تھا یہ عورت اقتدار کی بھوکی تھی اور دور اندیش نہ تھی۔ نوجوان شہنشاہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ اور سلطنت کے انتظام کو چلانے کا اہل نہ تھا وہ شراب میں غٹ رہتا تھا۔ جب ہوش میں آتا تو مسخروں کی صحبت سے اُسے فرصت نہ ملتی تھی۔ روایت ہے کہ اس نے کئی بار نشے کی حالت میں ہاتھی پر سوار ہو کر اشرفیوں کی بارش کی امراء اس کی بداعتدالیوں سے تنگ آ گئے اور تقریباً چھ ماہ بعد اُسے تخت سے علیحدہ کر دیا۔ اور وہ قید خانے میں مر گیا۔

رضیہ سلطانہ (۱۲۳۶ء تا ۱۲۳۹ء)

رضیہ نے اپنے بھائی کے بعد صرف تین سال حکومت کی۔ لیکن اُس کے حسن انتظام پر تمام امراء دنگ رہ گئے وہ پہلی مسلمان عورت ہے جس نے تاج شاہی پہنا۔ وہ اپنے باپ کی مانند نہایت لائق اور دور اندیش تھی۔ رضیہ نہایت حسین ملکہ تھی اور اس کی شکل و صورت التمش سے ملتی جلتی تھی۔ وہ مردانہ لباس پہن کر بے نقاب دربار لگاتی تھی۔ اس نے پردہ بالکل ترک کر دیا تھا اور بازاروں میں بے نقاب نکلنے کے علاوہ میدان جنگ میں بھی مردانہ لباس میں بے نقاب جاتی تھی۔ عورت ہونے کے باوجود اُس نے اس پُر آشوب زمانے میں مکمل امن و امان قائم کر دیا اور باغی امراء کی سرکوبی کی رضیہ کے حسن انتظام کو دیکھ کر امراء گو التمش کے

الفاظ یاد آتے تھے "رضیہ اپنے بھائیوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ تم دیکھ لینا کہ میرے بعد رضیہ سے زیادہ کوئی بھی سلطنت کے لئے موزوں نہ ہوگا۔"

بغاوتیں اس زمانے میں امرائے چہلگانی کا زور بہت زیادہ تھا۔ یہ ترک امراء معمولی غلاموں سے ترقی کر کے امارت کے درجے تک پہنچے تھے۔ رضیہ کے زمانے میں امراء کے تین گروہ تھے۔ معزی۔ قطبی۔ اور شمسی۔ ہر گروہ کے امراء اپنی اجارہ داری چاہتے تھے اور اقتدار کے بھوکے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ حاکم وقت ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہو۔ شروع شروع میں وہ رضیہ سلطانہ کے تابعدار رہے۔ لیکن بعد ازاں انہوں نے پے در پے بغاوتیں شروع کر دیں۔ اور سازشوں کا دور شروع ہو گیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ جب رضیہ نے پردہ ترک کر دیا تو شرع کے پابند امراء بھڑک اٹھے۔ اصلی بات یہ ہے کہ ایک عورت کی اطاعت کرتے ہوئے ان کو شرم آتی تھی۔ اسی دوران میں ملکہ نے اپنے ایک حبشی غلام یاقوت پہ خاص عنایات کیں۔ پہلے اُسے داروغۂ اصطبل بنایا۔ پھر اُسے امیر الامراء کا درجہ عطا کیا۔ ترکی امراء کے تمام گروہ یاقوت سے حسد کرنے لگے اور اس کے خلاف سازش کرنے کے لئے متحد ہو گئے۔ ان امراء نے جگہ جگہ رضیہ کے خلاف بغاوتیں شروع کر دیں۔ عوام بھی دنگ تھے کہ یاقوت کو اتنی جلدی امارت کا اعزاز کیوں بخشا گیا ہے۔ عوام کی زبان پر کسی کو قابو نہیں۔ لہذا یاقوت اور رضیہ کے بارے میں عشق و محبت کے قصے بھی مشہور ہو گئے۔ دراصل سلطانہ رضیہ بڑی پاک دامن ملکہ تھی۔ ہم عصر مورخین نے یاقوت اور رضیہ کے

عشق کی جانب اشارہ تک بھی نہیں کیا۔ اس عشق و محبت کی داستان کو تقریباً چار سو سال بعد فرشتہ کی تاریخ میں بیان کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ فرشتہ کا قول مستند نہیں ہو سکتا لیکن ہندو اور انگریز مورخ مزے لے لے کر یاقوت اور رضیہ کے عشق کے افسانے کو بیان کرتے ہیں اور یہ محض خرافات ہے۔

باغیوں کا سرغنہ: رضیہ کے خلاف سب سے پہلے لاہور میں بغاوت ہوئی۔ لیکن ملکہ نے فوراً زبردست فوج لے کر حملہ کیا اور لاہور کے گورنر اعزازالدین کو اطاعت پر مجبور کیا۔ جونہی رضیہ سلطانہ دہلی پہنچی جا بجا بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ تمام باغیوں کا سرغنہ اختیارالدین التونیہ تھا جو سرہند کا گورنر تھا۔ رضیہ اس کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئی لیکن بھٹنڈا کے قریب التونیہ سے شکست کھا کر گرفتار ہوئی۔ اور التونیہ نے رضیہ کو بھٹنڈے کے قلعے میں قید کر دیا۔ اس لڑائی میں یاقوت بھی کام آیا۔ رضیہ کی گرفتاری کے بعد دہلی کے امراء نے رضیہ کے بھائی معزالدین بہرام کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن رضیہ جیسی سمجھدار عورت قید خانے میں پڑی رہنے والی نہ تھی۔ اس نے التونیہ سے شادی کر لی اور ایک زبردست فوج لیکر دہلی کا تخت و تاج حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوئی بہرام کی فوج نے رضیہ اور اس کے خاوند کو شکست دی۔ لیکن رضیہ ہمت ہارنے والی خاتون نہ تھی۔ چند دنوں کے بعد اُس نے دہلی پر دوبارہ حملہ کیا۔ لیکن کیتھل کے قریب شکست کھائی۔ اس شکست کے بعد رضیہ اپنے خاوند سمیت بھیس بدل کر نکل گئی۔ یہ دونوں ایک جنگل میں جا پہنچے۔ جہاں چند گنواروں نے اُن کے بیش قیمت لباس کے لالچ میں ان کو مار ڈالا۔ بعض مورخین کا خیال یہ ہے کہ کیتھل کے جنگل میں چند ہندو ڈاکوؤں نے ان کو گھیر لیا۔ اور مار ڈالا۔ ایک روایت یہ ہے کہ دونوں خاوند بیوی بھیس بدل کر کیتھل کے جنگل میں سوئے ہوئے تھے کہ چند

گنواروں نے ان کی قبا کے نیچے سے اُن کے جواہرات دیکھ لیے اور اسی للاچ میں ان کو مار ڈالا۔ بہرام کی فوج اُن کے تعاقب میں آرہی تھی۔ اس فوج نے ان دونوں کی لاشوں کو پہچان لیا اور ان کو دہلی پہنچایا۔ رضیہ کی قبر دہلی میں ترکمان دروازے کے قریب ہے جہاں آجکل محلہ بلبل خانہ ہے۔ التونیہ کی قبر کا تاحال سراغ نہیں ملا۔

بہرام کا عہد حکومت

رضیہ کے بھائی معزالدین بہرام نے دو سال حکومت کی یعنی ۱۲۴۰ء تا ۱۲۴۲ء تک اتیگن اس کا نائب سلطنت تھا۔ اور مہذب الدین اُس کا وزیر سلطنت۔ بہرام نااہل ہونے کے علاوہ سادہ لوح بھی تھا۔ اتیگن نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ اس بات پر بہرام ناراض ہوا اور اتیگن کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد بادشاہ نے امیر حاجب بدرالدین سنقر پر لاانتہا نوازشیں شروع کر دیں۔ سنقر نمک حرام نکلا اور اس نے دہلی کے بعض اُمراء کو اپنے ساتھ ملا کر بادشاہ کو تخت سے اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن مہذب الدین نے بہرام پر سازش کا راز افشا کر دیا۔ اور بہرام نے فوراً سنقر کو قتل کروا ڈالا۔ اس کے بعد بہرام نے کئی ایک امراء کے قتل سے ہاتھ رنگے اور لوگ اُسے ظالم کہنے لگے اُمراء بھی اس کی بدعنوانیوں سے بیزار تھے لہٰذا دہلی میں ایک زبردست سازش کا جال پھیلایا گیا تاکہ بہرام کو تخت سے علیحدہ کیا جائے اس دوران میں منگولوں نے لاہور پر حملہ کر کے وہاں کے حاکم اختیارالدین کو بھگا دیا اور لاہور میں خوب قتل و غارت کیا۔ منگولوں کا سدباب کرنے کے لئے دہلی سے ایک فوج روانہ کی گئی۔ لیکن سازش کی بنا پر یہ فوج لاہور جانے کی بجائے دہلی پلٹ آئی اور شہر پر قبضہ کر کے بہرام کو قتل کر ڈالا۔

علاؤالدین مسعود

بہرام کی موت کے بعد امراء نے رکن الدین فیروز کے خوردسال بیٹے علاؤالدین مسعود کو تخت پر بٹھایا

اور مہذب الدین اس کا وزیرِ سلطنت مقرر ہوا۔ سب اختیارات وزیر کے ہاتھ میں تھے۔ لیکن امراء کی گروہ بندیاں بڑھ گئی تھیں اور ملک بھر میں بدانتظامی پھیلی ہوئی تھی۔ مسعود ۱۲۴۶ء تک حکمران رہا لیکن یہ زمانہ از حد پرآشوب تھا۔ ترکی امراء نے سازش کر کے مہذب الدین کو قتل کر دیا اور آپس میں اختیارات بانٹ لیے۔ مسعود برائے نام بادشاہ تھا اور امراء من مانی کارروائیاں کرتے تھے۔ مہذب الدین کے قتل کے بعد ترکی امراء کی جتھہ بندی نے بلبن کو امیر حاجب مقرر کیا۔ جس نے اپنی لیاقت سے انتظام ملکی کو سنوارا۔ بلبن نے منگولوں کے حملوں کا بھی منہ توڑ جواب دیا اور فوج کو از سرِ نو ترتیب دی۔ چنانچہ ۱۲۴۵ء میں جب منگولوں نے دوبارہ حملہ کیا اور سرحدی قلعے اُچ پر قبضہ کر لیا تو بلبن ایک زبردست فوج لے کر روانہ ہوا اور منگولوں کو مار بھگایا۔ اس سے شاہی دبدبہ دوبارہ قائم ہوا۔ لیکن بلبن کی اس فتح کی بدولت مسعود بہت زیادہ مغرور ہو گیا۔ اور اس نے چھوٹی چھوٹی باتوں پر امراء کو قتل کرانا شروع کر دیا۔ جبر و استبداد کا زمانہ دیر تک نہ رہ سکا کیونکہ امراء نے سازش کر کے مسعود کو قید کر لیا۔ اور ۱۲۴۶ء میں اُسے مروا ڈالا۔ اس کے بعد امراء نے التمش کے سب سے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود کو تخت پر بٹھایا۔

ناصر الدین محمود

ناصر الدین محمود اگرچہ جوانی کے عالم میں بادشاہ بنا لیکن وہ صوفی منش متقی اور پرہیزگار انسان تھا۔ وہ حد سے زیادہ نرم دل، منصف مزاج اور خدا ترس تھا۔ اس نے بادشاہی میں بھی درویشی اختیار کی۔ ناصر الدین خوش اخلاق اور منکسر المزاج تھا۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کی طرح اُس نے اپنی زندگی رعایا کی بہبودی کے لئے وقف کر دی اور شاہی خزانے کو ذاتی جاگیر نہ سمجھا۔ ناصر الدین محمود

عمدہ کاتب تھا۔ قرآن مجید کے نسخے کتابت کر کے روزی کماتا تھا۔ شاہی محل سے نوکر چاکر اور لونڈیوں کو جواب مل گیا۔ ملکہ خود کھانا پکاتی تھی اور گھر کا تمام کام کاج خود ہی کرتی تھی۔

ناصر الدین مرنجان مرنج بزرگ قسم کا انسان تھا۔ کسی کی دل شکنی نہ کرتا تھا۔ اس کی نرم دلی کے بارے میں کئی ایک قصے اوراقِ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ایک بار ایک شخص نے اُس کے کتابت کئے ہوئے قرآن مجید کے نسخے میں کوئی غلطی بتائی ناصر الدین نے بلا تامل اُس غلطی کو درست کر لیا۔ لیکن اس شخص کے چلے جانے کے بعد اُس جگہ کو چھیل کر پھر پہلے ہی الفاظ لکھ دیئے۔ جب امراء نے وجہ دریافت کی تو وہ بولا ''دراصل یہ شخص غلط کہہ رہا تھا لیکن میں ایسے شخص کی دل شکنی نہ چاہتا تھا جو اتنی مہربانی کرے کہ مجھے میری غلطیوں سے آگاہ کرے''

اُس پُر آشوب زمانے میں ناصر الدین محمود جیسے نرم دل بادشاہ کی ناکامی لازم تھی۔ لیکن ناصر الدین نے بہاؤ الدین بلبن کو اپنا وزیر سلطنت مقرر کیا۔ اس وزیر کے تدبر کی بدولت سلطنت کا انتظام نہایت اعلیٰ طریقے پر ہوا۔ بعد میں یہی وزیر غیاث الدین بلبن کے نام سے بادشاہ بنا۔ ناصر الدین محمود نے ۱۲۴۶ء سے لے کر ۱۲۶۶ء تک بیس برس حکومت کی۔ لیکن اس کی کامیابی کا سہرا در اصل بلبن کے سر پر ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود کے عہد کی تاریخ محض اُس کے وزیر کے کارناموں کی سرگزشت ہے۔

بلبن جابر اور سخت گیر تھا۔ لیکن امورِ سلطنت سے بخوبی آگاہ تھا۔ ناصر الدین محمود نام نہاد بادشاہ تھا۔ اصلی اختیارات تمام کے تمام بلبن کے ہاتھ میں تھے اور سلطنت کے سب کام بلبن کی مرضی کے مطابق ہی طے پاتے تھے۔ مسعود کے قتل کے بعد بلبن نے ناصر الدین محمود کو تخت نشین کرانے میں بہت

زیادہ کوشش کی تھی اسی لئے خوش ہو کر بادشاہ نے بلبن کو اپنا وزیر سلطنت یعنی وزیر اعظم بنایا تھا۔ اور بعد ازاں سلطنت کے تمام کام اُسی کو سونپ کر خود زہد و عبادت میں مشغول رہا۔ بعد ازاں بلبن کی لڑکی سے ناصر الدین محمود نے شادی کر لی۔ اس سے بلبن کا اقتدار اور بھی بڑھ گیا۔ اور وہ سلطنت کے تمام کاموں میں سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد بلبن کا اقتدار اس قدر زیادہ تھا کہ وہ آسانی سے بادشاہ بن بیٹھا۔

ناصر الدین محمود کا عہد حکومت

جب ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا تو ملک بھر میں افرا تفری پھیلی ہوئی تھی۔ شاہی دربار امراء کی سازشوں کا مرکز تھا۔ اور امراء ذاتی اقتدار کی بدولت سلطنت کو بھی نقصان پہنچانے پر آمادہ رہتے تھے۔ دوآبہ کے ہندو اور میواتی سرکش ہو چکے تھے۔ اور مسلمان حکمرانوں کی ذرہ بھر پرواہ نہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ منگول قوم پے در پے حملوں کی بدولت دہلی سلطنت کے لیے سوہان روح تھی۔ منگول سفاک اور خونخوار تھے اور قتل و غارت کے شوقین۔ کئی بار وہ دہلی تک آپہنچے تھے۔ لہذا اس زمانے میں تمام مشکلات پر قابو پانا اور شاہی اقتدار کو بحال کرنا آسان امر نہ تھا۔ کم ازکم ان حالات میں ناصر الدین محمود تو ضرور ناکام ثابت ہوتا۔ لیکن اس کے لائق وزیر بلبن کی بدولت اس کا عہد حکومت انتہائی کامیاب ثابت ہوا۔ اور تمام مشکلات پر قابو پانے کے بعد ملک میں بھی کامل طور پر امن و امان قائم ہوا۔

بلبن کی کامیابی کا راز سخت گیری اور جبر تھا۔ وہ خون گرانے سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ اور دشمن پر رحم کرنا بالکل نہ جانتا تھا۔ ہندو مورخ اسے سنگدلی

کہتے ہیں۔ لیکن اس نے جابرانہ پالیسی اختیار کر کے ملک کو ایسا سیدھا کیا کہ آئندہ چالیس سال تک کسی نے سر اٹھانے کی جرأت نہ کی۔

سب سے پہلے بلبن نے ۱۲۶۶ء میں ایک زبردست فوج لے کر دوآبہ کے سرکش اور باغی ہندوؤں کی گوشمالی کی۔ پہلی مہم میں اس نے باغیوں کا قلع قمع کر کے جمنا سے لے کر کانجر تک کا تمام علاقہ دوبارہ فتح کیا اور یہاں شاہی رعب و داب قائم کیا۔ دوسری مہم میں اس نے میوات اور رنتھمبور کے راجپوتوں کی بغاوت کو دور کیا۔ اور چنبل تک تمام علاقے کو مسخر کیا۔ اس کے بعد بلبن نے باقی ماندہ باغیوں کا صفایا کیا۔ گوالیار اور بندھیل کھنڈ کے مضبوط قلعے بھی اس نے دوبارہ فتح کئے اور چندیری اور مالوہ کے علاقوں کو بھی سرکشوں سے پاک کیا۔ بہرام اور مسعود کے زمانے میں سلطنت دہلی کی ساکھ ختم ہو گئی تھی اور تمام علاقے شاہی اقتدار کو بھول کر سرکش ہو چکے تھے۔ بلبن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تمام دور افتادہ علاقوں کو بھی دہلی کے شہنشاہ کا مطیع و فرمانبردار بنایا اور شاہی اقتدار کو دوبارہ بحال کیا۔

منگولوں کی روک تھام:- ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کہ چنگیز کے زمانے سے منگول قوم منظم ہو چکی تھی۔ اور وسط ایشیا پر چھا جانے کے بعد یہ وحشی اور خونخوار لوگ بار بار برصغیر ہند و پاکستان پر حملہ آور ہوتے تھے۔ یہ لوگ بلا کے شہسوار تھے۔ برق رفتاری سے آگے بڑھتے تھے اور قتل عام ان کا وطیرہ تھا۔ ان خونخوار وحشیوں کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ بلبن نے منگولوں کے خطرے کی روک تھام کے لئے باقاعدہ سرحدی پالیسی وضع کی جو اتنی عمدہ تھی کہ بعد میں بھی اکثر سلاطین اس پر عمل پیرا رہے۔ اس نے سب سے پہلے سرحدی علاقوں میں گکھڑ قوم کو کچل ڈالا۔ وجہ یہ تھی۔ کہ منگولوں کے حملے کے وقت یہ لامذہب لوگ

اُن کے ساتھی بن جاتے تھے اور لوٹ مار کے بعد پھر ہندوستان کی سرحد پر ہی ڈیرے ڈالے رہتے تھے۔ بلبن نے گکھڑوں کی سرکوبی کے بعد شمالی مغربی سرحد پر ایک اعلیٰ فوجی افسر مقرر کیا جسے (Warden of marches) کہتے ہیں اس فوجی گورنر کا فرض یہ تھا کہ سرحد پر ہی منگول حملہ آوروں کو روکے۔ سرحد پر بلبن نے اہم فوجی قلعے تعمیر کئے۔ اور ان میں باقاعدہ فوج اور خوراک مہیا کی تاکہ منگول سرحد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ اس زمانے میں منگول دہلی پہنچنے کے لئے دو راستے اختیار کرتے تھے۔ ایک راستہ درّہ خیبر سے پشاور اور لاہور کی جانب سے تھا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ مختلف دروں سے نکل کر کوئٹہ اور سنام کے راستے اُچ اور ملتان پہنچ جاتے تھے اور وہاں سے دہلی پر حملہ آور ہوتے تھے بلبن نے ان دونوں راستوں کے درمیان اہم فوجی چھاؤنیاں اور قلعے تعمیر کرائے اور ان میں زبردست فوج رکھی۔ اگر سرحدی گورنر کو شکست بھی ہو جاتی تو منگولوں کو چپہ چپہ زمین کے لئے لڑنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ بلبن نے دہلی میں بھی زبردست شاہی فوج رکھی۔ جو کمک کے لیے ہر مقام پر جا سکتی تھی اور دہلی کے قریب وجوار میں دشمن کا سر کچلنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھی۔

بلبن کی سرحدی پالیسی اسقدر کامیاب ثابت ہوئی کہ منگولوں کو ہر حملے میں مُنہ کی کھانی پڑی۔ چنانچہ منگولوں کے سردار ہلاکو خاں نے دہلی میں اپنا سفیر بھیجا اور دہلی سلطنت سے صلح کر کے دوستانہ تعلقات قائم کئے۔

عماد الدین ریحان ۔ بلبن مسعود کے زمانے سے ہی ترکی اُمراء کا سرغنہ تھا۔ لیکن وہ امراء جن کو اعلیٰ عہدے نہ ملے تھے۔ اس کے مخالف تھے ہندی امراء کا گروہ بھی کافی طاقتور بن چکا تھا۔ اور ان کا سردار عماد الدین ریحان تھا اس کی سرکردگی میں بلبن کے مخالفین متحد ہو گئے۔ اور سب نے مل کر بلبن کے

خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دئے۔ چنانچہ ناصرالدین محمود نے ۱۲۵۳ء میں بلبن کو وزارت سے برطرف کر کے دہلی سے جلا وطنی کا حکم دیا بلبن مجبور ہو کر ہانسی چلا گیا جہاں اس کی جاگیر تھی۔ عمادالدین ریحان کو سلطان نے وزیر مقرر کیا۔ یہ شخص نو مسلم تھا اور ہندی امراد کا سربراہ تھا۔ عمادالدین ریحان تقریباً ایک سال برسر اقتدار رہا۔ اور اس عرصے میں اُس نے بلبن کے حامی افسران کو برطرف کر دیا۔ اور اپنے گروہ کے آدمیوں کو تمام کلیدی آسامیوں پر فائز کیا۔ اس نے کشلو خان اور شیر خان جیسے عمدہ جرنیلوں کو بھی برطرف کر دیا۔ اور اس نے اپنے رفیق ارسلان کو سرحدی علاقوں کا گورنر بنایا۔ طبقات ناصری کے مصنّف قاضی منہاج السراج کو بھی محکمۂ عدل سے برطرف کر دیا۔ یہ ہم عصر مورّخ عمادالدین ریحان کو مرتد اور لامذہب قرار دیتا ہے۔ اور اُسے کمینہ اور اوباش لکھتا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ عمادالدین ریحان نے محض دنیاوی فائدے کے لئے ہندو مذہب ترک کیا تھا۔ موجودہ دور کے مورّخ قاضی منہاج السراج کے بیان کو پارٹی بازی اور ذاتی دشمنی پر محمول کرتے ہیں اس فاضل مصنف کے بیان کردہ تمام حالات مستند ہیں لیکن عمادالدین ریحان کے بارے میں وہ جذبات کی رو میں بہ گیا ہے۔

عمادالدین ریحان سلطنت کے کام خوش اسلوبی سے نہ چلا سکا۔ اس کے علاوہ ترکی امراء نے ہندی فوقیت کے خلاف پھر اتحاد کیا۔ اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ ترک گورنروں کی فوجیں بلبن کی قیادت میں دہلی کی جانب بڑھیں ناصرالدین محمود نے باہمی خانہ جنگی کو روکنے کے لئے عمادالدین ریحان کو معزول کر دیا۔ اور بلبن کی شرائط مان لیں۔ صلح کی رو سے بلبن کو وزارت پر بحال کر دیا گیا۔ اور عمادالدین ریحان کے افسران کو بھی برطرف کر دیا

گیا۔ بلبن کی واپسی گویا ایک انقلاب تھا۔ ترکی امراء کا اقتدار پھر بحال ہو گیا۔ اور بلبن کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ بلبن نے اپنے مخالفین کا زور بالکل ختم کر ڈالا۔ قتلغ خان حاکم اودھ نے ریحان سے مل کر بغاوت کی۔ لیکن بلبن کے جرنیل تاج الدین سنجر کے ہاتھوں شکست کھائی۔ ریحان مارا گیا اور اسکے رفقاء کا بھی قلع قمع کیا گیا۔ بلبن کی بحالی کے بعد سلطان اسی طرح یاد خدا میں مصروف رہا۔ اور بلبن سلطنت کے تمام امور میں سیاہ و سفید کا مالک تھا ۱۲۵۷ء میں منگولوں نے نوئین سالار کی سرکردگی میں ہندوستان پر حملہ کیا اور ملتان تک بڑھ آئے۔ بلبن نے شیر خان کو ایک زبردست فوج سمیت ملتان بھیجا۔ شاہی فوج کی آمد پر منگولوں نے حوصلہ ہار دیا۔ اور وہ بھاگ اٹھے اسی طرح ۱۲۶۰ء میں میواتیوں نے دوبارہ بغاوت کی اور مسلمانوں کے کئی گاؤں تباہ کر دیئے۔ بلبن نے زبردست فوج لے کر میواتیوں کو کچل ڈالا میواتی جنگلوں کو بھاگ گئے۔ لیکن بلبن نے وہاں بھی اُن کا پیچھا نہ چھوڑا اور میواتیوں کو چن چن کے قتل کر ڈالا۔ چنانچہ کم از کم بارہ ہزار میواتی تلوار کی نذر ہوئے اس سخت گیر پالیسی کو بلبن کی خون آشامی {"Blood and Iron" policy} گنا جاتا ہے اور ہندو مورخ اُسے ظالم۔ بے رحم اور سفاک گنتے ہیں۔ لیکن ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ بلبن کا اصول تھا۔ کہ دشمن پر کبھی رحم نہ کیا جائے بلکہ اتنی سختی کی جائے کہ باغیوں کے لئے باعث عبرت ہو۔ دشمن کی بیخ کنی بہتر ہے۔ تاکہ بار بار بغاوت کو فرو نہ کرنا پڑے۔ وہ دشمنوں کو تہ تیغ کر کے بدی کا سرچشمہ ہی بند کر دینا چاہتا تھا۔ قرون وسطیٰ میں نرم دلی کی پالیسی کمزوری گنی جاتی تھی۔ بلبن نے حالات کا اچھی طرح جائزہ لے کر سخت گیرانہ پالیسی اختیار کی۔ اور وہ اسی پالیسی کی بنا پر کامیاب ہوا۔

۱۲۶۶ء میں نیک دل بادشاہ ناصر الدین محمود نے وفات پائی۔ اُسوقت اس کی نرینہ اولاد زندہ نہ تھی۔ نیز التمش کی نسل سے بھی کوئی شخص زندہ نہ تھا۔ لہٰذا بلبن اپنے آقا کے بعد تخت نشین ہوا۔ اور بیس سالہ وزارت کے تجربہ کی بنا پر کامیاب ترین سلطان ثابت ہوا۔ اُس کا عہد حکومت ۱۲۸۶ء تک تھا۔ یعنی اُس نے بیس برس بادشاہت کی۔

سلطان غیاث الدین بلبن کا عہد حکومت

سلطان غیاث الدین بلبن ہند و پاکستان کی تاریخ میں عظیم ترین شخصیت ہے اُس کا دور عدل و انصاف۔ خوشحالی اور امن و امان کی بنا پر مشہور ہے ایشوری پرشاد کے قول کے مطابق بلبن خاندانِ غلاماں کا اہم ترین فرمانروا ہو گزرا ہے۔ اس کے بغیر یہ خاندان ۱۲۶۶ء ہی میں زوال پذیر ہو جاتا۔ مورخ بے شک اُسے بے رحم۔ انسانی خون کا پیاسا اور سفاک کہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے دور کا کامیاب ترین شخص تھا۔ جس نے وزارت اور بادشاہت کے دوران میں سخت گیرانہ پالیسی سے حیران کن کامیابی حاصل کی۔ وہ جرمنی کے سیاست دان بسمارک کی مانند آہنی عزم کے ساتھ فوراً ہی دشمنوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا تھا۔ چونکہ اطاعت قبول کر کے بلبن کو سر سے ٹال دینا ناممکن تھا۔ لہٰذا باغی اور سرکش لوگ سہم گئے اور بغاوتیں ختم ہو گئیں۔ سلطنت کی بہتری اسی جابرانہ پالیسی میں مضمر تھی۔ چالیس سال تک ملک بھر میں مکمل امن و امان کی بدولت رعایا خوشحال ہو گئی اور شاہی وقار اور دبدبہ بڑھ گیا۔

ابتدائی زندگی

بلبن ترک نسل سے تھا اور اس کا باپ البری قبیلے کا سردار تھا۔ ترکستان پر جب منگولوں نے حملہ کیا تو بلبن کا قبیلہ

منتشر ہو گیا۔ بلبن اور اس کا بھائی کشلو خان کم سن تھے۔ منگولوں نے ان کو گرفتار کر لیا اور غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ غلامی کے ایام میں وہ بھائی سے بچھڑ گیا اور اس نے خواجہ جمال الدین بصری کے ہاں تربیت پائی۔ بعد میں بکتا بکاتا بلبن گجرات پہنچا اور پھر دہلی میں سلطان التمش نے اُسے خرید لیا۔ اس کا اصلی نام بہاؤ الدین تھا۔

مشہور ہے کہ ابتداء میں التمش نے بلبن کو سقّے کا کام سونپا۔ اسی طرح مشہور ہے کہ بلبن از حد بد صورت تھا۔ چنانچہ جب غلاموں کا سوداگر صدہا غلام لے کر حاضر دربار ہوا تو التمش نے تمام غلام خرید لے لیکن بلبن کو نہ خریدا اس پر بلبن نے درخواست کی کہ اے سلطان مجھے اپنے لئے نہ سہی۔ خدا کے لئے خرید لے۔ التمش خوش ہوا اور اسے بھی خرید لیا بلبن کو کچھ عرصے کے بعد خاصہ دار مقرر کیا گیا۔ اسی دوران میں بلبن کا بھائی کشلو خان اور اُس کا چچا زاد بھائی شیر خان بھی غلام بن کر دہلی پہنچے اور اسی اتفاقیہ ملاپ پر تینوں از حد خوش ہوئے۔

اُلغ خان کا خطاب:۔ التمش نے بلبن کی لیاقت سے متاثر ہو کر اسے جلد ہی ترقی دی اور وہ آزاد ہو کر اعلٰی عہدوں پر سرفراز ہوا۔ بعد میں وہ امرائے چہلگانی میں شامل ہو گیا۔ اور دن بدن اس کا وقار بڑھنے لگا سلطانہ رضیہ کے زمانے میں بلبن کو میر شکار کا عہدہ عطا ہوا۔ لیکن رضیہ کی بجائے بلبن نے اُس کے بھائی بہرام کا ساتھ دیا۔ اور ۱۲۳۹ء میں بلبن بھی باغی اُمراء کی صف میں شامل تھا۔ بہرام کو تخت پر بٹھانے کے لئے بلبن نے کارہائے نمایاں کئے۔ بہرام نے خوش ہو کر ہانسی اور ریواڑی کی جاگیر بلبن کو بخشی اور اسے میر شکار کے عہدے پر بحال رکھا۔

بلبن اعلیٰ جرنیل تھا اور منگول بھی اُس کی فوجی قابلیت کو مانتے تھے ۱۲۴۳ء میں سلطان مسعود کے زمانے میں اُس نے منگولوں کے حملے کو ناکام بنایا جب منگول سردار مانگو خان نے اُچ کے قلعے کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ تو بلبن نے اُس کے مقابلے کے لئے فوج ترتیب دی اور منگولوں کو شکست دے کر مار بھگایا۔ سلطان مسعود نے خوش ہو کر اُسے امیر حاجب یعنی وزیر دربار بنا دیا۔ ناصر الدین محمود کی تخت نشینی بلبن ہی کی مرہونِ محنت تھی۔ لہذا نئے سلطان نے بلبن کو مزید ترقی دے کر وزیر سلطنت یعنی وزیر اعظم بنا دیا۔ سلطان ناصر الدین نے ۱۲۴۶ء میں تخت نشین ہوتے ہی بلبن کو اُلغ خان یعنی خان اعظم کا خطاب دیا۔ بعض مورخین غلطی سے اُلغ خان ہی بلبن کا اصلی نام سمجھتے ہیں۔ ناصر الدین محمود کے عہد حکومت میں اس لائق وزیر نے سلطنت کا کام نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔

بلبن کے عزائم

تخت نشین ہونے پر بلبن کے سامنے تین عزائم تھے۔

(۱) مرکزی سلطنت کا انتظام۔ شاہی اقتدار کی بلندی اور امراء کی طاقت کو کچلنا۔

(۲) ہندوؤں کی سرکشی اور باغیانہ خیالات کو ختم کر کے ملک میں مکمل امن و امان قائم کرنا اور شاہراہوں کو رہزنوں سے پاک کرنا۔

(۳) منگولوں کی روک تھام کر کے سلطنت کو بیرونی حملوں سے بچانا۔

ان تمام عزائم میں بلبن کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ بادشاہ بن کر بھی وہ جابرانہ اور سخت گیرانہ پالیسی پر قائم رہا اور سرکشوں اور باغیوں کا قلع قمع کر کے چھوڑا۔ اس کی سختی کی بنا پر کسی کو بغاوت کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

بلبن کو ہندو اور انگریز مورخ ظالم اور سفاک گنتے ہیں۔ لیکن حضرت

دشمنوں پر رحم کرنا نہ جانتا تھا۔ اور اُن کی بیخ کنی کر کے دم لیتا تھا۔ رعایا کے ساتھ اُس کا سلوک مشفقانہ تھا۔ اُس جیسا نیک دل اور عادل بادشاہ دہلی کے تخت پر نہ بیٹھا تھا وہ شائستگی۔ عمدہ اخلاق اور علم کا پتلا تھا۔ متقی اور پرہیز گار تھا۔ چنانچہ بادشاہ بنتے ہی اُس نے شراب نوشی کو بند کر دیا۔ اور خلاف شرع کاموں کو گوارا نہ کیا۔ وہ رعایا میں ہر دل عزیز تھا۔ کیوں کہ لوگ اس کے عدل و انصاف اور مکمل امن و امان کی بدولت خوشحال ہو گئے تھے۔ اس کی خون ریزی کی پالیسی صرف سرکشوں اور باغیوں کے لئے تھی۔ باغی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان وہ کسی پر ذرہ بھر رحم نہ کرتا تھا۔ وہ دشمن کے سر پر تیزی سے پہنچتا تھا۔ اور اس کا خون گرائے بغیر دم نہ لیتا تھا۔

سفاکی اور بے رحمی کے چند نمونے

ہم اس بات کو واضح کر چکے ہیں کہ بلبن طبعاً ظالم یا سفاک نہ تھا صرف دشمنوں پر رحم کرنا نہ جانتا تھا اُس کا قول تھا کہ کمزور دشمن پر رحم کرنا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا۔ کہ جس دماغ میں بغاوت کا خیال آ جائے اس سر کو قلم کر دینا لازم ہے۔ وہ زبردست فوج لے کر طوفانی حملہ کرتا تھا۔ اور فوراً دشمن کے سر پر جا پہنچتا تھا۔ وہ آہنی عزم کا مالک تھا۔ اور مناسب موقع پر دشمن کا خاتمہ کر ڈالتا تھا۔ بلبن کے دشمن کے سامنے یا تخت یا تختہ ہوتا تھا۔ اور کسی صورت میں بلبن کو سر سے ٹالنا ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلبن کے دور میں کسی کو بغاوت کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن جس کسی نے بغاوت کی بلبن نے خونریزی سے دریغ نہ کیا۔ اسے خون آشام پالیسی کہتے ہیں ("Blood and iron policy) ناصرالدین محمود کے زمانے میں بھی بلبن اسی پالیسی پر کاربند تھا۔ بادشاہ بننے پر اس پالیسی میں ذرہ بھر تبدیلی نہ ہوئی۔ امن پر آشوب زمانے

میں سخت گیری کی یہ پالیسی از حد کامیاب رہی۔ بلبن کے زمانے کی چند اہم بغاوتوں کا حال درج ذیل ہے۔

۱۔ میواتیوں کی سرکوبی:- اُس زمانے میں دہلی سے لے کر راجپوتانے تک ہندو قوم آباد تھی۔ جسے میواتی کہتے تھے۔ یہ لوگ بڑے بہادر تھے۔ لیکن رہزنی اور لوٹ مار کو باعث فخر اور آبرومندانہ پیشہ سمجھتے تھے۔ جب بھی مرکزی حکومت کمزور ہوتی یہ لوگ شیر ہو جاتے تھے اور دہلی پر بھی ڈاکہ زنی سے باز نہ آتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کے ڈر سے اہالیان دہلی سر شام ہی سے شہر کے دروازے بند کر لیا کرتے تھے۔ شاہی فوج کی آمد پر میواتی آس پاس کے جنگلوں میں چھپ جاتے تھے۔

۱۲۶۶ء میں جب بلبن تخت نشین ہوا تو میواتی ایک غریب سقے کی لڑکی کو اٹھا کر لے گئے۔ بلبن نے میواتیوں کی سرکشی ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور ایک سال تک وہ فوج لے کر میواتیوں کا صفایا کرتا رہا۔ اس نے اپنی فوج جنگلوں میں بھی پھیلا دی اور جانوروں کی طرح میواتیوں کا شکار کیا۔ بلبن نے ہزاروں میواتیوں کو تہ تیغ کر ڈالا اور اُن کو امن پسندانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ بلبن کے دور میں میواتی امن پسند کاشتکار بن گئے۔ اور رہزنی کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

بلبن نے میواتیوں کے علاقے میں مستقل طور پر امن قائم کرنے کے لئے چند مزید تدابیر اختیار کیں۔ اس نے اس علاقے میں مختلف مقامات پر افغانوں کی بستیاں قائم کیں۔ تاکہ میواتیوں کو درست کرنے والے ہمیشہ ان کے سر پر موجود رہیں۔ اور میواتیوں کو حکومت کے خلاف بغاوت کا موقع نہ ملے۔

بلبن نے جنگلات صاف کرا دئے تاکہ ڈاکہ زنی کے بعد میواتیوں کو چھپنے کا

موقع نہ ملے۔ اس کے علاوہ بلبن نے پولیس کا باقاعدہ نظام قائم کیا۔ اور علاقہ کو تھانہ دار تقسیم کیا۔ ہر تھانہ کا افسر امن و امان قائم کرنے کا ذمہ دار تھا۔ ان تدابیر سے میواتیوں کو مجبوراً امن پسند شہری بننا پڑا۔

۲۔ دوآبہ میں باغیوں کا استیصال:۔ دریائے گنگا اور جمنا کا درمیانی علاقہ بڑا شاداب ہے اور دوآبہ کہلاتا ہے۔ اس علاقے کے ہندو فطرتاً سرکش اور باغی تھے۔ التمش کے زمانے سے یہ لوگ بار بار سر اٹھاتے تھے اور مرکزی حکومت کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ان لوگوں نے بلبن کے ابتدائی دور میں ڈاکہ زنی سے اس قدر اودھم مچایا کہ دہلی سے بنگال تک کی تمام سڑکیں غیر محفوظ ہو گئیں اور ملکی تجارت کو سخت دھکا لگا۔ بلبن نے ۱۲۶۷ء میں فوج کشی کی۔ اور کئی مہینے صرف کر کے دوآبہ کو سرکشوں اور باغیوں سے صاف کیا۔ قزاقوں کے اہم مقامات میں شاہی فوج نے بیدردی سے لوگوں کو قتل کیا۔ اور مکمل خاندانوں کا صفایا کیا۔ بلبن نے ہر رہزن کو گرفتار کرنے یا اس کا سر کاٹ لانے کے عوض میں ایک ٹنکہ انعام مقرر کیا۔ سلطان نے مختلف مقامات سے جنگلات صاف کر کے رہزنوں کے لئے جینا حرام کر دیا اور کاٹھیر (بدایوں)، کنپل۔ پٹیالی اور بھوج پور میں مضبوط قلعے بنوائے تاکہ مقامی طور پر آئندہ کے لئے باغیوں کی سرکوبی ہو سکے۔ اس کے علاوہ بلبن نے مختلف مقامات پر فوجی چوکیاں بٹھائیں اور تھانہ دار تقسیم سے امن و امان قائم کیا۔

۳۔ روہیل کھنڈ کی شامت:۔ جونہی بلبن دوآبہ سے فارغ ہوا کٹھیر کے ہندوؤں نے لوٹ مار شروع کر کے لوگوں کو دق کرنا شروع کیا۔ اس علاقے کو روہیل کھنڈ بھی کہتے ہیں۔ سلطان غضبناک ہو کر کٹھیر جا پہنچا اور فوجی کارروائی کی۔ اس علاقے میں بلبن نے غیر معمولی سختی سے

کام لیا اور سرکشوں کی لاشوں کے پشتے لگ گئے۔ ہندو زمینداروں کو خاص طور پر کچلا گیا اور ان کے حامیوں کی خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ بلبن کی سخت گیرانہ پالیسی کی بدولت جب امن وامان قائم ہو گیا تو سلطان نے جگہ جگہ مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم کیں اور نئی پختہ سڑکیں تعمیر کرائیں تاکہ فوجی نقل و حرکت میں آسانی ہو۔

۴۔ **طغرل کی بغاوت** :- ۱۲۷۹ء میں بنگال کے گورنر طغرل بیگ نے بغاوت کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ بارشوں کا موسم شروع تھا اور سلطان کافی بوڑھا ہو چکا تھا۔ طغرل کا خیال تھا کہ ذرائع آمدورفت کی دشواری کی بنا پر سلطان اس دور افتادہ صوبے پر حملہ آور نہ ہو گا۔ لیکن بلبن آہنی عزم کا مالک تھا۔ اس نے بغاوت فرو کرنے کے لئے فوراً اقدام کیا۔ سب سے پہلے بلبن نے اودھ کے گورنر کو بغاوت فرو کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اُسے شکست ہوئی۔ بلبن نے ایک اور فوج بھیجی لیکن طغرل کو پھر فتح ہوئی۔ اب بلبن غصہ کھا کر برق رفتاری سے بنگال پہنچا۔ طغرل بیگ نے چال یہ چلی کہ میدانی علاقے کو چھوڑ کر جنگلوں کو بھاگ گیا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ بلبن پریشان ہو کر واپس چلا جائے گا۔ لیکن بلبن نے باغی کا تعاقب کیا۔ اور جنگلات چھان مارے۔ جب تک طغرل بیگ قتل نہ ہوا بلبن نے دم نہ لیا۔ طغرل کی موت کے بعد بلبن نے اُس کے حامیوں کو سزا دینے کے لئے بنگال کے پایۂ تخت لکھنوتی میں سربازار صدہا لوگوں کو پھانسیاں دیں۔ تاکہ عوام کے دلوں پر شاہی دبدبہ قائم ہو جائے۔ باغیوں کا صفایا کرنے کے بعد اُس نے اپنے لڑکے بغرا خاں کو بنگال کا گورنر مقرر کیا۔ اور دہلی واپس ہوا۔ واپسی سے پہلے بیٹے سے خطاب کر کے یوں گویا ہوا، "تم نے طغرل کا انجام دیکھ لیا۔

ہو گا۔ یاد رکھو اگر تم نے بنگال سے ہاتھی بھیجنے بند کر دئے۔ تو شمالی ہند سے ایک گھوڑا بھی بنگال نہ پہنچ سکے گا۔

ان تمام مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلبن دشمنوں کے مقابلے پر بے رحم سخت گیر اور خون آشام تھا۔ دشمن پر رحم کھانا یا نرمی کا سلوک کرنا اسکے لئے ناممکن تھا لیکن وہ طبعاً ظالم نہ تھا وہ صرف دشمنوں کے لئے خونریز تھا اور اُن کی مکمل بیخ کنی کے بغیر اسے چین نہ پڑتا تھا۔

مرکزی حکومت کا استحکام

بلبن نے شاہی اقتدار کو بڑھانے کے لئے خاص تدابیر اختیار کیں۔ وہ رعایا کے دل میں شاہی رعب و داب قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ لوگ سرکشی پر آمادہ نہ ہوں۔ اُسنے شاہی دربار کو باعظمت بنایا اور درباری آداب باقاعدہ طور پر مقرر کئے۔ شاہی دربار کی شان و شوکت آنکھوں کو خیرہ کرنیوالی ہوتی تھی اور امراء اور شہزادے باادب کھڑے رہتے تھے۔

منگولوں کی یورش کی بدولت کئی غیر ملکی شہزادے اور تاجدار بلبن کے دربار میں پناہ گزین تھے۔ ان سب کے درجے مقرر تھے۔ بلبن کا لباس امتیازی شان رکھتا تھا۔ بادشاہ اپنا رعب قائم کرنے کے لیے ہمیشہ سنجیدہ اور متین رہتا تھا۔ دربار میں کبھی بھی کسی شخص نے بلبن کو ہنستے ہوئے نہ دیکھا۔ شہزادہ محمد کی موت پر بلبن کو از حد صدمہ ہوا تھا۔ اور سلطان رات بھر بیٹے کے غم میں روتا رہتا تھا لیکن شاہی دربار میں بلبن نے شہزادے کی موت پر ایک آنسو بھی نہ بہایا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بلبن شاہی وقار اور دبدبے کا کس قدر خیال رکھتا تھا۔

۲۔ بلبن نے مرکزی حکومت کو مستحکم کیا اور دور اندیشی سے کام لیکر انتظام ملک کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ فوجی چوکیاں بٹھانا اور قلعہ دار

ضلعوں کی تقسیم اُس کی ذہانت کی دلیل ہیں۔ اُس نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے اور صوبائی گورنر بھی ہر امر میں بادشاہ سے ہدایات طلب کرتے تھے۔

۳) مرکزی حکومت کے مزید استحکام کی خاطر بلبن نے جاگیرداری کے نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ نیز امراء کی طاقت کو بھی کچل ڈالا۔ اُس نے اکثر امراء کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ وفادار امراء کے پاس چند جاگیریں ضرور رہیں لیکن یہ جاگیردار بھی بادشاہ کے رُعب سے ترساں تھے اور اپنے آپ کو اُس کے رحم وکرم پر سمجھتے تھے۔

۴۔ **جاسوسی نظام**۔ بلبن نے ملک بھر میں جاسوسوں کا جال بچھایا ہوا تھا۔ جاسوس بادشاہ کو ملکی حالات سے باخبر رکھتے تھے اور جاگیرداروں اور امراء کے تمام حالات کا بلبن کو پتہ چل جاتا تھا۔ اگر کوئی جاسوس کسی معاملے میں ذرہ بھر بھی سستی برتتا تو اُسے عبرت ناک سزا دی جاتی تھی۔ بدایوں کے جاسوس کو محض اس لئے پھانسی دی گئی۔ کہ اس نے بادشاہ کو اس امر کی اطلاع نہ دی کہ بدایوں کے گورنر نے غصّے کی حالت میں ایک شخص کو کوڑے لگوا کر مروا ڈالا۔

۵۔ بلبن نے سلطنت کے استحکام کے لئے فوج کو از سرِ نو مرتب کیا۔ اُس نے ملک بھر میں فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور دہلی میں زبردست شاہی فوج کو بھی بھرتی کیا۔ وہ پیادہ فوج کی نسبت شہ سواروں کو ترجیح دیتا تھا۔ بلبن کے حکم سے ہاتھیوں کی زبردست فوج مرتب کی گئی اور ان کو باقاعدہ طور پر سدھایا گیا۔ سلطان اپنی فوج کو جنگی مشق بہم پہنچانے کے لئے اکثر اس پاس کے جنگلوں میں شکار کے بہانے نکل جایا کرتا تھا لیکن اُس کا اصلی مقصد

یہ ہوتا تھا کہ اس کے سپاہی تن آسان نہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ صوبائی علاقوں اور سرحدوں سے فوج کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا تاکہ فوج چاک و چوبند رہے۔

عدل وانصاف

بلبن عدل وانصاف کا پتلا تھا۔ اس نے ملک بھر میں باقاعدہ عدالتیں قائم کیں۔ قاضی قانون شرع کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ بادشاہ خود لوگوں کی شکایات سن کر مجرموں کو قرار واقعی سزا دیتا تھا۔ بلبن اگرچہ شرع کا پابند تھا۔ لیکن اس کا عام اصول یہ تھا۔ کہ عوام کو ارتکاب جرم سے باز رکھنے کے لئے عبرت ناک سزائیں دینی چاہئیں۔ بلبن کے انصاف کے سامنے رعایا کے تمام افراد یکساں تھے اس نے بدایوں کے گورنر ملک باربک کو اس لئے کوڑے لگوا کر مروا ڈالا تھا کہ اس نے غصے میں آکر ایک بے گناہ کو اتنے کوڑے لگوائے تھے کہ اس غریب کی موت واقع ہو گئی تھی۔ بعض مورخین نے بدایوں کے گورنر کا نام ملک بقبق لکھا ہے۔ یہ نام درست نہیں۔ اس کا اصلی نام بارہ بک تھا۔ اسی طرح اودھ کے جاگیردار ہیبت خان نے نشہ کی حالت میں کسی کو قتل کر دیا۔ مقتول کی بیوہ نے شاہی دربار میں شکایت کی تو بلبن نے ہیبت خان کو غلام بنا کر بیوہ کے حوالے کیا۔ اور کہا کہ تم جو سلوک چاہو اس سے کر سکتی ہو۔ جاگیردار ہیبت خان نے بیس ہزار ٹنکہ قصاص اس بیوہ کو ادا کیا۔ اور رہائی پائی۔ بلبن نے کئی بار اعلان کیا کہ ہر شخص سے انصاف کیا جائے گا۔ اور کسی شہزادے کی بھی رعایت نہ کی جائے گی۔ بلبن کا عدل وانصاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ ظالم اور سفاک نہ تھا۔ رعایا کے دل میں شاہی رعب وداب گھر کر چکا تھا۔ اور سلطنت کا کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ اسی رعب ودبدبہ اور

سخت گیرانہ پالیسی میں بلبن کی کامیابی کا راز مضمر تھا۔

منگولوں کی روک تھام اور سرحدی پالیسی

بلبن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے منگول حملہ آوروں کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ اس نے ایسی عمدہ سرحدی پالیسی وضع کی کہ منگول شاذ و نادر ہی اس ملک کی سرحدوں کو پار کر سکے۔ دہلی سلطنت چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خان جیسے سفاک اور فاتح کے ہاتھوں محفوظ رہی۔ یہ امر محض بلبن کی دانشمندی اور تدبر کی دلیل ہے۔ اس کی پالیسی مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ بلبن نے پشاور سے دہلی اور سنام سے دہلی تک اہم فوجی ناکوں پر قلعے تعمیر کرائے۔ جن میں ہر وقت کافی فوج ڈیرہ ڈالے رہتی تھی۔ قلعوں میں کافی سامان رسد موجود رہتا تھا تاکہ محاصرہ کی صورت میں فوج مقابلہ کر سکے ان قلعوں میں وفادار اور آزمودہ کار جرنیل متعین تھے۔ اگر منگول سرحدی فوج کو شکست دے کر ملک کے اندر گھس بھی آتے تو سیدھا دہلی پہنچنے کی بجائے اُن کو چپہ چپہ زمین کے لئے لڑنا پڑتا تھا ہر قلعے کے محاصرے میں کئی مہینے لگ جاتے تھے۔ اور اس دوران میں دہلی سے شاہی فوج بھی کمک کو پہنچ جاتی تھی۔

۲۔ بلبن نے ملک کی سرحد پہ ایک اہم فوجی افسر مقرر کیا جو زبردست فوج سمیت وہاں موجود رہتا تھا۔ اس کا یہ فرض تھا کہ منگولوں کو سرحد پہ ہی روکے اور ملک کے اندر گھسنے نہ دے۔ اس افسر کو محافظ سرحد (Warden of Marches) کہتے تھے۔ بلبن نے اپنے چچا زاد بھائی شیر خان کو محافظ سرحد مقرر کیا اس اعلیٰ جرنیل کے ہاتھوں ہر بار منگولوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ شیر خان کی وفات کے بعد بلبن نے اپنے بڑے لڑکے شہزادہ محمد کو محافظ سرحد مقرر کیا۔ اور اس کی وفات کے بعد

بلبن نے اپنے دوسرے لڑکے بغرا خان کو یہ عہدہ عنایت کیا۔ چونکہ محافظ سرحد کا عہدہ نہایت اہم تھا۔ اور ایک زبردست فوج اس کے ماتحت ہوتی تھی اس لئے بلبن اپنے خاص آدمیوں کو یہ عہدہ عطا کرتا تھا۔

۳۔ ملک کے تمام حصوں سے فوج کا باری باری سرحد پر تبادلہ ہو جاتا تھا۔ تاکہ ہر سپاہی کو سرحدی جنگ کی تربیت حاصل ہو جائے۔ موقع پڑنے پر محافظ سرحد اندرون ملک سے مزید فوج منگوا سکتا تھا۔ گویا محافظ سرحد کا درجہ ملکی سپہ سالار کے برابر تھا۔

۴۔ دہلی میں سلطان کے پاس ایک زبردست شاہی فوج (Imperial standing army) موجود رہتی تھی۔ یہ فوج کارکردگی میں بے مثال تھی۔ شاہی باڈی گارڈ کا دستہ اسی فوج کا حصہ تھا۔ اس دستے میں بہترین اور نامور سپاہی شامل ہوتے تھے۔ شاہی فوج سے ہر مقام پر کمک پہنچ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اگر دشمن راستے کے تمام قلعوں کو سر کر کے دہلی پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاتے۔ تو شاہی فوج اُسکا سر کچلنے کے لئے کافی ہوتی تھی۔

۵۔ بلبن شاہی فوج کو بیکار بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ سپاہیوں کو چست و چالاک رکھنے اور انہیں فوجی مشق بہم پہنچانے کے لئے وہ اکثر شکار کے بہانے فوج سمیت جنگلوں میں چلا جاتا تھا۔ منگول سردار ہلاکو خان کو یہ طریقہ بہت پسند آیا اور اُس نے بلبن سے جنگ کرنے کی بجائے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے۔ ہلاکو خان کا سفیر بھی دہلی آیا اور بلبن کے دربار کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

منگولوں کے حملے:۔ بلبن کی وضع کردہ عمدہ سرحدی پالیسی کے باوجود منگولوں نے چند بار ہندوستان پر حملے بول دئے۔ جب بلبن وزیر تھا۔ تو ۱۲۵۷ء میں منگولوں نے اس ملک پر زبردست حملہ کیا تھا۔ اور ملتان تک آ پہنچے تھے۔

بلبن نے شیر خان کو اُن کے مقابلے پر بھیجا۔ جس نے اُن کو مار بھگایا۔ اس کے بعد شیر خاں جب تک محافظ سرحد رہا منگولوں کو حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ منگولوں نے اس زمانے میں کمال عروج حاصل کیا تھا اور بغداد کی تباہی بھی اُن کے ہاتھوں ہو چکی تھی۔ صرف دہلی سلطنت اُن کے حملوں سے محفوظ رہی چنانچہ تمام اسلامی ممالک سے صدہا علماء اور اہل فن دہلی میں پناہ گزین ہوئے۔

۲۔ شیر خاں کی وفات کے بعد بلبن نے شہزادہ محمد کو محافظ سرحد بنایا۔ اور اُسے قاآن ملک کا خطاب دیا۔ ۱۲۷۶ء میں منگولوں نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اس بار منگولوں کا لشکر لا تعداد تھا۔ انہوں نے دریائے ستلج کو بھی پار کر لیا۔ لیکن شہزادہ محمد نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ اور منگولوں کو مار بھگایا۔

۳۔ ۱۲۸۵ء میں منگولوں نے ہندوستان پر پھر حملہ کیا۔ اس بار ان کا سپہ سالار تمر خاں تھا جو خراسان کا گورنر تھا اور بے مثال فوجی قابلیت رکھتا تھا۔ تمر خاں ایک لاکھ بیس ہزار فوج لے کر حملہ آور ہوا۔ اور پنجاب میں گھس کر قتل و غارت کرتا ہوا دیپالپور پہنچا۔ یہاں شہزادہ محمد کی فوج نے اسے شکست دے کر پسپائی پر مجبور کیا۔ شہزادہ محمد کی فوج نے دور تک منگولوں کا تعاقب کیا۔ لیکن شومئ قسمت سے شہزادہ محمد کو گردن پر ایک تیر آلگا۔ اور وہ اُسی جگہ شہید ہو گیا۔ منگولوں نے کئی امراء کو گرفتار کر لیا اور واپس بھاگ گئے۔ امیر خسرو بھی منگول قیدیوں میں تھے۔ شہزادہ محمد کی شہادت سے بلبن کے بڑھاپے کا آسرا جاتا رہا اور سلطان از حد غمزدہ اور افسردہ رہنے لگا۔ بعد میں کسی شخص نے بلبن کو مسکراتے ہوئے نہ دیکھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بیٹے کے غم میں بلبن چند مہینوں میں گھل گھل کر مر گیا۔ شہزادہ محمد اور بلبن کا مقبرہ ایک دوسرے کے پہلو میں ہے یہ دونوں عظیم الشان ہستیاں قطب مینار سے تھوڑی دور دفن ہیں۔

شہزادہ محمد بہادری اور لیاقت میں بے مثال تھا۔ بلبن کا سب سے بڑا لڑکا تھا اور باپ کو از حد عزیز تھا۔ بلبن نے اُسے قاآن ملک کا خطاب دیا تھا۔ شہزادہ محمد علم و فنون کا سرپرست تھا۔ اور اس کی ملازمت میں جلیل القدر علماء اور شعراء تھے۔ سعدیٔ ہند حضرت امیر خسرو اسی کے دربار سے وابستہ تھے امیر خسرو کو شہزادہ نے ملک الشعراء کا عہدہ عطا کیا تھا۔ امیر خسرو شہزادہ کے مصاحب خاص تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مریدان خاص میں سے تھے شہزادہ محمد کو عوام خانِ شہید کہتے تھے۔ امیر خسرو کئی سال منگولوں کی قید میں رہے اور انہوں نے منگولوں کے دلچسپ حالات لکھے ہیں۔ رہائی کے بعد امیر خسرو نے دنیا ترک کر دی۔ اور سنہ ۱۳۲۶ء میں سلطان محمد تغلق کے زمانے میں وفات پائی۔ امیر خسرو کی قبر نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے بیرونی صحن میں ہے۔ ان کی قبر کے قریب ہی حسن دہلوی کی قبر ہے جو امیر خسرو کے دوست اور مشہور صوفی تھے حسن دہلوی نہایت عمدہ شاعر تھے۔ اور وہ بھی نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔

بلبن کی وفات

بلبن نے سنہ ۱۲۸۶ء میں وفات پائی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بلبن شہزادہ محمد کی بے وقت موت پر رات کے وقت زار زار رویا کرتا تھا۔ لیکن دن کے وقت حوصلہ و استقلال کے ساتھ سلطنت کے کام چلاتا تھا۔ غم کی بدولت وہ نحیف و نزار ہو چکا تھا۔ اسے اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خاں کے متعلق یقین تھا کہ وہ سلطنت کا کام چلانے کے لئے نا اہل ہے۔ لہٰذا اُس نے وصیت کی کہ اس کے بعد شہزادہ محمد کے بیٹے کیخسرو کو تخت نشین کیا جائے۔ لیکن امراء نے بغرا خان کے لڑکے کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا کیونکہ وہ کیخسرو کی تلخ مزاجی سے ڈرتے تھے۔

مشہور مؤرخ

خاندان غلاماں کی مشہور ترین تاریخ طبقاتِ ناصری ہے

جو ناصرالدین محمود کے نام پر معنون ہے۔ اس تاریخ کا مصنف منہاج السراج تھا۔ جو سلطان ناصرالدین محمود کے زمانے میں چیف جج (قاضی) تھا۔ یہ شخص ایک زبردست عالم تھا اور بلبن کے نمک خواروں میں تھا۔ عمادالدین ریحان کے عروج پر اسے بھی ملازمت سے جواب مل گیا تھا لیکن بلبن کے دوبارہ عروج پر منہاج السراج کو بھی بحال کر دیا گیا تھا۔ طبقات ناصری بہترین تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور ہم عصر مورخ نے مستند اور چشم دید حالات بیان کیے ہیں۔ عمادالدین ریحان کے سوا باقی تمام حالات مستند اور درست ہیں۔ اور لائق مصنف نے تمام واقعات کو تنقیدی رنگ میں کسی کی رو رعایت کے بغیر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ تاریخ بلبن کی بادشاہت کے زمانے تک ہے۔

بعد کے واقعات کے لیے مستند تاریخ ضیاءالدین برنی کی ہے۔ برنی اس دور کا ہم عصر مورخ نہیں کیونکہ اس کی تاریخ بلبن کے سو سال بعد لکھی گئی۔ لیکن برنی نے پوری محنت اور تحقیق سے واقعات کو لکھا ہے اسے تاریخ نویسی کا شوق تھا اور اس نے بیشتر واقعات اپنے بزرگوں سے سن کر تحریر کیے۔ برنی کے باپ دادا بلبن کے زمانے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لہذا اس کی معلومات کے ذرائع مستند تھے۔ برنی نے اپنی تاریخ کو بلبن کی تخت نشینی سے شروع کیا اور اپنے زمانے تک کے واقعات کو بغیر کسی کی طرف داری کے لکھ ڈالا ہے۔ یورپ والے برنی کو بہترین مورخ مانتے ہیں۔

امیر خسرو نے کئی ایک تاریخی مثنویاں بھی لکھیں۔ ان سے اس زمانے کے اکثر حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن امیر خسرو کی طرز تحریر کافی مشکل ہے۔ امیر خسرو نے منگولوں کے بارے میں خاص طور پر چشم دید حالات لکھے ہیں۔

منگولوں کے مختصر حالات منگول وسط ایشیا کے رہنے والے جنگجو

اور غیر مہذب وحشی تھے۔ منگولیا ان کا اصلی وطن تھا۔ یہ لوگ لامذہب تھے اور اُن کے خون میں ترکوں کی نسبت چینی اثرات زیادہ تھے۔ بارہویں صدی تک منگول قوم کے لوگ منتشر تھے اور خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن امن پسندانہ زندگی کے قائل نہ تھے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ انسانوں کا قتل عام کرتے وقت انہیں رتی بھر تاسف نہ ہوتا تھا۔ جو لوگ اُن کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ جاتے اُن کو وہ غلام بنا لیتے تھے۔

منگول قبیلے آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ لیکن ۱۲۰۳ء میں چنگیز خان ان کا سردار بنا اور اس نے منگولوں میں قومیت کا جذبہ پیدا کر کے اُن کی جنگی صلاحیتوں سے کام لیا۔ اُس کا اصلی نام تموچن تھا۔ لیکن منگول سرداروں کو زیر کرنے کے بعد جب اُس نے اپنی قوم کے لئے ایک وسیع سلطنت قائم کی تو منگول امراء نے اسے چنگیز خاں کا خطاب دیا یعنی شان جنگجو۔

(Perfect warrior)

چنگیزی سپاہیوں نے ایران اور خراسان کی خوارزم شاہی سلطنت کو تباہ و برباد کر ڈالا اور چین تک تمام علاقہ منگولوں کے قبضے میں آ گیا۔ چنگیز خان کے ہاتھوں اکثر اسلامی سلطنتیں برباد ہوئیں۔ چنگیز نے جلال الدین خوارزم شاہ کو پے در پے شکستیں دیں اور اس کے تعاقب میں دریائے سندھ تک آیا۔ سمرقند۔ بخارا۔ مرو۔ غزنی اور ہرات پر منگولوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد منگولوں نے ہندوستان پر بار بار حملے کئے اور سلاطین دہلی کو کبھی بھی چین کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔

امیر خسرو کئی برس منگولوں کے پاس اسیر رہے۔ وہ بیان کرتے ہیں۔

کہ منگول قوم کے لوگ کوتاہ قد لیکن مضبوط جسم والے تھے۔ گھنے بال۔ ہاتھی جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ ناک چپٹی اور ابھرے ہوئے رخسار گردن نہ ہونے کے برابر۔ چنانچہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سر گردن کے بغیر کندھوں پہ دھرے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ خونخوار اور سفاک تھے۔ بلا کے شہسوار اور عمدہ تیر انداز ہوتے تھے۔ صرف ٹھوڑی کے قریب مختصر سی داڑھی ہوتی تھی اور ان میں حرام و حلال کی تمیز نہ تھی۔ کتے اور سور کا گوشت بھی کھا جاتے تھے۔ الغرض یہ لوگ از حد غیر مہذب اور وحشی تھے۔ اور قتل و غارت کے شوقین تھے۔ ان کے چہرے اگرچہ سرخ و سفید ہوتے تھے لیکن یہ لوگ اتنے گندے تھے کہ بدبو کے مارے کوئی شخص ان کے پاس نہ بیٹھ سکتا تھا۔

سلطان بہرام کے زمانے سے منگولوں نے ہر سال ہندوستان پہ حملہ کرنا اپنا شیوہ بنا لیا۔ اور سرحدی علاقوں میں گھس کر لوٹ مار کرنے کے بعد یہ لوگ واپس ہو جاتے تھے بلبن کے عروج نے ان کے حملوں کا سدباب کیا۔

بلبن کے زمانے میں منگولوں کا سردار ہلاکو خاں تھا۔ جسے (Scourge of the world) کہتے ہیں یعنی تازیانۂ خدا۔ ہلاکو خان اپنے دادا چنگیز خان کی مانند خونخوار اور سفاک تھا جس نے بغداد کو برباد کیا۔ اور خلافتِ عباسیہ کا کھوج نکال دیا۔ آخری عباسی خلیفہ مستنصر باللہ اسی ہلاکو خان کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ہلاکو خان نے تمام اسلامی سلطنتوں کو برباد کر ڈالا صرف بلبن کی سلطنت اس کے ہاتھوں بچی۔ ہلاکو خاں بھی لامذہب تھا۔

محمد تغلق کے زمانے میں منگول قوم نے اسلام قبول کر لیا۔ انکا پہلا سلطان سردار پیر محمد تھا جو ہلاکو خان کا پوتا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ تاتاری مغل کہلائے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی یہ قوم اسی طرح جنگجو اور خونخوار

تھی۔ چنانچہ امیر تیمور جس نے دہلی میں قتل عام کا حکم دیا اور تغلق سلطنت کو تباہ کیا۔ اسی نسل سے تھا۔ لفظ مغل اور منگول دراصل ہم معنی ہیں۔ لیکن مغلوں میں ترک خون کی آمیزش زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ منگول سے مراد وحشی اور غیر مہذب لوگ ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ سلجھ گئے۔ اور تاتاری مغل کہلانے لگے۔

خاندان غلاماں کا زوال

بلبن کی وفات پر اُسکا پوتا کیقباد تخت نشین ہوا۔ اسکا عہد حکومت مختصر تھا سنہ ۱۲۹۰ء میں یعنی بلبن کی وفات کے صرف چار سال بعد خلجی امراء نے بلوہ کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور کیقباد کو ذلیل کر کے مار ڈالا۔ یعنی سنہ ۱۲۹۰ء میں خاندان غلاماں کا خاتمہ ہوا۔

کیقباد خوبرو نوجوان تھا اور بادشاہ بنتے ہی عیش و عشرت میں غرق ہو گیا وہ اپنے وزیر نظام الدین کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھا۔ اور ہمیشہ نشے میں مخمور رہتا تھا۔ وزیر کے ایما پر کیقباد نے کیخسرو کو مروا ڈالا اور اُسکے بعد طاقتور امراء کی شامت آئی۔ دراصل نظام الدین امراء کا زور توڑنے کے بعد اپنے لئے میدان صاف کرنا چاہتا تھا۔ ترکی امراء از حد کمزور ہو گئے۔ لیکن دربار میں خلجی امراء کا طاقتور گروہ موجود تھا۔ اور جلال الدین خلجی ان کا سرغنہ تھا۔ ترکی اور خلجی امراء کی باہمی رقابت نے سلطنت کے انتظام کو اور بھی خراب کر دیا اور دربار سازشوں کا مرکز بن گیا۔ بادشاہ مفلوج ہو کر چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ لیکن عیش و نشاط سے باز نہ آتا تھا۔ نظام الدین نے اپنے مخالف امراء کو قتل کروانے کی سازش کی لیکن خلجیوں نے جلال الدین فیروز کی سرکردگی میں بلوہ کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور مارچ سنہ ۱۲۹۰ء میں خلجی خاندان کا پہلا سلطان تخت نشین ہوا۔

Typical Questions

Q. 1. What do you know of the early career and important events of the reign of Qutb-ud-Din Aibak?

Q. 2. Sketch the career of Qutb-ud-Din Aibak and estimate his character and achievements.

Q. 3. What do you know of the reign of Altamish? What marks him out as the real founder of the Sultanate of Delhi?

Q. 4. Give an account of the achievements of Altamish. How far is it true to say that he was the real founder of the Slave Dynasty?

Q. 5. Describe the measures taken by Ghias-ud-Din Balban to prevent the Mongol invasions. How far was he successful?

Q. 6. Briefly describe the character and achievements of Sultan Ghias-ud-Din Balban.

Q. 7. Discuss the character, administrative policy and achievements of Balban.

Q. 8. Trace the career of Balban and give a few instances of his "blood and iron" policy.

Q. 9. What were the measures adopted by Balban to consolidate his empire and strengthen the authority of the Sultan?

Q. 10. Trace the gradual steps by which the Musalmans made themselves master of Northern India in the 13th century.

Q. 11. Briefly sketch the history of the growth and spread of Muslim power in India between 1206 and 1308 A.D.

Or

Describe the conquest of Northern India by the Turks in the 12th and 13th centuries. •

Q. 12. Write short notes on three of the following :—

(*a*) Sultana Razia.
(*b*) Amir Khusroe.
(*c*) Slave system or the Forty.
(*d*) Sultan Nasir-ud-Din Mahmud.
(*e*) Tughril Beg.

امتحانی سوالات

۱۔ سلطان قطب الدین ایبک کی ابتدائی زندگی اور اُس کے عہد حکومت کے حالات بیان کیجئے۔

۲۔ قطب الدین ایبک کی زندگی کے حالات لکھئے اور اس کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے اُس کے کارناموں کو بیان کیجئے

۳۔ سلطان (شمس الدین) التمش کے عہد حکومت کے مشہور واقعات بیان کیجئے۔ اُسے کس بنا پر خاندانِ غلاماں کا ,, اصلی بانی ,, شمار کیا جاتا ہے۔

۴۔ التمش کے کارناموں کا حال بیان کیجئے۔ وہ کس حد تک خاندانِ غلاماں کا اصلی بانی گنا جاسکتا ہے۔

۵۔ غیاث الدین بلبن نے منگولوں کے حملوں کی روک تھام کے لئے کون کون سی تدابیر اختیار کیں؟ ان تدابیر میں اُسے کس حد تک کامیابی ہوئی؟

۶۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا کردار لکھئے۔ اور اس کے کارناموں کا حال سپرد قلم کیجئے۔

۷۔ غیاث الدین بلبن کے کردار۔ انتظامی پالیسی اور کارناموں کا جائزہ لیجئے۔

۸۔ (غیاث الدین) بلبن کی ابتدائی زندگی کے حالات لکھئے اور اس کے جبر و استبداد کی پالیسی چند ایک مثالوں سے واضح کیجئے۔

۹۔ بلبن نے شاہی وقار کو بڑھانے اور سلطنت کے استحکام کے لئے کون کون سی تدابیر اختیار کیں۔ وضاحت کیجئے۔

۱۰۔ تیرہویں صدی میں مسلمانوں نے کس طرح آہستہ آہستہ شمالی ہند کو فتح کیا۔ اس تسخیر کے حالات لکھئے۔

۱۱۔ برصغیر ہند و پاکستان میں مسلمانوں کو ۱۲۰۶ء اور ۱۳۰۶ء کے درمیان سیاسی عروج کیسے حاصل ہوا۔ اس دور میں برصغیر کی تسخیر کا حال بیان کیجئے۔

یا

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کو کون نے کیسے فتح کیا؟ فتوحات کی تفصیلات بیان کیجئے۔

۱۲۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی تین پر مختصر نوٹ لکھئے۔

(ا) سلطانہ رضیہ (ب) امیر خسرو (ج) غلاموں کا خاندان یا امرائے چہلگانی (د) سلطان ناصر الدین محمود۔ (ہ) طغرل بیگ۔

اکیسواں باب

خلجی سلاطین

خلجی قبیلے کی ابتداء

خلجی قبیلہ کافی قدیم تھا لیکن ترک امراء ان کو غیر مہذب اور مخلوط نسل کے لوگ شمار کرتے تھے۔ خلجی سردار ترکی نسل ہونیکا دعویٰ کرتے تھے لیکن عوام اُن کو افغان یا پٹھان سمجھتے تھے۔ مشہور مؤرخ ضیاءالدین برنی بھی اُن کو افغان گنتا ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال یہ ہے کہ ترک ابن یافث کے گیارہ لڑکے تھے جن میں ایک کا نام خلج تھا اُسکی اولاد خلجی کہلاتی ہے۔ اگر اس نظریے کو درست مان لیا جائے تو خلجی قبیلہ بھی ترک نسل سے ہے۔ چند اور مؤرخین یہ سمجھتے ہیں کہ خلجیوں کی ابتداء چنگیز خان کے داماد قالج خان سے ہوئی۔ قالج خان نے جلال الدین خوارزم شاہ کی شکست کے بعد اپنے قبیلے سمیت غور اور گرجستان میں رہائش اختیار کر لی اور قالج خان کی نسبت سے یہ قبیلہ ابتداء میں خالج اور بعد میں خلج یا خلجی کہلانے لگا۔ یہ نظریہ درست نہیں کیونکہ خلجیوں کا ذکر امیر سبکتگین اور سلطان محمود کی تاریخوں میں بھی ملتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خلجی قبیلہ چنگیز خان کے عروج سے کافی قدیم تھا۔ موجودہ دور کے محققین کا خیال یہ ہے کہ خلجی ترکی نسل کے تھے لیکن کسی وجہ سے افغانستان میں آباد ہو گئے۔ یہاں انہوں نے پٹھان عورتوں سے شادیاں کر لیں اور افغان کہلانے لگے۔ بلبن کے دور میں ترک امراء ان کو مخلوط نسل کے لوگ شمار کرتے تھے اور ان سے رشتہ ناطہ کرنا اپنی شان کے

خلاف سمجھتے تھے۔ غزنی اور کابل کے درمیان اب بھی خلجی قبیلے کے لوگ کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

جلال الدّین فیروز کی تخت نشینی:

کیقباد کا خاتمہ کرنے کے بعد ۱۲۹۰ء میں جلال الدین فیروز کیلوگڑھی میں تخت نشین ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دہلی کے ترک امراء چونکہ خلجیوں سے نفرت کرتے تھے اس لئے دہلی کی بجائے کیلوگڑھی میں تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جلال الدین خلجی نے فوجی غلبہ سے تخت حاصل کیا۔ اسے دہلی کے ترک امراء کا ڈر نہ تھا۔ اس کے برعکس کیقباد کو نشے اور بیماری کی حالت میں چونکہ کیلوگڑھی میں قتل کیا گیا تھا لہٰذا فوراً ہی اسی مقام پر نئے بادشاہ کی تاج پوشی کی گئی۔ فوجی طاقت کے علاوہ جلال الدین فیروز نے زرپاشی سے ترکی امراء کا منہ بند کر دیا اور اس طرح اسے دہلی کا سلطان بننے کے لئے زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ بعض مفسدوں نے فتنہ برپا کرنے کے لئے کیقباد کے شیر خوار بچے شمس الدین کیومرث کی بادشاہت کا اعلان کر دیا لہٰذا جلال الدین فیروز نے اس شیر خوار بچےّ کو قتل کر کے فتنہ و فساد کی جڑ کاٹ ڈالی۔ اس کے بعد اُس نے انسانی خون گرانے سے اجتناب کیا۔ اور اپنے دشمنوں کو بھی معاف کرنے سے دریغ نہ کیا۔ تخت نشین ہونے سے پہلے وہ فوجی جرنیل تھا اور اس کی تمام زندگی جنگ و جدل میں بسر ہوئی تھی لیکن بادشاہ بنتے ہی وہ حد درجے کا نرم دل اور حلیم ثابت ہوا۔ وہ پکّا مسلمان تھا اور شریعت کا پابند تھا۔ رعایا سے مشفقانہ سلوک روا رکھتا تھا۔ اپنی نیک دلی اور رحم و کرم کی بدولت اس نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔

اس کی تخت نشینی ایک زبردست سیاسی انقلاب کا باعث ہوئی اس سے پہلے حکومت کے تمام اہم عہدے ترکی امراء کے لئے مخصوص تھے اور دیگر نسلوں کے مسلمانوں اور مقامی باشندوں کا حکومت میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ جلال الدین فیروز کے تخت نشین ہوتے ہی ترکوں کی یہ اجارہ داری ختم ہوگئی اور لیاقت کی بنا پر ہر نسل کے لوگوں کو ترقی کا موقع مل گیا۔ پس خلجیوں کا عروج دور رس اثرات کا حامل تھا۔ ترکوں کی برتری اور تفوق کا خاتمہ گویا ایک انقلاب تھا۔ نسلی تعصب ختم ہوا اور رعایا کے تمام افراد اور گروہوں کی فلاح وبہبود سلطنت کا اہم مقصد بن گیا۔ یورپ کے مورخ اسی بنا پر جلال الدین فیروز کے عروج کو خلجیوں کا انقلاب (Khilji Revolution) کہتے ہیں۔

بغاوتیں

جلال الدین فیروز ستر سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اس کا عہد حکومت صرف چھ سال تھا۔ اگرچہ وہ سلاطین دہلی کی مانند مطلق العنان شہنشاہ تھا لیکن اس کی نرم دلی کی بنا پر اس کے ابتدائی دور میں چند ایک بغاوتیں ہوئیں جن کا مختصر حال درج ذیل ہے۔

۱۔ **ملک چھجو کی بغاوت**:۔ جلال الدین فیروز کے تخت نشین ہونے کے ایک سال بعد یعنی ۱۲۹۱ء میں ملک چھجو نے بغاوت کی۔ یہ شخص بلبن کا بھتیجا تھا۔ اور اس کا اصلی نام ملک عبداللہ تھا لیکن ملک چھجو کے نام سے مشہور تھا۔ وہ کڑہ کا جاگیردار تھا اور بلبن سے قرابت داری کی بنا پر بادشاہت کا دعوے دار تھا۔ ملک چھجو ایک زبردست فوج لے کر دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ اسے چند باغی امراء کی حمایت بھی حاصل تھی اودھ کا حاکم بھی اس سے مل گیا تھا جہاں ملک چھجو نے مغیث الدین کا

لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان بھی کر دیا۔ لیکن جلال الدین بیٹے ارکلی خان نے ملک چھجو کو بدایوں کے قریب شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ جب اُسے دربار شاہی میں پیش کیا گیا تو سلطان جلال الدین فیروز نے اُسے معاف کر دیا لیکن اس کی جاگیر ضبط کر لی گئی۔ سلطان نے یہ جاگیر اپنے بھتیجے علاؤالدین خلجی کو عطا کی جو بعد میں جلال الدین فیروز کو قتل کر کے خود بادشاہ بنا۔

۲۔ **سیدی مولہ:۔** سیدی مولہ اُس زمانے میں ایک مشہور درویش تھا۔ اور شیخ فریدالدین شکر گنج کا مرید تھا عوام سیدی مولہ کو کیمیاگر سمجھتے تھے کیونکہ اُس کے دستر خوان سے ہر روز ہزاروں اشخاص کو کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ درویشی کے باوجود سیدی مولہ کے پاس دولت کی فراوانی تھی اور لوگ اُس کی کرامتوں کے قائل تھے۔ ترکی امراء بھی سیدی مولہ کے پاس اکثر آجایا کرتے تھے۔ امراء نے سیدی مولہ کی صحبت میں رہ کر بھی سازش کا جال پھیلایا اور سلطان جلال الدین خلجی کو قتل کرنے کی ٹھانی۔ امراء کی سکیم یہ تھی کہ جمعے کے روز جامع مسجد میں سلطان کو اچانک حملے سے ختم کر دیا جائے اور اس کی بجائے سیدی مولہ کو بادشاہ بنایا جائے۔ شاہی حکام کو سازش کا پتہ چل گیا۔ اور سیدی مولہ اور اُس کے رفقا کو گرفتار کر لیا گیا۔ بادشاہ ان باغیوں کو مناسب سزا دینے کے بارے میں ابھی غور و خوض کر رہا تھا۔ لیکن اس کے تندمزاج لڑکے ارکلی خان نے حکم دے کر سیدی مولہ اور اُس کے ساتھیوں کو مست ہاتھیوں کے پاؤں تلے روند ڈالا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس درویش کا اصلی نام سیدی مولہ تھا۔ دیگر مورخین اُسے سیدی

مولہ لکھتے ہیں۔ یورپ کے مورخ اس درویش کے زہد کو مکر وفریب گنتے ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ سیدی مولہ دراصل ٹھگوں کے ایک گروہ کا سرغنہ تھا۔

۳۔ سیدی مولہ کے قتل کے بعد مالوہ میں کئی ایک بغاوتیں ہوئیں۔ دراصل رنتھمبور کے راجپوتوں نے کیقباد کے زمانے ہی میں سرکشی اختیار کی تھی اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ ۱۲۹۱ء میں سلطان جلال الدین فیروز نے گجرات اور مالوہ پر فوج کشی کی۔ اکثر مقامی راجاؤں اور جاگیرداروں کو زیر کیا گیا لیکن خلجی سلطان خونریزی کے خلاف تھا لہٰذا رنتھمبور کے قلعے کو فتح کئے بغیر جلال الدین دہلی واپس آ گیا۔

منگولوں سے سلوک : ۱۲۹۳ء میں منگولوں نے الغو خان کی قیادت میں حملہ کیا۔ شاہی فوجوں نے سنام کے قریب اُن کو شکست دی اور جیسے سلطان نے شکست خوردہ دشمن کو ملیامیٹ کرنے کی بجائے اُن سے اچھا سلوک کیا اور تعاقب کرنے کی بجائے شاہی فوج کو حکم دیا گیا کہ منگولوں کو کوئی گزند پہنچائے بغیر واپس جانے دیا جائے۔ جلال الدین کے اس فیاضانہ سلوک سے تقریباً تین ہزار منگول مسلمان ہوئے اور انھوں نے اسی ملک میں سکونت اختیار کر لی بعض منگول شاہی ملازم بن گئے۔ اس نرم پالیسی کی بدولت منگولوں میں خوب اشاعت اسلام کے مواقع میسر آئے۔ منگول اسلام قبول کرنے کے بعد مغل کہلاتے تھے۔

سلطان جلال الدین خلجی کے زمانے میں دہلی کے قریب نو مسلم منگولوں کی ایک بستی قائم ہو گئی جسے مغلپورہ کہتے تھے۔ اس نام کا قصبہ دہلی کے قریب اب تک موجود ہے۔

دکن پر حملہ : سلطان جلال الدین خلجی کے زمانے میں پہلی بار دکن پر مسلمانوں نے حملہ کیا۔ اس سے پہلے کسی مسلمان سلطان نے دریائے نربدا عبور

نہ کیا تھا۔ ۱۲۹۴ء میں سلطان کے بھتیجے اور داماد علاءالدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا اور برق رفتاری سے تمام دکن پر چھا گیا۔ علاؤالدین کڑہ اور اودھ کا گورنر تھا۔ اس نے جلال الدین فیروز سے چندیری فتح کرنے کی اجازت حاصل کی لیکن فتوحات کے شوق میں دیوگری پر بھی حملہ کر کے فتح حاصل کی۔ اس زمانے میں ذرائع آمد و رفت کی کمی کے باعث دکن کو فتح کرنا آسان نہ تھا۔ نیز وسط ہند میں گھنے جنگلات کو عبور کرنا از حد دشوار تھا۔ لیکن علاؤالدین خلجی صرف چھ ہزار سپاہی لے کر روانہ ہوا اور نہایت جرأت سے کام لیکر فتوحات کرتا ہوا دیوگری جا پہنچا۔ بعض مورخ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنی ساس ملکۂ جہاں سے ناراض ہو گیا اور سلطان سے اجازت لئے بغیر دیوگری کو فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہو گیا۔ اس نے بندھیاچل کے کوہستانی راستے کی پرواہ نہ کی اور خوفناک دریاؤں اور ندیوں کو عبور کرتا ہوا دشمن کے سر پر جا پہنچا۔ چونکہ اس کے پاس جنگی سامان کی قلت تھی اور فوج بھی کم تھی لہذا اس نے ایک نہایت عمدہ چال چلی۔ اس نے مشہور کیا کہ وہ چندیری پر حملہ کرنے جا رہا ہے۔ لیکن یکا یک رخ پلٹ کر دیوگری کے راجہ رام دیو پر ہلہ بول دیا۔ اچانک حملے سے رام دیو گھبرا گیا اور اطاعت قبول کی۔ بعض مورخ یہ لکھتے ہیں کہ اس نے دشمن کو دھوکہ دینے کے لئے مشہور کر دیا تھا کہ وہ اپنی ساس سے ناراض ہو کر کسی دکنی راجہ کی ملازمت اختیار کرنے جا رہا ہے۔ اس چال کی بدولت وہ آسانی سے دیوگری جا پہنچا اور راجہ کو اطاعت کرنے پر مجبور کیا۔ دیوگری سے بے شمار مال و دولت حاصل کر کے علاؤالدین واپس لوٹا۔ رام دیو کا لڑکا تیرتھ یاترا کے لئے گیا ہوا تھا۔ اس دوران میں وہ دیوگری پہنچا اور باپ کی نصیحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی فوج لے کر مسلمانوں کے مقابلے پر آیا۔ دولت آباد کے قریب اسے شکست ہوئی اور راجہ رام دیو نے ایک بار پھر صلح کی درخواست کی۔ علاءالدین نے ایلچ پور کے

علاقے کا الحاق کر لیا اور راجہ سے تاوانِ جنگ کے طور ایک بھاری رقم وصول کی اور زر و جواہرات سے لدا پھندا دہلی واپس ہوا۔ دکنی فتوحات کی بدولت علاؤالدین کو از حد شہرت نصیب ہوئی۔ چنانچہ سلطان جلال الدین فیروز اُس کے استقبال کو الہ آباد تک آیا۔

جلال الدین کا قتل

دکن کی فتوحات کے بعد علاؤالدین خلجی دہلی کا تخت حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھا سلطان کی خدمت میں حاضر ہونے کی بجائے وہ اپنی جاگیر کڑہ میں چلا گیا تاکہ تازہ دم فوج فراہم کر سکے۔ جلال الدین کی خدمت میں اُس نے یہ بہانہ لکھ بھیجا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ مخالفین نے میرے خلاف آپ کے کان نہ بھر دیئے ہوں۔ جلال الدین فیروز اپنے بھتیجے کی کامرانی پر تہ دل سے خوش تھا اور اُس کے دل میں ذرہ بھر بھی ملال یا شک نہ تھا۔ لہذا اس نے علاؤالدین کو تشفی کا خط لکھا اور خود الہ آباد تک اُس کے استقبال کو آیا۔ علاؤالدین گنگا کے دوسرے کنارے فوج لئے ٹھہرا تھا۔ اور اُس نے ظاہر کیا کہ وہ سلطان کے خوف سے آگے بڑھنے سے تھم گیا ہے۔ جلال الدین فیروز خود ایک کشتی میں بیٹھ کر دوسرے کنارے پہنچا تاکہ اپنے خوف زدہ بھتیجے کو گلے لگائے۔ جب کشتی دوسرے کنارے پہنچی تو جلال الدین فیروز نے اپنے مکار بھتیجے کو محبت سے گلے لگایا اور شکوہ شکایت شروع کی۔ اور کہنے لگا کہ ایسے شفیق چچا سے ڈرنا نہ چاہئیے۔ عین اس وقت علاؤالدین کے اشارے پر بوڑھے سلطان کو قتل کر دیا گیا۔ اسی وقت نقارہ بجا کر علاؤالدین خلجی کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ جلال الدین فیروز ۱۲۹۶ء میں قتل ہوا۔

سلطان علاؤالدین خلجی

سلطان علاؤالدین خلجی ۱۲۹۶ء میں تخت نشین ہوا اور اشرفیوں کی بارش سے اس نے مرحوم سلطان کی یاد امراء کے دلوں سے محو کر دی۔ اس نے جلال الدین فیروز کے دونوں بیٹوں اور اس کی بیوی ملکہ جہاں کو گرفتار کر لیا تاکہ تخت کے اصلی وارث کوئی شورش بپا نہ کریں۔ تھوڑے ہی عرصے میں لوگ جلال الدین فیروز جیسے نیک دل سلطان کو بھول گئے اور علاؤالدین خلجی نے بیس سال نہایت کامیابی سے حکومت کی۔ علاؤالدین خلجی نہایت اعلیٰ منتظم اور مدبر تھا اگرچہ وہ ان پڑھ تھا لیکن اسکی عقل و دانش پہ یورپ کے مورخین بھی دنگ ہیں۔ اس کی معاشی اصلاحات حیران کن ہیں۔ اس نے فوجی غلبہ کی بنا پہ ملک میں امن و امان قائم رکھا اور رعایا کو آسودہ حال بنانے کے لئے نت نئی تجویزیں اختراع کیں علاؤالدین خلجی اعلیٰ پایہ کا جرنیل اور زبردست فاتح تھا لیکن اس کی دوراندیشی اور انتظامی قابلیت از حد زیادہ تھی۔ پس وہ ہر لحاظ سے کامیاب ترین شہنشاہ ہو گزرا ہے۔ اسے قرونِ وسطیٰ کا عظیم الشان سلطان اور اہم سیاست داں گنا جاتا ہے۔

ابتدائی دور اور منگول

علاؤالدین کے تخت نشین ہوتے ہی منگولوں نے اس ملک پہ پے در پے حملے شروع کر دئے ان کا پہلا حملہ ۱۲۹۶ء میں ہوا۔ اس کے بعد وہ ۱۳۰۶ء تک وقتاً فوقتاً حملہ آور ہوتے رہے۔ منگولوں کا خاطر خواہ سدِّ باب کرنے کے لئے علاؤالدین نے فوج کی از سر نو ترتیب کی اور اسی بنا پر معاشی اصلاحات نافذ کیں۔ وہ بلبن کی سرحدی پالیسی پہ دوبارہ عمل پیرا ہوا اور سرحدی قلعوں کی دوبارہ مرمت کرائی سرحدوں پہ تربیت یافتہ فوج متعین کی اور سامانِ حرب اور خوراک کے

ذخیرے جمع کئے گئے۔ علاؤالدین نے آزمودہ جرنیلوں کو سرحدی مقامات پر متعین کیا اور غازی ملک کو محافظ سرحد کا عہدہ عطا کیا۔ سلطان نے ملک بھر میں اسلحہ کے سرکاری کارخانے بھی قائم کئے۔ علاؤالدین کے زمانے میں منگولوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تین دفاعی لائنیں دہلی اور سرحد تک ہوتی تھیں۔ یہ دفاعی مورچے مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) ملتان اور اُچ (۲) دیپال پور اور پٹن (موجودہ پاک پٹن) (۳) بھٹنیر۔ بھٹنڈا۔ سمانہ۔ سنام اور ہانسی۔

محافظ سرحد کے علاوہ سلطان کے جرنیلوں میں سے ظفر خان اور اُلغ خان نے منگولوں کے خلاف کئی ایک لڑائیوں میں اپنی اعلیٰ فوجی قابلیت کا ثبوت دیا۔ اُلغ خان سلطان کا بھائی تھا۔ جس کا اصلی نام الماس بیگ تھا۔ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں منگولوں کے مشہور حملے مندرجہ ذیل تھے۔

ا۔ ۱۲۹۶ء میں منگول لشکر دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب میں آگیا۔ شاہی فوجوں نے لاہور کے قریب منگولوں کو شکست دی لیکن منگول فوج واپس جانے کی بجائے صوبہ سندھ میں گھس گئی اور وہاں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ علاؤالدین کے جرنیل ظفر خان نے منگولوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ ظفر خان کی بہادری قابل داد تھی اور اُس کی فتح مندی سے کئی امراء حسد کرنے لگے۔ منگول سپہ سالار غازان خان تھا جسے خراسان کے منگول حاکم قتلغ خان نے بھیجا تھا۔

(۲) ۱۲۹۷ء میں قتلغ خان نے وسیع پیمانے پر تیاری کی اور بڑا خوفناک حملہ کیا۔ منگول دہلی تک بڑھ آئے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ان کی آمد سے پہلے مختلف شہروں کے باشندے خوفزدہ ہو کر دہلی بھاگ آئے۔ دہلی میں پناہ گزینوں کا

اسقدر ہجوم تھا کہ بازاروں میں چلنا پھرنا دشوار تھا اور غلے کی کمی محسوس ہونے لگی۔ سلطان علاؤالدین محصور ہو کر لڑنے کے خلاف تھا۔ لہٰذا وہ تین لاکھ فوج لے کر اپنے بہترین جرنیلوں سمیت شہر سے باہر نکلا۔ منگول فوج دو لاکھ تھی۔ دہلی سے مغرب کی جانب مہرولی کے قریب خوفناک لڑائی ہوئی اور منگول بھاری نقصان سے شکست کھا کر واپس بھاگ گئے۔ اس جنگ میں علاؤالدین کا مشہور جرنیل ظفر خان دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے مارا گیا لیکن اس کی بہادری پر منگول بھی عش عش کر اٹھے۔

(۳) باقاعدہ سرحدی پالیسی وضع کرنے کے بعد سلطان مطمئن ہو گیا تھا کہ اب منگول آسانی سے دہلی نہیں پہنچ سکتے لیکن ۱۳۰۲ء میں منگولوں نے برق رفتاری سے دہلی پر حملہ بول دیا۔ ان کا سردار طرغی تھا جس نے راستے کے قلعوں پر اپنی طاقت ضائع کرنے کی بجائے سیدھا دہلی کا رخ کیا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ دہلی میں فوج صرف تیس چالیس ہزار تھی۔ لیکن منگولوں کے لشکر جرار میں ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی تھے۔ علاؤالدین کافی پریشان ہوا اور محصور ہو کر بڑی مشکل سے جنگ جاری رکھی۔ کمک کے لئے انہوں نے آس پاس کے علاقوں میں خطوط بھیجے۔ امدادی دستے پہنچنے سے   منگولوں کا لشکر اچانک واپس چلا گیا۔ عوام کا عقیدہ یہ تھا کہ منگولوں کی یک لخت واپسی حضرت نظام الدین اولیاء کی دعا کا نتیجہ ہے۔

(۴) ۱۳۰۵ء میں منگولوں نے پھر حملہ کیا۔ اس بار ان کے دو لشکر حملہ آور ہوئے دو منگول شہزادے علی بیگ اور ترتاق منگولوں کے جرنیل تھے۔ اس بار منگولوں نے دریائے جمنا کو عبور کر کے دوآبہ کے زرخیز علاقے میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ شاہی فوجوں نے تعاقب کر کے امروہہ کے قریب

منگولوں کو شکست دی اور اُن کے دو نوں جرنیلوں کو گرفتار کر لیا۔ منگول سپاہیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی اسیر ہوئی۔ علاؤ الدین نے ان تمام قیدیوں کو برسرِ بازار قتل کر واڈالا۔ قتل گاہ میں رعایا تماشا دیکھنے کی غرض سے بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئی۔

(۵) اگلے سال یعنی ۱۳۰۶ء میں منگولوں نے انتقامی حملہ کیا لیکن غازی ملک محافظِ سرحد نے انہیں مار بھگایا۔ منگول پنجاب میں تو نہ گھس سکے لیکن بلوچستان سے نکل کر سندھ میں نمودار ہوئے اور مارواڑ کے علاقے تک جا پہنچے لیکن غازی ملک نے ان کا تعاقب کیا اور شکست دے کر بھگا دیا۔ منگول اسیروں کو دہلی بھیج دیا گیا۔ یہاں انہیں اُس زمانے کے دستور کے مطابق مجمع عام میں قتل کیا گیا۔

(۶) اس سال یعنی ۱۳۰۵ء میں منگولوں نے ہندوستان پر کئی حملے کئے لیکن ہر بار شکست کھائی۔ منگول سردار کنک ایک حملے میں گرفتار ہوا اور اُسے ہاتھی کے پاؤں تلے روند کر مار ڈالا گیا۔ پھر منگولوں کی ایک فوج شوالک کے علاقے پر حملہ آور ہوئی لیکن اسے بھی شکست نصیب ہوئی۔ اس لڑائی میں منگول قیدیوں کی تعداد بہت بڑی تھی۔ کچھ عرصہ بعد منگول سپہ سالار اقبال مند پھر حملہ آور ہوا لیکن فوج کے بیشتر حصے سمیت گرفتار ہوا۔ دہلی کے قریب اُن سب قیدیوں کو قتل کر ڈالا گیا۔ اس کے بعد منگولوں کے دلوں پر دہشت چھا گئی اور انہوں نے ہندوستان کا رُخ نہ کیا۔ محافظِ سرحد غازی ملک تغلق نے سلطنت دہلی کی دھاک بٹھانے کے لئے منگولوں کے مقبوضات پر چند حملے بھی کئے۔ اس کے بعد مدت تک منگولوں نے برِّصغیر ہند و پاکستان پر حملہ کرنے کا خیال تک بھی نہ کیا۔

انتظامِ سلطنت اور اصلاحات

سلطان علاؤالدین خلجی ان پڑھ ہونے کے باوجود ملکی معاملات کو خوب سمجھتا تھا اور اپنے بلند عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے منصوبے اچھی طرح سے سوچ لیتا تھا۔ اُس نے سیاست کو مذہب سے آزاد رکھا اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تمام ذرائع کو جائز سمجھا۔ قاضی مغیث الدین نے ایک روز سلطان کو پابندیٔ شرع کی تلقین کی تو وہ بولا، مجھے جائز اور ناجائز کچھ پتہ نہیں ہیں تو وہی کام کروں گا جس میں سلطنت کی بہتری ہو۔ علاؤالدین کی تمام اصلاحات اور انتظامی تدابیر میں کوئی نہ کوئی سیاسی مصلحت تھی شرع کی پابندی کا خیال نہ تھا۔ اس نے امور سلطنت میں علماء کا عمل دخل ختم کر ڈالا اور مکمل مطلق العنانی کی حکومت قائم کی۔ سلطان کی ذات محور کا کام دیتی تھی اور سلطنت کی تمام مشینری اسی کے گرد گھومتی تھی۔ ملکی قوانین کا انحصار مذہبی بنیادوں کی بجائے سلطان کی اپنی مرضی پر تھا۔ علاؤالدین کی اصلاحات مندرجہ ذیل تھیں۔

انتظامی اصلاحات

(Administrative Refoms)

(۱) جاسوسی نظام۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے ملک بھر میں جاسوسوں کا وسیع جال پھیلا دیا۔ یہ جاسوس بادشاہ کو ہر چھوٹی بڑی چیز کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔ چنانچہ امراء کی ہر بات پر جواب طلبی ہوتی تھی۔ شاہی جاسوس ہر پیشہ کے لوگوں میں موجود ہوتے تھے۔ سلطان نے امراء کو مزید کمزور کرنے کے لیے بہت سی جاگیریں ضبط کر لیں۔ اُس نے رات کے وقت امراء کے میل جول کے علاوہ عیش و

نشاط کی محفلیں بند کر دیں۔ نیز امراء شاہی اجازت کے بغیر آپس میں رشتے ناطے بھی نہ کر سکتے تھے۔ تاکہ قرابت داریوں کی بناء پر طاقتور امراء کا باہمی اتحاد نہ ہو سکے۔ ان تمام انتظامی اصلاحات کی بناء پر امراء کی طاقت از حد کمزور ہو گئی اور علاؤالدین کے عہد میں وہ کبھی بھی سرکشی اختیار نہ کر سکے۔

(۲) بندش شراب: سلطان نے سیاسی فائدے کو مدنظر رکھتے ہوئے شراب نوشی بالکل بند کر دی۔ خود شراب نوشی سے توبہ کی اور مملکت میں شراب کی کشید بھی ممنوع قرار دی گئی۔ بندش شراب کی وجہ احترام مذہب نہ تھا بلکہ بادشاہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ شراب کی محفلوں میں حکومت کے خلاف سازش کے مواقع بہم پہنچتے ہیں۔ بادشاہ نے قمار بازی کو بھی بند کر دیا۔

(۳) بھاری ٹیکس اور ہندو: سلطان اس نظریے کا قائل تھا کہ دولت کی فراوانی سے لوگ بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس نے دوآبہ کے ہندوؤں پر اسقدر جابرانہ ٹیکس لگائے کہ وہ بالکل مفلس اور کنگال ہو گئے۔ یہ سختی مذہبی جنون کی بناء پر نہ تھی بلکہ سلطان کو یقین کامل تھا کہ سرکشی کا بہترین علاج یہ ہے کہ مخالفین کو مشکل سے ضروریات زندگی حاصل ہوں۔ دوآبہ ایک ایسا علاقہ تھا جہاں زمین زرخیز تھی اور دولت کی کثرت تھی لہٰذا اس علاقے کے ہندو ہر بادشاہ کے دور میں بغاوت اور سرکشی پر آمادہ رہتے تھے۔ علاؤالدین اس علاقے کے ہندوؤں کو پکا سرکش سمجھتا تھا لہٰذا ان پر بھاری ٹیکس نافذ کئے۔ وہ یہ کہا کرتا تھا کہ "ہندو حرام خور ہیں اور کبھی چین سے نہ بیٹھیں گے کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔"

"These rascally Hindus will not rest unless they are beaten."

ہم عصر مورخین کا بیان ہے کہ دوآبہ کے ہندوؤں کو بھاری ٹیکسوں نے ابھرنے نہ دیا۔ وہ ٹیکسوں کے بوجھ تلے اس قدر دبے ہوتے تھے کہ سواری کے لئے گھوڑا یا ہتھیار خریدنے کی استطاعت بھی نہ رکھتے تھے۔ گویا اس نے اس علاقے کے ہندوؤں کو گھسیارا بنا دیا۔ دن رات ان کو روزی کمانے اور پیٹ بھرنے کا فکر رہتا تھا۔ سلطان کا یہ نظریہ تھا کہ "غیروں پہ حکومت کرنا چاہتے ہو تو ان کو خوش حال نہ رہنے دو۔"

"If you want to rule a nation, destroy their prosperity."

علاؤالدین نے عام رعایا سے بھی ہر حیلے بہانے سے ٹیکس وصول کئے اور کسی علاقے میں دولت کی فراوانی نہ رہنے دی۔ ہر شخص دن رات اپنی ضروریات پوری کرنے کے چکر میں رہتا تھا اور بغاوت یا سرکشی کا خیال کسی کے نزدیک نہ پھٹکتا تھا۔

(۴) دیگر انتظامی تدابیر:۔ سلطان نے مختلف دیہات کے نمبرداروں اور چوہدریوں کا اثر و رسوخ کم کرنے کے لئے چند نئے احکام جاری کئے اس نے مالیہ وصول کرنے کیلئے سرکاری عہدے دار مقرر کئے تاکہ نمبرداروں کی آمدنی گھٹ جائے۔ اس سے پہلے نمبردار اور چوہدری اپنی کمیشن، اور مالیہ کے علاوہ رعایا سے زائد رقم بھی وصول کر لیا کرتے تھے۔ ہر دیہاتی مقررہ مقدار سے زیادہ مویشی نہ رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ اعلیٰ زمیندار اور معمولی کسان چار بیل۔ دو بھینسیں دو گائیں۔ اور بارہ عدد بھیڑیں یا بکریاں رکھ سکتا تھا اس سے زائد مویشی رکھنے کی ممانعت تھی۔ علاؤالدین نے زمین کا دوبارہ بندوبست کیا اور زراعتی زمین کی از سر نو پیمائش کی گئی۔ شرح مالیہ بڑھا دی گئی۔ چنانچہ علاؤالدین کے زمانے میں

علاؤالدین نے اسے ملکہ بنا لیا۔ الغ خاں نے گجرات کی ایک بندرگاہ سے ایک حبشی غلام خریدا جس کا نام ملک کافور تھا۔ یہ شخص اگرچہ خواجہ سرا تھا۔ لیکن مردانہ صفات رکھتا تھا۔ اور بہادری میں لاثانی تھا بعد ازاں ملک کافور اپنی فوجی قابلیت کی بنا پر سپہ سالار بنا اور دکن اسی کے ہاتھوں فتح ہوا۔ گجرات کے تمام علاقے کا الحاق سلطنت دہلی سے کر دیا گیا۔

(۲) فتح رنتھمبور :- ۱۲۹۹ء میں سلطان نے راجپوتانہ کی ریاستوں کا زور توڑنا چاہا۔ یہ ریاستیں زر و جواہر سے مالا مال تھیں اور سلطان ان کو فتح کرنے کا شوقین تھا۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر ان ریاستوں نے شکست خوردہ منگولوں کو پناہ دی تھی۔ لہٰذا علاؤالدین نے راجپوتوں کو سرکشی کا مزہ چکھانا چاہا۔ اس زمانے میں رنتھمبور اہم فوجی مرکز تھا۔ اور راجپوتانے کا سب سے مضبوط قلعہ تھا۔ لہٰذا علاؤالدین خلجی نے الغ خاں اور نصرت خاں کو رنتھمبور کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔ لیکن رنتھمبور کے راجہ ہمیر دیو نے مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ لیا۔ نصرت خاں ایک معرکے میں شدید زخمی ہوا اور کچھ دنوں کے بعد مر گیا۔ لہٰذا سلطان علاؤالدین خلجی خود رنتھمبور پہنچا۔ لیکن محاصرہ کئی مہینے جاری رہا۔ آخر کار جولائی ۱۳۰۱ء میں یہ قلعہ فتح ہوا۔ راجہ ہمیر دیو اور اس کی فوج کے منگول ملازم قتل ہوئے۔ منگولوں کا نو مسلم سردار محمد شاہ بھی راجہ ہمیر دیو سے جا ملا تھا۔ جب قلعہ فتح ہوا تو وہ زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ تلخ سوال و جواب کے بعد علاؤالدین خلجی نے اسے مروا ڈالا۔

(۳) بغاوتیں :- جب سلطان رنتھمبور کے محاصرے میں مشغول تھا تو اس

کی غیر حاضری میں بدایوں اور دہلی میں بغاوتیں ہوئیں۔ لیکن سلطان بالکل نہ گھبرایا اور محاصرہ جاری رکھا۔ بدایوں میں علاؤالدین کے دونوں بھتیجوں نے بغاوت کی تھی لیکن امراء نے ان کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ اور ان کو علاؤالدین کے پاس رنتھمبور بھیجا۔ سلطان نے قرابت داری کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہ کی اور ان کو قتل کروا ڈالا۔

دہلی میں سلطان کی غیر حاضری میں حاجی مولے نامی ایک شخص نے اچانک بغاوت کی۔ اور شاہی خزانے پر قبضہ کر کے علوی نامی ایک شخص کو تخت پر بٹھا دیا جو اپنے آپ کو التمش کی نسل سے گنتا تھا۔ وفادار امراء نے اس بغاوت کو فوراً ہی ختم کر ڈالا۔ اور حاجی مولیٰ میدان جنگ میں مارا گیا۔ تخت کا دعویدار علوی گرفتار ہوا۔ اور امراء نے اس کا سر کاٹ کر علاؤالدین کی خدمت میں بھیجا۔ علاؤالدین بہت خوش ہوا لیکن بغاوت کے جراثیم ختم کرنے کے لئے اس نے الغ خان کو دہلی بھیجا۔ اس جرنیل نے دہلی کے لوگوں پر بہت زیادہ سختی کی تاکہ پھر کسی کو بغاوت کی جرأت نہ ہو۔ الغ خان نے ہر اس شخص کو قتل کر ڈالا جس نے حاجی مولیٰ کی معمولی سی بھی مدد کی تھی۔ اس سخت گیری سے دہلی میں مکمل امن و امان ہو گیا۔ سلطان اس دوران میں رنتھمبور کے محاصرے میں مصروف رہا۔

(۴) **چتوڑ کی تسخیر** رنتھمبور کی فتح کے بعد سلطان علاؤالدین خلجی نے میواڑ کے حکمران رانا رتن سنگھ پر حملہ کیا۔ راجپوتوں کی یہ ریاست کافی اہم تھی۔ اور اس ریاست میں چتوڑ کا قلعہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ یہ قلعہ دشوار گزار راستے پر واقع تھا۔ اور پہاڑ کی چوٹی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ سلطان کا آہنی عزم قابل داد ہے کیونکہ اس نے لمبے محاصرے کے بعد

۱۳۰۳ء میں اس مضبوط قلعے کو بھی فتح کر لیا۔ راجپوت بڑی بہادری سے لڑے اور عورتوں نے رسم جوہر ادا کی یعنی زندہ چتا میں بیٹھ کر جل مریں اور مرد تلواریں ہاتھ میں لے کر دشمن پر پل پڑے۔ راجہ لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور سلطان نے اپنے لڑکے خضر خان کو چتوڑ کا گورنر مقرر کیا۔ بعد ازاں میواڑ کی ریاست باجگذاری کی شرط پر راجہ رتن سین کو بخش دی گئی جو سابق حکمران رتن سنگھ کا بھانجا تھا۔ اور شروع سے ہی علاؤالدین کا وفادار رہا تھا۔ علاؤالدین پہلا مسلمان فاتح ہے جس نے چتوڑ کے قلعے کو فتح کیا۔

بعض ہندو مؤرخین نے چتوڑ کی فتح کے بارے میں ایک

ایک افسانہ: عجیب و غریب قصہ گھڑ لیا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ چتوڑ کے راجہ بھیمسی کی رانی پدمنی کے حسن و جمال کا تمام ملک میں شہرہ تھا۔ چنانچہ علاؤالدین بغیر دیکھے اس پر فریفتہ ہو گیا اور اسے حاصل کرنے کے لئے چتوڑ پر حملہ کیا طویل جنگ سے تنگ آ کر پدمنی کی رائے سے راجہ نے اس شرط پر صلح کر لی۔ کہ علاؤالدین کو خود صرف پیچھے کھڑے ہو کر آئینے میں اپنی شکل دکھا دیوے پدمنی کے حسن کو دیکھ کر سلطان ہزار جان سے اس پر لٹو ہو گیا۔ اور واپسی پر دھوکے سے راجہ کو قید کر کے دہلی لے آیا۔ اس کی رہائی کے لئے یہ شرط پیش کی کہ پدمنی کو ہمارے حوالے کر دو۔ راجہ کی غیرت نے اس بات کو گوارا نہ کیا لیکن پدمنی نے ایک عمدہ چال چلی۔ اس نے مشہور کر دیا کہ پدمنی سلطان کے حرم میں داخل ہونے کیلئے دہلی روانہ ہو رہی ہے اور اس کی معیت میں درباری خواتین اور اس کی سہیلیوں کے ڈولے بھی جا رہے ہیں۔ دراصل ہر ڈولی میں راجپوت سپاہی تھے اور کہار بھی جانباز راجپوت سپاہی تھے۔ علاؤالدین خوش تھا۔ اور اس کے حکم سے ان کئی سو ڈولیوں کے جلوس کو بڑی عزت سے دہلی پہنچایا گیا۔

دہلی پہنچ کر راجپوتوں نے یک لخت حلہ بول دیا۔ اور اپنے راجہ کو قید سے نکال کر یہ بہادر سپاہی لڑتے بھڑتے چتوڑ واپس پہنچ گئے۔ علاؤالدین غصے میں آکر دوبارہ چتوڑ پر حملہ آور ہوا۔ اور قلعہ چتوڑ کا محاصرہ کر لیا۔ جب راجپوتوں کی کچھ پیش نہ گئی تو انہوں نے اپنے بال بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے لگایا عورتوں نے جوہر کی رسم ادا کی اور مرد قلعے سے باہر نکل کر مسلمانوں کے لشکر پر حملہ آور ہوئے اور سب کے سب میدان جنگ میں مردانہ وار مارے گئے۔ علاؤالدین جب پدمنی کو حاصل کرنے کے شوق میں قلعے کے اندر داخل ہوا تو سوائے راکھ کے ڈھیر کے کچھ بھی نہ پایا۔

تاریخی طور پر پدمنی کا قصہ محض شاعرانہ تخیل کی اختراع ہے چتوڑ کی تاریخ میں پدمنی کا وجود ہی ثابت نہیں۔ نیز علاؤالدین نے رانا رتن سنگھ پر حملہ کیا تھا۔ راجہ بھیم سی اس زمانے میں چتوڑ پر حکمران نہ تھا۔ ہم عصر مؤرخین نے پدمنی کا ذکر تک نہیں کیا، حتیٰ کہ طوطی ہند امیر خسرو بھی خاموش ہیں حالانکہ دیول دیوی اور خضر خاں کی تاریخی مثنوی انہوں نے لکھی ہے۔ اگر علاؤالدین اور پدمنی کے عشق کی کچھ بنیاد ہوتی تو امیر خسرو عاشق نامراد کا حال ضرور لکھتے۔ پہلی بار شیر شاہ سوری کے زمانے میں ملک محمد جائسی نے ہندی زبان میں ایک نظم لکھی جو پدماوت کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں یہ کہانی بیان کی گئی ہے ظاہر ہے کہ ملک محمد جائسی کا یہ قصہ محض افسانہ ہے۔ اور اسے تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے ہم عصر مؤرخ برنی نے پدمنی کا ذکر تک نہیں کیا حالانکہ یہ مؤرخ علاؤالدین کا حامی نہیں ہے

(۵) مالوہ اور وسط ہند کی تسخیر

۱۳۰۵ء میں سلطان نے مالوہ کی تسخیر کے لئے عین الملک کو بھیجا۔ یہ علاقہ آسانی سے فتح ہو گیا۔ اور راجہ کے قتل کے بعد مالوہ کا دہلی سلطنت سے الحاق کر لیا

گیا۔ مالوہ کی تسخیر کے بعد مانڈو۔ اجین۔ چندیری وغیرہ پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا
مالوہ کی فتح نے وسط ہند کی کئی ایک چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی تسخیر کے لئے راستہ
بنایا اور مسلمان تھوڑے ہی عرصے میں وسط ہند پر قابض ہو گئے۔

۶۔ **جیسلمیر وغیرہ** اسی سال یعنی ۱۳۰۵ء میں علاؤالدین نے آٹھ مہینے کے
طویل محاصرے کے بعد جیسلمیر کے مشہور قلعے کو بھی فتح
کر لیا۔ اس کے بعد شمالی ہند کی بچی کھچی ریاستوں نے خود بخود اطاعت قبول کی
اور فتوحات کے شوق میں سلطان نے دکن کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔

دکن کی فتوحات

وسط ہند کی تسخیر کے بعد سلطان علاؤالدین خلجی نے دکن کو فتح کرنے کا عزم
کیا۔ دیوگڑھی کے راجہ رام دیو نے گذشتہ تین برس خراج ادا نہ کیا تھا لہذا
یہ امر دکن پر فوج کشی کا بہانہ ثابت ہوا۔ چنانچہ ۱۳۰۶ء میں سلطان نے اپنے منظور
نظر خواجہ سرا ملک کافور کو سپہ سالار بنا کر دکن کی جانب روانہ کیا۔ ملک کافور کو
۱۲۹۷ء میں الغ خان نے کھمبایت کی بندرگاہ سے بطور غلام خریدا تھا۔ اور
شاہی دربار میں بھیج دیا تھا۔ ملک کافور جلدی ہی ترقی کر کے مصاحب شاہ بنا اور
امراء کی صف میں شامل ہو گیا۔ دکن کی تسخیر میں ملک کافور نہایت اعلیٰ جرنیل ثابت ہوا
بعد میں ملک کافور وزیر دربار بنا اور علاؤالدین کا مشیر خاص تھا۔

گجرات کا راجا کرن بھی دیوگڑھی میں پناہ گزین تھا۔ اور راجہ کرن کی سابق
بیوی کملا دیوی جو اب علاؤالدین کی ملکہ تھی۔ اپنی لڑکی دیول دیوی کو حاصل کرنے
کیلئے بیقرار تھی لہذا سلطان نے ملک کافور کو حکم دیا کہ دیوگڑھی سے دیول دیوی کو
بھی حاصل کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔ ادھر دیوگڑھی کا راجہ رام دیو اس

کوشش میں تھا کہ دیول دیوی کی شادی اس کے لڑکے سے ہو جائے۔

دیوگڑھی پر حملے کے ایک روز بعد ترک سپاہی ایلوراہ کی غاروں میں سیر سپاٹے کی غرض سے گئے ہوئے تھے۔ کہ اچانک دور سے گرد و غبار اٹھا انہوں نے دشمن کی فوج کا دستہ سمجھ کر حملہ کر دیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ دیول دیوی کی پالکی چند محافظوں کے ساتھ کہیں جا رہی ہے۔ مسلمان سپاہیوں نے ان سب کو گرفتار کر لیا اور ملک کافور کو تمام واقعہ کی اطلاع دی۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس نے دیول دیوی کو عزت سے دہلی بھجوا دیا۔ دیول دیوی کی شادی علاؤالدین کے بڑے لڑکے خضر خاں سے کر دی گئی۔ علماء نے فتویٰ دیا کہ دونوں کے باپ بھی الگ ہیں اور مائیں بھی الگ الگ ہیں۔ لہٰذا شادی جائز ہے۔ خضر خان اس راجپوت شہزادی پر دل و جان سے فدا تھا۔ دونوں کی داستان کو امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی "خضر خاں و دول رانی" میں بیان کیا ہے۔

دیول دیوی کو دہلی روانہ کرنے کے بعد ملک کافور نے دیوگڑھی کو تاخت و تاراج کیا، اور راجہ رام دیو کو پے در پے شکستیں دے کر گرفتار کر لیا۔ اُسے بھی دہلی روانہ کیا گیا۔ اور بے شمار مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ جب راجہ رام دیو دہلی پہنچا تو سلطان نے اسے معاف کر دیا۔ اور اس کا تمام علاقہ باجگذاری کی شرط پر واپس کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد رام دیو باقاعدگی سے خراج ادا کرتا تھا۔ اور مطیع و فرمانبردار رہا۔

ورنگل کی تسخیر:- دیوگرھی کے بعد ملک کافور تلنگانہ کے علاقے میں داخل ہوا، اور ۱۳۰۹ء میں ورنگل کا قلعہ مسخر ہوا۔ ورنگل کے راجہ نے اطاعت قبول کی اور خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ دکنی فتوحات میں ملک کافور کی پالیسی یہ تھی کہ وہ مختلف علاقوں کا الحاق نہ کرتا تھا بلکہ

باجگذاری کی شرط پر مقامی حکمرانوں کو ہی برقرار رکھتا تھا۔ اس زمانے میں یہی پالیسی دانشمندانہ تھی کیونکہ دکنی علاقوں کا راستہ دشوارگذار تھا اور ذرائع آمدورفت کی کمی تھی۔

دوار سمدر وغیرہ: اس سے اگلے سال یعنی ۱۳۱۰ء میں ملک کافور نے دوار سمدر کے علاقے کو بھی فتح کر لیا۔ اس علاقے کے راجہ ویر بلال سوئم نے اطاعت قبول کی اور ۳۶ ہاتھی اور گران قدر زر وجواہر پیش کئے۔ اس کے بعد ملک کافور معبر کے علاقے پر حملہ آور ہوا۔ اس خطے کو آجکل کرناٹک کہتے ہیں۔ معبر کے پایۂ تخت مدورا کے علاوہ رامیشوارم پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ مالابار میں ملک کافور نے فتح کی یاد میں ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کرائی۔ اکتوبر ۱۳۱۱ء میں ملک کافور مال و دولت سے لدا ہوا دہلی واپس آیا۔ جہاں سلطان نے اس کے کارناموں کو سراہا۔

مہاراشٹر کی فتوحات: ۱۳۱۲ء میں دیوگڑھی کا راجہ رام دیو فوت ہو گیا۔ اور اس کے لڑکے شنکر دیو نے خراج ادا کرنا بند کر دیا۔ چنانچہ ملک کافور کو اس کے خلاف مہم پر بھیجا گیا۔ ملک کافور نے برقی حملے سے شنکر دیو کو شکست دیکر گرفتار کر لیا۔ اور دیوگڑھی کو سلطنت دہلی کا صوبہ بنا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد شنکر دیو کو قتل کر لیا گیا۔

اس کے بعد ملک کافور نے آگے بڑھ کر جنوبی علاقوں کو فتح کر لیا۔ چنانچہ دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا کے درمیانی علاقے کو زیر کیا گیا۔ اس کے علاوہ کرناٹک اور مہاراشٹر کو دوبارہ فتح کر لیا گیا۔ دکن کے دشوارگذار علاقے میں اتنی عظیم الشان فتوحات ملک کافور کی فوجی قابلیت کی دلیل ہیں۔

علاؤالدین کے منصوبے: ان فتوحات کی بدولت علاؤالدین خلجی

از حد مغرور ہو گیا اور اس نے تمام دنیا کو فتح کر لینے کے منصوبے سوچنے شروع کئے۔ ان دنوں میں اس نے نیا مذہب بھی جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اسی بنا پر برنی اُسے بے دین اور جاہل قرار دیتا ہے۔ مشہور مورّخ سمتھ صاحب کا قول ہے کہ نئے مذہب کا خیال دراصل علاؤ الدین کی جہالت، خود پرستی اور مطلق العنانی کا بیّن ثبوت ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ پیغمبر اسلام کے چار بہترین دوست اور مددگار تھے (یعنی خلفائے راشدین) علاؤ الدین کے بھی چار عمدہ جرنیل ہیں۔ یعنی الغ خان ظفر خان۔ نصرت خان اور الپ خان۔ لہٰذا کیوں نہ وہ تلوار کے زور سے اپنا نیا مذہب منوائے تاکہ ہمیشہ کے لئے اس کا نام زندہ رہے۔ اس زمانے میں دہلی کا کوتوال علاء الملک ملتانی ایک حق گو انسان تھا اور ضیاء الدین برنی کا چچا تھا۔ اس نے ایک روز کھلے الفاظ میں بادشاہ کو تنبیہہ کی کہ نیا مذہب جاری کرنے سے سلطان بگڑ جائیں گے اور سلطنت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ نیا مذہب نبی لاتے ہیں جن کو تائیدِ خداوندی حاصل ہوتی ہے۔ وہی تلواریں جو آج آپ کے دشمنوں کا سر کاٹ رہی ہیں آپ کے خلاف اٹھیں گی"۔ اس صاف گوئی سے سلطان کے دل پر گہرا اثر ہوا اور اس نے نئے مذہب کے قیام کا منصوبہ ترک کر دیا۔

سلطان کا دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ سکندر اعظم کی طرح وہ برّصغیر کی حکومت کسی وزیر کے سپرد کر کے خود عظیم الشان فوج لے کر دنیا کی فتح کے لئے نکلے علاؤ الدین ضدی اور خود پسند تھا۔ کسی کو مجال نہ تھی کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی لفظ اپنے منہ سے نکالے۔ لیکن علاء الملک نے ایک بار پھر اپنی صاف گوئی سے سلطان کو دنیا کی تسخیر کے خیال سے باز رکھا اور علاؤ الدین کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ ارسطو جیسا لائق وزیر میسر ہونا محال ہے جو آپکی

غیر حاضری میں وفادار رہے اور شاہی دبدبہ قائم رکھے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ہند کے غیر مفتوحہ علاقوں کو مسخّر کریں اور منگولوں کا خاطر خواہ سدّباب کر کے رعایا پروری میں نام پیدا کریں" علاؤالدین نے دنیا کی تسخیر کا خیال ترک کر دیا۔ لیکن سکندر ثانی کا لقب اختیار کیا۔

علوم و فنون و عمارات

علاؤالدین خلجی کو نہ علم کی پرواہ تھی اور نہ مذہب کا پاس۔ لیکن اس کے دربار میں علماء اور دیانتدار لوگ بکثرت تھے۔ ملک میں بھی ماہرین فن بہت بڑی تعداد میں موجود تھے سلطان کے زمانے میں اولیاء اور صوفی لوگ اس قدر زیادہ تھے۔ کہ مورخین دنگ رہ گئے ہیں۔ ضیاءالدین برنی نے علاؤالدین کے دور کے علماء اور صوفیوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے اور چھبیس صفحات میں انکا حال بیان کیا ہے۔ نظام الدین اولیاء بھی سلطان علاؤالدین کے زمانے میں ہو گذرے ہیں۔ مشہور شاعر امیر خسرو جس نے بلبن کا دور دیکھا تھا ابھی تک زندہ تھا۔ اور سلطان کے دربار میں ملک الشعراء کے عہدہ پر سرفراز تھا

سلطان علاؤالدین خلجی کو عمارات کا شوق تھا چنانچہ اس نے بےشمار مسجدیں محل، قلعے اور حوض تعمیر کرائے۔ علاؤالدین کے دور میں فن تعمیر میں مقامی اور غیر ملکی خصوصیات کا امتزاج ہے اور نتیجہ خوشں آئند ہے۔ نیز فن آرائش و زیبائش نے بھی ترقی پائی۔ یوں تو خلجی دور کی عمارتیں بےشمار ہیں۔ لیکن چند ایک کا ذکر ضروری ہے۔ علاؤالدین نے مسجد قوۃ الاسلام کے قریب دہلی میں ایک عظیم الشان اور بلند دروازہ تعمیر کرایا۔ انگریز مورخ اسے... (Gateway) کہتے ہیں۔ یہ دروازہ سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے محرابیں نئی طرز کی ہیں۔ گنبد سڈول اور پہلے گنبد کی نسبت بڑا ہے۔ دیواروں کی بیرونی

سطح مزین ہے اور یہ آرائش نہایت دلکش ہے۔

علاؤالدین کا لڑکا خضر خاں حضرت نظام الدین اولیاء کا مرید تھا اس نے اپنے مرشد کی زندگی ہی میں ان کے مدفن کے لئے عالیشان گنبد تعمیر کرایا۔ لیکن حضرت نظام الدین اولیاء نے پسند نہ کیا چنانچہ شہزادے نے گنبد کے دونوں طرف کمرے بنوا کر اس عمارت کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔ یہ گنبد درمیان میں واقع ہے۔ اور خلجی فن تعمیر کی یادگار ہے یہ گنبد بہت بڑا ہے داخلہ کی محراب خوب بجی ہوئی ہے۔ اور اس کے کنگروں کے گرداگرد پتھر کی بنی ہوئی خوبصورت جھالر بھی ہے۔ تمام عمارت سرخ پتھر کی بنی ہوئی ہے یہ مسجد اس دور میں مسجد جماعت خانہ کے نام سے مشہور ہوئی بعد میں اس مسجد کے صحن میں حضرت نظام الدین اولیاء کو دفن کیا گیا۔ اور ان کے مزار پر ایک عالی شان گنبد بھی تعمیر کیا گیا۔

سلطان علاؤالدین خلجی نے مسجد قوۃ الاسلام کے شمال کی جانب ایک نیا مینارہ تعمیر کرانا شروع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مینارہ اتنا بلند ہو کہ قطب مینار اس کے سامنے ماند پڑ جائے۔ ابھی اس مینارہ کی ایک ہی منزل تعمیر ہوئی تھی کہ علاؤالدین فوت ہو گیا اور یہ مینار نامکمل رہ گیا۔ اس کے جانشین اس قابل نہ تھے کہ اس مینارہ کی تکمیل کا خیال کرتے

وفات آخری ایام میں سلطان علاؤالدین بہت زیادہ تند مزاج ہو گیا تھا۔ ملک کافور اس کا منظور نظر تھا اور سلطان اسی کے کہنے پر عمل کرتا تھا۔ بعض مؤرخین کا خیال یہ ہے۔ کہ ملک کافور اگرچہ خواجہ سرا تھا۔ لیکن اس کے دل میں بھی بادشاہت کا خیال پیدا ہو چکا تھا۔ اور اپنا رستہ صاف کرنے کے لیئے اس نے علاؤالدین کو ہلکی قسم کا زہر دینا شروع کیا جس سے

اس کے حواس اپنی جگہ پر قائم نہ رہے۔ اور اس نے اپنے آزمودہ کار اور وفادار امراء کو مروانا شروع کر دیا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ بڑھاپے میں سلطان ازحد شکی مزاج ہو گیا تھا۔ نیز اپنے پرانے رقیبوں کو ختم کرنے کے لئے ملک کافور نے بھی کان بھرے۔ لہذا اس نے اپنے پرانے مشیروں کو ذلیل و خوار کیا یا مروا ڈالا۔ ملک کافور کے کہنے پر سلطان نے تجربہ کار وزراء کو برطرف کر دیا لیکن نئے مشیر نااہل ثابت ہوئے۔ علاؤالدین کے بیٹے عیش و عشرت میں مگن تھے اور سلطان معمولی شک پر آزمودہ کار افسروں کو قتل کروا ڈالتا تھا۔ ان حالات میں سلطنت کا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ اور ملک میں بدنظمی کا دور شروع ہوا۔ آخری ایام میں علاؤالدین نے نو مسلم منگولوں پر بہت ظلم کیا اور سازش کے شک پر ان کے کئی خاندان برباد کر دیئے۔

۱۳۱۵ء میں ملک کافور کے کہنے پر وہ اپنی بیوی اور بیٹوں پر بھی شک کرنے لگا۔ اس کا خیال پیدا ہوا کہ اس کا بیٹا خضر خان اپنے ماموں الف خاں حاکم گجرات کی سازش سے علاؤالدین کو تخت سے علیحدہ کرنا چاہتا ہے۔

اگرچہ سلطان بیمار تھا۔ اور اس میں چلنے پھرنے کی سکت بھی نہ تھی لیکن حکومت کی ہوس ابھی باقی تھی۔ چنانچہ اس نے الف خاں کو گجرات سے بلا کر قتل کر ڈالا۔ ملکہ جہاں کو محل سے نکال کر ذلیل و خوار کیا۔ خضر خاں کو قید خانے میں ڈال دیا۔ بعد میں اپنے دوسرے بیٹے شادی خاں کو بھی قید کر دیا۔ ان باتوں کو دیکھ کر لوگ سمجھنے لگے کہ بادشاہ مخبوط الحواس ہو گیا ہے۔ ملک کے تمام حصوں میں بغاوتیں ہونے لگیں۔ اور سلطنت کمزور ہو گئی۔ گجرات پر الف خاں کے رشتہ داروں نے قبضہ جما لیا۔ چتوڑ اور دیوگڑھی کے صوبے خود مختار

ہو گئے۔ اور ان خبروں کو سن کر علاؤ الدین خلجی ۱۳۱۵ء میں فوت ہوا سلطان کو مسجد قوۃ الاسلام کے صحن میں شمال کی جانب دفن کیا گیا اس کی قبر پر ایک چھوٹا سا مقبرہ ہے۔

خلجی خاندان کا خاتمہ

علاؤ الدین خلجی کی وفات پر ملک کافور سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا اس نے علاؤ الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے شہاب الدین عمر کو تخت پر بٹھایا۔ جس کی عمر صرف چھ سال تھی۔ ملک کافور خود نائب سلطنت بنا۔ اس نے خضر خاں اور شادی خاں کو اندھا کروا ڈالا۔ اور قید خانے میں محبوس رکھا۔ علاؤ الدین کا ایک اور لڑکا مبارک خاں خلجی ملک کافور کی سازشوں کا شکار نہ ہو سکا۔ علاؤ الدین کی وفات کے تقریباً ایک ماہ بعد محل کے سپاہیوں نے بلوہ کر کے ملک کافور کو مار ڈالا۔ امراء نے مبارک خلجی کو نیا نائب سلطنت مقرر کیا۔ لیکن اپنے چھوٹے بھائی کو قید کر کے وہ خود بادشاہ بن بیٹھا۔ قید خانے میں اس نے شہاب الدین عمر کو اندھا کروا ڈالا۔

مبارک خلجی نیا سلطان نہایت عقل مند اور دور اندیش ثابت ہوا۔ اس نے امراء کو از سر نو عزت بخشی۔ ان کی جاگیریں بحال کیں۔ ظالمانہ ٹیکس منسوخ کئے۔ تجارت سے پابندیاں بھی دور کیں اور اپنے غلاموں کو اعلیٰ عہدے عطا کئے۔ چنانچہ سلطان مبارک خلجی بہت جلد ہر دلعزیز ہو گیا۔ اور دیوگرھی کی بغاوت کو بھی آسانی سے فرد کیا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد بادشاہ عیش و عشرت میں ڈوب گیا۔ مبارک خلجی نے خسرو خاں نامی ایک نو مسلم کو اپنا مصاحب خاص بنا لیا اور اسی کے

اشاروں پر ناچنے لگا۔ یہ شخص بہت خوبصورت تھا لیکن پرواری یا دھیر قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ ہندوؤں میں دھیر قوم کے لوگ گندے اور ذلیل سمجھے جاتے ہیں اور ان کو گاؤں میں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مبارک خلجی نے سلطنت کا تمام کام خسرو خان کے سپرد کیا اور خود عیش و نشاط میں مگن رہنے لگا۔ ۱۳۱۸ء میں خسرو خاں نے مبارک خلجی کو قتل کروا ڈالا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ مبارک خلجی کا عہد حکومت صرف تین سال تھا۔

خسرو خاں

مبارک خلجی کے قتل کے بعد خسرو خاں دھیر نے ناصر الدین کا لقب اختیار کیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ خسرو خاں نے اپنی قوم کے نیچ ذات کے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے دیئے اور دہلی پر ان کو مسلط کر دیا۔ وہ اگرچہ مسلمان تھا لیکن برادری کے لوگوں پر خاص مہربان تھا۔ اور ان کی من مانی کارروائیوں پر باز پرس نہ کرتا تھا۔ چنانچہ نیچ ذات کے ہندوؤں نے خوب ظلم و ستم ڈھائے۔ شاہی خاندان کے بچے کھچے افراد اور کم عمر بچوں کو تہ تیغ کیا۔ خلجی خاندان کے وفادار امراء کو ذلیل و خوار کیا اور باعزت خواتین کو پرواری قوم کے مردوں کے سپرد کیا۔ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت سے دہلی میں طوفان بدتمیزی بپا ہوا۔ اور بعض مقامات پر مسجدوں کی اعلانیہ بے حرمتی کی گئی۔

مسلمان امراء کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے خسرو خان کے خلاف بغاوت کی۔ اس وقت غازی ملک اتفاق سے دیپالپور میں موجود تھا۔ اور اس کے پاس ایک زبردست فوج موجود تھی۔

اس کا لڑکا جونا خاں دہلی کے امراء کی صف میں شامل تھا۔ ایک روز موقع پا کر جونا خاں دہلی سے بھاگ نکلا اور باپ کے پاس جا پہنچا۔ اب غازی ملک نے پنجاب کے لوگوں کی مدد سے دہلی پر حملہ کیا اور سرسہ کے قریب خسرو خاں کو

شکست دی دہلی کے قریب ایک اور لڑائی ہوئی، لیکن خسرو خان شکست کھا کر گرفتار ہوُا اور قتل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو دھیر قوم کے ہندوؤں کے ظلم سے نجات ملی اور عوام نے خوشیاں منائیں۔ غازی ملک امراء کی درخواست پر سلطان غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کر کے ۱۳۲۰ء میں تخت نشین ہوُا۔
خلجی سلطنت کی تباہی کا باعث ملک کافور اور مبارک خلجی تھے۔

Typical Questions

Q. 1. Give a brief account of the administrative and economic policy of Ala-ud-Din Khilji.

Q. 2. Do you agree with the view that Ala-ud-Din Khilji was a great man? Give reasons.

Q. 3. Carefully outline the administrative and econo. mic reforms of Ala-ud-Din Khilji.

Q. 4. What were the military, political and economic measures adopted by Sultan Ala-ud-Din Khilji to defend his empire from disintegration and foreign aggression?

Q. 5. Give a critical account of South Indian campaigns and policy of Ala-ud-Din Khilji.

Q. 6. Sultan Ala-ud-Din Khilji has been acclaimed as a great administrator. Why?

Q. 7. Give an account of the conquest of Sultan Ala-ud-Din Khilji.

Q 8. Give a brief acoount of the Deccan campaigns of Malik Kafur during the reign of Ala-ud-Din Khilji.

Q. 9. What measures were adopted by the Ala-ud-Din Khilji to defend his empire from the Mongols and to suppress rebellions ? Discuss his economic reforms.

Q. 10. Give a brief account of the career of Malik Kafur.

Q. 11. Form an estimate of the character of Ala-ud-Din Khilji and give a detailed account of his conquest of the Deccan.

Q. 12. Write short notes on any three of the following :—

(*a*) Malik Chajju, (*b*) Siddi Maula.
(*c*) Kamla Devi. (*d*) Haji Maula.
(*e*) Padmani. (*f*) Malik Kafur.
(*g*) Khusroe Khan.

Q. 13. Decribe Ala-ud-Din Khilji's policy towards the Hindus and the nobles.

Q. 14. Describe the measures adopted by Ala-ud-Din Khilji to control black-marketing and other anti-social practices of the trading classes of his time.

امتحانی سوالات

۱۔ سلطان علاؤالدین خلجی کی انتظامی اور معاشی پالیسی کا مختصر حال بیان کیجئے

۲۔ کیا آپ کو اس رائے سے اتفاق ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی ایک عظیم الشان ہستی کہلانے کا مستحق ہے۔ وجوہات بیان کیجئے۔

۳۔ علاؤالدین خلجی کی انتظامی اور معاشی اصلاحات کا جائزہ لیجئے۔

۴۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے اپنی سلطنت کو غیر ملکی حملوں اور اندرونی خلفشار سے بچانے کے لئے کیا کیا اصلاحات نافذ کیں؟ اس کی فوجی، سیاسی اور معاشی اصلاحات کا حال بیان کیجئے۔

۵۔ علاؤالدین خلجی کی دکنی پالیسی اور فتوحات کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

۶۔ کس بنا پر سلطان علاؤالدین خلجی کو اعلیٰ منتظم اور مدبر گنا گیا ہے واضح کیجئے

۷۔ سلطان علاؤالدین خلجی کی فتوحات کے حالات قلم بند کیجئے۔

۸۔ علاؤالدین کے عہد حکومت میں ملک کافور کی دکنی فتوحات کا حال بیان کیجئے۔

۹۔ علاؤالدین خلجی نے بغاوتوں کو فرو کرنے اور اپنی سلطنت کو منگولوں کے حملہ سے بچانے کے لئے کون کونسی تدابیر اختیار کیں؟ اس کے معاشی نظام کا بھی حال لکھئے۔

۱۰۔ ملک کافور کے عروج وزوال کے حالات بیان کیجئے۔

۱۱۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے خصائل اور کردار کا حال بیان کیجئے اور اسکے عہد حکومت کی دکنی فتوحات کی تفصیلات قلم بند کیجئے۔

۱۲۔ مندرجہ ذیل میں سے کسی تین پر مختصر نوٹ لکھو:۔

(ا) ملک چھجو (ب) سیدی مولہ (ج) کملا دیوی (د) حاجی مولے (ر) پدمنی (ہ) ملک کافور (س) خسرو خان۔

بائیسواں باب

تغلق خاندان

خسرو کے خاتمے کے ۔۔۔۔ بعد غازی ملک ہندوستان کا شہنشاہ بنا۔ اس نے غیاث الدین کا لقب اختیار کیا۔ وہ تغلق خاندان کا بانی ہے اور اس نے بہت جلد بدامنی اور شورش کو دور کر کے اپنے تدبر کا ثبوت دیا۔ بادشاہ بننے سے پہلے وہ محافظ سرحد یعنی سپہ سالار تھا اور دور دور تک اس کی شجاعت کا شہرہ تھا۔

تغلق خاندان کی ابتدا کے بارے میں مورخین میں شدید اختلاف ہے۔ بعض مورخ یہ سمجھتے ہیں کہ غازی ملک ترکی نسل سے تھا اور سلطان غیاث الدین بلبن کا غلام تھا۔ اس نے پنجاب میں جاٹ قبیلے کی ایک عورت سے شادی کی اپنی بے مثال بہادری کی بنا پر علاؤالدین کے زمانے میں پنجاب کا گورنر مقرر ہوا اور بعد میں محافظ سرحد بن گیا۔ فرشتہ کا خیال یہ ہے کہ غازی ملک کے قبیلے کا نام قتلغ تھا لیکن ہندوستانیوں نے اس لفظ کو بگاڑ کر "تغلق" بنا دیا۔ موجودہ دور میں اس نظریے کو درست نہیں مانا جاتا۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے ابن بطوطہ کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ غازی ملک ایک معمولی غریب آدمی تھا۔ اور ترکوں کے قبیلہ کرونہ (Karauna) سے تعلق رکھتا تھا۔ ابتداء میں سندھ کے ایک تاجر کے پاس گھوڑے چرانے کے لئے ملازم تھا۔ بعد میں علاؤالدین کے بھائی الغ خاں کے سواروں میں شامل ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ ترقی کر کے شمالی مغربی سرحدی صوبے کا گورنر اور محافظ سرحد مقرر ہوا۔ شروع

سے ہی وہ اپنے نام کے ساتھ غازی ملک تغلق لکھا کرتا تھا اس لئے بادشاہ بننے پر بھی تغلق ہی کہلایا۔

غیاث الدین تغلق کے کارنامے۔ غیاث الدین تغلق ۱۳۲۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا عہد حکومت نہایت مختصر یعنی صرف پانچ سال تھا لیکن اس قلیل عرصے میں اس نے سلطنت دہلی کا کھویا ہوا وقار دوبارہ قائم کیا۔ وہ اعلیٰ مدبر اور منتظم تھا۔ اس نے رعایا کی بہبودی کا از حد خیال رکھا۔ وہ منصف مزاج حکمران تھا اور حد اعتدال سے کبھی تجاوز نہ کرتا تھا وہ نرم مزاج اور رحم دل تھا۔ اس نے سخت گیرانہ پالیسی کی بجائے امراء سے صلاح و مشورہ لینے کا طریقہ شروع کیا۔ اس نے سرکاری حکام پر اعتماد کیا اور علاؤ الدین کی پالیسی کو ترک کر کے گاؤں کے چودھریوں اور نمبرداروں کو انتظامی امور میں اپنا مددگار بنایا اس نے زمین کا از سر نو بندوبست کیا اور پیداوار کے تناسب سے مالیہ مقرر کیا۔ ضرورت کے وقت مالیہ میں بتدریج اضافہ کیا جاتا تھا۔ تاکہ رعایا پر یک لخت بوجھ نہ پڑ جائے۔ اس نے آبپاشی کا انتظام کر کے بنجر علاقوں کو آباد کیا اور باغات بھی لگوائے۔ اس نے سرکاری افسروں کے لئے خرابہ کا طریقہ رائج کیا یعنی سرکاری ٹیکس وصول کرنے والوں کو اجازت دی کہ وہ جمع شدہ رقم میں سے ۲½ فیصدی کمیشن رکھ لیں، لیکن بقایا روپیہ باقاعدہ سرکاری خزانے میں جمع کرانا لازم تھا۔ غفلت کرنے والوں یا سرکاری روپیہ خورد برد کرنے والوں کو سزا دی جاتی تھی۔ جب غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا تو سرکاری خزانہ خالی تھا اور ملک بھر میں لوگوں کے دلوں سے قانون کا احترام اٹھ گیا تھا۔ سوسائٹی میں عمدہ اخلاق کی قدر نہ رہی تھی۔ سلطان تغلق نے نہایت دانشمندی سے تمام حالات پر قابو پایا

اور نظم ونسق کی تمام خرابیاں دور کر کے لوگوں کو شائستہ بنا دیا۔ محکمۂ انصاف اور پولیس کی دوبارہ تنظیم سے سوسائٹی کی حالت بہتر ہو گئی۔ اس نے شراب نوشی اور گداگری پر بھی پابندیاں لگائیں اور ملک کو لٹیروں سے پاک کر کے شاہراہوں کو محفوظ بنایا۔

فوجی مہمیں۔ غیاث الدین تغلق ایک آزمودہ کار جرنیل تھا۔ لہٰذا اس نے فوجی قوانین میں کوئی نرمی نہ دکھائی۔ اسلحہ کی باقاعدہ جانچ پڑتال ہوتی تھی بھرتی کرتے وقت سوار اور اس کے گھوڑے کا حلیہ لکھا جاتا تھا۔ سلطان نے منگولوں کی روک تھام کا مناسب بندوبست کیا۔ اس کے علاوہ دشمنوں کی سرکوبی کی گئی۔ مزید علاقوں میں فتوحات کے لئے فوجی مہمیں بھی روانہ کی گئیں۔

(۱) **ورنگل کی فتح۔** ۱۳۲۳ء میں ورنگل کے راجہ رودرادیو کی سرکوبی کے لئے شہزادہ محمد جونا خان کو بھیجا گیا۔ محمد جونا خاں کا لقب فخرالدین تھا اور غیاث الدین تغلق نے اسے الغ خاں کا خطاب عطا کیا تھا۔ ورنگل پر فوج کشی کی وجہ یہ تھی کہ علاؤالدین کے مرتے ہی تمام دکنی علاقے خودمختار بن بیٹھے تھے اور ورنگل کا راجہ دکنی سرکش حکمرانوں کا سرغنہ تھا۔ راجہ قلعہ بند ہو گیا اور محاصرے نے طول پکڑا۔ راجہ رودرادیو نے باجگذاری کی شرط قبول کرنے کی درخواست کی لیکن محمد جونا خاں نہ مانا۔ قلعہ میں سامان خوراک کافی تھا۔ اور حملہ آوروں کے پاس قلعہ شکن توپیں موجود نہ تھیں۔ دکن کی مرطوب آب وہوا سے اکثر فوجی بیمار پڑ گئے۔ اس کے علاوہ فوج میں غلط افواہیں بھی پھیل گئیں۔ لہٰذا محمد جونا خاں کو پیچھے ہٹ کر دیوگرھی آنا پڑا۔ اس مقام سے محمد جونا خاں نے اپنی فوج کو دوبارہ ترتیب دے کر

ورنگل پر دوبارہ حملہ کیا۔ راجہ شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ اور محمد جونا خاں نے اس علاقے کا الحاق سلطنت دہلی سے کر لیا۔ فاتح شہزادے نے ورنگل کا نام بدل کر سلطان پور رکھ دیا۔ مختلف قلعوں میں شاہی فوجیں رکھیں اور فتح مند و کامران واپس لوٹا۔

بنگال کی دوبارہ تسخیر۔ بلبن کے زمانے سے بنگال نیم آزاد چلا آتا تھا سکہ اور خطبہ دہلی کے سلطان کا ضرور چلتا تھا لیکن بنگال کے گورنر موروثی تھے اور سلطان دہلی کے رسمی طور پر باجگذار تھے۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانے میں بنگال کے گورنر شہاب الدین کو اس کے بھائی بہادر شاہ نے گدی سے ہٹا کر خود بنگال پر قبضہ کر لیا۔ شہاب الدین نے سلطان تغلق کی خدمت میں فریاد کی چنانچہ بوڑھا سلطان خود فوج لے کر لکھنوتی پہنچا۔ بہادر شاہ پایہ تخت کو چھوڑ کر مشرقی بنگال چلا گیا تاکہ افواج شاہی کو پریشانی ہو سلطان نے بہرام خاں کو اس کے تعاقب میں بھیجا۔ سنار گاؤں یعنی ڈھاکہ کے قریب بہادر شاہ نے دہلی کی افواج سے شکست کھائی اور گرفتار ہوا۔ سلطان تغلق نے بنگال کا صوبہ اصلی گورنر یعنی شہاب الدین کے حوالے کیا اور راستے میں ترہٹ کے علاقے کو فتح کر کے دہلی واپس لوٹا۔ ابھی سلطان دہلی نہیں پہنچا تھا کہ موت نے اسے آ لیا

سلطان کی وفات۔ ۱۳۲۵ء میں بنگال کی دوبارہ تسخیر کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق دہلی واپس آ رہا تھا۔ باپ کا استقبال کرنے کے لئے شہزادہ محمد جونا خاں دہلی سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر افغان پورہ کے مقام پر پہنچا اور سلطان کو ایک چوبی محل میں اتارا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اکثر امراء ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے باہر نکل آئے۔ لیکن ہاتھیوں کے دھماکے سے لکڑی کا محل اچانک گر پڑا اور سلطان غیاث الدین تغلق اپنے چھوٹے بیٹے سمیت

دب کر مر گیا۔ ابن بطوطہ اور بعض دیگر مؤرخین یہ سمجھتے ہیں کہ محل شہزادہ محمد جونا خاں کی سازش سے گرا تھا کیونکہ شہزادہ محمد جونا خاں تخت حاصل کرنے کیلئے بیقرار تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں دہلی کے عوام کو یقین تھا کہ بوڑھے سلطان کی موت سازش کا نتیجہ ہے عصامی نے بھی یہی شک ظاہر کیا ہے صرف ضیاء الدین برنی یہ لکھتا ہے کہ بلائے آسمانی..... بجلی گرنے سے منہدم ہو گیا اور سلطان اپنے چند امراء سمیت دب کر مر گیا۔ موجودہ تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ محل کا گرنا محض اتفاق تھا اور شہزادہ محمد جونا خاں اپنے باپ کے قتل کا مجرم نہیں ہے۔ شہزادہ محمد جونا خاں ولیعہد تھا اور کوئی جوان بھائی تخت کا دعویدار نہ تھا.....

سلطان بنگال جاتے ہوئے اسے نائب سلطنت بنا کر گیا تھا محمد جونا خاں سپہ سالار بھی تھا اور اسے امیر الامراء (الغ خاں) بنایا گیا تھا۔ لہٰذا باپ کو مروانے میں شہزادے کو کچھ فائدہ نہ تھا۔ سلطان کی اچانک موت کے بعد محمد جونا خاں تخت نشین ہوا۔ اسے ہم عصر مؤرخین سلطان محمد بن تغلق لکھتے ہیں لیکن یورپی مؤرخین اسے سلطان محمد تغلق کے نام سے پکارتے ہیں ہمارا خیال یہ ہے کہ چند مشرقی مؤرخین نے اسے محمد بن تغلق کی بجائے محمد تغلق لکھنا شروع کیا۔ یورپ والوں نے اضافت ابنی کو حذف کر کے اس نام کو محمد تغلق میں تبدیل کر دیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کو دہلی کے قریب سلطان کے نئے آباد کردہ شہر تغلق آباد میں دفن کیا گیا۔ یہ عالیشان مقبرہ اب تک تغلق آباد کے قلعے کے سامنے موجود ہے۔ بعد میں سلطان محمد تغلق بھی اسی مقبرے میں دفن ہوا

سلطان محمد بن تغلق (محمد تغلق)

نیا سلطان ۱۳۲۵ء میں تخت نشین ہوا اور اس کا عہد حکومت ۲۶ سال ۱۳۵۱ء تک رہا۔ سلطان محمد تغلق علم و فضل میں لاثانی تھا۔ کئی زبانیں جانتا تھا۔ عربی

فارسی اور نثر کی میں اعلیٰ پایہ کا ادیب اور شاعر تھا۔ فلسفہ، ریاضی، نجوم اور طبیعات میں بھی بلند درجے کی علمیت رکھتا تھا۔ علم طب میں اسقدر مہارت رکھتا تھا کہ ملک بھر کے مشہور طبیب اس کی لیاقت کا لوہا مانتے تھے۔ سلطان فنون لطیفہ کا بھی شائق تھا۔ اور اعلیٰ درجے کا خوش نویس بھی تھا۔ ان صفات کے علاوہ سلطان شیریں گفتار بھی تھا۔ اور بلا کا عمدہ حافظہ رکھتا تھا۔ مؤرخ اسے بجا طور پر ہر فن مولا (Versatile genius) کہتے ہیں۔

سلطان منصف مزاج، متقی اور پارسا انسان تھا۔ رعایا کی بہبودی کا خواہاں تھا۔ رواداری اور فیاضی میں بے مثال تھا۔ اور ہندو اور مسلمان سب سے یکساں سلوک روا رکھتا تھا۔ سلطان جنگ و جدل اور بہادری میں بھی لاثانی تھا۔ اس نے ہر باغی کا سر کچلا اور اپنی سیاست دانی کا ثبوت دیا۔ اس کے عہد حکومت کے آخری دور میں ملک کے چپہ چپہ میں بغاوتیں پھیل گئیں لیکن سلطان محمد تغلق کے آہنی عزم میں فرق نہ آیا۔ چنانچہ ان بغاوتوں کو فرو کرتے ہوئے اس نے وفات پائی

متضاد صفات یا جنون۔ محمد تغلق کی تمام اصلاحات ناکام ثابت ہوئیں اور لوگ اُسے جنونی یا پاگل کہنے لگے۔ فرشتہ اور بدایونی نے اسے بالکل دیوانہ قرار دیا ہے۔ ضیاء الدین برنی اس کا مصاحب تھا وہ اگرچہ محمد تغلق کے اوصاف بیان کرتا ہے۔ لیکن اس نے سلطان کے بے حد عیوب بھی تحریر کئے ہیں۔ مشہور مؤرخ عصامی بھی اسکے اعمال پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ سلطان اسقدر بدقسمت ہے کہ افریقی سیاح ابن بطوطہ جو اس کا مہمان رہا اور جس پر سلطان نے کئی ایک مہربانیاں کیں حتیٰ کہ اسے قاضی کا عہدہ بھی عطا کیا وہ بھی محمد تغلق کا شدید مخالف ہے اور اس کی عیب جوئی کرتا ہے۔ ہندو مؤرخین کو ان حالات میں سلطان کے خلاف زہر اُگلنے کا نہایت اعلیٰ موقعہ ملا ہے۔ چنانچہ تاریخ ہند و پاکستان میں محمد تغلق کو محض جنونی یا

پاگل سمجھا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان محمد تغلق نہایت پڑھا لکھا اور عالی دماغ انسان تھا۔ منطق اور فلسفے میں ماہر ہونے کی بنا پر ہر معاملے کو عقل اور فطرت کے اصولوں کے مطابق جانچتا تھا۔ مذہبی معاملات میں بھی ضعیف الاعتقادی یا ڈھکوسلوں کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ کسی مفتی یا قاضی یا درویش سے مرعوب نہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنے دربار سے مولویوں کا اقتدار ختم کر دیا۔ اسنے علماء اور صوفیوں کی اجارہ داری مٹا دی اور ان کو سزائیں دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ لہذا غرض مند علماء نے بادشاہ کو پاگل اور جنونی مشہور کر دیا۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ محمد تغلق خداداد قابلیت رکھتا تھا اور حد سے زیادہ لائق اشخاص کو لوگ جنونی ہی سمجھتے ہیں

"Muhammad Tughlk was a genius with a share of that madness to which great wit is nearly allied."

علماء پر سختی: سلطان محمد تغلق خود جید عالم تھا لہذا وہ مذہب کے نام پر علماء کو تجارت کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ معتزلہ فرقہ کے اصولوں کے مطابق کسی عقیدہ یا روایت کو قبول نہ کرتا تھا۔ جب تک وہ عقل کے مطابق نہ ہو۔ علماء یہ تنقیدی انداز پسند نہ کرتے تھے کیونکہ وہ فلسفہ اور عقلی علوم سے نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ سلطان کے مذہبی عقاید کے خلاف جذبہ ناراضگی پھیل گیا اور اکثر ہم عصر مورخین نے سلطان کے کردار پر نکتہ چینی کی ہے یا اسے جنونی قرار دیا ہے۔ ہم عصر مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ سلطان نے صوفیوں اور مشائخ پر ناجائز سختی روا رکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان عدل و انصاف کا پتلا تھا اور کسی کو قتل کی سزا دینے سے پہلے مفتی شرع کا فتویٰ حاصل کرتا تھا۔ اس نے مشائخ کو تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہ دی بلکہ انکو تبلیغ اسلام کی جانب لگانا چاہا۔ سادات اور مشائخ بڑے بڑے شہروں میں تن آسانی کی زندگی بسر کرتے رہے تھے اور سرکاری وظیفوں پر

عیش و عشرت کرنے کے عادی بن چکے تھے۔ سلطان محمد تغلق کی خواہش کے مطابق وہ قومی خدمت کی جانب نہ لگ سکے اور سلطان سے ان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے لیکن یہ محض پراپاگنڈا ہے۔ کہ سلطان نے مشائخ پر بے جا سختی کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے چند مخصوص اشخاص کو سازش یا نافرمانی کی بنا پر سزائیں دیں اور ہم عصر مورخین نے اسے علماء اور مشائخ پر سختی گردانا۔ چند مثالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے سلطان کے حکم سے شیخ ہود کو قتل کر دیا گیا۔ کیونکہ یہ شخص اپنی موروثی جاگیر کی آمدنی کو تبلیغی کاموں پر خرچ کرنے کی بجائے اپنی ذات پر خرچ کرتا تھا اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ شیخ ہود کے جد اعلیٰ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی تھے۔ کول یا علی گڑھ کے ایک عالم شیخ شمس الدین کو اس لئے موت کی سزا دی گئی کہ اس نے ایک باغی امیر کی مدد کی تھی۔ اسی طرح شیخ حیدری کو بھی حکومت کے خلاف سازش کرنے کے جرم میں قتل کی سزا دی گئی سلطان محمد تغلق نے علماء اور مشائخ پر ناجائز سختی نہیں کی اور سلطان کو جابر یا ظالم نہیں گنا جا سکتا۔

شاہی کردار کی خامیاں۔ سلطان محمد تغلق تند مزاج، زود رنج اور ضدی تھا۔ وہ حد سے زیادہ بے صبری سے کام لیتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اسکے منہ سے نکلی ہوئی بات فوراً پوری ہو جائے۔ معمولی فروگذاشت پر بھی سخت سزائیں دیتا تھا۔ مطلق العنان بادشاہوں کی طرح انسانی خون گرانے سے بھی دریغ نہ کرتا تھا۔ دور اندیشی اور مصلحت وقت سے بالکل کام نہ لیتا تھا۔ اس کے برعکس وہ فیاضی اور عدل و انصاف کا پتلا تھا۔ پس مورخ اسے متضاد صفات کا مالک گنتے ہیں۔

1 "His character was a strange medley of the most contradictory qualities."

2. " His character was a mixture of two extremes ; but he was a man of ideas."

محمد تغلق کی ناکامی کا باعث اس کے کردار کی یہی خامیاں ہیں۔ سلطان نے جو بھی تجاویز اور اصلاحات سوچیں وہ ہر لحاظ سے عمدہ تھیں لیکن عوام کو سمجھانے کی بجائے وہ ضد کر کے اپنے احکامات منواتا تھا۔ لوگ ان حالات میں اسے جنونی سمجھتے تھے۔ بعض مورخین سلطان محمد تغلق کو نظریاتی ہستی (Visionary) گنتے ہیں یعنی وہ محض نئے نظریے قائم کرنا جانتا تھا۔ ان پر عمل کرنے کا طریقہ نہ جانتا تھا۔ اصلی بات یہ ہے کہ سلطان محمد تغلق جیسا پڑھا لکھا بادشاہ اس دور کے لئے موزوں نہ تھا۔ اسے بیسویں صدی کا حکمران ہونا چاہیئے تھا۔ سلطان کی رعایا اسکی سکیموں کو نہ سمجھ سکی اور اُلٹا اسے پاگل اور جنونی گردانا۔

(" He was born before his time.")

یہ بات بھی درست ہے کہ سلطان نے جلد بازی سے کام لیا اور بے صبری سے اپنی سکیموں کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔ حالات کا جائزہ نہ لیا اور عوام کو خاطر میں نہ لایا بس اس کی اصلاحات نہایت عمدہ تھیں لیکن قبل از وقت ضرور تھیں اسکے علاوہ سلطان نے ان کو نافذ کرنے کے طریقے میں بھی غلطی کھائی۔ محض خیالی پلاؤ پکانے میں ہی مگن رہتا تھا۔ وہ جنونی نہ تھا - محض ضد کی وجہ سے ناکام ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ حالات ہی کچھ اس قسم کے تھے کہ سلطان کی اصلاحات ناکام ثابت ہوئیں مثلاً اس کے عہد میں ایک خوفناک قحط پڑا ہوا اور اس کی کوششوں کے باوجود کئی سال جاری رہا۔ اس قحط کی بدولت اس کی انتظامی اصلاحات درہم برہم ہو گئیں۔ مشہور مورخ ڈاکٹر مہدی حسین فرماتے ہیں :-

He was neither visionary nor impractical, nor inherently unsound, nor were his grandoise schemes beyond the range of human possibility. He was far in advance of his age......"

سلطان کی انتظامی تدابیر اور ان کی ناکامی

(۱) مالیہ میں اضافہ۔ گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقہ یعنی دوآبہ کے لوگ اپنی سرکشی کی بدولت ہر حکمران کو تنگ کیا کرتے تھے۔ سلطان نے ان پر سختی کی اور اس علاقے کے مالیہ میں اضافہ کر دیا۔ یہ علاقہ ازحد زرخیز تھا۔ اور مالیہ میں اضافہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس سے پہلے علاؤالدین نے بھی اس علاقے پر کافی سختی کی تھی۔ محمد تغلق دوآبہ کے لوگوں کو امن پسند بنانا چاہتا تھا نیز وہ اپنی وسیع سلطنت کے انتظام کے لئے سرکاری آمدنی بڑھانا چاہتا تھا۔ بدقسمتی سے محمد تغلق نے مالیہ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ چند نئے ٹیکس بھی لگا دیئے جو لوگوں کو ناگوار گذرے۔ مثلاً چراگاہوں اور جانوروں پر ٹیکس اور مختلف اشیاء پر محصول یہ تمام بلاواسطہ ٹیکس (Direct) تھے اور ادائیگی کے وقت عوام کو ناگوار گذرتے تھے۔ ان دنوں ہندوستان میں ایک خوفناک قحط رونما ہوا۔ کھیت اجڑ گئے اور لوگ کنگال ہو گئے۔ ضیاءالدین برنی لکھتا ہے کہ بھاری ٹیکسوں سے کاشتکار برباد ہو گئے۔ دراصل لوگوں کی زبوں حالی کا باعث خوفناک قحط تھا۔ ٹیکسوں سے اس قدر مصیبت بپا نہیں ہوئی۔ سلطان محمد تغلق نے قحط کو دور کرنے کے لئے عمدہ تدابیر سوچیں۔ کنوئیں کھدوائے اور قرضے بھی دیئے

لیکن قحط نہایت ہولناک تھا اور اس کی (Famine Policy) لوگوں کی مصیبت دور نہ کر سکی. سلطان قحط کی مصیبت کو دور کرنے کے لئے بے دریغ روپیہ صرف کرتا تھا لیکن بدقسمتی سے سلطان اصول پر قائم رہا۔ اور اس نے قحط کے باوجود مالیہ اور دیگر ٹیکس معاف نہ کئے۔ اس کا خیال تھا اس قسم کی معافی سے لوگ نکمے ہو جاتے ہیں عوام نے اسے جابر اور ظالم گنا اور یہ غلط پراپیگنڈا عام ہو گیا کہ شاہی ٹیکسوں کی بدولت کھیت اجڑ گئے ہیں اور لوگ مفلس و نادار ہو گئے ہیں۔ پس سلطان کی پہلی ہی انتظامی تدبیر ناکام ثابت ہوئی کیونکہ قحط کی بنا پر حالات سازگار نہ تھے۔ یہ خوفناک قحط سات سال تک رہا۔

۲ پایہ تخت کی تبدیلی۔ سلطان نے ۱۳۲۷ء میں یہ منصوبہ سوچا کہ دہلی کی بجائے دیوگڑھی کو پایۂ تخت بنایا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ تغلق سلطنت از حد وسیع ہو چکی تھی۔ اور دیوگڑھی جیسے مرکزی مقام سے انتظام سلطنت میں آسانی تھی اسکے علاوہ دکنی علاقے کو قابو میں رکھنے کے لئے دیوگڑھی موزوں مقام تھا۔ سلطان نے یہ بھی سوچا کہ دہلی منگولوں کی زد میں ہے اور دیوگڑھی اس کی نسبت زیادہ محفوظ ہے۔ چنانچہ اس نے دیوگڑھی کو دولت آباد کا نام دیا اور ملک کا پایۂ تخت بنا دیا یہ سکیم نہایت عمدہ تھی اور اس میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اکثر حکومتیں اپنا پایۂ تخت تبدیل کر لیتی ہیں۔ چنانچہ انگریزوں نے بھی سلطنت وسیع ہونے پر کلکتہ کی بجائے دہلی دارالسلطنت بنا لیا تھا۔ لیکن محمد تغلق نے اپنا حکم منوانے کے لئے ایک عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا۔ اس نے دہلی کے تمام لوگوں کو دولت آباد جانیکا حکم دے دیا۔ حالانکہ چاہئیے یہ تھا کہ بادشاہ خود دولت آباد چلا جاتا۔ اہل غرض اور ملازم پیشہ لوگ خود بخود پیچھے چلے آتے۔ لیکن جبر کی بدولت دہلی والے بگڑ گئے اور سلطان کی عقل و دانش پر تین حرف بھیجنے لگے۔ پایہ تخت تبدیل

ہونے ہی خوفناک قحط رونما ہوا اور دولت آباد میں خوراک کی کمی ہوگئی۔ مجبوراً سلطان نے دہلی واپس چلے جانے کا حکم دیا۔ اتنا لمبا سفر طے کرنے میں لوگوں کو کافی تکلیف ہوئی اور عوام بادشاہ کو جنونی سمجھنے لگے۔ دارالحکومت کی تبدیلی کی سکیم بالکل درست تھی لیکن قحط نے اسے ناممکن بنا دیا۔ اس کے علاوہ سلطان نے اس سکیم کو نافذ کرنے کے طریقے میں غلطی کھائی یعنی اس نے دولت آباد کو دہلی والوں سے بسانا چاہا۔ سلطان کو اس سے مفت کی بدنامی حاصل ہوئی۔

(۳) قانونی سکے۔ سلطان محمد تغلق ایک زبردست عالم تھا اور معاشیات و مالیات کا ماہر تھا۔ لہٰذا ۱۳۳۰ء میں اس نے ملکی فائدے کیلئے ایک نئی تجویز سوچی یعنی قانونی یا علامتی سکے جاری کئے۔ اس نے تانبے کا ایک نیا سکہ جاری کیا اور حکم دیا کہ ملکی کاروبار کے لیئے اس کی قیمت چاندی کے سکوں کے برابر کردی جائے اسے قانونی سکہ کہتے ہیں۔ آجکل کاغذ کے نوٹ بھی قانونی یا علامتی سکے ہیں اور حکومت کے اعتبار پر چلتے ہیں۔ محمد تغلق کے عہد میں قانونی سکوں کا تجربہ پہلی بار تاریخ میں ہوا۔ لوگ اس سے بالکل بے بہرہ تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ تانبا آخر تانبا ہے اس کی قدروقیمت سونے اور چاندی کے سکوں کے برابر کیسے ہوسکتی ہے پس ملکی تجارت کو نقصان پہنچا اس کے علاوہ غیر ملکی تاجروں نے علامتی سکے لینے سے انکار کر دیا۔ محمد تغلق نے تنگ آکر قانونی سکے واپس لے لیئے۔ اور ان کی بجائے شاہی خزانے سے چاندی اور سونے کے سکے دیئے تاکہ لوگوں کو نقصان نہ ہو۔ لیکن سلطان کو معلوم ہوا کہ بے ایمان لوگوں نے بے شمار جعلی سکے بھی چلائے ہوئے تھے۔ سلطان نے نرم دلی کی بنا پر جعلی سکوں کے عوض بھی چاندی کے سکے دیئے تاکہ رعایا کا نقصان نہ ہو۔ قانونی سکوں کی سکیم لوگوں کی جہالت کی بنا پر ناکام ہوئی ورنہ اس میں کوئی خامی نہ تھی۔ یہ بات یاد رہے

کہ محمد تغلق نے صرف ملکی تجارت کے لئے قانونی سکے جاری کئے تھے غیر ملکی تجارت کے لئے وہی پرانے چاندی اور سونے کے سکے رائج تھے لیکن افراتفری میں لوگوں نے غیر ملکی تاجروں کو بھی قانونی سکے ہی دینے شروع کر دیئے۔ اگر عوام کو آہستہ آہستہ ترغیب دی جاتی تو قانونی سکوں کی سکیم کامیاب ہو جاتی اور اس سے ہندوستان کے مالیات کو خوب فایدہ پہنچتا۔ یہ سکیم سلطان کے اپنے دماغ کی اختراع تھی اور صحیحاً قبل از وقت تھی اس دور کے لوگ اس تدبیر کو سمجھنے کے بالکل نااہل تھے۔

(۴) فتوحات کے منصوبے۔ بعض مؤرخین محمد تغلق کو جنونی ثابت کرنے کے لئے اس پر یہ تہمت لگاتے ہیں کہ اس نے ایران تبت اور چین کی تسخیر کے منصوبے سوچے اور ان فتوحات کے لئے ایک زبردست فوج بھرتی کی اصل بات یہ ہے کہ سلطان نے خراسان پر حملہ کی نیت کی تھی کیونکہ یہ علاقہ منگولوں کی طاقت کا سرچشمہ تھا۔ خراسان کی تسخیر سے منگولوں کا خاطر خواہ سد باب ہو سکتا تھا۔ اس وقت خراسان کا حاکم ابوسعید رعایا میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لہٰذا محمد تغلق نے ترمہ شیریں ایک منگول سردار سے ساز باز کی اور خراسان کی فتح کے لئے تین لاکھ فوج بھرتی کی لیکن ایک سال کے بعد ترمہ شیریں قتل ہو گیا۔ اور ابوسعید کی طاقت کافی بڑھ گئی لہٰذا سلطان محمد تغلق نے خراسان کی تسخیر کا ارادہ ترک کر دیا اور بھرتی شدہ فوج کو توڑ دیا گیا مورخین نے اس بات پر سلطان پر خوب پھبتیاں کسی ہیں حالانکہ مہم کو ترک کر دینا اس کی دانشمندی کی دلیل ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اس نئی فوج کو سال بھر تنخواہ ملتی رہی اور شاہی خزانے پر بار پڑا۔

محمد تغلق نے چین اور تبت کی تسخیر کا منصوبہ کبھی نہیں سوچا۔ یہ بات محض

افسانہ ہے جسے لوگوں نے گھڑ لیا ہوا ہے۔ ۱۳۳۸ء میں سلطان کی فوج قراجیل کی تسخیر کے لئے گئی تھی۔ یہ مہم ترائی کے علاقے میں کسی پہاڑی راجہ کے خلاف تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ریاست کانگڑے کی عدود میں تھی۔ راجہ نے شکست کھا کر اطاعت قبول کی لیکن واپسی پر برسات کی بدولت ملیریا شروع ہو گیا اور شاہی فوج کو اس وبا سے کافی نقصان پہنچا۔ دہلی واپس آنے پر یار لوگوں نے محض گپ بازی کی بنا پر یہ مشہور کر دیا کہ سلطان محمد تغلق نے چین اور تبت کی تسخیر کے لئے فوج بھیجی تھی۔ لوگوں نے یہ بھی افواہ پھیلا دی کہ شاہی فوج کوہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کو عبور نہ کر سکی اور ناکام واپس لوٹی ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ قراجیل کا علاقہ دہلی سے دس روز کی مسافت پر تھا۔ ظاہر ہے کہ چین کی سرحد دہلی سے اس قدر نزدیک نہیں ہے۔

بغاوتیں۔ سلطان محمد تغلق کی اصلاحات ناکام ہو چکی تھیں اور بادشاہ جنونی مشہور ہو چکا تھا۔ لہذا ملک کے ہر کونے میں بغاوتیں رونما ہوئیں۔ سلطان ان بغاوتوں سے بالکل ہراساں نہ ہوا بلکہ اس نے پوری تندمزاجی سے باغیوں کا سر کچلنا شروع کر دیا۔ اور اپنے آپ کو عمدہ جرنیل ثابت کیا۔ دشمنوں کے مقابلے پر اس کی پالیسی فیروز شاہ تغلق سے بہتر تھی۔ فیروز شاہ نرم دل تھا اور فوراً دشمن کی صلح کی درخواست قبول کر کے اسے نیم آزاد رہنے دیتا تھا۔ تاکہ مناسب وقت پر وہ خود مختار بن جائے۔ محمد تغلق نے اس کے برعکس سخت گیرانہ پالیسی پر عمل کیا اور کسی دشمن پر رحم دلی نہ دکھائی۔ علیٰ کی طرح اس نے دشمنوں کا سر کچل دیا۔ اس بنا پر مؤرخین اسے ظالم گنتے ہیں۔ لیکن دشمنوں کا قلع قمع کرنا ہی دانشمندانہ پالیسی تھی۔ اگر فیروز شاہ بھی محمد تغلق کی مانند دشمنوں اور باغیوں کا استیصال کر دیتا تو

تغلق سلطنت زوال پذیر نہ ہوتی۔

سلطان محمد تغلق اگرچہ اعلیٰ جرنیل تھا لیکن وہ بغاوتوں کو فرد نہ کر سکا۔ یہ بغاوتیں بے شمار تھیں اور ایک ہی وقت میں ملک کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک پھیلی ہوئی تھیں ان کا فوری خاتمہ سلطان کے بس کی بات نہ تھی لیکن محمد تغلق کے آخری ایام بغاوتوں کو فرد کرنے میں ہی صرف ہوئے ۱۳۵۱ء میں سلطان سندھ میں ٹھٹہ کی بغاوت فرو کرنے جا رہا تھا کہ چند دن بیمار رہ کر وفات پائی۔

سلطان محمد تغلق کے دور کی بغاوتوں سے دہلی سلطنت کمزور ہو گئی اور کئی ایک علاقے خود مختار بن بیٹھے۔ بدقسمتی سے اس کا جانشین فیروز تغلق سیاست دان اور دور اندیش نہ تھا۔ اس نے باجگذاری کی شرط پر ہر باغی کو خود مختار بن جانے کی مہلت دی اور سلطنت دہلی کا شیرازہ بکھر گیا۔ محمد تغلق کے دور کی اہم بغاوتوں کا حال درج ذیل ہے :-

(۱) ورنگل اور مالابار۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۳۵ء میں ورنگل اور مالابار کے گورنر نے بغاوت کی اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ سلطان خود ایک زبردست فوج لے کر ورنگل پہنچا۔ لیکن ان دنوں شاہی فوج میں ہیضے کی وبا پھیل گئی اور سلطان کو مجبوراً واپس آنا پڑا۔ بعد میں سلطنت کے ہر کونے میں بغاوتیں رونما ہوئیں اور سلطان دوبارہ ورنگل اور مالابار پر فوج کشی نہ کر سکا لہٰذا ورنگل اور مالابار کا علاقہ محمد تغلق کے زمانے میں ہی خود مختار ہو گیا۔

(۲) بنگال۔ ۱۳۳۷ء میں جبکہ سلطان محمد تغلق ملک کے باقی حصوں میں بغاوتیں فرو کرنے میں مشغول تھا۔ لکھنوتی میں فخرالدین نے بغاوت کی اس باغی نے بنگال کے گورنر کو قتل کر دیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

سلطان محمد تغلق کو بنگال پر حملہ کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ فیروز تغلق نے اپنے دورِ حکومت میں بنگال پر حملہ کیا لیکن اس صوبے کو فتح نہ کر سکا۔

(۳) اودھ۔ محمد تغلق کی جانب سے عین الملک اودھ کا گورنر تھا۔ یہ شخص انتہائی وفادار تھا لیکن ۱۳۴۰ء میں اس نے غلط فہمی کی بنا پر بغاوت کی۔ سلطان نے اسے اودھ سے تبدیل کر دیا تھا اور دکن جانے کا حکم دیا تھا عین الملک نے سمجھا کہ بادشاہ اس سے ناراض ہے اور دکن بھیج کر اسے مروانا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ سلطان نے اودھ پر حملہ کیا۔ عین الملک شکست کھا کر گرفتار ہوا لیکن محمد تغلق نے اسے معاف کر دیا اور اودھ کی گورنری دوبارہ اسے ہی عطا کی۔ اس کے بعد عین الملک انتہائی وفادار ثابت ہوا۔ کڑہ کی بغاوت عین الملک نے ہی فرو کی۔

(۴) وجیانگر۔ ۱۳۳۶ء میں ہری ہر اور بکا نامی دو بھائیوں نے دکن میں ایک خود مختار سلطنت قائم کی جس کا پایہ تخت وجیانگر کا شہر تھا۔ جو دریائے تنگ بھدرا کے کنارے واقع تھا۔ شروع شروع میں یہ ریاست محض ایک چھوٹی سی بستی تھی لیکن تغلق سلطنت کے کمزور ہوتے ہی وجیانگر کی سلطنت میں دکن کے اکثر علاقے شامل ہو گئے۔ اور یہ ریاست ہندوؤں کے لئے باعث فخر ہوئی۔ اس ریاست کا تفصیلی حال آئندہ باب میں درج ہے۔

(۵) بہمنی سلطنت۔ ۱۳۴۷ء میں ظفر خاں نے دکن میں بغاوت کی اور بہت سے امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ دولت آباد کے قلعے پر ظفر خاں کا قبضہ ہو گیا۔ اور اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس ریاست کا پایہ تخت گلبرگہ تھا۔ ظفر خان نے تخت نشین ہوتے ہی

علاؤالدین حسن بہمن شاہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بہمن ابن اسفندیار کی نسل سے گنتا تھا۔ بہمن کی نسبت سے یہ خود مختار ریاست بہمنی سلطنت کہلائی۔ بہمنی سلطنت پونے دو سو سال تک قائم رہی اور علم و فن کا مرکز تھی۔ وجیانگر کی سلطنت سے اس کی چپقلش کافی دیر تک رہی۔ بہمنی سلطنت میں حیدرآباد دکن کے علاوہ صوبہ بمبئی بھی شامل تھا۔ اس سلطنت کا تفصیلی حال آیندہ باب میں درج ہے۔

مالوہ اور گجرات۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں مالوہ کے مقامی امراء کا اقتدار بہت بڑھ گیا۔ لہذا سلطان نے عزیز نامی ایک نیا گورنر بھیجا جس نے مالوہ کے کئی ایک امراء کو تہ تیغ کیا۔ لیکن اس سخت گیری سے گجرات کے امراء بھڑک اٹھے اور انہوں نے بغاوت کر کے انہلواڑہ پر قبضہ کر لیا۔ گجرات کا شاہی خزانہ لٹ گیا۔ اور محمد تغلق کے گورنر کو قید کر لیا گیا۔ سلطان نے گجرات پر حملہ کر کے باغیوں کا زور توڑا اور اس صوبے میں امن و امان قائم کیا۔ ایک باغی سردار تغی خان سندھ کی جانب بھاگ گیا۔ محمد تغلق نے تعاقب کی ٹھانی لیکن اسی تعاقب کے دوران میں سلطان ۱۳۵۱ء میں ٹھٹھہ کے قریب راہئی ملکِ عدم ہوا۔

ابن بطوطہ کا سفرنامہ۔ سلطان محمد تغلق کے عہد حکومت کے بارے میں دیگر مورخین کی تحریروں کے علاوہ افریقی سیاح ابن بطوطہ کا سفرنامہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب ازحد دلچسپ ہے اور تاریخ ہندوپاکستان کے علاوہ اس دور کے اسلامی ممالک کا حال بھی اس سفرنامہ

بیں ملتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں چشم دید حالات لکھے ہیں اور چین سے مراکو تک تمام عالم اسلام پر روشنی ڈالی ہے۔ ابن بطوطہ کا اصلی نام محمد ابن عبداللہ ہے۔ اور وہ ۱۳۰۴ء میں مراکو کے شہر طنجہ میں پیدا ہوا۔ ۱۳۲۵ء میں سیرو سیاحت کی غرض سے نکلا اور ٹیونس۔ لیبیا۔ مصر ہوتا ہوا حج کی غرض سے عرب پہنچا۔ ایشیائے کوچک۔ عراق اور ایران کی سیاحت کے بعد ابن بطوطہ ۱۳۳۴ء میں سندھ کے راستے ملتان پہنچا۔ وہاں سے دیپالپور گیا اور پھر کابل پہنچا۔ محمد تغلق نے اس سیاح کی خوب خاطر مدارات کی اور انعامات عطا کرنے کے علاوہ اسے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز کیا۔ ابن بطوطہ دہلی کا قاضی رہا۔ اور سلطان نے اسے جاگیر بھی بخشی۔ بعد ازاں ابن بطوطہ کو محمد تغلق نے چین کے بادشاہ کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ ابن بطوطہ جزائر شرق الہند کی سیاحت کرتا ہوا چین پہنچا۔ ابن بطوطہ ۱۳۴۹ء میں اپنے وطن واپس پہنچا اور فراغت سے اپنے سفر کے حالات لکھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابن بطوطہ بھی محمد تغلق کے اعمال و کردار پر شدید نکتہ چینی کرتا ہے اور محمد تغلق کے احسانات کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق

سلطان محمد تغلق کے بعد اس کا چچا زاد بھائی فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا۔ محمد تغلق کے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس لئے اس نے فیروز شاہ کو بیٹوں کی مانند پالا تھا۔ اور اعلیٰ تربیت دی تھی۔ لیکن نیا سلطان از حد نرم دل اور رحم دل تھا۔ اس کی بے جا نرمی کی بدولت سلطنت کمزور ہو گئی اور جلد ہی زوال پذیر ہو گئی۔

فیروز شاہ تغلق نے جنگ و جدل اور فتوحات کی پالیسی ترک کر دی اور اپنی تمام توجہ رعایا کی بہبودی اور رفاہ عام کے کاموں میں صرف کی۔ فیروز شاہ نہ ہی

عمدہ جرنیل تھا اور نہ اعلیٰ سیاست دان۔ لیکن وہ رعایا میں انتہا مقبول اور ہر دلعزیز تھا۔ وہ معمولی لیاقت رکھتا تھا لیکن کامیاب ترین حکمران ثابت ہوا۔ اپنی نرم دلی سے ہر ایک کا دل موہ لیا۔ وہ دشمنوں سے فوراً صلح کر لیتا تھا اور ہر باغی آسانی سے اسے تحفے تحائف اور نذرانے دے کر سر سے ٹال دیتا تھا لہٰذا سلطنت دہلی کے زوال کی ذمہ داری فیروز شاہ کے کندھوں پر ہے فیروز شاہ نے دور اندیشی سے کام نہ لیا اور سلطنت کے استحکام کی جانب توجہ مبذول نہ کی۔
اس نے جاگیرداری کے نظام کو دوبارہ رائج کیا اور ملک کو اپنے غلاموں میں بانٹ دیا۔ یہ نئے جاگیردار سلطان فیروز شاہ کے وفادار رہے لیکن اس کے مرتے ہی ہر شخص خود مختار بن بیٹھا اور سلطنت کی مرکزی طاقت ختم ہو گئی۔ پس تغلق خاندان کے زوال میں فیروز شاہ کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ فیروز شاہ تغلق ۱۳۵۱ء میں تخت نشین ہوا۔ اور اس نے ۳۷ سال تک حکومت کی۔

خصائل و عادات۔ سلطان فیروز شاہ تغلق عبادت گذار اور پارسا تھا اس کی طبیعت پر مذہبی رنگ غالب تھا لہٰذا وہ نظام حکومت کو شرعی رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ یورپ کے مورخ اس کی حکومت کو (Theocracy) کہتے ہیں۔ یعنی وہ حکومت جس میں ملاؤں کا غلبہ ہو۔ سلطان اگرچہ پکا مسلمان اور شرع کا پابند (Orthodox) تھا لیکن غیر مسلموں سے بھی حسن سلوک روا رکھتا تھا۔ اس نے کبھی بھی ہندوؤں پر ناجائز سختی نہیں کی۔ اس سے پہلے نو مسلم بھی جزیہ ادا کرتے تھے۔ لیکن فیروز شاہ نے اس غیر اسلامی رسم کو ختم کر دیا۔ فیروز شاہ نے رائج الوقت کئی ایک غیر اسلامی باتوں کو ممنوع قرار دیا مثلاً امراء ریشم کے کپڑے پہنتے تھے۔ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتے تھے۔ میزوں اور کرسیوں پر زیبائش کے لئے تصویریں بناتے تھے۔ سلطان

نے ان سب چیزوں کو ممنوع قرار دیا۔ مستورات کو مزارات کی زیارت یا میلوں پر جانے سے روک دیا۔ علماء اور مشائخ کو جاگیریں عطا کیں اور ان برہمنوں کو سزا دی جو مسلمانوں کو ورغلا کر ہندو بناتے تھے۔ سلطان منصف مزاج اور نرم دل تھا لیکن بعض ہندو مورخ بے جا طور پر اسے متعصب گردانتے ہیں۔ علماء اور مشائخ سے اس کا حسن سلوک حدِ اعتدال سے بڑھ گیا اور یہ لوگ امورِ سلطنت میں بے جا دخل دینے لگے۔ فیروز شاہ اُچ کے روحانی بزرگ حضرت جلال الدین مخدومِ جہانیاں جہاں گشت کا خاص طور پر عقیدت مند تھا سلطان نے بہت سے قدیم مزاروں کی مرمت کرائی۔ وہ کسی مہم پر جانے سے پہلے بزرگان دین کے مزارات پر حاضر ہو کر دعا مانگا کرتا تھا۔ برنی کا قول ہے کہ سلطان معزالدین کے زمانے سے لے کر اب تک سلاطین دہلی میں سے کوئی حکمران اس جیسا پارسا، رحمدل، منکسر المزاج اور حق گو نہیں ہوا ہے۔ ہم عصر مورخ شمس سراج عفیف اسے نوشیرواں جیسا عادل گنتا ہے لیکن اس کے کردار میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس کے ارادے ہمیشہ متزلزل رہتے تھے اور دشمنوں سے اس نے بے جا نرمی کا برتاؤ کیا۔

ابتدائی احکامات اور مہمیں۔ فیروز شاہ تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی تمام غیر شرعی ٹیکس منسوخ کر دیئے اور رعایا کی خوشحالی اور بہبودی کی جانب اپنی تمام توجہ مبذول کی۔ ٹیکسوں کی منسوخی سے وہ رعایا میں ہر دلعزیز ہوگیا۔ اسکے عہد حکومت میں صرف چار ٹیکس تھے۔ یعنی خراج، زکوٰۃ، جزیہ اور خمس۔ یہ سب ٹیکس شرع اسلام کے مطابق تھے۔ فیروز شاہ نے چونکہ جنگ و جدل کی پالیسی ترک کر دی تھی اسلیئے ان ٹیکسوں سے حکومت کا انتظام بخوبی چلتا تھا سلطان نے رعایا سے مشفقانہ اور پدرانہ سلوک روا رکھا۔ وحشیانہ سزائیں موقوف کر دی گئیں۔

قید خانوں کی حالتوں کو بھی سدھارا گیا۔

فیروز شاہ تغلق نے دکن اور دوسرے صوبوں کی دوبارہ تسخیر کے خیال کو ترک کر دیا۔ چنانچہ اس نے ہر حیلے بہانے سے مخالفین سے صلح کر لی اور جنگ سے باز رہا۔ اس کا زمانہ فتوحات سے خالی ہے۔ بلکہ اس نے مختلف صوبوں کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا۔ سب سے پہلے اس نے بہمنی سلطنت کی خود مختارانہ حیثیت کو تسلیم کیا۔ اسکے بعد ان صوبوں کو بھی اپنے حال پر چھوڑا جہاں محمد تغلق کے آخری ایام میں بغاوتیں رونما ہوئی تھیں یہ پالیسی غلط تھی کیونکہ فیروز شاہ تغلق کے مرتے ہی ہر صوبے دار نے اقتدار اعلیٰ کے حصول کیلئے کوشش کی۔

فیروز تغلق کے زمانے میں چند ایک مہمیں قابل ذکر ہیں۔ لیکن سلطان کی نرم دلی اور صلح جویانہ پالیسی کی بدولت کسی مہم میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ سلطان نے بنگال پر دوبارہ حملہ کیا لیکن اسے فتح نہ کر سکا۔ دونوں بار برسات کی آمد پر سلطان فیروز شاہ تغلق نے صلح کر لی اور واپس لوٹ آیا۔ اس وقت بنگال کا خود مختار حاکم حاجی شمس الدین الیاس تھا۔ ۱۳۵۷ء میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا سکندر بنگال کا خود مختار حاکم بنا۔ دوسرا حملہ سکندر کے تخت نشین ہوتے ہی کیا گیا تھا لیکن سلطان میں قوتِ ارادی کی کمی تھی۔ سکندر کی درخواست پر فوراً صلح کر لی۔ بنگال کی پہلی مہم کے دوران میں سلطان نے جونپور کا شہر آباد کیا۔ بعد میں یہ شہر شاہان شرقی کا دار السلطنت بنا اور یہاں ایک عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی۔

بنگال سے واپسی پر سلطان ہاتھیوں کا شکار کرتا ہوا جاج نگر دار یسہ) جا پہنچا اور وہاں کے راجہ کو باجگذار بنایا۔ ۱۳۶۰ء میں سلطان نے نگر کوٹ پر حملہ کیا کیونکہ نگر کوٹ کے راجہ نے آس پاس کے علاقوں کو تاراج کرنا شروع کر دیا تھا۔ راجہ قلعہ بند ہو گیا۔ لیکن محاصرے کے دوران میں فیروز شاہ نے خود ہی صلح کی بابت اشارہ کیا

راجہ فوراً مان گیا۔ اور تحفے تحائف پیش کیے۔ صلح ہو جانے کے بعد سلطان جوالا مکھی کے مندر کو دیکھنے گیا۔ نگر کوٹ سے فیروز شاہ نے چند نایاب کتابیں حاصل کیں۔ اور ان کا ترجمہ فارسی میں کرایا۔ ٹھٹہ کی مہم ۱۳۶۶ء میں ہوئی۔ سلطان فیروز شاہ کے دور کی یہ آخری مہم تھی۔ اس کے بعد سلطان نے جنگ و جدل کے خیال کو ترک کر دیا۔ اور محض رفاہِ عام کے کاموں میں مگن رہا۔ سندھ میں اس وقت علاؤالدین جونا اور صدر الدین باہمیہ حکمران تھے۔ ان دونوں نے ملتان اور گجرات کے علاقوں پر حملے شروع کر دیئے۔ سلطان ٹھٹہ پہنچا اور وہاں ڈیرے ڈالے۔ کچھ عرصے کے بعد شاہی فوجوں کی رسد ختم ہو گئی اور سلطان گجرات واپس آ گیا۔ گجرات پہنچتے ہوئے راستہ بھول جانے کی بنا پر شاہی لشکر کا بے حد نقصان ہوا۔ گجرات سے سلطان نے دوبارہ جنگی تیاریوں کے بعد سندھ پر حملہ کیا۔ ٹھٹہ کے مقام پر فریقین میں جنگ شروع ہوئی۔ لیکن سلطان نے اپنی فوج کو میدان سے واپس بلا لیا۔ مختلف صوبوں سے کمک پہنچنے کے باوجود سلطان نے جنگ نہ کی اور ٹھٹہ میں ڈیرے ڈالے پڑا رہا۔ سندھ کے لوگوں نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی سفارش سے سلطان کی خدمت میں تحفے تحائف بھیج کر صلح کی درخواست کی جسے فیروز شاہ نے قبول کیا۔

فیروز شاہ کا دور نہ صرف فتوحات سے خالی ہے بلکہ اس کی تمام جنگی مہمیں بھی ناکام رہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی۔ کہ سلطان خونریزی کو پسند نہ کرتا تھا اور فوراً صلح پر آمادہ ہو جاتا تھا۔

رفاہ عام کے کام۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کو رعایا کی بہبودی اور خوشحالی کا از حد خیال تھا۔ زراعت کو ترقی دینے کے لئے اس نے مصنوعی آبپاشی کا عمدہ انتظام کیا اور کئی ایک نہریں کھدوا کر تمام علاقے کو سرسبز و شاداب کر دیا

سلطان کے زمانہ کی نہر جمن غربی آج تک موجود ہے۔ یہ نہر ہانسی اور حصار کے خشک علاقوں کو سیراب کرتی تھی۔ شرعی ٹیکسوں کے علاوہ نہری رقبے سے آبیانہ بھی وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کی شرح معمولی تھی۔

سلطان نے شفاخانے کھولے اور محتاج خانے قائم کئے۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں سڑکیں بنوائیں۔ بند باندھے اور پل تعمیر کئے تاکہ رعایا کو ہر قسم کی سہولت میسر ہو۔ شاہی ہسپتالوں میں مفلس اور نادار لوگوں کو مفت دوا ملتی تھی۔ ہر ہسپتال میں لائق معالج موجود رہتے تھے۔ سلطان نے بیوہ عورتوں اور یتیموں کے لئے بھی وظائف مقرر کئے۔ غریب لڑکیوں کی شادی کے لئے دیوان خیرات سے مدد ملتی تھی۔ بیکار لوگوں کو بھی مدد دی جاتی تھی۔ لیکن کوشش یہ کی جاتی تھی کہ ان کے لئے کوئی کام مہیا کیا جائے۔

سلطان نے ملک بھر میں مدرسے کھولے۔ کئی خانقاہیں اور علمی مرکز قائم کئے اور تعلیم کو عام کیا۔ سنسکرت کی قدیم کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ طلبا اور علماء کیلئے باقاعدہ وظیفے مقرر تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں دہلی میں حوض شمسی کے قریب ایک مشہور یونیورسٹی تھی جہاں طلبا دن رات مقیم رہتے تھے۔ اس عمارت کے کھنڈر اب تک ملتے ہیں۔

سلطان نے رعایا کو دئے ہوئے پرانے قرضے بالکل معاف کر دیئے اور ضبط شدہ جاگیریں بھی واپس کر دیں۔ ان تمام امور کی بدولت وہ رعایا میں بہت زیادہ مقبول ہو گیا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق باغات لگوانے کا ازحد شوقین تھا۔ یوں تو اس نے کئی نئے شہر بسائے اور محل تعمیر کرائے لیکن باغات کے لحاظ سے اس کا دور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ محض دہلی شہر کے اردگرد اس نے بارہ سو باغات

لگوائے۔ ان باغات سے شہروں کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا۔

غلام اور شاہی کارخانے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کو عمدہ غلام حاصل کرنے کا بہت شوق تھا چنانچہ لوگ غلاموں کو تحفے کے طور پر پیش کرتے تھے۔ سلطان کے پاس دو لاکھ سے زیادہ غلام جمع ہو گئے تھے۔ فیروز شاہ نے ان غلاموں کی اعلیٰ تربیت کا انتظام کیا اور ان کی لیاقت کے مطابق اعلیٰ عہدے عطا کئے۔ غلاموں میں سے کئی ایک ترقی کرتے کرتے جاگیردار اور صوبائی گورنر بھی بن گئے۔ یہ غلام فیروز شاہ کے وفادار اور جان نثار تھے لیکن اسکے مرتے ہی ان میں سے ہر ایک حکومت کے خواب دیکھنے لگا۔ غلاموں کی بے زبردست تعداد تغلق خاندان کی تباہی کا باعث بنی۔ غلاموں کے علاوہ سلطان فیروز شاہ تغلق نے پرانا جاگیرداری نظام دوبارہ رائج کر کے سلطنت کے لئے کمزوری کا بیج بویا۔ اس کی وفات پر طاقتور جاگیردار خود مختار بن بیٹھے اور مرکزی حکومت کا وقار اٹھ گیا۔

سلطان فیروز شاہ کے زمانے میں چھتیس شاہی کارخانے تھے جن میں سرکاری خرچ پر مختلف اشیاء تیار ہوتی تھیں۔ شاہی دربار اور محل کی تمام ضروریات ان کارخانوں سے پوری ہوتی تھیں۔ کپڑے کے علاوہ گھوڑوں کا ساز و سامان کمبل، دریاں اور قالین بھی تیار ہوتے تھے۔ بعض کارخانوں میں برتن بھی تیار کئے جاتے تھے۔

عمارات۔ سلطان فیروز شاہ تغلق عمارات کا از حد شوقین تھا۔ بھارت میں اس کی تعمیر کردہ عمارتیں اب بھی ملتی ہیں۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ سلاطین دہلی میں سے سب سے زیادہ عمارتیں اسی سلطان نے تعمیر کرائیں۔ سلطان فیروز شاہ نے کئی ایک شہر بسائے، پل، نہریں، بند، قلعے، محل، مسجدیں، تعمیر کروائیں

اس نے قدیم مقبروں کی مرمت بھی کرائی۔ اس نے دہلی کے قریب نیا شہر بسایا جس کا نام فیروز آباد تھا۔ یہاں ایک جامع مسجد اور قلعہ بھی بنوایا۔ یہ تمام علاقہ اب کھنڈرات کی صورت میں موجود ہے۔ اور کوٹلہ فیروز شاہ کہلاتا ہے فیروزہ اور حصار کے شہر بھی اسی نے آباد کیٹے۔ جونپور کا شہر اس نے مرحوم سلطان محمد تغلق کے ابتدائی نام (جونا خان) کی نسبت سے آباد کیا۔ سلطان کے وزیر خواجۂ جہاں مقبول نے دہلی میں نئی طرز کی ایک مسجد تعمیر کرائی۔ یہ مسجد نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے قریب ہے اور اب ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہے اس مسجد کے صحن میں شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً چھت والے راستے تھے۔ تاکہ گرمیوں کی دھوپ میں نمازیوں کو صحن عبور کرنے میں تکلیف نہ ہو۔ اس جدت سے مسجد کا صحن چار حصوں میں منقسم معلوم ہوتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں چونا اور گچ کی آمیزش سے سفید رنگ کا ایک نئی قسم کا گچ تیار ہوا جس کی بدولت نئی تعمیر شدہ عمارتیں نہایت خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن تغلق دور کی عمارتیں پائیدار نہیں تھیں۔ ان میں سے اکثر اب منہدم ہو چکی ہیں۔

وفات۔ سلطان فیروز شاہ تغلق ۱۳۸۸ء میں نوّے سال کی عمر پا کر فوت ہوا۔ وہ از حد نیک دل، پارسا اور رعایا پرور سلطان تھا۔ اور سلطان ناصر الدین محمود کی مانند ملک بھر میں ہر دلعزیز تھا۔ رعایا کی بہبودی اور خوشحالی اسکو دل و جان سے عزیز تھی۔ وہ اعلیٰ جرنیل یا سیاستدان نہ تھا۔ لیکن از حد کامیاب سلطان ہو گذرا ہے۔

اس کے جانشین۔ فیروز شاہ تغلق کے جانشین نااہل، کمزور اور نالائق تھے۔ اس کے آخری ایام میں ہی تخت کے لئے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ فیروز شاہ کے وزیر خانِ جہاں مقبول کے فرزند جونا شاہ اور ولیعہد شہزادہ محمد میں

رقابت پیدا ہوگئی تھی اور بوڑھے سلطان نے پہلے شہزادے کی گرفتاری کا حکم دیا پھر اسے رہا کر دیا۔ اور جونا شاہ کے قتل کی اجازت دے دی۔ پھر امراء کے بہکانے سے شہزادے کے خلاف ہو گیا۔ شاہی غلام دو گروہوں میں بٹ گئے اور ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شہزادہ محمد شکست کھا کر بھاگا اور سرمور کی پہاڑیوں میں چھپ گیا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنے مرحوم بیٹے فتح خاں کے لڑکے غیاث الدین تغلق کو ولیعہد مقرر کیا۔ اور ستمبر ۱۳۸۸ء میں فوت ہوا۔ فیروز شاہ تغلق کے تمام جانشین نکمے اور نالائق ثابت ہوئے۔ ہندوؤں نے سرکشی اختیار کی اور جگہ جگہ بغاوتیں ہونے لگیں۔ فیروز شاہ تغلق کے جانشینوں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:-

عہد حکومت

(۱) غیاث الدین تغلق ثانی ۱۳۸۸ء سے لے کر ۱۳۸۹ء تک

(۲) ابو بکر ۱۳۸۹ء (صرف چند ماہ)

(۳) ناصر الدین محمد ۱۳۹۰ء تا ۱۳۹۴ء

(۴) ہمایوں ۱۳۹۴ء (صرف چند ماہ)

(۵) محمود تغلق ۱۳۹۴ء سے لے کر ۱۴۱۲ء تک

تغلق خاندان کا آخری سلطان محمود تغلق از حد نالائق تھا۔ اس کے زمانے میں بڑے بڑے زمیندار جاگیردار بھی شاہی احکام کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ اس کے زمانے میں مالوہ۔ خاندیش اور گجرات کے علاوہ جونپور نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ دہلی سلطنت اس قدر کمزور ہو گئی کہ محمود تغلق کی حکومت سمٹ کر دہلی کے گرد و نواح میں رہ گئی۔ اسی سلطان کے زمانے میں امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کر کے قتل عام کیا۔ اور بچا کھچا شاہی وقار بھی خاک میں ملا دیا

۱۳۹۸ء میں تیمور کے حملے کے بعد دراصل تغلق خاندان مٹ چکا تھا۔ لیکن امیر تیمور کی واپسی پر محمود تغلق اور اس کا وزیر ملّو اقبال خاں دوبارہ دہلی لوٹ آئے۔ اور تغلق خاندان کی حکومت برائے نام ۱۴۱۲ء تک قائم رہی۔ محمود تغلق کا انجام بیان کرنے سے پہلے امیر تیمور کے حملے کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔

امیر تیمور کا حملہ ۱۳۹۸ء

امیر تیمور کو تیمور لنگ بھی کہتے ہیں۔ وہ سمرقند کے قریب کش کے مقام پر ۱۳۳۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ امیر تحغی ترکستان کا قبائلی سردار تھا۔ امیر تیمور کی ماں منگول نسل سے تھی۔ لیکن امیر تیمور اپنے آپ کو چغتائی مغل کہتا تھا اس میں چنگیز خاں جیسی تمام صفات موجود تھیں۔ اس نے بھی تمام قبائل کو متحد و منظم کیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں تمام وسط ایشیا پر قبضہ جما لیا۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی خداداد فوجی قابلیت موجود تھی۔ اور وہ انسانی خون گرانے میں ذرہ بھر بھی دریغ نہ کرتا تھا۔ منگولوں کی روایات کے مطابق وہ لوٹ مار اور قتل عام کو بالکل معمولی چیز سمجھتا تھا۔ امیر تیمور کو دنیا کے عظیم الشان فاتحین اور جرنیلوں کی صف میں کھڑا کیا جاتا ہے۔

دہلی پر حملہ۔ برصغیر ہندو پاکستان پر امیر تیمور نے ۱۳۹۸ء میں حملہ کیا۔ اس حملے کی اصل وجہ فتوحات کا شوق تھا۔ لیکن اس نے بہانہ بنایا کہ ہند میں بت پرستی اور شرک عام ہے لہذا اسے ختم کرنا چاہیئے اور مذہب اسلام کو سربلند کرنا چاہیئے۔ مجاہد اور غازی بننے کی خواہش سے سرحدی علاقوں کے اکثر بہادر اس کی فوج میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح مذہب کے نام پر امیر تیمور

نے فتوحات کا شوق پورا کرنا چاہا۔ وسط ایشیا۔ ایران۔ عراق۔ ایشیائے کوچک اور افغانستان پر امیر تیمور کا تسلط ہو چکا تھا۔ لہٰذا اب برصغیر ہندو پاکستان کی باری تھی۔ اس ملک کی سیاسی حالت ایسی تھی کہ امیر تیمور کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اسے پتہ تھا کہ محمود تغلق ازحد کمزور ہے اور صوبائی گورنر خود مختار ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں بہانہ تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ لیکن امیر تیمور نے اپنے اصلی مقصد یعنی لوٹ مار کی خواہش پر خوبصورتی سے پردہ ڈالا اور "جہاد" کی نیت سے اس ملک پر حملہ آور ہوا۔

حملے کا راستہ اور مراحل۔ امیر تیمور نے اعلان کیا کہ ہندی لوگ کفر و شرک میں مبتلا ہیں اور ہندی مسلمان کمزور اور دبے ہوئے ہیں لہٰذا مذہب اسلام کی سربلندی کے لیے حملہ لازم ہے۔ امیر تیمور کی کل فوج بانوے ہزار تھی۔ سب سے پہلے امیر تیمور نے ہراول فوج کا دستہ اپنے پوتے پیر محمد کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ پیر محمد ان دنوں کابل کا گورنر تھا۔ اس نے آسانی سے دریائے سندھ کو عبور کیا اور چھ ماہ کے محاصرے کے بعد ملتان اور اُچ پر قبضہ کر لیا۔

ستمبر ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور خود فوج لے کر اس ملک میں داخل ہوا اور اٹک کے قریب دریائے سندھ کو عبور کر کے سیدھا لاہور کا رخ کیا۔ ان دنوں مبارک خان لاہور کا گورنر تھا۔ تیمور کی فوجوں نے اسے نہایت آسانی سے شکست دی۔ ملتان سے پیر محمد کی فوجیں بھی امیر تیمور کے لشکر سے آملیں۔ اور قلعہ کی تسخیر کی گئی۔ اس شہر سے دو لاکھ روپیہ تاوان جنگ وصول کیا گیا۔ اس کے بعد بھٹنیر کے راجہ دھول چند کی فوجوں کا قلع قمع کر کے شہر کو لوٹا گیا۔ اور دس ہزار سے زیادہ اشخاص کو موت کے

گھاٹ اتارا گیا۔ اس کے بعد تیموری لشکر دہلی کی جانب روانہ ہوا اور راستے میں سرسوتی۔ فتح آباد۔ ٹوہانہ اور کیتھل کو مسخر کیا گیا۔ دسمبر ۱۳۹۸ء میں تیمور لشکر نے دہلی سے چھ میل کے فاصلے پر جہاں نما کے مقام پر ڈیرے ڈالے۔

محمود تغلق سے جنگ ۔ محمود تغلق نے امیر تیمور کے مقابلے کے لئے کچھ بھی اقدام نہ کیا تھا۔ آخر جب تیموری فوجیں دہلی کے قریب آپہنچیں تو اس نے بھی چند ہزار سپاہی مقابلہ کے لئے سامنے لا کھڑے کئے تغلق کی فوج میں جنگی ہاتھی بھی تھے جن کی ہیبت سے غیر ملکی سپاہی دہل گئے۔ اور امیر تیمور نے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ اس وقت امیر تیمور کے پاس ایک لاکھ کے قریب ہندی قیدی تھے محمود تغلق سے جنگ لڑنے سے پہلے اس نے بیدردی سے ان تمام قیدیوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ اُس کا خیال تھا کہ جنگ کے دوران میں یہ قیدی کوئی فتنہ بپا نہ کر دیں۔ ۱۲ دسمبر ۱۳۹۸ء کو امیر تیمور اور محمود تغلق کی فوجوں میں فیصلہ کن جنگ ہوئی ملّو اقبال خان دہلی کی افواج کا سپہ سالار تھا اور محمود تغلق کا وزیر بھی تھا۔ دراصل یہی وزیر سیاہ سفید کا مالک تھا اور محمود تغلق محض برائے نام بادشاہ تھا۔ تغلق فوج میں چالیس ہزار پیادے اور دس ہزار سوار تھے۔ اس کے علاوہ ایک سو بیس جنگی ہاتھی بھی تھے۔ کچھ دیر لڑائی ہوتی رہی لیکن ملّو اقبال خان اور محمود تغلق دونوں میدان جنگ سے بھاگ اٹھے اور امیر تیمور فتح مند دہلی میں داخل ہوا۔ محمود تغلق بھاگ کر گجرات کاٹھیاواڑ پہنچا اور وہاں پناہ گزین ہوا۔ ملّو اقبال خان برن کی جانب بھاگ گیا۔

دہلی میں قتلِ عام۔ امیر تیمور فاتح کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا۔ دوسرے روز یعنی ۱۳ دسمبر ۱۳۹۸ء کو اس نے دربار لگا کر علماء اور مشائخ کو بلایا۔ اپنی اور بادشاہت کا اعلان کیا۔ علماء کی سفارش پر اہل دہلی کو اس شرط پر امان دی گئی کہ وہ ایک بھاری رقم بطور تاوان جنگ ادا کریں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ جب امیر تیمور کے سپاہی شہر سے سامان رسد لینے گئے اور تاوان جنگ وصول کرنا چاہا تو دہلی کے چند بانکوں سے اُن کا جھگڑا ہو گیا اور امیر تیمور نے غصے میں آکر قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ متواتر پانچ دن تک تیموری فوج نے شہر دہلی میں قتلِ عام جاری رکھا اور لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ تیموری سپاہیوں کے ہاتھوں سید اور علماء بھی تہ تیغ ہوئے اور دہلی کے اہالیان میں سے ایک لاکھ اشخاص قتل ہوئے۔ تیموری فوج نے بے اندازہ دولت لوٹی۔ عمارتیں برباد کیں اور ہزاروں عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لونڈی غلام بنا لیے دہلی پر تیمور کا حملہ قیامت سے کم نہ تھا۔

تیمور کی واپسی:۔ دہلی میں پندرہ روز قیام کرنے کے بعد امیر تیمور نے واپسی کی ٹھانی۔ دہلی سے نکل کر امیر تیمور نے میرٹھ اور ہردوار کو فتح کیا اور ان شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مال و دولت لوٹ کر وہ پہاڑی علاقوں کو مسخر کرتا ہوا جموں جا پہنچا۔ فروری ۱۳۹۹ء میں جموں کے راجہ کو شکستِ فاش ہوئی اور اُس نے رعایا سمیت اسلام قبول کیا تب سے اس ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

جموں سے امیر تیمور پنجاب پہنچا اور سید خضر خان کو ملتان اور لاہور کے صوبوں کا وائسرائے مقرر کر کے مارچ ۱۳۹۹ء میں سمرقند واپس چلا۔

گیا۔ واپس جاتے ہوئے وہ برِ صغیر کی بے اندازہ دولت سمیٹ کر لے گیا۔

امیر تیمور کے حملے کے اثرات

امیر تیمور آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی مانند واپس چلا گیا۔ لیکن اس نے سلطنت دہلی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو گل کر دیا اور محمود تغلق کے دستار کو خاک میں ملا دیا۔ اس کی واپسی پر بدامنی کا دور شروع ہوا برِ صغیر پر امیر تیمور کے حملے کے اثرات دور رس ثابت ہوئے۔

(۱) امیر تیمور جب دہلی سے روانہ ہوا تو شہر ویران ہو چکا تھا اور انسانی لاشیں گلی کوچوں میں کس مپرسی کی حالت میں پڑی گل سڑ رہی تھیں۔ دہلی پر اس تاخت تاراج کی بنا پر سخت تباہی آئی اور اس شہر کی عظمت کو سخت دھکا لگا۔ دہلی کے علاوہ امیر تیمور نے کئی ایک شہروں کو برباد کیا اور ان کی دولت کو لوٹ کر لے گیا۔ چنانچہ امیر تیمور کی واپسی پر لوگوں کی مالی حالت پتلی تھی اور وہ مفلس و نادار ہو چکے تھے۔ امیر تیمور اگرچہ واپس چلا گیا لیکن اس کے جاتے ہی بیماری پھوٹ نکلی اور قحط رونما ہوا۔ لوگ یہ محسوس کرتے تھے کہ امیر تیمور کا حملہ گویا عذاب الٰہی ہے جس کے نتائج بھی ہولناک ہیں۔

(۲) جونہی امیر تیمور سمرقند واپس لوٹا۔ مارچ ۱۳۹۹ء میں دہلی پر فیروز شاہ کے ایک پوتے نصرت خان نے قبضہ جما لیا۔ لیکن محمود تغلق اور اس کا وزیر ملو اقبال خان بھی دوبارہ دہلی میں آ گئے اور حکومت کے دعویداروں میں جنگ و جدل ہوتی رہی۔ اس خانہ جنگی سے رعایا کی جان سخت کوفت میں تھی اور بدنظمی اور بھی بڑھ گئی۔ ملو اقبال خان نے نصرت خان کو شکست دی اور دہلی پر قبضہ کر لیا اس طرح سے محمود تغلق دوبارہ بادشاہ بنا لیکن وہ محض برائے نام بادشاہ تھا۔ اصلی اختیارات

اُس کے وزیر ملّو اقبال خان کے ہاتھ میں تھے۔ وزیر کے چنگل سے آزاد ہونے کے لئے اُس نے دہلی کی بجائے قنوج میں دربار لگانا شروع کیا لیکن ۱۴۰۲ء ملّو اقبال خان نے قنوج پہ حملہ کر کے محمود تغلق کے رہے سہے اقتدار کو بھی خاک میں ملا دیا۔ ملّو اقبال خان نے ۱۴۰۵ء میں پنجاب پر حملہ کیا لیکن دیپال پور کے قریب امیر تیمور کے وائسرائے سید خضر خان سے شکست کھائی اور میدان جنگ میں مارا گیا۔ محمود تغلق ۱۴۱۲ء تک زندہ رہا اور اُس کی حکومت محض دہلی کے گرد و نواح میں محدود تھی۔ یہاں بھی اصلی طاقت چند فوجی سرداروں کے ہاتھ میں تھی جن کا سرغنہ ایک افغان دولت خان لودھی تھا۔ محمود تغلق کس مپرسی کی حالت میں بادشاہت کر رہا تھا۔ اس قسم کے سیاسی حالات میں رعایا سخت تنگ تھی اور سلطنت دہلی کی شان و شوکت مٹ چکی تھی۔

(۳) امیر تیمور کے حملے سے دہلی سلطنت کو اس قدر دھکا لگا کہ مدت مدید تک مرکزی طاقت بحال نہ ہو سکی۔ تغلق خاندان کے بعد اگرچہ سیدوں اور لودھیوں کا اقتدار رہا لیکن سلطنت کی پرانی عظمت بحال نہ ہو سکی۔ سلطنت کی اس بنیادی کمزوری کی بدولت مغل شہنشاہ بابر کے لئے دہلی کو فتح کرنا آسان ثابت ہوا۔

(۴) امیر تیمور کے حملے کی بدولت ہزاروں انسان موت کے گھاٹ اترے اور لاکھوں انسان مفلس و نادار ہو کر بے خانماں ہوئے۔ لہٰذا مدت تک صدہا یتیم اور بے کس افراد ملک کے ہر گوشے میں فاقہ کشی اور ذلت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ گداگری عام ہو گئی اور صدہا افراد نے مجبور ہو کر ڈاکے ڈالنے شروع کر دئے۔ پس امیر تیمور کی واپسی کے بعد برصغیر میں سوسائٹی کی حالت دگرگوں ہو گئی اور قانون کی حرمت لوگوں کے دلوں سے اٹھ گئی۔

(۵) ملکی تجارت تباہ و برباد ہو گئی اور ملک کے ہر کونے میں بغاوتیں ہونے

لگیں۔ کئی صوبے پہلے ہی خود مختار ہو چکے تھے اب بقایا صوبے بھی آزاد ہو گئے۔ اور برِ صغیر ہند و پاکستان میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ محمود تغلق کی وفات پر تغلق خاندان کا بھی خاتمہ ہو۔ ۱۴۱۱ء امیر تیمور کے وائسرائے سید خضر خان نے پنجاب سے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور خاندانِ سادات کی بنیاد ڈالی۔

تغلق خاندان کا خاتمہ: محمود تغلق ۱۴۱۲ء تک زندہ رہا لیکن اُسکی موت تک ملک میں بدترین قسم کا سیاسی خلفشار موجود رہا۔ فوجی سردار من مانی کاروائیاں کرتے تھے۔ صوبائی گورنر آزاد اور خود مختار ہو چکے تھے حکومت کا خزانہ خالی تھا اور جاگیردار بھی شاہی فرامین کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ امراء کی باہمی کشمکش نے سلطنت کی حالت اور بھی دگرگوں کر دی تھی۔ دہلی میں سلطان محمود تغلق بالکل بے اختیار شہنشاہ تھا۔ ۱۴۱۲ء میں جب محمود تغلق کا انتقال ہوا تو امیر تیمور کے وائسرائے نے نہایت آسانی سے پنجاب اور ملتان کے علاقوں سے آگے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سید سلاطین کا حال بیان کرنے سے پہلے لازم ہے کہ تغلق خاندان کے زوال کے اسباب کا جائزہ لیا جائے۔

تغلق خاندان کے زوال یا دہلی سلطنت کی تباہی کے اسباب

تغلق خاندان کے زوال پر سلطنت دہلی کی پرانی عظمت بحال نہ ہوئی۔ سید اور اور لودھی سلاطین اگرچہ ۱۵۲۶ء تک حکمران رہے لیکن مرکزی طاقت کمزور ہی رہی۔ لہٰذا تغلق خاندان کے زوال کے اسباب اور سلطنت دہلی کی تباہی کے اسباب بالکل وہی ہیں۔ ان میں کچھ بھی فرق نہیں۔ زوال کے اہم اسباب

مندرجہ ذیل ہیں۔

وسعت سلطنت۔ تغلق خاندان کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ سلطنت دکن کے دور دراز صوبوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ذرائع آمد و رفت میں دقتوں کی بنا پر دہلی سے مؤثر انتظام سلطنت نہ ہو سکتا تھا۔ لہذا بغاوتیں عام رہتی تھیں اور دہلی کے سلطان کے لئے عمدہ جرنیل ہونا لازمی تھا۔ محمد تغلق کے بعد سلاطین دہلی میں فوجی صلاحیت بالکل مفقود تھی لہذا مختلف صوبے خود مختار بن بیٹھے۔

(۲) **محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق کی پالیسی۔** سلطان محمد تغلق کی نت نئی سکیموں سے ملک میں سیاسی خلفشار پیدا ہو گیا۔ لوگ بادشاہ کو جنونی سمجھنے لگے اور ملک کے ہر کونے سے بغاوتیں رونما ہوئیں۔ محمد تغلق ان بغاوتوں کو مکمل طور پر ختم کرنے سے پہلے فوت ہو گیا اور کئی صوبے خود مختار بن بیٹھے۔ اس کے جانشین فیروز شاہ تغلق نے جنگ و جدل کی پالیسی ترک کر کے باغیوں سے بھی نرمی کا سلوک کیا اور سلطنت کی تباہی کا باعث بنا۔ مختلف صوبوں میں باغی تقریباً خود مختار بن بیٹھے۔ وہ برائے نام فیروز شاہ کی اطاعت کرتے تھے۔ اس کے مرتے ہی انہوں نے سلطنت دہلی کی اطاعت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔

(۳) **فیروز شاہ کے غلام اور جاگیرداری نظام۔** تغلق خاندان کی تباہی کی زیادہ تر ذمہ داری فیروز شاہ کے کندھوں پر ہے۔ اس نے ناعاقبت اندیشی دکھلائی اور ہر دلعزیز بننے کے لئے اس نے پرانا جاگیرداری نظام دوبارہ رائج کیا۔ اس سے مرکزی حکومت کے وقار کو سخت دھکا لگا۔ نیز فیروز شاہ نے دو لاکھ سے زیادہ ذاتی غلام بھرتی کئے اور ان کو اعلیٰ سرکاری عہدے دے دیئے۔ یہ غلام فیروز شاہ تغلق کے وفادار رہے لیکن اس کے مرتے ہی

ان غلاموں نے ملکی سیاست کو درہم برہم کر دیا۔ ان میں سے ہر ایک نے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کی کوشش کی اور مرکزی حکومت کو کمزور کر دینے کا باعث بنے۔

(۴) نالائق جانشین:۔ فیروز شاہ کے بعد تغلق خاندان کے تمام حکمران نالائق تھے۔ اور عیش و نشاط میں مگن رہتے تھے۔ ان میں انتظام سلطنت کی اہلیت نہ تھی ۱۴۱۲ء تک کوئی بھی صاحب فہم شخص تخت نشین نہ ہوا اور نہ ہی کسی سلطان کی شخصیت ایسی تھی کہ امراء اور رعایا سے اپنے احکام منوا سکے۔ بدقسمتی سے اس دور میں وزراء اور امراء بھی خود غرض تھے۔ کسی نے سلطنت کو مضبوط بنانے کی کوشش نہ کی۔

(۵) حصول تخت کے لئے سازشیں:۔ سلطنت دہلی کے زوال کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ ہر سلطان کے مرنے کے بعد تخت کے مختلف دعویدار پیدا ہو جاتے تھے اور ان کی حمایت کے لئے امراء میں سازشیں ہوتی تھیں۔ بعض اوقات خانہ جنگی کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ اگر تخت کی وراثت کے لئے برطانیہ کی مانند کوئی مقررہ قانون یا طریقہ ہوتا تو یہ سیاسی خلفشار نہ ہوتی۔

(۶) ہندوؤں سے سلوک۔ سلاطین دہلی نے ہندوؤں کا دل موہ لینے کے لئے کوئی کوشش نہ کی۔ ان کی حکومت اگرچہ عدل و انصاف پر مبنی تھی لیکن ہندو عوام ان کو غیر ملکی سمجھتے تھے اور موقع ملتے ہی ہندو بغاوت پر آمادہ رہتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں امرائے ہندو عورتوں سے شادیاں شروع کر دیں لیکن ہندو اور مسلمان کی باہمی نفرت نہ مٹ سکی۔ اگر سلاطین دہلی رعایا میں یگانگت اور قومیت کا جذبہ پیدا کر دیتے تو مرکزی حکومت کا شیرازہ نہ بکھرتا۔

(۷) امیر تیمور کا حملہ: یوں تو منگولوں نے کبھی بھی سلاطین دہلی کو چین سے بیٹھنے نہ دیا لیکن ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور کے حملے نے سلطنت دہلی کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور اس کے رہے سہے وقار کو خاک میں ملا دیا۔ مورخین بجا طور پر کہتے ہیں کہ اس حملے نے تغلق خاندان کے چراغ سحری کو پھونک مار کر بجھا دیا۔ اس کے بعد مرکزی طاقت بحال نہ ہو سکی اور سلطنت دہلی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی کیونکہ ملک میں لاتعداد چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔

Typical Questions

Q. 1. Estimate the work of Sultan Ghias-ud-Din Tughlaq.

Q. 2. "Muhammad Tughlaq's character has been described as a 'mixture of opposites,' but he was a man of ideas." Discuss this.

Q. 3. Muhammad Tughlaq was unquestionably the ablest man among the crowned heads of the middle ages," (I shwari Parshad) Discuss.

Q. 4. Carefully describe the administrative measures of Muhammad bin Tughlaq.

Q. 5. Narrate the leading events of Muhammad Tughlaq's reign and show that " it was a tragedy of high intentions self defeated."

Q. 6. "Muhammad Tughlaq's character was a mixture of two extremes, but he was a man of ideas." Discuss.

Q. 7. Give an account of the reign of Feroze Shah Tughlaq and show that he was an administrator rather than a statesman.

Q. 8. Write a short note on the administration of Feroze Shah Tughlaq with special reference to

(*a*) his religious policy
(*b*) work of public utility and
(*c*) slave system.

Q. 9. "Feroze Tughlaq is known to posterity not as a great soldier but as an administrator and builder of works of public utility." Explain this statement.

Q. 10. What measures did Feroze Shah Tughlaq adopt to restore order and promote the prosperity of his subjects ?

Q. 11. Critically examine the administration of Feroze Shah Tughlaq.

Q. 12. "Feroze Shah Tughlaq is well-known in history for his administrative reforms but he had nothing of ability, intrepidity and vigour of Ala-ud-Din Khilji or Muhammad Tughlaq." Discuss,

Q. 13. Give an accunt of Taimur's invasions of India. Estimate its effect.

Q. 14. Describe the course of Taimur's invasions of India and its effects on the Sultanate.

Q. 15. Describe the course of the disruption of the Empire of Delhi after the death of Feroze Tughlaq.

Q. 16. Account for the break up of the Delhi Sultanaet in the 15th. century.

Q. 17 Discuss the causes of the downfall of the Sultanate of Delhi.

امتحانی سوالات

۱۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے کارناموں کا حال بیان کیجیے۔
۲)۔ محمد تغلق متضاد صفات کا مالک اور نظریاتی سلطان تھا تبصرہ کیجیے۔
۳)۔ "قرون وسطیٰ میں سلطان محمد تغلق قابل ترین حکمران ہو گذرا ہے" وضاحت کیجیے۔ (ایشوری پرشاد)
۴) سلطان محمد بن تغلق کی انتظامی تدابیر کا جائزہ لیجیے۔
۵)۔ محمد تغلق کے عہد حکومت کا حال بیان کرتے ہوئے واضح کیجیے کہ اُس کے عزائم بلند تھے۔ نیت نیک تھی لیکن وہ اپنے خصائل کی بدولت ناکام ثابت ہوا۔
۶)۔ "محمد تغلق متضاد صفات کا مالک اور انتہا پسند تھا اور نظریاتی دنیا میں رہتا تھا یعنی عمل سے عاری تھا" تبصرہ کیجیے۔
۷) فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت کا حال بیان کیجیے۔ اور ثابت کیجیے کہ وہ اعلیٰ منتظم تو ضرور تھا لیکن سیاست دان نہ تھا۔
۸)۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے انتظام سلطنت بیان کرتے ہوئے مندرجہ ذیل عنوانات قائم کیجیے۔
(ا) اُس کی مذہبی پالیسی (ب) رفاہِ عام کے کام (ج) اُس کے غلام۔
۹) "فیروز شاہ تغلق میں سپاہیانہ جوہر نہ تھے لیکن انتظام سلطنت اور رفاہِ عام کے کاموں کی بدولت آنے والی نسلیں اُسے ہمیشہ یاد رکھیں گی" وضاحت کیجیے۔
۱۰) فیروز شاہ تغلق نے امن و امان کی بحالی اور رعایا کو خوشحال بنانے کے

لئے کون کون سی تدابیر اختیار کیں۔

۱۱) سلطان فیروز شاہ تغلق کے انتظام سلطنت کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

۱۲۔ فیروز شاہ تغلق انتظامی قابلیت کی بدولت تاریخ کے صفحات میں کافی اہمیت رکھتا ہے لیکن وہ علاؤ الدین خلجی اور محمد تغلق جیسا لائق۔ زورآور نڈر۔ اور باہمت نہ تھا۔ تبصرہ کیجئے۔

۱۳۔ ہندوستان پر امیر تیمور کے حملے کا حال بیان کیجئے اور اس کے اثرات واضح طور پر لکھئے۔

(۱۴) ہندوستان پر امیر تیمور کے حملے کی تفصیلات قلمبند کیجئے۔ یہ حملہ سلطنت دہلی پر کیسے اثر انداز ہوا؟

۱۵۔ فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد سلطنت دہلی کی تباہی کا حال بیان کیجئے۔

۱۶۔ پندرھویں صدی عیسوی میں سلطنت دہلی کیوں زوال پذیر ہوئی زوال کے اسباب واضح طور پر بیان کیجئے۔

۱۷۔ تغلق خاندان کے زوال کے اسباب بیان کیجئے۔

تیئسواں باب

دکنی ریاستوں کا عروج و زوال

بہمنی سلطنت اور وجیانگر کی ریاست

سلطان علاؤالدین خلجی پہلا مسلمان حکمران تھا۔ جس نے دکنی علاقوں کو اپنا باجگذار بنایا۔ اُس کے جرنیل ملک کافور نے دکنی ہندو راجاؤں کو شکست دیکر دیوگڑھی۔ ورنگل اور دوار سمدر اور مدورا تک کے علاقوں کو سلطنت دہلی کا مطیع و فرمانبردار بنا دیا۔ خلجیوں کے بعد سلطان محمد تغلق نے فتوحات کے شوق میں باجگذار ریاستوں کو ختم کر دیا اور تمام دکنی صوبے سلطنت دہلی میں شامل کر لیے۔ سلطنت کی وسعت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس نے دارالخلافہ کی تبدیلی کی تھی۔ لیکن شمالی علاقوں میں بغاوتیں ہونے لگیں نیز قحط کی بدولت دولت آباد میں کھانے پینے کو کچھ نہ ملتا تھا۔ لہذا اس نے مجبور ہو کر دہلی کو دوبارہ پایۂ تخت بنایا۔ محمد تغلق جونہی واپس گیا۔ دکنی علاقوں میں بغاوتیں رونما ہوئیں۔ بذاتِ خود دکن جانے کی بجائے اس نے اپنے لائق جرنیل ظفر خان حسن گنگو کو ان بغاوتوں کو زد کرنے کے لئے بھیجا۔ ظفر خان حسن نے دکنی علاقوں میں مکمل امن و امان قائم کیا اور سلطان محمد تغلق نے خوش ہو کر اسے ۱۳۴۲ء میں دکن میں اپنا وائسرائے مقرر کر دیا۔ وائسرائے بننے کے بعد ظفر خان حسن بادشاہت کے خواب دیکھنے لگا۔ لیکن مناسب موقع کی تلاش میں رہا۔ چند سال اس نے اپنی طاقت کو خوب بڑھایا اور آخرکار ۱۳۴۷ء میں اپنے آقا سلطان محمد تغلق کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا

بہمنی سلطنت کا آغاز: ظفر خان حسن گنگو کی قائم کردہ خود مختار ریاست

تاریخ میں بہمنی سلطنت کے نام سے مشہور ہے اور برِ صغیر کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس ریاست کے خود مختار شاہان ۱۵۲۷ء تک حکمران رہے اور دکن میں ہندوؤں کی ریاست وجیانگر سے کافی دیر اس ریاست کی چپقلش رہی۔ بہمنی سلطنت کا دار الحکومت گلبرگہ تھا اور موجودہ صوبہ بمبئی کے علاوہ ریاست حیدر آباد کا علاقہ بھی اس سلطنت میں شامل تھا یعنی جنوب میں دریائے کرشنا اس کی آخری حد تھا۔ مغرب میں اس ریاست کی حدود بحیرہ عرب تک اور مشرق میں ورنگل تک تھیں۔ گلبرگہ کو حسن آباد بھی کہتے ہیں۔ دو چار بادشاہوں کو چھوڑ کر اس سلطنت کے تمام حکمران بیدار مغز۔ دانشمند اور طاقتور تھے۔ یہ سلطنت ہندوؤں کی اکثریت کے علاقوں میں ڈیڑھ سو سال سے زیادہ قائم رہی اور ہمسایہ ہندو ریاست کی شدید مخالفت کے باوجود برقرار رہی۔ اس خاندان کے کل چودہ سلاطین ہو گزرے ہیں اور اس کے خاتمے پر بھی پانچ نئی اسلامی ریاستیں اسی علاقے میں قائم ہوئیں۔ بہمنی سلطنت کی علمی ادبی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ فنِ تعمیر میں بھی بہمنی سلطنت نے خوب ترقی کی۔ اس سلطنت کے اہم سلاطین کا مختصر ذکر درج ذیل ہے۔

(۱) **علاؤالدین حسن بہمنی ۱۳۴۷ء تا ۱۳۵۸ء**: ظفر خان حسن گنگو نے تخت نشین ہو کر علاؤالدین حسن بہمن کا لقب اختیار کیا۔ وہ اپنے آپ کو ایران کے بادشاہ بہمن شاہ کی نسل سے سمجھتا تھا لہٰذا بہمن کا لفظ اپنے لقب کے ساتھ استعمال کیا۔ اسی نسبت سے اس ریاست کو بہمنی سلطنت کہتے ہیں مشہور مورخ فرشتہ نے لفظ بہمن کے بارے میں ایک اور روایت بیان کی ہے۔ جسے ہندو مورخین نے نمایاں جگہ دی ہے۔ لیکن یہ روایت پایۂ ثبوت

کو نہیں پہنچتی۔ فرشتہ کا خیال ہے کہ ابتدا میں ظفر خان حسن از حد مفلس تھا۔ اور فکر معاش کی بدولت پشیمان تھا۔ ایک ہندو برہمن گنگو نے ترس کھا کر اُسے اپنے پاس ملازم رکھ لیا اور بعد میں کچھ زمین اُسے دی۔ ظفر خان حسن کاشتکاری سے اپنا پیٹ پالنے لگا۔ ایک روز ہل چلاتے ہوئے ظفر خان حسن کو اس کھیت سے اشرفیوں کا ایک خزانہ ملا۔ لیکن اس نے کامل دیانت داری سے یہ خزانہ اپنی برہمن کے حوالے کیا۔ برہمن بہت متاثر ہوا اور اس نے یہ واقعہ اپنے آقا شہزادہ جونا خان (محمد تغلق) کی خدمت میں بیان کیا۔ جس نے سلطان غیاث الدین تغلق کے سامنے یہ کہانی بیان کی۔ سلطان نے خوش ہو کر اُسے امراء کی صف میں شامل کر لیا۔ برہمن نے ظفر خان حسن کے ستارۂ اقبال کو دیکھ کر اس سے وعدہ لیا کہ جب تم بلند ترین مرتبہ پر پہنچ گئے۔ تو میرے نام کو اپنے نام کا حصہ بنا لینا تاکہ مجھے بقائے دوام حاصل ہو۔ بادشاہ بن کر ظفر خان حسن نے گنگو بہمن (برہمن) اپنے لقب میں شامل کئے ہو تو وہ تحقیق سے یہ کہانی ثابت نہیں ہوتی۔ بعض مورخ یہ بھی لکھتے ہیں۔ کہ حضرت نظام الدین اولیا نے ظفر خان حسن کو دکن کے تاج و تخت کی بشارت دی تھی۔ اُس وقت ظفر خان حسن امرائے دربار میں شامل تھا۔

علاؤ الدین حسن بہمن نہایت بیدار مغز اور جنگجو سلطان تھا۔ اس نے سلطنت کی حدود کو وسعت دی اور اعلیٰ انتظام سے سلطنت کو مستحکم کیا۔ وفادار اُمراء کو جاگیریں عطا کیں۔ لیکن مرکزی حکومت کو خوب مضبوط کیا۔ انتظامی سہولت کے لئے سلطنت کو چار صوبوں میں منقسم کیا۔ ان صوبوں کے نام گلبرگہ۔ دولت آباد۔ بیدر اور برار تھے۔ اپنے فرزند محمد شاہ کو ولی عہد مقرر کر کے بہمنی سلطنت کے بانی نے ۱۳۵۸ء میں وفات پائی۔

محمد شاہ اوّل :- اس کا عہد حکومت ۱۳۵۸ء سے لے کر ۱۳۷۳ء تک تھا۔ محمد شاہ اپنے باپ کی مانند جنگجو اور اعلیٰ مدبر تھا۔ اُس نے پہلی بار دکن میں اپنا سکہ رائج کیا۔ جس سے ہندو تلملا اٹھے اور اُس کے سکوں کو ڈھال ڈھال کر نیست و نابود کرنے کی ناکام کوشش کی۔ محمد شاہ نے انتظام سلطنت کو بہتر بنایا۔ اور آٹھ شعبے قائم کئے۔ ہر شعبے کی دیکھ بھال کے لئے اُس نے وزیر مقرر کئے۔ تاکہ ہر کام عمدگی سے سرانجام ہو سکے۔ محمد شاہ کی سلطنت ہندوؤں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ لہذا یکے بعد دیگرے ورنگل اور وجیانگر کے ہندو حکمرانوں سے محمد شاہ کی کئی ایک لڑائیاں ہوئیں۔ لیکن محمد شاہ نے اپنی سلطنت کو برقرار رکھا اور دشمنوں کے مُنہ کھٹے کئے۔ سب سے پہلے ۱۳۶۱ء میں ورنگل کے راجہ سے جنگ چھڑ گئی۔ کیونکہ وہ دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا کے درمیانی علاقے کا دعویدار تھا۔ محمد شاہ کے جرنیل بہادر خان نے ورنگل کی فوجوں کو شکست دے کر صلح پر مجبور کیا اور بھاری تاوان جنگ بھی وصول کیا۔ کچھ عرصے کے بعد ورنگل کے راجہ نے پھر جنگ شروع کر دی لیکن مُنہ کی کھائی۔ اس بار اُسے تیرہ لاکھ سونے کے سکے۔ تین سو ہاتھی تاوانِ جنگ کے طور پر دینے پڑے۔ اسکے علاوہ گولکنڈہ کا علاقہ بھی محمد شاہ کی نذر کیا۔ اس دوران میں وجیانگر کے ہندو راجہ بکا نے رائے چور کے دوآب پر اچانک حملہ کر کے تمام علاقے کو ویران کیا محمد شاہ خود فوج لے کر آگے بڑھا اور ہندوؤں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ محمد شاہ تعاقب کرتا ہوا وجیانگر جا پہنچا اور اس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ ایک ماہ جاری رہا۔ اور پھر دونوں ریاستوں میں صلح ہو گئی۔ یہ جنگ کسی منحوس گھڑی شروع ہوئی تھی۔ کیونکہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہ جنگ پھر چھڑ جاتی تھی۔ اس جنگ نے ہندو اور مسلمانوں کی باہمی

نفرت کو تیز کیا اور طرفین کا بھاری نقصان ہوا۔ یہ جنگ بہمنی سلطنت کے خاتمے تک جاری رہی۔ محمد شاہ کے زمانے میں دولت آباد کے گورنر نے بھی بغاوت کی۔ لیکن محمد شاہ نے اُس کا قلع قمع کیا۔

مجاہد شاہ اور داؤد۔ محمد شاہ کے بعد اُس کا لڑکا مجاہد شاہ ۱۳۷۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اُس نے غدر میں آکر وجیا نگر پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ اور صلح کرنے پر مجبور ہوا۔ اُس نے غیر ملکی لوگوں کو امراء کی صف میں شامل کیا۔ اور ترکی اور ایرانیوں پر خوب نوازشیں کیں۔ اس بات پر دکنی امراء اُس کے مخالف بن گئے اور ۱۳۷۷ء میں اُس کے چچا داؤد نے امراء کی سازش سے مجاہد شاہ کو مروا ڈالا اور خود تخت پر قابض ہو گیا۔ لیکن چند ماہ بعد خود بھی مارا گیا۔ اسکی وفات پر امراء نے محمد شاہ ثانی کو ۱۳۷۸ء میں تخت پر بٹھایا۔

محمد شاہ ثانی ۱۳۷۸ء تا ۱۳۹۷ء محمد شاہ ثانی بہترین سلطان تھا۔ علم و فن کا دلدادہ اور امن پسند تھا۔ اُس نے انتظام سلطنت کو بہتر بنایا۔ اور سلطنت کو مستحکم کیا۔ محمد شاہ ثانی نے عیش و عشرت کو ترک کر کے رفاہِ عام کے کاموں کی جانب توجہ مبذول کی۔ اس کے زمانے میں گلبرگہ میں دُور دراز علاقوں سے علماء اور فضلا آکر مقیم ہو گئے تھے۔ اس سلطان کے زمانے میں ایران کے مشہور شاعر حافظ شیرازی کو گلبرگہ آنے کی دعوت دی گئی لیکن حافظ سمندری سفر اختیار کرنے پر رضامند نہ ہوا۔

فیروز شاہ ۱۳۹۷ء تا ۱۴۲۲ء۔ فیروز شاہ ۱۳۹۷ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ علاؤ الدین حسن گنگو کا پوتا تھا۔ محمد شاہ ثانی کے دونوں لڑکے یکے بعد دیگرے چند ماہ حکومت کر کے فوت ہو گئے۔ لہٰذا امراء نے فیروز شاہ بہمنی کو تخت پر بٹھایا۔ فیروز شاہ کے زمانے میں وجیا نگر کی ریاست سے

کئی ایک خوفناک لڑائیاں ہوئیں۔ جنگ کی ابتداء ۱۳۹۸ء میں راجہ ہری ہر دوم نے کی۔ لیکن دریائے کرشنا کے کنارے پر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ ۱۴۰۶ء میں پھر جنگ چھڑ گئی۔ فیروز شاہ نے بانکانگر پر قبضہ کر لیا۔ اور ہری ہر دوم کو پے در پے شکستیں دیں۔ وجیانگر کے راجہ نے مجبور ہو کر صلح کر لی۔ اور بھاری تاوان جنگ ادا کیا۔ راجہ نے اپنی لڑکی کا رشتہ بھی فیروز شاہ سے کر دیا۔ اور بانکانگر کا علاقہ جہیز میں دیا۔ اس شادی کے باوجود دونوں سلطنتوں میں اتحاد و دوستی کا رشتہ قائم نہ ہو سکا۔ کیونکہ ۱۴۲۰ء میں پھر جنگ چھڑ گئی۔ اور دو سال متواتر جنگ ہوتی رہی۔ فیروز شاہ کی فوج میں وبائی بیماری پھیل گئی۔ لہذا اسے فوجیں سرحدی علاقوں سے پیچھے ہٹانی پڑیں۔ وجیانگر کی فوجیں بہمنی مقبوضات میں گھس آئیں اور خوب تاخت و تاراج کیا۔ ہندوؤں نے رعایا میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اور مسجدوں کی بے حرمتی کی۔ آخر کار صلح ہوئی۔ اور فیروز شاہ کو بانکانگر کا علاقہ واپس کرنا پڑا۔

فیروز شاہ نہایت اعلیٰ جرنیل تھا۔ اس نے چوبیس لڑائیاں ہندوؤں کے خلاف لڑیں۔ یہ حکمران اعجوبۂ روزگار تھا۔ فنون جنگ کا ماہر تھا۔ علم و فضل کا دلدادہ تھا۔ کئی ایک زبانیں جانتا تھا۔ شاعر بھی تھا لیکن عیش و عشرت کا بھی دلدادہ تھا منصف مزاج اور رعایا پرور تھا۔ لیکن شراب کا عادی تھا۔ اس کے حرم میں مختلف ممالک کی عورتیں تھیں۔ جن سے وہ ان کی مادری زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ ہر خاتون کے لئے علیحدہ محل تھا۔ اور سلطان عیش و نشاط میں مگن رہتا تھا۔ اس نے نئی طرز کا مرصع تاج پہننا شروع کیا۔ جو بعد میں بہمنی سلاطین کا امتیازی نشان بنا۔

احمد شاہ ۱۴۲۲ء تا ۱۴۳۵ء۔ احمد شاہ جنگ و جدل کا شوقین

تھا۔ اس نے وجیا نگر سے جنگ چھیڑ دی اور دریائے تنگ بھدرا کے کنارے وجیا نگر کی فوجوں کو شکست فاش دی۔ اس کے بعد اس نے فیروز شاہ کے زمانے کا بدلہ لینے کے لئے وجیا نگر کے علاقوں کو خوب تاراج کیا۔ وجیا نگر کا راجہ محصور رہا۔ آخر کار اس نے بھاری تاوان جنگ ادا کر کے صلح کر لی۔ احمد شاہ نے ورنگل کے راجہ کو بھی شکست دی۔ اس نے مالوہ کے حکمران ہوشنگ شاہ کو بھی شکست دی۔ مالوہ سے جنگ کا باعث یہ تھا۔ کہ ہوشنگ شاہ نے احمد شاہ کے ایک باجگذار راجے کو قتل کر کے اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ مالوہ کی جنگ کے بعد احمد شاہ بہمنی اور احمد شاہ والئے گجرات میں جنگ چھڑ گئی لیکن جلدی ہی صلح ہو گئی۔ احمد شاہ بہمنی کا زمانہ جنگ وجدل اور فتوحات کا دور ہے احمد شاہ نے گلبرگہ کی بجائے احمد آباد کو دارالخلافہ بنایا۔ کیونکہ اس علاقے کی آب و ہوا سلطان کو پسند آئی تھی۔ احمد شاہ اعلیٰ جرنیل اور علم و پرور سلطان تھا لیکن اس کے زمانے میں امراء میں جتھہ بندیاں ہو گئیں۔ ایک گروہ دکنی امراء کا تھا جس میں حبشی امراء شامل تھے۔ دوسرا گروہ غیر ملکی امراء کا تھا۔ جس میں ترکی اور ایرانی نسل کے امراء شامل تھے۔ ان دونوں پارٹیوں کی رقابت دن بدن بڑھتی گئی۔ اور آخر کار بہمنی سلطنت کے زوال کا باعث ہوئی۔

علاؤ الدین ۱۴۳۵ء تا ۱۴۵۷ء: علاؤ الدین کے زمانے میں امراء کی باہمی چپقلش تیز ہو گئی۔ سلطان عیش و نشاط کا دلدادہ تھا لیکن انتظام سلطنت سے غافل نہ ہوتا تھا۔ اس کے زمانہ میں وجیا نگر کی ریاست سے پھر جنگ ہوئی۔ لیکن دیو رائے ثانی کو شکست فاش ہوئی۔ اور راجہ باقاعدگی سے خراج ادا کرتا رہا۔ دیو رائے ثانی نے ایک چال یہ چلی تھی کہ اپنی فوج میں سلمانوں کو بھی بھرتی کر لیا تھا۔ اور ان کو گراں قدر تنخواہیں اور جاگیریں دی تھیں۔۔۔۔

لیکن سلطان علاؤالدین کے سامنے بیش اسکی پیش نہ گئی۔

علاؤالدین کے جرنیل دلاور خاں نے کونکن کے راجہ کو شکست دے کر باجگذاری پر مجبور کیا۔ راجہ نے اپنی لڑکی کی شادی بھی علاؤالدین سے کر دی۔ یہ لڑکی نہایت حسین تھی۔ لہٰذا علاؤالدین نے اس کی بہت زیادہ قدرو منزلت کی۔ اور اسے "زیبا چہرہ" کا خطاب دیا۔ علاؤالدین کی پہلی بیوی آغا زینب جو خاندیش کے حکمران کی لڑکی تھی۔ سوکن کے جلاپے کی بدولت سخت ناراض ہوئی۔ بیٹی کا بدلہ لینے کے لئے خاندیش کے حکمران ناصر خان نے برار پر حملہ کیا لیکن دولت آباد کے گورنر ملک التجار نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور ناصر خان کو شکست دے کر بھگا دیا۔ بعد ازاں بہمنی فوجوں نے خاندیش کے پایۂ تخت برہان پور کو تاراج کیا۔

سلطان علاؤالدین بیدار مغز اور علم پرور تھا منصف مزاجی میں بے مثال تھا عوام میں "سلطان عادل" کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے ۱۴۵۷ء میں وفات پائی۔

ہمایوں ۱۴۵۷ء تا ۱۴۶۱ء:- نیک دل باپ کے بعد اس کا سنگ دل بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا۔ وہ ظالم اور خونی تھا۔ رحم کے جذبے سے عاری تھا۔ اس نے اپنے خاندان کے نام پر بٹہ لگایا۔ اس کا پھوپھی زاد بھائی سکندر تخت کا دعویدار تھا۔ دونوں میں ایک خونریز جنگ ہوئی۔ سکندر خاں کو شکست ہوئی۔ اور وہ میدان جنگ میں مارا گیا۔ ہمایوں کے لئے اب میدان صاف تھا۔ لیکن اس نے سکندر خاں کے پرانے ساتھیوں پر بے پناہ مظالم توڑے۔ اس کے زمانے میں محمود گاواں بیجاپور کا گورنر مقرر ہوا۔ اس شخص نے بہمنی سلطنت کی بیش بہا خدمات کیں۔ اور اس کی شہرت کو

چار چاند لگائے۔

نظام شاہ ۱۴۶۱ء تا ۱۴۶۳ء:۔ ہمایوں کی وفات پر اس کا نابالغ بیٹا نظام الدین شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی اس کی والدہ مخدومہ جہاں اس کی سرپرست مقرر ہوئی۔ لیکن لائق وزیر محمود گاواں کی مدد سے نظام سلطنت نہایت عمدگی سے چلتا رہا۔ اڑیسہ اور تلنگانہ کے راجاؤں نے مل کر بہمنی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ لیکن محمود گاواں ان دنوں محافظ سرحد اور سپہ سالار تھا۔ اس نے ان راجاؤں کو شکست دی اور اپنے ملک سے مار بھگایا۔ اس کے بعد مالوہ کے حکمران محمود خلجی نے سلطان کو خورد سال سمجھ کر بہمنی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اور آناً فاناً بیدر کے علاقے پر قبضہ جما لیا۔ بہمنی سلطنت کے لیئے یہ نازک وقت تھا۔ امراء نے صلاح و مشورہ کر کے گجرات کے سلطان محمود شاہ سے مدد کی التجا کی۔ محمود خلجی ڈر گیا۔ اور مالوہ واپس چلا گیا۔ اس طرح سے بہمنی سلطنت کے سر سے بلا ٹلی۔ نظام شاہ اچانک ہی ۱۴۶۳ء کے وسط میں فوت ہو گیا۔ اور اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی محمد شاہ تخت نشین ہوا۔

محمد شاہ سوئم ۱۴۶۳ء تا ۱۴۸۲ء:۔ تخت نشینی کے وقت محمد شاہ سوئم کی عمر صرف نو سال کی تھی۔ اس کی ماں حسب سابق سرپرست رہی اور خواجہ جہاں محمود گاواں کو نائب السلطنت مقرر کیا۔ غیاث الدین بلبن کی طرح محمود گاواں لائق وزیر تھا۔ اس نے انتظام سلطنت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ صوبوں کی از سر نو تقسیم کی اور سلطنت کو مستحکم و مضبوط بنایا۔ اس نے نہ صرف بہمنی سلطنت کے دشمنوں کا قلع قمع کیا۔ بلکہ مزید فتوحات سے سلطنت کی حدود کو وسعت بخشی۔ پندرہ برس کی عمر میں بادشاہ نے عنان حکومت

اپنے ہاتھ میں لی۔ لیکن محمود گاواں کو وزیر اعظم کے عہدے پر مامور رہنے دیا۔ محمد شاہ سوئم کی فتوحات اور کامرانیوں کا سہرا محمود گاواں کے سر پر ہے۔ اس وزیر کے بغیر محمد شاہ سوئم کی کامیابی یقینی نہ تھی۔

محمود گاواں: اس کا اصلی نام نجم الدین محمود تھا۔ ابتدا میں تاجر تھا۔ اور ایران کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصلی وطن گاواں کا شہر تھا اسی نسبت سے محمود گاواں کہلاتا ہے۔ علاؤالدین بہمنی کے زمانے میں دکن پہنچا اور بادشاہ کا مصاحب بنا۔ ہمایوں نے ۱۴۵۸ء میں اسے وزیر بنالیا۔ اور نظام شاہ اور محمد شاہ سوئم کے دور میں وہ وزیر اعظم اور سپہ سالار کے عہدے پر فائز رہا۔ وہ بہمنی سلطنت کا ازحد وفادار تھا۔ اس نے برسر اقتدار آتے ہی نظام حکومت کو سنوارا اور مالیات کے نظام کو بہتر بنایا۔ فوج میں نظم و نسق کی خرابیوں کو دور کیا۔ اور تنخواہوں کے باقاعدہ گریڈ بنائے۔ عدالتوں کی خرابیوں کو بھی دور کیا۔ انتظام سلطنت سے محمود گاواں نے اپنی سیاست دانی اور اعلیٰ انتظامی قابلیت کا ثبوت دیا۔

محمود گاواں محافظِ سرحد اور اعلیٰ فوجی جرنیل بھی تھا۔ اس نے شاندار فتوحات حاصل کیں۔ اور بہمنی سلطنت کے دشمنوں کا صفایا کیا۔ اس نے ورنگل اور وجیانگر کے راجاؤں کو پے در پے شکستیں دیں۔ کونکن فتح کیا۔ اور بہمنی سلطنت کی عظمت کو بحال کیا۔ نظام شاہ کے زمانے میں صرف مالوہ کے حکمران محمود خلجی نے بہمنی فوجوں کو شکست دے کر بیدر پر قبضہ کر لیا۔ لیکن محمود گاواں نے کامیاب سیاست دان ہونے کا ثبوت دیا۔ اور گجرات کے سلطان محمود شاہ سے مدد مانگی۔ مالوہ کا حکمران گجرات سے جنگ مول نہ لینا چاہتا تھا۔ لہذا فوراً ہی بیدر کو خالی کر کے واپس لوٹا۔ محمود گاواں کی

سیاست کامیاب رہی۔ اور اس نے بہمنی سلطنت کو نازک وقت پر بچا لیا۔

محمود گاواں علوم و فنون کا سرپرست تھا۔ اور خود ایک زبردست عالم تھا۔ ادب کے علاوہ وہ علم طب اور ریاضی میں شغف رکھتا تھا۔ اس کی بدولت بہمنی سلطنت علم و فن کا مرکز بن گئی۔ محمود گاواں نے تعلیم کو عام کیا اور جا بجا مدرسے کھولے۔ پایۂ تخت میں اس نے ایک شاندار یونیورسٹی بھی قائم کی۔ اس یونیورسٹی کی لائبریری میں تین ہزار سے زیادہ نادر کتابیں جمع کیں۔ محمود گاواں کی علمی خدمات بہت بلند ہیں۔ اور بہمنی سلطنت کے لئے باعث فخر ہیں۔

سنہ ۱۴۸۱ء میں محمد شاہ سوئم نے محمود گاواں کو اس جرم کی پاداش میں قتل کروا دیا کہ وہ بہمنی سلطنت کے خلاف اڑیسہ کے راجہ سے مل کر سازش کر رہا ہے۔ دراصل دکنی امراء کی ریاستی پارٹی کو محمود گاواں کے اقتدار کے خلاف خلش تھی۔ انہوں نے اڑیسہ کے راجہ کے نام ایک جعلی خط لکھا تھا اور محمود گاواں کے ایک حبشی غلام کو ساتھ ملا کر اس کی مہر اس خط پر ثبت کروائی تھی۔ بادشاہ ایک روز نشے میں چور تھا کہ یہ خط پیش کر کے محمود گاواں کے قتل کا حکم حاصل کر لیا۔ محمود گاواں کی موت بہمنی خاندان پر کلنک کا ٹیکہ ہے اور پرلے درجے کی احسان ناشناسی ہے۔ اس وقت محمود گاواں کی عمر ۷۸ سال تھی۔ بعد میں بادشاہ کو محمود گاواں کی بے گناہی کا پتہ چلا۔ لیکن دست افسوس ملنے کے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا۔

محمود گاواں کے قتل کے فوراً بعد بہمنی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ صوبائی گورنروں نے سرکشی اختیار کی اور خود مختار بن بیٹھے۔ وجہ یہ تھی کہ اب محمود گاواں جیسا سخت گیر سپہ سالار اٹھ گیا تھا۔ ایک سال بعد محمد شاہ سوئم بھی کثرت

شراب نوشی کی بدولت عین جوانی کے عالم میں فوت ہوا۔
محمد شاہ سوئم کی وفات ۱۴۸۲ء میں ہوئی۔ اس کے بعد امراء میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اگرچہ بہمنی سلطنت ۱۵۲۷ء تک قائم رہی۔ لیکن اس کی عظمت مٹ چکی تھی اور نظام حکومت درہم برہم ہو چکا تھا۔ بہمنی سلطنت کا اقتدار صرف پایۂ تخت اور اس کے آس پاس کے علاقوں تک محدود تھا۔ بہمنی سلطنت کی مرکزیت ختم ہو گئی اور اس کی بجائے پانچ خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ان ریاستوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ صوبہ بیدر کی برید شاہی خود مختار ریاست
۲۔ گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت۔
۳۔ احمد نگر میں نظام شاہی خاندان کی ریاست۔
۴۔ برار میں عماد شاہی خاندان کی ریاست۔
۵۔ بیجاپور میں عادل شاہی خاندان کی ریاست۔

بہمنی سلطنت کی اہمیت: بہمنی سلطنت دکن میں مسلمانوں کا ایک عظیم الشان مرکز تھی۔ اس کی بدولت دکنی علاقوں میں مسلمان اب تک موجود ہیں۔ نیز اس سلطنت نے اسلامی علوم و فنون کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بہمنی سلطنت نے وجیا نگر کی ریاست کے خلاف متواتر جنگیں لڑیں۔ اور اس کے نشو و نما کو روکے رکھا۔ اس جنگ و جدل کی بدولت وجیا نگر کی ریاست زوال پذیر ہوئی۔ بہمنی حکمرانوں نے اپنی سلطنت میں فن تعمیر کو خوب فروغ دیا۔ مساجد اور مقبروں کے علاوہ ریاست میں کئی ایک مضبوط قلعے بھی بنوائے۔ بہمنی سلاطین میں سے اکثر رعایا پرور اور منصف مزاج تھے۔ رعایا کے ہر فرد سے یکساں سلوک روا رکھتے تھے۔ اور

رواداری کے پتلے تھے۔ جنگ کے دنوں میں ہندو رعایا پر سختی کی جاتی تھی تاکہ یہ لوگ ورنگل اور وجیا نگر کی ہمسایہ ہندو ریاستوں کے آلہ کار نہ بنیں۔ بہمنی دور میں رعایا خوشحال تھی اور تجارت کو کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔ حکومت کی آمدنی کافی تھی۔ اور شاہی دربار کی شان و شوکت دیکھنے والوں کو دنگ کر دیتی تھی۔ بہمنی سلاطین نے مصنوعی آبپاشی کے لئے تالاب بھی تعمیر کرائے بہمنی فن تعمیر کی طرز علیحدہ ہے۔ اسے دکن گہ طرز تعمیر کہتے ہیں۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے اسباب یہ تھے کہ ہمایوں کے زمانے سے درباری امراء کے دو گروہ بن گئے۔ یہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتی تھیں۔ چنانچہ سازشوں کا ایک وسیع جال شروع ہوا۔ اور انتظام سلطنت کی جانب سے توجہ ہٹ کر باہمی رقابتوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ لائق وزیر محمود گاواں بھی ان ہی سازشوں کا شکار ہوا۔ محمد شاہ سوئم کی وفات کے بعد امراء کی باہمی چپقلش نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی اس انتشار کے دور میں سلطنت کی مرکزی طاقت کمزور ہو گئی۔ اور مختلف صوبے خود مختار بن بیٹھے۔ مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ محمود گاواں کے قتل کے بعد مرکز کا خوف لوگوں کے دلوں سے اٹھ گیا۔ اور بہمنی سلطنت زوال پذیر ہوئی۔

بہمنی سلطنت کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وجیا نگر سے طویل جنگ کی بدولت آہستہ آہستہ دونوں ریاستیں کمزور ہوتی گئیں۔ اور آخر کار مٹ گئیں

وجیا نگر کی ہندو ریاست

وجیا نگر کی ہندو ریاست ۱۳۳۶ء سے لے کر ۱۵۶۵ء تک قائم رہی یہ ریاست ہندوؤں کے لئے باعث افتخار تھی۔ اور تین ہندو خاندانوں کے

بعد دیگرے اس کے حکمران رہے۔ تقریباً دو سو سال تک یہ ریاست ہندو تہذیب و تمدن کا مرکز بنی رہی۔ اس سلطنت کے بانی ہریہر اور بکا نامی دو بھائی تھے جنہوں نے وجیانگر کے شہر کو دریائے تنگ بھدرا کے کنارے پر آباد کیا بعد ازاں یہ شہر اس خود مختار ریاست کا پایۂ تخت بنا۔ ہریہر اور بکا یادو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ابتدا میں ورنگل کے راجہ کے امراء تھے۔ کچھ عرصہ سلطان محمد تغلق کے پاس قید بھی رہے۔ سلطان نے ان کو آزاد کرکے اپنا ملازم بنالیا تھا۔ اور پھر رائے چور کا گورنر بنایا تھا۔

تغلق خاندان کی تباہی کے بعد جب صوبائی گورنر خود مختار بن بیٹھے تو ان دونوں بھائیوں نے وجیانگر کی خود مختار ریاست قائم کرلی۔ اور ہریہر اس ریاست کا پہلا راجہ ہوا۔ یہ سلطنت بہمنی سلطنت کے جنوب میں دریائے کرشنا سے لے کر راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت نے دکن کی جانب اسلامی حملوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا۔ ۱۳۳۶ء سے کر ۱۵۶۵ء تک وجیانگر کی ریاست میں تین خاندان برسراقتدار آئے۔ یہ خاندان مندرجہ ذیل تھے:۔

۱۔ یادو خاندان ۱۳۳۶ء سے لے کر ۱۴۸۶ء تک۔ اس کے بانی ہریہر اور اس کا بھائی بکا ہے۔

۲۔ دوسرے خاندان کی بنیاد نرسنگ سالوا نے رکھی۔ اس خاندان کا دور حکومت ۱۴۸۶ء سے لے کر ۱۵۰۵ء تک تھا۔

۳۔ تیسرا خاندان ۱۵۰۵ء سے لے کر ۱۵۶۵ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس خاندان کا بانی نریش نائک یا اس کا بیٹا ویر نرسنگ تھا۔

وجیانگر کی ریاست کے اہم راجاؤں کے مختصر حالات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ ہری ہر اوّل ۱۳۳۶ء سے لیکر ۱۳۵۴ء تک ۱۔ ہری ہر چونکہ بڑا بھائی تھا اس لئے اس سلطنت کی بنیاد پڑتے ہی ۱۳۳۶ء میں وہ تخت نشین ہوا۔ وہ ایک زبردست فاتح تھا۔ اور ہمیشہ سلطنت کو وسیع کرنے کا خواہشمند رہتا تھا۔ ۱۳۴۴ء میں اس نے ورنگل کے راجہ سے اتحاد کرکے دریائے کرشنا کے جنوبی علاقوں پر ہلہ بول دیا۔ اور وہاں سے تمام مسلمان، افسروں اور جاگیرداروں کو نکال دیا۔ جو سلطنت دہلی کے مطیع تھے۔ دو سال بعد اس نے کونکن اور مالابار کا بیشتر حصہ فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس نے اسی سال مدوار سمدر کو بھی فتح کرکے ہیوئے سالا خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ پس اس کی سلطنت کی حدود کافی وسیع ہوگئیں۔ کیونکہ وجیا نگر کی ریاست اس وقت دریائے کرشنا سے لے کر کاویری تک پھیلی ہوئی تھی اور مالابار کے ساحلی علاقے سے لے کر کارومنڈل کے ساحل تک تمام علاقہ اسی ریاست کے زیر نگین تھا۔

۲۔ بکا (Bukka) ہری ہر کے بعد اس کا چھوٹا بھائی تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت ۱۳۵۴ء سے لے کر ۱۳۷۷ء تک تھی۔ اپنے بھائی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس نے بھی شاہی القاب اختیار کرنے سے احتراز کیا۔ اس نے مدورا کا علاقہ فتح کرکے وجیا نگر کی ریاست میں شامل کیا۔ اس کے زمانے میں وجیا نگر اور بہمنی سلطنتوں کے درمیان جنگ کا آغاز ہوا۔ یہ جنگ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پھر شروع ہو جاتی تھی۔ اور آخر کار دونوں سلطنتوں کے زوال کا باعث ہوئی۔ بکا کے زمانے میں جنگ کی بنیاد رائے چور دوآبہ کے حصول کے لئے تھی۔ یہ وہ علاقہ تھا جو دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا کے درمیان تھا۔ بکا نے نہایت بہادری سے مقابلہ کیا لیکن

بہمنی سلاطین سے شکست کھائی۔ بکّا نے ۱۳۷۶ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا ہری ہر ثانی تخت نشین ہُوا۔

۳۔ ہری ہر ثانی ۱۳۷۶ء سے لیکر ۱۴۰۴ء تک ہری ہر ثانی نے اپنی بادشاہت اور خود مختاری کا اعلان کیا۔ اور مہاراجہ ادھیراج کا لقب اختیار کیا۔ اس نے رائے چور فتح کرنے کی کوشش کی لیکن بہمنی سلطان فیروز شاہ سے شکست کھا کر اسے خراج ادا کرتا رہا۔ ہری ہر نے وجیا نگر کی ریاست کو خوب مستحکم کیا۔ اور اپنی سلطنت کی حدود کو وسعت بخشی۔ اس کی سلطنت ترچناپلی اور اندھرا تک پھیلی ہوئی تھی۔

۴۔ کمزور جانشین، ہری ہر ثانی ۱۴۰۴ء میں ۳۱ اگست کو فوت ہوا اس کا لڑکا بکّا دوم نیا راجہ بنا۔ لیکن چند ماہ بعد مر گیا۔ اس کے بعد دیو رائے تخت پر بیٹھا۔ اور چند سال حکومت کی۔ دیو رائے نے بہمنی سلطنت سے جنگ چھیڑ کر شکست کھائی۔ اس نے نہ صرف خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا بلکہ اپنی لڑکی کی شادی بھی فیروز شاہ بہمنی سے کر دی۔ دیو رائے نے ۱۴۱۰ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا وجے رائے تخت نشین ہُوا۔ اس نے بھی بہمنی سلطان سے شکست کھائی۔ نو سال حکومت کرنے کے بعد وہ ۱۴۱۹ء میں فوت ہُوا۔

۵۔ دیو رائے ثانی ۱۴۱۹ء تا ۱۴۴۹ء دیو رائے اس خاندان کا مشہور ترین راجہ ہو گذرا ہے۔ اس کے پاس گیارہ لاکھ فوج اور ایک ہزار ہاتھی تھے۔ اس نے مؤثر طریقے پر بہمنی سلاطین کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو بھی فوج میں بھرتی کیا۔ لیکن پھر بھی احمد شاہ بہمنی سے شکست کھائی۔ اس کے عہدِ حکومت میں مشہور اطالوی سیاح نکولو کونٹی پہنچا۔

اس نے اپنے سفر نامے میں وجیانگر کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ وہ بیان کرتا ہے کہ وجیانگر کا شہر بہت وسیع تھا۔ اور اس کے گرداگرد مضبوط فصیل تھی۔ لوگوں کو فنون جنگ کا شوق تھا۔ راجہ کی کئی ایک بیویاں تھیں عوام بھی ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کر سکتے تھے۔ ستی کی رسم از حد مقبول تھی۔ مذہبی میلے لگتے تھے۔ اور دیوتاؤں کے بت رتھ پر لاد کر جلوس نکالے جاتے تھے۔

دیو رائے ثانی کے زمانے میں امیر تیمور کے لڑکے شاہ رخ نے اپنا سفیر عبدالرزاق سمرقندی وجیانگر بھیجا۔ اس نے اپنی کتاب میں اس ریاست کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک میں کئی بندرگاہیں تھیں۔ اور ریاست کی تجارت زوروں پر تھی۔ زمین زرخیز اور رعایا خوشحال تھی۔ وجیانگر کے شہر کے گرداگرد سات حفاظتی فصیلیں تھیں۔ ہر فصیل کی قریبی زمین پر نوکدار پتھر لگائے ہوئے تھے۔ تاکہ دشمن فصیل کے قریب پہنچ کر بھی نقصان پہنچانے سے قاصر رہے پھولوں سے بھرپور باغات عام تھے۔ اور بازار وسیع تھے۔ وجیانگر کے مختلف کاریگر اور صناع برادریوں کی شکل میں منظم تھے۔

دیو رائے ثانی نے اپنی فوج کی از سر نو تنظیم کی لیکن اس کے باوجود احمد شاہ بہمنی سے دو بار شکست کھائی۔

۶۔ ارجن ۱۴۴۹ء تا ۱۴۶۵ء:۔ دیو رائے ثانی کے بعد اس کا بیٹا ارجن تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے باجگذار سردار نرسنگ سالووا کی مدد سے بہمنی سلطان اور اڑیسہ کے ہندو راجہ پرشوتم کو ہزیمت دی۔ ہندو مورخ اس راجہ کو ماکی ارجن لکھتے ہیں اس کے زمانے میں چندراگری کے سردار نرسنگ

سالوا کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ جو بعد میں خطرناک ثابت ہوئی۔
آخری حکمران:۔ مالکی ارجن کے بعد اس کا جانشین ویرو پکش ازحد نالائق تھا۔ سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر بہمنی سلطان نے رائے چور دوآب پر قبضہ کر لیا۔ اور اڑیسہ کے ہندو راجہ نے بھی کافی علاقہ ہتھیا لیا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر نرسنگ سالوا نے ۱۴۸۶ء میں وجیانگر کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ اور ویروپکش کو تخت سے علیحدہ کر دیا۔

وجیانگر میں سالوا خاندان کے حکمران

سالوا خاندان کے حکمرانوں نے وجیانگر میں ۱۴۸۶ء سے لے کر ۱۵۰۵ء تک حکومت کی۔ اس خاندان کا بانی نرسنگ سالوا تھا۔ جو چندر گری کا معمولی راجہ تھا۔ اور کافی عرصے سے وجیانگر کا باجگذار چلا آتا تھا۔ وجیانگر کا تخت حاصل کرنے کے بعد اس نے کافی سختی کی اور باغی سرداروں کا صفایا کیا۔ اس کی بدولت وجیانگر کی ریاست دوبارہ مستحکم ہو گئی۔ اس کی وفات پر اس کا لڑکا عمادی نرسنگ تخت نشین ہوا۔ ہندو مورخ لکھتے ہیں کہ عمادی نرسنگ اور اس کے بھائی کو قتل کر کے سپہ سالار نراش نائک نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور غاصب خاندان کا خاتمہ کر ڈالا۔ اس واقعہ کو دوسرا سیاسی انقلاب یا غصب کہتے ہیں۔ دیگر ذرائع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نراش نائک نے سلطنت کو غصب نہیں کیا بلکہ اس کے لڑکے ویر نرسنگ نے عمادی نرسنگ کو تخت سے علیحدہ کر کے خود سلطنت پر قبضہ جما لیا اس کا باپ غاصب نہیں ہے۔ بلکہ ویر نرسنگ تھا۔

وجیانگر پر تیسرے ہندو خاندان کی حکمرانی

وجیانگر کی ریاست پر نیا خاندان ۱۵۰۵ء سے ۱۵۶۵ء تک حکمران رہا۔ اس خاندان کا پہلا اہم راجہ ویر نرسنگ تھا۔ جس کی فیاضی کی ...... شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اس خاندان کا مشہور ترین حکمران کرشن دیو تھا۔

کرشن دیو ۱۵۰۹ء تا ۱۵۲۹ء کرشن دیو ۱۵۰۹ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ ویر نرسنگ کا بیٹا تھا۔ اس کے دور میں وجیانگر کی ریاست ترقی کی منازل طے کر کے بام عروج پر پہنچی۔ کرشن دیو جنگ وجدل کا شوقین اور زبردست فاتح تھا۔ سب سے پہلے اس نے باغی اور سرکش مقامی سرداروں کو زیر کیا۔ پھر اڑیسہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ تاکہ ریاست وجیانگر کے غصب شدہ علاقوں کو دوبارہ مسخر کر لیا جائے بیدر اور گولکنڈہ کے مسلمان حکمرانوں نے اڑیسہ کا ساتھ دیا۔ کرشن دیو کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ تاہم اُدھے گری اور کونڈا ویڈو اور کونڈا پلی پر اسکا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ کرشن دیو مختلف علاقے فتح کرتا ہوا وزیگاپٹم تک جا پہنچا۔ اڑیسہ کے راجہ نے مجبور ہو کر صلح کر لی اور کرشن دیو کا اقتدار بہت بڑھ گیا۔ ۱۵۲۰ء میں بیجاپور کے مسلمان سلطان نے رائے چور کے دو آب کو فتح کرنے کی نیت سے حملہ کیا لیکن کرشن دیو سے شکست کھائی بحیرۂ عرب اور خلیج بنگال کے اکثر جزیرے کرشن دیو کے زیر اثر تھے۔

کرشن دیو نے فتوحات کے علاوہ علوم وفنون کو بھی خوب ترقی دی وہ خود بھی عالم تھا۔ کرشن دیو وشنو بھگت تھا۔ اور مذہب کا شیدائی تھا۔

لیکن ہندوؤں کے تمام فرقوں سے نہایت اچھا سلوک کرتا تھا مسلمان حکمرانوں سے جنگ وجدل کی بنا پر اس نے عربوں کی تجارت کو تباہ کرنے کی کوشش کی اور پرتگیزوں کو خوب نوازا کیونکہ اہل پرتگال اور مسلمان تاجروں کی آپس میں چپقلش رہتی تھی پیس (Paes) ، پرتگالی سیاح اس راجہ کی بے حد تعریف کرتا ہے۔

اچھوتا رایا ۱۵۲۹ء تا ۱۵۴۲ء۔ کرشن دیو کی وفات پر اس کا سوتیلا بھائی اچھوتا رایا تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں مدورا کے گورنر نے بغاوت کی لیکن شکست کھائی۔ اچھوتا رایا نے ٹراونکور کے راجہ کی بھی گوشمالی کی جس نے مدورا کے باغی گورنر کی مدد کی تھی۔ اچھوتا رایا کو ہندو مورخ نااہل اور ظالم گردانتے ہیں اس کے دور میں امراء میں پارٹی بازی شروع ہوئی۔ جو سلطنت کے زوال تک قائم رہی۔ اسی راجہ نے سلطنت کے تمام امور اپنے نسبتی بھائیوں کے سپرد کر رکھے تھے۔ یہ بات امراء کو ناگوار گذرتی تھی۔ اچھوتا رایا کے بعد اسکا لڑکا وینکٹ ناکام رہا۔ اسے سداشو نے تخت سے علیحدہ کر دیا سداشو کے زمانے میں وزیر اعظم رام راجہ سلوا کے ہاتھ میں تمام اختیارات تھے اور سداشو برائے نام حکومت کرتا تھا۔ سداشو کے زمانے میں بہمنی سلطنت تباہ ہو چکی تھی۔ اور اس کی بجائے پانچ مسلمان ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ سداشو کے وزیر رام راجیہ سلوا نے عیاری سے کام لے کر مسلمان حکمرانوں کو آپس میں لڑوانے کی کوشش کی۔ وہ کبھی ایک مسلمان ریاست کا حلیف بن جاتا تھا۔ اور کبھی دوسری ریاست کا ساتھ دیتا تھا۔ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ مسلمان ریاستیں باہمی جنگ وجدل کی بدولت کمزور ہو جائیں۔ چنانچہ

۱۵۵۸ء میں وجیانگر کی ریاست نے بیجاپور کے سلطان سے مل کر احمد نگر پر قبضہ کر لیا۔ احمد نگر کے سلطان نے وجیانگر کی اطاعت قبول کی لیکن ہندوؤں کی فوج نے احمد نگر پر خوب مظالم توڑے اور بے گناہ مسلمانوں کا خون بہانے کے علاوہ مساجد کی بھی توہین کی۔ احمد نگر کے سلطان کی بھی تذلیل کی۔ ہندوؤں کے ظلم و ستم کو دیکھ کر بیجاپور اور احمد نگر کی مسلمان ریاستوں نے اپنے اختلاف ختم کر دیئے اور ہندوؤں سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ گولکنڈہ اور بیدر کے مسلمان حکمرانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اور تمام مسلمان ریاستوں کی فوجوں نے وجیانگر کی ریاست پر حملہ کر دیا۔ تلی کھاٹ یا تلی کوٹ کے قریب جنوری ۱۵۶۵ء میں کفر اور اسلام کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں ہندوؤں کو شکست ہوئی۔ وجیانگر کا راجہ گرفتار ہو کر احمد نگر کے سلطان کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ہندوؤں کے تقریباً ایک لاکھ سپاہی کام آئے۔ دکن کی تاریخ میں یہ جنگ فیصلہ کن اور ہولناک گنی جاتی ہے۔ فتح کے بعد مسلمان سلاطین کی متحدہ فوجوں نے وجیانگر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور احمد نگر کے مظالم کا بدلہ لیا۔ اس شکست کے بعد وجیانگر کی سلطنت مٹ گئی لیکن شہر وجیانگر کے کھنڈرات اب تک اس کی عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔ تلی کھاٹ کی جنگ کی بدولت دکن کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی نفرت کا جذبہ پائیدار صورت اختیار کر گیا۔

وجیانگر کا انتظام سلطنت

مرکزی حکومت:۔ وجیانگر کی ریاست میں فوجی نوعیت کی حکومت

قائم تھی۔ حکومت کا اہم مقصد یہ تھا کہ ہمسایہ مسلمان ریاست کے مقابلے کے لئے پوری جنگی تیاری کی جائے۔ بہمنی سلطنت اور وجیانگر کی سرحدیں ہمیشہ آتش فشاں پہاڑ کی مانند تھیں۔ کیونکہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان میں جنگ ہوتی رہتی تھی۔ پاکستان اور بھارت کی طرح ان دونوں ریاستوں کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہتے تھے اور امن کے زمانے میں بھی حقیقی دوستی قائم نہ ہوتی تھی۔ راجہ مطلق العنان تھا۔ اور طاقت کا سرچشمہ تھا۔ اس کی سلطنت میں بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار بھی تھے۔ جو اس کے تابع تھے۔ پس بعض مورخ وجیانگر کی حکومت کو جاگیردارانہ حکومت (Feudal organization) بھی کہتے ہیں۔ راجہ انتظام سلطنت میں مشورہ کے لئے ایک کونسل طلب کرتا تھا۔ جس میں وزرا اور جرنیلوں کے علاوہ مقتدر اشخاص اور امرا بھی ہوتے تھے۔ لیکن شاہی اختیارات پر کوئی پابندی نہ تھی۔

صوبے۔ ریاست میں تقریباً ایک سو چھوٹے چھوٹے صوبے تھے گورنروں کی حیثیت جاگیرداروں کی مانند تھی۔ تمام گورنر معین شدہ رقم ہر سال مرکزی حکومت کو بھیجتے تھے۔ اور جنگ کے دنوں میں فوج بھی مہیا کرتے تھے۔

صوبائی سپاہیوں کے علاوہ مرکز میں ایک زبردست شاہی فوج بھی تھی۔ وجیانگر کی فوج کی تعداد حیران کن ہے۔

آمدنی۔ صوبائی گورنر مالیہ اکٹھا کر کے مرکز کو بھیجتے تھے۔ حکومت کی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ یہی لگان تھا۔ بعض زمینیں سرکاری امور کے لئے وقف تھیں۔ ان کی تمام آمدنی راجہ کے پاس جاتی تھی۔ مالیہ نقدی

کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔ اور کل پیداوار کا ۱/۶ حصہ ہوتا تھا۔ زرعی لگان کے علاوہ وجیانگر کی ریاست میں کئی ایک ٹیکس موجود تھے۔ لوگ ان ٹیکسوں سے بیزار تھے۔

عدل وانصاف:۔ راجہ انصاف کا سرچشمہ تھا۔ لیکن ریاست میں باقاعدہ عدالتی نظام موجود نہ تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں پنچایت کا طریقہ رائج تھا لیکن شہروں میں صوبائی گورنر یا جاگیردار عدل وانصاف کرتا تھا راجہ کے دربار میں ہر امر کی شکایت ہو سکتی تھی اور اس کے احکام حرف آخر گنے جاتے تھے۔ فریقین حکومت سے اجازت حاصل کرنے کے بعد جنگ آزمائی (Dusl) سے بھی اپنے جھگڑے چکا لیتے تھے۔ اس جنگ آزمائی میں جو شخص ہار جاتا اُس کی تمام جائیداد پر مخالف کا قبضہ ہو جاتا تھا۔ سزائیں وحشیانہ تھیں۔ لیکن جرائم کا ارتکاب کم تھا۔ رعایا خوش حال تھی۔ اور راجہ کو عوام کی بہبودی کا خیال رہتا تھا۔ وجیانگر کے اکثر راجہ علوم وفنون کے سرپرست تھے۔

پایۂ تخت:۔ وجیانگر کا شہر نہایت خوبصورت تھا اور دارالسلطنت تھا شہر ایک پہاڑی پر واقع تھا اور اس کا گھیرا تقریباً ساٹھ میل تھا۔ شہر کے گرد حفاظت کے لئے سات مضبوط فصیلیں تھیں سب سے آخری فصیل کے گرد اگرد پچاس گز تک زمین پر نوکدار پتھر لگے ہوئے تھے۔ تاکہ حملہ آور فصیل کے قریب نہ آسکے۔ بازار کشادہ تھے اور سڑکیں عمدہ تھیں پہلی تین فصیلوں کے درمیان کھیت اور باغات تھے۔ محاصرے کی صورت میں شہر میں خوراک کی کمی نہ ہوتی تھی۔ شہر کے وسط میں راجہ کا محل تھا۔ یہ عمارت نہایت خوبصورت تھی۔

مجلسی حالات: نکولو کونٹی اور عبدالرزاق سمرقندی اور پرتگالی مورخ نونتز (Nunitz) کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ وجیانگر کی ریاست میں برہمنوں کی بے حد قدر و منزلت تھی۔ جانوروں کی قربانیاں دینے کا رواج عام تھا۔ دیوتاؤں کے بتوں کے جلوس نکالے جاتے تھے اگر کوئی اس رتھ کے نیچے دب کر مر جاتا جس پر دیوتا کے بت کو جلوس کی صورت میں لے جایا جاتا تھا۔ تو لوگ اس شخص کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔ ستی کا رواج عام تھا۔ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتے تھے لیکن خاوند کی موت پر تمام بیویاں اس کی چتا پر جل مرتی تھیں۔ تعلیم عام تھی۔ لوگ امیر تھے۔ اور لباسِ فاخرہ پہنتے تھے۔

Typical Questions

Q. 1. Describe breifly the origin, development and ruin of the Hindu Empire of Vijanagar.

Q. 2. What do you know of the Bahmanid Kingdom? What led to its decline?

Q. 3. What part did Mahmud Gawan play in the history and administrative improvement of the Bahmani Kingdom?

Q. 4. Give a brief account of the rise and fall of the Bahmani Kingdom.

Q. 5. Trace and explain the break up of the Bahmani Kingdom.

Q. 6. Give a brief acoount of the rise and fall of the Bahmani Kingdom and bring out clearly the part it played in the history of India.

Q. 7. Give an account of Vijyanagar at the hight of its power. To what did it owe its greatness? What brought about its ultimate fall?

Q. 8. Write short notes on the following :—

(*a*) Nicolo conti (*b*) Abdur Razzak

(*c*) Mahmud Gawan (*d*) Harie Har I

(*e*) Battle of Tali Ghat.

امتحانی سوالات

۱- وجے نگر کی ہندو ریاست کی ابتدا اور عروج و زوال کا حال قلمبند کیجئے۔

۲- بہمنی سلطنت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ اس کے زوال کے اسباب بیان کیجئے۔

۳- محمود گاوان نے بہمنی سلطنت کے انتظام کو سدھارنے اور اس خاندان کی تاریخ کو روشن کرنے کے لئے کیا کیا کارہائے نمایاں کئے؟

۴- بہمنی سلطنت کے عروج و زوال کا حال لکھئے۔

۵- بہمنی سلطنت کے زوال کے اسباب وضاحت سے بیان کیجئے۔

۶- بہمنی سلطنت کے عروج و زوال کا حال بیان کرتے ہوئے یہ واضح کیجئے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس سلطنت کی اہمیت کیا ہے۔

۷- وجیانگر کی ریاست کے زمانۂ اقتدار کا حال بیان کیجئے۔ اس ریاست کی عظمت کا راز کیا تھا؟ آخر کار کن وجوہات کی بنا پر یہ ریاست زوال پذیر ہوئی؟

۸- مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھئے۔

(ا) نکولو کونٹی (ب) عبدالرزاق (ج) محمود گاوان (د) ہری ہر اول۔

(ھ) تلی گھاٹ کی لڑائی۔

چوبیسواں باب

گجرات۔ مالوہ۔ جونپور اور بنگال کی اسلامی ریاستیں

یوں تو فیروز شاہ تغلق کے زمانے سے ہی دہلی سلطنت کی طاقت کمزور پڑ گئی تھی لیکن ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور کے حملے نے دہلی سلطنت کے رہے سہے وقار کو خاک میں ملا دیا اور صوبائی گورنر موقع ملتے ہی خودمختار بن بیٹھے۔ دکنی خودمختار ریاستوں کا حال پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ اس باب میں گجرات۔ مالوہ۔ جونپور اور بنگال کی خودمختار ریاستوں کا حال پیش کیا جائے گا۔ یورپی مورخین ان ریاستوں کو خودمختار صوبائی حکومتیں، (Provincial dynasties) کہتے ہیں۔ ہم اس باب میں انکو اسلامی ریاستیں کہتے ہیں۔

ان چاروں خودمختار اسلامی ریاستوں نے اپنی عظمت کے دور میں خوب شہرت حاصل کی۔ اور ہر شعبے میں مقامی رنگ (Provincial Style) قائم رکھا۔ چنانچہ فن تعمیر۔ کلچر۔ ادب اور راگ میں بھی یہی مقامی رنگ جھلکتا ہے جو الگ تھلگ۔ واضح اور ممیز ہے اور مرکزی حکومت (یعنی سلطنت دہلی) کے انداز سے بالکل مختلف ہے۔ خاندیش۔ کشمیر۔ سندھ۔ اور ملتان کا..... رنگ بھی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس باب میں صرف گجرات۔ مالوہ۔ جونپور۔ اور بنگال کی خودمختار ریاستوں

کے عروج و زوال کی داستان بیان کی جائے گی۔

۱۔ مالوہ (Malwa) کی ریاست

سلطان علاؤالدین خلجی نے سنہ ۱۳۰۵ء میں مالوہ کے راجپوت حکمران کو شکست دے کر اس ریاست پر قبضہ جمایا تھا۔ اور اس زمانے سے مالوہ کا علاقہ صوبائی گورنروں کے ماتحت رہا۔ امیر تیمور کے حملے کے بعد فیروز شاہ تغلق کے ایک جاگیردار نے مرکزی حکومت کی اطاعت کا جوا اپنے گلے سے اتار پھینکا اس گورنر کا نام دلاور خان تھا۔ اُس نے سنہ ۱۴۰۱ء میں خود مختار ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اُس کا بیٹا الپ خان سنہ ۱۴۰۵ء میں تخت نشین ہوا اور اس نے ہوشنگ شاہ کا لقب اختیار کر کے باقاعدہ تاج شاہی پہنا۔ اُس نے سنہ ۱۴۳۵ء تک حکومت کی اور مانڈو (Mandu) کو نیا پایہ تخت بنایا اور خوبصورت عمارتیں بنا کر اس شہر کو دلہن کی مانند سجا بنا دیا۔ ہوشنگ شاہ کے زمانے سے ہمسایہ ریاستوں سے مالوہ کی جنگ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ بعد ازاں گجرات اور جونپور کے علاوہ مالوہ کی ریاست نے دہلی کی سلطنت سے بھی ٹکر لی۔ ان طویل جنگوں سے مالوہ کے مالی وسائل پہ کافی بوجھ پڑا۔ گجرات کے خلاف ایک جنگ میں ہوشنگ شاہ گرفتار ہوا لیکن مالوہ کے دلیر سپاہیوں نے اُسے آزاد کرا لیا اور اُس کی بادشاہت بحال ہو گئی۔

ہوشنگ شاہ کے بعد اُس کا بیٹا غزنی خان تخت نشین ہوا اور اُس نے محمد غوری کا لقب اختیار کیا۔ بادشاہ خود شراب میں غلطاں رہتا اور لہو و لعب میں مگن رہتا تھا سلطنت کے تمام کام اُس نے اپنے وزیر محمد خان

خلجی کو سونپ رکھے تھے۔ اُس نے بادشاہ کو قید خانے میں ڈال کر ۱۴۳۶ء میں خود حکومت سنبھالی۔ نیا بادشاہ اعلیٰ جرنیل تھا اور جنگ و جدل کا بےحد شوقین تھا۔ وہ ہر وقت میدانِ جنگ میں خیمہ زن رہتا تھا جہاں فارغ وقت ملیں وہ تاریخی واقعات سننے میں مگن رہتا تھا۔ یہ بادشاہ منصف مزاج اور فیاض تھا اور طویل جنگوں کی بدولت اُس نے ہمسایہ ریاستوں پر اپنی دھاک بٹھالی۔ راجپوتانہ۔ گجرات اور بہمنی سلطنت سے مالوہ نے جنگیں لڑیں محمود خلجی نے مالوہ کی حدود کو وسعت بخشی۔ چنانچہ مالوہ کی سرحدیں جنوب میں ست پڑا پہاڑ تک مغرب میں گجرات تک، مشرق میں بندیلکھنڈ تک اور شمال میں میواڑ تک پھیلی ہوئی تھیں ۱۴۴۰ء میں محمود خلجی نے دہلی پر حملہ کیا لیکن سلطان بہلول لودھی سے شکست کھا کر واپس لوٹا۔ اس کے بعد محمود خلجی نے چتوڑ کے راجپوتوں پر حملہ کیا لیکن فیصلہ کن لڑائی نہ ہو سکی۔ محمود خلجی نے ۱۴۶۹ء میں وفات پائی اور اُس کا بیٹا غیاث الدین تخت نشین ہوا۔ لیکن اُس کے اپنے لڑکے ناصر الدین نے اسے زہر دے کر ہلاک کر ڈالا اور وہ خود ۱۵۰۰ء میں تخت نشین ہوا۔ نیا بادشاہ حسن پرست اور شراب کا متوالا تھا۔ اور اس کی حیرہ دستیاں آج تک مشہور ہیں ۱۵۱۱ء میں وہ نشے کے عالم میں ڈوب مرا۔

ناصر الدین کے بعد محمود ثانی تخت نشین ہوا۔ اُس کے زمانے میں امراء کا زور حد سے بڑھ گیا تھا لہٰذا اُس نے مدنی راؤ (Madini Rao) کو اپنا وزیر مقرر کیا اور راجپوتوں سے گٹھ جوڑ کر کے اپنے امراء کا اقتدار ختم کیا۔ مدنی راؤ کی بدولت مالوہ میں راجپوتوں کا اقتدار حد سے زیادہ بڑھنے لگا بادشاہ نے گھبرا کر گجرات کے حکمران مظفر شاہ سے مدد طلب کی اور مدنی راؤ سے

نجات پائی۔ میواڑ کے حکمران رانا سانگا سے بھی مالوہ کی جنگ ہوئی لیکن محمود خانی گرفتار ہوا۔ رانا سانگا نے اُسے رہا کر کے بحال کر دیا۔ اسکے بعد محمود ثانی نے گجرات کے حکمران بہادر شاہ سے ملکر میواڑ پر چڑھائی کی لیکن بہادر شاہ نے موقع پا کر محمود ثانی کو قتل کر دیا اور اسکی اولاد کو بھی تہ تیغ کر دیا۔ البتہ محمود ثانی کے خاندان کا ایک فرد بھاگ کر مغل شہنشاہ ہمایوں کے پاس پناہ گزین ہوا۔ ۱۵۳۱ء میں مالوہ کی ریاست کا الحاق گجرات کی سلطنت سے ہوا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ہمایوں گجرات پر حملہ آور ہوا اور مالوہ کا صوبہ ۱۵۳۶ء میں اس ریاست سے چھین لیا۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں شجاعت خان کو مالوہ کے صوبے کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اسکی وفات کے بعد اس کا بیٹا ملک بایزید مالوہ کا گورنر بنا۔ وہ باز بہادر کے نام سے مشہور ہے اور سارنگ پور کی شہزادی روپ متی سے اس کے عشق کی داستان مشہور ہے۔

۱۵۶۰ء میں اکبری افواج نے آدھم خان اور پیر محمد کی سرکردگی میں مالوہ کو فتح کیا اور اس ریاست کا الحاق کر لیا۔ باز بہادر نے اطاعت قبول کی اور دو ہزاری ذات و سوار کا منصبدار بنا۔ باز بہادر موسیقی کا ماہر تھا اور اس فن کو اس نے خوب ترقی دی۔ مالوہ کا پایہ تخت مانڈو "عروس البلاد" کہلاتا ہے۔ اس کی عمارات بے حد دلکش ہیں۔ اہم ترین عمارتیں جامع مسجد۔ جہاز محل اور ہوشنگ شاہ کا مقبرہ ہیں۔

۲۔ گجرات کی ریاست

گجرات کا علاقہ سرسبز و شاداب تھا اور سمندری تجارت سے مالا مال تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے گجرات مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا

لیکن سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانے میں یہ صوبہ فتح ہوا اور گورنر دلی کے ماتحت رہا۔ تغلق خاندان کے زوال کے بعد ۱۴۰۱ء میں گجرات کے گورنر ظفر خان نے مظفر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ گجرات کے تخت کے لئے اس کا لڑکا ناصرالدین محمد بیتاب تھا۔ اور باپ کو قید کر ڈالا۔ لیکن ظفر خان کے ایک معتمد شمس خان نے اس کو رہا کرایا اور اس کی بادشاہت بحال ہوئی لیکن ۱۴۱۱ء میں ظفر خان کو اس کے پوتے احمد شاہ نے زہر دے کر ہلاک کر دیا اور خود تخت حاصل کیا۔

احمد شاہ نے ۱۴۴۱ء تک تیس برس حکومت کی۔ وہ جنگجو تھا اور اس نے اپنی سلطنت کو وسعت بخشی اس نے گرنار (Girner) کے راجپوت حکمران کو باجگذار بنایا اور بعد ازاں اس نے مالوہ کے سلطان ہوشنگ کو شکست دی۔ ۱۴۳۸ء میں اس نے محمود خلجی کو شکست دی اور مالوہ کے پایہ تخت مانڈو کا طویل محاصرہ کیا۔ اس کے جنگی کارناموں سے گجرات کی سلطنت کا وقار بڑھ گیا۔

احمد شاہ کے زمانے میں سلطان کے نام کی نسبت سے احمد آباد کا شہر بسایا گیا۔ اس شہر میں عمدہ اور خوبصورت عمارات تعمیر ہوئیں اور بادشاہ نے دور دور سے کاریگر اور تاجر منگوا کر اس شہر کو شہرت بخشی وہ شاید مالوہ کو فتح کر لیتا لیکن احمد آباد میں ایک خوفناک وبا پھوٹ پڑی۔ چنانچہ بادشاہ نے مانڈو کا محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے ملک میں واپس آ گیا۔ یہاں اس نے ۱۴۴۱ء میں وفات پائی۔ احمد شاہ کو گجرات کی سلطنت کا اصلی بانی گنا جاتا ہے۔ احمد شاہ پکا مسلمان تھا اور عدل و انصاف کا پتلا تھا۔ احمد شاہ کا لڑکا محمد شاہ اپنی زر بخشی اور فیاضی کے لئے مشہور تھا اس کا

عہد حکومت دس سال تک تھا۔ اس نے چمپانیر پر حملہ کیا لیکن مالوہ کی فوجیں ا
چمپانیر کی مدد کو پہنچ گئیں اور محمد شاہ کو پسپا ہونا پڑا۔ ۱۴۵۱ء میں امراء نے
سازش کر کے محمد شاہ کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اس کا بیٹا قطب الدین
بادشاہ بنا اور چتوڑ کے خلاف مصروف پیکار رہا۔ اس نے ۱۴۵۹ء میں
وفات پائی۔ اس کا جانشین چچا داؤد تخت نشین ہوا لیکن امراء نے اُسے
چند روز بعد معزول کر کے احمد شاہ کے پوتے فتح خاں کو تخت
پر بٹھایا۔ نئے بادشاہ نے محمود کا لقب اختیار کیا۔ مورخ اسے محمود
بیگاڑا (Mahmud Bigoda) کہتے ہیں۔ اس کا شمار گجرات کے
عظیم ترین سلاطین میں ہوتا ہے۔ سلطان پیٹو (Glutton)
ضرور تھا لیکن بہادر اور جنگجو تھا۔ اُس نے ساحلی علاقے کو سمندری
لٹیروں سے پاک کیا۔ چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستوں کو باجگذار بنایا اور
چمپانیر کی ریاست کو اطاعت پر مجبور کیا۔ ۱۵۰۸ء میں سلطان نے پرتگیزوں
کے خلاف کارروائی کی اور ان یورپی تاجروں کو گجرات کے مغربی گھاٹ
سے نکالنے کی کوشش کی۔ ترکی کے سلطان نے بھی محمود کی مدد
کے لئے اپنے بارہ جنگی جہاز بھیجے جن میں پندرہ ہزار سپاہی تھے۔
لیکن پرتگیزوں کے ہاتھوں شکست کھائی اور وہ ہندوستان کے
مغربی ساحل پر جم گئے۔ سلطان نے ۱۵۱۱ء میں وفات پائی۔
محمود کے جانشینوں میں سے سلطان بہادر شاہ کا عہد اہمیت رکھتا
ہے۔ یہ بادشاہ ۱۵۲۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اُس نے مانڈو، چندیری اور
چتوڑ کو فتح کر کے اپنی فوجی عظمت کا لوہا منوایا۔ جب اس نے ۱۵۳۴ء
چتوڑ کو فتح کیا تو مغل شہنشاہ ہمایوں بدک اٹھا اور اس نے

بہادر شاہ سے نبرد آزمائی کی ٹھانی۔ مغل فوجوں کے سامنے بہادر شاہ کی پیش نہ گئی اور ہمایوں نے نہ صرف مانڈو اور چمپانیر کو فتح کر لیا بلکہ گجرات پر بھی قبضہ جما لیا۔ بہادر شاہ نے حوصلہ نہ ہارا اور مقامی فوج تیار کر کے مغلوں کو آہستہ آہستہ اپنے ملک سے باہر نکال پھینکا۔ اس نے دیو (Diew) کا علاقہ پرتگیزوں سے چھین لینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بہادر شاہ کو عین شباب کے عالم میں اکتیس برس کی عمر میں سازش کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ وہ ۱۵۳۷ء میں پرتگیزی گورنر سے ملنے کے لئے اس کے جہاز پر پہنچا لیکن گورنر نے حرمت مہمان کو بالائے طاق رکھ کر اسے سمندر میں ڈبو دیا۔ بہادر شاہ کی وفات کے بعد گجرات کے تخت کے کئی دعویدار پیدا ہوئے اور ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہے۔ ملکی امن برباد ہو گیا اور طوائف الملوکی پھیل گئی۔ آخر کار ۱۵۷۲ء میں شہنشاہ اکبر نے گجرات کو فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔

سلاطین گجرات نے فن تعمیر کو خوب فروغ دیا اور طرز تعمیر میں مقامی رنگ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ پتھر کی جالی عمارات میں لگائی گئی ہے اور عمارتوں کی تزئین اور زیبائش دلکش ہے۔ گجرات کی عمارتوں میں سے احمد آباد کی جامع مسجد خاص طور پر قابل ذکر ہے یہ مسجد گجراتی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اور اس مسجد کے ۲۶۰ ستون ہیں۔ مسجد کے علاوہ دیگر عمارات کی زیبائش بھی جاذب نظر ہے۔

۳۔ جونپور کی شرقی سلطنت

جونپور کا شہر سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۱۳۶۰ء میں دریائے گومتی کے کنارے آباد کیا تھا۔ بعد ازاں یہ شہر علم و فضل کا مرکز بن گیا۔ اور دور دراز علاقوں سے لوگ یہاں تحصیل علم کے لئے آنے لگے۔ چنانچہ مورخین اس شہر کو "ہندوستان کا شیراز" گنتے ہیں۔

فیروز شاہ تغلق کے جانشین محمود تغلق نے اپنے وزیر خواجہ جہاں کو ۱۳۹۴ء میں "ملک الشرق" کا خطاب عطا کر کے مشرقی علاقوں میں امن و امان بحال کرنے کے لئے بھیجا یعنی قنوج سے لیکر بہار تک کا تمام علاقہ اس کے حوالے کیا۔ خواجہ جہاں کا اصلی نام سرور تھا اور وہ خواجہ سرا تھا لیکن لیاقت اور بہادری میں بے مثال تھا۔ نئے گورنر "ملک الشرق" نے جونپور کو اپنا صدر مقام بنایا اور اٹاوہ۔ کول اور قنوج کی بغاوتوں کو فرو کر کے "شرقی" علاقوں میں امن و امان بحال کیا۔ اس نے گرد و نواح کے جاگیرداروں اور ہندو سرداروں کو اطاعت پر مجبور کیا اور اودھ۔ بہرائچ۔ بہار اور ترہٹ تک اپنی دھاک بٹھا دی۔ جاج نگر۔ بنگال اور لکھنوتی کے حکمران بھی اس سے دبنے لگے۔

امیر تیمور کے حملے کے بعد خواجہ جہاں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اتابک اعظم کا لقب اختیار کیا۔ اس کی مملکت جونپور کی ریاست کہلاتی ہے۔ "ملک الشرق" کی نسبت سے مورخین نے اسے "مملکت جونپور شرقی" لکھا ہے۔

مشہور ترین حکمران

جونپور کا مشہور ترین حکمران شمس الدین ابراہیم شاہ شرقی تھا۔ وہ سنہ ۱۴۰۲ء میں تخت نشین ہوا اور اُس کے چالیس سالہ عہدِ حکومت میں ریاست جونپور کی شہرت بامِ عروج پر پہنچی۔ وہ علوم و فنون کا دلدادہ تھا اور اُس نے جونپور کو ایشیا بھر میں علم و حکمت کا سرچشمہ بنا دیا۔ برِصغیر کی سیاسی خلفشار کی بنا پر ہر جانب سے اہلِ فن شرقی سلطنت میں آ کر مقیم ہو گئے۔ بادشاہ کو فنِ تعمیر سے بے حد لگاؤ تھا چنانچہ جونپوری طرزِ تعمیر معرضِ وجود میں آئی۔ جونپور کی مشہور ترین عمارت اٹالہ مسجد (Atala Mosque) ہے

ابراہیم شاہ شرقی کے زمانے میں دہلی کا حکمران محمود تغلق تھا۔ جو اپنے وزیر ملّو اقبال خان کے سامنے بے بس تھا۔ محمود تغلق نے ابراہیم سے مدد مانگی لیکن اس نے ہوش مندی سے کام لے کر اُن کے جھگڑے میں دخل انداز ہونے سے انکار کر دیا۔ اس دوران میں ملتان کے گورنر خضر خان کے عروج سے ملّو اقبال خان مارا گیا اور محمود تغلق دہلی چلا گیا۔ اس موقع پر ابراہیم شاہِ شرقی نے قنوج پر قبضہ جما لیا۔ شائد ابراہیم دہلی پر بھی قبضہ جما لیتا لیکن مظفر شاہ گجراتی کی یلغار کی خبر پا کر وہ جونپور واپس چلا گیا۔ اس دوران میں خضر خان کو دہلی کا سلطان تسلیم کر لیا گیا۔

پندرھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں جونپور کے سلاطین محمد ابراہیم اور اُس کے جانشین حسین شاہ نے دہلی پر قبضہ جمانے کے لئے متعدد جنگیں لڑیں اور آخر کار دہلی کے لودھی حکمرانوں سے

شکست کھائی۔ اس چپقلش میں جونپور کی شرقی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

آخری تاجدار جونپور شرقی کا آخری تاجدار حسین شاہ تھا جو ۱۴۵۸ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ علوم و فنون کا سرپرست تھا۔ موسیقی اور آرٹ کا دلدادہ تھا۔ خود موسیقی میں کامل مہارت رکھتا تھا۔ جونپوری۔ خیال اور گانا میں حسین شاہ خوب درک رکھتا تھا۔ صبحدم جونپوری راگ گانے کا رواج جونپور سے ہی شروع ہوا۔ دہلی کے سلطان بہلول لودھی نے ۱۴۷۶ء میں جونپور پہ فوج کشی کر کے اس ریاست کا خاتمہ کر دیا۔

۴۔ مملکتِ بنگالہ

بنگال کا وسیع صوبہ اپنی زرخیزی اور دولت کی بنا پہ "مملکت بنگالہ" کے نام سے مشہور رہا ہے۔ اس دور دراز صوبے کے گورنر محض برائے نام دہلی کی مرکزی حکومت کے ماتحت تھے۔ لیکن سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۳۹ء میں بنگال کے مختلف حصوں میں فوجی افسروں نے بغاوتیں کیں اور بنگال کا صوبہ محمد تغلق کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

خود مختار بنگال کا پہلا حکمران حاجی شمس الدین الیاس گنا جاتا ہے جس نے تمام بنگال پر ۱۳۵۲ء تک اپنا تسلط جما لیا۔ اس کا بیٹا سکندر شاہ باپ سے بھی زیادہ شہرت کا مالک ہے۔ وہ سلطان فیروز شاہ تغلق کا ہمعصر تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق بنگال کو فتح نہ کر سکا۔ اور سکندر شاہ نے بنگال کو خوشحال سلطنت بنا دیا۔ پانڈوا میں اس نے ادینہ مسجد تعمیر کی جو قابلِ دید عمارت ہے۔

سکندر شاہ نے ۱۳۹۳ء میں وفات پائی اور اس کا لڑکا اعظم تخت نشین ہوا۔ اس نے غیاث الدین کا لقب اختیار کیا اور ۱۴۱۰ء تک حکمرانی کی یہ بادشاہ علوم و فنون کا شوقین تھا اور فارسی زبان کے شہرۂ آفاق شاعر حافظ شیرازی کو اپنے دربار میں لانے کا متمنی تھا۔ حافظ نے سمندری سفر اختیار کرنے سے انکار کر دیا لیکن ایک نظم لکھ کر غیاث الدین کی خدمت میں بھیجی۔

غیاث الدین کے بعد بنگال پر ایک ہندو سردار راجہ گنیش نے قبضہ جما لیا اور مسلمان رعایا کو خوب دق کیا۔ ابراہیم شاہ شرقی (آف جونپور) نے مشتعل ہو کر بنگال پر حملہ کیا لیکن راجہ گنیش کے لڑکے نے اسلام قبول کیا اور ابراہیم مطمئن ہو کر واپس لوٹا۔ گنیش کی وفات کے بعد ۱۴۱۴ء میں اس کا نو مسلم لڑکا جلال الدین محمد تخت نشین ہوا اور اس نے سترہ برس ۱۴۳۱ء تک حکومت کی جلال الدین محمد مذہب کا متوالا تھا۔ اس کے لڑکے احمد شاہ کے عہد میں سابق شاہان بنگال کی نسل کے ایک شخص ناصر الدین محمود نے ۱۴۴۲ء میں بغاوت کی اور تخت و تاج پر قابض ہو گیا۔ یعنی حاجی شمس الدین الیاس کا خاندان دوبارہ بنگال کا مالک بنا۔

باربک کا دور ناصر الدین محمود کے لڑکے باربک نے ۱۴۶۰ء سے لے کر ۱۴۷۴ء تک حکومت کی۔ اس نے افریقہ کے حبشی غلاموں کو از حد فوقیت دی اور کلیدی اسامیوں پر لگا دیا۔ یہ حبشی غلام اس قدر منہ زور ہو گئے کہ باربک کے جانشین یوسف شاہ کی وفات کے بعد انہوں نے ۱۴۸۱ء میں زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لیکر خوب ادھم مچایا۔ رعایا نے تنگ آکر بغاوت کی اور عربی نسل کے ایک سید علاؤالدین

حسین شاہ کو ۱۴۹۳ء میں بنگال کا بادشاہ بنا دیا۔ اُس نے ۱۵۱۹ء تک حکومت کی۔ اس کا عہدِ حکومت بنگال کی تاریخ میں درخشاں گنا جاتا ہے۔ اُس نے افریقی غلاموں کو قابو میں کیا اور ہندو فوجیوں کو۔ (جو پائیک کہلاتے تھے) افراتفری مچانے سے باز رکھا۔ اُس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بنگال میں امن و امان بحال کیا۔ اس نے کھوئے ہوئے علاقوں کو دوبارہ فتح کیا اور اپنی سلطنت کی حدود کو اڑیسہ تک وسعت دی۔ البتہ وہ آسام فتح نہ کر سکا۔ وہ مذہبی تعصب سے بالاتر تھا اور رعایا کی بہبودی کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے ملک بھر میں کئی ہسپتال قائم کیے اور مسجدیں بنائیں۔ جونپور کا حکمران حسین شاہ اپنی سلطنت کھو چکنے کے بعد اس کے دربار میں مقیم رہا اور بنگال کے بادشاہ کا وظیفہ خوار رہا۔

نصرت شاہ

علاؤ الدین حسین شاہ کی وفات کے بعد اُس کا لڑکا نصرت شاہ ۱۵۱۸ء میں تخت نشین ہوا۔ اُس نے ۱۵۳۲ء تک حکومت کی۔ یہ بادشاہ علماء کا قدردان اور علوم و فنون کا سرپرست تھا۔ اس کے زمانے میں بنگالی زبان کو فروغ ہوا۔ گوڑ کے علاقے میں اُس نے عالیشان مسجدیں بنوائیں جن میں سے بڑا سونا مسجد اور قدم رسول مسجد خاص طور پر مشہور ہیں۔ بابر نے اپنی تزک میں نصرت شاہ کو ہندوستان کے طاقتور حکمرانوں میں شمار کیا ہے۔

نصرت شاہ کی وفات کے بعد حسینی خاندان زوال پذیر ہوا اور پانچ سال افغان اور مغل بنگال پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے برسرِ پیکار رہے۔ آخر کار شیر شاہ افغان نے ۱۵۳۸ء میں گوڑ پر قبضہ جما لیا اور حسینی خاندان کے آخری تاجدار محمود کو معزول کر دیا۔ شیر شاہ نے کامل بنگال اور بہار پر قبضہ

جمانے کے بعد مغل شہنشاہ ہمایوں سے دہلی کا تخت چھینا اور وہ بنگال کی بجائے ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ بنگال افغان سرداروں کی تحویل میں رہا۔ آخر کار مغل شہنشاہ اکبر نے سنہ ۱۵۷۶ء بنگال کو فتح کر کے اپنی سلطنت سے الحاق کر لیا۔

Typical Questions

Q. 1. Give a brief account of the Sharqi Kingdom of Jaunpore.

Q. 2. "Bahadur Shah was the last great ruler of Gujrat". Discuss.

Q. 3. Give a brief history of the Kingdom of Malwa.

Q. 4. Give a brief account of the independent Kingdom of Bengal with special reference to the house of Ilyas and the Hussaini dynasty.

امتحانی سوالات

۱۔ جونپور کی "شرقی" سلطنت کا مختصر حال قلمبند کیجئے۔

۲۔ "بہادر شاہ گجرات کا آخری عظیم المرتبت حکمران ہو گذرا ہے" تبصرہ کیجئے۔

۳۔ ریاست مالوہ کی مختصر تاریخ بیان کیجئے۔

۴۔ بنگال کی خود مختاری کی سرگذشت لکھئے اور حاجی الیاس و حسینی خاندان کے بادشاہوں کا خاص طور پر ذکر کیجئے۔

پچیسواں باب

سیّد اور لودھی سلاطین

امیر تیمور کی واپسی کے بعد برصغیر ہند و پاکستان چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ اس کا حال بیان ہو چکا ہے محمود تغلق اگرچہ دہلی میں دوبارہ آگیا تھا۔ لیکن وہ برائے نام بادشاہ تھا کیونکہ تمام اختیارات دولت خاں لودھی کے پاس تھے۔ اس وقت پنجاب اور ملتان پر امیر تیمور کا وائسرائے سید خضر خان حکمران تھا۔ دہلی کی سلطنت میں پایۂ تخت کے علاوہ رہتک، سنبھل اور دوآبہ کا کچھ علاقہ شامل تھا۔ باقی صوبے خود مختار بن بیٹھے تھے۔ ۱۴۱۴ء میں خضر خاں نے چار ماہ کے محاصرہ کے بعد دہلی کو فتح کر لیا۔ اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور خاندان سادات کی بنیاد رکھی۔ سیّدوں کی حکومت ۱۴۱۴ء سے لے کر ۱۴۵۱ء تک رہی اس خاندان کے چار بادشاہ ہوئے سیّد حکمران سلطنتِ دہلی کی پرانی عظمت کو بحال نہ کر سکے۔ سیدوں کے زمانے میں ہندوؤں نے بار بار بغاوت کی۔ اور سلاطین کے لئے امن و امان قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ سیدوں کے چار بادشاہ ہوئے ان کے نام درج ذیل ہیں:۔

۱۔ سید خضر خاں۔ عہد حکومت ۱۴۱۴ء سے لیکر ۱۴۲۱ء تک
۲۔ سید مبارک شاہ ” ۱۴۲۱ء ” ۱۴۳۴ء ”
۳۔ سید محمد شاہ ” ۱۴۳۴ء ” ۱۴۴۵ء ”

۴۔ سید علاؤالدین۔ عہد حکومت ۱۴۴۵ء سے لیکر ۱۴۵۱ء تک۔

سید خضر خاں:۔ سید خضر نہایت پارسا اور حلیم انسان تھا۔ لیکن فوجی قابلیت اور شجاعت کی بنا پر امیر تیمور کا منظور نظر بن گیا تھا۔ اور خدمات کے صلے میں امیر تیمور نے اسے پنجاب اور ملتان کی حکومت عطا کی دہلی کا سلطان بننے کے بعد بھی سید خضر خاں اپنے آپ کو امیر تیمور کا نائب گنتا تھا۔ سید خضر خاں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے سلطنت کے استحکام کی کوشش کی لیکن ماحول اتنا بگڑا ہوا تھا کہ مشکلات پر قابو نہ پا سکا۔ اس زمانے میں ترک اور افغان تمام عہدوں پر چھائے ہوئے تھے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے لیکن ان فوجیوں میں قبائلی تعصب اس قدر زیادہ تھا کہ وہ کسی دوسرے خاندان کے عروج کو گوارا نہ کرتے تھے۔ سید خضر خاں کو ان امراء کا تعاون حاصل نہ تھا۔ لہٰذا وہ مرکزی طاقت بحال کرنے میں ناکام رہا۔

سلطان نے دوآبہ، بیانہ اور گوالیار کی بغاوتوں کو فرو کیا لیکن اس کے عہدِ حکومت میں دوآبہ کے ہندو بار بار بغاوتیں کرتے رہے۔ ان مشکلات کے پیش نظر سید خضر خاں خاطر خواہ اصلاحات نافذ نہ کر سکا۔ آٹھ سال کے عہد حکومت میں وہ محض امن وامان قائم کرنے میں مصروف رہا۔ اگرچہ وہ نہایت عمدہ جرنیل تھا۔ لیکن بے جا انسانی خون بہانے سے دریغ کرتا۔ وہ عالی مرتبہ، دانا اور نیک دل سلطان تھا۔ اور رعایا میں ہر دلعزیز تھا۔

مبارک شاہ:۔ سید خضر خاں کی وفات پر اس کا بیٹا مبارک شاہ تخت نشین ہوا۔ اپنے باپ کی مانند وہ شجاع اور دانش مند تھا۔ لیکن اس کا تمام عہد حکومت بغاوتوں کو فرو کرنے اور سرکش سرداروں کو دبانے میں

صرف ہوا۔ وہ سیاسی حالات پر قابو نہ پا سکا اور جاگیرداروں کی سرکشی کا قلع قمع نہ کر سکا۔ اس کے زمانے میں حسرت کھوکھر کی بغاوت فرد کی گئی اور لاہور کو دوبارہ آباد کیا گیا۔ دوآب کے علاقے کو دوبارہ زیر کیا گیا۔ اور مقامی سرداروں اور زمینداروں کو مالیہ کی ادائیگی کے لئے مجبور کیا گیا۔ میوات اور بیانہ کی بغاوتوں کو بھی فرد کیا گیا۔ مبارک شاہ کے زمانے میں جونپور کے شاہِ شرقی ابراہیم نے دہلی فتح کرنے کے خواب دیکھنے شروع کئے اور دونوں میں کالی ندی اور چاندوارہ کے مقامات پر جنگ بھی ہوئی۔ لیکن جونپور کا سلطان شکست کھا کر واپس بھاگ گیا۔ اور مبارک شاہ تعاقب کئے بغیر دہلی لوٹ آیا۔ سلطان مبارک شاہ نے اپنے وزیر سرور الملک کو شک کی بنا پر علیحدہ کر دیا۔ لیکن معزول شدہ وزیر نے امراء کو ساتھ ملا کر سازش کی اور فروری ۱۴۳۴ء میں مبارک شاہ کو قتل کر دیا۔

سلطان مبارک شاہ کے دور میں مشہور مؤرخ یحیٰی بن احمد نے تاریخ مبارک شاہی لکھی۔ جو اس سلطان کے نام پر معنون ہے۔ یہ کتاب مستند مانی جاتی ہے۔ اور سیدوں کے دور کی تاریخ کا ماخذ ہے۔

سید محمد شاہ، مرنے سے پہلے مبارک شاہ اپنے رشتہ دار محمد شاہ کو اپنا جانشین نامزد کر گیا تھا۔ سید محمد شاہ نے گیارہ برس حکومت کی۔ وہ خضر خاں کے بیٹے فرید خاں کا لڑکا تھا۔ اس کا دربار سازشوں کا مرکز تھا اور بادشاہ کس مپرسی کی حالت میں تھا۔ ابتدا میں سرور الملک نے اپنے دوستوں کی مدد سے اقتدار حاصل کر لیا۔ مسندِ وزارت اسی نے سنبھالی اور خانِ جہان کا لقب اختیار کیا۔ لیکن بادشاہ نے

مخالف گروہ کے امراء کی مدد کرنی شروع کردی۔ جن کا سرغنہ کمال الدین تھا کمال الدین کی سازش کی بدولت سرور الملک قتل ہوا اور محمد شاہ نے کمال الدین کو اپنا وزیر مقرر کیا۔

مبو ابھیوں نے سازش کرکے مالوہ کے سلطان محمود خلجی کو دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ محمود خلجی دہلی کی جانب بڑھتا چلا آرہا تھا کہ خدا نے اس بھرم ایک نئی مصیبت ڈالی۔ یعنی گجرات کاٹھیاوار کے سلطان احمد شاہ نے مالوہ کے پایۂ تخت پر حملہ کردیا۔ اور محمود خلجی دہلی کو فتح کرنے کی بجائے اپنی سلطنت کو بچانے کی غرض سے واپس ہوا۔ سید محمد شاہ نے پنجاب کے گورنر بہلول لودھی کو محمود خلجی کے تعاقب پر بھیجا۔ لیکن محمود خلجی تیزی سے مالوہ واپس چلا گیا۔ محمد شاہ نے بہلول لودھی کو خان خاناں کا خطاب دیا۔ بہلول کے دل میں دہلی پر قبضہ جمانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ لیکن وہ مناسب موقع کی تلاش میں رہا۔ سید محمد شاہ کے زمانے میں اٹاوہ۔ بدایوں۔ سرہند۔ علی گڑھ اور گوالیار میں بغاوتیں ہوئیں اور کئی ایک جاگیرداروں نے مالیہ ادا کرنا بند کردیا۔

سلطان علاؤالدین:۔ ۱۴۴۵ء میں محمد شاہ کے انتقال پر سلطان علاؤالدین شاہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت نظام سلطنت اس قدر بگڑ چکا تھا کہ بلبن جیسے سخت گیر اور جابر سلطان کی ضرورت تھی۔ لیکن سید علاؤالدین شاہ درویش صفت انسان تھا اور حکومت کا کام چلانے کے لئے موزوں نہ تھا۔ اس کا خطاب شاہ عالم یعنی دنیا کا بادشاہ تھا۔ لیکن دہلی کے علاوہ کہیں بھی اس کے فرمان کی پرواہ نہ کی جاتی تھی۔ ۱۴۴۷ء میں وہ بدایوں پہنچا اور اس علاقے کی آب ہوا اسے بہت پسند آئی۔ اس دوران میں علاؤالدین شاہ اور اس کے وزیر حمید خاں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اور بادشاہ نے وزیر کو مروانا چاہا

لیکن وہ دہلی بھاگ گیا اور اُمراء کی سازش سے بہلول لودھی کو دہلی پر قابض کروا دیا۔ بہلول لودھی اب بھی سید علاؤالدین شاہ کی وفاداری کا دم بھرتا تھا۔ لیکن سلطان اپنی مرضی سے تخت سے دست بردار ہو گیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ نئے سلطان بہلول لودھی نے بدایوں کا علاقہ سابق سلطان سید علاؤالدین شاہ کو بطور جاگیر عطا کیا۔ سید علاؤالدین ۱۴۵۱ء میں تخت سے دست بردار ہوا۔ بعد ازاں وہ یادِ الٰہی میں مصروف رہا۔ اور ۱۴۷۸ء میں وفات پائی۔

لودھی سلاطین

بہلول لودھی۔ سید حکمران علاؤالدین شاہ نے ۱۴۵۱ء میں جب بادشاہت ترک کر کے درویشی اختیار کی تو پنجاب کا گورنر بہلول لودھی تخت نشین ہوا اور لودھی خاندان کی بنا ڈالی۔ بہلول لودھی کو اُس کے چچا اسلام خان نے پالا تھا۔ جو سرہند کا جاگیردار تھا۔ اپنی شجاعت کی بنا پر وہ پنجاب کا گورنر بنا اور پھر دہلی پر قابض ہو کر بادشاہ بنا۔ بہلول لودھی کئی سال جنگ و جدل میں مصروف رہا اور اس نے سلطنت دہلی کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ دہلی کے سرداروں کو مطیع کرنے کے بعد اس نے دوآبہ کی شورشوں کا خاتمہ کیا اور دہلی سلطنت کے وقار کو بحال کیا۔ وہ دُور اندیش اور سیاستدان تھا۔ چھبیس سال کی متواتر کوشش سے اُس نے جونپور کی شرقی سلطنت کا خاتمہ کر کے سلطنت دہلی سے الحاق کر لیا۔ لیکن اُس نے دکن اور بنگال کو فتح کرنے کی بالکل کوشش نہ کی۔ یہ اُس کی دانائی تھی۔ اس نے وسط ہند کے راجاؤں مثلاً گوالیار، کالپی اور دھولپور کو مسخر کر کے اپنا باجگذار بنا لیا۔

بہلول لودھی آخری دور کے سلاطین میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اگر وہ عمدہ سیاست دان نہ ہوتا تو دہلی سلطنت جلدی ہی فنا ہو جاتی۔ وہ انصاف پسند اور سادہ مزاج تھا۔ ہندوؤں سے رواداری کا سلوک کرتا تھا اور لیاقت کے مطابق ان کو سرکاری ملازمت بھی عطا کرتا تھا۔ اس نے افغانوں کو منظم کیا۔ ان کو سرحدی علاقوں سے بلوا کر ہندوستان کے مختلف حصوں میں آباد کیا۔ برادری کی بری رسموں کو ختم کیا اور تمام افغانوں کو مالا مال کر دیا۔ پنجاب اور بہار میں خاص طور پر لودھی افغانوں کی بستیاں قائم کیں۔ پنجاب میں سلطان پور لودھیاں خاص طور پر مشہور بستی تھی جو اب ریاست کپورتھلہ میں شامل ہے۔ پاکستان بننے پر اس بستی سے مسلمانوں کا بالکل صفایا ہو گیا۔

سکندر لودھی۔ بہلول لودھی کی وفات پر ۱۴۸۹ء میں اُس کا سب سے چھوٹا لڑکا نظام خان تخت نشین ہوا اور سکندر لودھی کا لقب اختیار کیا۔ سکندر لودھی نے ۱۵۱۷ء تک حکومت کی۔ وہ لودھی خاندان کا سب سے زبردست اور مشہور ترین سلطان ہو گذرا ہے۔

سلطان کا کردار۔ سکندر لودھی سنجیدہ مزاج۔ علم پرور متقی اور پرہیز گار سلطان تھا۔ نہایت خوبرو تھا۔ لیکن عیش و نشاط سے نفرت کرتا تھا۔ شکار کا شوقین۔ چوگان کا ماہر۔ مذہب کا شیدائی اور علماء کی صحبت کا دلدادہ تھا۔ سکندر لودھی عدل و انصاف کا پتلا تھا۔ وہ رعایا کی شکایات بذاتِ خود سنتا تھا۔ علوم و فنون کی سرپرستی کے علاوہ علاوہ علماء کی صحبت سے خوش ہوتا تھا۔ اور امورِ سلطنت میں اُن سے صلاح و مشورہ لیتا تھا۔

بے بنیاد الزام۔ ہندو مؤرخین نے سکندر لودھی کو متعصب اور ظالم گردانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مسلمان علماء کے کہنے پر اُس نے اپنی سلطنت سے

بُت پرستی کو فنا کرنے کا تہیہ کر لیا متھرا کے مندر کو مسمار کر دیا۔ اور ہندوؤں کی مذہبی رسُوم پر پابندیاں عاید کر دیں۔ چنانچہ ہندو سردار ڈاڑھی بھی نہ منڈوا سکتے تھے۔ یہ الزامات بے بنیاد ہیں۔ سکندر لودھی شریعت اسلامی کا پابند ضرور تھا۔ لیکن وہ ہندوؤں پر ظلم نہ کرتا تھا۔ مولویوں کا حکومت میں عمل دخل زیادہ تھا۔ لیکن سکندر لودھی ایک روشن خیال حکمران تھا اور کبھی بھی حدِ اعتدال سے نہ بڑھتا تھا۔ اور ملکی معاملات سے اچھی طرح سے باخبر رہتا تھا۔ اُس نے وفادار ہندوؤں کو جاگیریں بھی عطا کیں لہذا اس پر مذہبی تعصب کا الزام لگانا سراسر نا انصافی ہے۔

اصلاحات۔ سکندر لودھی نے اُمراء پر سختی کی اور مرکزی حکومت کو مضبوط کیا۔ صوبائی گورنر اُس کی معمولی حکم عدولی کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اُسنے منڈیوں کی نگہداشت کر کے مختلف اشیاء کو سستا کر دیا غلے سے محصول ہٹا دیا۔ اور زراعت کو خوب ترقی دی سڑکیں تعمیر کرائیں۔ اور پولیس و ڈاک کا باقاعدہ انتظام کیا۔ تیز رفتار گھوڑوں کے ذریعے روزانہ ڈاک بھیجی جاتی تھی ہر چوکی پر ڈاک لے جانے کے لئے تازہ دم گھوڑے موجود رہتے تھے ملک بھر میں جاسوسوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اور بادشاہ کو ہر بات کی اطلاع پہنچ جاتی تھی۔ ان اصلاحات سے ملک میں امن و امان قائم کرنے میں آسانی ہو گئی اور حکومت کا وقار بڑھ گیا۔

امراء اور جاگیرداروں پر سختی سکندر لودھی نے جاگیرداروں کے حساب کی باقاعدہ پڑتال کی اور سرکاری روپیہ خُرد بُرد کرنے والے اُمراء اور جاگیرداروں کو سخت سزائیں دیں۔ اُس نے حکم دیا کہ سرکاری آمدنی کے حساب کیلئے

باقاعدہ رجسٹر رکھے جائیں۔ اُس نے آہستہ آہستہ جاگیرداروں کی طاقت کو کچل ڈالا اور ان کی آزادی سلب کر دی۔ باغی جاگیرداروں نے سکندر لودھی کے خلاف سازش کی اور سکندر کا خاتمہ کر کے اسکے بھائی فتح خاں کو تخت پر بٹھانا چاہا لیکن فتح خاں نے خود ہی سازش سے بھائی کو مطلع کیا۔ اور سکندر نے ان اُمراء اور جاگیرداروں کو سخت سزائیں دیں۔ اس کے عہدِ حکومت کے ابتداء میں بعض امراء نے اس کے بھائی باربک کو اکسایا وہ جونپور کا گورنر تھا۔ اس نے امراء کے اکسانے پر اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ سکندر لودھی نے اُسے شکست دے کر جونپور کو مرکزی حکومت کی تحویل میں لے لیا۔ لیکن اپنے بھائی کو معاف کر دیا۔

وسعتِ سلطنت:۔ سکندر لودھی فنونِ حرب میں ماہر تھا۔ لہذا ملک میں امن قائم کرنے کے بعد اور جاگیرداروں کی طاقت کچلنے کے بعد اس نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ اس کی فتوحات کافی شاندار ہیں اس نے اٹاوہ۔ دھولپور اور گوالیار کو فتح کیا اور رنتھمبور کو بھی باجگذاری پر مجبور کیا۔ اس کی سلطنت کی سرحدیں بندھیلکھنڈ تک جا ملیں۔ پس سکندر لودھی سلاطین دہلی کے آخری دور کا بہترین اور نادر سلطان ہو گذرا ہے۔ سکندر لودھی نے بنگال پر بھی حملہ کیا۔ لیکن بنگال کے سلطان علاؤالدین نے صلح کر لی اور وعدہ کیا کہ سلطنت دہلی کے باغیوں کو پناہ نہ دی جائے گی۔ اور سکندر لودھی کی سرحدوں کا احترام کیا جائے گا۔

پایۂ تخت کی تبدیلی:۔ سکندر لودھی نے ۱۵۰۴ء میں شہر آگرہ کو آباد کیا لیکن اگلے سال ایک خوفناک زلزلے کی بدولت یہ

پڑا۔ دلی شہر برباد ہو گیا۔ ملک کی تاریخ میں ایسا خوفناک زلزلہ کبھی نہ آیا تھا۔ لیکن شاہجہاں کی طرح سکندر لودھی کو بھی آگرہ کا شہر دل پسند تھا۔ لہذا اس نے اس شہر کو دوبارہ بسایا۔ سکندر نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنا دیا۔ اور یہاں کئی ایک شاندار محل اور عمارتیں تعمیر کرائیں فوجی نقطہ نظر سے بھی آگرہ کی اہمیت کافی تھی۔ اس شہر سے راجپوتانہ اور یو۔پی پر کڑی نگرانی ہو سکتی تھی۔

علوم و فنون کی سرپرستی۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کہ سکندر لودھی علوم و فنون کا سرپرست تھا اور اہل علم کی صحبت میں بیٹھنے کا شوقین تھا۔ اس کے دربار میں اکثر علمی مباحثے رہتے تھے۔ اہل علم کے لئے اس نے وظیفے مقرر کئے ہوئے تھے۔ اس نے سنسکرت کی کئی ایک کتابوں کے تراجم کرائے۔ ہندوؤں نے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے بڑے شوق سے فارسی پڑھنا شروع کیا۔ سکندر لودھی کو علم طب کا خاص شوق تھا۔ اس نے مختلف علاقوں سے طبیب جمع کئے اور اپنی سرپرستی میں علم طب پر تحقیق کروائی۔ یونانی طب اور ویدک طریقہ علاج کے امتزاج سے ایک نیا طریقہ علاج اختراع کیا گیا۔ اور علم طب پر ایک مستند کتاب لکھی گئی۔ جسے طب سکندری کہتے ہیں۔ سکندر لودھی کو فن موسیقی سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ بادشاہ خوش اخلاق تھا اور اہل علم سے فیاضانہ سلوک کرتا تھا۔ اس نے علماء کو جاگیریں بھی عطا کیں۔

اس نیک دل سلطان نے ۱۵۱۷ء میں وفات پائی۔ وہ لودھی خاندان کا سب سے اہم بادشاہ تھا۔ اس کی بدولت سلطنت دہلی کچھ عرصہ کے لئے زوال پذیر ہونے سے بچ گئی۔

ابراہیم لودھی:- سکندر لودھی کے بعد ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا۔ وہ لودھی خاندان کا آخری سلطان تھا شہنشاہ بابر نے ۱۵۲۶ء میں اُسے پانی پت کے میدان میں شکست دے کر دہلی کا تخت اس سے چھین لیا۔

ابراہیم لودھی تند مزاج ۔ ضدی اور مغرور نوجوان تھا۔ وہ امراء کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اور ان کی تذلیل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ امراء اور بادشاہ کے تعلقات از حد خراب ہو گئے ۔ امراء بادشاہ کی بد سلوکی کی شکایت کرتے تھے۔ ابراہیم ہر امیر کو غدار اور سازشی سمجھتا تھا۔ افغان جاگیرداروں نے ابراہیم کے خلاف بار بار بغاوتیں کیں لیکن منہ کی کھائی ۱۵۱۷ء میں ابراہیم لودھی کی تخت نشینی پر چند امراء نے یہ تجویز پیش کی کہ سلطنت کے دو حصے کر دئے جائیں اور جونپور میں شہزادہ جلال کو خود مختار حکمران تسلیم کر لیا جائے ۔ سلطنت کے بہی خواہوں نے تقسیم ملک کی مخالفت کی اور ابراہیم کو تمام سلطنت کا بادشاہ تسلیم کیا ۔ لیکن شہزادہ جلال نے ناکام بغاوت کے بعد کالپی کی جاگیر بھی گنوائی ۔ اعظم ہمایوں نے اپنے بھائی شہزادہ جلال کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور ابراہیم لودھی کی اطاعت قبول کر لی ۔ شہزادہ جلال گوالیار میں پناہ گزین ہؤا۔ جب ابراہیم نے گوالیار پر حملہ کیا تو وہ بھاگ کر مالوہ کے سلطان محمود خلجی کے پاس پہنچا۔ لیکن وہاں اسے پناہ نہ ملی ۔ آخر کار بھاگ کر وسط ہند جا پہنچا۔ لیکن مقامی زمینداروں نے اُسے گرفتار کر کے ابراہیم لودھی کے حوالہ کر دیا ۔ جس نے اسے مروا ڈالا۔

مزید بغاوتیں:- شہزادہ جلال کے بعد بہار کے گورنر اسلام خان نے بغاوت کی لیکن ابراہیم کے ہاتھوں شکست کھا کر میدان جنگ میں کام آیا۔ اس فتح کے بعد ابراہیم لودھی از حد شکی مزاج ہو گیا۔ اور

اس نے کئی ایک امراء کو سازش کے محض شک کی بنا پر قتل کروا ڈالا۔
اس بے جا سختی کی بدولت امراء اس کے خلاف نالاں تھے۔ ابراہیم لودھی
کا سگا چچا بھی اس سے ناراض ہو کر ہندوستان سے بھاگ گیا۔ اور کابل
میں پناہ گزین ہوا۔ صوبہ بہار میں دریا خان لودھی نے
بغاوت کی اور اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ابراہیم کو اس بغاوت کے
فرو کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ ان دنوں پنجاب کا صوبیدار دولت خاں
لودھی تھا۔ اسے ابراہیم لودھی پر اعتماد نہ تھا۔ ایک بار ابراہیم نے اُسے
دہلی طلب کیا تھا۔ لیکن دولت خان کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ لہذا وہ ٹال
مٹول کر گیا۔ اپنی بجائے اپنے لڑکے دلاور خان کو دہلی بھیجا اور ساتھ ہی
گھبراہٹ میں کابل کے مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی
دعوت دی۔ بابر پہلے ہی موقع کا منتظر تھا۔ فوراً فوج لے کر ہندوستان پر
حملہ آور ہوا۔ اور دولت خان کی مدد کی بنا پر بلا روک ٹوک پانی پت کے
میدان تک آپہنچا۔ ابراہیم یہاں لشکر جرار کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی
فوج بابر سے کئی گنا زیادہ تھی۔ جنگی ہاتھی بھی موجود تھے۔ لیکن وہ نہ تو رعایا کو
خوش کر سکتا تھا۔ اور نہ امراء کو۔ بابر کی فوج صرف بارہ ہزار تھی۔ لیکن
اس کا طریق جنگ بہتر تھا۔ اس کے سپاہی جان نثار تھے۔ اور بابر کی
جوشیلی تقریر کی بدولت وہ اور بھی جوش و خروش سے لڑے۔ نصف دن
کی لڑائی کے بعد بابر کو فتح ہوئی۔ ابراہیم لودھی جنگ میں مارا گیا۔ بابر کے
توپ خانے کی بدولت فتح میں آسانی ہوئی۔ ہاتھیوں کا سدِ باب کرنے کے
لیے بابر نے خار دار جنگلے لگوائے ہوئے تھے۔ اور مغل تیراندازوں
نے بھی کارہائے نمایاں دکھائے۔ پانی پت کی جنگ ہند و پاکستان کی

تاریخ میں فیصلہ کن ہے۔ اس کی بدولت سلاطین دہلی کا دور ختم ہوا۔ اور بابر نے برصغیر میں مغل خاندان کی بنیاد رکھی۔ ابراہیم کی لاش کو بابر نے نہایت عزت سے پانی پت کے میدان جنگ کے قریب ہی دفن کرا دیا۔

Typical Questions

Q. 1. Give a brief acconnt of the condition of India under the Sayyid dynasty.

Q. 2. Estimate the importance of the reign of Sikandar Lodhi.

Q. 3. Write a brief account of the reign of Sikandar Lodhi.

Q. 4, What was the nature of Lodhi Empire ? Discuss the circumstances which led to its establishment and downfall.

امتحانی سوالات

۱۔ سادات خاندان کے حکمرانوں کے دور میں ہندوستان کی حالت بیان کیجیے۔

۲۔ سکندر لودھی کے عہد حکومت کی اہمیت واضح کیجیے۔

۳۔ سلطان سکندر لودھی کے عہد حکومت کا مختصر حال بیان کیجیے۔

۴۔ لودھی سلطنت کی نوعیت کیا تھی؟ لودھی خاندان کے عروج و زوال کے اسباب قلمبند کیجیے۔

چھبیسواں باب

سلاطین دہلی کا دور اور اُس کے مختلف پہلو

سلطان قطب الدین ایبک 1206ء سے لے کر بابر کی تخت نشینی یعنی 1526ء تک جس قدر مسلمان حکمران دہلی کے تخت پر بیٹھے ان کو سلاطین دہلی کہتے ہیں۔ مغلیہ حکمران اگرچہ دہلی پر آخر تک قابض رہے لیکن ان کو قرون وسطیٰ کے سلاطین سے الگ رکھا جاتا ہے۔ اور خاندان غلاماں سے لے کر لودھی حکمرانوں تک تمام دور کو دہلی سلطنت کا زمانہ گنا جاتا ہے۔ 1526ء سے مغلیہ دور شروع ہوتا ہے۔ ان تین صدیوں میں مسلمان بادشاہوں کی سلطنت کی حدود بیش و کم ہوتی رہیں۔ لیکن دہلی اور اس کے گرد و نواح پر ہمیشہ ان کا قبضہ رہا۔ اس لحاظ سے بھی ان کو سلاطین دہلی کہنا مناسب و موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس دَور میں برصغیر کے عام حالات اس باب میں مختلف عنوانوں کے ماتحت بیان کیئے جائیں گے۔

دہلی سلطنت کا طرز حکومت:۔ سلاطین دہلی مکمل طور پر خود مختار اور مطلق العنان شہنشاہ تھے۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ بادشاہ طاقت کا سرچشمہ تھا۔ اور جب کبھی وہ کسی کو گردن زدنی قرار دیتا۔ تو ملک بھر میں کوئی طاقت یا عدالت اسے بچا نہ سکتی تھی۔ سلاطین دہلی اکثر شرعی قوانین کی پابندی کرتے تھے۔ لیکن اگر کبھی بادشاہ غصے میں آکر کسی کا سر قلم کروا دیتا۔ یا ہاتھی کے پاؤں تلے روندے جانے کا حکم بھی دیتا تو قاضی القضاۃ

بھی بے بس ہوتا۔ موجودہ دور میں جمہوریہ اسلامیہ میں خواہ صوبائی گورنر اور صدر مملکت دونوں مل کر کسی شخص کے قتل کا حکم صادر کر دیں۔ تو وہ ملکی قانون اور آئین کے خلاف ہوگا۔ اور ہائی کورٹ کے حکم سے کالعدم قرار دے دیا جائے۔ لیکن اس زمانے میں شخصی حکومت تھی۔ اور بادشاہت کی بنا جبر و استبداد پر تھی۔ بادشاہ ہمیشہ مطلق العنان تھا۔ اور من مانی کارروائیاں کر سکتا تھا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ سلاطین دہلی میں سے بہت کم حکمران ظالم یا بے رحم تھے۔ ان کے زمانے میں سکھا شاہی کا نام نہ تھا۔ سلاطین دہلی کی بہت بڑی اکثریت ایسے بادشاہوں کی تھی جو عدل و انصاف کے پتلے تھے۔ اور شریعت اسلامی کی پابندی کرتے تھے خلفائے عباسیہ کی طرز کا عدالتی نظام برصغیر میں رائج کیا ہوا تھا۔ اور عوام کے اخلاق کی نگہداشت کے لئے ہر شہر میں کوتوال بھی مقرر کئے ہوئے تھے۔ شاذ و نادر ہی سلاطین دہلی نے غصے میں آکر کسی بیگناہ کو قتل کروایا ہو۔ اس کے برعکس کئی سلاطین قاضی کی عدالت میں معمولی آدمیوں کی طرح حاضر ہو کر جواب دہی کے لئے تیار رہتے تھے۔

سلاطین دہلی کسی غیر ملکی حکمران کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم نہ کرتے تھے کیونکہ وہ بالکل خود مختار تھے۔ لیکن عوام کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے وہ خلیفہ بغداد کو دنیائے اسلام کا امیر اور خلیفہ رسولؐ گنتے تھے۔

مسجدوں میں خلیفہ بغداد کا نام خطبے میں شامل کیا جاتا تھا۔ یہ چیز برائے نام اور رسمی تھی۔ بغداد کے خلفاء اپنے ملک میں بے بسی کی

حالت میں تھے۔ دہلی کے بعض سلاطین نے خلیفۂ بغداد سے خطابات اور خلعتیں حاصل کیں۔ کسی ایک نے اپنی بادشاہت بھی تسلیم کروائی اس سے خلیفۂ بغداد کو کچھ بھی فائدہ یا نقصان نہ ہوتا تھا۔ لیکن سلاطینِ دہلی کی مسلمان رعایا خوش ہو جاتی تھی۔ اور اس سلطان کے خلاف بغاوت کرنا مسلمان عوام حرام سمجھتے تھے۔ گویا خلیفۂ بغداد محض آئینی اور روحانی پیشوا تھا۔ اصلی اقتدار (Defacto Kingship) سلاطین دہلی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ خلیفۂ بغداد کی منظوری دہلی کے سلطان کو مسلم عوام میں ہردلعزیز اور مقبول بنانے کا باعث ہوتی تھی۔ بعض سلاطین سکّوں پر بھی خلیفہ بغداد کا نام محض رسمی طور پر لکھ دیتے تھے۔

صرف علاؤالدین خلجی کے زمانے میں شریعت اور سیاستِ ملکی کو الگ الگ سمجھا گیا ورنہ سلاطینِ دہلی ہمیشہ شرع اسلامی کی پابندی کرتے تھے۔ اُن کی حکومت خلافت راشدہ کا نمونہ نہ تھی کیونکہ سلطان اپنے تاج و تخت کو محفوظ کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتا تھا۔ ناصرالدین محمود کے سوا دہلی کے ہر سلطان نے شاہی خزانے کو ذاتی ملکیت سمجھا اور اپنی مرضی کے مطابق اُسے خرچ کیا۔

سلاطین دہلی فوجی طاقت کے بل بوتے پر ملک پر حکومت کرتے تھے امراء اور جاگیرداروں کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ طاقت ور سلاطین نے جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا۔ اور مرکزی حکومت کو ازحد مضبوط کیا چنانچہ بلبن۔ علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق کے زمانے میں شاہی اقتدار بہت بلند تھا۔ اور جاگیردار بے بس ہو چکے تھے لیکن فیروز تغلق

نے جاگیرداری کا نظام پھر بحال کر دیا۔ سید اور لودھی سلاطین کے زمانے میں ملک بالکل فیوڈل طرز کی حکومت میں بٹ گیا۔ مختلف جاگیردار اپنی اپنی جگہ پر تمام اختیارات کے مالک تھے۔ اور سلطان کی حیثیت ایک اعلیٰ جاگیردار کی مانند تھی۔ یہ امر سلطنتِ دہلی کی کمزوری کا باعث ہوا۔

سلاطین دہلی امراء کے اثر و رسوخ اور فوجی غلبے کی بدولت تخت حاصل کرتے تھے۔ تخت نشینی کے لئے کوئی واضح قانون نہ تھا۔ کسی سلطان کے نااہل بیٹوں کے لئے تخت نشین ہو کر کامیابی سے حکومت چلانا ناممکن تھا۔ ان حالات میں عام طور پر کوئی طاقتور وزیر تخت پر قبضہ جما لیتا تھا۔

سلاطین دہلی کے دَور میں غلام رکھنے کا رواج عام تھا۔ ترکی غلاموں کو خاص طور پر پسند کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ یہ لوگ بہادر اور شجاع ہوتے تھے۔ غلاموں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ اور شاہی دربار میں عمدہ غلام بہت بڑی قیمت پاتے تھے۔ غلام کو ہر ادنیٰ کام پر لگایا جاتا تھا۔ لیکن لیاقت کے مطابق اسے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر بھی فائز کیا جاتا تھا۔ کسی غلام کو اعلےٰ عہدہ عطا کرنے سے پہلے بادشاہ اُسے آزاد کر دیتا تھا۔ ترقی کرتے کرتے ایک معمولی غلام امراء کی صف میں شامل ہو جاتا تھا۔ خاندانِ غلاماں کے تمام سلاطین ابتدا میں معمولی غلام تھے۔ ترقی کرتے کرتے انہوں نے بادشاہت حاصل کی۔ پس بادشاہت کے لئے لیاقت اور فوجی طاقت اصلی معیار تھا۔ عام طور پر بادشاہت کا سلسلہ ایک ہی خاندان میں چلتا تھا۔ لیکن جب کوئی نالائق بادشاہ تخت نشین ہوتا۔ دربار میں سازشیں شروع

ہو جائیں اور کوئی نہ کوئی وزیر یا سپہ سالار ایسے سلطان کو معزول کر کے خود تخت پر قابض ہو جاتا۔

نائب سلطنت اور حکومت کے شعبے:۔ انتظام ملک کے لئے صوبوں کی تقسیم تھی اور صوبائی گورنر آزمودہ کار شخص ہوتا تھا۔ جسے بادشاہ اپنی مرضی سے مقرر کرتا تھا۔ مرکزی حکومت کے کئی ایک شعبے ہوتے تھے۔ اہم شعبے چھ عدد تھے۔ یہ شعبے مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) دیوانِ وزارت جس کا نگران وزیر یا وزیر اعظم کہلاتا تھا۔ دوسرے شعبوں کے نگران افسروں کو وزیر نہیں کہا جاتا تھا۔ یعنی سلطنت میں ایک ہی شخص وزیر کہلاتا تھا۔

(2) دیوانِ رسالت۔

(3) دیوان قضا۔

یہ دونوں محکمے اگرچہ الگ الگ تھے۔ لیکن ایک ہی شخص ان محکموں کا نگران تھا۔ اسے صدر الصدور یا صدرِ جہاں کہتے تھے۔

(4) دیوانِ عرض:۔ اس محکمے کا انچارج عارض ممالک کہلاتا تھا اور فوج کی دیکھ بھال اور انتظام اس کے سپرد تھا۔

(5) دیوانِ انشاء یعنی شاہی خط و کتابت کا محکمہ۔ اس کا نگران دبیر خاص ہوتا تھا۔ جو موجودہ دور کے چیف سیکرٹری کے برابر ہے۔

(6) دیوان برید:۔ اس محکمے کا نگران ملکی اطلاعات بادشاہ کو پہنچاتا تھا اور برید ممالک کہلاتا تھا۔

بعض اوقات سلطان اپنے وزیر کو نائب سلطنت بنا دیتا تھا۔ لیکن اکثر سلاطین محض وزیر کے تقرر پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ناصر الدین محمود

اور علاؤالدین خلجی نے اپنے دور میں نائب السلطنت مقرر کئے۔ بلبن وزیر بھی تھا۔ اور نائب السلطنت بھی۔ علاؤالدین خلجی نے اپنے مصاحب خاص ملک کافور کو نائب السلطنت بنایا۔ اگر بادشاہ خورد سال ہوتا تو نائب سلطنت کا تقرر لازم ہوتا تھا۔ جب کبھی سلطان پایہ تخت سے غیر حاضر ہوتا یا کسی دور دراز علاقے کی تسخیر میں مشغول ہوتا تو اس کی غیر حاضری کے دوران میں اس کا نائب حکومت چلاتا تھا۔ اُسے نائب غیبت کہتے تھے۔

سطور ذیل میں مرکزی حکومت کے مختلف شعبوں کا مختصر حال بیان کیا جائے گا۔ تاکہ نظام حکومت سمجھنے میں آسانی ہو۔

دیوان وزارت:۔ یہ محکمہ اس قدر اہم تھا۔ کہ وزیر اس کا نگران اعلیٰ ہوتا تھا۔ وزیر بادشاہ کا مصاحب خاص ہوتا تھا۔ اور سلطنت کے تمام کاموں میں اُسے صلاح و مشورہ دیتا تھا۔ سلطنت کے ہر کام میں وزیر دخل دے سکتا تھا۔ اور پورے نظام حکومت پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ صوبائی گورنروں کے لئے وزیر کے احکام کی پابندی لازم تھی۔ وزیر اپنے اختیارات سے ملک کے ہر افسر کی معزولی یا تبادلے کا حکم دے سکتا تھا۔ سلطان کی جانب سے خاص حکم پہنچ جانے پر وزیر کے صادر کئے ہوئے احکام منسوخ سمجھے جاتے تھے۔ پس سلطنت میں بادشاہ کے بعد وزیر کے اختیارات سب سے زیادہ ہوتے تھے اور سیاسی انتشار کے دور میں اس کے لئے بادشاہ بن جانا آسان امر ہوتا تھا

وزیر کا عہدہ کافی مشکل تھا۔ کیوں کہ امراء اس کے رقیب بن

جاتے تھے۔ اور ان کا قابو میں رکھنا لازمی ہوتا تھا۔ دوسری جانب اس کے لیئے موقع شناس ہونا لازمی تھا۔ کیونکہ سلطان کو خوش رکھنا نہایت ضروری تھا۔ پس سلاطین دہلی کے وزراء نہایت قابل۔ مدبر۔ اعلیٰ منتظم۔ عمدہ جرنیل اور ادبی ذوق رکھنے والے ہوتے تھے۔

دیوانِ وزارت کا اہم ترین فرض یہ تھا۔ کہ حکومت کی آمدنی اور اخراجات کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا جائے۔ یہ محکمہ اتنا بڑا تھا۔ کہ ایک نائب وزیر کا تقرر بھی کیا جاتا تھا۔ دیوان وزارت کا شعبہ تین حصوں میں منقسم تھا۔ آمدنی کے حسابات کے افسر اعلیٰ کو مشرف کہتے تھے۔ اخراجات کی نگرانی کے لیئے الگ افسر تھا جسے مستوفی کہتے تھے۔ حسابات کی آڈٹ بھی اسی محکمے کے سپرد تھی۔ آمد و خرچ کے علیحدہ علیحدہ رجسٹر باقاعدہ طور پر رکھے جاتے تھے۔ دیوان وزارت کے ماتحت پولیس کا ایک خاص شعبہ بھی تھا۔ جس کے افسر اعلیٰ کو شحنہ کہتے تھے۔ اگر کوئی شخص حکومت کو ادائیگی کرنے میں غفلت برتتا تو یہ پولیس اسے مجرموں کی مانند گرفتار کر لیتی تھی حکومت کی آمدنی کے اہم ذرائع مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) مالیہ یا زمین کا لگان:۔ زرعی زمینوں کا مالیہ حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ مسلمان کاشت کاروں سے بعض اوقات زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ اسے عشر کہتے تھے۔ غیر مسلموں سے زمین کے لگان کی شرح زیادہ تھی۔ اکثر اوقات کل پیداوار کا 20 فی صدی وصول کیا جاتا تھا۔ خراج کی شرح زمین کی زرخیزی اور پیداوار کے مطابق بدلتی رہتی تھی

بعض زمینیں اتنی اعلیٰ تھیں کہ ان کو خراجی قرار دیا گیا۔ ان زمینوں کو اگر مسلمان خرید بھی لیں تو بھی خراج کی شرح سے مالیہ وصول کیا جاتا تھا۔ مالیہ وصول کرنے کا کام ہندوؤں کے سپرد تھا۔ یہ لوگ گاؤں کے چوہدری یا مقدم ہوتے تھے۔ علاؤالدین خلجی نے ان لوگوں سے یہ کام چھین لیا۔ لیکن فیروز شاہ تغلق نے پرانا طریقہ رائج کیا سلاطین دہلی کے مالیات کا طریقہ وہی تھا۔ جو محمد بن قاسم نے فتح سندھ کے بعد رائج کیا تھا۔ اور عربوں سے بالکل مشابہہ تھا۔

(۲) عشور:۔ تجارتی مال پر در آمد کے موقعہ پر ٹیکس عائد کیا جاتا تھا۔ جسے عشور کہتے تھے۔ اسے محصولِ در آمد بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی شرح مال کی قیمت کے مطابق بیس پچیس فی صدی ہوتی تھی۔

(۳) جزیہ:۔ غیر مسلم رعایا سے اسلامی اصول کے مطابق جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔ نادار لوگ۔ اپاہج بچے۔ عورتیں اور برہمن اس ٹیکس سے مستثنےٰ تھے۔ اس ٹیکس کی شرح بالکل معمولی تھی۔ اگر کوئی غیر مسلم فوج میں بھرتی ہو جاتا تو اس سے جزیہ وصول نہ کیا جاتا تھا۔ جزیہ کی ادائیگی کے بعد غیر مسلم رعایا کی جان و مال کی حفاظت حکومت کا فرض تھا۔ جزیہ آمدنی کے مطابق ایک دینار فی کس سے لے کر چار دینار فی کس کے حساب سے لیا جاتا تھا۔

(۴) زکواۃ:۔ مسلمانوں سے اسلامی شرع کے مقرر کردہ نصاب کے مطابق زکواۃ وصول کی جاتی تھی۔ شاہی خزانے میں زکواۃ کی آمدنی کا حساب کتاب الگ رکھا جاتا تھا۔ اور اس روپے سے غریبوں اور یتیموں کی مدد کی جاتی تھی۔ یا اسے رفاہِ عام کے کاموں

پر خرچ کیا جاتا تھا۔

(5) دیگر ٹیکس:۔ سلاطین دہلی نے چند دوسرے ٹیکس بھی وقتاً فوقتاً عائد کئے۔ مثلاً دکانوں اور مکانات پر ٹیکس۔ مویشیوں کو چرانے پر ٹیکس۔ یہ ٹیکس از عہد قدیم تھے۔ اور ہندوؤں کے زمانہ اقتدار سے چلے آتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے پہلی بار ان تمام ٹیکسوں کو منسوخ کیا۔ اس کے زمانے میں وہی ٹیکس وصول کئے جاتے تھے۔ جو شرع اسلام کے عین مطابق ہوتے تھے۔

(6) مالِ غنیمت اور تحائف:۔ مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ شاہی خزانے میں داخل ہوتا تھا۔ باجگذار ممالک سے خراج کے علاوہ تحائف بھی آتے تھے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں یہ دستور تھا۔ کہ سلطان کے دربار میں حاضر ہونے والا ہر شخص اپنی بساط کے مطابق تحائف اور نذرانے پیش کرتا تھا۔ اس سے حکومت کو معقول آمدنی ہوتی تھی۔

(7) مختلف ذرائع آمدنی:۔ حکومت کو بعض اوقات مختلف ذرائع سے بھی آمدنی ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص لاوارث فوت ہو جاتا۔ تو اس کی ساری جائداد پر حکومت کا قبضہ ہو جاتا۔ اگر کسی جگہ سے مدفون خزانہ ملتا یا کان دریافت ہو جاتی تو شرعی قانون کے مطابق حکومت اس کے پانچویں حصے کی حقدار ہوتی۔

دیوانِ انشاء:۔ یہ محکمہ گویا شاہی منشی خانہ یا سول سیکرٹریٹ کا کام دیتا تھا۔ سب سے اعلیٰ افسر دبیر خاص کہلاتا تھا۔ دبیر سیکرٹری یا منشی کو کہتے ہیں بادشاہ اپنے فرمان یا حکم کا مضمون کسی دبیر کو سمجھا دیتا تھا۔ اور پھر محکمے کے لوگ خوب محنت کر کے مرصع و مسجع عبارت

لکھتے تھے۔ بادشاہ کا کاتب خاص" اسی محکمے کا ملازم ہوتا تھا۔ ہر سرکاری فرمان کی نقل رکھ لی جاتی تھی۔ اور صادر ہونے والے ہر فرمان پر شاہی مہر ثبت کی جاتی تھی۔ کسی جاگیردار یا صوبائی گورنر کی جانب صادر ہونے والے شاہی فرمان کو سنہری حروف میں لکھا جاتا تھا اور اُسے "فرمانِ طغرا" کہتے تھے۔ نئے تقرر یا نئی اصلاحات اور قوانین کو "فرمانِ توقیع" کہا جاتا تھا جنگ کے دنوں میں چند ایک دبیر فوج کے ہمراہ جاتے تھے۔ اور سب حالات لکھتے رہتے تھے۔ اس ریکارڈ کو "فتح نامہ" کہا جاتا تھا۔ دبیر خاص کا عہدہ نہایت اہم تھا ہر دبیر علم و ادب کا ماہر ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات وزیر سلطنت بن جاتا تھا۔

دیوانِ برید:۔ اس محکمہ کے فرائض میں خبر رسانی اور ڈاک جیسی اہم چیزیں شامل تھیں۔ جاسوسی نظام بھی اسی محکمے کے سپرد تھا اور اکثر سلاطین اس پر زور دیتے تھے۔ اس محکمے کا افسر برید ممالک کہلاتا تھا۔ وہ ہر روز سلطان کو ملک کے مختلف حصوں کی خبریں پہنچاتا تھا۔ اس محکمہ کے لوگ خفیہ پولیس کی مانند امراء کے پاس ملازم ہو جاتے تھے۔ اور ان کی سازشوں کا پتہ چلاتے تھے۔ اس محکمے میں مستورات بھی ملازم تھیں۔ بلبن نے ایک خبر رساں کو غفلت کی بنا پر پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں جاسوسی نظام اس قدر عمدہ تھا کہ بادشاہ کو یہ پتہ ہوتا تھا۔ کہ کسی امیر نے گزشتہ رات کو کیا کچھ کھایا پیا ہے۔ امراء ڈر کے مارے اپنی بیویوں سے بھی اشارہ و کنایہ میں بات کرتے تھے۔ کیوں کہ ان کی نوکرانیوں میں بھی

خبر رسان مخبر جن کا تعلق محکمۂ برید سے ہوتا تھا۔

دیوانِ قضا اور دیوانِ رسالت

یہ دونوں محکمے الگ الگ تھے۔ لیکن ایک ہی شخص ان کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ دیوان رسالت کی حیثیت سے اسے صدر الصدور یا صدر جہاں کہتے تھے اور دیوانِ قضا کا انچارج ہونے کی حیثیت سے وہی شخص قاضی القضاۃ کہلاتا تھا۔ بعض اوقات اسے قاضیٔ ممالک بھی کہتے تھے۔

دیوانِ رسالت کے انچارج کی حیثیت سے صدر الصدور مذہبی امور کی نگہداشت کرتا تھا۔ اوقاف کی نگرانی کے علاوہ یہ محکمہ علماء اور طالب علموں کو وظیفے عطا کرتا تھا، مسجدوں کے امام اور موذّن اسی محکمے سے وظیفے پاتے تھے۔ خیرات بھی یہی محکمہ بانٹتا تھا۔ اس زمانے میں یہ بھی دستور تھا۔ کہ اس محکمے کی جانب سے سیّدوں کو وظیفے ملتے تھے۔ شائد اسی لئے بعض لوگ جعلی سیّد بن گئے۔

صدر الصدور کا عہدہ خاص اہمیّت رکھتا تھا۔ صدر الصدور جیّد عالم ہوتا تھا۔ اور زہد و تقویٰ میں مشہور ہوتا تھا۔

دیوانِ قضا سے مراد عدالتی نظام تھا۔ انصاف کے اس محکمے کو دیوانِ شرع بھی کہتے تھے۔ ہر شہر میں قاضی کی عدالت ہوتی تھی۔ جہاں اسلامی شریعت کے مطابق فیصلے کئے جاتے تھے۔ بعض معاملات میں ہندوؤں کو اجازت تھی۔ کہ وہ اپنے مذہبی رواج کے مطابق مقامی پنچایت سے فیصلہ کروالیں۔ قاضی کا تقرر قاضی القضاۃ کی منظوری

سے یہی محکمہ کرتا تھا۔ البتہ قاضی القضاۃ کو بادشاہ مقرر کرتا تھا قاضی کی عدالت سے اپیل قاضی القضاۃ کے پاس آتی تھی قاضی القضاۃ کے فیصلے کے خلاف براہ راست سلطان کے دربار میں اپیل کی جاتی تھی۔ قاضی القضاۃ افسروں کے خلاف عوام کی شکایات بھی سنتا تھا۔

عدالتی فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کے لئے ایک اور افسر ہوتا تھا جسے امیرِ داد کہتے تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ سلاطین دہلی میں سے اکثر حکمران عدل و انصاف کے پتلے تھے۔ وہ بڑے سے بڑے افسر کو بھی سزا دینے سے باز نہ رہتے تھے۔

عسکری نظام یا دیوانِ عرض

فوجی ضروریات کے انتظام کے لئے ایک الگ محکمہ تھا اس شعبہ کے اعلیٰ افسر کو عارض ممالک کہتے تھے۔ اس کا فرض یہ تھا۔ کہ اپنے محکمے کی مدد سے سال بھر میں کم از کم ایک بار تمام ملکی فوج کا معائنہ کرے یہ محکمہ فوجی بھرتی کرتا تھا۔ سامانِ حرب کی جانچ پڑتال۔ تنخواہوں کا تعیّن اور اہتمام اسی محکمے کے سپرد تھا۔ فوجی مالیات کی نگرانی بھی اسی محکمہ کے سپرد تھی۔ جنگ کے دنوں میں لشکر کے لئے خوراک اور سامانِ حرب کی ترسیل یہی محکمہ کرتا تھا۔ ہر سال اس محکمے کے حسابات مکمل ہو کر دیوانِ وزارت کو بھیجے جاتے تھے۔ دیوانِ عرض میں ہر سپاہی اور اس کے گھوڑے کا تفصیلی حلیہ لکھا جاتا تھا۔ علاؤالدین خلجی نے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ بھی شروع کیا۔ فوج کی تربیت بھی عارض ممالک کے سپرد تھی۔ اس دور میں نائب عارضِ ممالک کا

عہدہ بھی ہوتا تھا۔

سلاطین دہلی کے دور میں فوج کے دستے اہم ناکوں پر مامور رہتے تھے۔ بلبن نے باقاعدہ فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور اہم مقامات پر قلعے تعمیر کرائے۔ ہر قلعے میں کافی فوج اور خوراک موجود رہتی تھی یہ تدابیر منگولوں کے سدباب کے لئے اختیار کی گئیں مقامی فوج اگر کسی بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام رہتی تھی۔ تو قریبی فوج چھاؤنی سے کمک پہنچ جاتی تھی۔ خاص حالات میں مرکز سے شاہی فوج بھی بھیج دی جاتی تھی۔ دہلی میں شاہی فوج یا (Standing Army) بہت بڑی تعداد میں تھی۔ کسی فوجی مہم کے لئے جرنیل کا تقرر بادشاہ کرتا تھا شاہی فوج کے علاوہ مقامی فوج بھی جنگ کے لئے بھیجی جاتی تھی۔ دہلی میں مقیم شاہی فوج کو حشمِ قلب کہتے تھے شاہی فوج میں ایک دستہ خصوصی بھی ہوتا تھا۔ جسے محافظ دستہ (Royal Body-guard) کہتے تھے۔ اس دستے میں آزمودہ کار فوجی ہوتے تھے۔ جن کی وردیاں نہایت شاندار ہوتی تھیں۔

بلبن کے زمانے سے سرحدوں کی حفاظت کے لئے ایک الگ افسر مقرر کیا گیا جس کا عہدہ سپہ سالار کے برابر تھا۔ اسے محافظِ سرحد۔ Wardew of Marches کہتے تھے۔ اس کا فرض یہ تھا۔ کہ منگولوں کو ملکی سرحد پار کرنے سے پہلے ہی روکا جائے۔ محافظ سرحد کے پاس نہایت عمدہ فوج ہوتی تھی مختلف فوجی چھاؤنیوں سے وہ مزید فوج بھی منگوا سکتا تھا۔ اگر محافظ سرحد کو شکست ہو جاتی تو منگولوں کو اس کے بعد بھی ہر قلعے پر جنگ کرنا پڑتی۔ اگر وہ لڑتے بھڑتے دہلی پہنچ بھی جاتے تو دہلی کی شاہی فوج ان کے مقابلے کے لئے

تیار ہوتی تھی محافظ سرحد بہترین جرنیل ہوتا تھا۔ وہ یا تو شاہی خاندان کا فرد ہوتا تھا۔ یا بادشاہ کو اس پر خاص اعتماد ہوتا تھا۔

سلاطین دہلی کے دور میں فوج کے تین حصے ہوتے تھے

(۱) پیادہ فوج (2) رسالہ یعنی گھوڑے سوار فوج (3) جنگی ہاتھی۔
فوج کا اہم ترین حصہ رسالہ تھا۔ فوج کے اس حصے میں دو اسپہ اور سہ اسپہ سپاہی بھی ہوتے تھے۔ یعنی وہ فوجی جن کے پاس اپنے خرچ سے دو یا تین گھوڑے ہوتے تھے جنگ کے دنوں میں یہ خالی گھوڑے فوج کے ساتھ ہوتے تھے۔ اور ضرورت کے وقت وہی فوجی ان کو استعمال کرتا تھا۔ عام سوار کے پاس صرف ایک ہی گھوڑا ہوتا تھا۔ بعض سپاہی ایسے بھی تھے۔ جن کے پاس اپنا گھوڑا نہ ہوتا تھا۔ لیکن بوقت ضرورت ان کو دیوانِ عرض کی جانب سے گھوڑا مہیا کیا جاتا تھا۔ ان فوجیوں کو مُرتّب کہتے تھے۔ سوار کے پاس تلوار اور خنجر کے علاوہ گرز۔ تیر کمان اور ڈھال بھی ہوتی تھی زرہ بکتر پہننے کا رواج عام تھا۔

سلاطین دہلی فوجی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے عمدہ نسل کے گھوڑے پالتے تھے۔ عربی نسل کے گھوڑوں کی مانگ بہت زیادہ تھی شاہی اصطبل میں صدہا گھوڑے موجود رہتے تھے۔ اصطبل کے نگران کو میر آخور کہتے تھے۔

پیادہ فوج کے سپاہی کو "پائک" کہتے تھے۔ وہ تیر کمان تلوار۔ خنجر۔ نیزہ اور ڈھال سے مسلح ہوتے تھے۔ ذرائع آمد و رفت کی دقت کی بدولت پیادہ فوج دور دراز مہموں میں پہنچنے سے قاصر

رہتی تھی۔

شاہی محافظ دستہ کے تمام فوجی پیادہ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ شاہی محل میں پہرہ دار بھی "پائک" ہی ہوا کرتے تھے۔

دشمن کی فوج کو روندنے کے لئے جنگی ہاتھی نہایت ہی کارآمد تھے۔ چنانچہ ہاتھیوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک الگ افسر ہوتا تھا جسے شحنۂ فیل کہتے تھے۔ ہاتھی کے ماتھے اور پہلوؤں پر لوہے کی پلیٹیں بندھی ہوتی تھیں۔ تاکہ ہاتھی دشمن کے وار سے محفوظ رہے بعض اوقات ہاتھی کی پیٹھ پر چار پانچ تیر انداز سپاہی بھی ہوتے تھے۔ مملکت میں بادشاہ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص ہاتھی نہ رکھ سکتا تھا۔

سلاطین دہلی کے زمانے میں آتش گیر مادہ کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ جنگ کا یہ طریقہ عربوں کی ایجاد تھی۔ ہندوؤں کے اکثر قلعوں کو مسلمانوں نے آتش باری سے فتح کیا۔ منجنیق یا قلعہ پر پتھر برسانے کی مشین بھی رائج تھی۔ اسے قلعہ شکن توپ سمجھنا چاہیئے دریاؤں کو عبور کرنے کے لئے فوج کے ہمراہ چند کشتیاں ضرور ہوتی تھیں۔

ہراول دستے کو طلایہ یا یزک کہتے تھے۔ یہ دستہ آگے پہنچ کر دشمن کے بارے میں اطلاعات مہیا کرتا تھا۔ اور شاہی فوج کی آمد کے بغیر جنگ شروع نہ کرتا تھا۔ فوج میں جھنڈے بہت بڑی تعداد میں ہوتے تھے۔ جو دور دور سے دکھائی دیتے تھے۔ امراء اور خوانین کے خاص جھنڈے ہوتے تھے۔

شاہی جھنڈا سرخ رنگ کا ہوتا تھا۔ قطب الدین ایبک کے زمانے

ہیں اس پر ہلال کی شکل بنائی ہوئی تھی۔ بعد ازاں شیر یا مچھلی کی تصویر اس سرخ جھنڈے پر بنائی گئی۔ تغلق دور سے مچھلی کا نشان عام ہو گیا۔ ایسے جھنڈے کو "ماہی مراتب" کہتے تھے۔

فوج میں خصوصی فرائض کو بجا لانے کے لئے بعض افسر موجود ہوتے تھے۔ مثلاً نقیب عام سپاہیوں تک سپہ سالار کے احکام بلند آواز سے پہنچاتا تھا۔ چاؤس نظم و نسق کا خیال رکھتے تھے اور فوجیوں کو قطاروں میں منظم رکھتے تھے۔

سلطان کے ذاتی افسران:- دہلی کے سلاطین شاہی محل میں شان و شوکت سے رہتے تھے۔ سلطان کے رعب داب سے بڑے بڑے لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ سلطان کی آمد کا اعلان کرنے کے لئے ایک خاص افسر ہوتا تھا۔ جسے نقیب کہتے تھے۔ وہ ہمیشہ سونے کا گرز اٹھائے رکھتا تھا۔ جلوس کے وقت محافظ دستہ سلطان کے اردگرد ہوتا تھا۔ محل کے اندر اور شاہی حرم میں پہرہ دینے کے لئے خواجہ سرا مہیا کئے جاتے تھے۔ سلطان کی خدمت کے لئے کئی ایک ذاتی افسر بھی ہوتے تھے۔ ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) کتاب دار:- یہ شخص شاہی لائبریری کا نگران تھا۔

(۲) خاصہ دار:- شاہی دسترخوان کا نگران افسر خاصہ دار کہلاتا تھا۔

(۳) قور بیگ:- شاہی جھنڈے اور اسلحہ خانہ کا انچارج ہوتا تھا۔

(۴) امیر تزک:- دربار کے آداب اور مختلف رسومات کی دیکھ بھال کے لئے ایک الگ افسر تھا۔ جسے امیر تزک کہتے تھے۔ اسے امیر حاجب بھی کہتے تھے۔

(۴) ملک الحکماء کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ کیوں کہ وہ شاہی طبیب ہوتا تھا۔

(۵) مشعل جلانے کے لئے اور محل میں روشنی کا انتظام کرنے کے لئے ایک الگ افسر تھا۔ جسے مشعل دار کہتے تھے۔

(7) طشت دار یا ساقی وہ شخص تھا جو مشروبات کا انتظام کرتا تھا۔ وضو کرانے اور ہاتھ دھلانے کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔

(8) وکیل در :۔ شاہی محل کا عام انتظام اس کے سپرد تھا۔ شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی اسی شخص کے سپرد ہوتا تھا۔

عمارات اور فنِ تعمیر

مسلمان سلاطین کے دور میں نئی طرز کی بے شمار عمارات تعمیر ہوئیں ان عمارتوں میں شاہی محل۔ مسجدیں۔ قلعے اور مقبروں کے علاوہ شاندار گنبد۔ محرابیں اور دروازے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسلمان سلاطین نے مقامی فن تعمیر سے گہرا اثر قبول کیا۔ لیکن ہندوانہ عمارات کو اسلامی ماحول میں ڈھال کر نئی طرز تعمیر کو وجود میں لائے پس اس دور کی عمارتوں میں غیر ملکی اور مقامی طرز کا امتزاج ہے۔ لہٰذا اس نئے فنِ تعمیر کو انڈو مسلم آرٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہیول Havell اسے ہندو مسلم آرٹ کے نام سے یاد کرتا ہے۔

مسلم آرٹ اور نئی طرز تعمیر کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں۔

(۱) مسلمان بادشاہوں نے ہندوانہ تصاویر اور جزئیاتِ زیبائش کو

یک لخت ترک کر دیا۔ اس کی بجائے سادگی پر زور دیا اور عمارت کے تناسب کو بہتر بنایا چنانچہ اسلامی دور کی تمام عمارتیں خوش منظر اور دل کش ہیں۔ دیکھنے والا ان سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں نے آرائش و زیبائش کو ضروری سمجھا تو خوش نویسی اور کتبوں سے عمارتوں کو سجایا۔ اس کے علاوہ بیل بوٹے اور رنگدار خطوط سے سجاوٹ کی مسجدوں کے محراب پر آیات قرآنی کندہ کروائیں۔ اور رنگدار بیل بوٹوں سے تزئین کا کام لیا گیا۔

(۲) مسلمانوں کی عمارات کشادہ اور فراخ ہیں۔ ان میں روشن دان کافی ہوتے ہیں۔ اور روشنی اور ہوا بکثرت مہیا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہندوانہ عمارتوں میں بھول بھلیاں کی طرز کے چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں۔ روشن دان اور کھڑکیاں غائب۔ داخل ہونے کے لئے محض ایک ہی دروازہ۔ چھت بغیر گنبد کے نیچی سطح کی۔ روشنی کم اور ماحول دھندلکا سا ہوتا ہے۔ ہندو عمارتوں کی تنگی و تاریکی نمایاں خصوصیت ہے۔

(۳) ہندوؤں کی عمارتوں میں ستون ضرور موجود ہوتے ہیں مسلمانوں نے ستونوں کو بعض حالات میں قائم رکھا۔ لیکن چھتوں کو تبدیل کر دیا۔ نیز عمارتوں کو کشادہ اور ہوا دار بنا دیا۔ مسلمان عمارتوں کی نمایاں خصوصیت گنبد۔ محراب اور مینار ہیں۔

(۴) مسلمانوں کی عمارتیں پائیدار ہیں۔ اگرچہ اینٹ اور پتھر وغیرہ وہی استعمال کیا گیا۔ لیکن محراب کی گولائی کی بدولت اسلامی عمارات زیادہ پختہ ہیں۔ اگر محراب گول نہ ہو۔ تو زیادہ بوجھ پڑنے سے عمارت

گر جاتی ہے ہندو محراب کی گولائی سے بالکل نابلد تھے۔

(۷) اسلامی اور ہندووانہ طرز تعمیر کے فرق کو نمایاں کرنے کے لئے ہندووانہ مندر اور مسلمانوں کی مسجد کا جائزہ کافی ہوگا۔ مندر میں کئی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑیاں ہوتی ہیں۔ لیکن مسجد کا صحن کشادہ اور اجتماعی عبادت کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ مسجد کی سادگی اور متانت دل کش ہوتی ہے۔ دلی سکون اور روح کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بر عکس مندر میں شوخ رنگوں کی زیبائش اور گھٹی ہوئی فضا ہوتی ہے۔ تاکہ دیوتاؤں کا رعب پڑ سکے۔

مسجد میں گنبد اور مینار افقی خط کے مجموعی تاثر میں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں لیکن مندر میں یہ چیزیں نہ ہونے سے طبیعت کو تازگی حاصل نہیں ہوتی۔

(۸) ہندو عمارتوں میں سجاوٹ کے لئے شوخ رنگوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اور دیواریں سر سے لے کر پاؤں تک اٹی ہوتی ہیں۔ مسلمان عمارتوں میں سادگی۔ دل کشی اور ہلکے رنگوں کی زیبائش سے حسن پیدا ہوتا ہے مسلمان عمارتوں سے اعلیٰ ذوق اور سلیقہ ٹپکتا ہے اور مجموعی حسن اور تناسب پر زیادہ زور ہوتا ہے۔

ذیل کی سطور میں مسلمان سلاطین کی عمارتوں کا مختصر حال بیان کیا جائے گا اور ہر شاہی خاندان کی عمارات کی خصوصیات واضح کی جائیں گی۔

ابتدائی عمارات۔ سلطان قطب الدین ایبک نے ہندوؤں کی عمارتوں میں تبدیلی کر کے اپنا کام چلایا۔ اس دور کی تمام عمارتوں میں

اینٹ پتھر اور چونا سب کا سب ہندوؤں کی عمارتوں کا ہے۔ بتوں کی تصاویر والے پتھروں کو اُلٹا کر کے لگا دیا گیا ہے۔ مقامی معمار صحیح قسم کا گنبد سمجھانے کے باوجود تیار نہ کر سکے۔ چنانچہ اس دور میں گنبد بغیر گردن کے تیار کئے گئے ہیں۔ چھت اور ستونوں پر ہندوؤں کی آرائش کے اثرات اور نشانات موجود رہے۔ اس زمانے میں محرابیں صحیح شکل میں ہندوستانی معمار نہ بنا سکے۔ یہ محرابیں چوڑدار ہیں جالی دار پتھر پہلی بار سجاوٹ کے لئے لگایا گیا ہے۔ مشہور عمارتیں مسجد قوت الاسلام۔ قطب مینار اور اجمیر کی جامع مسجد ہیں۔

مسجد قوت الاسلام ۔ یہ مسجد دہلی کی اوّلین مسجد ہے اور قطب مینار کے قریب واقع ہے۔ اس مسجد میں ستون موجود ہیں۔ چھت پر گنبد معمولی سے اور بغیر گردن کے ہیں۔ مسجد میں ہندوؤں کے مندروں کا سامان استعمال ہوا تھا اور بعض ہندوانہ تصاویر کو پلستر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس مسجد کی محرابیں ناقص اور ہندوانہ طرز کی ہیں۔ مسجد قوت الاسلام کو التمش نے وسیع تر بنایا تھا التمش نے اس مسجد کے دالان کے آگے ایک بلند دیوار تعمیر کرائی جس میں محراب والا دروازہ بھی ہے۔ اس پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ یہ دیوار چھت سے زیادہ بلند ہے اور متناسب نہیں ہے۔ علاؤالدین خلجی نے بھی مسجد قوت الاسلام میں توسیع کرائی تھی۔ اُس نے مسجد کے جنوب کی جانب ایک شاندار دروازہ تعمیر کرایا۔ اس دروازے کی محراب نہایت عمدہ ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسجد قوت الاسلام کی تعمیر کے لئے خاص طور پر ہندوؤں کے مندروں کو مسمار نہیں کیا گیا تھا بلکہ دہلی پر

حملے کے دوران میں جو مندر برباد ہوئے تھے اُن کے سامان کو ضائع ہونے نہ دیا گیا اور مسجد کی تعمیر پر صرف کر لیا گیا۔

قطب مینار۔ دہلی کا یہ بلند مینار مسجد قوت الاسلام کے قریب واقع ہے۔ اسے سلطان قطب الدین ایبک نے فتح دہلی کی یادگار کے طور پر بنوایا تھا یعنی یہ TOWER OF VICTORY تھا۔ بعض مورّخ یہ کہتے ہیں کہ یہ دراصل ناطور ہے یعنی مسجد سے ملحقہ مینار ہے اور اذان دینے کے لئے تعمیر ہوا تھا لیکن التمش نے اسے مکمل کراتے وقت بہت بلند کر دیا۔ اس مینار کو قطب صاحب کی لاٹھ کہتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ اذان دینے کے لئے نہ بنایا گیا تھا بلکہ پرتھوی راج کی لوہے کی لاٹھ کو دیکھ کے بعد سلطان قطب الدین ایبک نے یہ مینار بطور یادگار بنوایا۔ اس مینار کے قریب ایک مشہور ولی قطب الدین بختیار کاکی کا مزار ہے۔ مینار کا گھیرا 48 فٹ ہے لیکن آخری منزل کا گھیرا صرف 9 فٹ ہے۔ یہ مینار 242 فٹ بلند ہے اور اس کی سات منزلیں ہیں۔ آخری منزل کی برجی آسمانی بجلی گرنے سے معدوم ہو گئی ہے لیکن مینار قائم ہے۔ دنیا بھر میں یہ مینار از حد شاندار ہے۔

اجمیر کی مسجد۔ سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے میں اجمیر میں ایک جامع مسجد تعمیر ہوئی۔ اس مسجد کا نمونہ دہلی کی مسجد قوت الاسلام کی مانند ہے۔ طرزِ تعمیر اور زیبائش بھی اُسی قسم کی ہے یہ مسجد اڑھائی دن کا جھونپڑا کہلاتی ہے۔ یہاں ایک میلہ لگتا تھا جو اڑھائی دن رہتا تھا۔ چھت کی زیبائش سے یہ مسجد جینی فنِ تعمیر سے مشابہت رکھتی ہے۔

سلطان التمش کی عمارت۔ التمش کے زمانے میں فنِ تعمیر نے ترقی کر کے بہتر شکل اختیار کی۔ پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ التمش نے مسجد قوت الاسلام کو وسیع تر کیا اور قطب مینار کو بھی پایہ تکمیل تک پہنچایا التمش کے زمانے کی بہترین یادگار سلطان غازی کا مقبرہ ہے۔ عوام غلط طور پر اس عمارت کو کسی ولی کا مقبرہ سمجھتے ہیں۔ دراصل یہ سلطان التمش کے لاڈلے لڑکے ناصرالدین کا مقبرہ ہے جو لکھنوتی میں فوت ہوا لیکن اس کی لاش دہلی میں منگوا کر دفن کی گئی۔ ناصرالدین محمود اس کے بعد پیدا ہوا اور اُس کا نام مرحوم بھائی کے نام پر رکھا گیا قبر کے تعویز پر چھت دار چبوترہ ہے۔ قبر مسجد کے صحن میں ہے۔ مغرب اور مشرق کی جانب دالان ہے مسجد کے محراب پر سنگِ مرمر لگا ہوا ہے اور اُس پر آیاتِ قرآنی لکھی ہوئی ہیں۔ التمش کا اپنا مقبرہ قطب مینار کے قریب ہے۔ مقبرے کا گنبد چھت سمیت گر چکا ہے۔ قبر کا تعویز کافی بلند ہے لیکن اصلی قبر تہ خانے کے اندر ہے۔ بیرونی تعویز پر نہایت عمدہ اور باریک نقاشی کی گئی ہے اور اس پر قرآن مجید کی آیات درج ہیں۔ بلبن کے دور کی عمارات بہت کم ہیں شہزادہ محمد کا مقبرہ البتہ گردن دار گنبد رکھتا ہے۔

خلجی دور کی عمارتیں۔ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں فنِ عمارت نے اور بھی ترقی کی۔ اس دور کے گنبد نہایت گول اور خوبصورت ہیں محراب بھی متناسب اور عمدہ ہے۔ زیبائش میں بھی مزید حسن پیدا ہوا۔ اُس دور کی اہم عمارتیں علائی دروازہ۔ علائی مینار۔ جماعت خانہ مسجد ہیں مسجد قوت الاسلام کو وسیع کرنے کے لئے اُس کے جنوب کی جانب

اُس نے ایک شاندار دروازہ تعمیر کیا۔ یہ دروازہ سُرخ پتھر کا ہے۔ محرابیں اور گنبد گولائی کی بدولت مضبوط اور خوبصورت ہیں۔ دیوار کی بیرونی سطح پر آرائش نہایت دلکش ہے۔

علائی مینار کی تعمیر علاؤالدین خلجی کے زمانے میں نامکمل رہ گئی۔ سلاطین کا خیال تھا کہ ایسا مینار تعمیر کرائے جو قطب مینار سے زیادہ دلکش ہو۔ یہ مینار مسجد قوت الاسلام کے شمال کی جانب ہے۔ اس کی صرف ایک منزل تعمیر ہوئی تھی کہ سلطان کا انتقال ہوا اور بعد ازاں کسی نے اسے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچایا۔

علاؤالدین خلجی کے لڑکے خضر خان نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے لئے ان کی زندگی ہی میں ایک شاندار گنبد والا مقبرہ تیار کرایا لیکن نظام الدین اولیا نے اُس عمارت کو پسند نہ کیا۔ چنانچہ شہزادہ نے اُس عمارت کے دونوں طرف ایک ایک کمرہ بنا کر اُسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ یہ عمارت جماعت خانہ مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ درمیانی عمارت کا گنبد عظیم الشان ہے۔ محراب عمدہ اور گولائی میں مکمّل ہے۔ کنگرے پر سنگِ مرمر کی جھالر ہے۔ اس مسجد کے صحن میں بعد ازاں نظام الدین اولیا دفن ہوئے اور ان کے مزار پر ایک عالیشان مقبرہ تعمیر ہوا خلجی دور کی عمارتوں میں سنگ سرخ اور سنگِ مرمر کا امتزاج ہے اور گنبد اور محرابیں صحیح طور کی ہیں۔ اِس زمانے میں اندرونی محراب بھی مکمّل گولائی پر ہے۔

تغلق سلاطین کا دور۔ تغلق سلاطین کے زمانے میں عمارات میں سنجیدگی اور متانت نمایاں ہے۔ زیبائش میں کمی ہے لیکن سادگی

دلکش ہے۔ پتھر کی بجائے اینٹ کا استعمال عام ہوا لیکن عمارتوں پر سفید پلستر کرانے کا طریقہ شروع ہوا۔ نئی نئی عمارت نہایت ہی صاف اور شفّاف ہوتی تھی لیکن تغلق دور کی عمارتیں پتھر کی بنی ہوئی عمارتوں کی نسبت کم پائیدار ہیں۔ تغلق دور کے گنبد پست ہیں۔ ملتانی طرز کے مطابق دیواروں اور ستونوں میں ڈھلان رکھی گئی ہے تاکہ عمارت کے رعب میں اضافہ ہو۔ ڈھلان سے مراد یہ ہے کہ دیوار کا نچلا حصّہ موٹا ہوتا ہے اور اُوپر سے دیوار عام دیوار کی مانند پتلی ہوتی ہے۔ تغلق سلاطین کے زمانے میں صوبائی طرزِ تعمیر میں بھی خاص طور پر ترقی ہوئی۔ جونپور اور گجرات کا طرزِ تعمیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

تغلق دور کی اکثر عمارتیں اب کھنڈرات ہیں۔ بعض عمارتوں کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا:۔

غیاث الدین تغلق کا مقبرہ۔ دہلی سے مشرق کی جانب چند میل دور سلطان غیاث الدین تغلق نے نیا شہر تغلق آباد بسایا تھا اور اس میں ایک مضبوط قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ اس کے کھنڈرات اور فصیل کے نشان باقی رہ گئے ہیں۔ تغلق آباد میں سلطان غیاث الدین تغلق کا مقبرہ یادگار عمارت ہے۔ مقبرے کے گرداگرد فصیل نما دیوار ہے۔ دروازہ عالیشان اور رعب دار ہے مقبرے کے گرد ایک مصنوعی جھیل تھی جواب سوکھی ہوئی ہے۔ عمارت سرخ پتھر کی ہے لیکن کہیں کہیں سنگِ مرمر بھی لگا ہوا ہے۔ سنگِ مرمر عمارت میں تنوع پیدا کرتا ہے۔ گنبد سنگِ مرمر کا ہے اور کافی بلند ہے۔

جہاں پناہ۔ سلطان محمد تغلق نے دہلی اور اُس کی قریبی بستیوں کے دفاع کیلئے ایک مضبوط فصیل تعمیر کرائی۔ اسے جہاں پناہ کہتے ہیں۔ اس فصیل کے نشان اب تک موجود ہیں۔ جہاں پناہ کے قریب شہر کے اندر کی جانب سلطان نے ہزار ستونوں والا ایک شاندار ہال تعمیر کرایا تھا جس میں شاہی دربار لگتا تھا۔ شہر کے اندر محمد تغلق نے ایک ٹیلے پر اپنے لئے ایک عمدہ محل بنوایا تھا جس کا نام بدیع منزل تھا اب اس مقام کو بجے منڈل کہتے ہیں جو بدیع منزل کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

بیگم پوری مسجد۔ بدیع منزل کے قریب ایک وسیع مسجد بھی محمد تغلق نے تعمیر کرائی تھی۔ اس مسجد میں ایک علیحدہ گیلری تھی جس میں سلطان نماز پڑھتا تھا۔ اس گیلری کو جانے کے لئے شمال مشرق کی جانب الگ راستہ ہے۔ مسجد کے درمیان وسیع صحن ہے اور چاروں طرف چھت والے دالان ہیں۔ ہر دالان پر ایک ایک بڑا گنبد ہے اور چھت پر کئی ایک چھوٹی چھوٹی برجیاں ہیں۔

فیروز تغلق کی تعمیرات۔ سلطان فیروز تغلق بے شمار عمارتیں ملک بھر میں بنوائیں۔ قلعے۔ محل۔ مسجدیں تعمیر کرائیں۔ نہریں کھدوائیں۔ پل بنوائے اور شہر آباد کئے۔ دہلی کے قریب فیروز آباد کا نیا شہر آباد ہو گیا۔ یہ شہر اب کھنڈرات کی شکل میں ہے اور کوٹلہ فیروز شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ فیروزہ اور حصار کے شہر اسی سلطان نے بسائے تھے۔ حصار میں تغلق دور کی مسجدیں اور مقبرے موجود ہیں۔ شہر کا دروازہ۔ قلعہ۔ لاٹھ اور گجری محل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آگرہ میں

فیروز تغلق کے ایک باغ کے آثار اب تک موجود ہیں۔ سلطان کے وزیر خانِ جہاں نے دہلی میں نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کے قریب ایک مسجد بنوائی تھی جواب ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہے۔

سیّد اور لودھی سلاطین کی عمارتیں۔ سیّد اور لودھی سلاطین کے دور میں عالیشان عمارتیں کمیاب ہیں۔ دراصل سلطنتِ دہلی کے زوال کے دنوں میں فنِ عمارت بھی زوال پذیر ہوا۔ ان سلاطین کے دور کے مقبرے ضرور ملتے ہیں۔ اکثر مقبرے ہشت پہلو ہیں۔ ہر کونے پر برجی موجود ہے۔ درمیان میں بلند گنبد ہے۔ مقبرے کے گردا گرد برآمدے ہیں۔ یہ مقبرے پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور اُن پر چونے کا پلستر کیا ہوا ہے۔ سکندر لودھی۔ مبارک شاہ اور محمد شاہ کے مقبرے سرخ پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔

بھگتی تحریک

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل ملاپ کی بدولت ایک نیا تمدن پیدا ہوا۔ دونوں قوموں نے ایک دوسرے سے اثرات قبول کیے۔ اسلامی حکومت کے اہم اثرات برّصغیر پر ہوئے۔ اس ملک کو سیاسی وحدت نصیب ہوئی اور امن و امان قائم ہوا۔ غیر ممالک سے تجارتی اور تمدنی تعلقات پیدا ہوئے۔ دونوں قوموں کے اختلاط سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی جسے اُردو زبان کہتے ہیں۔ فنِ تعمیر میں مقامی اور بیرونی اثرات کے امتزاج سے نئی طرزِ تعمیر کی بنیاد پڑی۔ فنونِ جنگ میں ترقی ہوئی اور مسلمانوں

کے اثر کی بدولت اس ملک میں بھی تاریخ نویسی کا فن باقاعدہ طور پر شروع ہؤا۔ اگرچہ سلاطین دہلی نے تبلیغ مذہب کے لئے کوئی خاص اقدام نہ کیا لیکن صوفیوں اور خدا رسیدہ اصحاب کی آمد سے اُس ملک میں اسلام خوب پھیلا اور ہزاروں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

اسلام توحید پرستی اور مساوات کا سبق دیتا ہے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں نے بھی یہ اصول اپنا لئے۔ اس کے علاوہ اسلامی تصوّف نے برّصغیر کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ مسلمان صوفیوں کی تقلید میں ہندوؤں نے بھی رواداری۔ محبت اور اخوت کا سبق سیکھا۔

سلاطین دہلی کے آخری دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط سے ایک نئی قسم کا تصوّف پیدا ہؤا جسے بھگتی تحریک کہتے ہیں اس تحریک کے بانی ہندو خدا پرست تھے جن کے عقاید پر گہرے اسلامی اثرات واضح تھے۔ اس تحریک کا پیغام یہ تھا کہ مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ تمام مخلوق سے بلا امتیاز مذہب وملّت اخلاق رواداری اور محبت سے پیش آنا چاہیئے۔ خدمتِ خلق اور توحید پرستی اس تحریک کے بنیادی اصول تھے۔ بھگتی کا مفہوم ہندوؤں میں یہ تھا کہ ویدانت کے فلسفہ کے مطابق اور گیتا کی بنیادی تعلیم کے مطابق کسی انسان سے نفرت نہ کی جائے بلکہ پریم اور تپسیا سے نجات حاصل کرنا چاہیئے۔ اگر ہر انسان اپنے اپنے مذہب پر قائم رہ کر بھگت بن جائے تو دنیا کی مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں۔

اس تحریک کے علمبردار اگرچہ توحید۔ تصوف۔ رواداری اور محبّت کا پیغام دیتے تھے لیکن وہ مسلمان نہ تھے۔ اُن کے عقاید اسلام سے

ملتے جلتے تھے لیکن صحیح طور پر اسلام کے دائرہ میں نہ تھے۔ اس تحریک کی بدولت اسلام کی تبلیغ رک گئی۔ اس تحریک کے عمدہ نتائج یہ تھے کہ برصغیر میں بسنے والے لوگوں میں یک جہتی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوا۔ مذہبی تعصب اور فرقہ پرستی ختم ہوئی اور لوگ باہم پیار و محبت سے رہنے لگے۔ نیز اس ملک میں ایک مشترکہ تمدن نے فروغ پایا بھگتی تحریک نے برہمنوں کے باقی ماندہ اقتدار کا بھی خاتمہ کر ڈالا اور ذات پات اور مذہبی رسومات کی قیود سے لوگوں کو آزاد کر کے خدا کی والہانہ محبت پیدا کر دی۔ اس تحریک کے مشہور راہنماؤں کے حالات درج ذیل ہیں :-

(1) رامانج (RAMANUJ) رامانج دکن کا مشہور مذہبی راہنما ہے جس نے بارھویں صدی عیسوی میں بھگتی کو کامل نجات کا ذریعہ بتایا اس کا پیغام یہ تھا کہ خدا یا ایشور خیر و برکت اور حسن کا نام ہے۔ اطمینانِ قلب اور سچی خوشی ایشور کے تصور سے حاصل ہوتی ہے۔ بھگتی اور نجات کی آخری منزل یہ ہے کہ خدا پہچانا جائے ایشور کی قوتِ تخلیق کا نام وشنو ہے جس کی پرستش لازم ہے۔ شوجی کے پجاریوں نے رامانج کی تعلیمات کی سخت مخالفت کی۔

(2) رامانند۔ الہ آباد میں چودھویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا لیکن اپنی عمر کا زیادہ حصہ بنارس میں بسر کیا۔ رامانند نے رام اور سیتا کی پرستش پر زور دیا کیونکہ وہ ان کو وشنو کا اوتار مانتا تھا۔ اس نے ذات پات کی سخت مذمت کی۔ اور سنسکرت زبان کو ترک کر کے مروجہ زبان یعنی ہندی میں اپنے خیالات کی پرچار کی۔ نیچ ذاتوں

کے اکثر لوگ رامانند کے عقیدت مند تھے۔

(3) نامدیو۔ یہ شخص مہاراشٹر کا باشندہ تھا اور نیچ ذات سے تعلق رکھتا تھا اس نے رسومات اور ذات پات کے خلاف سخت جہاد کیا۔ نامدیو رام اور رحیم کا فرق مٹا کر ہندو اور مسلمانوں کی یک جہتی چاہتا تھا بت پرستی کے خلاف تھا اور توحید کا قائل تھا۔ اس شخص نے تیرھویں صدی عیسوی میں محبت و یگانگت کا پیغام دیا۔

(4) کبیر۔ بھگت کبیر 1440ء میں پیدا ہوا اور 79 سال کی لمبی عمر پائی۔ اُس نے ہندی شاعری کے ذریعے عوام تک بھگتی کا پیغام پہنچایا۔ اُس نے اسلامی تصوّف اور ویدانت کے فلسفے کو ملانے کی کوشش کی۔ کبیر نے شیخ بھیکا چشتی اور شیخ تقی سہروردی سے اسلامی تصوّف کی تعلیم حاصل کی اور رامانند سے ہندوانہ تصوّف اور ویدانت کا فلسفہ سیکھا۔ کبیر اس بات پر زور دیتا تھا کہ محض عبادت اور مذہبی مقامات کی زیارت بے سود ہے۔ دل کو دنیاوی اغراض سے پاک کرنا چاہیئے۔ اُس نے رواداری اور ایشور بھگتی پر زور دیا۔ کبیر کے دوہے برِ صغیر میں کافی مشہور ہیں۔

(5) چیتنیہ یا گورنگ۔ چیتنیہ بنگال کا ایک برہمن زادہ تھا۔ شہر ندیا میں 1485ء میں پیدا ہوا۔ عین جوانی کے عالم میں سنیاسی بن گیا اور سیر و سیاحت اختیار کی۔ اس کے خیالات یہ تھے کہ کرشن سے والہانہ محبّت اختیار کر کے اپنے آپ کو بھول جاؤ۔ کرشن خدائی حسن و جمال کا مظہر ہے اور روحانیت کا کمال یہی ہے کہ کرشن کی ذات میں کھو جاؤ۔ مسلمان قوالوں کی مانند اُس کے پیرو کیرتن میں مشغول رہتے

ہیں اور بار بار بھجن گا کر روحانی سرور حاصل کرتے ہیں۔ بعد میں بنگال کے ہندو چیتنیہ کو کرشن کا اوتار سمجھنے لگے۔

(6) گورو نانک۔ 1469ء میں ضلع شیخوپورہ (پنجاب) میں ننکانہ صاحب (دیا تلونڈی) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بھگت کبیر کی مانند اسلامی تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں ذات پات اور بے معنی رسوم کے خلاف جہاد کیا۔ گورو نانک ذات پات اور بت پرستی کے سخت مخالف تھے اور دل کی صفائی پر زور دیا۔ ہندو اور مسلمان اُن کے عقیدت مند تھے۔ پنجابی زبان میں اپنے خیالات کا پرچار کرتے تھے۔ جاٹوں میں ان کے عقیدت مند بہت زیادہ تھے۔ نیچ قوم کے بہت سے لوگوں نے اُن کی مریدی اختیار کی۔ گورو نانک نے ہندو اور مسلمانوں کو یکجا اور متحد کرنے کی کوشش کی 1530ء میں گورو نانک نے وفات پائی مسلمان مریدوں نے اُن کو مسلمانوں کی طرح دفن کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہ گورو نانک کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ہندوؤں نے اُن کو اپنے طریق کے مطابق جلانے کی کوشش کی۔ گورو نانک کی تعلیمات بالکل سادہ تھیں۔ وہ صلح کل۔ محبت اور خدا پرستی پر زور دیتے تھے۔ مذہبی تعصّب کو دور کرکے ملکی باشندوں کو یکجا کرنا چاہتے تھے۔ بابا نانک کی تعلیم کو ان کے جانشینوں نے خوب پھیلایا۔ اور یہ گدی نشین گورو کہلاتے ہیں دسویں گورو گوبند سنگھ نے صلح کل طریقے کو ترک کرکے اپنے پیروؤں کو جنگجوئی کا سبق دیا۔ اُس زمانے سے یہ لوگ سکھ کہلائے۔

(7) سوامی ولبھ اچاریہ۔ یہ شخص تلنگانہ کے برہمن خاندان میں

1479ء میں پیدا ہوا تعلیم حاصل کرنے کے بعد مذہبی مقامات کی یاترا کی۔ سیر و سیاحت کے بعد بنارس کو اپنا صدر مقام بنایا اور بھگتی کی پرچار شروع کی۔ چیتنیہ کی مانند ولبھ اچاریہ نے بھی کرشن اور رادھا کی والہانہ محبت پر زور دیا۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ کرشن دراصل وشنو کا روپ ہے۔ دولت اور اس کے حصول کی خواہش انسان کو روحانیت سے دور لے جاتی ہے۔ لہٰذا ابدی خوشی صرف کرشن کی ذات میں مدغم ہو جانے سے حاصل ہوتی ہے۔

(8) نمبارک۔ یہ شخص بھی دکن کا باشندہ تھا۔ بارھویں صدی عیسوی میں مدراس کے قریب پیدا ہوا۔ اس کا فلسفہ ولبھ اچاریہ سے ملتا جلتا تھا۔ وہ بھی کرشن کو وشنو کا اوتار سمجھتا تھا اور اس کی محبت کو ذریعۂ نجات خیال کرتا تھا۔ نمبارک یہ کہتا تھا کہ خدا انسان کی ذات سے الگ بھی ہے اور اس میں شامل بھی ہے۔ اس کی تعلیمات میں فلسفے کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔

(۹) دادو (Dadu) یہ راہنما احمد آباد گجرات میں 1544ء میں پیدا ہوا جنوبی ہند میں اپنے خیالات کی تبلیغ کی۔ وہ بت پرستی اور ذات پات کا سخت مخالف تھا۔ مذہبی قیود کو بھلا کر تمام انسانوں سے محبت اور رواداری کا سبق دیتا تھا۔ اس نے اپنے خیالات کو اشعار میں ڈھال کر پیش کیا۔ دکن کے علاوہ اس کے چیلے شمالی بھارت میں بھی پائے جاتے ہیں۔

یہ بات یاد رہے کہ بھگتی تحریک کے راہنما مسلمان نہ تھے بلکہ ایک خاص قسم کے تصوف کی پرچار کرتے تھے جو اسلامی اور ہندوانہ خیالات

کا مجموعہ تھا۔ انہوں نے مذہبی تعصب کو کم کرنے میں مدد دی اور رواداری اور محبت پر زور دیا لیکن اسلام اور ہندومت کے عقاید کے بنیادی اختلاف کو ختم نہ کر سکے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ کفر اور اسلام میں بعد المشرقین ہے۔

دورِ سلاطین کے مسلمان صوفی

مختلف سلاطین کا حال بیان کرتے ہوئے ہم نے اکثر اوقات مشہور صوفیوں کے مختصر حالات بھی بیان کئے ہیں۔ ذیل میں ہم چند دیگر مسلمان صوفیوں کا ذکر کریں گے۔ علی ہجویری داتا گنج بخش امیر خسرو اور حسن دہلوی کا ذکر پہلے دیا جا چکا ہے۔ چند دیگر بزرگ حسب ذیل ہیں۔

(۱) **خواجہ معین الدین چشتی**۔ آپ سیستان کے رہنے والے تھے شیخ ابراہیم قندوزی قلندر سے فیض حاصل کیا۔ جائیداد کو فروخت کر کے سمرقند چلے گئے اور درویشی اختیار کی۔ خواجہ عثمان ہارونی سے تصوف کی تعلیم حاصل کی اور اُن کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ سیر و سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان کے کفر گڑھ یعنی اجمیر میں مقیم ہوئے۔ آپ نے تبلیغ کے لئے ہندی زبان بھی سیکھی۔ اجمیر میں مشہور علمی مرکز قائم کیا اور تبلیغ اسلام کے لئے زندگی وقف کر دی۔ اب بھی صدہا عقیدت مند آپ کے مزار کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

(۲) **خواجہ قطب الدین بختیار کاکی**۔ آپ خواجہ معین الدین اجمیری کے مرید تھے۔ اصلی وطن ترکستان کا شہر اوش تھا۔ خواجہ معین الدین کی ملاقات کے لئے ہندوستان پہنچے اور مریدی اختیار کی۔ اُن کے حکم

سے آپ دہلی مقیم ہو گئے اور تبلیغ اسلام کے لئے خانقاہ قائم کی۔
التمش آپ کا بے حد معتقد تھا۔ آپ کا مزار قطب مینار کے قریب ہے۔
(ج) بابا فرید گنج شکر۔ آپ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مرید
تھے۔ آپ کا اصلی نام مسعود تھا اور آباو اجداد ملتان میں آباد
ہوئے تھے۔ ملتان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے خواجہ
قطب الدین کی مریدی اختیار کی اور دہلی چلے گئے۔ مرشد کی وفات کے
بعد آپ اجودھن چلے گئے۔ یہ جگہ اب پاک پٹن کے نام سے مشہور
ہے۔ وہاں آپ نے بقایا زندگی تبلیغِ اسلام میں گذاری۔ بلبن اور
ناصر الدین محمود کے ہم عصر تھے۔ آپ کا مزار پاک پٹن میں ہے۔
(د) علی احمد صابر۔ آپ بابا فرید کے بھانجے تھے۔ 1195ء میں ملتان
کے قریب کھتووال میں پیدا ہوئے۔ اپنے ماموں سے تعلیم و تربیت
پائی اور انہیں سے روحانی فیض حاصل کیا۔ آپ بابا فرید کے داماد
اور خلیفہ بھی تھے۔ آخر عمر میں آپ مجذوب ہو گئے۔ رڑکی ضلع سہارنپور
میں آپ کا مزار ہے اور صدہا لوگ اب بھی زیارت کو جاتے ہیں۔
(ہ) حضرت نظام الدین اولیا۔ آپ دہلی کے مقتدر اور نامور
بزرگوں میں سے ہیں۔ حضرت بابا فرید کے مرید تھے۔ صوفیوں کے
سلسلۂ نظامیہ چشتیہ کے بانی تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد بخارا کے رہنے
والے تھے منگولوں کے حملوں سے ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ آپ
کے والدین کچھ عرصہ لاہور بھی رہے۔ حضرت نظام الدین اولیا بدایوں
میں پیدا ہوئے تھے۔ 1257ء میں پاک پٹن پہنچ کر بابا فرید کے
مرید ہوئے اور اُن کے حکم سے دہلی میں خانقاہ قائم کی۔ آپ کی

خدمت میں امراء بھی حاضر ہوتے تھے سلطان علاؤ الدین کا لڑکا خضر خاں بھی آپ کا مرید تھا۔ آپ کے مریدوں میں امیر خسرو اور حسن دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(6) **شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی**۔ آپ قریشی تھے اور اُن کے آباؤ اجداد حجاز سے نکل کر خوارزم میں مقیم ہوئے۔ بعد ازاں ملتان میں آکر آباد ہوئے۔ آپ 1182ء میں پیدا ہوئے اور حصول تعلیم کے لئے خراسان اور بخارا کا سفر اختیار کیا۔ کچھ عرصہ مدینہ بھی مقیم رہے اور وہاں علم حدیث پڑھا۔ آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے اور تبلیغ اسلام اور خدمتِ خلق اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا 1257ء میں آپ نے منگولوں کو ایک لاکھ درہم دے کر سر سے ٹالا اور ملتان کو بربادی سے بچا لیا۔ برصغیر میں آپ کے صدہا مقتدر مرید تھے۔ آپ کا مزار ملتان میں ہے۔

(7) **حضرت مخدوم جہانیاں**۔ آپ کا پورا نام سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت تھا۔ سیر و سیاحت کے از حد شوقین تھے اس لئے جہاں گشت کہلاتے ہیں۔ آپ نے چھتیس 36 مرتبہ حج کیا۔ آپ نے اپنے چچا صدر الدین سے روحانی فیض حاصل کیا۔ بعد ازاں آپ نے کئی ایک بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ جیّد عالم اور پابندِ شرع تھے۔ سلطان فیروز تغلق آپ کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ٹھٹھہ (سندھ) کے باغیوں کو آپ کی سفارش پر سلطان نے معاف کر دیا۔

(8) **شاہ شمس سبزواری**۔ ملتان میں اسماعیلی شیعہ فرقے کے مشہور مبلغ تھے آپ 1165ء میں پیدا ہوئے اور ایک لمبی عمر پائی

ان کی تبلیغ کی بدولت سندھ اور ملتان کافی عرصہ اسمٰعیلیوں اور قرامطیوں کا مرکز بنے رہے۔ بعد ازاں حضرت مخدوم جہانیاں اور سیّد محمد غوث گیلانی کی کوششوں سے عوام نے حنفی مذہب اختیار کر لیا۔ ملتان کے عوام غلطی سے اس بزرگ کے مزار کو شمس تبریز کا مزار سمجھتے ہیں جو مولانا روم کے مرشد تھے۔ شاہ شمس کی کرامتوں سے کئی فرضی قصّے اس شہر میں رائج ہیں۔

(۹) سیّد محمد غوث۔ آپ حضرت عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں کے ایک مقتدر بزرگ تھے۔ جیّد عالم اور پابندِ شریعت تھے۔ اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کی اور بعد ازاں اُچ میں مقیم ہو گئے اور وہاں قادریہ سلسلہ کی مشہور خانقاہ قائم کی۔ یہ خانقاہ ۱۴۸۲ء میں قائم ہوئی صدیوں تک یہ اسلامی علوم کا مرکز تھی اور صدہا لوگوں نے یہاں سے روحانی فیض حاصل کیا۔ اُچ کے سلسلہ قادریہ کے متعلقین میں برّصغیر کے مقتدر بزرگوں کا نام شامل ہے۔ شاہ ابوالمعالی اور حضرت شاہ چراغ اسی سلسلے کے فیضیاب تھے۔ حضرت شاہ چراغ کے نام پر لاہور ہائی کورٹ کے قریب مسجد شاہ چراغ بھی ہے۔ سیّد محمد غوث کی اولاد اور اُن کے مریدوں نے برّصغیر سے قرامطی اور اسمٰعیلی اثرات کو ختم کرنے میں بہت سودمند کوشش کی۔

(۱۰) قطب العالم شیخ عبدالجلیل۔ آپ لودھی سلاطین کے دور میں مشہور بزرگ ہو گذرے ہیں۔ آپ لاہور میں مقیم تھے۔ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کے بعد لاہور میں ایک مشہور خانقاہ قائم کی اور تبلیغ اسلام کے لئے زندگی وقف کی۔ آپ کی کوششوں سے بے شمار

راجپوت مسلمان ہوئے۔ سلطان بہلول لودھی نے حضرت قطب العالم کی روحانیت سے متاثر ہو کر اپنی لڑکی کی شادی اُن سے کر دی شیر شاہ سوری اور اُس کا باپ حسن سوری دونوں آپ کے مرید تھے۔ آپ نے 1504ء میں وفات پائی۔ آپ کا مزار لاہور میں قلعہ گجر سنگھ کے قریب واقع ہے۔

(۱۱) **حضرت شاہ کاکو چشتی**۔ آپ بابا فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے۔ بازار دارا شکوہ (لنڈا بازار) میں آپ کی خانقاہ تھی۔ اسلامی دور میں خانقاہ سے مراد علمی اور روحانی مرکز تھا۔ حضرت شاہ کاکو علم مناظرہ کے فن کے بڑے ماہر تھے۔ آپ نے اپنی تمام زندگی تبلیغ اسلام میں گذاری۔ آپ 1477ء میں فوت ہوئے اور اپنی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ بعد ازاں حضرت میاں میر آپ کے معتقد تھے اور اکثر اُن کے مزار پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ سکھوں کے زمانے میں مسجد شہید گنج اور حضرت کاکو شاہ کے مزار کے گرد ایک نئی چار دیواری تعمیر کر کے اُسے سکھوں کا گوردوارہ قرار دیا لیکن مزار اور مسجد کے محراب کو قائم رکھا۔ 1936ء میں انگریزی فوج کے زیر سایہ سکھوں نے اس مزار اور مسجد کو گرا دیا۔

TYPICAL QUESTIONS

Q.1. Write a short account of the architecture of medieval India.

Q.2. Briefly relate the effects of the Muslim conquest of India on her literary life.

Q.3. Write a short essay on the social and cultural effects of the contact of Islam with Hinduism in India under the Sultanate.

Q.4. Give a brief account of the Revenue administration of the Sultanate of Delhi.

Q.5. Describe in brief outline the central structure of Govt: under the Turkish Sultans of Delhi.

Q.6. Write short notes on any three:-
(a) Syed Ali Hajveri. (b) Bhagti Movement.
(c) Muin-ud-Din Chishti of Ajmer. (d) Dadu.
(e) Nanak. (f) Kabir. (g) Baba Farid.

امتحانی سوالات

۱- قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان کے فن تعمیر کا حال بیان کیجئے۔

2- مسلمانوں کی فتوحات کا اثر ہندوستان کی مذہبی۔ اخلاقی۔ سماجی اور ادبی حالت پر کیا ہوا۔ وضاحت کیجئے۔

3- دہلی سلطنت کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط سے کون کون سے سماجی اور تمدنی اثرات ہوئے؟

4- سلاطینِ دہلی کے دور میں نظامِ مالیات کا حال قلمبند کیجئے۔

5- سلاطین دہلی کے زمانے میں نظام حکومت کا حال بیان کیجئے۔

6- مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیئے :-

(ا) سیّد علی ہجویری (ب) بھگتی تحریک (ج) معین الدین چشتی اجمیری (د) بابا نانک (ھ) دادو (و) کبیر- (ز) بابا فرید؟ -

مُغلیہ سلطنت

کی

ابتداء

ستائیسواں باب

ظہیر الدّین محمد بابر

ابتدائی زندگی:۔ شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر نے سلطان ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر اکیس اپریل 1526ء کو دہلی پر قبضہ جمالیا یعنی شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اُس کی رگوں میں امیر تیمور اور چنگیز خاں کا خون موجزن تھا لیکن وہ لفظ منگول یا مغل سے نفرت کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ترک گنتا تھا لیکن مورّخین نے اُس کے جانشینوں کو مغل قرار دیا ہے۔ اس بنا پر بابری نسل کے تمام حکمرانوں کو مغلیہ خاندان کہتے ہیں۔ بابر کے خانوادہ کے لئے لفظ مغل مناسب نہیں لیکن یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اور اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ بابر اور اس کے خاندان کو مغلیہ حکمران ہی گنا جاتا ہے۔ بابر اور اُس کے جانشینوں کو بعض مورّخین تیموری یا چغتائی بھی کہتے ہیں۔ بابر اعلےٰ جنگجو تھا لیکن ایرانی ثقافت کا دلدادہ تھا۔ بابر 1483ء میں پیدا ہوا۔ اُس کے والد کا نام عمر شیخ مرزا تھا۔ جو چینی ترکستان کی چھوٹی سی ریاست فرغانہ کا فرمانروا تھا۔ بابر کے دادا ابو سعید مرزا کے زمانے میں سلطنت کافی وسیع تھی لیکن اُس کی وفات کے بعد سلطنت اُس کے نو بیٹوں نے باہم

بانٹ لی۔ اس سے مرکزی طاقت زائل ہو گئی اور نوزائیدہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں طویل عرصہ تک جنگ وجدل میں مصروف رہیں۔ بابر محض بارہ برس کی عمر میں ریاست فرغانہ کا بادشاہ بنا لیکن اس کے آٹھ چچا فرغانہ کی ریاست کو ہڑپ کرنے کے درپے ہوئے اور انہوں نے ایک پل کے لئے بھی بابر کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ اس کے علاوہ اُزبک سردار شیبانی خان سے بھی بابر نے کئی بار تیغ آزمائی کی۔ 1497ء میں بابر نے سمرقند فتح کر لیا جو اُس کے جدِ امجد امیر تیمور کا پایہ تخت تھا۔ لیکن محض سو دن کی حکمرانی کے بعد یہ شہر اُس کے ہاتھ سے نکل گیا بلکہ فرغانہ کی ریاست بھی بابر سے چھن گئی۔ 1500ء میں بابر نے سمرقند دوبارہ فتح کر لیا لیکن اُزبکوں نے آٹھ ماہ کے محاصرہ کے بعد اس شہر پر دوبارہ قبضہ جما لیا اور بابر جان بچانے کے لئے تاشقند کی جانب بھاگ گیا۔ کافی عرصہ تک بابر دربدر ٹھوکریں کھاتا رہا لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری۔ اُس زمانے میں اُزبک سردار شیبانی خان کی قسمت چمک اُٹھی تھی اور اُس نے مغلیہ شہزادگان کو چپہ چپہ پر شکست دی تھی۔ بابر کی ہمشیرہ بھی اُزبکوں کے پاس اسیر تھی۔

آخرکار 1504ء میں ترک اور تاتاری سپاہی بابر کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور بابر نے کوہ ہندوکش کی دشوار گذار گھاٹیوں سے گذر کر کابل پر قبضہ کر لیا۔ افغانستان کا بادشاہ بن کر بابر نے اپنی آبائی ریاست فرغانہ کی تسخیر کا خیال ترک کر کے برِصغیر پاکستان و ہند کی جانب توجہ مبذول کی اور ہندوستان پر گیارہ بار

فوج کشی کی۔ یہ حملے معمولی نوعیّت کے تھے گویا بابر ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لئے راہ ہموار کر رہا تھا۔

۱۵۱۱ء میں بابر نے ایران کے صفوی حکمران شاہ اسمٰعیل سے مل کر شیبانی خان اُزبک کو شکست دی۔ اُزبک سردار میدانِ جنگ میں کام آیا۔ بابر نے ایرانی فوج کی مدد سے بخارا اور سمرقند فتح کر لیا۔ اُدھر اُس کے چچازاد بھائی مرزا حیدر نے فرغانہ سے اُزبکوں کو مار بھگایا۔ لیکن مغلوں کی قسمت نے یاوری نہ کی۔ اُزبکوں کے نئے سردار عبیداللہ خان نے مئی ۱۵۱۲ء میں بابر کو شکست دے کر سمرقند سے بھگا دیا۔ ایرانی فوج بھی اُزبکوں سے شکست کھا کر واپس بھاگ گئی۔ مجبوراً بابر کابل لوٹ آیا۔ اُس کے بعد اُس نے اپنی آبائی میراث یعنی ماوراءالنہر کا نام تک نہ لیا۔ البتہ بدخشان اُس کے قبضے میں رہا اور ۱۵۲۲ء میں اُس نے قندھار بھی فتح کر لیا۔ کابل سے حملہ آور ہو کر ۱۵۲۶ء میں بابر نے پانی پت کی پہلی لڑائی جیتی تھی اور دہلی و آگرہ پر قبضہ کر کے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ بعد ازاں اُس نے راناسانگا کے خلاف جنگ کر کے شمالی ہندوستان پر اپنے قدم جمائے۔

بابر کی آمد پر برِّصغیر کی سیاسی حالت

سولھویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں لا تعداد چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں تھیں اور مرکزی طاقت زائل ہو چکی تھی۔ تمام ریاستیں ایک دوسرے کی رقیب تھیں اور ہمیشہ ایک دوسرے

کے خلاف برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ ان حالات میں ہندوستان کی تسخیر بے حد آسان تھی۔ پروفیسر ایشوری پرشاد کا قول یوں ہے کہ "لا تعداد چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے جھرمٹ کی بدولت ہندوستان کسی غیر ملکی فاتح کے عزم و استقلال کے سامنے تر نوالہ تھا۔" بابر نے ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر دہلی پر مغلیہ سلطنت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ اُس وقت برِّصغیر کا سیاسی نقشہ حسبِ ذیل تھا:۔

(۱) سلطنتِ دہلی:۔ سلطان ابراہیم لودھی ہندوستان کا سلطان کہلاتا تھا لیکن اُس کی سلطنت بے حد کمزور اور کھوکھلی تھی۔ وہ 1517ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اُس کی ریاست میں دہلی اور آگرہ کے علاوہ پنجاب۔ دوآبہ۔ جونپور۔ بہار۔ بیانہ اور چندیری کے کچھ علاقے شامل تھے۔ پنجاب برائے نام سلطنتِ دہلی کا صوبہ تھا۔ وہاں کا گورنر دولت خان لودھی عملاً خود مختار بن چکا تھا اور خود سری میں مشہور تھا۔ سلطان ابراہیم لودھی زود رنج تھا۔ وہ اپنے اُمراء کا زور توڑنے سے قاصر تھا۔ نیز انہیں خوش بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ ناعاقبت اندیش اور کنجوس تھا۔ اُس کا چچا عالم خان لودھی دہلی کا تخت حاصل کرنے کے درپے تھا۔ بہار میں دریا خان اور اُس کے فرزند بہار خان نے سرکشی اختیار کی تھی۔ جونپور میں بھی افغان اُمراء مرکز سے آزاد ہونے پر تلے ہوئے تھے۔ سلطان ابراہیم لودھی درشت مزاج تھا اور حالات سدھارنے سے قاصر تھا۔ اُمراء نے اپنی اپنی جاگیروں میں عظیم الشان فوج رکھی ہوئی تھی اور بادشاہ فیوڈل حاکم کی مانند بے حیثیت ہو چکا تھا۔ مرکزی

فوجی طاقت کافی کمزور ہو چکی تھی۔ ابراہیم لودھی کا خزانہ بھرپور تھا لیکن اُس نے مزید فوج بھرتی نہ کی اور پانی پت کے میدان میں بابر سے شکست کھا کر مارا گیا۔

(2) کشمیر اور سندھ:- بابر کی آمد پر کشمیر اور سندھ کے علاقے کامل طور پر آزاد تھے۔ شاہ مرزا کی سرکردگی میں کشمیر نے ۱339ء میں خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ اس خاندان کا مشہور ترین حکمران زین العابدین تھا جسے "کشمیر کا اکبر" کہتے ہیں۔ اُس نے 1470ء میں وفات پائی۔ بابر کے زمانے میں کشمیر کے علاوہ سندھ بھی آزاد تھا۔ سندھ نے محمد تغلق کے زمانے سے سلطنت دہلی سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ سندھ پر سولھویں صدی عیسوی تک سمرا خاندان کی حکومت رہی۔ 1520ء میں شاہ بیگ ارغون نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ شاہ بیگ بابر سے شکست کھا کر ہندوستان بھاگ آیا تھا اور سندھ کا مالک بن بیٹھا تھا۔ اُس کے بیٹے شاہ حسین نے ملتان کا الحاق بھی کر لیا تھا۔

(3) گجرات و مالوہ:- گجرات اور مالوہ کی ریاستوں میں گہری رقابت تھی۔ بابر کے زمانے میں مالوہ کا حکمران محمود ثانی تھا اور گجرات کا سلطان مظفر شاہ ثانی تھا۔ میواڑ کے حکمران رانا سانگا نے ان دونوں ریاستوں پر فوج کشی کر کے سیاست کو مزید اُلجھا دیا تھا اور ان ریاستوں کو کمزور کر ڈالا تھا۔ مالوہ کے حکمران محمود ثانی نے اپنے تمام اختیارات اپنے وزیر مدنی رائے کے سپرد کئے ہوئے تھے لیکن اُمراء نے اُس کا اقتدار ختم کرنے کی ٹھانی۔ وزیر نے اپنے بچاؤ کے لئے رانا سانگا کو حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ رانا سانگا نے مالوہ کی فوجوں

کو شکست دے کر محمود ثانی کو گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد سلطان کو رہا کر دیا گیا لیکن ریاست بے حد کمزور ہو گئی۔ چنانچہ 1531ء میں گجرات کے سلطان نے مالوہ پر قبضہ کر لیا۔ میواڑ کے حکمران رانا سانگا نے گجرات کے والی سلطان مظفر شاہ کے خلاف بھی جنگ کی تھی مظفر شاہ نے جولائی 1526ء میں وفات پائی اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ ہمایوں اسی بہادر شاہ کے خلاف بر سرِ پیکار رہا۔

(۷) میواڑ:۔ یہ ریاست راجپوتوں کی ریاستوں میں سے اہم ترین گنی جاتی ہے۔ اس کا دارالخلافہ چتوڑ تھا اور اس ریاست کے حکمران کا نام راجہ سنگرام سنگھ تھا لیکن وہ رانا سانگا کے نام سے مشہور ہے۔ مشہور مورّخ ٹاڈ (Tod) صاحب کا خیال ہے کہ میواڑ کی ریاست وسط ہند کی اہم ترین ریاست تھی اور رانا سانگا نے ۱۰۴ راجپوت سرداروں۔ سات راجوں اور ۹ رایان کو اپنا مطیع بنایا ہوا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ۔ گوالیار۔ اجمیر۔ رامپور۔ سیکری اور آبو کے حکمران بھی رانا سانگا کے باج گذار تھے۔ رانا سانگا نے بابر سے جنگ کنواہہ میں شکست کھائی۔ اگر اس جنگ میں بابر کو شکست ہو جاتی تو ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بجائے ہندو راج قائم ہو جاتا۔

(۸) خاندیش:۔ دریائے تاپتی کی زرخیز وادی کی ریاست خاندیش چودھویں صدی عیسوی سے خود مختار بن چکی تھی۔ اس کا پہلا حکمران ملک راجہ فاروقی تھا۔ گجرات اور احمد نگر کے سلاطین ہمیشہ خاندیش

کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ لہٰذا خاندیش کو ہمیشہ جنگ کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔ 1508ء میں خاندیش کے سلطان داؤد کی وفات کے بعد تخت کے کئی ایک دعوے دار پیدا ہو گئے۔ ریاست جنگ و جدل کا شکار ہو کر کمزور ہو گئی۔ گجرات اور احمد نگر نے ان حالات سے خوب ہاتھ رنگے۔ خاندیش کی ریاست دہلی سے کافی دور تھی اس لئے برِ صغیر کی اپنی سیاست اس ریاست پر اثر انداز نہ ہوئی۔

(6) بنگال اور اُڑیسہ :- فیروز شاہ تغلق کے عہد سے حسینی خاندان کے شاہان نے بنگال کو خود مختار سلطنت بنا لیا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں بنگال کا حکمران علاؤالدین حسین تھا۔ اُس نے اپنی سلطنت کو وسیع تر کر کے کامروپ یا آسام کی سرحد تک اپنی حکومت قائم کی۔ اُن دنوں جونپور کا بادشاہ حسین شاہ دہلی کے سلطان سکندر لودھی سے شکست کھا کر بھاگ آیا اور علاؤالدین حسین نے اُسے پناہ دی۔ اس بنا پر سکندر لودھی بنگال پر حملہ آور ہوا بنگال کے سلطان علاؤالدین حسین کو شکست ہوئی اور اُس نے بہار کی سرحد سے آگے نہ بڑھنے کا وعدہ کیا۔

اُڑیسہ کی ریاست میں ہندوؤں کی حکومت تھی۔ یہ ریاست خاصی بڑی تھی لیکن شمالی ہند کی سیاست سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ اس ریاست کی بدولت دہلی کے سلاطین آسانی سے دکن یا بنگال پر حملہ آور نہ ہو سکتے تھے۔

(7) دکنی ریاستیں :- بندھیاچل کے اُس پار دکن کی چھ خود مختار

ریاستیں تھیں۔ وجیانگر کی ہندو ریاست محمد تغلق کے زمانے سے آزاد چلی آتی تھی اور بابر کے زمانے میں اس ریاست پر کرشنا دیو حکمران تھا۔ دکن کی عظیم الشان اسلامی ریاست جو بہمنی سلطنت کہلاتی تھی زوال پذیر ہو کر پانچ ریاستوں میں بٹ چکی تھی۔ یہ نئی ریاستیں 1481ء میں محمود گاوان کی وفات کے بعد وجود میں آئیں ان ریاستوں کو بعد ازاں مغلوں نے آہستہ آہستہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان ریاستوں کے نام حسب ذیل ہیں :-

(i) برار (1484ء تا 1527ء)

(ii) احمد نگر (1489ء تا 1686ء)

(iii) بیجاپور (1489ء تا 1686ء)

(iv) گولکنڈہ (1512ء تا 1687ء)

(v) بیدر (1526ء تا 1590ء)

نتیجہ :- سولھویں صدی عیسوی میں برصغیر کی سیاسی حالت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی تسخیر کے لئے حالات سازگار تھے۔ مرکزی طاقت مفقود تھی اور ملک لاتعداد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ نیز یہ ریاستیں ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی تھیں۔ پس بابر جیسے عمدہ جرنیل کے لئے جو عزم و استقلال کا پتلا تھا ہندوستان فتح کر لینا آسان امر تھا۔

بابر کے ابتدائی حملے :- پانی پت کی پہلی لڑائی سے بہت پہلے بابر نے ہندوستان پر بہت سے حملے کیئے لیکن یہ حملے اہم نہ تھے بلکہ تسخیر ہند کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے۔ بابر نے برصغیر پر

پہلا حملہ 1505ء میں کیا۔ وہ درہ خیبر سے آگے بڑھ کر کوہاٹ کے راستے ڈیرہ غازی خاں تک پہنچا، لیکن ان علاقوں کا الحاق کئے بغیر اُس نے 1506ء میں کابل واپس لوٹ گیا۔

برّصغیر پر بابر کا اگلا اہم حملہ 1519ء میں تھا۔ اس سال وہ یوسف زئی قبیلے کی گوشمالی کی ..... اور اُس سے خراج وصول کرنے کے لیئے روانہ ہوا اور آگے بڑھ کر اُس نے باجوڑ (Bajaur) کا قلعہ فتح کرلیا۔ پھر بھیرہ فتح کیا جو دریائے جہلم کے کنارے واقع تھا۔ پنجاب کو فتح کیے بغیر بابر واپس لوٹ گیا اور مفتوحہ علاقوں کی گورنری ہندو بیگ کے سپرد کی۔ جونہی بابر واپس لوٹا، بھیرہ اور باجوڑ کے لوگوں نے مغلیہ گورنر کو مار بھگایا۔

ان دنوں دولت خاں لودھی پنجاب کا گورنر تھا جو سلطان ابراہیم لودھی سے بدظن تھا۔ وہ بابر سے خط و کتابت کرکے اُسے دہلی پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دے رہا تھا اور اُسے پنجاب کا مالک تسلیم کرنے پر تیار تھا۔ نیز سلطان ابراہیم کا چچا عالم خاں لودھی بھاگ کر بابر کے پاس پناہ گزیں تھا۔ ان حالات میں بابر اپنے آپ کو پنجاب کا مالک گنتا تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ تیمور کے حملے کے بعد پنجاب کی حکومت بطور ورثہ اس کے پاس ہونی چاہیئے۔ اصلی بات یہ تھی کہ دولت خاں لودھی پنجاب پر قابض تھا اور وہ برائے نام دہلی کے ماتحت تھا۔ وہ بابر کی حمایت کا دم بھرتا تھا، لیکن دل سے وہ بابر کے ساتھ بھی نہ تھا۔

ستمبر 1519ء میں یوسف زئی قبائل کی سرزنش کرتے ہوئے بابر

ایک بار پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور اس بار اُس نے پشاور کو اپنا فوجی اڈہ بنانے کی کوشش کی، لیکن بدخشاں میں گڑبڑ کی خبر پا کر وہ فوراً واپس چلا گیا۔

1520ء میں بھیرہ اور باجوڑ کی دوبارہ تسخیر کے بعد بابر فتوحات کرتا ہوا سیالکوٹ تک جا پہنچا، جہاں لوگوں نے بغیر لڑے ہتھیار رکھ دیے۔ البتہ سید پور کے لوگوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور شکست کھائی، لیکن قندھار میں شاہ بیگ ارغون کی شورش کے پیش نظر بابر فوراً کابل واپس لوٹ گیا۔

پنجاب کی تسخیر:۔ 1524ء میں بابر کو پنجاب کے لودھی گورنر دولت خاں نے برّصغیر پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور اپنی فوج سے اس کی مدد کا وعدہ کیا۔ اُن دنوں بابر قندھار پر قبضہ جما چکا تھا اور شاہ بیگ ارغون بھاگ کر سندھ چلا گیا تھا، لہٰذا بابر پنجاب کی تسخیر پر دل جمعی سے وقت صرف کر سکتا تھا (کیونکہ اُس کی اپنی سلطنت میں اب کامل امن وامان قائم تھا)۔ بابر اپنی فوج سمیت لاہور تک بڑھ آیا۔ بابر کی آمد سے پہلے سلطان ابراہیم لودھی نے اپنی فوج بھیج کر دولت خاں لودھی کو مار بھگایا۔ دہلی کی اس فتح مند فوج کو بابر نے لاہور کے قریب شکست دے دی اور لاہور پر قبضہ جما کر اس شہر کو نذرِ آتش کر دیا۔ پھر اس نے ضلع منٹگمری میں دیپال پور کی مشہور فوجی چھاؤنی کو برباد کیا اور تمام پنجاب کی تسخیر مکمل کی۔ دیپال پور میں دولت خاں لودھی بھی بابر سے آملا اور پنجاب کا گورنر بننے کی خواہش کی، لیکن بابر پنجاب جیسے اہم علاقے کو اپنے پاس رکھنا چاہتا

تھا۔ چنانچہ اُس نے جالندھر کا علاقہ دولت خان کو دیا۔ سلطان پور کی حکومت اُس کے لڑکے دلاور خان کو دی اور دیپال پور کی گورنری عالم خاں لودھی کو بخشی۔

بابر جوں ہی واپس لوٹا دولت خان نے سلطان پور کا علاقہ اپنے لڑکے سے چھین لیا اور عالم خاں لودھی کو بھی دیپال پور سے مار بھگایا۔ سیالکوٹ کی مغل چھاؤنی پر بھی اُس نے قبضہ جما لیا۔ اس دوران میں سلطان ابراہیم لودھی کی ایک فوج پنجاب میں وارد ہوئی، لیکن دولت خان لودھی نے اُسے بھی مار بھگایا۔ بابر نے عالم خاں لودھی کو فوج دے کر دولت خان لودھی کے خلاف بھیجا لیکن وہ دولت خاں سے مل گیا اور دونوں نے دہلی کی تسخیر کے ناکام منصوبے تیار کئے۔

پانی پت کی پہلی لڑائی:۔ پنجاب کے حالات سن کر بابر نومبر 1525ء میں فوج لے کر پنجاب میں وارد ہوا اور سیالکوٹ پہنچ کر دم لیا، جہاں مغلیہ چھاؤنی تھی۔ بابر نے دولت خان کی سرکوبی کے بعد اُسے بھیرہ میں قید کر دیا اور عالم خان بھی بابر کے سامنے تھم نہ سکا۔ پنجاب کی تسخیر کے بعد بابر آگے بڑھا اور پانی پت کے تاریخی میدان میں دہلی کے سلطان ابراہیم لودھی سے نبرد آزما ہوا۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ فیصلہ کن لڑائی ۲۱ اپریل 1526ء کو ہوئی۔ عصر کی نماز سے قبل بابر فتح مند تھا اور ہندوستان کا مالک بن چکا تھا۔ اس لڑائی میں ابراہیم کی فوج ایک لاکھ تھی جس کے ساتھ مست ہاتھی بھی تھے۔ مغل فوج بارہ ہزار تھی اور

ہاتھیوں سے بدکتی تھی۔ بابر نے اپنی فوج کے سامنے خاردار جنگلے نصب کئے اور اُن کے پیچھے بھینسے قطار در قطار کھڑے کر کے اُن کے اگلے پاؤں چمڑے کے رسوں سے باندھ دیے۔ مغلیہ فوج کو دستوں میں تقسیم کیا، مورچے بنائے اور اُن کے پیچھے بندوقچی اور تیر انداز کھڑے کئے۔ ان تدابیر سے سلطان ابراہیم کی عظیم الشان فوج مغلوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی اور نصف روز سے قبل ہندوستانی فوج کو شکست فاش ہوئی اور دہلی کے تخت پر بابر کا قبضہ ہو گیا۔ لودھی سلطان پندرہ ہزار سپاہیوں سمیت میدان جنگ میں کام آیا۔

پانی پت کی لڑائی میں بابر کے توپ خانے کی بدولت مغلوں کو بہت فائدہ رہا۔ یہ توپ خانہ گاڑیوں پر لدا ہوا تھا اور ان گاڑیوں کو بھی چمڑے کے رسّوں سے مضبوطی سے باندھا ہوا تھا گاڑیوں کی اوٹ میں تیر انداز تھے۔

پانی پت کی لڑائی کے بعد بابر نے آگے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کیا اور ہمایوں سیدھا آگرہ پہنچا جہاں شاہی خزانے سے کوہ نور بھی مغلوں کو ملا۔ بابر دس مئی ۱۵۲۶ء کو آگرہ پہنچا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کیا، لیکن تاحال اُس کے قبضے میں صرف دہلی، آگرہ اور گوالیار کا علاقہ تھا، باقی ہندوستان کی تسخیر ابھی باقی تھی۔

جنگ کنواہہ :- میواڑ کے رانا سانگا کا خیال تھا کہ بابر بھی تیمور کی مانند آندھی کی طرح وارد ہو گا اور بگولے کی طرح واپس

ٹوٹ جائے گا لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ بابر اس برِصغیر میں مستقل سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے تو رانا سانگا نے مغلوں کو ہندوستان سے باہر نکال پھینکنے کی ٹھانی اور راجپوتوں کی ایک لاکھ فوج لے کر کنواہہ آ پہنچا۔ یہ مقام آگرہ سے 37 میل دور ہے۔ رانا سانگا کی فوج میں بہت سے راجپوت رئیس بھی شامل تھے۔

۱۶ مارچ 1527ء کو یہ خونریز جنگ لڑی گئی۔ بابر کی فوج قلیل تھی اور بددل ہونے لگی تھی لیکن بابر نے ایک زوردار تقریر سے اپنے سپاہیوں کو ابھارا اور شراب نوشی سے بھی توبہ کی۔ خدا تعالیٰ نے بابر کو اس جنگ میں بھی فتح عطا کی اور راجپوتوں کی کمر بالکل ٹوٹ گئی۔ جنگ کنواہہ پانی پت کی مانند اہم اور فیصلہ کن تھی۔

بابر لکھتا ہے کہ کنواہہ کی جنگ میں راجپوتوں کی فوج دو لاکھ تھی۔ ہندو مؤرخ لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی فوج محض اسی ہزار تھی۔ مغربی مؤرخین رانا سانگا کی فوج کی تعداد ایک لاکھ تصوّر کرتے ہیں۔ مشہور مؤرخ رش بروک ولیمز کا خیال ہے کہ بابر کی فوج آٹھ دس ہزار کے قریب تھی اور اس کے مقابلے پر راجپوتوں کی فوج سات آٹھ گنا زیادہ تھی۔ ہندو مؤرخ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بابر کی فوج میں مقامی افغان سپاہی آ شامل ہوئے تھے، لہٰذا بابر کی فوج چالیس ہزار تھی۔ ہماری رائے یہ ہے کہ پروفیسر رش بروک ولیمز کا اندازہ صحیح ہے۔ بابر کی فوج آٹھ دس ہزار سے زیادہ نہ تھی اور ہندوؤں کی فوج

اسّی ہزار یا ایک لاکھ کے قریب تھی۔

بابر کی دیگر فتوحات:۔ کنواہہ کی جنگ کے بعد بابر نے راجپوتوں اور افغانوں کے گٹھ جوڑ کو ختم کرنے کے لیئے چندیری کو فتح کیا۔ اس دوران میں افغانوں نے بہار میں ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی کو بادشاہ بنا لیا تھا۔ بابر ایک عظیم فوج لے کر (جس کی تعداد ایک لاکھ تھی) بنارس کی جانب بڑھا تاکہ افغانوں سے نبرد آزمائی کرے۔ مغلیہ فوج اور افغانوں کی جنگ 6 مئی ۱۵۲۹ء کو دریائے گھاگرا کے کنارے پر ہوئی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دریائے گھاگرا پٹنہ کے قریب دریائے گنگا سے آ ملتا ہے مؤرخین نے اسے گھاگرا کی جنگ قرار دیا ہے۔ اس لڑائی میں افغان فوج کو شکست فاش ہوئی اور افغان طاقت کی بحالی کا خطرہ مٹ گیا۔ گویا شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد قائم ہوئی۔

بابر کی موت:۔ جنگ و جدل سے فراغت کے بعد بابر نے ابھی چین کا سانس نہ لیا تھا کہ اُسے موت کا پیغام آیا۔ مشہور یہ ہے کہ دسمبر 1530ء میں ہمایوں بخار میں مبتلا ہوا اور جان کے لالے پڑ گئے۔ شاہی طبیب عاجز آ گئے، بابر نے خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا، ہمایوں کی بیماری مجھے مل جائے اور میرے عوض تو اسے زندگی عطا کر۔ اتفاق یہ ہے کہ ہمایوں جلد صحت یاب ہو گیا اور بابر چند روز بخار میں مبتلا رہ کر 26 دسمبر 1530ء میں راہیٔ ملک عدم ہوا۔ مغل مؤرخین فخریہ بیان کرتے ہیں کہ باپ نے اپنی جان بیٹے پر نثار کر دی۔

بابر اعلیٰ صفات کا مالک تھا اور فیاضی میں بے مثال تھا۔ فوجی قابلیت کی بناء پر اُس نے برِصغیر میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی لیکن انتظامی جوہر نہ دکھا سکا۔

بابر کا کردار اور شخصیت :۔ بابر کو ایشیا کے تاجداروں میں اعلےٰ مقام حاصل ہے۔ وہ مورخ و سپہ سالار، مصنف منصف جرنیل تھا۔ جنگ و جدل کا دلدادہ تھا اور فنون حرب سے پوری واقفیت رکھتا تھا۔ اُس کی فوج میں اعلےٰ توپچی بھی تھے۔ وہ محض بارہ ہزار قلیل فوج لے کر ہندوستان وارد ہوا لیکن اُس نے سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دینے کے علاوہ رانا سانگا کی عظیم الشان فوج کو بھی شکست فاش دی۔ یہ کارنامہ معمولی نہیں۔ بلا شبہ بابر عمدہ جرنیل تھا اور اُس کا شمار عظیم ترین فاتحین میں ہوتا ہے۔ پانی پت کی پہلی لڑائی میں بابر نے دانشمندی سے کام لے کر احتیاطی تدابیر اختیار کیں اور اپنی فوج کو مختلف دستوں میں تقسیم کرکے دشمن کو بے بس کردیا۔ نیز مست ہاتھیوں سے بچنے کے لئے عمدہ تدبیر اختیار کی۔ جنگ کنواہہ میں بابر نے مؤثر تقریر کرکے اپنی فوج کا دل بڑھایا اور فتحیاب ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر اعلےٰ دل و دماغ کا مالک تھا اور عمدہ جنگی چالوں کے علاوہ اپنی فوج کی نفسیات بھی سمجھتا تھا۔

بابر خوب فیاض تھا اور اُس کے فوجی سپاہی اُس پر جان دیتے تھے۔ اس کی رگوں میں اگرچہ چنگیزی خون موجود تھا اور امیر تیمور جیسے سفاک اُس کے آباد اجداد تھے لیکن اُس نے کبھی خون کا ایک قطرہ

بھی بلا ضرورت نہ گرایا۔ وہ ایرانی ثقافت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ علوم و فنون کا دلدادہ تھا۔ خود شاعر تھا۔ حسن قدرت کا متوالا تھا۔ زندہ دلی اور خوش باشی اُس کا مطمح نظر تھا۔ ابتدائی دور میں اُسے پے در پے شکستیں ہوئیں۔ اکثر اُسے سر چھپانے کو بھی جگہ میسر نہ ہوتی تھی لیکن اُس نے عزم و استقلال کا دامن نہ چھوڑا۔ نیز کسی حالت میں بھی اُس نے افسردگی یا بزدلی کو دل میں راہ نہ دی۔ بابر کے کردار کی بہترین خوبی یہ ہے کہ وہ ہر وقت ہشاش بشاش رہتا تھا اور زندہ دلی سے زندگی گذارنے کا عادی تھا۔ عیش کوشی کے باوجود بابر کبھی بدمست نہ ہوتا تھا۔ اُسے ادب اور شاعری سے دلی لگاؤ تھا۔ شراب کے دور چلتے تھے۔ وہ ندیموں کی صحبت کے مزے لوٹتا تھا۔ موسیقی اور ناچ سے بھی حظ اُٹھاتا تھا۔

بابر کی شخصیت میں دلکشی اور جاذبیت ہے۔ اُس میں ادبی ذوق، شعر گوئی اور شیرینیٔ گفتار کے علاوہ مردانگی، حوصلہ اور ہمت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ بلا کا نڈر اور خطرات میں کود جانے والا انسان تھا۔ سردیوں میں برفوں سے مستور چوٹیاں اُس کے عزم کو متزلزل نہ کر سکیں۔ وہ بے دھڑک ہرات سے کابل پہنچا۔ راستے میں اُس نے برف کوٹنے سے دریغ نہ کیا۔ اُس کی زندگی کے نشیب و فراز کو دیکھ کر انسان اُس کی ہمت کی داد دیتا ہے۔

بابر موقع شناس اور دانشمند تھا۔ علم قیافہ میں مہارت رکھتا تھا۔ اُس کی عقابی نظر قابل داد ہے۔ وہ ایک ہی نظر میں دوسروں کے دل کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔ شیر خان کے دل کی خوابیدہ اُمنگوں

کو اُس نے فوراً بھانپ لیا لیکن شیر خان نے بھی اُس کے تیور دیکھ کر راہ فرار اختیار کی۔ تزک بابری کے مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ بابر مختلف اشخاص کے بارے میں ہمیشہ صحیح رائے قائم کرتا تھا۔ اپنی تحریر میں وہ صاف گوئی سے کام لیتا ہے۔ بابر تیرنے کا شوقین تھا اُس نے ہندوستان کا ہر دریا تیر کر پار کیا۔ بابر نے کابل اور ہرات کے پھلوں کی تمام اقسام مزے لے لے کر گنوائی ہیں۔ لیکن بابر نے ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ اُن میں وسعت نظر نہیں اور وہ صحبت کا لطف اُٹھانے سے عاری ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستانیوں میں خوبصورتی کا فقدان ہے اور اُن میں دوستی۔ اختلاط۔ موانست اور معاشرتی لطف اندوزی غائب ہے۔ نیز لوگ کور ذوق ہیں۔ بابر کو شکایت تھی کہ ہندوستان کے لوگ سلجھے ہوئے اور آداب نہیں رکھتے فن تعمیر کے ماہر نہیں۔ اُن کے جسم صحت مند اور متناسب نہیں۔ اُن کی رہائش گاہیں بھی عمدہ نہیں۔ الغرض ہندوستان میں نہ عمدہ حمام ہیں، نہ مشعلیں، نہ پھل، نہ باغات، نہ انگور، نہ سرد پانی، نہ برف۔ الغرض بابر کو ہندوستان میں سوائے اس ملک کی دولت کے کوئی دلکشی یا جاذبیت نظر نہ آئی۔

تزک بابری :۔ بابر نے ترکی زبان میں اپنی سرگزشت لکھی ہے یہ کتاب ترکی نثر کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ اُس کے الفاظ سے شوکت اور مردانہ پن نمایاں ہے۔ اسلوب بیان میں لفاظی کی بجائے سادگی اور موزونیت ہے۔ سلاست اور روانی کے علاوہ کتاب میں منطقی چاشنی

اور ندرتِ بیان ہے۔ ادب میں اس کتاب کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کے فارسی تراجم اکبر کے عہد میں ہوئے۔ اب اس کتاب کے ترجمے اکثر یورپی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں ایس لین پول کے علاوہ مسز بیورج نے بھی تزک بابری کا ترجمہ کیا ہے۔

تزک بابری کی حیثیت معمولی ڈائری جیسی نہیں۔ بلکہ اُسے مطلع السعدین اور تاریخ رشیدی سے کئی گنا بلند مقام حاصل ہے۔ تزک بابری کو مستند تاریخ گنا جاتا ہے۔ بابر نے اچھے مؤرخ کی مانند چشم دید واقعات بلا کم و کاست بیان کئے ہیں۔ وہ سنی سنائی باتوں پر کان نہیں دھرتا بلکہ واقعات کو تحقیق کے بعد پوری ذمّہ داری سے بیان کرتا ہے۔ پس تزک بابری کو وسط ایشیا کی مستند (AUTHENTIC) تاریخ قرار دیا گیا ہے۔

تزک بابری سے بابر کے اپنے کردار اور تاریخی واقعات پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ پس تزک بابری ایک کار آمد تاریخ ہے۔ بعد ازاں شہنشاہ جہانگیر نے بھی بابر کے نقش قدم پر چل کر تزک جہانگیری لکھی۔

تزک بابری سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ بابر فن تعمیر کا شوقین تھا۔ اُس نے ہندوستان کے اکثر مقامات پر بارہ دریاں تعمیر کرائیں اور باغات لگوائے۔ سدا بہار درخت۔ فوّارے اور تالاب بابر کی اختراع تھے۔ بابر کے زمانے سے مغلیہ باغ چار حصوں میں منقسم ہوتے تھے۔ مغلیہ باغ کو اسی بنا پر چہار باغ کہتے تھے۔

تاریخ میں بابر کا مقام:- بابر کی وصیت سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ مذہبی رواداری کا قائل تھا اور اس بات پر زور دیتا تھا

کہ ہندو رعایا سے اچھا سلوک کیا جائے۔ مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ بابر انتظامی صلاحیت سے خالی تھا۔ اُس نے سلطنت کے استحکام کے لئے کوئی قدم نہ اُٹھایا اور اپنے بیٹے کے لئے کانٹوں سے بھرپور تخت پیچھے چھوڑا ہماری رائے یہ ہے کہ بابر نے محتاط پالیسی اختیار کی اور غیر ملکی لوگوں کو آہستہ آہستہ رام کر کے مطیع بنانا چاہا۔ لیکن موت نے اُسے مہلت نہ دی۔ بابر نے سابقہ انتظام سلطنت برقرار رکھا اور شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کے قیام کو غنیمت جانا۔ بابر کے زمانے میں ایران اور توران میں مذہبی جھگڑے مصیبت کا باعث بنے رہے لیکن بابر نے رعایا پروری اور رواداری سے کام لیا۔ اُس نے مذہب کو سیاست سے الگ رکھا۔ وہ رعایا کے ہر فرد سے عمدہ سلوک کا حامی تھا اور عوام کی بہبودی کا خواہاں تھا۔ بابر نے حکمرانی کے نئے تجربے نہ کئے۔ انتظام سلطنت کے نئے منصوبے نہ سوچے۔ اُس نے مفتوحہ علاقے اپنے فوجی افسروں میں بانٹ کر جاگیردارانہ نظام قائم رکھا اُسے نت نئی اصلاحات کا شوق نہ تھا۔ محض اپنی زوردار شخصیت کی بنا پر وہ کامیاب حکمران ثابت ہوا۔ اُس کے مرتے ہی ہمایوں کو ناکامی کا سامنا ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ بابر نے انتظامی ڈھانچے کی اصلاح نہ کی تھی اور ہمایوں کے اپنے کردار کی خامیوں اور اُس کی نرم پالیسی کی بدولت سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ پس بابر کو اعلےٰ منتظم یا سیاستدان نہیں گنا جا سکتا۔ وہ محض فوجی دماغ۔ اعلےٰ جرنیل اور فاتح تھا۔ اُس نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد ضرور رکھی لیکن اُسے استحکام نہ بخشا۔ اکثر مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ بابر کو تاریخ میں بلند مقام

حاصل نہیں ہے۔ وہ محض ذاتی تھا۔ البتہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بابر کی شخصیت میں گوناگوں رنگینی، دلکشی اور جاذبیت تھی۔ وہ اعلیٰ صفات کا مالک تھا۔

بابر کے بارے میں مؤرخین کے اقوال کافی دلچسپ ہیں۔ چند اقوال درج ذیل ہیں:۔

(۱) ابوالقاسم فرشتہ نے بابر کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ "بابر حسین و جمیل تھا۔ چہرے کی دلکشی کے علاوہ اس کے طرزِ تکلم میں دلربائی اور طبیعت میں مٹھاس تھی۔ اس کی گفتگو دل کو موہ لیتی تھی اور ہمیشہ تصنع اور بناوٹ سے خالی ہوتی تھی۔ بابر کی بات چیت میں خوش اخلاقی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی"۔

(۲) "تاریخ رشیدی":۔ تاریخ رشیدی میں بابر کے ہم عصر مؤرخ مرزا حیدر نے (جو بابر کا چچازاد بھائی بھی تھا) یوں لکھا ہے کہ "بابر جیسی صلاحیتیں اور لیاقت خاندان کے کسی دوسرے فرد میں نہ تھیں بلکہ ہماری نسل میں سے کوئی بھی بابر جیسے تجربات اور حیران کن معرکوں سے دوچار نہ ہوا ہوگا۔ بابر کی ذات لاتعداد خوبیوں سے مزین تھی اور اُس کے کمالات ان گنت تھے۔ لیکن شجاعت، انسان شناسی اور ملاطفت و موانست میں وہ یکتا تھا"۔

(۳) پروفیسر رشبروک ولیمز یوں رقمطراز ہیں:۔

"بابر کی شخصیت میں آٹھ بنیادی صفات تھیں:۔ وہ صائب رائے و پاکیزہ عزائم رکھتا تھا۔ فتوحات کے طریقے، حکمرانی کے ڈھنگ اور عوام کو خوشحال بنانے کے ذرائع جانتا تھا۔ انصاف کا دلدادہ تھا۔

رعایا سے نرمی کا سلوک کرتا تھا اور اپنی سپاہ کا دل موہ لیتا تھا۔"

"Babur possessed eight fundamental qualities—lofty judgment, noble ambition, the art of victory, the art of government, the art of conferring prosperity upon his people, the talent of ruling mildly the people of God, ability to win the hearts of his soldiers and love of justice."

(4) پروفیسر شرما کی رائے یہ ہے:-

"بابر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں لیڈر شپ کی خداداد قابلیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔"

"He possessed in an eminent degree the supreme virtue of a born leader of men." (S. R. Sharma).

(5) ایرسکائن (Erskine) کی رائے یہ ہے کہ:-

"بابر کے کردار کا نفیس ترین پہلو یہ ہے کہ وہ انسان شناس ہونے کے علاوہ طبعاً نرم دل اور شفیق تھا۔"

"No part of his character is more admirable than his uniform humanity and kindliness of disposition"

(6) ڈاکٹر ایشوری پرشاد کا قول یہ ہے کہ:-
"قرونِ وسطیٰ کی پوری تاریخ میں بابر سے زیادہ دلکش اور جاذب شخصیت نہیں ملتی"

"Babur is one of the most fascinating personalities in the whole range of medieval Indian History."

(7) ڈاکٹر وی۔ اے سمتھ کی رائے کافی مشہور ہے:-
"اپنے دور کے تاجداروں میں سے بابر ایشیا بھر میں درخشاں شخصیت رکھتا تھا بلکہ کسی بھی دور یا ملک کے حکمرانوں کے مقابلے پر اُسے تاریخ میں بلند مقام دیا جا سکتا ہے"

"Babur was the most brilliant Asiatic Prince of his age, and worthy of a high place among the sovereigns of any age or country."

(8) مشہور مؤرخ ایس۔ لین پول نے نہایت شاندار الفاظ میں بابر کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ لین پول کی تحریر ذرا طویل ہے

لیکن ہم اُس کا مکمّل پیراگراف درج کرتے ہیں تاکہ لین پول کا عالمانہ جائزہ اور اُس کے الفاظ کی چاشنی برقرار رہے :-

"بابر کی شخصیّت وسط ایشیا اور ہندوستان کے مابین رشتۂ اتحاد ہے۔ وہ تاتاری خانہ بدوش قبیلوں کے جتھوں اور باقاعدہ نظم و نسق والی شاہی حکومتوں کی درمیانی کڑی ہے۔ اُسے امیر تیمور اور اکبر اعظم کے دور کے مابین اصلی رابطہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایشیا کی دو آسمانی بلاؤں (یا سنگدل فاتحین) یعنی چنگیز خان اور امیر تیمور کا خون اُس کی رگوں میں موجزن تھا لیکن اُس نے خون کا ایک قطرہ بھی بے سود نہ بہایا۔ خانہ بدوش تاتاریوں کی مانند وہ شجاعت کا پتلا اور بے باک انسان تھا لیکن اُس کے افعال سے ایرانی کلچر اور مہذّب شہریوں کی صفات عیاں تھیں۔ وہ اپنے ساتھ ہندوستان میں منگولوں جیسی سرگرمی و مستعدی لایا۔ ترکوں کی بلند ہمتی، اور صلاحیّت لایا اور ان صفات سے ہندوؤں کی کاہلی اور بے پرواہی قدرتی طور پر دور ہوئی۔ قسمت نے بلاشبہ بابر کو سپاہیانہ جوہر عطا کیے تھے (اور وہ ہندوستان کا فاتح بن گیا تھا) لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اعلےٰ ادبی ذوق رکھتا تھا اور اُس کی ناقدانہ نگاہ بھی ارفع و اعلیٰ تھی۔ بابر نے سلطنت کو استحکام نہ بخشا لیکن اُس نے مغلیہ حکومت کی بنیاد ڈالی جسے اُس کے پوتے اکبر اعظم نے منتہائے کمال تک پہنچایا۔ ہندوستان کی تسخیر کی بنا پر اُسے تاریخ میں اہمیّت حاصل ہے کیونکہ اُس کے جانشینوں کی بدولت برّصغیر میں عظیم الشان مغلیہ سلطنت قائم

ہوئی لیکن سوانح نگاری اور ادب میں اُسے بلند مقام حاصل ہے
تزک بابری کی چاشنی اُس کے فوجی کارناموں کے مقابلے پر زیادہ
لازوال ہے۔ تزک بابری اُس کی ذاتی صفات کی بہترین عکاسی
کرتی ہے۔ اُس کے ادبی ذوق اور ناقدانہ نگاہ کی درخشاں مثال ہے۔"

"He is the link between central Asia and India, between predatory hordes and imperial governments, between Tamerlane and Akbar. The blood of the two great scourages of Asia, Chingiz and Timur, mixed in his veins, and to the daring and restlessness of the nomad Tartar he joined the culture and urbanity of the Persian. He brought the energy of the Mongol, the courage and capacity of the Turk to the listless Hindu; and himself a soldier of fortune and no architect of empire, he yet laid the first stone of the splendid fabric which his grandson Akbar achieved. His permanent place in history rests upon his Indian conquests, which opened the way for an imperial line, but his place in biography and literature is determined not by his daring adventures and persevering efforts in his earlier days, but by the delightful memoirs in which he related them. Soldier of fortune as he was, Babur was not the less a man of fine literary taste and fastidious critical perception."

Typical Questions

Q. 1. "India was a Congeries of states at the opening of the 16th century." In the light of this remark describe the political condition of Indo-Pakistan on the eve of Mughal conquest.

Q. 2. Sketch the career of Babur up to the First Battle of Panipat.

Q. 3. Describe the character of Babur and explain the historical and literary value of his Memoris.

Q. 4. Comment upon one of the following remarks about Babur :—

(*a*) "Babur was the most brilliant Asiatic Prince of his age, worthy of a high place among the sovereigns of any age or country."

(*b*) Babur is one of the most fascinating personalities in the whole range of medieval Indian history."

(*c*) Soldier of fortune as he was, Babur was no less man of a fine literary taste and fastidious critical perception."

(*d*) "Babur's engaging personality, artistic temperament and romantic career make him one of the most attractive figures in the history of Islam."

امتحانی سوالات

۱- سولھویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کا مرکزی شیرازہ بکھرا ہوا تھا اور لاتعداد چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ بن چکا تھا۔" اس رائے کی روشنی میں مغلوں کی آمد پر برِ صغیر کی سیاسی حالت مختصر طور پر بیان کیجئے۔

2- پانی پت کی پہلی لڑائی تک بابر کی زندگی کی سرگزشت سپرد قلم کیجئے۔

3- بابر کا کردار بیان کیجئے اور تزک بابری کی تاریخی و ادبی اہمیت واضح کیجئے۔

4- مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک پر تبصرہ کیجئے:-

(ا) "اپنے دور کے تاجداروں میں سے بابر ایشیا بھر میں درخشاں شخصیت رکھتا تھا بلکہ کسی بھی دور یا ملک کے حکمرانوں کے مقابلے پر اُسے تاریخ میں بلند مقام دیا جا سکتا ہے۔"

(ب) "قرونِ وسطیٰ کی پوری تاریخ میں بابر سے زیادہ دلکش اور جاذب شخصیت نہیں ملتی۔"

(ج) "قسمت نے بلاشبہ بابر کو سپاہیانہ جوہر عطا کیے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اعلیٰ ادبی ذوق رکھتا تھا اور اُس کی ناقدانہ نگاہ بھی ارفع و اعلیٰ تھی۔"

(د) "تاریخ اسلام میں بابر نہایت دلکش ہستی ہے کیونکہ اُس کی شخصیت میں بلا کی کشش ہے۔ اُس کا مزاج آرٹسٹ کی مانند ہے اور اُس کی داستانِ حیات رومانی ہے۔"

اٹھائیسواں باب

ہمایوں اور شیر شاہ سُوری

بابر کی وفات کے بعد اُس کا بڑا بیٹا نصیرالدین ہمایوں ۲۹ دسمبر 1530ء کو تخت نشین ہُوا۔ اُس کا نام اگرچہ "ہمایوں" تھا لیکن اُس کا عہد حکومت نحوست، بد قسمتی اور ناکامیوں کا پلندہ ثابت ہُوا۔ وہ اگرچہ عمدہ دل و دماغ رکھتا تھا اور علوم و فنون کا دلدادہ تھا لیکن اُس کا اپنا کردار ہمایوں کا بدترین دشمن ثابت ہُوا۔ وہ عزم و استقلال سے عاری تھا اور نامناسب حد تک نرم دلی دکھاتا تھا۔ نیز وہ سیاسی بصیرت سے محروم تھا۔ بہادر ضرور تھا لیکن فوجی چالیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ کتب خانے میں کئی کئی روز بند رہتا تھا اور امور سلطنت سے غفلت برتتا تھا۔ وہ شاہی حرم میں کافی وقت صرف کرتا تھا۔ وہ معاملات کو گہری نظر سے جانچنے کی بجائے جذباتیت سے کام لیتا تھا۔ اُس کے بھائیوں نے ہمایوں کی مشکلات میں بے حد اضافہ کیا لیکن ہمایوں نے تخت نشین ہوتے ہی یہ فاش غلطی کی کہ بابر کی اس وصیّت کو حد سے زیادہ اہمیت دی کہ اپنے بھائیوں سے اچھا سلوک کرنا۔ ہمایوں نے سلطنت کے اہم حصّے اپنے بھائیوں کو بخش دیئے۔ اُس نے کامران کو کابل اور قندھار کی حکومت عطا کی سنبھل کا علاقہ عسکری کو دیا مرزا ہندال

کو اور کی جاگیر بخشی - کابل اور قندھار کے علاقے جب ہمایوں کے پاس نہ رہے تو وسط ایشیا سے اُس کا تعلق ٹوٹ گیا اور فوجی بھرتی کے خطّے اُس کے ہاتھ سے نکل گئے - اُس کے تمام بھائی اُس کے بدخواہ تھے بلکہ مصیبت کے وقت بھی انہوں نے ہمایوں کا ساتھ نہ دیا - چنانچہ کامران نے شروع سے ہی کابل اور قندھار سے آگے بڑھ کر پنجاب پر قبضہ جما لیا - ہمایوں یہ سمجھ نہ سکا کہ پنجاب ہندوستان کے لئے "بازوئے شمشیر زن" ہے - اُس نے کامران کے خلاف کارروائی کرنے کی بجائے خود بخود پنجاب کا صوبہ اُس کے حوالے کیا بلکہ شاہی فرمان جاری کر کے حصار فیروزہ تک تمام علاقے کامران کو بخشے - یہ فیاضی سلطنت پر کلہاڑا چلانے کے مترادف تھی -

مشہور مؤرخ رشبروک ولیمز کی رائے یہ ہے کہ بابر نے سلطنت کو استحکام بخشنے کی بجائے ایک ایسا نظام حکومت ورثے میں دیا جو جنگ کے ایام میں بے شک کام دے سکتا تھا لیکن امن کے دنوں میں ناکارہ اور بودا تھا "

" Babur bequeathed to his son a monarchy which could be held together only by the continuance of war conditions, which in time of peace was weak, structureless and invertebrate."

ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ ہمایوں نے متعدد فاش غلطیوں کا ارتکاب کیا اور اپنے کردار کی خامیوں کی بدولت سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بلکہ ایس۔ لین پول نے ہمایوں پر نہایت عمدہ فقرہ چست کیا ہے کہ "ہمایوں زندگی بھر ٹھوکریں کھانے اور فاش غلطیاں کرنے کا عادی تھا۔ حتیٰ کہ آخری وقت بھی ٹھوکر کھا کر گرا اور موت کی آغوش میں جا بیٹھا۔"

"If ever there occurred a chance or possibility for Humayun to fall or make a mistake, he would never miss it.......... He tumbled through life and tumbled out of it."

ہمایوں کی مشکلات اور فاش غلطیاں بیان کرنے سے قبل اس کے کردار کا جائزہ لینا سودمند ثابت ہو گا۔

ہمایوں کا کردار:- ہمایوں ثقافت اور علم پروری میں بلند مقام رکھتا تھا۔ وہ سلجھا ہوا انسان تھا۔ بذلہ سنج۔ ملنساری اور خوش اخلاقی میں ثانی نہ رکھتا تھا۔ جنگجوئی اور بہادری میں کسی سے کم نہ تھا لیکن اسے وقت کی نزاکت کا کبھی احساس نہ ہوتا تھا۔ وہ جنگی چالیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ سیاسی بصیرت سے محروم تھا۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی بجائے وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا تھا۔ عزم و استقلال سے یکسر محروم تھا۔ وہ کئی ارادے باندھتا تھا اور پھر خود ہی ان کو

توڑ دیتا تھا۔ بابر کی وفات کے بعد التمش جیسے زیرک اور ہوشمند حکمران کی ضرورت تھی لیکن ہمایوں ان تمام صفات سے خالی تھا۔ لین پول کی رائے بالکل درست ہے کہ ہمایوں کا بدترین دشمن اُس کا اپنا کردار تھا۔ اُس نے شیر خان کے خلاف بروقت فوجی کارروائی نہ کی اور افغانوں کے خلاف شروع سے ہی اقدام کرنے کی بجائے انہیں طاقتور بن جانے کی مہلت دی۔ وہ گجرات کی تسخیر میں مگن رہا لیکن استحکام سلطنت کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اُس کی فوج میں رنگا رنگ کے سپاہی بھرتی ہو گئے جن کی وفاداری محل نظر تھی۔ پس وہ سیاست اور انتظامی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ تن آسان۔ عیش کوش تھا۔ چنانچہ دس سال کے عرصے میں یعنی ۱۵۴۰ء میں وہ تخت سے محروم ہو گیا۔ اس عرصے میں انتظام سلطنت۔ فوجی یا مالی اصلاحات کی جانب اُس نے رتی بھر توجہ نہ کی۔ اگر وہ اکبر کے بعد تخت نشین ہوتا تو شاید بنی سنوری ہوئی سلطنت برقرار رہتی۔ بابر کی وفات کے بعد یہ لازم تھا کہ اُس جیسا بادشاہ ناکام ثابت ہو۔

ہمایوں شریعت کا پابند اور پکا سُنی مسلمان تھا لیکن مذہبی اُمور میں وہ رواداری سے کام لیتا تھا۔ وہ درویشوں کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا تھا اور علمی مشاغل کا دلدادہ تھا۔ میدان جنگ میں بھی کتابوں کا ذخیرہ اُس کے ساتھ جاتا تھا۔ اُسے ریاضی اور علم ہیئت میں خاص شغف تھا۔ اُس نے دہلی میں رصدگاہ (Observatory) کے قیام کے لیے آلات مہیا کیے لیکن اچانک مرجانے سے یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ ہمایوں کو فن تعمیر اور مصوری میں بھی کافی شوق تھا۔

اُس نے دہلی کے قریب دین پناہ نامی شہر بسایا جو دریائے جمنا کے کنارے واقع تھا۔ اس شہر میں اُس نے خوبصورت باغات اور شاہی محل بنوائے اُسے خوش نویسی میں مہارت تھی۔ ایران سے واپسی پہ وہ دو عظیم المرتبت مصوّر میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد۔ اپنے ساتھ لایا۔ اکبر کے عہد میں ان مصوّروں کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ہمایوں کے عہد کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:-

(۱) 1530ء سے لے کر 1540ء تک۔ اس زمانے میں وہ برِّ صغیر کے اطراف و اکناف میں فتوحات کرکے اپنا شوق پورا کرتا رہا لیکن سلطنت کے استحکام اور انتظامی امور کی جانب اُس نے بالکل توجّہ نہ کی۔ اُس نے شیر خان کو حقیر سمجھ کر اُس کا سر نہ کچلا اور آخرکار اُسی کے ہاتھوں شکست کھا کر ایران بھاگ گیا۔ وہاں وہ پندرہ سال تک شاہ طہماسپ کا مہمان بن کر جلاوطنی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ آخرکار 1555ء میں اُس نے شیر شاہ سوری کے جانشینوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ایرانی فوج کی مدد سے ہندوستان پر حملہ کیا اور سرہند کے قریب سکندر شاہ سوری کو شکست دے کر دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرلیا۔

(۲) 1555ء میں دوبارہ دہلی میں ہمایوں کی تاجپوشی ہوئی۔ ابھی اُس نے اپنے دشمنوں کا پوری طرح سے صفایا نہیں کیا تھا کہ چند ماہ بعد وہ شاہی محل کے زینے سے پھسل کر سر کے بل گرا اور زخموں کی تاب نہ لاکر 26 جنوری 1556ء کو فوت ہوا۔

ہمایوں کی ابتدائی مشکلات

(۱) ہمایوں کو لاتعداد مشکلات ورثے میں ملی تھیں۔ ہندوستانی رعایا کا دل موہ لینے یا ملکی نظم ونسق سنوارنے کی بابر کو مہلت نہ ملی تھی۔ خزانہ بھرپور نہ تھا اور فوجی جاگیردار نئے بادشاہ کی کمزوریوں سے واقف تھے، لہٰذا وہ جان نثاری کی بجائے عافیت کوشی میں مگن تھے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ہمایوں نے بھائیوں کو خوش کرنے کے لئے سلطنت کے حصے بخرے کرڈالے تھے جس سے مرکزی طاقت کمزور ہو گئی تھی۔ ہمایوں کی ایک بدقسمتی اور تھی کہ بھائیوں کے علاوہ اُس کا ہر رشتہ دار اس کے لئے مصائب کا باعث بنا اور نازک دور میں بھی اُسے بغاوتوں سے پریشان رکھا۔ چنانچہ محمد زمان مرزا نے اُسے خوب دق کیا۔ وہ ماں کی جانب سے ہمایوں کا قریبی رشتہ دار تھا اور والئی ہرات سلطان حسین بائیقرا کی نسل سے تھا۔ محمد زمان مرزا جنگ وجدل میں مہارت رکھتا تھا اور دہلی کا تخت حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ ایک اور تیموری شہزادہ محمد سلطان بھی ہمایوں کا رقیب تھا اور یہ دونوں بہادر شاہ والئی گجرات کے پاس پناہ گزین تھے۔ بابر کے ایک اور رشتہ دار مہدی خواجہ نے بابر کے وزیر خلیفہ نظام الدین کی مدد سے دہلی کے تخت پر قبضہ جمانا چاہا لیکن ناکام رہا۔ قریبی رشتہ داروں کے علاوہ مغل جاگیردار بھی سلطنت کی کمزوری کا باعث تھے کیونکہ وہ خود غرض تھے اور اپنی اپنی طاقت بڑھانے میں مگن تھے۔

(۲) افغان اُمراء کا سر کچلنا باقی تھا۔ وہ اپنی سلطنت کی

بحالی کے لئے بے قرار تھے اور مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ سلطان ابراہیم لودھی کا بھائی محمود لودھی کھوئی ہوئی سلطنت کی بحالی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ عالم خان لودھی بھاگ کر بہادر شاہ والئے گجرات کے پاس مقیم تھا، اور آگرے پر حملے کے منصوبے سوچ رہا تھا۔ ادھر شیر خان سوری بھی افغانوں میں جذبۂ قومیت پیدا کرکے مغلوں کو نیچا دکھانے کے درپے تھا۔ بنگال کا حاکم نصرت شاہ بھی افغانوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ اُن دنوں بہار کے صوبے میں افغان اُمراء نے بہت زور پکڑ لیا تھا اور بنگال کا سلطان نصرت شاہ اُن کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔

(ج) والئے گجرات بہادر شاہ نے مالوہ فتح کر لیا تھا اور میواڑ کی تسخیر کے منصوبے مکمل کر چکا تھا۔ اُس کے عزائم یہ تھے کہ دہلی کے تخت پر قبضہ جمائے۔ حالات کے پیش نظر اُس نے بہار کے افغانوں کا تعاون حاصل کر لیا تھا تاکہ دونوں مل کر مغلوں کو برّصغیر سے نکال باہر کریں۔

ان حالات میں یہ لازم تھا کہ مغل شہنشاہ فوجی قابلیت کے علاوہ سیاسی بصیرت کا مالک ہو۔ لیکن جواں سال بادشاہ ہمایوں (جس کی عمر تخت نشینی کے وقت 23 سال تھی)، عزم و استقلال سے عاری تھا۔ علمی لیاقت میں وہ بلاشبہ بلند تھا لیکن مشکلات کے نرغے میں التمش اور بلبن جیسے صاحب عزم و فراست جرنیل کی ضرورت تھی، نہ کہ اُس شخص کی جو نام کا "ہمایوں" ہو لیکن قوت ارادی سے محروم ہو، مستقل مزاجی سے عاری ہو اور جلدی فیصلہ کرنے

سے یکسر قاصر ہو۔ اُس پر طرہ یہ کہ ہمایوں وقت کی قدر و قیمت نہ جانتا تھا اور مناسب موقع پر سرگرم عمل نہ ہوتا تھا۔ اگر وہ دور اندیش ہوتا تو شیر خان کو طاقتور بن جانے کی مہلت نہ دیتا اور گجرات کی تسخیر میں وقت ضائع نہ کرتا۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ 1533ء میں اُس نے والئ گجرات بہادر شاہ کے خلاف فوری طور پر فوجی کارروائی کرنے کی بجائے ڈیڑھ سال ضائع کیا اور دین پناہ کی تعمیر میں مصروف رہا۔ دہلی اور آگرہ میں جشن ہوتے رہے اور دشمن کو اپنی قوت بڑھانے کا سنہری موقع مل گیا۔ پس ہمایوں کی بدنصیبی اُس کے کردار کی خامیوں کی بدولت تھی۔ علمیت، خوش اطواری، صدق دلی اور فیاضی کے باوجود وہ ناکام بادشاہ ثابت ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بروقت صحیح قدم نہ اٹھاتا تھا اور قوت ارادی سے محروم تھا، نیز دور اندیش اور سیاست دان نہ تھا۔

ہمایوں کے عہد کی فوجی کارروائیاں

(۱) کالنجر کا محاصرہ۔ بندھیل کھنڈ کے مشہور قلعے کالنجر کی تسخیر کے لئے ہمایوں 1531ء میں روانہ ہوا اور اُس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ وجہ یہ تھی کہ کالنجر کا راجہ افغانوں کا دوست تھا۔ نیز کالنجر فتح ہونے سے مغلیہ سلطنت کی جنوبی سرحدیں محفوظ ہو جاتی تھیں۔ قلعہ فتح کئے بغیر ہمایوں نے کالنجر کے راجہ سے تحفے تحائف وصول کر کے صلح کر لی اور جونپور کی تسخیر کے لئے روانہ ہو گیا جہاں محمود لودھی اور دوسرے افغان سرداروں نے سر اُٹھایا تھا۔ پس

پہلی فوجی کارروائی میں ہی اُس نے مستقل مزاجی سے محروم ہونے کا ثبوت دیا۔

(۲) شدید غلطی:۔ کالنجر فتح کئے بغیر ہمایوں بہار کے افغانوں کی جانب متوجہ ہوا۔ افغان سرداروں نے محمود لودھی کی سرکردگی میں جونپور کے مغل گورنر جنید برلاس کو مار بھگایا تھا اور افغان فوج نواب گنج تک بڑھ آئی تھی۔ ہمایوں نے اگست 1532ء کو دوراہہ کے مقام پر محمود لودھی کو شکست فاش دی اور افغان فوج منتشر ہو گئی۔ ستمبر 1532ء میں ہمایوں نے آگے بڑھ کر چنار کے مشہور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ اہم فوجی ناکہ تھا اور اُن دنوں شیر خان سوری کے قبضے میں تھا۔ چار ماہ کے محاصرے کے بعد ہمایوں نے شیر خان کی صلح کی درخواست منظور کر لی اور محض اس بات پر راضی ہو گیا کہ شیر خان مغلوں کا نمک خوار ہے اور کسی زمانے میں بابر کی فوج میں ملازم رہا تھا۔ نیز شیر خان نے افغان فوج کا ایک دستہ اپنے بیٹے قطب خان کی سرکردگی میں ہمایوں کی خدمت پر مامور کیا۔ شیر خان کو کچل ڈالنے کا یہ سنہری موقع تھا لیکن ہمایوں نے بلا وجہ یہ موقع کھو دیا۔ اسے چنار کا پہلا محاصرہ کہتے ہیں۔

(۳) والئ گجرات بہادر شاہ:۔ گجرات کے حکمران بہادر شاہ سے ہمایوں کی جنگ ناگزیر تھی۔ یہ بادشاہ بلند عزائم کا مالک تھا اور مالوہ فتح کرنے کے بعد وہ راجستھان اور وسط ہند کی جانب اپنی سلطنت کو وسعت دے رہا تھا۔ ہمایوں کے رقیب مغل شہزادے محمد زمان مرزا اور محمد سلطان مرزا اُس کے پاس پناہ گزین تھے۔ نیز عالم خان لودھی

بھی گجرات میں مقیم تھا اور بہادر شاہ اُس کی پشت پناہی کر رہا تھا
ہمایوں کو چاہیئے تھا کہ شیر خاں سے صلح کے بعد فوراً گجرات پر حملہ کر
دیتا، لیکن اُس نے ڈیڑھ سال دین پناہ کی تعمیر اور جشن میں گذار
دیے اور دشمن کو طاقتور بن جانے کی مہلت دی۔ آخرکار ہمایوں نے
1533ء میں گجرات کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اس سے پہلے بہادر شاہ
نے عالم خاں لودھی کے بیٹے تاتار خاں کو مالی مدد دے کر اُسے اس
قابل بنا دیا تھا کہ وہ مغلیہ علاقہ میں گھس کر بیانہ (Bayana)
پر قبضہ جما لے۔ مرزا عسکری اور ہندال کے ہاتھوں تاتار خاں شکست
کھا کر مارا گیا اور بیانہ کے قلعے پر مغلوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔

اُن دنوں گجرات کے والی بہادر شاہ نے چتوڑ کے مشہور قلعے کا
محاصرہ کیا ہوا تھا اور راجہ بکرماجیت سخت پریشان تھا۔ چتوڑ کی رانی
نے ہندوؤں کی رسم کے مطابق راکھی بھیج کر ہمایوں کو اپنا بھائی بنا
لیا۔ ہمایوں نے بہادر شاہ سے رقابت کی بنا پر راجپوتوں سے دوستی
قبول کی اور اُس کی فوج بڑھ کر جنوری 1535ء میں سارنگ پور
آ پہنچی۔ بہادر شاہ نے گھبرا کر چتوڑ پر دھاوا بول دیا اور 8 مارچ 1535ء
کو قلعہ فتح کر لیا۔ ہندو مؤرخ یہ لکھتے ہیں کہ ہمایوں نے جان بوجھ کر
تاخیر کی تاکہ مسلمان حملہ آور ایک کافر کی سلطنت ختم کر سکے۔ یہ
بات غلط ہے، ہمایوں کبھی بھی سرعت سے فوجی کارروائی نہ کرتا تھا
البتہ بہادر شاہ نے مغلوں اور راجپوتوں کا اتحاد نہ ہونے دیا اور مغلوں
کی آمد سے پہلے ہی دھاوا بول کر چتوڑ فتح کر لیا۔

اپریل 1535ء میں ہمایوں کی فوج نے آگے بڑھ کر مندسور کے مقام

پر ڈیرے ڈالے اور بہادر شاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ خوراک کی کمی کے باعث بہادر شاہ فرار ہونے پر مجبور ہوا اور 25 اپریل 1535ء کو بھاگ کر مانڈو چلا گیا۔ مشہور توپچی رومی خان بھی ہمایوں سے آ ملا۔ وجہ یہ تھی کہ بہادر شاہ اُس پر اعتماد نہ کرتا تھا۔ ہمایوں نے اس جنگ میں ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور نہ صرف مانڈو کے قلعے پر قبضہ جمایا بلکہ اُس نے بہادر شاہ کا تعاقب کیا اور چمپانیر اور احمد آباد سے گزر کر کھمبایت جا پہنچا۔ بہادر شاہ بھاگ کر جزیرہ دیو میں چلا گیا اور تمام گجرات اور مالوہ پر ہمایوں کا قبضہ ہو گیا۔ مرزا عسکری کو ہمایوں نے گجرات اور مالوہ کا گورنر بنایا اور خود مانڈو واپس لوٹا۔ لیکن گجرات اور مالوہ کا علاقہ جلدی ہی مغلوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ وجہ یہ تھی کہ مغل سردار آپس میں اُلجھ گئے اور ایک دوسرے کو شک و شبہ سے دیکھنے لگے۔ اُدھر گجراتی فوج میں قومی جذبہ بیدار ہو گیا اور بہادر شاہ نے اس سے فائدہ اٹھا کر مغلوں کو مار بھگایا۔ عسکری اُدھر آگرہ کی جانب روانہ ہوا۔ ہمایوں کو اپنے تخت کی فکر دامن گیر ہوئی اور وہ بھی مارچ 1537ء میں آگرہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اُس کے جاتے ہی بہادر شاہ نے مالوہ پر دوبارہ قبضہ جما لیا۔ ہمایوں اس کے بعد افغانوں سے اُلجھ گیا اور گجرات یا مالوہ کو دوبارہ فتح نہ کر سکا۔ پس بہادر شاہ کے خلاف ہمایوں کی جنگی کارروائی بے سود ثابت ہوئی بلکہ اُس نے شیر خان کا سر کچلنے کی بجائے طویل عرصہ گجرات اور مالوہ کی تسخیر پر ضائع کیا۔ اس عرصے میں شیر خان کو اپنی طاقت بڑھانے اور افغان فوج کو منظم کرنے کا

موقع مل گیا۔

(۲۷) شیر خان سے جنگ :- آگرہ پہنچ کر ہمایوں اطمینان کا سانس نہ لے سکا کیونکہ بہار اور بنگال میں شیر خان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اُسے خدشہ پیدا ہو گیا۔ شیر خان نے تمام صوبۂ بہار پر قبضہ جما لیا اور 1537ء میں اُس نے بنگال کے سلطان کو شکست دی۔ اُس نے افغانوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا تھا اور بنگال میں خود مختار ہو جانے کے علاوہ وہ مغلوں کو ہندوستان سے نکالنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

جولائی 1537ء میں ہمایوں بنگال کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا لیکن فوجی مصلحت کو نظر انداز کر کے نومبر 1537ء میں اُس نے چنار کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ آٹھ ماہ کے محاصرے کے بعد فتح ہوا۔ یعنی ہمایوں نے قیمتی وقت ضائع کیا اور شیر خان کو مزید منظم ہونے کا موقع دیا۔ نیز ان آٹھ مہینوں میں شیر خان نے تمام گور (Gaur) کو فتح کر لیا تھا اور رہتاس گڑھ کے مضبوط قلعے پر بھی شیر خان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ پٹنہ پہنچ کر ہمایوں نے اصل حالات کا جائزہ لیا۔ اس موقع پر شیر خان پر دھاوا بولنے کے بجائے اُس نے نامہ و پیام میں وقت ضائع کیا۔ نیز بہار پر قبضہ کئے بغیر وہ آخرکار گور کی جانب بڑھا اور بنگال کو افغانوں سے چھین لینے کی ٹھانی۔ یہ پالیسی فوجی لحاظ سے بالکل غلط تھی۔ گور کی سیاسیات میں دخل دینا بے سود تھا۔ اگر ہمایوں بنگال فتح کرنا چاہتا تھا تو چنار کے محاصرے میں آٹھ ماہ ضائع کرنا شدید غلطی تھی۔

جوں ہی ہمایوں گور میں داخل ہوا شیر خان نے گہری چال چلی۔ اس نے ہمایوں کو بنگال میں آگے بڑھنے دیا لیکن خود صوبہ بہار پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ اس نے بنارس فتح کر کے قنوج تک تمام علاقہ فتح کر لیا اور اس طرح مغلیہ فوج کی رسد کے راستے بند کر دئے۔ ہمایوں نے اپنے بھائی مرزا ہنڈال کو ترہٹ بھیجا تاکہ خوراک مہیا کرے لیکن بد طینت بھائی آگرہ روانہ ہو گیا اور ہندوستان کا تخت حاصل کرنے کے درپے ہوا۔ ہمایوں نے کامران کو بھی مدد کے لئے پیغام بھیجے لیکن اس نے بھی پرواہ نہ کی۔ آخر کار مارچ 1537ء میں ہمایوں نے آگرہ واپس جانے کی ٹھانی۔ لیکن شیر خان کی فوج نے راستہ روک رکھا تھا اور فیصلہ کن جنگ لازم تھی۔ ہمایوں نے فوری طور پر جنگ کرنے کی بجائے ٹال مٹول شروع کی اور اس کی فوج تین ماہ تک دیکم اپریل تا جون 1539ء) دریائے گنگا کے مشرق کی جانب کرم ناسا ندی کے مغربی کنارے پر خیمہ زن رہی۔ یہ تاخیر شیر خان کے لئے مفید تھی کیونکہ برسات کا موسم شروع ہو گیا اور مغل فوج میں ملیریا پھیل گیا۔ ہمایوں کو بھائیوں کی جانب سے مدد نہ ملی اور اس کی فوج کے لئے خوراک ختم ہو گئی۔ شیر خان کی فوج ندی کے دوسری جانب چوسا (Chausa) کے قریب خندقیں کھودے اور مورچے لگائے بیٹھی تھی۔ جون کے مہینے میں شیر خان نے ایک گہری چال چلی۔ نامہ و پیام کے بعد صلح کر لی اور ہمایوں کی برتری (Paramountcy) قبول کر لی۔ ہمایوں نے خوش ہو کر بنگال اہسرام اور چنار کا قلعہ شیر خان کو بخش دیا۔ مغلیہ فوج جشن منانے لگی اور

بالکل غافل ہو گئے۔ شیر خان نے 26 جون 1539ء کو یک دم حملہ کرکے ہمایوں کی فوج کو پریشان کر دیا اور مغل سپاہی بھاگ اٹھے ہمایوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر دریائے گنگا کو عبور کرنا چاہا لیکن گھوڑا بھنور میں پھنس گیا۔ نظام نامی ایک سقے نے ہمایوں کو ڈوبنے سے بچایا اور وہ مشکل سے جان بچا کر جولائی 1539ء میں آگرہ پہنچا۔ اس فتح سے شیر خان کا وقار بلند ہو گیا اور وہ مغلوں کو برصغیر سے نکالنے کے درپے ہوا۔ اب اس نے شیر شاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔

ادھر ہمایوں نے اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کو قومی خطرے کا احساس دلایا اور شیر خان سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک عظیم الشان فوج تیار کی۔ اس موقع پر بھی ہمایوں کے بھائیوں نے اس سے دلی تعاون نہ کیا، بلکہ کامران اپنی بیس ہزار فوج لے کر لاہور چلا گیا۔

قنوج کی لڑائی ۔ 1540ء میں ہمایوں اپنی فوج لے کر شیر شاہ کے مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ شیر شاہ پہلے ہی دریائے گنگا کے مشرقی کنارے پر موجود تھا۔ ہمایوں نے دریا عبور کر کے شیر شاہ کی فوج کے سامنے ڈیرے ڈالے اور پورا ایک ماہ ضائع کیا۔ برسات شروع ہو گئی اور ہمایوں کی فوج نشیبی جگہ بدلنے پر مجبور ہوئی۔ عین اس وقت شیر شاہ نے تین جانب سے حملہ کر دیا اور ہمایوں کو شکست فاش ہوئی۔ مغلوں کا توپ خانہ استعمال نہ ہو سکا کیونکہ نشیبی جگہ سے مغل سپاہی اسے سامنے نہ لا سکے۔ ہمایوں کی فوج بھاگ اٹھی اور 17 مئی 1540ء کو اس

شکست کے بعد ہمایوں سے برِصغیر کی سلطنت چھن گئی۔ ایک ہاتھی پر سوار ہو کر اُس نے دریائے گنگا کو عبور کیا اور اُس کی جلا وطنی کا دَور شروع ہوا۔

ہمایوں کے مصائب

قنوج کی فیصلہ کن لڑائی سے ہمایوں کی چالیس ہزار فوج بالکل غارت ہو گئی اور مغلیہ سلطنت کا وقار خاک میں مل گیا۔ وہ آگرہ پہنچ گیا لیکن اسے افغانوں کے تعاقب کا ڈر تھا۔ اُس نے کشمیر کا رُخ کیا لیکن بے وفا بھائی کامران نے مدد کرنے کی بجائے اُس کی راہ روکنے کی تیاری کر لی۔ مجبور ہو کر ہمایوں نے سندھ کا رُخ کیا۔ ان دنوں وہ بے یار و مددگار تھا اور اسے کہیں سر چھپانے کو جگہ نصیب نہ تھی۔ مارواڑ کے راجہ مالدیو نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی لیکن معلوم ہوا کہ اُس کا اصل منشا یہ ہے کہ ہمایوں کو گرفتار کر کے شیر شاہ کے حوالے کر دیا جائے۔ بدنصیب ہمایوں دربدر پھرتا اور ٹھوکریں کھاتا آخر عمرکوٹ پہنچا جہاں 15 اکتوبر 1542ء کو اکبر پیدا ہوا۔ یہاں سے ہمایوں نے قندھار کا رُخ کیا۔ مرزا عسکری نے (جو ان دنوں کامران کی جانب سے قندھار کا گورنر تھا) ہمایوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن ہمایوں اپنے چند جان نثار رفیقوں سمیت تیزی سے ایران کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ البتہ اُس کا کم سن بیٹا اکبر پیچھے رہ گیا۔ مستونگ سے (جو کوئٹہ کے قریب ہے) اکبر کو قندھار پہنچا دیا گیا جہاں عسکری

کی بیوی نے اُسے پالا۔

ہمایوں کی ناکامی کے اسباب

ہمایوں کی ناکامی کے اسباب کئی ایک تھے۔ سب سے اہم سبب یہ ہے کہ وہ سیاسی بصیرت اور جنگی چالوں سے محروم تھا۔ اُس کا مدِّ مقابل شیر شاہ سوری بیدار مغز فوجی جرنیل تھا اور جنگ کا نقشہ شطرنج کی چالوں کی مانند تیار کرتا تھا جس میں ہمایوں کو مات ہو جاتی تھی۔ گویا ہمایوں جنگی قابلیت نہ رکھتا تھا۔ چنار کا محاصرہ، گوڑ کی تسخیر کا خیال، رسل و رسائل کا منقطع ہونا، چوسا کی لڑائی میں دھوکا کھا جانا اور قنوج کی جنگ میں نشیبی علاقے میں خیمہ زن ہونا اس امر کے بیّن ثبوت ہیں کہ ہمایوں اعلیٰ جرنیل نہ تھا، محض بہادری کے جوہر دکھانا جانتا تھا۔ شیر شاہ کی قابلیت کے سامنے اُس کی پیش نہ گئی۔ مغل مؤرخین شیر شاہ کو دھوکے باز اور جھوٹا گنتے ہیں، لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ ہمایوں کو شیر شاہ کی جنگی چالوں اور فہم و فراست سے مات ہوئی اور اُسے سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑے۔

(۲) ہمایوں کی شکست کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ مناسب وقت پر قدم نہ اُٹھاتا تھا اور فوجی کارروائی نہ کرتا تھا۔ عزم و استقلال کا مادہ اُس میں موجود نہ تھا، لہٰذا ناکام رہا۔ ہمایوں نے شیر خان کا شروع سے ہی سر کچلنے کی بجائے اُس سے صلح کر لی اور اُسے طاقتور بن جانے کا موقع دیا۔ گجرات اور مالوہ کی تسخیر سے اُسے کچھ

حاصل نہ ہوا۔ یہ وقت اگر وہ بنگال پر صرف کرتا تو شیر خان اُبھر نہ سکتا۔

(3) بنگال جیسے دور دراز صوبے پر قبضہ جمانا ممکن نہ تھا لیکن اُس نے گجرات و مالوہ کی ناکامی سے سبق حاصل نہ کیا، نیز چنار کی فتح پر آٹھ ماہ بیکار صرف کیے۔ اس کے علاوہ بلا ضرورت بنگال کے اندر گھس کر آگے بڑھتا گیا۔ شیر خان نے بہار اور قنوج پر قبضہ کر کے اُس کا تعلق آگرہ اور دہلی سے کاٹ دیا۔ چوسا کی جنگ میں بھی اس نے سخت دھوکا کھایا۔

(4) مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ بھائیوں کی بے وفائی اور رشتہ داروں کی بے عقلی کی بدولت ہمایوں کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ خطرے کے دنوں میں متحد ہونے کی بجائے انھوں نے ہمایوں کو مزید پریشان کیا۔ مغلوں کی باہمی ناچاقی سے افغانوں نے فائدہ اُٹھایا اور ہمایوں شکست کھا کر ایران بھاگ گیا۔

(5) ہمایوں سہل انگار تھا۔ کبھی کتابوں میں مصروف رہتا، کبھی عیش و نشاط میں وقت گزار دیتا تھا۔ دشمن سے بلا وجہ صلح کر لیتا تھا۔ یہ تن رفتاری سے دشمن کے سر پر نہ پہنچتا تھا، بلکہ جب فوجوں کا آمنا سامنا ہو جاتا تو اُس موقع پر بھی ایک دو ماہ تک بغیر خیمہ زن رہتا۔ ان حالات میں اُس کی ناکامی لازم تھی۔

ہمایوں پندرہ برس برِ صغیر کی سلطنت سے محروم رہا۔ شیر شاہ کی وفات کے بعد بھی وہ مناسب موقع کی تلاش میں رہا۔ آخرکار 1555ء میں اُس نے سکندر سوری کو شکست دے کر باپ کی سلطنت پر دوبارہ قبضہ کیا۔ شیر شاہ سوری کے حالات اِس

حصّے کے آخر میں بیان ہوں گے۔ اس باب کے خاتمے سے پہلے ہمایوں کی جلا وطنی کے ایّام کی مختصر داستان بیان ہوگی، تاکہ واقعات کا تسلسل قائم رہے۔

شاہ طہماسپ:۔ ایران کے حکمران شاہ طہماسپ نے ہمایوں کی خوب آؤ بھگت کی اور اُسے طویل عرصے تک اپنے پاس مہمان رکھا۔ آخر 1545ء میں شاہ طہماسپ نے ہمایوں کو ایرانی سپاہیوں پر مشتمل چودہ ہزار فوج عطا کی اور یہ وعدہ لیا کہ وہ اپنے بھائی عسکری سے قندھار چھین کر ایرانیوں کے حوالے کر دے گا۔ عسکری اُن دنوں کامران کی جانب سے قندھار کا گورنر تھا۔

شاہ طہماسپ چاہتا تھا کہ ہمایوں شیعہ مذہب اختیار کر لے لیکن ہمایوں نے یہ شرط قبول نہ کی۔ بعض مؤرّخین غلط طور پر یہ لکھتے ہیں کہ ہمایوں نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔

ایرانی فوج کی مدد سے ہمایوں نے 1545ء میں قندھار کو فتح کر لیا اور نومبر 1545ء میں اُس نے کابل پر بھی قبضہ جما لیا، لیکن کامران مزید دو سال تک ہمایوں کے لئے پریشانی کا باعث بنا رہا آخرکار گرفتار ہوا اور ہمایوں نے اُسے مروانے کی بجائے اندھا کروا دیا اور عسکری سمیت اُسے مکہ معظمہ بھجوا دیا۔ اس سے پہلے مرزا ہندال ایک شب خون میں کسی افغان کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

دہلی میں دوبارہ تاجپوشی۔ 1545ء میں شیر شاہ نے وفات پائی۔ اس کا جانشین اسلام شاہ سوری کافی دانش مند تھا، لہٰذا ہمایوں نے کابل کی حکومت پر قناعت کی اور اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی ہمت

نہ ہوئی۔ اسلام شاہ سوری کی وفات کے بعد افغانوں میں تخت و تاج کے لئے خانہ جنگی کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر 25 دسمبر 1554ء کو ہمایوں نے پشاور پر قبضہ کر لیا، پھر پندرہ ہزار فوج سے لاہور پر حملہ کیا۔ اس فوج کا سالار بیرم خان تھا جو ہمایوں کا معتمد تھا۔ فروری 1555ء میں لاہور پر بھی مغلوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا اور ایک ماہ کے اندر اندر سرہند تک تمام علاقہ ہمایوں کے قبضے میں آگیا۔ اس دوران میں محمد عادل سوری کی بجائے سکندر خان سوری دہلی کا شہنشاہ بن چکا تھا۔ اس نے مغلوں کی روک تھام کے لئے افغان فوج بھیجی لیکن بیرم خان نے سرہند کے قریب مارچ 1555ء میں اس فوج کو شکست دی۔ اس کے بعد سکندر خان سوری خود فوج لے کر مغلوں کے مقابلے پر آیا۔ 22 جون 1555ء کو سرہند کے قریب ایک خونریز جنگ ہوئی اور افغان فوج شکست کھا کر منتشر ہو گئی۔ ہمایوں نے آگے بڑھ کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ جما لیا۔ 23 جولائی 1555ء کو دہلی میں ہمایوں کی دوبارہ تاجپوشی ہوئی، یعنی پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد اس نے دہلی کی سلطنت دوبارہ حاصل کی۔ افغانوں کی بچی کھچی فوج کا خاتمہ کرنے کے لئے اکبر کو اس کے تجربہ کار اتالیق بیرم خان کے ساتھ پنجاب بھیج دیا گیا۔

ہمایوں کی وفات:۔ دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرنے کے صرف چند ماہ بعد ہمایوں نے 24 جنوری 1556ء کو وفات پائی۔ ایک شام وہ اپنے کتب خانے کی چھت سے زینے کے ذریعے اتر رہا تھا کہ اذان کی صدا سنی۔ وہ تعظیماً بیٹھ گیا۔ اذان کے بعد جب ہمایوں اترنے لگا

تو اس کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا سر کے بل نیچے گرا۔ زینہ پتھر کا تھا لہٰذا اس کو شدید چوٹیں آئیں۔ ان زخموں کی تاب نہ لاکر 26 جنوری کو اس نے دنیا سے کوچ کیا۔ وہ اگرچہ ناکام اور بدنصیب بادشاہ تھا لیکن دلکش شخصیت کا مالک تھا اور بردباری اور صبر و تحمل میں بے نظیر تھا۔

فرید خان کا عروج اور سوری سلطنت کا قیام

ابتدائی زندگی:۔ شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید خان تھا۔ اُس کا دادا بہلول لودھی کے زمانے میں تلاشِ معاش میں پنجاب وارد ہوا جہاں اُس نے فوج کی ملازمت اختیار کر لی۔ فرید خان 1472ء میں پنجاب میں پیدا ہوا۔ سکندر لودھی کے زمانے میں پنجاب کے صوبے دار جمال خان کی تعیناتی جونپور میں ہوئی تو فرید خان کا دادا بھی اپنے خاندان سمیت اُس کے ساتھ چلا گیا۔ فوجی خدمات کے عوض فرید خان کے باپ حسن سوری کو بہار میں جاگیر عطا ہوئی جس میں خواص پور، سہسرام اور ٹانڈہ کا علاقہ شامل تھا۔ کچھ عرصہ فرید خان نے اپنی جاگیر کا انتظام سنبھال کر باپ کو خوش کر دیا لیکن فرید خان کی سوتیلی ماں اُس کی سخت مخالف تھی لہٰذا فرید خان نے گھر کو خیرباد کہا اور جونپور جا کر اُس نے جمال خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہاں اُس نے رائج الوقت علوم میں خوب مہارت پیدا کر لی اور اپنی لیاقت کا لوہا منوایا۔ جمال خان نے باپ بیٹے کی صلح کروا دی اور فرید خان

نے دوبارہ اپنے باپ کی جاگیر کا انتظام سنبھالا۔ 1518ء میں فرید خاں اپنی سوتیلی ماں سے لڑکر دہلی چلا گیا اور سلطان ابراہیم لودھی کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے باپ کی جاگیر حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ باپ کی وفات کے بعد البتہ فرید خان نے اُس کی جاگیر پر قبضہ جما لیا اور اپنے آٹھ سوتیلے بھائیوں کو کچھ نہ دیا۔ فرید خان نے جنوبی بہار کے حاکم بہار خان کی ملازمت اختیار کرلی تاکہ اُس کے ہاتھ مضبوط ہو جائیں اور اُس کے سوتیلے بھائی جاگیر کا حصہ طلب کرنے سے قاصر رہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرید خان ہوشمند تھا اور مطلب برآری کے لئے عمدہ سیاسی چالیں چلتا تھا۔ فرید خان جلدی ہی بہار خان کا مقرّب بن کر اُس کے بیٹے کا اتالیق مقرر ہوا لیکن درباریوں نے بہار خان کے کان بھر کر اُسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ حسن سوری کی جاگیر ایک بیٹے کے قبضے میں نہ رہنی چاہیئے بلکہ جاگیر فرید خان اور اُس کے تمام بھائیوں کے مابین تقسیم کردی جائے۔ فرید خان جاگیر کی تقسیم پر راضی نہ ہوتا تھا لہٰذا بہار خان نے غصے میں آکر فرید خان کو جاگیر سے محروم کر دیا اور اپریل 1527ء میں مجبور ہو کر فرید خان نے مغلیہ شہنشاہ بابر کی ملازمت اختیار کرلی۔ اُس نے مغلوں کا اچھی طرح جائزہ لیا اور افغان سلطنت کی بحالی کا عزم کیا۔ مغلوں کی فوجی خدمت کی بدولت فرید خان کو آبائی جاگیر واپس ملی۔ کچھ عرصے کے بعد فرید خان بابر کی قیافہ شناسی سے گھبرا کر بلا اجازت بھاگ اُٹھا اور سہسرام پہنچ کر معذرت کا خط لکھ دیا۔

کچھ عرصہ بعد فرید خان نے جنوبی بہار کے حکمران بہار خان کی دوبارہ ملازمت اختیار کرلی۔ بہار خان کو مغل مورّخین نے سلطان محمد لوہانی کا لقب دیا ہوا ہے۔ اسی سلطان کے عہد میں فرید خان نے ایک روز تلوار سے شیر کا شکار کیا تھا اور شیر خان کا خطاب پایا تھا۔ ہمایوں سے تخت چھیننے کے بعد شیر خان نے شیر شاہ سوری کا لقب اختیار کیا۔

سلطان محمد کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا جلال خان جنوبی بہار کا حکمران بنا لیکن اصلی اختیارات اُس کے مشیر شیر خان کے پاس تھے کیونکہ وہی کمسن شہزادے کا محافظ (Regent) تھا۔

شیر خان کا عروج:۔ بہار کے شہزادہ جلال خان کو شیر خان نے محض کٹھ پتلی بنا دیا اور اُس کے شاہی اختیارات سلب کر لئے اُن دنوں بنگال کے سلطان نصرت شاہ نے بہار پر حملہ بول دیا لیکن شیر خان نے بنگالی فوج کو شکست دے کر پسپا کر دیا۔ کثیر مال غنیمت کی بدولت شیر خان کی طاقت مزید بڑھ گئی لیکن لوہانی اُمراء سازشیں کر کے شیر خان کے غلبہ کو ختم کرنے کے درپے ہوئے۔ عین اُن دنوں شہزادہ جلال خان بھاگ کر بنگال کے حکمران نصرت شاہ کے پاس چلا گیا۔ اُس کا یہ اقدام تخت سے دست بردار ہونے کے مترادف تھا۔ بنگال کے حکمران نے شیر خان پر دوبارہ حملہ کر کے شکست کھائی اور بہار پر شیر خان کی بادشاہت مسلّم ہو گئی۔ گویا اُس کی قسمت خود بخود چمک اُٹھی۔

شیر خان نے اس فتح کے بعد فتح ملکہ سے شادی کر لی جو

بہلول لودھی کی قریبی رشتہ دار تھی اور چنار کے قلعے کی وارث تھی اس سیاسی شادی سے شیر خان کی طاقت میں اضافہ ہوا اور وہ افغانوں کا مقتدر سردار بن گیا۔

کامیاب سیاست:۔ شہنشاہ ہمایوں نے 1532ء میں سلطان ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی کو شکست دے کر افغانوں کی فوج کو منتشر کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہمایوں نے افغانوں کی طاقت کو ملیا میٹ کرنے کی نیت سے چنار کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس کی نیت یہ تھی کہ بہار پر قبضہ کر کے افغانوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیا جائے۔ ہمایوں کے لئے افغانوں کا سر کچلنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ لیکن شیر خان نے کمال دانشمندی اور اعلیٰ تدبر سے کام لیا اور ہمایوں کی خوشامد کر کے اسے عمدہ الفاظ سے خوش کر دیا۔ شیر خان نے اپنے آپ کو مغلوں کا قدیم نمک خوار ظاہر کیا اور یہ بھی بتایا کہ بابر کی فوج میں ملازمت کا شرف اسے حاصل رہا ہے۔ ہمایوں چونکہ سیاسی بصیرت سے عاری تھا وہ شیر خان کی باتوں سے خوش ہو کر واپس ہوا اور اس کے بعد گجرات کی تسخیر میں ہمایوں نے طویل مدت صرف کی۔ اس عرصے میں شیر خان کو اپنی طاقت بڑھانے کی مہلت مل گئی۔

ہمایوں کے حالات میں بیان ہو چکا ہے کہ قلعہ چنار کے پہلے محاصرے کے بعد مغل شہنشاہ ہمایوں گجرات اور مالوہ کی تسخیر میں مگن رہا۔ اس عرصے میں شیر خان نے تمام صوبہ بہار پر قبضہ جما لیا اور افغان فوج کو منظم کر دیا۔ 1536ء میں شیر خان

نے بنگال کے سلطان نصرت شاہ کو شکست دے کر ازحد کمزور کر ڈالا اور بنگال کے وسیع ذرائع شیر خان کے قبضے میں آگئے اب شیر خان اسقدر طاقتور بن چکا تھا کہ وہ ہندوستان سے مغلوں کے اخراج کے منصوبے سوچنے لگا۔ اب ہمایوں کو شیر خان کے عروج سے خدشہ پیدا ہوا۔

فوجکشی:۔ ہمایوں نے شیر خان کی طاقت ختم کرڈالنے کی نیّت سے 1537ء میں بنگال پر فوج کشی کی۔ اس فوجی اقدام میں ہمایوں دوبارہ فاش غلطی کا مرتکب ہوا۔ اُس نے چنار کے قلعہ کا آٹھ ماہ محاصرہ کرکے کافی وقت ضائع کیا۔ اُس کے لئے یہ بہتر تھا کہ چنار کی تسخیر کی بجائے صوبہ بہار فتح کرلیتا تاکہ مغلیہ فوج کے لئے سپلائی لائن برقرار رہتی۔ چنار کی تسخیر کے بعد ہمایوں بہار کو فتح کئے بغیر گوڑ یعنی بنگال کے اندرونی علاقے میں گھس گیا۔ شیر خان نے ہمایوں کی اس غلطی سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ اُس نے اپنے بیٹے جلال خان کو ہمایوں کے مقابلے پر بھیجا۔ جلال خان نے مغلیہ فوج کی واپسی ناممکن بنادی۔ شیر خان کی اپنی فوج نے اس عرصے میں بنارس فتح کرنے کے بعد سنبھل سے لے کر قنوج تک تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس سے مغلیہ فوج کے لئے رسد پہنچانے کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ ہمایوں نے اس نازک وقت میں اپنے بھائی مرزا ہنڈال کو خوراک مہیّا کرنے کے لئے ترہٹ بھیجا لیکن مرزا ہنڈال کی نیّت بد ہو گئی اور وہ آگرہ پہنچ کر تخت حاصل کرنے کے درپے ہوا۔ ہمایوں نے

کامران سے بھی مدد طلب کی لیکن اُسے بھی وقت کی نزاکت کا احساس نہ ہوا۔ ہمایوں نے مجبور ہو کر مارچ 1539ء میں آگرہ واپس جانے کا فیصلہ کیا لیکن شیر خاں کی فوج نے راستہ روک رکھا تھا۔ ہمایوں نے اب بھی فوری طور پر فیصلہ کن جنگ لڑنے کی بجائے ٹال مٹول سے کام لیا اور تین ماہ تک وہ دریائے گنگا کے مشرق کی جانب کرم ناسا ندی کے مغربی کنارے پر ڈیرے ڈالے رہا۔ یہ تاخیر ہمایوں کی بربادی کا باعث بنی کیونکہ برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ نیز مغلیہ فوج کی خوراک بالکل ختم ہو گئی۔ شیر خاں کی فوج ندی کے دوسرے کنارے چوسہ کے قریب خندقیں کھود کر مورچے لگائے مغلوں کی منتظر رہی۔ جون 1539ء میں شیر خاں نے ایک گہری چال چلی۔ اُس نے ہمایوں کو غافل کرنے کی خاطر صلح کی بات چیت شروع کر دی اور فوراً اُس کی سیادت (Paramountcy) قبول کر لی۔ ہمایوں نے خوش ہو کر بنگال کے علاوہ سہسرام اور چنار کا قلعہ شیر خاں کو بخش دیا۔ صلحنامے پر دستخط ہو جانے کے بعد مغلیہ فوج کامل طور پر غافل ہو گئی اور مغل سپاہی جشن منانے لگے۔ شیر خاں نے 26 جون 1539ء کو تمام وعدے وعید بالائے طاق رکھ کر مغلیہ فوج پر یکدم ہلہ بول دیا۔ مغلیہ فوج کو شکست ہوئی اور ہمایوں بھی گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ اُٹھا۔ برسات کے موسم میں دریائے گنگا طغیانی میں تھا۔ سینکڑوں مغل سپاہی دریا عبور کرتے ہوئے ڈوب گئے۔ ہمایوں تیرنا نہ جانتا تھا لیکن

اُس نے گھوڑے پر سوار ہو کر دریائے گنگا کو عبور کرنا چاہا اُس کا گھوڑا بھنور میں پھنس کر ڈوب گیا اور ہمایوں کو نظام سقے نے بڑی مشکل سے بچایا۔ ہمایوں بھاگ کر جولائی 1539ء میں آگرہ پہنچا اور شیر خان سے دوبارہ جنگ کرنے کے لئے ایک عظیم الشان فوج بھرتی کی۔ اُس کے اپنے بھائیوں کو بھی نزاکت وقت کا احساس دلایا لیکن انہوں نے خود غرضی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ کامران اپنی بیس ہزار فوج لے کر لاہور واپس چلا گیا۔ اُدھر شیر خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور شیر شاہ سوری کا لقب اختیار کیا۔

گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے کہ 17 مئی 1540ء کو ہمایوں کی ایک لاکھ فوج نے قنوج کی لڑائی میں شکست کھائی اور ہمایوں سے ہندوستان کا تخت و تاج چھن گیا۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ وہ بھاگ کر ایران چلا گیا اور پندرہ برس جلاوطن رہا۔

شیر شاہ سوری کا عہد حکومت

شیر شاہ سوری مئی 1540ء میں تقریباً 54 برس کی عمر میں ہندوستان کا شہنشاہ بنا۔ اُس نے بائیس مئی 1545ء کو وفات پائی۔ یعنی اُس نے محض پانچ برس حکمرانی کی۔ اس قلیل مدت میں اُس نے لاتعداد اصلاحات نافذ کیں۔ نظم و نسق کو بہتر بنایا اور عظیم الشان تعمیرات کی بدولت داد تحسین حاصل کی۔ اُس کی فتوحات

اور فوجی کارنامے بھی حیران کن تھے۔ اُس کی محنت اور قابلیت بھی قابلِ رشک ہے۔ مغل مؤرخین شیر شاہ سوری کے بارے میں حقائق چھپانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ شیر شاہ بیدار مغز حکمران تھا۔ اُس نے پانچ سال کی قلیل مدت میں اس قدر درخشاں کام کیا جو دوسرے حکمران اپنے طویل عہد حکومت میں بھی نہ کر سکے۔

شیر شاہ سوری بے حد محنتی تھا۔ وہ دانشمند۔ موقع شناس اور دور بین تھا۔ شیر شاہ کی عظمت کا بیّن ثبوت یہی ہے کہ وہ ابتدا میں معمولی جاگیر دار تھا اور اُس نے محض ذاتی قابلیت اور بلند ہمتی کی بدولت مغلوں کو ہندوستان سے مار بھگایا اور دہلی کا تخت و تاج حاصل کیا۔ شیر شاہ رعایا کی بہبودی کا خواہاں تھا۔ وہ نظم و نسق سنوارنے کے منصوبے سوچتا تھا۔ عیش و نشاط کی بجائے وہ انتظام سلطنت کو بہتر بنانے کے لئے دن رات محنت کرتا تھا۔ وہ مذہبی رواداری کا قائل تھا۔ اُس نے ہندوؤں کو اُن کی لیاقت کے مطابق حکومت کے مختلف شعبوں میں سرکاری ملازمتیں عطا کیں۔ مؤرخین نے اُسے اکبر اعظم کا پیش رو قرار دیا ہے۔ شیر شاہ سوری رعایا سے پدرانہ شفقت رکھتا تھا۔ عدل و انصاف کا پتلا تھا۔ تجارت اور زراعت کی ترقی پر زور دیتا تھا۔ خیراتی کاموں کا شوقین تھا اور عوام کی بہبودی سے متعلق اُمور پر خوب زور دیتا تھا۔

شیر شاہ سوری کے کردار کی اہم صفت یہ ہے کہ وہ خداداد فوجی قابلیت رکھتا تھا اور عمدہ جنگی چالوں سے دشمن کو بے بس

کر دیتا تھا۔ وہ ابتدا سے ہی افغانوں کی سربلندی کا خواہاں تھا۔ اُس نے افغانوں میں قومیّت کا جذبہ پیدا کیا۔ اگر اُس کے جانشین بیدار مغز ہوتے یا اُس کی عمر وفا کرتی تو مغلیہ سلطنت کی بحالی ممکن نہ ہوتی۔ شیر شاہ سوری کی زندگی کا اہم ترین اُصول یہ تھا کہ جنگ جیتنے کے لئے ہر حربہ جائز ہے۔ مغل مؤرخین اُسے دغاباز گنتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُس کی سیاسی بصیرت اور فوجی قابلیت ہمایوں کی نسبت کہیں زیادہ تھی۔ نیز وہ اعلےٰ پایہ کا جرنیل اور منتظم تھا اُس نے ملکی نظم و نسق میں نئی روح پھونک دی اور کارکردگی پر زور دیا۔

"Re-vitalized administration and introduced efficiency."

وہ دشمن پر رحم کھانے کے خلاف تھا۔ شرع کا پابند تھا لیکن مذہبی تنگ نظری سے بالا تھا۔ مشہور مؤرخ ڈاکٹر قانونگو نے شیر شاہ سوری کی بے حد تعریف کی ہے۔ شیر شاہ سوری کے کارنامے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اکبری دور کا مؤرخ مُلّا عبدالقادر بدایونی بھی شیر شاہ سوری کو خراج تحسین ادا کرتا ہے بلکہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ عبدالقادر بدایونی کی پیدائش شیر شاہ سوری کے عہد میں ہوئی جو عدل و انصاف میں نوشیرواں جیسی شہرت کا مالک تھا۔ شیر شاہ سوری کی فتوحات اور اُس کی نافذ کردہ اصلاحات کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے۔

(۱) فتوحات :۔ شیر شاہ سوری اولوالعزم جرنیل اور زبردست فاتح تھا۔ مغلوں سے سلطنت چھین لینے کے بعد اُس نے دہلی اور آگرہ کا خاطر خواہ انتظام کیا۔ افغان فوج کا ایک دستہ ہمایوں کے

تعاقب میں بھیج کر اُسے اس قدر ہراساں کیا کہ وہ ایران بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا۔ شیر شاہ نے وقت ضائع کئے بغیر پنجاب پر فوراً قبضہ جمایا۔ لیکن اُس نے کامران اور عسکری کو اپنے حال پر چھوڑا۔ یعنی کابل یا قندھار کا رُخ نہ کیا بلکہ برصغیر کی سرحدوں کو مضبوط کیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ مغلوں میں باہمی نفاق ہے اور کامران برصغیر پر حملہ آور ہونے کی سکت نہیں رکھتا۔ شیر شاہ نے سرحدی قبائل کو مطیع کیا اور بلوچوں کے علاوہ گکھڑ قبائل کو زیر کیا۔ جہلم کے قریب اُس نے ایک مضبوط قلعہ بنایا جو رہتاس کہلاتا ہے۔ اسی نام کا ایک قلعہ بہار میں بھی تھا۔ شیر شاہ نے 1541ء میں بنگال کے گورنر کی سرکوبی کر کے اُسے بغاوت سے باز رکھا۔

وسعت سلطنت:۔ پنجاب سے لے کر بنگال تک کامل امن وامان قائم کرنے کے بعد شیر شاہ نے فتوحات کا عظیم الشان سلسلہ شروع کیا اور اپنی سلطنت کو خوب وسیع کیا۔ اُس نے اپنی فوجی قابلیت کی دھاک بٹھا دی اور آناً فاناً اُس نے گوالیار۔ مالوہ اور رنتھمبور پر قبضہ کر لیا۔ ملتان اور سندھ کے دُور افتادہ علاقوں میں بھی اُس کے جرنیلوں نے فتوحات حاصل کیں۔ 1543ء میں شیر شاہ نے راجہ پورن مل کو شکست دے کر رائے سین کے قلعے کو مسخر کیا۔ راجہ ہلاک ہوا اور قلعے سے بے کس عورتوں کی بھاری تعداد کو آزاد کر دیا گیا جن میں مسلمان اور ہندو عورتیں شامل تھیں۔ 1544ء میں شیر شاہ نے اجمیر کے قریب مشہور راجپوت راجہ مالدیو کو شکست فاش دی۔ مارواڑ کا یہ راجہ راجپوتوں کا سردار تھا

اور ہندو سلطنت کی بحالی کے منصوبے باندھ رہا تھا۔

اسی سال شیر شاہ نے کالنجر فتح کرنے کی ٹھانی اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ 22 مئی 1545ء کو قلعے پر دھاوا بولا گیا۔ شیر شاہ بارود کے ڈھیر کے پاس کھڑا تھا جبکہ ایک گولہ قلعے کی دیوار سے ٹکرا کر واپس گرا۔ بارود میں آگ لگ جانے سے شیر شاہ بری طرح جھلس گیا اور چند روز بعد جب قلعہ فتح ہوا تو وہ بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔

شیر شاہ کی عظیم الشان فتوحات اس کی فوجی عظمت اور عزم و استقلال کا بیّن ثبوت ہیں۔

(2) اصلاحات:۔ شیر شاہ کی انتظامی صلاحیّت بہت بلند تھی۔ اس نے نظم و نسق کو سنوارنے کے لئے دن رات محنت کی۔ فوج کی کایا پلٹ دی۔ مالیہ کی وصولی کے لئے گراں قدر اصلاحات نافذ کیں۔ عوام کی بہبود پر زور دیا۔ زراعت کو ترقی دی افغان سرداروں کو قابو میں رکھا۔ ان کو ناراض کئے بغیر مرکزی حکومت کو مضبوط بنایا۔ سکّوں کی اصلاح کی جگہ جگہ تاجروں سے محصول وصول کرنے کا طریقہ بند کر کے ملک کی سرحد پر کسٹم ڈیوٹی کی وصولی کا انتظام کیا۔ ذرائع آمدورفت کو ترقی دی یعنی سڑکوں سے سلطنت کے ہر گوشے کو ملا دیا۔ شیر شاہ کی نافذ کردہ اصلاحات کی فہرست بے حد طویل ہے۔ ان اصلاحات میں سے چند ایک کی مختصر تفصیل دلچسپی کا باعث ہو گی۔

(1) انتظامی حلقے:۔ انتظامی سہولت کے لئے شیر شاہ نے صوبوں

کو مختلف حلقوں میں بانٹا ہوا تھا۔ ان حلقوں کو سرکار کہتے تھے ان حلقوں کی تعداد ۴۷ تھی۔ ہر سرکار میں مزید انتظامی حلقے تھے جنکو پرگنہ کہتے تھے ہر پرگنے میں دو اہم شاہی افسر تھے۔ شقدار چوپاییوں کا سر کچلتا تھا اور امن و امان قائم رکھنے کے علاوہ حکومت کے احکام منواتا تھا اور فوجی نوعیت کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ شقدار کے علاوہ ہر پرگنے میں ایک ایک منصف ہوتا تھا جو مقدمات کا فیصلہ کرنے کے علاوہ پرگنے کے انتظامی معاملات سلجھاتا تھا۔ اس کے علاوہ مالیہ وصول کرنے والے اہم ترین افسر یعنی امین کے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ مختلف پرگنوں کے کام کی نگرانی کے لئے ہر سرکار میں دو اعلیٰ افسر ہوتے تھے جو "شقدار شقداران" اور "منصف منصفان" کہلاتے تھے۔

ہر شقدار اور اس کا ناظم اعلیٰ اپنے فرائض کے علاوہ چور اور رہزنوں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ شیر شاہ نے پولیس کا عجیب و غریب نظام باندھا تھا۔ مجرم کو تلاش کر کے سزا دلوانا مقامی لوگوں اور زمینداروں کا فرض تھا ورنہ چوری شدہ مال کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس نظام کی بدولت چوری چکاری کا خاتمہ ہو گیا اور کمزور و بے کس بڑھیا بھی کسی کھٹکے کے بغیر مال و دولت سے لدی پھندی ملک بھر میں سفر کر سکتی تھی بلکہ اگر وہ سرِ راہ سو جاتی تو نزدیکی گاؤں کے باشندے پہرہ دیتے اور اس کے مال کی حفاظت کرتے تھے۔

(ب) فوجی اصلاحات:۔ شیر شاہ سوری نے جاگیرداروں کی فوج

کو ناکافی سمجھا اور مرکزی حکومت کی باقاعدہ فوج (Standing army or imperial army) بھرتی کی۔ اس کی فوج میں ڈیڑھ لاکھ سوار، پچیس ہزار پیدل فوج اور تین سو ہاتھی تھے۔ شاہی توپ خانہ نہایت شاندار تھا۔ مرکزی فوج کے علاوہ اس نے اہم فوجی اڈوں پر قلعے تعمیر کرکے چھاؤنیاں قائم کیں۔ چھاؤنی کے افسر اعلیٰ کو فوجدار کہتے تھے۔ شیر شاہ مرکزی فوج کا باقاعدہ معائنہ کرتا تھا۔ سپاہیوں کی تنخواہ خود مقرر کرتا تھا اور فوجی ڈسپلن قائم رکھتا تھا۔ ہر سپاہی کا تفصیلی حلیہ لکھا جاتا تھا۔ نیز علاؤالدین خلجی کی مانند اُس نے فوج کے گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ از سر نو رائج کیا۔ ان اقدامات سے فوجی امور میں دھوکہ دہی ختم ہو گئی۔ شیر شاہ کے زمانے سے فوجی سپاہیوں میں نئی روح پیدا ہو گئی اور وہ افسروں کے رحم وکرم پر نہ رہے۔ بلکہ فوجی سپاہی باقاعدہ سرکاری ملازم اور بادشاہ کے بہی خواہ بن گئے۔

(ج) مالیہ کی اصلاحات:۔ شیر شاہ نے مالیہ کے بارے میں اہم اصلاحات نافذ کیں۔ شیر شاہ کے بعد یہ اصلاحات برِّصغیر کے دیگر حکمرانوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئیں۔ شیر شاہ نے زمین کی باقاعدہ پیمائش کی اور زمین کے ہر ٹکڑے کو ملکیت کے لحاظ سے الگ الگ خسرہ نمبر دیا۔ یعنی ملک بھر کی زمین کا تفصیلی ریکارڈ تیار کروایا۔ لگان یا مالیہ کی شرح عام طور پر زمین کی پیداوار کے لحاظ سے ایک تہائی ہوتی تھی۔ بعض اوقات مالیہ کی شرح گھٹ کر ایک چوتھائی ہوتی تھی۔ مالیہ کاشتکاروں سے بلاواسطہ وصول

کیا جاتا تھا اور مالیہ کی ادائیگی نقدی یا جنس کی صورت میں ہوتی تھی زمین کی پیمائش اور پیداواری کا اندازہ لگاتے وقت نرمی برتی جاتی تھی لیکن مالیہ کی ادائیگی کے وقت کاشتکاروں کو ڈھیل نہیں دی جاتی تھی۔ مالیہ کی وصولی کے لئے ہر پرگنے میں اعلیٰ افسر موجود ہوتا تھا جو امین (Amin) کہلاتا تھا۔ ضرورت کے وقت وہ شقدار سے فوجی مدد لے لیتا تھا۔ لیکن مالیہ عام افسر وصول کرتے تھے اس محکمے میں قانونگو۔ مقدم اور پٹواری کے علاوہ دیگر کئی کارکن ہوتے تھے۔ اکبر کے عہد میں ٹوڈرمل نے شیر شاہی نظام کو بہتر بنا کر رائج کیا۔

(3) عدل و انصاف :۔ شیر شاہ عدل و انصاف کا پتلا تھا۔ انصاف کرتے وقت امیر یا غریب کی تمیز نہ ہوتی تھی۔ نیز رعایا کے تمام افراد سے بلا تمیز مذہب یکساں سلوک ہوتا تھا۔ شاہی خاندان کے افراد بھی ملکی قانون کے سامنے سرنگوں تھے۔ یوں تو ہر نوعیت کا مقدمہ بادشاہ کے سامنے پیش ہو سکتا تھا لیکن شیر شاہ نے باقاعدہ عدالتی نظام قائم کیا ہوا تھا۔ ہر پرگنے میں امین۔ میر عدل اور قاضی یا منصف موجود تھے اور منصفِ منصفاں ہر سرکار کا اعلیٰ جج ہوتا تھا۔ ملکی دار الخلافہ میں ملک کا چیف قاضی تھا جس کی عدالت میں عام طور پر اپیلیں دائر ہوتی تھیں۔

شیر شاہ کے انصاف کے ہاتھوں اس کا سگا بھتیجا اور مالوہ کا گورنر شجاعت خان بھی نہ بچ سکا۔

4۔ تعمیرات :۔ شیر شاہ نے چار عظیم الشان شاہراہیں بنا کر

ملک کے ہر گوشے کو ملا دیا۔ اُس کی تعمیر کردہ مشہور سڑک اب، جرنیلی سڑک (Grand Trunk Road) کہلاتی ہے۔ یہ سڑک سنار گاؤں (مشرقی پاکستان) سے شروع ہو کر آگرہ اور دہلی سے گذرتی ہوئی لاہور تک آتی تھی اور پھر دریائے سندھ تک پہنچتی تھی یعنی پورے پندرہ سو میل لمبی تھی۔ دیگر سڑکیں آگرہ تا برہان پور۔ آگرہ تا جودھپور و چتوڑ۔ لاہور تا ملتان تھیں ان سڑکوں پر جگہ جگہ مسافر خانے (Serais) تعمیر کئے گئے جہاں کنوئیں کھودے گئے اور ہندو و مسلمان خادم موجود رہتے تھے۔ سڑکوں پر دو رویہ سایہ دار اور پھلدار درخت تھے۔ ان مسافر خانوں کے قریب شاہی ڈاک لے جانے کے لئے تازہ دم گھوڑے موجود ہوتے تھے۔ ذرائع آمد و رفت کی ترقی سے ملکی تجارت کو بھی خوب فروغ ہوا۔ شیر شاہ کے عہد کی تعمیر کردہ شاہی عمارات زمانے کی دستبرد سے بچ نہ سکیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ دہلی کا پرانا قلعہ اُسی نے بنایا تھا۔ جہلم کے قریب قلعہ رہتاس شیر شاہ کا تعمیر کردہ ہے۔ وہ پختہ مسافر خانے نہ بنا سکا لیکن سہسرام (بہار) میں شیر شاہ کا اپنا مقبرہ سوری خاندان کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مقبرے کا بیرونی حصہ سادہ ہے لیکن اندر سے یہ مقبرہ دلکشی اور زیبائش کا مرقع ہے۔ اس میں شاہجہانی عمارات کی نسوانیت و نزاکت نہیں ہے اور نہ ہی تغلق دور کی عمارات کی سادگی و سنجیدگی دکھائی دیتی ہے۔ مشہور مؤرخ برسی براؤن کا فتویٰ یہ ہے کہ اس مقبرے کا ڈیزائن نادر

ہے۔ تعمیر اور ڈھب میں عمدگی ہے اور زیبائش مصوّرانہ ہے۔
تاریخ میں شیر شاہ کا مقام:۔ تاریخ میں شیر شاہ کو بلند مقام حاصل ہے۔ اُسے مؤرّخین نے اکبر کا پیش رو گنا ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر نے شیر شاہ سوری کی اصلاحات کو بہتر بنا کر نافذ کیا۔ نیز اُس نے شیر شاہ کی مانند رواداری کی پالیسی اختیار کی البتہ اکبر نے دین الٰہی رائج کر کے مذہب اسلام اور دیگر مذاہب کو یکجا کرنا چاہا۔ شیر شاہ سوری اگرچہ رعایا کے ہر فرد سے بلاتفریق مذہب عمدہ سلوک کرتا تھا لیکن وہ شرعی احکام کو پابندی سے ادا کرتا تھا اور سنّی مسلمان تھا۔ نیز دشمنوں کا سر کچلنے کے لئے شیر شاہ نے جہاد کے نام پر مسلمان فوج کو اُبھارا۔ دونوں کی مذہبی پالیسی مختلف تھی لیکن فوجی اصلاحات۔ لگان اراضی اور رواداری میں اکبر بلاشبہ شیر شاہ سوری کے نقش قدم پر چلا۔ اکبر کا عہد حکومت کافی طویل ہے اور وہ عظیم ترین شہنشاہ تھا لیکن اُس نے شیر شاہ سوری کے مفید کاموں کو برباد ہونے نہ دیا۔ شیر شاہ سوری کا عہد حکومت کئی لحاظ سے اکبر کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا۔

شیر شاہ سوری نے کرنسی کی اصلاح کر کے نئے معیاری سکے رائج کئے۔ اُس کے عہد میں روپیہ یا دام سولہ آنے کا تھا۔ اُس نے چاندی کے علاوہ سونے کے سکّے بھی جاری کئے۔ شیر شاہ سوری نے فیروز شاہ تغلق کی مانند محکمہ خیرات کی نگرانی کی اور طلبا۔ علماء اور مسجدوں کے آئمہ کو وظائف عطا کئے۔ مسجدوں اور مدرسوں کو وہ سرکاری گرانٹ عطا کرتا تھا۔ اُس کے زمانے میں مسکینوں

کو شاہی لنگر سے مفت کھانا ملتا تھا۔

شیر شاہ نے سڑکیں تعمیر کرائیں اور جاسوسی نظام کو بہتر بنانے کے لئے اطلاعات اور ڈاک کے محکمے کو ترقی دی۔ ڈاک چوکیوں پر تازہ دم گھوڑے موجود ہوتے تھے جو شاہی ڈاک لے جاتے تھے۔ عوام بھی ڈاک کے اس انتظام سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

شیر شاہ کے زمانے میں سڑکوں کی تعمیر۔ پولیس کے نئے نظام اور امن و امان کی بدولت تجارت کو خوب فروغ ہوا۔ اُس نے مختلف مقامات سے محصول اور چونگی کی پابندیاں ہٹادیں۔ صرف ملکی سرحد پر ایک بار درآمدی مال پر محصول لگتا تھا۔

مغلیہ دور کے مؤرخین شیر شاہ سوری کے سپاہیانہ جوہر ضرور تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ لکھتے ہیں کہ شیر شاہ کی انتظامی قابلیت معمولی تھی۔ انگریز مؤرخ ارسکائن (Erskine) نے سو سال قبل اپنی تاریخ میں اس رائے کا اظہار کیا کہ شیر شاہ عظیم حکمران تھا۔ اُس کی شہرت محض فوجی کارناموں کی بدولت نہیں بلکہ اُس نے لاتعداد اصلاحات نافذ کیں اور رعایا کی بہبودی کی جانب پوری توجہ مبذول کی۔ اُسے رعایا کا محافظ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر قانونگو (Dr. K. R. Qanungo) نے شیر شاہ سوری پر عالمانہ مقالہ لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ شیر شاہ سوری کے بارے میں قدیم نظریے درست نہیں۔ ڈاکٹر قانونگو کی رائے یہ ہے کہ شیر شاہ سوری عظیم حکمران تھا۔ تعمیری کاموں سے متعلق وہ خدا داد قابلیت

رکھتا تھا اور اکبر کی نسبت بہتر معمار قوم تھا۔

"He was a greater constructive genius and a better nation-builder than even Akbar the Great."

موجودہ صدی میں ڈاکٹر پی۔ سرن اور ڈاکٹر تری پاٹھی نے شیر شاہ سوری کے بارے میں یہ فتویٰ دیا ہے کہ شیر شاہ سوری کے کارنامے بیان کرتے ہوئے مؤرخین نے مبالغہ آمیزی کی ہے۔ ان دونوں حضرات کی رائے یہ ہے کہ شیر شاہ سوری نے محض قدیم قوانین کو دوبارہ رائج کیا لیکن وہ نت نئی اصلاحات کا اصلی موجد نہ تھا۔ اُس نے اصلاحات کی تجدید کی۔

"He was in fact a reformer and not an innovator"

ہماری رائے یہ ہے کہ شیر شاہ سوری کو اکبر جیسا عظیم المرتبت حکمران بنا دینا غلط ہے۔ لیکن وہ قرونِ وسطیٰ کا اہم ترین حکمران تھا وہ بیدار مغز اور کامیاب بادشاہ ثابت ہوا۔ کئی لحاظ سے اکبر کا پیش رو تھا۔ وہ بابر اور ہمایوں کی نسبت بہتر حکمران تھا۔ اُس نے محض پانچ سال کے قلیل عرصے میں عظیم الشان تعمیرات اور اصلاحات سے ہر شخص کو دنگ کر دیا۔ اُس کی محنت قابلِ داد ہے۔ اُس نے خواہ نئی چیزیں اختراع نہ بھی کی ہوں لیکن مفید مطلب اصلاحات کو رائج کرنا اُس کا کمال ہے۔ اُس کی فوجی اصلاحات بے شک

علاؤالدین خلجی کے نقش قدم پر تھیں۔ اُس کا نظام مالیہ بھی بالکل نیا (Original) نہ تھا لیکن یہ بات ضرور ہے کہ شیر شاہ سوری نے عمدہ انتظام سلطنت رائج کر کے اپنی وسیع سلطنت میں امن و امان قائم رکھا۔ اُس کے زمانے میں رعایا خوشحال تھی۔ زراعت اور تجارت کو ترقی ہوئی۔ سفر کرنا بے حد آسان ہو گیا۔ لوگوں کی نظروں میں قانون کی حرمت تھی۔ سرکاری افسروں کی کارکردگی بڑھ گئی تھی اور رعایا کی بہبودی حکومت کی واضح پالیسی بن گئی تھی۔ پس شیر شاہ سوری کو برّصغیر کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔

شیر شاہ کے جانشین:۔ شیر شاہ کے جانشین معمولی حکمران تھے اور اُن کے عہد میں سلطنت کا شیرازہ جلدی ہی بکھر گیا۔ افغان قومیت اور یک جہتی کا خیال جاتا رہا۔ امراء حسد و رقابت کا شکار ہو گئے۔ فوجی نظام درہم برہم ہو گیا اور جاگیردارانہ فوج (Feudal Army) دوبارہ شروع ہو گئی۔ تخت و تاج کے کئی دعویدار پیدا ہو گئے اور افغان امراء باہمی خلفشار میں مبتلا ہو گئے۔ سب سے نرالی بات یہ تھی کہ سوری خاندان میں شیر شاہ جیسا بیدار مغز حکمران یا جرنیل ایک بھی پیدا نہ ہوا لہٰذا سوری خاندان جلدی زوال پذیر ہوا اور 1555ء میں ہمایوں نے دہلی میں مغلیہ سلطنت بحال کر دی۔ 1545ء میں شیر شاہ کی وفات کے بعد اُس کا لڑکا جلال خان تخت نشین ہوا اُسے سلیم شاہ بھی کہتے ہیں۔ لیکن اُس کا لقب اسلام شاہ تھا۔ اُس کی سخت گیری کی بدولت نظامِ سلطنت برقرار رہا اور اُس

کے بھائی عادل خان اور اُس کے حامیوں کی پیش نہ گئی۔ لیکن جب نومبر ۱۵۵۳ء میں اسلام شاہ نے وفات پائی تو دہلی کے تخت و تاج کے لئے افغانوں میں سخت تنازعہ پڑا۔ آخر کار اسلام شاہ کے کمسن بیٹے فیروز خان کو قتل کر کے اُس کا ماموں مبارز خان تخت نشین ہوا اور محمد عادل شاہ سوری کا لقب اختیار کیا۔ وہ شیر شاہ کے بھائی نظام خان کا بیٹا تھا۔ لیکن عافیت کوش اور نکما تھا۔

نئے بادشاہ نے سلطنت کے تمام اُمور اپنے ایک ہندو وزیر ہیمو بقّال کے سپرد کر دئے جو ابتداء میں ریواڑی کا معمولی بنیا تھا لیکن اپنی لیاقت کی بدولت ترقی کر کے شاہی وزیر بنا۔ عادل شاہ سوری سہل انگار تھا اور موسیقی میں مگن رہتا تھا۔ لہٰذا جلدی ہی مالوہ اور بنگال اُس کے ہاتھوں سے نکل گئے اور کچھ عرصے کے بعد ملتان اور سندھ کے صوبے بھی خود مختار ہو گئے۔ کشمیر پہلے سے ہی آزاد تھا۔

شیر شاہ کے دو بھتیجے تخت کے دعویدار بنے اور افغان امراء نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ پنجاب کے گورنر سکندر شاہ نے بغاوت کی اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اسی سکندر شاہ کو مغل شہنشاہ ہمایوں نے سرہند کے قریب فروری 1555ء میں شکست دی اور آگے بڑھ کر دہلی و آگرہ پر قبضہ جما لیا۔ سوری خاندان کے زوال کی اصلی وجہ باہمی رقابت اور جنگ و جدال تھا۔ افغانوں میں باہمی اتحاد نہ رہا تھا اور طوائف الملوکی پھیلی چکی تھی۔ مرکزی

طاقت فنا ہو چکی تھی اور سوری خاندان کے تین حکمران دہلی کے تخت کے دعویدار تھے۔ دہلی سے جہلم تک کے علاقے پر سکندر شاہ سوری حکمران تھا۔ پنجاب کے کچھ حصے پر ابراہیم شاہ قابض تھا اور محمد عادل شاہ سوری کی حکومت آگرہ سے لے کر جونپور تک تھی۔ اور تینوں اپنے آپ کو برِ صغیر کا شہنشاہ تصور کرتے تھے۔

ان حالات سے فائدہ اٹھا کر ہمایوں نے مغلیہ سلطنت بحال کر لی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہمایوں دہلی کی سلطنت دوبارہ حاصل کر کے زیادہ دیر زندہ نہ رہا۔ لیکن نوعمر اکبر کو محمد عادل شاہ سوری کے وزیر ہیمو بقال کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کا حال اگلے باب میں بیان ہو گا۔

Typical Questions

Q. 1. "If there was a chance to stumble, Humayun was not the man to miss it." Discuss.

Q. 2. Do you agree with the view that Humayun blundered throughout his life ?Explain carefully.

Q. 3. How far is it correct to say that Humayun's own character was responsible for his misfortunes ?

Q. 4. " Humayun tumbled through life and tumbled out of it." Discuss.

Q. 5. The characters of Humayun and Sher Shah were poles apart."

Comment upon this and account for the failure of Humayun.

Q. 6. Describe briefly the reforms introduced by Sher Shah Suri.

Q. 7. " Sher Shah Suri re-vitalized administration and introduced efficiency." Discuss.

Q. 8. Comment upon one of the following statements about Sher Shah Suri :—

(*a*) " He was a greater constructive genius and a better nation-builder than even Akbar the great."

(*b*) " He was in fact a reformer and not an innovator."

Q. 9. Make an estimate of the achievements of Sher Shah Suri. Can he be regarded as a forerunner of Akbar ?

Q. 10. " Sher Shah Suri was a pre-cursor of Akbar the great." Discuss.

امتحانی سوالات

۱۔ "جب کبھی لغزش کا موقع پیدا ہوتا ہمایوں اُسے ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا" تبصرہ کیجئے۔

۲۔ آپ کو اس رائے سے کس حد تک اتفاق ہے کہ ہمایوں سے زندگی بھر فاش غلطیاں سرزد ہوئیں؟

۳۔ کیا یہ رائے درست ہے کہ ہمایوں کے تمام مصائب اُس کے اپنے کردار نے پیدا کئے؟

۴۔ "ہمایوں زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا رہا وہ آخری لمحات میں بھی ٹھوکر کھا کر گرا اور موت کی آغوش میں جا بیٹھا۔ تبصرہ کیجئے"

۵۔ "ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی صفات بالکل متضاد تھیں"۔ تبصرہ کیجئے اور ہمایوں کی ناکامی کے اسباب گنوائیے۔

۶۔ شیر شاہ سوری کی نافذ کردہ اصلاحات کا مختصر جائزہ لیجئے۔

۷۔ "شیر شاہ سوری نے ملکی نظم و نسق میں نئی روح پھونک دی اور کارکردگی پر زور دیا"۔ تبصرہ کیجئے۔

۸۔ شیر شاہ سوری کے بارے میں مندرجہ ذیل آراء میں سے کسی

ایک پر تبصرہ کیجئے:۔

(ا) "شیر شاہ سوری عظیم حکمران تھا۔ تعمیری کاموں سے متعلق وہ خداداد قابلیت رکھتا تھا اور اکبر کی نسبت بہتر معمار قوم تھا"

(ب) "شیر شاہ سوری نے محض قدیم قوانین کو دوبارہ رائج کیا۔ لیکن وہ نت نئی اصلاحات کا اصلی موجد نہ تھا۔ اُس نے اصلاحات کی تجدید کی"

۹۔ شیر شاہ سوری کے کارناموں کا جائزہ لیجئے۔ کیا اُسے اکبر کا پیش رو گنا جا سکتا ہے؟

۱۰۔ "شیر شاہ سوری کا عہد حکومت اکبر اعظم کے لئے مشعلِ راہ تھا اور وہ اُس کا پیش رو گنا جاتا ہے"۔ تبصرہ کیجئے۔

اُنتیسواں باب

اکبر اعظم

جلال الدین محمد اکبر چودہ فروری ۱۵۵۶ء کو تخت نشین ہوا اُس نے انچاس ۴۹ برس حکومت کی۔ اکبر کا عہد حکومت کامرانیوں سے بھرپور ہے۔ اکبر کی اصلاحات۔ فتوحات۔ انتظام سلطنت اور تدبر شہرۂ آفاق ہے۔

اکبر نے اپنی مذہبی پالیسی سے رعایا میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی اور مغلیہ سلطنت کو استحکام بخشا۔ وہ فہم و فراست اور دور اندیشی میں لاثانی تھا۔ راجپوتوں سے رشتے ناطے کر کے اُس نے ہندوؤں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ہندوستان کے باشندوں نے مغلوں کو غیر ملکی سمجھنا ترک کر دیا اور مغلیہ سلطنت پائیدار بنیادوں پر اُستوار ہوئی۔ پس مؤرخین نے اکبر کو مغلیہ سلطنت کا حقیقی بانی تصور کیا ہے۔ اُسے اکبر اعظم بھی گنا جاتا ہے۔ نیز وہ خوش قسمت حکمران تھا اُس کے عہد میں لاتعداد مشاہیر تھے جن میں اعلےٰ پایہ کے جرنیل منتظم اور اہل قلم حضرات بھی تھے۔ اِن مشاہیر نے اکبر کے عہد کو چار چاند لگائے۔

ابتدائی زندگی اور مشکلات:- اکبر 23 نومبر ۱۵۴۲ء میں

عمر کوٹ کے مقام پر پیدا ہوا جب ہمایوں ہندوستان کے تخت سے محروم ہو کر در بدر ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ اکبر کی والدہ کا نام حمیدہ بانو بیگم تھا جو وفا شعار تھی اور اپنے خاوند کے ساتھ مصائب برداشت کرنے کے بعد ایران چلی گئی۔ بیٹے کی پیدائش کی خبر جب ہمایوں کو ملی تو اُس کے پاس سوائے مشک نافے کے کچھ نہ تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں میں تھوڑا تھوڑا مشک نافہ ہی بانٹ دیا۔ مغلیہ دور کے مؤرخین فخریہ بیان کرتے ہیں کہ مشک نافے کی خوشبو کی مانند اکبر کی شہرت بھی چاردانگ عالم میں پھیلی۔

شیر شاہی فوج ہمایوں کے تعاقب میں تھی۔ اس لئے ہمایوں نے سندھ سے قندھار کی جانب کوچ کیا لیکن اُسے معلوم ہوا کہ کامران اُسے گرفتار کرنے کے درپے ہے۔ پس ہمایوں ایران بھاگ گیا۔ اس کس مپرسی کی حالت میں نوزائیدہ بچہ اکبر پیچھے رہ گیا۔ مغل سپاہیوں نے کم سن اکبر کو عسکری کی بیوی کے حوالے کیا۔ اُس نے اکبر کو پالا۔ ہمایوں نے 1547ء میں جب کابل کا قلعہ کامران سے چھینا تو اکبر اُسی قلعے میں تھا۔ اکبر کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہوا تھا لیکن وہ صحت مند اور خوبرو تھا۔ اپنے دادا بابر کی مانند بہادر تھا اور فنون حرب سے خوب واقف تھا۔ 1555ء میں جب ہمایوں نے پنجاب دوبارہ فتح کر لیا تو اُس نے بیرم خان کو اکبر کا اتالیق مقرر کیا لیکن چند ماہ بعد ہمایوں نے وفات پائی اور سوا تیرہ برس

کی عمر میں اکبر کلانور (ضلع گورداسپور) میں تخت نشین ہوا۔

نابالغ اکبر بالکل بے بس اور ناتجربہ کار تھا۔ بیرم خان اُس کا سرپرست بنا اور اُس نے اس نازک وقت میں مغلیہ سلطنت کو تباہی سے بچایا۔ وہ ہمایوں کا جان نثار خادم تھا اور مغلیہ اُمراء میں سے اہم ترین تھا۔ وہ شہزادے کو تعلیم دلانے میں قاصر رہا لیکن اُس نے سیاسی بصیرت سے کام لے کر مُغلیہ سلطنت کو مشکلات کے نرغے سے بچایا۔ کم عمر شہنشاہ نے اُسے خان خانان اور وکیل سلطنت بنا دیا اور بیرم خان جلدی ہی سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھا لیکن اُس کی وفاداری میں رتی بھر فرق نہ آیا۔ وہ اعلٰے پایہ کا جرنیل اور موقع شناس تھا لوگ اُسے جابر کہتے ہیں لیکن بیرم خان نے اپنی سخت گیری کی بدولت مغلیہ فوج کو بددلی سے بچایا۔ بیرم خان ثقافت ادب اور ہوشمندی میں یکتا تھا۔ اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ حالات کو بخوبی سمجھتا تھا اور موقع و محل کے مطابق مناسب اقدام کرتا تھا۔

بیرم خان کی رگوں میں ایرانی خون تھا اور وہ شیعہ تھا۔ مؤرخین اُسے ترکمان کہتے ہیں۔ ترک اُمراء اُس کے مخالف تھے۔ خاص طور پر شاہ ابوالمعالی سے بیرم خان کی خوب لگتی تھی۔ شاہ ابوالمعالی ترمذی کی قدر و منزلت بہت زیادہ تھی اور وہ ہمایوں کا ندیم تھا۔ وسط ایشیا کے سنّی اس خاندان کے عقیدت مند تھے۔ اکبر کی تخت نشینی کے فوراً بعد بیرم خان

نے شاہ ابوالمعالی کو گرفتار کر لیا اور شاہی دربار کو اپنے مخالفین سے پاک کیا۔

۱۵۵۶ء میں اکبر کی تخت نشینی کے محض چار روز بعد بدخشان کے گورنر سلیمان مرزا نے بغاوت کر کے کابل پہ فوج کشی کر دی۔ اگر بیرم خان کابل کو بچانے کے لئے فوج بھیجتا تو ہندوستان میں مغلوں کی حالت بے حد مخدوش ہو جاتی۔ اُن دنوں سوری سلطنت کے تین وارث پیدا ہو چکے تھے۔ پنجاب میں سکندر شاہ سوری نے ہمایوں کے ہاتھوں سرہند کے مقام پر شکست کھائی تھی اور وہ شوالک کی پہاڑیوں کی جانب بھاگ گیا تھا۔ ہمایوں نے اکبر کو لاہور کا گورنر بنا کر اُس کے اتالیق بیرم خان سمیت فوج دے کر اُس کا سر کچلنے کے لئے بھیجا تھا۔ اکبر کلانور پہنچا تو ہمایوں نے وفات پائی تھی۔

ہمایوں کی آمد سے پہلے ابراہیم شاہ سوری نے محمد عادل شاہ کو دہلی سے مار بھگایا تھا لیکن خود سکندر شاہ سوری سے شکست کھائی تھی اور دہلی اُس کے حوالے کر کے وہ بھاگ گیا تھا۔ ابراہیم شاہ سوری کافی عرصہ دربدر پھرتا رہا۔ آخرکار وہ ۱۵۶۷ء میں اڑیسہ پہنچا اور وہاں وفات پائی۔

پانی پت کی دوسری لڑائی:۔ اُن دنوں دہلی اور آگرہ میں قحط رونما تھا اور پلیگ کی وبا نے بھی تباہی مچائی ہوئی تھی۔ مغلوں کے قدم ابھی پوری طرح نہ جمے تھے۔ پنجاب میں بیرم خان کی فوج ضرور موجود تھی لیکن اکثر مغل سپاہی ہندوستان

میں قیام کے خلاف تھے۔ محمد عادل شاہ اُس وقت چنار کے قلعے میں مقیم تھا۔ اُس کے ہندو وزیر ہیمو بقال نے فوری پیش قدمی کر کے آگرہ اور دہلی پر قبضہ جما لیا اور دہلی کے مغلیہ گورنر تردی بیگ کو مار بھگایا۔ اس فتح کے بعد ہیمو بقال نے اپنے آقا محمد عادل شاہ سوری کو فراموش کر دیا اور خود بکرماجیت کا لقب اختیار کر کے دہلی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

مشکلات کے نرغے سے مغلیہ فوج بددل ہو گئی تھی اور اکثر مغل سردار کابل لوٹ جانے کے حامی تھے۔ لیکن اس نازک وقت میں بیرم خان کی سخت گیری نے پانسہ پلٹ دیا اُس نے تردی بیگ کو بزدلی کی پاداش میں سولی پر لٹکا دیا۔ اُس کا حشر دیکھ کر مغلیہ فوج چپ سادھ کر بیرم خان کی حکم عدولی نہ کر سکی۔ بیرم خان نے تھوڑی سی فوج پنجاب میں رکھی اور باقی فوج لے کر ہیمو بقال کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ پانی پت کے تاریخی میدان میں ۵ نومبر 1556ء کو بیرم خان نے ہیمو کو شکست فاش دی۔ اِسے پانی پت کی دوسری لڑائی کہتے ہیں۔ ہیمو گرفتار ہوا اور بیرم خان نے اُسے تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ برصغیر کی تاریخ میں یہ لڑائی کافی اہم ہے۔ اس لڑائی کی بدولت ہندوؤں کی سلطنت بحال ہونے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ نیز مغلیہ سلطنت مٹ جانے سے بچ گئی۔

پانی پت کی لڑائی میں ہیمو بقال کے پاس ایک لاکھ فوج

تھی جس میں ہندوؤں کے علاوہ افغان بھی تھے۔ اُس کا توپخانہ عمدہ تھا اور اُس کی فوج میں پندرہ سو ہاتھی بھی تھے۔ مغلوں کی کامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ مغلیہ جرنیل علی قلی خان اُزبک نے جو ہراول دستے کا سردار تھا ہیمو کے توپخانہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے باوجود ہیمو نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مغلیہ فوج ہراساں ہو چکی تھی لیکن اتفاقاً ایک تیر ہیمو کی آنکھ میں آ لگا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اُس کی فوج بددل ہو کر بھاگ اُٹھی اور دہلی و آگرہ پر مغلوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔

مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ پانی پت کی دوسری لڑائی میں مغلوں کی فتح کا سہرا دراصل بیرم خان کے سر ہے۔ اُس کے بغیر مغلیہ فوج پنجاب سے آگے نہ بڑھتی۔ پس برّصغیر میں مغلیہ سلطنت کی بقا بیرم خان کی بدولت ممکن ہوئی۔

بیرم خان کا زوال:- بالغ ہونے کے بعد ۱۵۶۰ء میں اکبر نے یکدم بیرم خان کو معزول کر دیا اور اُمورِ سلطنت خود سنبھالے۔ دربار میں بیرم خان کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اکبر اپنی والدہ حمیدہ بانو بیگم کا بے حد احترام کرتا تھا۔ نیز اپنی دایہ جیجی انگہ اور اُس کے خاوند شمس الدین اتگہ خان پر خوب مہربان تھا۔ اسی طرح اکبر کی دوسری آیا ماہم انگہ اور اُس کا بیٹا ادھم خان بھی صاحبِ اثر تھے۔ یہ تمام اشخاص بیرم خان کے مخالف تھے اور اکبر کے کان بھرتے رہتے تھے۔ خاص طور پر شاہی محل کی باا‌ثر خواتین (حمیدہ بانو بیگم۔ ماہم انگہ اور جیجی انگہ) اکبر کو بیرم خان

کے خلاف گستاخی تھیں۔ بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ بیرم خان کا اقتدار حد سے بڑھ گیا تھا اور وہ شیعہ اصحاب کو اعلے عہدے عطا کرتا تھا۔ اصلی بات یہ تھی کہ دوسرے اُمرا، اُس سے حسد کرتے تھے اور شاہی دربار میں اُس کے خلاف سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اکبر بذاتِ خود زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ البتہ مشیروں کے کہنے پر اکبر نے بیرم خان سے اچھا سلوک نہ کیا۔

شاہی اختیارات اپنے ہاتھ میں لیتے ہی اکبر نے بیرم خان سے تمام منصب چھین لئے اور جبری اُسے حج کے لئے روانہ کیا۔ بیرم خان نے شہنشاہ کے احکام کی پوری تعمیل کی۔ لیکن اکبر نے پیر محمد کو فوج کا ایک دستہ دے کر بیرم خان کی نگرانی کے لئے بھیجا کہ وہ کہیں راستے میں ہی نہ رک جائے۔ پیر محمد سے بیرم خان ناراض تھا اور پیر محمد کو بیرم خان نے اپنی ملازمت سے سبکدوش کر دیا تھا۔ اکبر نے جب پیر محمد کو بیرم خان کی نگہداشت کے لئے بھیجا تو غیور جرنیل نے غصے میں آ کر بغاوت برپا کر دی۔ مکّہ جانے کی بجائے بیرم خان پنجاب پہنچا لیکن جالندھر کے قریب شاہی فوجوں سے شکست کھا کر گرفتار ہُوا۔ اکبر نے اُس کی خدمات کے پیشِ نظر بیرم خان کو معاف کر دیا اور عزت و احتشام سے اُسے حج کے لئے روانہ کیا۔ گجرات کاٹھیاواڑ میں پٹن کے مقام پر بیرم خان کو اُس کے کسی ذاتی دشمن نے قتل کر ڈالا۔ اکبر نے بیرم خان کے نابالغ بیٹے عبدالرحیم

کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ عبدالرحیم خان خاناں اکبری دور کے مشاہیر میں سے ہے۔ وہ متعدد سرکاری عہدوں پر فائز رہا۔ عبدالرحیم شعر و سخن کا دلدادہ تھا اور اہل علم کا قدردان تھا۔

اکبر کے خصائل :۔ شہنشاہ اکبر رعب دار شخصیت کا مالک تھا۔ اُس کا قد متوسط تھا (پانچ فٹ سات انچ) لیکن جسم متناسب و موزوں تھا۔ اُس کی پیشانی کشادہ اور اونچی تھی۔ آنکھیں تیز اور چمکدار۔ رنگ گندمی۔ آواز بلند اور مؤثر تھی۔ وہ شکار۔ تفریح اور کھیل تماشے کا شوقین تھا۔ وہ خوش مزاج اور ملنسار تھا۔ وہ فراخ دل۔ دور اندیش اور زیرک تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ سلطنت کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس کی یادداشت نہایت عمدہ تھی۔ بعد ازاں جب ابوالفضل اُس کا ندیم بنا تو اکثر کتابوں کا موضوع اکبر کو زبانی یاد ہو گیا۔ اکبر بحث مباحثے کا شوقین تھا اور بحث و تنقید کو حصولِ علم کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ بعد ازاں اُس نے فتح پور سیکری میں بحث کے لئے ایک عالیشان ہال تعمیر کرایا۔ اُس کا خیال تھا کہ بحث مباحثے عبادت کے مترادف ہیں۔ چنانچہ اس ہال کا نام عبادت خانہ رکھا گیا۔ اکبر ابتدا سے ہی مذہبی معاملات میں تنگ نظر نہیں تھا۔ اُس کے اُستاد اکبر کو کتابیں پڑھانے میں ناکام رہے لیکن کورانہ تقلید سے اُسے پاک کر گئے۔ وہ مطلق العنان بادشاہ ضرور تھا لیکن اُسے اپنے مزاج پر قابو تھا۔ وہ دشمنوں سے بھی فراخ دلی سے پیش آتا تھا۔ وہ سلجھا ہوا انسان تھا اور ادبی ذوق رکھتا تھا۔

موسیقی اور مصوّری میں بھی صاحبِ نظر تھا۔ اکبر مشائخ کا احترام کرتا تھا اور مختلف صوفیوں کی درگاہوں کی زیارت کے لئے جاتا تھا۔ بعد ازاں اُسے یقین کامل ہو گیا کہ تمام مذاہب خدا تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں۔ ابوالفضل نے بار بار یہ لکھا ہے کہ بادشاہ صوفی منش تھا اور کائنات پر گھنٹوں غور کرتا رہتا تھا۔ اکبر صلحِ کل اور کامل رواداری کا پیغامبر تھا۔ اُس نے راجپوت شہزادیوں سے شادیاں کر کے غیر مسلم رعایا کو اپنا بنا لیا۔ نیز اُس نے غیر مسلموں کو بھی اعلےٰ سرکاری عہدے عطا کئے۔ اُس نے بادشاہت کی بنیاد مذہب کی بجائے نیشنلزم پر رکھی۔ دینِ الٰہی رائج کرنے میں اُس کے مقاصد واضح نہ تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندو رعایا اُس کی مذہبی پالیسی کی بدولت بے حد خوش تھی۔ وہ رام اور رحیم کو یکجا نہ کر سکا لیکن اُس نے مغلیہ سلطنت کو استحکام بخشا۔ اُس کی انتظامی قابلیت بھی قابلِ داد ہے۔ اُس کی فتوحات عظیم الشان تھیں۔ الغرض وہ ہر لحاظ سے کامیاب ترین حکمران تھا۔ اُس کی فتوحات بیان کرنے سے پہلے اکبر کی ابتدائی اصلاحات کا جائزہ لیا جائے گا۔

ابتدائی احکامات:۔ (۱) 1562ء میں اکبر نے حکم دیا کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنانا قطعی طور پر بند کر دیا جائے۔ اُس وقت اکبر کی عمر محض بیس برس کی تھی۔ اس فرمان سے اکبر کی وسعتِ نظر اور فراخ دلی کا ثبوت ملتا ہے۔

(۲) نومبر 1561ء میں اکبر نے منیم خان کی بجائے شمس الدین اتکہ خان کو اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ یہ بات اُمراء کو ناگوار گذری - نیز ماہم انگہ اور اُس کا بیٹا آدھم خان بھی شمس الدین اتکہ خان کو ناپسند کرتے تھے۔ نئے وزیر کی بدولت اُن کا اثر و رسوخ گھٹ گیا تھا۔ ماہم انگہ کا داماد شہاب الدین احمد خان بھی اتکہ خان کا مخالف تھا۔ مخالفین کے گروہ کی دال نہ گل سکی - لیکن آدھم خان نے بے قابو ہو کر ۱۶ مئی 1562ء میں شاہی محل میں گھس کر شمس الدین اتکہ خان کو خنجر گھونپ کر مار ڈالا اور اس کے فوراً بعد اکبر کی خوابگاہ میں گھسنے کی کوشش کی تاکہ بادشاہ سے معافی نامہ حاصل کر سکے۔ شاہی پہرہ داروں نے اُسے روکا تو وہ اُن سے اُلجھ پڑا۔ شور سن کر اکبر نیند سے بیدار ہُوا جب اُسے واقعات کا علم ہُوا تو اکبر کے غصّے کی انتہا نہ رہی اور اُس نے حکم دیا کہ آدھم خان کو محل کی چھت سے نیچے پھینک دیا جائے۔ آدھم خان چھت سے گرتے ہی مر گیا اور اسی غم میں اُس کی بیمار ماں بھی تھوڑے عرصے بعد چل بسی۔ منیم خان، شہاب الدین اور دیگر سازشی ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ اس مقام سے اکبر شاہی محل کے زہریلے اثرات سے بالکل آزاد ہُوا۔ نیز وہ اپنی ماں اور دایوں کے اثر و رسوخ سے بھی بے نیاز ہو گیا۔ گویا آدھم خان کی موت کے بعد اکبر اپنے پاؤں پر کھڑا ہُوا اور زنانہ اثر سے آزاد ہو کر خود حکمرانی کرنے لگا۔

(۳) 1563ء میں متھرا کے مقام پر اکبر نے یہ فرمان جاری

کیا کہ ہندو یاتریوں سے کوئی ٹیکس (Pilgrim Tax) وصول نہ کیا جائے۔ اس فراخ دلی سے ہندو رعایا خوش ہو گئی۔ جوان سال بادشاہ خیال تھا کہ خالق کی پرستش خواہ کوئی شخص غلط طریقے سے ہی کرے عبادت یا تلاش حق پر ٹیکس عائد نہ کرنا چاہئے۔

(۴) 1564ء میں اکبر نے اپنی مملکت کے ہر حصے میں جزیہ کی وصولی ختم کر ڈالی۔ یہ ٹیکس اُن ہندوؤں سے وصول کیا جاتا تھا جو فوجی خدمت نہیں کرتے تھے۔ اپاہج نہیں تھے اور دولت کماتے تھے۔ جزیہ معاف کرنے سے اکبر اپنی ہندو رعایا میں مقبول ہو گیا۔

(۵) مارچ 1564ء میں اکبر نے اپنے ماموں خواجہ معظم کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔ خواجہ معظم سازشی تھا اور اُس نے اپنی بیوی کو بھی قتل کر ڈالا تھا۔ اکبر نے شروع میں حکم دیا کہ خواجہ معظم کو دریائے جمنا میں ڈبو دیا جائے۔ بعد ازاں یہ حکم صادر ہُوا کہ اُسے قید خانے میں ڈال دیا جائے۔ خواجہ معظم کے بعد اکبر کی ماں حمیدہ بانو بیگم نے بھی سیاست میں دخل اندازی ترک کر دی۔ البتہ اکبر حسب سابق ماں کا احترام کرتا رہا۔ مورخین کا خیال ہے کہ زنانہ اثرات سے آزاد ہو کر اکبر نے مارچ 1564ء سے اصلی اختیارات اپنے ہاتھ میں لئے۔ بعد ازاں اُس نے اپنی فہم و فراست سے کام لیا اور کسی کے زیر اثر نہ رہا۔

اکبر کے عہد کی فتوحات

بیرم خان کے زوال کے بعد جب انتظام سلطنت شاہی محل

کی مستورات کے چنگل میں تھا۔ اکبر نے شمالی ہند کی تسخیر کا عزم کیا۔ ابوالفضل یوں رقمطراز ہے کہ شہنشاہ سلامت نے فتوحات کا ارادہ محض اس لیئے کیا تھا کہ ملک کے ہر گوشے میں امن و امان کی بحالی سے عوام کو خوشحالی نصیب ہو اور لوگ، اپنے حاکموں کے استبداد سے نجات پائیں۔ ابوالفضل کی یہ چکنی چپڑی باتیں سراسر غلط ہیں۔ اکبر کی فتوحات کا مقصد محض حصول زر اور علاقائی بھوک تھی۔ وہ ہر عظیم الشان فاتح کی مانند محض اقتدار کے نشے میں اور فتوحات کے شوق میں برِصغیر کے اطراف واکناف میں پہنچ کر جنگ و جدال میں مصروف رہا۔ اُس کے فوجی کارنامے کافی درخشاں ہیں۔ اکبر نے اپنی امپیریل پالیسی کی ابتدا ۱۵۶۱ء میں مالوہ کی تسخیر سے کی۔ اس کے بعد اُس نے پے درپے فتوحات کی بدولت مغلیہ سلطنت کو خوب وسعت بخشی۔ وسعت پذیری کی پالیسی پر اکبر پورے چالیس برس کاربند رہا۔ مرنے سے تین چار برس قبل وہ تقریباً تمام ہندوستان پر قابض ہو چکا تھا اُس کی فتوحات کی فہرست کافی طویل ہے۔

اکبر کی فتوحات کا مختصر حال حسب ذیل ہے۔

(۱) **مالوہ کا الحاق**:۔ بیرم خان نے معزولی سے پہلے مالوہ کی تسخیر کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ اکبر نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیتے ہی ۱۵۶۰ء میں پیر محمد اور ادھم خان کو فوج دے کر مالوہ کو فتح کرنے کے لئے بھیجا۔ مالوہ کے حاکم باز بہادر کو شکست ہوئی اور مالوہ کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا

گیا۔ باز بہادر کافی عرصہ تک بھٹکتا رہا لیکن آخرکار اطاعت قبول کر کے اکبر کا منصب دار بن گیا۔

(۲) گونڈوانہ کی تسخیر:۔ ۱۵۶۴ء میں اکبر نے اپنے جرنیل آصف خان کو ریاست گونڈوانہ (وسط سندھ) کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ اس ریاست کا راجہ بیر نرائن نابالغ تھا، لیکن اس کی ماں رانی درگاوتی نائب سلطنت تھی اور رعایا اس کی حکومت سے خوش تھی۔ مغلیہ فوج کے سامنے رانی کی پیش نہ گئی اور وہ شکست کھا کر میدان جنگ میں کام آئی۔ ریاست کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

(۳) اُزبکوں کی سازش:۔ ۱۵۶۴ء میں اُزبکوں نے سازش کی اور اکبر کی بجائے اس کے چچا کامران کے بیٹے کو برِ صغیر کا تخت و تاج دلانے کی کوشش کی۔ چنانچہ تین سال تک اکبر اُزبکوں کے خلاف مصروف پیکار رہا۔ سب سے پہلے مالوہ کے گورنر عبداللہ خان اُزبک نے بغاوت کی لیکن شکست کھائی اگلے سال یعنی ۱۵۶۵ء میں جونپور کے گورنر زمان خان اُزبک نے بغاوت کی لیکن منہ کی کھائی۔ اکبر کے رضائی بھائی مرزا حکیم نے جو کابل کا گورنر تھا، اُزبکوں سے مل کر ۱۵۶۶ء میں بغاوت کی اور پنجاب پر قبضہ جمانے کی کوشش کی لیکن اکبر کی فوج کی آمد پر بغیر لڑے پیچھے ہٹ گیا۔ اکبر نے اسے تو معاف کر دیا لیکن اُزبک سرداروں کے خلاف فوجی کارروائی کی اور ان کے سرداروں کا صفایا کیا۔

(۴) چتوڑ کی تسخیر:۔ فتوحات کے شوق میں اکبر نے 1567ء میں میواڑ کے راجہ اُودھے سنگھ پر حملہ کیا اور خونریز لڑائی کے بعد چتوڑ کے مشہور قلعے پر قبضہ کیا۔ راجہ بھاگ کر راجپوتانے کی پہاڑیوں میں چھپ گیا لیکن میواڑ کے راجپوتوں نے جے مل اور پتہ سنگھ (یا فتا سنگھ) کی سرکردگی میں مغل فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ چتوڑ کا قلعہ 23 فروری 1568ء کو فتح ہو گیا اور مذکورہ بالا دونوں سردار مارے گئے۔

میواڑ کے راجپوتوں نے چتوڑ کی آزادی کے لئے مسلسل جدوجہد کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اُودھے سنگھ کے بعد اس کا بیٹا رانا پرتاپ مغلوں کے خلاف لڑتا رہا۔ 1576ء میں اس نے ہلدی گھاٹ کے مقام پر مغل جرنیلوں آصف خان اور مان سنگھ سے شکست کھائی لیکن ہمت نہ ہاری اور پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہو کر اپنی ریاست کی آزادی کے لئے کوشاں رہا۔ اپنی موت سے پہلے رانا پرتاپ ریاست میواڑ کے کچھ حصے پر قابض ہو گیا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا امر سنگھ بدستور مغلوں کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اکبر نے حسن سلوک کی بدولت اکثر راجپوت حکمرانوں کا دل موہ لیا تھا اور وہ برضا و رغبت شاہی منصبدار بننے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ نیز اکبر نے کئی ایک راجپوت شہزادیوں سے شادی کر کے راجپوتوں کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ اس نے راجپوتوں کو اعلےٰ عہدے بخشے تھے اور اکثر

راجپوت حکمرانوں اور رئیسوں نے اکبر کی ماتحتی قبول کر لی تھی چنانچہ ریاست جے پور کے حکمران راجہ بہاری مل نے سب سے پہلے اپنی لڑکی کی شادی اکبر سے کر دی تھی۔ اس کا بیٹا بھگوان داس اور اس کا پوتا مان سنگھ عمر بھر اکبر کے دربار میں رہے اور اعلیٰ منصب پا کر عزت پائی۔ اس کے علاوہ بیکانیر اور جیسلمیر کے حکمرانوں نے بھی اپنی لڑکیاں اکبر سے بیاہ دیں۔ ان رشتوں سے مغلیہ سلطنت کو جانثار سپاہی میسر آ گئے۔ لیکن ریاست میواڑ کے راجپوت کبھی مغلوں کے سامنے نہ جھکے۔ رانا سانگا جس نے بابر سے جنگ کی تھی اسی ریاست کا حکمران تھا۔ اکبر نے چتوڑ پر قبضہ تو کر لیا لیکن میواڑ کے راجپوتوں کا دل نہ موہ سکا۔

(۵) رنتھمبور اور کالنجر کی تسخیر:۔ چتوڑ کی فتح کے بعد اکبر نے رنتھمبور کا رخ کیا اور فروری 1569ء میں رنتھمبور کے قلعے پر گولہ باری شروع کر دی۔ یہ قلعہ ناقابل تسخیر گنا جاتا تھا۔ رنتھمبور کے راجہ سرجن ہری نے بھگوان داس اور مان سنگھ کے ذریعے اکبر کی اطاعت قبول کی اور قلعہ اکبر کے حوالے کیا۔ اکبر نے خوش ہو کر راجہ سرجن ہری کو اعلیٰ منصب عطا کئے۔ یہ راجہ بعد ازاں بنارس کا گورنر بھی رہا۔

اس کے بعد اکبر نے اپنی فوج کو کالنجر کی فتح کے لئے بندھیل کھنڈ میں بھیجا۔ اگست 1569ء میں راجہ نے اطاعت قبول کی اور کالنجر کا اہم فوجی اڈہ مغلوں کے قبضے میں آ گیا۔

(۶) گجرات کا الحاق:۔ گجرات کی شادابی اور اس کی تجارتی اہمیت کے پیش نظر اکبر نے اس علاقے کی تسخیر کا عزم کیا اور نومبر 1572ء

میں وہ احمد آباد جا پہنچا۔ گجرات کے حکمران مظفرشاہ سوم نے اطاعت قبول کی اور اکبر انتظامات مکمل کر کے واپس لوٹا۔ لیکن فتح پور سیکری پہنچتے ہی خبر ملی کہ گجرات بغاوت پر آمادہ ہے۔ اکبر تیزی سے واپس لوٹا اور ستمبر 1573ء میں گجراتی فوج کو شکست دی۔ اکبر نے وہاں چند سال اور صرف کیے تا کہ دشمن کی مزاحمت کا خاتمہ ہو سکے۔ چنانچہ 1584ء تک گجرات کامل طور پر مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔ یعنی وہ کام جو ہمایوں نہ کر سکا تھا اکبر نے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ گجرات پر قبضہ ہونے سے دکن کی تسخیر آسان ہو گئی۔

(۷) **بنگال کا الحاق** :- بنگال کے سلطان سلیمان نے اکبر کی اطاعت قبول کر کے اپنی سلطنت کو بچا لیا تھا۔ 1572ء میں اُس کا بیٹا داؤد تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اکبر نے حملہ کر کے داؤد کو شکست دی اور تخت سے علیحدہ کر دیا۔ اگلے سال اُس نے پھر سر اُٹھایا لیکن شکست کھا کر مارا گیا۔ اُس کی موت کے بعد بنگال کامل طور پر مغلیہ سلطنت سے ملحق ہو گیا۔ اس کے بعد بنگال کے افغان کافی عرصہ باغیانہ سرگرمیوں میں مگن رہے۔ چنانچہ انہوں نے حکیم مرزا کی حمایت میں 1592ء میں بغاوت کی لیکن مان سنگھ کے ہاتھوں شکست کھائی۔

(۸) **کشمیر اور سرحدی قبائل کی تسخیر** :- کافی عرصے سے اکبر کشمیر پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ کشمیر کے حکمران یوسف خان نے 1581ء میں اطاعت قبول کی تھی اور اپنے بیٹے کو اکبری دربار میں

بھیجا تھا، لیکن اُس نے خود شاہی دربار میں حاضری نہ دی اور ٹال مٹول کرتا رہا۔ لہٰذا 1585ء میں اکبر نے کشمیر فتح کرنے کا عزم کیا اور قاسم خان و بھگوان داس کی سرکردگی میں فوج بھیجی۔ مغلیہ فوج سری نگر کے قریب جا پہنچی لیکن برفباری سے مجبور ہو کر یوسف خان سے صلح کر لی۔ یوسف خان نے مغل جرنیلوں کے سامنے پیش ہو کر باجگذاری کا وعدہ کیا اور یہ شرط بھی مان لی کہ کشمیر میں اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا اور اکبری سکے رائج ہوں گے۔ شہنشاہ اکبر نے اس صلح نامے کو منظور نہ کیا اور جب یوسف خان اور اُس کا بیٹا یعقوب اکبر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اکبر نے اُن کی گرفتاری کے احکام صادر کر دئے۔ یعقوب خان بھاگ نکلا اور کشمیر پہنچ کر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اکبر نے بھی مغل فوج کشمیر بھیجی۔ یعقوب خان کو شکست فاش ہوئی اور اکبر نے کشمیر کا الحاق کر لیا۔ یوسف خان کو مغلیہ حکومت نے منصبدار بنا دیا اور کشمیر کو صوبۂ کابل میں شامل کر دیا گیا۔

1585ء میں جب مغلیہ فوج کشمیر پر حملہ آور ہوئی تو اکبر نے شاہی فوج سرحدی قبائل کی سرکوبی کے لئے بھی بھیجی۔ وہ خود دسمبر 1585ء میں راولپنڈی اور اٹک پہنچا اور یوسف زئی و مندار قبائل کی سرکوبی کے لئے زین خان کوکلتاش، راجہ بیربل اور حکیم ابوالفتح کو بھیجا۔ مغلیہ فوج کو شکست ہوئی کیونکہ تینوں جرنیل ایک دوسرے سے تعاون نہ کرتے تھے اور سرحد کے لا متناہی سلسلۂ کوہ سے شاہی فوج تنگ آ گئی تھی۔ راجہ بیربل مارا گیا

اور اُس کی لاش بھی نہ مل سکی۔ اکبر کو بیربل کی موت کا بہت قلق ہوا۔ اس کے بعد اکبر نے راجہ ٹوڈر مل کو بھیجا جس نے سرحدی قبائل کو اطاعت پر مجبور کیا۔ اس کے بعد مغل جرنیل مان سنگھ نے بھی سرحد پر فوج کشی کی اور درہ خیبر کے قریب شاندار فتح حاصل کر کے قبائل کو بے بس کر دیا اور اُن کو امن پسندی پر مجبور کیا۔

(۹) سندھ، بلوچستان اور قندھار کا الحاق:۔ 1590ء میں اکبر نے ملتان کے گورنر عبدالرحیم خان خاناں کو ٹھٹھہ کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ جنوبی سندھ کے حاکم مرزا جانی بیگ ترکمان نے مغلیہ فوج سے شکست کھا کر ہتھیار ڈال دیئے اور تمام جنوبی سندھ (ٹھٹھہ سمیت) مغلوں کے حوالے کیا اور خود سہ ہزاری منصبدار بن گیا اور دین الٰہی بھی قبول کر لیا۔ ٹھٹھہ سے مغل فوج بلوچستان اور قندھار پر حملہ آور ہو سکتی تھی۔ چنانچہ 1595ء میں اکبر نے میر معصوم کو بلوچستان کی تسخیر کے لئے مامور کیا۔ بلوچستان پر اُس زمانے میں افغان سرداروں کی حکومت تھی۔ سبی کے علاقے پر قبضہ جمانے کے بعد میر معصوم نے بلوچستان اور مکران پر کامل قبضہ جما لیا۔

اُن دنوں قندھار پر ایرانیوں کا قبضہ تھا۔ اکبر قندھار فتح کرنے کے منصوبے سوچ رہا تھا لیکن قندھار کے ایرانی گورنر مظفر حسین مرزا نے اپنی حکومت سے ناراض ہو کر قندھار کا علاقہ مغلوں کے حوالے کر دیا اور دہلی پہنچ کر جاگیر پائی اور

پنج ہزاری منصبدار کے عہدے پر سرفراز ہوا۔

(۱۰) اُڑیسہ کا الحاق:۔ 1590ء میں بہار کے گورنر راجہ مان سنگھ کو اُڑیسہ پر فوج کشی کا حکم ملا۔ اُڑیسہ میں قتلو خان لوہانی خود مختار بن بیٹھا تھا۔ اس نے مغل فوج کی آمد سے پہلے ہی وفات پائی اور اُس کے بیٹے نثار خان نے معمولی سی جھڑپ کے بعد اطاعت قبول کر لی۔ دو سال بعد اُس نے بغاوت کی مان سنگھ نے حملہ کر کے نثار خان کو مار بھگایا اور اُڑیسہ کو صُوبہ بنگال میں شامل کر دیا گیا۔

(۱۱) تسخیر دکن:۔ تمام شمالی ہند پر قابض ہو جانے کے بعد اکبر نے دکن کی تسخیر کا ارادہ کیا۔ اُس نے اگست 1591ء میں دکنی حکمرانوں کے پاس اپنے سفیر بھیج کر یہ مطالبہ کیا تھا کہ تمام دکنی ریاستیں اُس کی باجگذار بن جائیں۔ خاندیش کے سوا کسی ریاست نے اکبر کی اطاعت قبول نہ کی۔ پس اکبر نے 1593ء میں دکن کی تسخیر کے لئے فوج بھیجی۔

(۱) سب سے پہلے عبدالرحیم خان خاناں اور شہزادہ مراد کی سرکردگی میں مغلیہ فوج بیجاپور کی تسخیر کے لئے روانہ ہوئی اور احمد نگر کا محاصرہ کر لیا جہاں چاند بی بی نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مغل فوج کے دانت کھٹے کئے۔ 1596ء میں مغل فوج نے مجبوراً صلح کر لی۔ برہان الملک کے نابالغ پوتے بہادر نظام شاہ کو ریاست کا سلطان تسلیم کر لیا گیا۔ برار کا علاقہ مغلوں کے حوالے ہوا اور بیجاپور کی ریاست نے اکبر کو حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا۔

(۱۱) 1597ء میں احمد نگر کی فوج نے برار پر دوبارہ قبضہ جمانے کی کوشش کی لہٰذا عبدالرحیم خان خاناں حملہ آور ہوا۔ شہزادہ مراد اور خان خاناں کی آپس میں نہ بنتی تھی لہٰذا مغلیہ فوج کامیاب نہ ہو سکی اور اکبر نے اُن دونوں کو واپس بلا کر ابوالفضل کو تسخیر دکن پر مامور کیا اور خود بھی دکن جانے کی تیاری کی۔ اکبر کی آمد سے پہلے 1599ء میں دولت آباد فتح ہوا۔ اگست 1600ء میں محاصرے کے بعد احمد نگر پر بھی مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ بیجاپور کے نوجوان حاکم بہادر نظام شاہ کو مغلوں نے گرفتار کر کے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا لیکن احمد نگر کے اُمراء نے ریاست کی آزادی کے لیئے جدوجہد جاری رکھی اور تخت پر کسی اور شخص کو بیٹھا دیا۔

(۱۱۱) احمد نگر کی تسخیر سے پہلے خاندیش کے نئے سلطان میراں بہادر شاہ نے مغلوں کی اطاعت سے منہ موڑا اور اسیر گڑھ میں قلعہ بند ہو بیٹھا۔ اکبر 1599ء میں خود خاندیش پر حملہ آور ہوا اور خاندیش کے صدر مقام برہان پور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مغل فوج نے اسیر گڑھ کا محاصرہ کیا اب ابوالفضل کو محاصرے پر مامور کیا گیا۔ آخر کار جنوری 1600ء میں یہ قلعہ بھی فتح ہوا خاندیش کے حاکم کو گوالیار کے قلعے میں بھجوا دیا گیا اور ریاست کا الحاق مغلیہ سلطنت سے کر لیا گیا۔

دکن کے تمام مفتوحہ علاقوں کو مغلوں نے تین صوبوں میں منقسم کیا یعنی صوبہ احمد نگر، صوبہ برار اور صوبہ خاندیش۔

اکبر کا شمار برِّ صغیر کے عظیم ترین فاتحین میں ہوتا ہے۔ علاؤالدین خلجی کے سوا کسی اور شہنشاہ نے اِس قدر وسیع سلطنت پر حکومت نہیں کی ہے۔

اکبر کی راجپوت پالیسی

۱۵۶۲ء میں اجمیر جاتے وقت اکبر کی ملاقات رانا بہاری مل سے ہوئی جو راجپوتانے کی مشہور ریاست امبر یا جے پور کا حکمران تھا۔ رانا نے لڑائی کیئے بغیر اکبر کی اطاعت قبول کی اور اپنی بیٹی اُجدھیائی بائی کی شادی شہنشاہ اکبر سے کردی مسلمان مؤرخین نے اس شہزادی کو مریم زمانی کا لقب دیا ہے جہانگیر اُسی کے بطن سے تھا۔ اکبر نے جے پور کی آزادی کو برقرار رکھا اور اُس ریاست کو مغلوں کی زیرِ حفاظت ریاست قرار دیا۔ رانا بہاری مل کے دونوں بیٹے بھگوان داس اور مان سنگھ شاہی منصبدار بن کر مغلیہ دربار میں پہنچے اور اعلےٰ عہدوں پر فائز رہے۔ راجپوت حکمرانوں سے بیٹیوں کے ڈولے کر رشتے ناطے کرنے کی ابتدا اس شادی سے ہوئی۔ بعد ازاں اکبر نے متعدد راجپوت خاندانوں میں شادیاں کیں اور اُن کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ شادی کے بعد اکبر اپنی راجپوت ہندو بیویوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرتا تھا۔ نیز وہ کسی راجپوت حکمران کے مذہبی معاملات میں دخل نہ دیتا تھا۔ یہ بات یقینی ہے کہ اکبر کی نئی پالیسی سے راجپوت اُس

کے گرویدہ ہو گئے لیکن تبلیغ اسلام رُک گئی۔ اکبر کی بیویوں کے خطابات اسلامی تھے۔ اُن کی طرزِ زندگی بھی باہمی اختلاط کی بدولت اسلامی طرز کی ہو گئی لیکن اکبر نے اپنے راجپوت رشتہ داروں کے مذہب میں بالکل دخل نہ دیا۔ بعض راجپوت ریاستوں نے لڑائی کے بعد اطاعت قبول کی لیکن اکبر نے اُن سے بھی فیاضانہ سلوک روا رکھا۔

راجپوتانے کے اکثر حکمران رشتے ناطوں کے بعد یا اطاعت قبول کر لینے کے بعد اپنی ریاست کا انتظام کسی وزیر کے سپرد کر دیتے تھے اور خود مغلیہ دربار میں حاضر ہو کر منصبدار بن جانے میں اپنی عزت و توقیر سمجھتے تھے۔ اکبر کے عہد میں راجپوتوں نے سلطنت کے ہر شعبے میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ اکبر راجپوتوں کی جان نثاری اور وفاداری کا مدّاح تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ راجپوتوں کی بدولت مغلیہ سلطنت نہ صرف مستحکم ہو گئی بلکہ اُسے بے مثال وسعت نصیب ہوئی۔ مغلوں سے قبل بعض مسلمان حکمرانوں نے راجپوتانہ فتح کیا لیکن راجپوت ریاستوں کی تسخیر محض عارضی ثابت ہوئی۔ اکبر نے الحاق کی پالیسی ترک کر دی اور راجپوتوں کے خلاف لڑنے کی بجائے رشتے ناطوں سے اُن کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ یہ اکبر کی دانشمندی کی دلیل ہے کہ راجپوتوں کی بدولت مغلوں نے اپنے دشمنوں کا سر کچل ڈالا۔ اس سے قبل مغلوں کی سلطنت محض تنخواہ دار فوجیوں کے سہارے پر قائم تھی اور ہندوستان کے باشندے

انہیں غیر ملکی سمجھتے تھے۔ اکبر کی فیاضانہ پالیسی کی بدولت ہندو رعایا اُس کی گرویدہ بن گئی۔ راجپوت بھی رشتے ناطوں کی بدولت مغلیہ سلطنت کی بقا اور اُس کے استحکام کے خواہاں ہوئے۔ یہ امر اکبر کے تدبر کی درخشاں مثال ہے۔ بعد ازاں اکبر نے مارواڑ کی راجپوت شہزادی سے بھی شادی کی۔ اس کے علاوہ شہزادہ سلیم کی شادی جے پور کے راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے ہوئی۔ 1570ء تک راجپوتانے کی اکثر ریاستوں مثلاً رنتھمبور۔ مارواڑ۔ بیکانیر۔ اور جیسلمیر نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی۔ راجستھان اور وسط ہند کی اکثر ریاستوں نے بھی اطاعت قبول کی۔ 1577ء میں بانسوارہ۔ ڈنگا پور اور پرتاپ گڑھ نے بھی اکبر کی اطاعت اختیار کی۔ لیکن میواڑ کی ریاست نے سر نہ جھکایا۔ میواڑ کے حکمران رانا اودے سنگھ نے اکبر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مالوہ کے حکمران باز بہادر کی مدد بھی کی۔ اکبر نے 1567ء میں چتوڑ کا محاصرہ کر لیا۔ رانا اُودے سنگھ اراولی کی پہاڑیوں کی جانب بھاگ گیا لیکن اُس کے جرنیل جے مل نے مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ طویل محاصرہ کے بعد ایک روز اکبر نے خود جے مل کو قلعے کی دیوار درست کراتے وقت گولی کا نشانہ بنایا۔ راجپوت عورتوں نے رسم جوہر ادا کی اور چتوڑ کے فوجی سپاہی قلعے سے باہر نکل کر کٹ مرے۔ آصف خان کو میواڑ کا گورنر مقرر کر کے اکبر واپس لوٹا۔

1569ء میں رنتھمبور کے راجپوت حکمران سرجن رائے نے مختصر جنگ کے بعد اطاعت قبول کی۔ کالنجر۔ مارواڑ۔ بیکانیر اور جیسلمیر

نے لڑے بغیر اطاعت قبول کی۔ اکبر نے بیکانیر کے راجہ کلیان مل اور جیسلمیر کے راجہ ہررائے کی بیٹیوں سے شادی کرلی۔

چتوڑ کی تسخیر کے بعد بھی میواڑ کے شاہی خاندان یعنی سیسودیا راجپوتوں نے ریاست کی آزادی بحال کرنے کے لئے تگ و دو برقرار رکھی۔ اودھے سنگھ کی وفات کے بعد رانا پرتاپ سنگھ نے مغلوں کو خوب دق کیا۔ 1576ء میں میواڑ کے راجپوتوں کا سر کچلنے کے لئے اکبر نے شہزادہ سلیم اور مان سنگھ کو بھیجا رانا پرتاپ کو ہلدی گھاٹ کے مقام پر شکست فاش ہوئی اور وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ اس کے بعد رانا پرتاپ نے گوریلا جنگ جاری رکھی لیکن چتوڑ مغلوں سے چھین نہ سکا۔ رانا پرتاپ نے 1597ء میں وفات پائی۔

تنقید:۔ اکبر کی راجپوت پالیسی از حد کامیاب ثابت ہوئی۔ عام ہندو رعایا جزیہ کی معافی سے خوش ہوگئی تھی۔ نیز اکبر نے ہندو رعایا کو لیاقت کی بنا پر اعلٰے سرکاری عہدے عطا کرنے کی پالیسی اختیار کی تھی۔ راجپوتوں سے رشتے ناطوں کی بدولت مغلوں کو بہت زیادہ فائدہ رہا۔ راجپوت بہادری میں بے مثال تھے۔ اُن کی بدولت مغلوں کی مشکلات کم ہوگئیں۔ نیز مغلیہ سلطنت کو وسعت نصیب ہوئی اور مغلیہ سلطنت کی جڑ مضبوط ہوگئی۔ بعد ازاں جب اکبر نے دین الٰہی رائج کیا تو ہندو رعایا اور بھی خوش ہوئی اور شہنشاہ کی فیاضی۔ وسعتِ نظر اور مذہبی رواداری کی تعریفیں ہونے لگیں۔ ہندو مؤرخین

یہ لکھتے ہیں کہ اکبر نے ہندو رعایا سے اچھا سلوک کر کے اور راجپوت شہزادیوں سے شادیاں کر کے قومیت اور حُبّ وطن کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسلمان مؤرّخ یہ لکھتے ہیں کہ اکبر کے زمانے میں الحاد زوروں پر تھا اور تبلیغ اسلام رک گئی۔ مغلوں کو سیاسی فائدے بے شک ہوئے لیکن مذہبی لحاظ سے اکبر کی راجپوت پالیسی درست نہ تھی۔ انگریز مؤرّخین نے اکبر کی راجپوت پالیسی کو خوب داد تحسین دی ہے۔ وہ اکبر کو اعلیٰ سیاست دان۔ مدبّر اور دور اندیش گنتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اکبر کے لبرل ازم کی بدولت مغلیہ سلطنت کی بنیاد مستحکم ہوئی۔ تمام مؤرّخین اکبر کو مغلیہ سلطنت کا اصلی بانی شمار کرتے ہیں۔ اکبر کی مذہبی پالیسی کی بدولت ہندو رعایا اُسے روشن خیال حکمران تصوّر کرتی تھی لیکن راجپوتوں سے رشتے ناطوں کی بدولت راجپوتانے کی اکثر ریاستیں مغلوں کو اپنا رشتہ دار سمجھنے لگیں اور اُن کی سلطنت کے استحکام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے تک راجپوت نہ صرف مغلیہ سلطنت کے اعلےٰ عہدوں پر فائز رہے بلکہ انھوں نے مغلوں کے دشمنوں کا سر کچلا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں راجپوتوں اور مغلوں کے مابین تعلّقات کشیدہ ہو گئے۔ اس کا حال مناسب مقام پر بیان کیا جائے گا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ روشن خیالی۔ مذہبی رواداری اور وسعت نظر کے باوجود اکبر ہندوستان میں نیشنلزم کو پائیداری نہ بخش سکا

البتہ اُس نے راجپوتوں سے خوب فائدے اُٹھائے اور مغلیہ سلطنت کی جڑ کو مضبوط کیا۔

اکبر کے مذہبی خیالات کا ارتقاء

اکبر نے دین الٰہی اگرچہ 1582ء میں رائج کیا لیکن وہ شروع سے ہی وسیع مشرب تھا اور تنقید کا دلدادہ تھا۔ وہ بحث مباحثے کا شوقین تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ تنگ نظری اور کورانہ تقلید کی بجائے بحث کی بدولت ہر چیز کو کھنگالا جا سکتا ہے جس سے تلاش حق میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ ہندو بیویوں کی صحبت سے اَن پڑھ بادشاہ کے مذہبی خیالات میں گہری تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ نیز یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اکبر مطلق العنان بادشاہ تھا اور ہنری ہشتم و علاؤالدین خلجی کی مانند مذہبی علماء کی طاقت ملیا میٹ کر کے شاہی اقتدار کی سربلندی کا خواہاں تھا۔ لیکن اکبر رواداری کا پتلا تھا۔ اُس نے مہاراجہ اشوک کی مانند رعایا پر اپنے مذہبی خیالات ٹھونسنے کی بجائے وسعتِ قلب کا ثبوت دیا اور اپنی سلطنت میں تنگ نظری اور مذہبی نفرت کو جڑ سے کاٹنے کی کوشش کی۔ اُس کے مرتے ہی دین الٰہی ملیا میٹ ہو گیا لیکن سیاست میں اُس کے لبرل ازم نے خوشگوار اثر پیدا کیا۔ اُسے مذہبی راہنما قرار دینا غلطی ہے لیکن دنیاوی لحاظ سے اکبر کی مذہبی پالیسی سود مند ثابت ہوئی کیونکہ ہندو رعایا خوش ہو گئی اور اکبر کی ہر دلعزیزی میں بے پناہ اضافہ

ہونے سے مغلیہ سلطنت خوب مستحکم ہوئی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ دینِ الٰہی رائج کرتے وقت اکبر کی اصل نیت کیا تھی۔ آیا اُس نے جہالت اور کم فہمی کی بنا پر مذہب کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا یا درباری خوشامدیوں نے اُسے مجتہد اور مذہبی راہنما بنا دیا۔ یا وہ اتنا چالاک تھا کہ جان بوجھ کر سوچی سمجھی ہوئی سکیم کے مطابق اُس نے نئے مذہب کا ڈھونگ رچا کر مغلیہ سلطنت کے استحکام کی تدبیر سوچی۔ اس بارے میں قطعی فیصلہ کافی مشکل ہے۔ لیکن اکثر مورخین کی رائے یہ ہے کہ دینِ الٰہی رائج کرتے وقت اکبر کے مقاصد مذہبی نہیں تھے بلکہ دنیاوی تھے۔

اکبر کے مذہبی خیالات کے تدریجی ارتقاء کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) اکبر بہ لحاظ پیدائش سنّی مسلمان تھا لیکن وہ ابتدا سے ہی آزاد خیال تھا۔ اور کورانہ تقلید، تنگ نظری اور مذہبی ڈھکوسلوں کا سخت مخالف تھا۔ اکبر کے اتالیقوں نے بھی اُسے وسیع نظر اور روشن خیال بننے میں مدد دی۔ اکبر کے اُستاد اُسے دنیاوی علوم سکھانے میں سراسر ناکام رہے لیکن انہوں نے اکبر کو ہر چیز کو کھنگالنے اور اُس کا تنقیدی جائزہ لینے کا عادی بنا دیا۔ خاص طور پر اکبر کے ایک اُستاد عبداللطیف نے اُس کے دل و دماغ پر گہرا اثر پیدا کیا۔ عبداللطیف کو ایرانی رُعماء سنّی شمار کرتے ہیں اور ہندوستان کے لوگ اُسے شیعہ تصوّر کرتے ہیں۔ دراصل وہ آزاد خیال تھا اور مذہبی تنگ نظری کا سخت مخالف تھا۔ مذہبی رواداری اور آزاد خیالی اکبر نے

اپنے اُستاد عبداللطیف سے سیکھی۔

(۲) عالم شباب میں بھی دنیاوی جاہ و دولت سے بدمست ہونے کی بجائے اکبر عبادت گذار تھا اور وہ اکثر کائنات پر غور و خوض کرنے کے علاوہ مذہبی مسائل کے بارے میں متفکر رہتا تھا۔ بدایونی رقمطراز ہے کہ بیس سال کی عمر میں شہنشاہ روحانیت کا متلاشی بن گیا تھا لیکن صحیح راہ نہ پا سکنے کی بدولت اُس کے دل میں قدرے تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ کبھی وہ صبح سویرے اُٹھ کر ورد وظیفوں میں مگن رہتا تھا۔ کبھی علماء اور مذہبی راہنماؤں کی محفل میں راہ حق تلاش کرتا تھا اور کبھی ولیوں اور مشائخ کی درگاہوں پر حاضری دے کر فیض یاب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ اکبر شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے مزار پر حاضری دیتے وقت کچھ فاصلہ پیدل طے کرتا تھا۔ یہ اُس کی عقیدت مندی کی دلیل ہے۔ اجمیر جاتے ہوئے اُس نے جے پور کی راجپوت شہزادی جُدھیا بائی سے شادی کی جو رانا بہاری مل کی بیٹی تھی۔

(۳) ۱۵۶۲ء کے بعد اکبر نے متعدد ہندو عورتوں یعنی راجپوت شہزادیوں سے شادیاں کیں۔ اُس نے ان بیویوں کو اسلام لانے پر مجبور نہ کیا۔ شریعت اسلام کی رو سے مشرک عورت کے ساتھ شادی ناجائز ہے لیکن اکبر کامل طور پر مذہبی معاملات میں آزاد خیال بن گیا تھا۔ ہندو بیویوں کی صحبت سے اکبر کے مذہبی رجحانات میں عظیم تبدیلی پیدا ہوئی

اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ مختلف مذاہب تلاشِ حق کے مختلف راستے ہیں۔ وہ صلح کل پر زور دینے لگا اور اُس نے برملا کہہ دیا کہ سچا مذہب دیگر مذاہب سے نفرت یا بیر نہیں سکھاتا اکبر نے اس بات میں غلطی کھائی کہ رام اور رحیم بھی یکجا ہو سکتے ہیں۔ جاہ طلب درباری مولویوں نے اُسے سچ بات نہ بتائی جس سے اُس کے مذہبی خیالات عجیب قسم کے بن گئے۔

(۴) شیخ مبارک اور اُس کے دونوں بیٹے جاہ طلب تھے لیکن انہوں نے تصوّف اور مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اکبر کے مذہبی خیالات کو راہ راست سے ہٹ جانے دیا۔ 1574ء میں ابوالفضل اکبر کا ندیم بنا۔ آہستہ آہستہ وہ بادشاہ کے مزاج میں دخیل ہو گیا۔ اُس نے شاہی لائبریری میں تاریخ۔ مذہب فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ جمع کیا۔ فیضی اور ابوالفضل نے یہ کتابیں بادشاہ کو پڑھ کر سنائیں جس سے اُس کی آزاد خیالی کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔

(۵) 1575ء میں اکبر نے فتح پور سیکری میں بحث مباحثے کے لئے ایک عظیم الشان ہال تعمیر کرایا جس کا نام اُس نے عبادت خانہ رکھا۔ اکبر کا خیال تھا کہ بحث مباحثے عبادت کے مترادف ہیں کیونکہ اِن کی بدولت سچائی کا راستہ دستیاب ہوتا ہے۔ اکبر نے اس عبادت خانہ میں متعدد مباحثے کرائے۔ بعض مباحثے مختصر یا مذہبی کانفرنس کی مانند تھے جن میں مسلمان علماء کے علاوہ دیگر مذاہب کے سرکردہ افراد بھی

حصّہ لیتے تھے۔ چنانچہ اکبر کے مباحثوں میں ہندومت۔ بدھ مت
جین مت کے علماء کے علاوہ عیسائی اور آتش پرست بھی گاہے
بگاہے شامل ہوتے رہے۔ اکبر چاہتا تھا کہ تمام مذاہب کے
علماء جذبات سے بلندو بالا ہو کر حقیقت کا اظہار کریں اور
کسی حالت میں صداقت کو نہ چھپائیں تاکہ اکبر اُن کے مباحثوں
کی بدولت تمام مذاہب کے عمدہ اُصول پا سکے۔ ظاہر ہے کہ
اس مقام پر اکبر کے دل و دماغ میں یہ غلط خیال جاگزین
ہو چکا تھا کہ تمام مذاہب یکساں ہیں لیکن اہل غرض حضرات
نے اُن کی اصلی شکل مسخ کر دی۔ تمام مذاہب کے اصلی
یا بنیادی اُصولوں کو یکجا کرنے سے سچا مذہب اُجاگر ہو
سکتا ہے۔ ہندو بیگمات اور نام نہاد مذہبی علماء و درباری
خوشامدیوں نے اکبر کی بے راہ روی کو روکنے کی بجائے اُس
کے نئے خیالات کو تقویت دی۔ صدر الصدور حکیم عبدالنبی اور
مخدوم الملک اُس زمانے کے مقتدر عالم تھے لیکن بادشاہ کو
ٹوکنے کی بجائے چپ سادھ لیتے تھے تاکہ اُن کے سرکاری
عہدے برقرار رہیں۔ اس کے برعکس شیخ مبارک، ابوالفضل
اور فیضی بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور اُس کی
عنایات و بخششوں سے مالا مال ہو جاتے تھے۔

(۶) ابوالفضل نے بار بار یہ لکھا ہے کہ بادشاہ روحانیّت
اور تصوّف کا دلدادہ تھا اور گھنٹوں کائنات پر غور و خوض
کرتا رہتا تھا۔ اُس کا دل مذہبی منافرت سے کڑھتا تھا اور وہ

صلح کل کے اُصولوں پر کاربند تھا۔ اصلی بات یہ ہے کہ شیخ مبارک اور اُس کے بیٹے خوشامدیوں کے سرتاج تھے اور اکبر اُن کے چنگل میں پھنس کر بھٹک چکا تھا۔ ابوالفضل جو کچھ بھی اکبر کے تصوّف کے بارے میں لکھتا ہے وہ سراسر جھوٹ اور خوشامد ہے۔ بادشاہ بے علم تھا۔ خوشامدیوں اور دنیادار علماء نے اُسے کج روی پر اپنی مطلب برآری کے لئے اُبھارا۔

(۲) ۱۵۷۹ء کا محضر اور اجتہاد کا مسئلہ:۔ ستمبر ۱۵۷۹ء میں اکبر نے عبادت خانے میں ایک عظیم الشان محضر قائم کیا۔ اس مذہبی کانفرنس میں مسائل حل ہونے کی بجائے علماء آپس میں اُلجھ پڑے اور ایک دوسرے .... کو پاگل اور بیوقوف کہنے لگے۔ مسلمان علماء کے اس محضر میں زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ اجتہاد سے کیا مراد ہے اور مجتہد کون ہو سکتا ہے۔ جب علماء ایک دوسرے کی بے عزتی کرنے لگے تو اکبر طیش میں آ گیا۔ عین اُس وقت درباری خوشامدیوں اور سرکاری مولویوں نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے یہ فتویٰ دیا کہ بادشاہ اُس دور کا امام عادل ہے۔ غلطیوں سے مبّرا ہے۔ اصلی مجتہد ہے۔ اُس کی عقل کامل ہے۔ اسی فتویٰ میں یہ بھی لکھ دیا گیا کہ آئندہ اگر کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ پیدا ہو (جہاں قرآن مجید اور حدیث خاموش ہوں) تو اجماع اُمّت کی بجائے مصلحت وقت اور قوم کی بہبودی کے پیش نظر امام عادل یعنی شہنشاہ اکبر شاہی حکم جاری کر سکتا ہے جو غلطیوں سے مبّرا ہونے کی بنا پر

مذہبی طور پر مسلّم ہو گا اور آیات قرآنی کی رُو سے اُس کی اطاعت رعایا کے لئے لازمی ہوگی۔ گویا علماء نے اَن پڑھ بادشاہ کو مجتہد بنا دیا۔ اس کے بعد نیا مذہب ایجاد کر لینا اکبر کے لئے اگلا قدم تھا۔

ستمبر 1579ء کے فتویٰ کو شیخ مبارک نے لکھا تھا اور اُس پر سرکاری مولوی صدر الصدور حکیم عبد النبی اور دیگر سرکردہ علماء کے دستخط بھی تھے۔ اگر کوئی عالم جرأت سے کام لیتا تو یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ بے علم بادشاہ کو مجتہد اور امام عادل بنا دیا جائے۔ اس محضر کی بدولت اکبر کی آزاد خیالی اور لادینی کو خوب تقویت حاصل ہوئی۔

اکبر نے فتویٰ کی شرائط کو بالائے طاق رکھ کر تین سال کے اندر اندر اپنے "مجتہد" ہونے کا ثبوت دیا یعنی دین الٰہی کے نام سے نیا مذہب رائج کیا۔ اس سرکاری مذہب کی رو سے اکبر یقینی طور پر اسلام کی حدود کو پھاند گیا۔ لیکن ہندو مؤرخین (خاص طور پر ڈاکٹر ایشوری پرشاد) یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں کہ دین الٰہی کوئی نیا مذہب نہ تھا محض نئے عقاید کا مجموعہ تھا۔

(A creed but not a religion)

اکبر کا دینِ الٰہی اور اُس کی سیاسی اہمیت

1582ء میں اکبر نے دینِ الٰہی رائج کیا۔ اِسے توحیدِ الٰہی بھی

کہتے ہیں۔ نئے مذہب کا بنیادی اُصول کامل رواداری یا صلح کل تھا۔ اس مذہب کے اُصول بادشاہ نے اپنی سمجھ کے مطابق تمام مذاہب کے عقائد سے لئے تھے یعنی اُس نے مذہبی تنگ نظری اور منافرت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس مذہب میں اسلام کے علاوہ۔ ہندومت۔ زرتشت مذہب عیسائیت اور جین مت کے اُصولوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی لیکن اکبر نے دین الٰہی کی بدولت توحید پرستی اور انسانی اخوت یا بھائی چارے پر زور دیا۔ دین الٰہی کو ماننے والے سورج کو مظہر خدا سمجھتے تھے۔ بعض مؤرخین نے غلط طور پر یہ لکھا ہے کہ زرتشت کی تعلیمات اور پارسیوں کے اثر کی بنا پر اکبر نے اپنے چیلوں کو سورج کی پرستش کا سبق دیا اکبر کے رائج کردہ دین میں توحید پرستی بنیادی بات تھی لہٰذا آتش پرستوں کی چند رسومات ضرور دین الٰہی میں داخل کی گئیں لیکن سورج کی پرستش اور توحیدِ الٰہی کا تطابق اس مذہب میں نہ ہو سکتا تھا۔ قدیم منگولوں کی مانند اکبر بھی سورج کو خدائی طاقت کا سرچشمہ سمجھتا تھا۔ نیز وہ علم نجوم پر اعتقاد رکھتا تھا اور اُس کا خیال تھا کہ عناصر اربعہ (ہوا۔ پانی۔ مٹی اور روشنی یا آگ) میں سے روشنی اہم ترین ہے۔ روحانی روشنی اور جسمانی گرمی (یا آگ اور سورج کی روشنی) کا باہم گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا سورج کو مظہر خدا سمجھ کر بعض رسومات ادا کرنے سے بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ سورج کا تقدس اُس کی ضعیف الاعتقادی

کی دلیل تھی۔

دینِ الٰہی کی اہم تعلیمات یہ تھیں کہ خدا ایک ہے اور وہ تمام مخلوق کی یکساں پرورش کرتا ہے۔ اکبر اس دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے (اکبرُ خلیفۃ اللّٰہ)۔ اخلاق کا معیار وہ ہونا چاہیئے جسے تمام مذاہب قبول کریں (یعنی اُس نے رام اور رحیم کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور برّصغیر سے مذہبی نفرت ختم کرکے قومی مذہب رائج کرنے کی ناکام سعی کی)۔ دینِ الٰہی کی رو سے یہ لازم تھا کہ اس کے حامی تمام برادری (یعنی حامیانِ دینِ الٰہی) کی بہبودی کے لئے کوشاں ہوں۔ دینِ الٰہی میں شامل ہونے والا ہر فرد اس بات کا عہد کرتا تھا کہ وہ اپنا تن۔ من۔ دھن سب کچھ اکبر پر نثار کرنے کے لئے تیار رہے۔ بعض مؤرخین یہ لکھتے ہیں کہ دینِ الٰہی کے پیرو چار اقسام یا درجوں میں بٹے ہوئے ہوتے تھے۔ پہلا طبقہ اُن لوگوں کا تھا جو بادشاہ کے لئے مال فدا کرنے کے لیے آمادہ ہوتے تھے۔ دوسرا درجہ اُن لوگوں کا تھا جو مال کے علاوہ جان نثار کرنے پر آمادہ تھے۔ تیسرا درجہ اُن کا تھا جو اپنی آبرو بھی بادشاہ کے لئے قربان کرنے کو تیار تھے۔ چوتھے درجے میں مریدانِ خاص تھے۔ یہ اعلیٰ ترین درجہ تھا۔ اس طبقے کے لوگ اپنا مذہب بھی قربان کرنے پر آماہ تھے یعنی یہ لوگ بادشاہ کی محبّت کو منتہائے مقصود سمجھتے تھے۔

ظاہر ہے کہ دینِ الٰہی سرکاری مذہب تھا بادشاہ کو خوش

کرنے کے لئے اور دنیاوی فائدے اُٹھانے کے لئے درباری خوشامدی اس مذہب کو اختیار کر لیتے تھے۔ البتہ اکبر نے کسی شخص پر جبر نہ کیا اور دین الٰہی کو فروغ دینے کے لئے بالکل کوشاں نہ ہوا۔ ابوالفضل بادشاہ کا مرید خاص تھا اور دین الٰہی قبول کرنے والے اشخاص کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ دین الٰہی کے پیرو خاص طریقے سے ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔ ایک شخص پکارتا تھا "اللہ اکبر" دوسرا یوں جواب دیتا "جلّ جلالہٗ"

بعد ازاں اکبر نے دین الٰہی میں کئی نئے احکام شامل کئے اور اس مذہب کو رسومات کا عجیب و غریب پلندہ بنا دیا۔ مثلاً اُس کے چند ایک احکامات مندرجہ ذیل تھے :۔

(۱) گوشت خوری ترک کر دی جائے اور نیچ ذات کے لوگوں مثلاً قصابوں۔ چڑیماروں اور ماہی گیروں سے اختلاط نہ رکھا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیالات اُس کے دماغ میں ہندو بیویوں نے ڈالے۔

(۲) عمر رسیدہ یا بانجھ عورتوں یا چھوٹی عمر کی لڑکیوں سے شادی نہ کی جائے۔ حمل کے ایّام میں بیوی سے علیحدگی اختیار کی جائے۔

(۳) دین الٰہی کے حامیوں کے لئے لازم ہے کہ اپنی پیدائش کے دن دوسروں کی ضیافت کرے اور اپنی پیدائش کے مہینے میں گوشت خوری قطعی طور پر ترک کر دے۔ اپنی زندگی

میں ہی خیرات کرکے آخرت کے لئے زادِ راہ مہیّا ہے۔
(۴) ڈاڑھی منڈوانے پر اکبر نے زور دیا۔ ہندووانہ رسوم کے مطابق بادشاہ صدقات دیتا تھا۔ بادشاہ کو اناج میں بھی تولا جاتا تھا۔ نوروز کے موقع پر میلے اور ضیافتیں ہوتی تھیں۔
(۵) اکبر نے اس بات پر زور دیا کہ مردے کو دفن کرتے وقت اُس کے پاؤں مغرب کی جانب ہوں اور سر مشرق کی طرف ہو۔ رات کو سوتے وقت بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔
مریدی اختیار کرنے کا طریقہ:۔ ابوالفضل رقمطراز ہے کہ دین الٰہی کا مقصد یہ تھا کہ انسان اپنی اصلیّت اور حقیقت کو نہ بھولے۔ جب کوئی شخص تلاش حق کا متوالا بن کر دین الٰہی قبول کرتا ہے تو اُس کا روحانی علم روز افزوں ترقی کرتا ہے آخر کار کسی اتوار کے روز جب سورج پورے شباب پر ہوتا ہے بادشاہ سلامت (یعنی اکبر) اُس شخص کو شرف باریابی عطا کرتے ہیں اور اُسے اپنی مریدی میں قبول کر لیتے ہیں۔ دین الٰہی میں شامل ہونے والا شخص اپنی پگڑی اُتار کر اپنے ہاتھ میں تھام لیتا ہے اور اپنا سر بادشاہ کے قدموں پر رکھ دیتا ہے گویا وہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اُس نے خود غرضی۔ چالاکی اور دیگر برائیوں کو ترک کرکے اس مذہب (دین الٰہی) کی پیروی اختیار کی ہے اور ابدی سکون اور خوش بختی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے۔ خدا کی

برگزیدہ ہستی یعنی بادشاہ اُس شخص کی پگڑی اُٹھا کر اُسی کے سر پر رکھ دیتا ہے گویا بادشاہ نے اُس شخص کو اپنی مریدی میں قبول کیا۔ پھر اُسے خاص نشان عطا ہوتا ہے۔

ان رسومات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہنری ہشتم کی مانند اکبر نے مذہب اور سیاست کو ملا دیا۔ یعنی دین الٰہی کے حامیوں میں اُس کا درجہ روحانی پیشوا کی مانند تھا۔

دین الٰہی کی ناپائیداری :- اکبر نہایت ہوشمند حکمران تھا اُس نے اپنے نئے مذہب کی تبلیغ نہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب کو یکجا کرنا آسان امر نہیں ہے اُس نے مذہبی رواداری سے کام لیا اور اُس کا دین الٰہی محض درباریوں تک محدود رہا۔ دین الٰہی کے حامیوں کی تعداد چند ہزار سے تجاوز نہ کر سکی۔ اِن لوگوں میں بھی اکثر جاہ طلب تھے۔ اکبر کے مرتے ہی دین الٰہی مٹ گیا اور شہنشاہ جہانگیر نے اکبری الحاد کا خاتمہ کر ڈالا۔ نیز شیخ احمد سرہندی مجددؒ الف ثانی نے صحیح اسلامی تعلیمات عوام کے سامنے پیش کر کے ظلمت کے پردے دور کر دئیے اور یہ واضح کر دیا کہ شرک اور توحید یکجا نہیں ہو سکتی۔

دین الٰہی کی نوعیت :- دین الٰہی کے بارے میں مؤرخین کے مابین سخت اختلاف ہے۔ پرتگیزی عیسائی مشنری اور ہم عصر مؤرخ بدایونی یہ لکھتے ہیں کہ دین الٰہی رائج کر کے اکبر دائرۂ اسلام

سے خارج ہو گیا تھا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اکبر نے بعض مسلمانوں کو لاہور میں خوب دق کیا۔ جدید تحقیق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بدایونی اور پرتگیزی مبلّغین قابل اعتماد نہیں ہیں۔ ابوالفضل بادشاہ کی بے حد تعریف کرتا ہے اور اُسے صوفی منش انسان قرار دیتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ درباری خوشامدی ہے اور مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ نیز اُس کا اسلوب بیان بھی سادگی سے عاری ہونے کی بنا پر واضح نہیں ہے۔ یعنی ابوالفضل چرب زبان ہے اور اُس کی تحریر کے اصلی معانی پا لینا آسان نہیں۔ شہنشاہ جہانگیر یہ لکھتا ہے کہ مرتے وقت اکبر مسلمان تھا۔ بیٹے کی رائے باپ کے بارے میں مستند نہیں گنی جا سکتی۔ سمتھ اور بلوچ مین (BLOCHMAN) کی رائے یہ ہے کہ اکبر قطعی طور پر (دین الٰہی رائج کرنے کے بعد) دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا تھا۔ بیورج کی رائے یہ ہے کہ اکبر نے اپنا آبائی مذہب ترک نہ کیا وہ محض آزاد خیال تھا اور کورانہ تقلید نہ کرتا تھا۔

شبلی نعمانی کی رائے یہ ہے کہ اکبر نہ مرتد تھا اور نہ ہی اسلام سے نفرت کرتا تھا۔ کاؤنٹ نوئیر کا خیال یہ ہے کہ دین الٰہی نیا مذہب نہ تھا بلکہ نیا مسلک (CREED) تھا اور اُس میں متصوفانہ خیالات اور ہندومت و پارسیوں کے مذہب کے اصول یکجا تھے۔

"His creed was a sort of Parsi-Sufi-Hinduism."

ڈاکٹر سمتھ کی رائے کافی دلچسپ ہے۔ اس مشہور مؤرّخ نے لکھا ہے کہ "اکبر کا دین الٰہی بادشاہ کی عقلمندی کی دلیل نہیں بلکہ اُس کی حماقت کی یادگار ہے۔ دین الٰہی مضحکہ خیز تھا اور شاہی غرور و تمکنت اور بے لگام مطلق العنانی کا نتیجہ تھا۔"

"The whole scheme was the outcome of radiculous vanity, a monstrous growth of unrestricted autocracy......... The Divine Faith was a monument of Akbar's folly, and not of his wisdom." (V. A. Smith).

ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے یہ ہے کہ "دین الٰہی کوئی نیا مذہب نہیں تھا اور نہ ہی اس کے خاص عقائد تھے۔ بلکہ یہ نیا مسلک تھا اور تمام مذاہب کی خوبیوں کا مجموعہ تھا اس میں فلسفہ۔ تصوّف اور نیچری پرستش کی جھلک تھی جو بادشاہ کی اپنی ذات تک محدود تھی۔ دین الٰہی میں توحید پرستی اور قومیت موجود تھی۔ لیکن نئے عقائد مفقود تھے۔"

An eclectic pantheism containing the good points of all religions—a combination of mysticism, philosophy and Nature—worship. Its basis was national, it upheld no dogmas, no gods or prophets and the Emperor was its chief exponent"

ڈاکٹر سری واستوا کی رائے یہ ہے کہ "دین الٰہی کے مقاصد سیاسی تھے۔ اکبر چاہتا تھا کہ ہندومت اور اسلام کا ملاپ ہو جانے کے بعد اس کی سلطنت کو سیاسی اور ثقافتی وحدت نصیب ہو جائے۔ نیا مسلک اُس کی رواداری کا نتیجہ تھا اور اُس کا مطمح نظر یہ تھا کہ ملک کے باشندوں کو جذبۂ قومیت عطا کرے۔"

"Akbar's highest political object was the fusion of Hinduism and Islam and the establishment of cultural as well as political unity in the empire. The innovation was the outcome of his policy of universal toleration and a brilliant testimony to his national idealism."

ایس۔ آر۔ شرما کی رائے یہ ہے کہ "دین الٰہی ابتدائی تجربے کے سوا کچھ نہ تھا۔ دین الٰہی کی بدولت بادشاہ نے ہندوستان

کے لوگوں کو قومیت کا جذبہ عطا کر کے متحد کرنے کی کوشش کی۔"

پرنسپل سری رام شرما کی رائے یہ ہے کہ "دین الٰہی محض شاہی حکم تھا۔ اِسے مذہب کا درجہ دینا مبالغہ آمیزی ہے۔ دین الٰہی کی نہ کوئی کتاب تھی۔ نہ پادری۔ نہ رسومات اور نہ مذہبی اعتقادات۔"

لین پول رقمطراز ہے کہ "اکبر نت نئے تجربات کا حامی تھا اکبر کا فلسفہ، اُس کا تصوّف اور مناظر قدرت کی پرستش اُس کے ساتھ ہی فنا ہو گئے لیکن اُس نے جنگجوؤں کی سرزمین میں انسان شناسی۔ وسعت نظر اور انسانی ہمدردی (یا رواداری) کے پائیدار نشانات پیچھے چھوڑے ہیں۔"

علامہ یوسف علی کا خیال ہے کہ "دین الٰہی نیا مذہب نہیں محض ایک فرقہ ہے۔ مذہب خواہ کچھ بھی تھا۔ اکبر نے باقاعدہ طور پر اسلام کسی وقت بھی ترک نہیں کیا (لہٰذا اُسے مسلمان ہی شمار کرنا چاہیئے)۔"

" His breach with the church did not amount to a formal repudiation of Islam."

اکثر مؤرّخین یہ سمجھتے ہیں کہ اکبر نے محض چند بدعتیں اسلام میں داخل کر کے یہ کوشش کی کہ مذہب کو سیاست کے تابع کر کے اپنے قابو میں رکھا جائے۔ مؤرّخین کا ایک گروہ اس خیال کا حامی ہے کہ دین الٰہی کے اصلی مقاصد دنیاوی اور

سیاسی تھے۔

"Akbar's real motives were political and mundane rather than religious."

ڈاکٹر تری پاٹھی اکبر کے دین الٰہی کی سیاسی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کا خیال ہے کہ برِ صغیر کے چند ہزار افراد نے اس مذہب کو قبول کیا۔ دین الٰہی کے حامی اکبر سے ذاتی تعلق رکھتے تھے اور بادشاہ کے لئے جان قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ سماجی۔ سیاسی اور مذہبی اختلاف کے باوجود اکبر نے چند لوگوں کے ایک گروہ کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کرنے کی کوشش کی۔

ہماری رائے یہ ہے کہ دین الٰہی پریشان خیالات اور کم علمی کا نتیجہ تھا جسے درباری خوشامدیوں نے اُبھارا اور ابوالفضل جیسے چرب زبان مؤرخ نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ ہندو بیویوں کے زیرِ اثر اکبر نے ہندو مت اور اسلام کو یکجا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ البتہ ہندو مؤرخ اُسے انڈین نیشنلزم کا رنگ دے کر اکبر کی خوب تعریف کرتے ہیں۔ اکبر کے مرتے ہی دین الٰہی اور نیشنلزم کا ڈھونگ ختم ہو گیا۔

دین الٰہی کے دور رس فوائد یہ تھے کہ اکبر کی ہندو رعایا جو اُس کی فراخ دلی اور حسن سلوک سے پہلے ہی اُس کی گرویدہ تھی اب اُس کی مذہبی آزاد خیالی کی بدولت مزید خوش ہو گئی

اس سے مغلیہ سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ دین الٰہی اکبر کی سوچی سمجھی ہوئی سکیم نہ تھی۔ محض ایک عارضی تجربہ تھا جو سراسر ناکام ثابت ہوا۔ اکبر نے روحانی پیشوا بننے کی کوشش کی لیکن عوام نے دین الٰہی کو در خور اعتنا نہ سمجھا۔ نیز اکبر نے دانشمندی سے کام لے کر اپنا مذہب رعایا پر نہ ٹھونسا۔

لگان اراضی سے متعلق اکبر کی اصلاحات

اکبر نے 1582ء میں نیا نظام مالیہ رائج کیا یعنی لگان اراضی میں اہم اصلاحات نافذ کیں۔ اکبر کے رائج کردہ نظام کو ضبطی نظام یا رعیت واڑی سسٹم کہتے ہیں۔ اورنگ زیب کی وفات تک اکبر کا رائج کردہ لگان اراضی برِصغیر میں رائج رہا لہٰذا اسے مغلیہ نظام مالیہ بھی کہتے ہیں۔ لگان اراضی میں اصلاحات کا اصل سہرا ٹوڈرمل کے سر پر ہے جو اکبر کے زمانے میں دیوان اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھا۔ ٹوڈرمل نے شیر شاہ سوری کے نظام مالیہ کی خامیاں دور کر کے اُسے اپنے آقا (یعنی شہنشاہ اکبر) کے سامنے پیش کیا اکبر نے اپنے طویل عہد حکومت میں نظام مالیہ کو ہر لحاظ سے کامل اور بہتر بنایا۔

شیر شاہ کے زمانے میں حکومت کل زرعی پیداوار کا ایک تہائی حصہ بطور مالیہ وصول کرتی تھی۔ نیز ہر سال پیداوار اور قیمتوں کا تخمینہ لگا کر مالیہ کی رقم متعین ہوتی تھی۔ اس نظام

میں دو خرابیاں تھیں۔ ایک تو حکومت کی آمدنی میں ہر سال تغیر و تبدل رونما ہوتا تھا دوسرے مالیہ کی وصولی میں تاخیر ہو جاتی تھی کیونکہ مالیہ کی رقم کا تعین گرداوری کئے بغیر ممکن نہ تھا۔

ٹوڈرمل نے اکبر سے منظوری لے کر مغلیہ نظام مالیہ میں اہم تبدیلیاں کیں۔ یہ تبدیلیاں حسب ذیل تھیں:۔

(۱) اکبری نظام کے تحت اصل زیر کاشت رقبے پر لگان عاید کیا جاتا تھا۔

(۲) لگان جنس یا نقدی کی صورت میں ادا ہو سکتا تھا۔

(۳) قابل کاشت زمین کی از سر نو پیمائش کی گئی۔ رسی کی جریب کی بجائے بانس کی جریب رائج کی گئی تا کہ بارش کے دنوں میں رسی نہ بڑھے یعنی ہر موسم میں پیمائش درست رہے۔ بانس کی جریب کے دونوں جانب لوہے کے کنڈے ہوتے تھے۔ پیمائش کے لئے 33 انچ کا گز رائج ہوا۔ اُسے الٰہی گز کہتے تھے۔ ساٹھ مربع گز کا ایک بیگھا شمار ہونے لگا۔

(۴) شیر شاہ کے زمانے سے زرعی زمین کا مکمل ریکارڈ تیار کر لیا گیا تھا۔ ہر علاقے میں زمین کے کھاتے۔ کھتونی اور خسرہ نمبر تیار کر لئے گئے۔ اکبر کے عہد میں زمین کو چار قسموں اور تین اجزاء میں تقسیم کر کے شاہی ریکارڈ از سر نو تیار کیا گیا۔ زمین کی اعلیٰ ترین قسم پولاج کہلاتی تھی۔ یہ وہ زمین تھی جو بے حد زرخیز تھی اور کبھی بغیر کاشت کے نہ رہتی تھی۔ دوسری قسم کی زمین پراوتی کہلاتی تھی۔ اس زمین کو کبھی کبھی سستانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔

زمین کی ان دونوں قسموں کو تین اجزاء میں تقسیم کر دیا جاتا تھا یعنی بہترین حصہ (ب) درمیانی درجہ کی زمین اور (ج) معمولی درجے کی زمین۔

لگان متعیّن کرنے سے قبل ان دونوں اقسام کی زمین کے ہر حصّے کی پیداوار کا تخمینہ لگا کر اوسط پیدائش نکال لی جاتی تھی اور قیمتوں کے لحاظ سے اوسط نکال کر اوسط پیداوار کا تہائی حصّہ بطور لگان وصول کیا جاتا تھا۔ لگان کی اصل رقم متعیّن کرنے کے لئے گذشتہ دس سال کی اوسط پیداوار اور قیمتوں کی اوسط نکالی جاتی تھی اور لگان کی شرح اُس کے مطابق نکالی جاتی تھی۔

(۵) شاہی ریکارڈ میں گذشتہ دس سال یعنی 1570ء تا 1580ء کی قیمتوں کے گوشوارے تیار کرلئے گئے۔ اس کے علاوہ قابل کاشت زمین کی ہر قسم کی پیداوار کے گوشوارے بھی بنائے گئے۔ دونوں کی اوسط بھی نکال لی گئی۔ لگان کی رقم متعیّن کرنے کا فارمولا یہ تھا کہ کسی ٹکڑے کی اوسط پیداوار کو اوسط قیمت سے ضرب دے کر تین سے تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

اس نظام کا فائدہ یہ تھا کہ زمین کا معائنہ کئے بغیر محکمۂ مالگذاری ضرب تقسیم کرکے لگان مقرر کر دیتا تھا۔ سرکاری ملازم اسے آسان طریقہ شمار کرتے تھے لیکن بیچارہ ان پڑھ کاشتکار ضرب۔ تقسیم اور اوسط کے چکر میں پھنس کر کچھ نہ سمجھتا تھا اور محکمۂ مال کے ہندو ملازمین خوب ہاتھ رنگتے تھے ٹوڈرمل کے زمانے سے اس محکمے میں ہندوؤں کی اجارہ داری

قائم ہو گئی - اورنگ زیب کے عہد تک اس محکمے میں ہندو چھائے ہوئے ہیں۔

(۶) زمین کی تیسری قسم کو کم زرخیز یا چھاچھار اور آخری قسم کو بنجر تصوّر کیا جاتا تھا۔ چھاچھار زمین کو چار سال تک کاشت نہیں کیا جاتا تھا۔ بنجر زمین وہ تھی جہاں گذشتہ پانچ سال سے کاشت نہ کی گئی ہو۔ ان دونوں اقسام کی زمینوں پر مالیہ کی شرح ایک تہائی سے کم تھی۔ یعنی زرخیزی کے مطابق بتدریج مالیہ بڑھ جاتا تھا۔ زمین کا لگان چونکہ زرخیزی کے مطابق تھا اس لئے ان اقسام پر لگان کا بوجھ زیادہ نہیں پڑتا تھا۔ البتہ زمین کی زرخیزی یا پیدائش میں معتدبہ اضافہ ہونے پر لگان بھی اُسی شرح سے بڑھ جاتا تھا۔ نئے نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر سال لگان کی شرح میں کمی یا بیشی نہ ہوتی تھی۔ حکومت کا بجٹ متوازن رہتا تھا اور کاشتکار وقت پر فصل کاٹ لیتا تھا پیدائش کم ہونے کی صورت میں لگان میں کمی یا معافی ہو سکتی تھی۔

(۷) اکبر کا نظام نہ تو دوامی بندوبست تھا اور نہ دس سال کے لئے تھا۔ اکبری لگان اراضی کے بارے میں مورلینڈ سمیت اکثر مورّخین نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اکبر کا نظام بنیادی سالوں (1570ء تا 1580ء) کی اوسطوں پر منحصر تھا لیکن قابل کاشت زمین کی موجودہ پیمائش اور زرخیزی یا پیداوار کا تخمینہ بھی لگایا جاتا تھا۔ لگان کی شرح پیداوار اور قیمتوں کی اوسط کا ایک تہائی ہوتی تھی۔ یہ طریقہ کافی پیچیدہ تھا۔

(۸) اکبر کے عہد میں ملک کو بارہ صوبوں میں منقسم کیا گیا اور ہر صوبے میں ایک دیوان مقرر ہوا جو مرکزی دیوان اعلیٰ کی زیر نگرانی کام کرتا تھا اور مالیہ کی وصولی کا ذمہ دار تھا۔ شیر شاہ کے زمانے میں پرگنے اور سرکار مالیہ کی وصولی کے حلقے تھے۔ اکبر کے عہد میں پرگنہ اور سرکار کا امتیاز ختم کر دیا گیا۔ اس سے انتظامی سہولت میسّر ہو گئی۔

اکبری لگان سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل مثال سود مند ثابت ہو گی:۔
مثلاً پولاج یا پراوتی زمین کے کسی شخص کے پاس تین بیگھے ہیں جن کی پیداائش کا تخمینہ حسب ذیل ہے:۔

اعلےٰ ترین ٹکڑا	70 من گندم
درمیانی درجے کا ٹکڑا	50 من
سب سے کم درجے کا ٹکڑا	30 من
کل پیداائش	150 من گندم

اوسط پیداوار = 150 ÷ 3 = 50 من

لگان = 50 من × $\frac{1}{3}$ = $16\frac{2}{3}$ من گندم

بنیادی دس سالوں میں اس علاقے میں گندم کی قیمت یوں تھی:۔

1571ء	5 روپے فی من
1572ء	4 " "
1573ء	5 " "
1574ء	5 " "

1575ء	6 روپے فی من
1576ء	7 " "
1577ء	4 " "
1578ء	5 " "
1579ء	4 " "
1580ء	5 " "
میزان	50 روپے

اوسط قیمت 50 ÷ 10 = 5 روپے فی من

$$\text{شرح لگان} = \frac{\text{اوسط پیداوار} \times \text{اوسط قیمت}}{3}$$

$$= \frac{5 \times 50}{3} = \frac{250}{3} = 83\frac{1}{3} \text{ روپے}$$

یا $16\frac{2}{3}$ من گندم

---

(۹) اکبر کے لگان اراضی میں ضرب۔ تقسیم اور اوسط کے علاوہ ہر علاقے میں گذشتہ سال کی قیمتوں کے گوشوارے ہر زرعی پیداوار کے متعلق تیار کرلئے جاتے تھے۔ اوسط قیمت کو مروّجہ قیمت تصوّر کیا جاتا تھا اور لگان متعیّن کرنے کے لئے ہر سال قیمتوں یا پیداوار کا تخمینہ لگانے کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ لیکن اکبر کے عہد میں حکومت نئے گوشوارے تیار کرتی رہتی تھی اور گاہے بگاہے لگان کی نئی شرح مقرّر کر دیتی تھی یا بنیادی سال بدل دیتی تھی۔ یعنی لگان لچکدار تھا اور دوامی بندوبست

یادہ سالہ بندوبست نہ تھا۔
تنقید:۔ اکبر کا لگان اساسی پیچیدہ ہونے کے باوجود بے حد کامیاب ثابت ہوا۔ لیکن شاہجہان کے زمانے سے جاگیریں عطا ہونے لگیں نیز خالصہ یا سرکاری زمینوں سے مالیہ کی وصولی ٹھیکیداروں کے سپرد ہوئی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ٹھیکیداروں کا سلسلہ قائم رہا۔ اُس کی وفات کے بعد ضبطی سسٹم کالعدم ہو گیا اور جاگیرداری سسٹم یا ٹھیکیداری نظام عام ہو گیا۔ یعنی اکبر کا نظام مالیہ قائم نہ رہا اور حکومت کے مرکزی خزانے کی آمدنی غیر معیّن ہو کر ٹھیکیداروں کے رحم و کرم کا شکار ہو گئی۔ نیز جاگیردار اور صوبائی گورنر خود سر ہو گئے اور انہوں نے مالیہ کی رقوم سرکاری خزانہ میں داخل کرنے کی بجائے اُن کو اپنے مصرف میں لانے کا طریقہ اختیار کیا۔ مرکزی فوجی طاقت چونکہ قائم نہ رہی تھی اس لئے مالیہ وصول نہ ہو سکا اور مرکزی حکومت دیوالیہ بن کر بے حیثیت ہو گئی۔

اکبر کی فوجی اصلاحات یا منصب داری نظام

اکبر کی انتظامی تدابیر میں سے اُس کا منصبداری نظام اہم ترین ہے۔ اس سے مغلیہ دور میں ملک کے فوجی اور انتظامی شعبوں میں اعلیٰ ترین مرکزی افسر یا منصبدار مقرر ہوتے تھے۔ یہ نظام اکبر کے اپنے دماغ کی اختراع تھی

اور اسے اکبر کی فوجی و انتظامی اصلاحات بھی گنا جاتا ہے۔ دراصل یہ نظام فوجی شعبوں اور انتظامی یا سول محکموں دونوں پر یکساں لاگو تھا۔ یعنی منصبدار کو ضرورت کے مطابق فوج یا سول محکمے میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ بعض مؤرخین نے منصبداری نظام کو مغلیہ سول سروس گنا ہے۔ منصبداری نظام سے اکبر کی انتظامی قابلیت چھلکتی ہے۔

اکبر نے امراء اور فوجی افسروں کو جاگیریں عطا کرنے کا طریقہ ختم کر ڈالا۔ اس کے برعکس ہر بڑے افسر کو خدمت کا نقد معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ ہر منصبدار امراء کی صف میں شامل نہ تھا لیکن اس کا شمار شاہی مرکزی افسروں میں ہوتا تھا۔ منصبداروں کی تعداد ملکی ضروریات کے مطابق ہوتی تھی۔ منصبداروں کے تقرر کا انحصار شاہی مرضی پر تھا۔ منصبدار کی ترقی کے لئے باقاعدہ قواعد و ضوابط نہ تھے شاہی مرضی کے مطابق وہ حیران کن ترقی بھی پا سکتا تھا۔ منصبداروں کے تقرر کے لئے کوئی مقابلے کا امتحان نہ ہوتا تھا۔

منصبدار کا بیٹا اگر لیاقت یا اہلیت سے محروم ہوتا تو وہ کسی منصب پر فائز نہ ہو سکتا تھا۔ منصبداری نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی رو سے مغلیہ دور میں مقامی فوج میسّر ہوتی جو ہر وقت باغیوں کا سر کچلنے کے لئے موجود ہوتی تھی۔ اس سے قبل ضرورت کے وقت مرکز سے فوج بھیجی جاتی تھی۔ ذرائع آمد و رفت عمدہ نہ ہونے کے باعث مقامی فوج بہت سود مند ثابت ہوئی سول محکموں کے لئے بھی منصبدار میسّر ہو گئے۔ منصبدار کو

شاہی مرکزی افسر یا گزیٹیڈ آفیسر سمجھنا چاہیئے۔ منصب سے مراد ہے مرتبہ یا (Rank)۔ ہر منصبدار کے تقرر کے وقت اُس کا ذاتی مرتبہ ہندسوں سے ظاہر کر دیا جاتا تھا۔ اُسے ذاتی منصب یا مرتبۂ ذات (Zat Rank) کہتے تھے۔ مثلاً یک ہزاری ذات۔ دو ہزاری ذات۔ پنج ہزاری ذات۔ یک صد ذات وغیرہ وغیرہ۔

ذاتی مرتبہ کی رو سے منصبدار کی تنخواہ اور الاؤنس ادا ہوتے تھے۔ نیز سرکاری تقریبات پر ذاتی مرتبہ کے مطابق وہ جگہ پاتا تھا۔ دس ہزاری مرتبہ ولیعہد۔ ملکہ یا وزیر اعظم کو عطا ہوتا تھا۔

بعض منصبداروں کو سواروں کا مرتبہ (Sawar Rank) بھی عطا ہوتا تھا۔ یہ بھی ہندسوں سے ظاہر کیا جاتا تھا مثلاً دو ہزار ذات وسوار۔ دو ہزار ذات ویک ہزار سوار۔ سوار مرتبہ سے مراد یہ تھی کہ منصبدار کے لئے لازم ہے کہ جس علاقے میں اُسے ڈیوٹی پر مامور کیا جائے وہاں وہ اپنے سوار مرتبہ کی تعداد کے مطابق شاہی خرچ پر مقامی فوج رکھے۔ ان فوجیوں کے تمام اخراجات مقامی خزانے سے ادا ہوتے تھے۔ منشی اور متصدی باقاعدہ حساب رکھتے تھے کہ مقامی آمدنی اسقدر تھی۔ اُس میں سے اتنے گھوڑے خریدے۔ اُن کے لئے چارہ اور خادموں پر اسقدر خرچ آیا سپاہیوں کو تنخواہ دینے کے بعد اور منصبدار کو اُس کے ذاتی مرتبہ کے مطابق تنخواہ اور الاؤنس ادا کرنے کے بعد باقی اس قدر رقم بچی۔ یہ رقم مرکزی خزانے میں داخل کرا دی جاتی تھی۔ شاہی افسر اس حساب کتاب کی باقاعدہ پڑتال کرتے تھے۔ منصبدار کے مرنے

کے بعد اُس کا ذاتی سامان اور جائیداد اُس کے وارثوں کو ملتے تھے۔ لیکن مقامی خزانے سے خرید کردہ گھوڑے اور دیگر اشیاء سرکاری تحویل میں رہتے۔ بعض یورپی سیاحوں نے اس نظام کو پوری طرح سمجھے بغیر یہ لکھا ہے کہ منصبدار کا سرو سامان بحق سرکار ضبط ہو جاتا تھا۔ یہ بات سراسر غلط ہے۔

اسی طرح ٹامس راؤ۔ برنیئر۔ ہاکنس۔ مینوچی اور دیگر غیر ملکیوں نے منصبداری نظام کے بارے میں فاش غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور وہ اس نظام کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ مغلیہ منصبداری نظام پر عبدالعزیز نے ایک مستند کتاب لکھی ہے جس کا عنوان مغلیہ منصبداری سسٹم ہے۔

منصبدار کے تین درجے ہوتے تھے۔

(۱) اعلےٰ ترین منصب دار یا اوّل درجہ کے منصبدار۔ ایسے منصبداروں کا ذات و سوار درجہ برابر ہوتا تھا۔ مثلاً پنج ہزاری ذات و سوار۔ ہفت ہزاری ذات و سوار۔

(2) دوسرے درجے کا منصب دار وہ تھا جس کا سواروں کا مرتبہ اُس کے ذاتی مرتبے کا نصف ہوتا تھا۔ مثلاً دو ہزار ذات و یک ہزار سوار۔ چھ ہزار ذات و سہ ہزار سوار۔

(3) معمولی منصبدار یا تیسرے درجے کا منصبدار وہ تھا جس کا سواروں کا مرتبہ اُس کے ذاتی مرتبہ کے نصف سے بھی کم ہوتا تھا یا اُسے محض ذاتی مرتبہ عطا ہوتا تھا۔ مثلاً پنج صد ذات و یک صد سوار۔ یک ہزاری ذات۔

مقامی فوج کے علاوہ مرکزی یا امپیریل فوج بھی ہوتی تھی عام سپاہی جو مرکزی فوج میں بھرتی ہوتے تھے اُن کو احدی کہتے تھے منصبداری نظام میں سب سے چھوٹا منصب دار وہ تھا جس کا ذاتی مرتبہ بیس تھا۔

چند مثالوں سے منصبداری نظام کی وضاحت ہو سکے گی۔

(i) پنج ہزاری ذات و سوار۔

(ii) یک ہزاری ذات و پنج صد سوار۔

(iii) یک صد ذات۔

ان تینوں منصبداروں کے ذاتی مرتبہ کے مطابق اُن کے سالانہ مشاہرے اور الاؤنس کی ادائیگی مقامی خزانے سے ہوتی تھی۔ ہر منصبدار کے ذاتی مرتبے کو ایک سپاہی کی ماہانہ تنخواہ سے ضرب دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مہمان خانے کا خرچ چلانے کے لئے ذاتی مرتبہ کے ہندسے کو دو سے ضرب دی جاتی تھی۔ مثلاً اکبر کے زمانے میں ایک عام فوجی سپاہی کی تنخواہ اگر چھ روپے ماہوار تھی تو مندرجہ بالا منصبداروں کو حسب ذیل سالانہ رقوم بطور تنخواہ والاؤنس ملتی تھیں:۔

پنج ہزاری ذات و سوار:۔ ضیافت یا مہمان خانے کا خرچ:۔ 5000×2

= 10000 سالانہ۔

ذاتی تنخواہ = 6 × 5000 = 30,000 سالانہ

کل سالانہ آمدنی 40,000 روپے

(چالیس ہزار روپے)

یہ منصبدار پانچ ہزار فوج بھی رکھتا تھا۔ اُس کے اخراجات مقامی خزانے سے پورے کرتا تھا۔ مثلاً وہ پانچ ہزار فوجیوں کو تنخواہ (بحساب چھ روپے ماہوار فی کس) ادا کرتا تھا۔ اُن کے لیئے گھوڑوں کی مناسب تعداد خریدتا تھا۔ گھوڑوں کے لئے اصطبل بناتا تھا۔ ملازموں کا خرچ اور چارے کا خرچ بھی سرکاری خزانہ سے لیتا تھا۔ منشی اور متصدی یہ تمام حسابات لکھ لیتے تھے۔

مقامی آمدنی سے منصبدار اور اُس کی مقامی فوج کے اخراجات وضع کرنے کے بعد بقایا آمدنی مرکزی خزانے میں جمع ہوتی تھی اگر منصبدار کو کسی دوسرے صوبے میں تبدیل کیا جاتا تو وہاں بھی وہ اپنے سواروں کے مرتبہ کے مطابق مقامی فوج بھرتی کر لیتا تھا پہلے صوبے کی فوج اُس کی ذاتی فوج شمار نہ ہوتی تھی۔ شاہی مرضی سے اُس فوج کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا یا نئے منصبدار کی ضروریات (یعنی اُس کے سواروں کے مرتبہ کے مطابق) مقامی فوج کی تعداد گھٹ جاتی تھی یا اُس میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ بادشاہ اپنی مرضی کے مطابق مقامی ضروریات کے مطابق منصبداروں کا تقرر یا تبادلہ کرتا تھا۔ ضرورت کے وقت یہ لازم تھا کہ منصبدار اُسی قدر فوج فوراً بھیجے۔

یک ہزاری ذات و پنج صد سوار:۔ یہ منصب دار حسب ذیل رقوم مقامی خزانے سے وصول کرتا تھا:۔

ضیافت یا مہمان خانے کا خرچ:۔ 2 x 1000 = 2000 روپے سالانہ

ذاتی تنخواہ (سالانہ) :۔ 6 x 1000 = 6000

کل میزان آٹھ ہزار روپے 8000 روپے

اگر عام فوجی کی تنخواہ پانچ روپے ماہوار یا آٹھ روپے ماہوار ہوتی تو منصبدار کی ذاتی تنخواہ اُسی نسبت سے بڑھ جاتی تھی۔
یہ منصبدار مقامی خزانے سے صرف پانچ سو فوجی بھرتی کرتا تھا یعنی اُس کے زیرِ کمان صرف پانچ سو سپاہی تھے۔

یک صد ذات:- یہ منصبدار معمولی درجے کا تھا۔ اُسے فوجی یا سواروں کا مرتبہ حاصل نہ تھا۔ یعنی محض سول محکمے کے لئے موزوں گنا جاتا تھا۔ وہ جہاں بھی فائز ہوتا اُس کے لئے مقامی فوج بھرتی کرنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ سواروں کے مرتبہ سے محروم تھا۔

اُس کی تنخواہ وغیرہ حسبِ ذیل تھی:-

ضیافت یا مہمان خانے کا خرچ:- 2×100 = 200 روپے سالانہ
ذاتی تنخواہ:- 6×100 = 600 " " "

کل آمدنی 800 روپے سالانہ

ظاہر ہے کہ منصبداروں کے تقرر اور تبادلے کے موقع پر بادشاہ ہر صوبے کی فوجی ضروریات مدِّ نظر رکھتا تھا۔ بعض اوقات اچھے بھلے فوجی منصبدار کو کسی سول محکمے میں مامور کر دیا جاتا تھا یعنی سول اور فوجی محکمے علیحدہ علیحدہ نہ تھے۔

"Civil and military administration interpenetrated each other in the Mansabdari system." (Abdul Aziz).

خاص احتیاط:- اکبر نے منصبداروں کی بے ایمانی روکنے کے لئے چند خاص احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ وہ اکثر بغیر اطلاع معائنہ کے لئے چلا جاتا تھا۔ وزیر اعظم بھی مقامی فوج کا معائنہ کر سکتا تھا۔ اکبر کے حکم سے مقامی فوج کے گھوڑوں کو داغنے کا پرانا طریقہ دوبارہ رائج ہوا۔ اگر کوئی گھوڑا بیمار ہو جاتا اور اُسے بیچنے کی نوبت آتی تو داغ کا نشان کراس (X) کر دیا جاتا تھا۔ بھرتی ہونے والے ہر فوجی سپاہی کا مکمل حلیہ۔ اُس کے چہرے اور آنکھوں کی رنگت۔ بالوں کا رنگ۔ مونچھوں کا انداز۔ صحیح قد وغیرہ سب کچھ سرکاری رجسٹروں میں لکھا ہوتا تھا۔ اس سے دھوکہ دہی ممکن نہ رہی اور معائنہ کے وقت نقلی سپاہی پیش کر کے گنتی پوری نہ ہو سکتی تھی۔ مرکزی دیوان یا وزیر خزانہ تمام منصبداروں کے حسابات کی آڈٹ کرتا تھا۔

منصبداری نظام کی خصوصیات:- منصبداری نظام سے مغلوں کو جاگیرداری نظام کے نقائص سے نجات ملی۔ موروثی ملازمین کی بجائے تنخواہ دار شاہی افسر میسّر آ گئے جو فوجی اور سول محکموں میں خدمات سر انجام دے کر معقول معاوضہ پاتے تھے۔ مغلیہ دور کی رائج الوقت قیمتوں کے لحاظ سے ہر منصبدار کو وافر تنخواہ ملتی تھی۔ وہ دولت میں کھیلتا تھا اور عیش و طرب میں زندگی گذارتا تھا۔ بعض منصبدار اہلِ علم کی سرپرستی کرتے تھے۔ اعلےٰ منصبدار دولت کی فراوانی کی بدولت شاندار محل تعمیر کراتے تھے اور اپنا ذاتی دربار لگاتے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے

بعد منصبداروں نے اپنی دولت راگ رنگ اور کبوتربازی پر صرف کرنی شروع کردی۔ محمد شاہ رنگیلے کے زمانے سے بڑے بڑے منصبدار خود مختار بن بیٹھے اور انہوں نے مقامی فوج کو ذاتی مطلب برآری کے لئے استعمال کیا۔ دیگر منصبداروں نے جی بھر کر بے ایمانی کی۔ مرکز کی جانب سے چونکہ کڑی نگرانی برقرار نہ رہی لہٰذا ہر منصبدار نے دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹی بلکہ مقامی بچت مرکز کو بھیجنے کی بجائے اپنے پاس ہی رکھ لیتے تھے۔

اکبر کا رائج کردہ منصبداری نظام تقریباً دو سو برس نہایت کامیاب رہا بلکہ اس سے مغلیہ سلطنت کی بنیاد مستحکم ہوئی۔ ضرورت کے وقت فوجی منصب دار کو سول محکموں میں تبدیل کردیا جاتا تھا۔ بعض منصب دار تمام عمر محکمۂ مال یا عدالتی کام میں صرف کر دیتے تھے۔ لائبریری کے افسران۔ محکمۂ خط و کتابت کے منتظم سبھی منصبدار ہوتے تھے اور اعلٰے تنخواہ کی بنا پر خوب محنت سے کام کرتے تھے۔

منصبداری نظام کے تحت درباری امراء اور اُن کی اولاد کے لئے بھی لیاقت اور محنت لازمی تھی ورنہ بادشاہ کی جانب سے اُن کو منصب عطا نہ ہوتا تھا۔ راجپوت والیانِ ریاست بھی شاہی دربار میں پہنچ کر منصبدار بن جانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔

مرکز سے شاہی فوج کی آمد کا انتظار کئے بغیر مقامی منصبدار باغیوں کا سر کچل دیتا تھا۔ ضرورت کے وقت مرکز سے کمک پہنچ

جاتی تھی یا کسی دوسرے نزدیکی علاقے سے کسی اور منصب دار کو حکم پہنچ جاتا تھا کہ وہ اپنی فوج سمیت بغاوت فرو کرنے کے لئے پہنچ جائے۔ کسی اہم مہم پر جب شاہی فوج بھیجی جاتی تو منصبداروں کے نام احکام صادر ہوتے کہ وہ مقامی فوج میں سے اسقدر فوجی بھیج دیں۔ منصبداروں کی مقامی فوج امن وامان قائم رکھنے اور مالیہ وصول کرنے میں بھی مدد دیتی تھی۔

منصبداری نظام کی بدولت محنتی اور لائق اشخاص کو ترقی کے مواقع حاصل ہوئے۔ چنانچہ ملّا سعداللہ خان چنیوٹی جیسے افراد اعلےٰ ترین عہدوں پر سرفراز ہوئے۔ اس سے امراء کی اجارہ داری ختم ہوئی اور سرکاری شعبوں کو اعلیٰ کارکن میسّر آنے سے حکومت کا کام عمدگی اور خوش اسلوبی سے چلنے لگا۔ منصبداری نظام کارکردگی کا اعلےٰ نمونہ تھا۔

نقائص :۔ منصبداری نظام کا بنیادی نقص یہ تھا کہ معاشی حالات اور رائج الوقت قیمتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہر منصبدار کو وافر دولت مل جاتی تھی اور وہ جلدی ہی مالا مال ہو کر تن آسانی اور عیش کوش ہو جاتا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اکثر منصبدار لہو ولعب میں مگن رہنے لگے۔ یہ سب خرابی اس لئے نمودار ہوئی کہ منصبداروں کی تنخواہ بہت زیادہ تھی۔

کمزور بادشاہوں کے زمانے میں مرکز کی جانب سے کڑی نگرانی قائم نہ رہ سکی۔ اس سے منصبداروں کو بے ایمانی کے سنہری مواقع میسّر آ گئے اور انہوں نے سرکاری رقوم کو جی بھر کر خرد برد

گیا۔ اس سے مغلیہ سلطنت کی مالی حالت ابتر ہو گئی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال میں یہ امر اہم ترین گنا گیا ہے۔

شاہجہان کے زمانے سے بادشاہ نے خوش ہو کر بعض منصبداروں کے نام خصوصی فرمان جاری کر کے اُن کو مراعات عطا کیں۔ مثلاً ایک منصب دار کا عہدہ دو ہزار ذات و سوار تھا۔ اُسے یہ رعایت ملی کہ صرف ایک ہزار مقامی فوج ملازم رکھے لیکن اخراجات پورے دو ہزار فوجیوں کے وصول کرے۔ بعد ازاں یہ فیشن ہو گیا کہ بادشاہ یہ مراعات (Exemptions) عطا کر دیتا تھا۔

اس سے شاہی خزانے پر کافی بوجھ پڑ گیا۔ نیز منصبداروں نے کمزور بادشاہوں کے زمانے میں ان مراعات سے قطع نظر دیگر ناجائز فائدے اُٹھائے۔ منوچی رقمطراز ہے کہ اُس نے ایک ہفت ہزاری ذات و سوار منصبدار کو دیکھا۔ اُس کے پاس فوجی سوار اور گھوڑے تو کجا سات گدھے بھی نہ تھے لیکن کاغذی کارروائی کی بدولت وہ خوب دولت سمیٹتا تھا۔

یہ بات یاد رہے کہ منصبداری نظام صرف کمزور بادشاہوں کے زمانے میں دگرگوں ہو گیا۔ اکبر سے لے کر اورنگ زیب کے زمانے تک یہ نظام عمدگی سے چلتا رہا۔

مدد معاش اور وظیفہ:۔ اکبر نے اپنے زمانے میں یہ قدیم دستور برقرار رکھا کہ شاہی خزانے سے علماء اور مشائخ کو باقاعدہ وظائف عطا ہوں۔ بیوہ عورتوں اور یتیموں کو محکمۂ خیرات کا افسر اعلےٰ اپنی مرضی کے مطابق مالی مدد عطا کرتا تھا۔ اس افسر کو صدر الصدور

کہتے تھے۔ ہر صوبے میں خیراتی امور کے نگران کو صدر کہتے تھے۔

معززین۔ علماء اور مشائخ کو بعض اوقات بادشاہ زمین عطا کرتا تھا۔ اس قسم کی گرانٹ کو مددِ معاش کہتے تھے۔ نیا بادشاہ عطا شدہ زمین بحال کر دیتا تھا یا ناراض ہو کر اُسے ضبط کر لیتا تھا۔ مدد معاش وصول کرنے والے زمین کے عطیے بغیر کسی حق خدمت کے حاصل کرتے تھے۔ لہٰذا وہ نہ دل سے بادشاہ کے شکر گزار ہوتے تھے اور اس کی سلطنت کی بقا کے لئے نہ صرف دعا گو رہتے تھے بلکہ نازک وقت پر فوج سے بھی مدد کر کے اپنی وفاداری اور احسان شناسی کا ثبوت دیتے تھے۔ علماء کے علاوہ تان سین جیسے اہلِ فن اور موسیقاروں کو بھی مدد معاش عطا ہوتی تھی۔

تاریخ میں اکبر کا مقام:۔ شہنشاہ اکبر کو بجا طور پر مغلیہ سلطنت کا اصلی بانی شمار کیا جاتا ہے۔ وہ عظیم الشان فاتح تھا۔ انتظامی صلاحیت۔ تدبّر اور فہم و فراست میں بے مثال تھا۔ اُس نے رواداری اور ہوشمندی سے کام لے کر مغلیہ سلطنت کی جڑ کو مضبوط کیا۔ غیر مسلم رعایا کا دل موہ کر اُس نے ہندو عورتوں سے شادیاں بھی کیں اور حکومت کو نیشنلزم کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ اُس کی اصلاحات میں سے لگانِ اراضی اور منصبداری سسٹم کافی اہم ہیں۔ اُس نے ملک کو صوبوں میں تقسیم کیا۔ مرکزی اور صوبائی حکومت کا باقاعدہ ڈھانچہ تیار کیا اور حکومت کے مختلف شعبوں کی تنظیم کی۔ پس ہر لحاظ

سے اکبر کامیاب ترین شہنشاہ ہو گزرا ہے۔ تاریخ میں اُسے بلند مقام حاصل ہے۔ اُس جیسی ہر دلعزیزی کسی حکمران کو حاصل نہ ہو سکی۔ سر ولیم سلیمین (Sir William Sleeman) کا فقرہ اکبر کے بارے میں کافی چٹخارے دار ہے کہ "تمام شہنشاہوں میں اکبر مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے شعراء میں شیکسپیئر"۔

"Akbar has always appeared to me among sovereigns what Shakespeare was among poets."

اکثر مؤرخین نے اکبر کے کارناموں اور صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بلاشبہ وہ اکبر اعظم کہلانے کا مستحق ہے۔ اکبر کے بارے میں چند مؤرخین کے اقوال حسب ذیل ہیں:-

(۱) لین پول کا فتویٰ یہ ہے کہ "ہندوستان کے شہنشاہوں میں سے اکبر سب سے زیادہ رفیع الشان اور عالی ظرف حکمران تھا۔ وہ مغلیہ سلطنت کا اصلی بانی تھا۔ اُس کی تنظیم کی بدولت اکبر کے عہد کو مغلیہ سلطنت کا سنہری دور گنا جاتا۔

"Akbar was the noblest king that ever ruled in India. He was the founder and organizer of the Empire. He represents the golden age of the Mughals."

(2) سمتھ صاحب کی رائے یہ ہے کہ "بلاشبہ اکبر نے

حکومت کے شعبوں کے نظم و نسق کو بہتر بنا دیا۔ اُسے مغلیہ سلطنت کا اصلی بانی کہنا چاہیئے۔"

"The organization of the government undoubtedly was immensely improved by Akbar, who was the real founder of the Mughal Empire."

(۳) ڈاکٹر ایشوری پرشاد کا قول یہ ہے کہ "اکبر دنیا کی تاریخ میں عظیم ترین تاجدار ہے۔ انتظامی صلاحیتوں اور سپاہیانہ جوہر میں وہ لاثانی تھا۔ تخت نشینی پر وہ مشکلات کے نرغے میں گھرا ہوا تھا لیکن اُس نے سب مشکلات پر خدا داد قابلیت اور کردار کی پختگی کی بدولت قابو پا لیا۔"

"Akbar is one of the greatest kings in the history of the world.........As a soldier and administrator he had no equal. He succeeded to a throne beset with perils but he overcame them all by his genius and force of character."

(۴) ڈاکٹر ہری واستوا یوں لکھتے ہیں کہ "سیاست دانی اور انتظام ملکی میں اکبر بے مثال ہے۔ وہ تعمیری کاموں میں

خداداد قابلیت رکھتا تھا۔ اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی
کہ حکمرانی کے عام اُصولوں کو اچھی طرح سے جاننے کے علاوہ
اُس میں یہ بھی اہلیت تھی کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی جانب
بھی پوری توجّہ مبذول کر سکے۔"

"As an administrator and statesman Akbar stands unrivalled. He was a great constructive genius and possessed a rare gift of combining the knowledge of broad principles of administration with a mastery over minute details of various departments of government."

(۵) ڈاکٹر تری پاٹھی کا قول یہ ہے کہ " ہر لحاظ سے پرکھنے
کے بعد ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ اکبر ہر دور کے عظیم ترین
تاجداروں کی نسبت ارفع و اعلےٰ تھا۔"

" Taken altogether it may safely be said that Akbar was one of the greatest kings of all times."

(۶) شیخ محمد اکرم یوں رقمطراز ہیں کہ " اکبر نہ صرف عظیم المرتبت
فاتح تھا بلکہ وہ تنظیم اور موزوں قوانین بنانے میں اعلیٰ لیاقت

رکھتا تھا۔ وہ مغلیہ سلطنت کو اصلی پائیداری بخشنے والا حکمران تھا۔"

" Akbar was not only a great conqueror, but was also a capable organiser and a law giver. He was the real builder of the Mughal Empire."

اکبر کے آخری ایّام :۔ اکبر کی زندگی کے آخری سال ناخوشگوار تھے۔ شہزادہ سلیم نے باپ کے خلاف 1602ء میں بغاوت کردی اور الہ آباد میں اپنے حواری جمع کرلئے۔ اُس نے اُن دنوں بیر سنگھ کے ذریعے اکبر کے ندیم خاص ابوالفضل کو قتل کروا دیا۔ اکبر بے حد ناراض ہوا لیکن شہزادے کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم نے 1603ء میں باپ بیٹے کی صلح کروا دی۔ اپریل 1604ء میں شہزادہ دانیال کی موت کے بعد اکبر نے شہزادہ سلیم کو اپنا ولیعہد مقرر کردیا لیکن عزیز کوکہ کے علاوہ مان سنگھ اور دیگر بااثر راجپوت سازشوں میں مگن تھے تاکہ شہزادہ سلیم کے بیٹے خسرو کو اکبر کا جانشین نامزد کروا دیا جائے۔

اکبر نے 1605ء میں پیچش سے نڈھال ہو کر وفات پائی اور اُس کے بعد چوبیس اکتوبر 1605ء کو شہزادہ سلیم آگرہ میں تخت نشین ہوا۔

اکبر کی وسعت سلطنت :۔ اکبر کی وفات کے وقت اُس کی سلطنت بہت وسیع تھی۔ اُس کی سلطنت اٹھارہ صوبوں پر مشتمل تھی جو حسب ذیل تھے :۔

(1) کابل (2) کشمیر (3) لاہور (4) ملتان (5) سندھ (6) دہلی (7) آگرہ (8) اودھ (9) الہ آباد (10) بنگال (11) بہار (12) اڑیسہ (13) گجرات (کاٹھیاواڑ) (14) مالوہ (15) خاندیش (16) برار (17) اجمیر (18) احمد نگر۔

راجپوتانے کی ریاستیں مغلیہ سلطنت کے زیر حفاظت تھیں۔ 1604ء میں، شاہی صوبوں کی کل آمدنی سترہ کروڑ پینتالیس لاکھ روپے تھے۔ پس تمام شمالی ہند کے علاوہ اکبر کی سلطنت میں دکن کا کچھ حصہ۔ بنگال و بہار اور صوبۂ کابل بھی شامل تھا۔ ذرائع آمد و رفت کی کمی اور پس ماندگی کے باوجود اسقدر وسیع سلطنت میں امن و امان قائم رکھنا گویا ایک معجزہ تھا۔

اکبری دور کے معاشی و سماجی حالات

اکبر کے عہد یعنی سولھویں صدی میں مردم شماری نہ ہوتی تھی لیکن مختلف امور سے اندازہ لگا کر مؤرخین نے یہ تخمینہ لگایا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کی کل آبادی ضرورت سے زیادہ نہ تھی۔ صوبہ کابل سمیت تمام شمالی ہند کی آبادی ستّر ملین یعنی سات کروڑ تھی اور جنوبی ہند کی آبادی تیس ملین یعنی تین کروڑ تھی۔ اس لحاظ سے مغلوں کی کل رعایا کی تعداد دس کروڑ تھی جس میں ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ پارسی سبھی شامل تھے۔ اسی تعداد میں غیر ملکی بھی شامل تھے۔ ساحلی علاقوں پر عرب آباد تھے۔ دمن اور دیو میں پرتگیزی مقیم تھے عیسائی مبلّغین گوا اور بعض دیگر مقامات میں موجود تھے۔ ایرانی

اور تورانی ہندوستان آ کر اعلےٰ عہدوں پر فائز تھے۔ حبشی غلام بھی برّصغیر میں موجود تھے۔ 1562ء میں اکبر نے جنگی قیدیوں کو غلام بنانا ممنوع قرار دیا لیکن غلامی مغلیہ سلطنت میں رائج رہی۔ شاہی منصبدار دولت سے کھیلتے تھے۔ یہ بات افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اکبری دور کے منصبداروں میں سے ایک منصبدار کے پاس پانچ صد مشعل بردار ملازمین تھے۔ ایک اور منصبدار ہر روز ہزار اقسام کے کھانے پکوا کر اپنے دستر خوان پر چنتا تھا۔ بادشاہ کے ذاتی ملازمین کی تعداد بھی کافی تھی۔ شاہی دربار شان و شوکت میں بے مثال تھا۔ مذہبی راہنماؤں اور اہل فن کو بادشاہ کی جانب سے مدد معاش ملتی تھی۔ اسے سرکاری گرانٹ کہہ سکتے ہیں۔ امراء گھوڑے اور ہاتھی پالتے تھے۔ جواہرات اور قیمتی پتھروں کے علاوہ وہ زرق برق لباس اور اعلےٰ قسم کے پھلوں پر خوب روپیہ خرچ کرتے تھے۔ سارا سال برف کے استعمال کا رواج تھا۔ گھریلو ملازم کی تنخواہ ڈیڑھ روپیہ ماہوار تھی۔ عام فوجی سپاہی کو ماہانہ پانچ یا چھ روپے ملتے تھے۔ اچھی کنیز کی قیمت پچاس روپے تھے۔ ملک بھر میں قیمتیں نہایت کم تھیں اور فی کس آمدنی کافی تھی۔ لہٰذا عوام خوشحالی اور قناعت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

موجودہ قسم کی پکّی سڑکیں۔ ریلیں یا نہریں تو موجود نہ تھیں لیکن بڑے بڑے شہروں کو کچی (لیکن ہموار) سڑکوں سے ملایا ہوا تھا۔ شیر شاہی دور سے سڑکوں کے دو رویہ سایہ دار درخت تھے۔ جگہ جگہ سرائیں اور کنوئیں موجود تھے۔ وسط ہند گورکھپور اور بہار کا علاقہ جنگلات سے بھرپور تھا لیکن چوری چکاری اور ڈاکہ زنی مفقود تھی

مسافر اور غیر ملکی تاجر بلا روک ٹوک مملکت کے ہر حصّے میں جا سکتے تھے۔ یہودی اور آرمینیا کے تاجر بھی سولھویں صدی میں ہندوستان آتے تھے۔ ملکی آبادی دیہات میں مقیم تھی لیکن بڑے بڑے شہر وجود میں آچکے تھے۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس۔ کانپور اور کراچی تاحال وجود میں نہ آئے تھے۔ قدیم راجدھانیاں مثلاً قنوج اور وجیانگر برباد ہو چکے تھے۔ اکبری دور کے اہم شہر دہلی۔ آگرہ فتح پور سیکری۔ الہ آباد۔ بنارس۔ لکھنؤ۔ لاہور۔ ملتان۔ اجین۔ احمد آباد اجمیر۔ پٹنہ۔ راج محل اور ڈھاکہ تھے۔

ملک کی آبادی کا بیشتر حصّہ دیہات میں مقیم تھا اور زراعت اہم ترین پیشہ تھا۔ سلطنت میں ہندو آبادی کی اکثریت تھی۔ ہندو ذات پات میں منقسم تھے لیکن راجپوت۔ برہمن۔ کائستھ اور ویش قابلِ عزت سمجھے جاتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں فرقہ دارانہ نفرت میں ازحد کمی واقع ہو گئی تھی۔ اور مختلف مذاہب کے عوام اچھے ہمسایوں کی مانند یک جہتی سے زندگی بسر کرتے تھے مغلوں نے باغات اور سدا بہار درخت لگوا کر ملک کے مختلف حصّوں کو حسین بنا دیا تھا۔

زراعت :- اکبری دور میں مصنوعی آبپاشی و نہریں مفقود تھیں لیکن ملک میں بارش کافی ہوتی تھی۔ زراعت کے طریقے اور اوزار قدیم طرز کے تھے لیکن آبادی کے تناسب سے ملک میں خوراک کافی پیدا ہوتی تھی اور دیگر ممالک سے خوراک کی درآمد نہ ہوتی تھی۔ جب بارش نہ ہوتی تو ملک میں قحط رونما ہو جاتا۔ چنانچہ ۱۵۵۶ء

اور 1598ء میں شدید قحط رونما ہوا۔ اکبری دور میں گندم، چاول روئی، تیل نکالنے کے بیج۔ پوست۔ نیل۔ گنا۔ جوار۔ باجرہ کی کاشت ہوتی تھی۔ پٹ سن کی کاشت زیادہ نہ تھی۔ 1604ء سے تمباکو بھی کاشت ہونے لگا۔ اشیاء کی قیمتیں بے حد کم تھیں لیکن معیارِ زندگی اُونچا نہ تھا۔ لہٰذا لوگ ذہنی طور پر خوش تھے۔ معمولی مزدور محض ایک آنہ یومیہ کماتا تھا لیکن اُس کے پاس کھانے پینے کی اشیاء کی فراوانی تھی۔ مالوہ اور بہار میں پوست کی کاشت بہت زیادہ تھی۔ شراب کی کشید بھی عام تھی۔ مچھلی کافی مقدار میں پکڑی جاتی تھی اور خوب سستی تھی۔

نباتات اور صنعتیں:۔ ملک میں نباتات کے ذخائر کافی تھے خاص طور پر لوہا کافی مقدار میں پایا جاتا تھا۔ راجستھان اور وسط ہند میں تانبے کی کانیں موجود تھیں اور اُن سے خوب فائدہ حاصل کیا جاتا تھا۔ پنجاب کے پہاڑوں اور جھیل سانبھر سے نمک حاصل کیا جاتا تھا۔ قلمی شورہ کثرت سے بنتا تھا۔ بارود ہندوستان میں تیار ہوتا تھا۔

ملک بھر میں سوتی کپڑا۔ دریاں اور ریشمی کپڑا بننے کے کئی اہم مرکز تھے۔ سنار گاؤں اور ڈھاکہ کے علاوہ بنارس۔ آگرہ۔ برہان پور ملتان۔ لاہور۔ سوتی کپڑے کے اہم مرکز تھے۔ گجرات۔ کشمیر۔ بنگال میں ریشمی کپڑا تیار ہوتا تھا جو غیر ممالک کو بھی جاتا تھا۔ اکبری دور میں ہندوستان کی مصنوعات دور دراز ممالک تک پہنچتی تھیں۔ عرب۔ بحیرہ روم۔ چین۔ جاپان۔ مصر اور برما خاص طور پر

ہندوستانی مال کے خریدار تھے۔ جہاز سازی اور چمڑا رنگنے کی صنعت بھی عام تھی۔ کاغذ کی قلیل مقدار بھی ہندوستان میں بنائی جاتی تھی۔ بعض مقامات پر کمبل بنتے تھے لیکن اُونی کپڑے کی صنعت کو فروغ پذیر نہیں گنا جاتا تھا۔

زرگری۔ ہاتھی دانت کا کام اور لکڑی کا زیبائشی سامان ہندوستان میں عام تھا اور ہندوستان کے کاریگر دنیا بھر میں مشہور تھے۔

غیر ملکی تجارت:۔ اکبر کے زمانے میں ہندوستان کی غیر ملکی تجارت ایشیا اور یورپ کے کئی ایک ممالک کے ساتھ زوروں پر تھی۔ دساور کو بھیجی جانے والی اشیا میں سوتی کپڑا۔ نیل اور پوست۔ مرچیں اور ادویات تھیں۔ سوتی کپڑے کی طلب بہت زیادہ تھی۔ افریقہ۔ مصر۔ عرب۔ ملایا۔ برما۔ اٹلی۔ فرانس۔ برطانیہ اور جرمن ریاستوں کو سوتی کپڑا جاتا تھا۔ درآمدی تجارت میں سونا۔ چاندی۔ تانبا۔ مخمل۔ خام ریشم کمخواب۔ گھوڑے۔ یورپ کی شراب اور حبشی غلام نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ زیادہ تر غیر ملکی تجارت سمندری راستے سے ہوتی تھی لیکن کچھ مال برّی راستے سے بھی جاتا تھا۔ برّی راستے سے تاجر براستہ لاہور کابل پہنچتے تھے یا ملتان سے قندھار پہنچ جاتے تھے اور پھر مشرقِ وسطیٰ میں ہندوستان کا مال لے جاتے تھے۔ اہم بندرگاہیں کھمبایت۔ بھڑائچ۔ سورت لاہوری بندر (سندھ)۔ بسین گوا۔ کالی کٹ۔ کوچین۔ ہگلی اور سری پور تھیں۔ محصولات نہایت معمولی تھے۔

میلے اور تفریحات:۔ اکبر کے زمانے میں ملک بھر میں کئی ایک

میلے اور تہوار منائے جاتے تھے۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس کے موقع پر ہزاروں عقیدت مند حاضر ہوتے تھے۔ اکبر نے کئی ایک ہندوانہ تقریبات کو منانے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ دسہرہ۔ دیوالی۔ بسنت اور راکھی بندھن بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے جشن نوروز بھی ہر سال منایا جاتا تھا۔ بادشاہ اور ولیعہد کی سالگرہ پر بھی میلہ لگتا تھا۔ ہندو عوام ہردوار۔ متھرا۔ پراگ۔ گیا اور اُجین میں میلے لگاتے تھے اور یاترا کے لئے جاتے تھے۔ اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ مکّہ کے حاجیوں کو ہر سہولت دی جاتی تھی۔ 1575ء میں اکبر نے حکم دیا کہ ہر شخص کو اجازت ہے کہ شاہی خزانے سے روپیہ لے کر حج کرلے۔ مسلمان عوام نے اس سے استفادہ کیا۔

اکبر اور اُس کے درباری امراء شکار کے شوقین تھے۔ ہاتھیوں کی لڑائی۔ پولو۔ کبوتر بازی۔ باز پالنا۔ مُکّے بازی اور کشتیاں مقبول تفریحات تھیں شطرنج۔ چوسر اور پچیسی (جو کوڑیوں سے کھیلتے تھے) رائج تھیں۔ غریبوں کی بستیوں میں لوگ پتلی کا تماشا۔ مداری کا کھیل۔ بندر کا ناچ۔ رام لیلا یا سیلہ کا تماشا دیکھ کر دل بہلاتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ناٹک اور کھیل تماشے ہوتے تھے ملک بھر میں موسیقی کافی مقبول تھی۔

سوسائٹی کے اعلےٰ درجوں میں شراب نوشی عام تھی۔ راجپوت بھی شراب اور افیون کے شوقین تھے۔ اکبر کی تمام اولاد کو شراب نوشی کا چسکا تھا۔ البتہ عوام مذہبی جوش کی بنا پر شراب نوشی سے دُور

رہتے تھے۔

ادب اور فن تاریخ نویسی:۔ اکبر کے زمانے میں فارسی ادب کو خوب فروغ ہوا۔ ادب اور تاریخ نویسی نے کمال حاصل کیا۔ شعر و سخن میں بھی درخشاں ستارے نمودار ہوئے۔ عرفی۔ فیضی۔ عبدالرحیم خان خاناں بلند مرتبہ شاعر تھے۔ ان کے علاوہ غزالی اور محمد حسین نظیری مشہور غزل گو شعراء تھے۔

اکبر کے زمانے میں اہم ترین تاریخی کتابیں لکھی گئیں۔ ملّا داؤد کی "تاریخ الفی"۔ ابوالفضل کا "اکبر نامہ" اور "آئین اکبری"۔ بدایونی کی "منتخب التواریخ"۔ نظام الدین احمد کی "طبقات اکبری"۔ فیضی سرہندی کا "اکبر نامہ" عبدالباقی کا "ماثر رحیمی" احمد یادگار کی "تاریخ سلاطین افاغنہ" بایزید سلطان کی "تاریخ ہمایوں" اور نورالحق کی "زبدة التواریخ" اس دور کی قابل قدر تاریخی کتب ہیں۔ یہ سب کتابیں فارسی میں ہیں۔

اکبر کے عہد میں متعدد کتابوں کے تراجم ہوئے۔ اصل کتابیں سنسکرت یا ہندی میں تھیں۔ بدایونی نے "راماین" کا ترجمہ کیا۔ مختلف علماء نے "مہابھارت" کے حصوں کا الگ الگ ترجمہ کیا۔ ان حصوں کو یکجا کر کے "رزم نامہ" کا نام دیا گیا۔ حاجی ابراہیم سرہندی نے "اتھرو وید" کا ترجمہ کیا اور فیضی نے ریاضی کی مشہور کتاب لیلاوتی کا ترجمہ کیا عبدالرحیم خانخاناں نے "واقعات بابری" کا ترجمہ کیا اور مولانا شاہ محمد نے "تاریخ کشمیر" کا ترجمہ کیا۔ چند ایک عربی اور یونانی کتب کا ترجمہ بھی ہوا۔

فن تعمیر۔ مصوری اور موسیقی:۔ اکبر آرٹ اور موسیقی کا دلدادہ تھا

اکبر کا خیال تھا کہ مصوّری کی بدولت انسان خدا کو پہچان سکتا ہے اُس کی سرپرستی میں ایرانی تصوّرات اور ہندی خیالات کا عمدہ امتزاج مصوّری میں رونما ہوا۔ اکبر کے دربار میں نامور مصوّرین کی تعداد سترہ تھی۔ اُس دور کے مشہور ترین مصوّر عبدالصمد شیرازی میر سید علی فرحت بیگ۔ دسونت اور بساون تھے۔ اکبری دور میں مصوّری میں شاہجہانی عہد کی نفاست اور نزاکت نہیں تھی۔ لیکن دیواروں پر تزئین اور زیبائش کے لئے رنگ بھرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

اکبر کے دور میں فن موسیقی بام عروج پر پہنچا۔ اُس کا درباری موسیقار تان سین اکبر کا مقرّب خاص تھا۔ وہ موسیقی میں اُستاد مانا گیا ہے اُس کی بدولت پکّے راگوں کو مزید ترقی ہوئی۔ تان سین کے علاوہ اکبری دربار میں چھتیس ماہرِ فن موسیقار تھے۔ اُن سب کو اکبر نے مدد معاش یا منصب عطا کئے ہوئے تھے۔ مالوہ کا سابق حکمران باز بہادر موسیقی کے فن میں امام وقت تھا۔ وہ اکبر کا منصبدار بن کر دربار کی زینت تھا۔ رام داس اور سور داس موسیقی کے ماہر اور ہندی زبان کے شاعر تھے۔ اُسی زمانے میں ہندی کا مشہور شاعر تلسی داس ہو گذرا ہے۔

اکبر کو تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ اُس نے لاہور۔ آگرہ اور الٰہ آباد میں شاہی قلعوں میں متعدد عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ہر قلعے میں اُس نے دیوان خاص تعمیر کر دیا جس میں راجپوت آرٹ کے نمونے پر ستون موجود ہیں۔ نیز تزئین و آرائش میں ہندوانہ اثرات ہیں۔ ابوالفضل

نے اکبر کی تعمیر کردہ عمارات کی بے حد تعریف کی ہے۔ لیکن مؤرخین نے اکبر کے فن تعمیر کو معمولی درجہ دیا ہے۔ اکبر کی اکثر تعمیرات فتح پور سیکری میں بغیر جواب کھنڈرات بن چکی ہیں۔ فتح پور سیکری کی عمارات میں سے جامع مسجد اور بلند دروازہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اکبری دور کی عمارات میں ایرانی اور ہندی فن تعمیر کا امتزاج ہے۔

ہمایوں کا مقبرہ اکبری عہد میں تعمیر ہوا۔ اس کا گنبد دہرا ہے اور اس کی بلندی حیران کن ہے۔ عمارت وسیع اور رعب دار ہے کرسی بھی کافی اونچی ہے۔ لیکن اس عمارت میں شاہجہانی عمارات جیسی نزاکت۔ بانکپن اور موزونیت نہیں ہے۔ مغلوں میں ڈبل گنبد کا رواج نہ ہوسکا۔ البتہ ایرانی طرز تعمیر نے خوب فروغ پایا۔ اکبر کے زمانے میں شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ بھی تعمیر ہوا لیکن اس میں مقامی اثر غالب ہے۔

اکبری دور کے مشاہیر:۔ اکبر کے زمانے میں علم و ادب۔ مصوری موسیقی اور ثقافت نے بے مثال ترقی کی۔ عام طور پر مشہور ہے کہ اکبر کے مشاہیر نو تھے جو "نورتن" کہلاتے ہیں۔ یہ روایت درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبری دور کی عظمت نو اشخاص تک محدود نہیں بلکہ لاتعداد عظیم شخصیتیں اکبری دور کی درخشانی کا باعث بنیں اس سے قبل نامور مؤرخین کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ مصورین۔ ماہرین موسیقی اور شعرا کا ذکر بھی گذشتہ سطور میں پیش ہو چکا ہے۔ اکبری دور کے چند دیگر مشاہیر کا مختصر حال حسب ذیل ہے۔

۱۔ **شیخ مبارک کا خاندان:۔** اکبر کے عہد کے مشاہیر اور علماء میں

سے شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ تینوں شیعہ تھے اور جیّد عالم تھے۔ شیخ مبارک اور اس کے بیٹے جاہ پرست اور دربارداری کے ماہر تھے۔ وہ خوشامد کے فن کو خوب جانتے تھے۔ اکبر کے مزاج میں ان کو خوب دخل تھا۔ 1579ء کے محضر میں شیخ مبارک نے اہم پارٹ ادا کیا۔ ابوالفضل اکبر کے دوستوں میں سے تھا اور نثرنویسی کا استاد تھا۔ تاریخی کتب کے علاوہ اس نے "انشائے ابوالفضل" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں سیاسی خطوط کے اعلیٰ نمونے ہیں اور ہم عصر شعرا اور اہلِ قلم پر ابوالفضل نے عالمانہ تنقید کی ہے۔ ابوالفضل کا اسلوب بیان عالمانہ ہے لیکن عبارت عام فہم نہیں اور بھاری بھرکم الفاظ اور مسجع و مقفیٰ عبارت نے اسے کافی مشکل بنا دیا ہے۔ ابوالفضل کا بھائی فیضی ملک الشعراء تھا اور عجوبۂ زمان تھا۔ اس کی یادداشت بلا کی تھی اس نے ریاضیات کی مشہور کتاب "لیلاوتی" کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ فیضی نے اپنا کمال دکھانے کے لئے کافی کچھ لکھا لیکن اس کے کلام میں خیالات کی بجائے زبان کی زیبائش پہ زیادہ زور پایا جاتا ہے۔ فیضی کی بے نقط تفسیر ایک کارنامہ ہے۔

(ب) عبدالرحیم خانخاناں اور عرفی:- اکبر کے اتالیق اور سخلیہ سلطنت کے صاحب عزم جرنیل بیرم خان کے لڑکے عبدالرحیم نے اکبر کی سرپرستی میں تعلیم و تربیّت حاصل کی اور جوان ہو کر اعلیٰ عہدوں پہ سرفراز ہوا۔ وہ شاعر بھی تھا اور اہل قلم کا سرپرست بھی۔ کئی علماء اور شعرا اس کی سرپرستی میں تھے۔ فارسی کا مشہور شاعر اور فیضی کا

رقیب) عرفی ابتدا میں عبدالرحیم کی سرپرستی میں رہا اور بعد ازاں اکبر کے دربار سے وابستہ ہوا۔ عرفی کی شاعری میں شوکت الفاظ، تخیل کی بلندی اور بے ساختہ پن کے علاوہ فطری جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں مغلیہ سلطنت کا ستون اور عمدہ جرنیل گنا جاتا ہے انتظامی قابلیت، علمیت اور دولت و ثروت میں وہ بے مثال تھا اور اکبری دور کا درخشندہ ستارہ تھا۔

(ج) غیر مسلم منصبدار:۔ عہد اکبر کے ہندو مشاہیر میں سے مان سنگھ بھگوان داس اور ٹوڈرمل قابل ترین اشخاص تھے۔ مان سنگھ عمدہ جرنیل تھا اور اس کی سرکردگی میں کئی مہمات سر ہوئیں۔ وہ کابل اور بنگال کے صوبوں کا گورنر بھی رہا۔ مان سنگھ کو اکبر اپنا دست راست سمجھتا تھا، وہ راجہ بہاری مل آف جے پور کا لڑکا تھا۔ اکبری دربار میں اسے ہفت ہزاری ذات و سوار کا عہدہ عطا ہوا۔ ٹوڈرمل مالیات کا ماہر تھا اور اکبر کے عہد میں لگان اراضی کا نیا نظام اسی کی نگرانی میں رائج ہوا۔ مالی اور انتظامی امور کے علاوہ وہ فوجی قابلیت بھی رکھتا تھا۔ اس نے محض اپنی لیاقت کی بدولت درجہ بدرجہ ترقی پائی تھی۔

(د) بیربل اور حکیم ابوالفتح:۔ اکبر کے مصاحبین میں سے دو مزاحیہ ہستیاں خاصی مشہور ہیں اور ان کے چٹکلے اور لطیفے آج تک رائج ہیں۔ ایک کا نام راجہ بیربل تھا اور دوسرا حکیم ابوالفتح یا حکیم ہمام تھا جیسے لوگ ملا دو پیازہ کہتے ہیں۔ یہ دونوں لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کی بدولت بادشاہ کے خاص مصاحب بن گئے تھے۔ بیربل کو اکبر

بہت پسند کرتا تھا اور اسے اعلیٰ منصب عطا کیا تھا۔ 1586ء میں سرحدی آزاد قبائل کی گوشمالی کی غرض سے اکبر نے یوسف زئی قبیلے کے خلاف بیربل کو فوج دے کر بھیجا۔ برہمن زادہ بیربل مسخرہ پن میں مہارت رکھتا تھا لیکن فنون جنگ سے بالکل ناواقف تھا۔ اس کی فوجوں کو شکست ہوئی بیربل بھاگ اٹھا اور مارا گیا۔ اس کی لاش کا پتہ نہ چل سکا۔ اکبر نے اس کی موت کا بہت سوگ منایا۔

(ھ) مرزا عزیز کوکہ:۔ یہ اکبر کا رضاعی بھائی تھا یعنی دایہ جی جی انگہ کا بیٹا تھا اور اکبر کے ساتھ کھیلنے کی بدولت اس کا مصاحب خاص تھا۔ اکبر اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ جہانگیر کے بڑے بیٹے خسرو کی شادی عزیز کوکہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ عزیز کوکہ نے اکبر کی مذہبی پالیسی سے برگشتہ ہو کر مکّہ میں اقامت اختیار کر لی لیکن بعد ازاں واپس ہندوستان آ کر دین الٰہی اختیار کر لیا اور پکا دنیادار بن گیا۔ اکبر کے آخری ایّام میں عزیز کوکہ نے راجپوتوں سے مل کر کئی سازشیں کیں تاکہ جہانگیر کی بجائے خسرو کو اکبر کا جانشین بنایا جائے۔ جہانگیر نے بادشاہ بن کر اسے معاف کر دیا اور دکن کا گورنر بنا دیا، لیکن عزیز کوکہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا اس لئے معتوب ہو کر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ مرزا عزیز کوکہ نے 1624ء میں وفات پائی۔

اکبری دور کے عیسائی مبلّغین:۔ اکبر کے عہد میں عیسائی مبلّغین کا تانتا بندھ گیا اور وہ اس خیال خام میں مبتلا ہو گئے کہ اکبر عیسائی مذہب اختیار کرنے پر آمادہ ہے اور اس کی بدولت برّ صغیر میں عیسائیّت کو خوب فروغ ہو گا۔ یہ عیسائی مبلّغین

رومن کیتھولک تھے اور جیسوئٹ کہلاتے ہیں سپین اور پرتگال کا اُن دنوں اتحاد ہو چکا تھا اور جیسوئٹ پادریوں نے (جو عام طور پر پرتگیزی کہلاتے ہیں) گوا کو اپنا صدر مقام بنا لیا تھا۔ اکبر کے دربار میں عیسائی مبلغین کے تین تبلیغی مشن آئے اور ناکام واپس ہوئے عبادت خانہ کے بحث و مباحثہ میں بھی جیسوئٹ پادری شامل ہوتے رہے۔ سمتھ صاحب لکھتے ہیں کہ اکبر پرتگالی باشندوں سے فن جہازرانی کے فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا اور فنون حرب میں بھی اُن سے استفادہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ کج بحثی اور اتہام ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ تمام مسلمان حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبر مانتے ہیں اور حضرت مریمؑ کی بھی تکریم کرتے ہیں عقیدت کے اظہار سے یہ ہرگز مراد نہ تھی کہ اکبر یا اُس کا ولیعہد عیسائی مذہب قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ سمتھ صاحب کا یہ قول کہ بادشاہ اور شہزادہ سلیم ظاہرداری سے کام لے رہے تھے سراسر غلط ہے۔ اکبر کی مذہبی رواداری ضرب المثل ہے۔ سمتھ صاحب بلا وجہ مبلغوں کی نیت پر شک کر رہے ہیں۔ اصلی بات یہ تھی کہ جیسوئٹ مبلغین جلد بازی میں جذبات کی رو میں بہہ گئے اور اکبر کی مذہبی پالیسی کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

جیسوئٹ مبلغین کا پہلا مشن فتح پور سیکری پہنچ کر عبادت خانہ کی مذہبی بحث میں شریک ہوا لیکن ۱۵۸۳ء میں ناکام واپس لوٹا۔ اس مشن میں ایکوا ویوا (Aquaviva) اور مونسرٹ (Monserrate) شامل تھے۔ دوسرا مشن اکبر کی دعوت پر ۱۵۹۰ء میں شاہی دربار میں آ کر دو سال مقیم رہا اور ۱۵۹۲ء

میں ناکام لوٹا۔ تیسرا مشن 1595ء میں لاہور وارد ہوا۔ اکبر اُن دنوں اسی شہر میں مقیم تھا۔ عیسائی مبلّغین کو اکبر نے خاص رعایات عطا کیں بلکہ شاہی فرمان جاری ہوا کہ اگر اکبر کی رعایا میں سے کوئی شخص عیسائی مذہب اختیار کرلے تو اکبر کو مطلق اعتراض نہ ہوگا۔ اس فراخ دلانہ سلوک کے باوجود عیسائی مشن تبلیغ میں سراسر ناکام رہا۔ پادری جیروم ایکسی ور (Jerome Xavier) اور ای پن ہائیرو (Emmanuel Pinhero) اس تبلیغی مشن کے سرکردہ افراد تھے۔ عیسائی مبلّغین نے ہندوستان کے بارے میں کافی دلچسپ اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ اُن کی تحریروں سے اکبر کے دور کی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

Typical Questions

Q. 1. Give a brief account of the territorial expansion under Akbar the Great.

Q. 2. Write a critical account of Akbar's Din-i-Ilahi

Q. 3. "The whole scheme (Din-i-Ilahi) was the outcome of ridiculous vanity, a monstrous growth of unrestricted autocracy.........The Divine Faith was a monument of Akbar's folly and not of his wisdom." Discuss critically.

Q. 4. Trace the growth of Akbar's religious ideas.

Q. 5. Give a brief account of Akbar's dealings with the Rajputs. How did this policy help in the consolidation of his Empire ?

Q. 6. "Akbar was the real founder of Mughal Empire." Discuss this with reference to his liberalism and his dealings towards his Hindu subjects.

Q. 7. Make an estimate of the character and achievements of Akbar the Great.

Q. 8. Critically examine Akbar's land revenue system. In what way did it differ from that of Sher Shah Suri ?

Q. 9. Write a careful account of Akbar's Mansabdari system, bringing out the distinction between Zat and Sawar rank.

Q. 10. Write short notes on the following :—

(*a*) Second Battle of Panipat.

(*b*) Adham Khan.

(*c*) Aziz Koka.

(*d*) Abul Fazl.

(*e*) Tan Sen.

(*f*) Todar Mall.

(*g*) Bir Bal.

(*h*) Tulsi Dass.

(*i*) Man Singh.

(*j*) Jesuit Missions to Akbar's Court.

امتحانی سوالات

۱- اکبر اعظم کے عہد حکومت میں وسعت سلطنت اور فتوحات کا مختصر حال بیان کیجئے۔

2- اکبر کے رائج کردہ دین الٰہی کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

3- "اکبر کا دین الٰہی اُس کی عقل مندی کی دلیل نہ تھا بلکہ اُس کی حماقت کی یادگار ہے۔ اُس کا رائج کردہ دین الٰہی مضحکہ خیز تھا اور شاہی غرور و تمکنت اور بے لگام مطلق العنانی کا نتیجہ تھا" تبصرہ کیجئے۔

4- اکبر کے مذہبی خیالات نے کیسے نشوونما پائی۔ اُس کے مذہبی خیالات

کی ارتقائی منزلیں واضح کیجیے۔

5- راجپوتوں سے اکبر کے سلوک کا حال قلمبند کیجیے۔ راجپوت پالیسی اُس کی سلطنت کے استحکام میں کس حد تک معاون ثابت ہوئی؟

6- "اکبر مغلیہ سلطنت کا اصلی بانی تھا" آپ کو اس رائے سے کس حد تک اتفاق ہے۔ اکبر کی آزادخیالی اور ہندو رعایا سے سلوک کو پیش نظر رکھ کر بحث کیجیے۔

7- اکبر کے کردار اور کارناموں کا جائزہ لیجیے۔

8- لگان اراضی سے متعلق اکبری نظام کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔ نیز یہ بتائیے کہ اکبری نظام شیرشاہی نظام سے کیسے مختلف تھا۔

9- اکبر کے رائج کردہ منصبداری نظام کا خاکہ کھینچیے اور ذات و سوار کے فرق کو واضح کیجیے۔

10- مندرجہ ذیل پہ مختصر نوٹ لکھیے:-

(ا) پانی پت کی دوسری لڑائی (ب) ادھم خان (ج) عزیز کوکہ (د) ابوالفضل (ھ) تان سین (و) ٹوڈرمل (ز) بیربل۔ (ح) تلسی داس (ط) مان سنگھ۔ (ی) جیسوئٹ تبلیغی مشن اور اکبری دربار۔

تیسواں باب

جہانگیر کا عہدِ حکومت

اکبر کی وفات کے سات روز بعد چوبیس اکتوبر ۱۶۰۵ء کو شہزادہ سلیم کی آگرہ میں تاجپوشی ہوئی اور اُس نے نورالدین محمد جہانگیر کا لقب اختیار کیا۔ ہندو اور یورپی مؤرّخین نے اُس کے عہدِ حکومت کو حقیر بنانے کی کوشش کی ہے اور اُس کی شراب نوشی و عشق و محبّت کے افسانوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ اُس کا عہد اکبر جیسا عظیم الشان یا شاہ جہان جیسا درخشاں نہیں ہے۔ ان دونوں عظیم المرتبت حکمرانوں کے مقابلے پر جہانگیر کا عہد بالکل معمولی معلوم ہوتا ہے شہنشاہ جہانگیر کا اہم ترین کام یہ ہے کہ اُس نے مذہب اسلام کی پاکیزگی کو قائم رکھا اور اسلامی معاشرے کو بگڑنے نہ دیا۔ جہانگیر نے اسلام کو دیگر مذاہب اور خاص طور پر ہندو مت میں جذب ہونے سے بچا لیا۔ مسلمان مؤرّخین اس بات پر متفق ہیں کہ جہانگیر نے اکبری دور کے الحاد کا سدّباب کیا۔ تخت نشین ہوتے ہی اُس نے متعدّد فرمان جاری کر کے اسلامی نظریات بحال کرنے کا اہتمام کیا۔ اُس نے مشاورت کے لئے علماء کی ایک کونسل بھی مقرّر کی

لیکن یاد رہے کہ جہانگیر تنگ نظر فرمانروا نہ تھا۔ اُس نے اکبر کی پالیسی کے مفید پہلو ترک نہ کئے۔ اُس نے اپنے باپ کی مانند رواداری اور انصاف سے کام لیا۔ ہندوؤں کو اعلےٰ عہدوں پر بحال رکھا اور راجپوتوں سے اکبر کی مانند عمدہ سلوک کیا۔ تخت نشینی سے قبل اُس نے خدمتِ اسلام کا عزم کیا تھا اور تخت حاصل کرتے ہی اُس نے اعلان کیا کہ اب کوئی کام شریعت اسلام کے خلاف نہ ہوگا۔ جہانگیر کی حکمرانی کی خوبی کی بہترین دلیل یہ ہے کہ اُس نے حدِّ اعتدال سے تجاوز نہ کیا۔ مذہب کی شیفتگی میں اُس نے ملّاؤں کو برسرِ اقتدار نہ آنے دیا اور نہ ہی الحاد و مذہبی بے راہ روی کو پنپنے دیا۔ حضرت مجدّد الف ثانی (شیخ احمد سرہندی) نے بھی جہانگیر کی مذہبی پالیسی کی تعریف کی ہے۔ اُس نے بائیس برس حکومت کی۔

ابتدائی احکام:۔ تخت نشین ہوتے ہی جہانگیر نے عام قیدیوں کو رہا کر دیا اور فراخ دلی سے کام لے کر اپنے اُن تمام دشمنوں کو معاف کر دیا جنہوں نے اُسے تخت سے محروم کرنے کے لئے سازش کی تھی۔ اُس نے خسرو کے تمام حامیوں کو بھی معاف کر دیا اور حسبِ وعدہ اُس نے مان سنگھ اور مرزا عزیز کوکہ کو بھی معاف کر کے اعلیٰ عہدوں پر بحال رکھا۔ اُس نے بہیمانہ سزائیں منسوخ کر ڈالیں۔ شراب کی فروخت بند کر دی (لیکن خود شراب نوشی سے باز نہ آیا) اُس نے درآمدی محصولات کو کم کر دیا تاکہ اشیاء سستی ہو جائیں۔ اُس نے تاجروں کو سہولتیں عطا کیں اور مزارعین کو جاگیرداروں کے ظلم سے

بجایا۔ یہ بھی حکم ہُوا کہ کوئی جاگیردار یا سرکاری افسر اپنے علاقے میں شاہی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتا۔ مزید سرکاری ہسپتال اور سرائیں تعمیر کرائی گئیں اور چوری چکاری و ڈاکہ زنی کو ختم کیا گیا۔

زنجیرِ عدل :۔ جہانگیر نے آگرہ کے قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ شاہ برج سے لے کر جمنا کے کنارے تک سونے کی زنجیر لٹکا دی جسے زنجیرِ عدل کہتے ہیں۔ جب کوئی فریادی اس زنجیر کو کھینچتا تھا تو شاہی محل میں گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں اور جہانگیر فوراً نمودار ہو کر داد رسی کرتا تھا۔ یہ بات یاد رہے کہ ملکی عدالتوں کا نظام باقاعدگی سے برقرار رہا۔ محض خاص حالات میں فریادی زنجیرِ عدل کھینچ کر بلا روک ٹوک شہنشاہ کی خدمت میں فریاد لے کر آتا تھا اور فوری انصاف طلب کر سکتا تھا۔ گویا زنجیرِ عدل کا کھینچنا رٹ (Writ) کی درخواست کے مترادف تھا۔ یہ امر مسلّم ہے کہ جہانگیر انصاف کا پتلا تھا۔ اُس نے عدل کرتے وقت ملکہ نور جہاں کا بھی رتّی بھر لحاظ نہ کیا۔

جہانگیر کی ابتدائی زندگی :۔ اکبر کے بچے چھوٹی عمر میں ہی مر جاتے تھے۔ آخرکار شیخ سلیم چشتی کی دعا سے شہزادہ محمد سلیم زندہ بچا۔ اکبر نے اُسے بڑے لاڈ پیار سے پالا۔ سلیم ۱۵۶۹ء میں پیدا ہُوا۔ اکبر اُسے پیار سے شیخو بابا کہا کرتا تھا۔ بچپن سے ہی سلیم کے لئے بہترین اتالیق مقرر ہوئے اور اُس کی تعلیم کا مناسب بندوبست ہُوا۔ عبدالرحیم خان خاناں بھی اُس کا اتالیق تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں شہزادہ سلیم نے تعلیم مکمل کر لی اور اکبر نے اُس کی شادی امبر کے راجہ

بھگوان داس کی لڑکی مان بائی سے کر دی۔ اُس کے بطن سے 1587ء
میں شہزادہ خسرو پیدا ہُوا جو اپنے باپ کی مانند حسین وجمیل تھا
دو سال بعد صاحب جمال کے بطن سے شہزادہ پرویز پیدا ہُوا۔
شہزادہ خرّم 1592ء میں ایک بیوی جگت گوسائیں کے بطن
سے پیدا ہُوا۔ جہانگیر کا سب سے چھوٹا بیٹا شہریار (نور جہان کی
پچھلگ لڑکی کا خاوند) 1605ء میں پیدا ہُوا۔ خسرو کی پیدائش
سے قبل جہانگیر نے شراب نوشی شروع کر دی تھی اور چند ہی سال
میں وہ پکا شرابی بن گیا تھا۔ جہانگیر ہر وقت شراب میں غلطاں
رہتا تھا۔ اِسی بنا پر اکبر اُس سے ناخوش تھا اور درباری اُمراء
نے اکبر کے کان بھرنے شروع کر دیئے تھے۔ خسرو کے ماموں
مان سنگھ اور اُس کے خسر مرزا عزیز کوکہ نے سازش کر کے اس امر
کی سر توڑ کوشش کی کہ اکبر خسرو کو اپنا ولیعہد نامزد کر دے۔
اُن کی کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں اور اکبر نے مرنے سے
قبل واضح طور پر جہانگیر کی ولیعہدی کا اعلان کر دیا۔ گذشتہ
صفحات میں بیان ہو چکا ہے کہ اکبر کے آخری ایّام میں جہانگیر
نے اُسے کافی پریشان کیا۔ ابوالفضل کو قتل کروا ڈالا اور باپ
کے خلاف بغاوت بھی کی۔ لیکن آخر کار باپ بیٹے میں صلح ہو گئی۔
جہانگیر کی شخصیّت :- جہانگیر لمبا تڑنگا اور خوش وضع نوجوان
تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک اور شگفتہ مزاجی مسحور کن تھی
اُس کی گفتگو میں مٹھاس تھی اور دل کو موہ لیتی تھی۔ اُس کا
رنگ صاف تھا اور جوانی میں وہ بڑی بڑی مونچھیں رکھتا تھا۔

شراب کی لت نے اُس کی صحت برباد کر دی۔ نیز جہانگیر نے کئی ایک شادیاں کیں۔ لیکن وہ وفا کا پتلا تھا۔ وہ اپنی تمام بیویوں سے محبت کرتا تھا۔ خسرو کی والدہ مان بائی اپنے بیٹے اور خاوند میں صلح نہ کروا سکی تو اُس نے خودکشی کر لی۔ جہانگیر کو مان بائی کی موت کا صدمہ ہوا اور وہ کئی روز سوگوار رہا۔ اسی طرح وہ پرویز کی ماں صاحب جمال کو بھی ہمیشہ یاد کرتا رہا۔ نور جہاں اُس کی تمام بیویوں کی نسبت زیادہ سلیقہ شعار، بذلہ سنج اور زیرک تھی جہانگیر بھی اُس کا عاشق زار بن گیا۔ ابتدا میں جہانگیر ورزش اور سیر و شکار کا شوقین تھا لیکن کثرت شراب نوشی سے اُس کی صحت برباد ہو گئی اور وہ دمہ کا مریض بن گیا۔ اس مرض سے تنگ آ کر وہ گرمیاں کشمیر میں بسر کرتا تھا اور سردیاں اکثر لاہور میں گزارتا تھا۔

جہانگیر نے کئی اُستادوں سے علم حاصل کیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے علاوہ وہ شائستگی اور ثقافت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اُسے فارسی، ترکی، عربی اور ہندی پر عبور حاصل تھا۔ فارسی اور ترکی میں وہ خوب مہارت رکھتا تھا۔ بابر کی مانند اُس نے اپنی زندگی کی سرگزشت لکھی ہے جس کا نام تزک جہانگیری ہے۔ اس کتاب سے جہانگیر کی علمیت، نظر کی گہرائی، راست بازی اور رائے کی پختگی ثابت ہوتی ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے جہانگیر کا اسلوب بیان شستہ ہے اور زبان کی سلاست و روانی حیران کن ہے۔ بابر کی مانند جہانگیر بھی ہر چیز کو بلا کم و کاست لکھ دیتا ہے اور اُس کا کردار تزک کی بدولت واضح ہو جاتا ہے۔ تزک جہانگیری کے مطالعہ سے یہ بات

عیاں ہوتی ہے کہ جہانگیر ادب اور موسیقی کا رسیا تھا۔ وہ شعر اور اس کے لوازمات کو سمجھتا تھا۔ بلکہ شاعرانہ دماغ اور مصورانہ آنکھ لے کر آیا تھا۔ وہ مناظرِ قدرت، مصوری، اور آرٹ کا دلدادہ تھا۔ اُسے فنِ تعمیر اور نقاشی کا بھی شوق تھا۔ اُسے کشمیر کے پھل اور پھول بہت پسند تھے۔ اُس نے کشمیر میں کئی ایک خوبصورت باغات لگوائے۔ وہ فنکار بادشاہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اُس نے کئی جانور بھی پال رکھے تھے۔

جہانگیر کو رعایا کی خوشحالی اور بہبودی کا بے حد خیال تھا۔ اُس نے زراعت، صنعت اور تجارت کو فروغ دیا۔ جوا حکماً بند کر دیا۔ جہانگیر نے بھنگ اور دیگر منشیات پر بھی پابندی لگا دی۔ اُس نے ہندوؤں میں دختر کشی اور ستی کی رسم بند کرنے پر کافی زور دیا۔ وہ رفاہی کاموں میں خوب دلچسپی لیتا تھا اور غریبوں و مسکینوں کی مدد کرتا تھا۔

جہانگیر فنونِ حرب سے بھی واقف تھا اور اعلیٰ نشانہ باز تھا۔ وہ تیر کمان اور بندوق سے ایک جیسا نشانہ لگاتا تھا۔ میواڑ اور کانگڑہ کی تسخیر میں اُس نے سپاہ گری کے جوہر دکھائے۔ لیکن جہانگیر کو عمدہ جرنیل گننا درست نہیں۔ اُس کے کردار کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ تن آسان اور عافیت کوش تھا۔ اُس نے اپنے عہدِ حکومت میں محض نظم و نسق چلانے اور امن و امان قائم رکھنے پر قناعت کی اُس کا عہدِ حکومت ہر لحاظ سے کامیاب تھا لیکن اکبر یا شاہ جہان کی مانند اُس کا زمانہ درخشاں نہ تھا۔ مؤرخین اُسے کمزور، تن آسان اور

زن مرید کہتے ہیں۔ اصلی بات یہ ہے کہ جہانگیر اپنی حسین و جمیل بیوی نورجہان کی صلاحیتوں اور قابلیت کا مدّاح بن کر اُس پر بے پناہ اعتماد کرنے لگا۔ اُس نے ملکہ کو اُمورِ سلطنت میں شریک کیا اور بعد ازاں خود محنت کرنے کی بجائے ہر کام اُس کے سپرد کیا۔

خسرو کے ساتھی:۔ شہزادہ خسرو نہایت حسین و جمیل اور اپنے دادا (اکبر) کا چہیتا تھا۔ مذہب میں وہ اکبر کی مانند آزاد روش کا حامی تھا، اس لئے غیر مسلم رعایا اسے پسند کرتی تھی۔ خسرو 1587ء میں جے پور کی شہزادی مان بائی (بھگوان داس کی لڑکی) کے بطن سے اس وقت پیدا ہوا جبکہ جہانگیر کی عمر صرف اٹھارہ (۱۸) برس تھی وہ راجہ مان سنگھ کا بھانجا اور عزیز کوکہ کا داماد تھا۔ ان طاقتور امراء کی پشت پناہی کے لئے راجپوت موجود تھے اور وہ لوگ بھی اُن کے ساتھ تھے جو اکبری دور کے الحاد کے حامی تھے۔ ان سب نے مل کر اکبر کو اُکسانا شروع کر دیا کہ جہانگیر شرابی اور لاپرواہ ہے اُس کی بجائے خسرو کو ولیعہد مقرر کیا جائے۔ اکبری دربار میں شہزادہ سلیم کی موافقت کے لئے بھی امراء کا ایک گروہ موجود تھا۔ یہ امراء مذہب اسلام کی پاکیزگی اور بحالی کے خواہاں تھے اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے مرید تھے۔ ان امراء میں سے عبدالرحیم خانخاناں، سید صدر جہاں، مہابت خان اور شیخ فرید بخاری (یعنی مرتضیٰ خان) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شہزادہ سلیم نے اُن کی موجودگی میں عہد کیا تھا کہ میں تخت نشین ہو کر اسلام کی حفاظت کروں گا۔ اکبر کے آخری ایام میں سلیم نے باپ کے خلاف بغاوت

بھی کی تھی۔ خسرو کی ماں نے باپ بیٹے میں صلح کرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی اور اُس نے شکستہ دل ہو کر سنہ ۱۶۰۴ء میں خودکشی کرلی۔ اُسے مغل مؤرخ شاہ بیگم کہتے ہیں جو اُس کا خطاب تھا۔ اکبر نے دانشمندی سے کام لے کر خسرو کی بجائے سلیم کو اپنا ولیعہد مقرر کیا۔

خسرو نے جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد بھی حصول تخت کے لئے کوشش جاری رکھی اور بغاوتیں کیں۔ چنانچہ اس نے جہانگیر کی تخت نشینی کے پانچ چھ ماہ بعد مارچ سنہ ۱۶۰۵ء میں پنجاب پہنچ کر بغاوت کے لئے فوج بھرتی کرلی اور سکھوں کے گورو ارجن سے مالی امداد لی۔ جہانگیر نے وقت ضائع کئے بغیر لاہور کا محاصرہ کرلیا اور خسرو کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ شہزادے کے حامیوں کو بھی سزائیں ملیں۔ گورو ارجن کو دو لاکھ روپیہ جرمانہ ہوا لیکن اُس نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کیا اور قید میں ڈال دیا گیا۔ وہیں اُس نے وفات پائی۔ گورو ارجن نے باغی شہزادے کی مدد کی تھی اس لئے سزا پائی۔ کوئی بھی حکومت باغیوں کے حامیوں کو معاف نہیں کرتی لیکن مؤرخین نے گورو ارجن کے متعلق واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ یہ غلط ہے کہ گورو ارجن کو جہانگیر نے قتل کروایا تھا۔ وہ قید خانے میں قدرتی موت مرا۔ خسرو کی ناکامی سے اکبری دور کے الحاد کی تحریک بالکل ختم ہو گئی اور اسلامی معاشرے کی شکل مسخ ہونے سے بچ گئی۔

خسرو کا انجام :۔ خسرو نے قید خانے میں بھی باپ کو قتل کروانے کی سازش کی لہٰذا اُسے اندھا کروا دیا گیا۔ لیکن اُس کے حامی

شرارت سے باز نہ آئے۔ ۱۶۱۵ء میں ایک جعلی شخص نے خسرو بن کر بغاوت کی اور پٹنہ پر قبضہ کر لیا۔ شاہی فوجوں نے اُسے گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ ۱۶۱۷ء میں خسرو کو اُس کے سوتیلے بھائی شہزادہ خرم (شاہجہان) کے حوالے کر دیا گیا۔ شہزادہ خرم جگت گوسائیں (جس کا دوسرا نام جودھا بائی تھا اور جو موٹا راجہ اُودھے سنگھ کی بیٹی تھی) کے بطن سے تھا۔ وہ خسرو سے پانچ سال چھوٹا تھا اور نورجہان کے بھائی آصف خان کا داماد تھا۔ شہزادہ خرم نے خسرو کو برہان پور میں مروا ڈالا لیکن باپ کو لکھ بھیجا کہ خسرو قدرتی موت مر گیا ہے۔ خسرو الہ آباد کے قریب خسرو باغ میں دفن ہے۔

ملکہ نورجہان:۔ اُس کا اصلی نام مہرالنساء تھا اور وہ مرزا غیاث بیگ کی بیٹی تھی۔ وہ تہران کا باشندہ تھا اور علمیّت و لیاقت میں یدطولیٰ تھا۔ ایرانی حکمرانوں کی مذہبی تنگ نظری کی بنا پر اُس نے ترک وطن کر کے ہندوستان کا رخ کیا اور اُس کے خاندان کے تمام افراد نے بے سروسامانی کی حالت میں سفر کیا۔ اُن کا قافلہ جب قندھار پہنچا تو مہرالنساء پیدا ہوئی۔ عین اُن دنوں ایک امیر تاجر ملک مسعود کا قافلہ وہاں سے گذرا۔ ملک مسعود نے مرزا غیاث بیگ کی حالت زار دیکھ کر اُس کی مدد کی اور اُسے اپنے ساتھ ہندوستان لے آیا۔ اُس کی وساطت سے مرزا غیاث کو اکبر کے دربار میں رسائی ہوئی اور ۱۵۷۷ء میں اُسے محکمۂ مال میں ایک معمولی سی نوکری مل گئی۔ مرزا غیاث بیگ نے اپنی لیاقت کی بدولت خوب

ترقی کی اور اُسے دیوان بیوتات یعنی شاہی کارخانوں کا نگران وزیر بنا دیا گیا۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اُسے مزید ترقی ملی اور اُسے اعتمادالدولہ کا خطاب بھی ملا۔ مرزا غیاث بیگ کا بیٹا ابوالحسن (آصف خان) بھی شاہی منصبدار بنا۔

1594ء میں جب مہرالنساء کی عمر سترہ برس کی ہوئی تو مرزا غیاث بیگ نے اپنی لڑکی کی شادی ایک ایرانی فوجی جوان علی قلی خان استجلو سے کر دی۔ اس نوجوان نے اپنی فوجی قابلیت کی بنا پر خوب ترقی کی اور اُسے بنگال میں جاگیر عطا ہوئی۔ 1599ء میں وہ شہزادہ سلیم کا محافظ (ADC) بن گیا۔ اُسی سال شہزادہ سلیم نے اُس کی بہادری سے خوش ہو کر شیر افگن کا خطاب دیا۔ 1605ء میں تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے شیر افگن کو بنگال کا نائب گورنر بنا دیا۔ چند ماہ بعد جہانگیر کو شک گذرا کہ شیر افگن خسرو کے حامیوں سے ساز باز کر رہا ہے اور سرکشی پر آمادہ ہے۔ چنانچہ جہانگیر نے بنگال کے گورنر قطب الدین کو لکھا کہ شیر افگن کو عہدے سے ہٹا کر شاہی دربار میں بھیج دیا جائے۔ شیر افگن بھنّا اُٹھا اور اُس نے قطب الدین کو خنجر گھونپ کر مار ڈالا۔ شیر افگن کو قطب الدین کے ملازموں نے قتل کر ڈالا اور اُسے باغی قرار دے کر اُس کا سامان لوٹ لیا اور اُس کی بیوہ مہرالنساء اور اُس کی کم سن بیٹی لاڈلی بیگم کو بھی (جو شیر افگن کی نسل سے تھی) گرفتار کر کے شاہی دربار میں بھیج دیا۔ یہ بات یاد رہے کہ قطب الدین سے قبل مان سنگھ بنگال کا گورنر تھا۔ جہانگیر

نے بنگال جیسے اہم صوبے سے مان سنگھ کو تبدیل کر دیا اور اپنے معتمد خاص قطب الدین کو بنگال کا گورنر بنایا۔ اُن دنوں شیر افگن بردوان میں منصبدار تھا اور اُس نے واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی کی تھی قطب الدین نے اُسے اپنے کیمپ میں بلوایا تھا اور شاہی حکم اُسے سنایا تھا۔ قطب الدین نے اس موقع پر شیر افگن کی مناسب توقیر نہ کی تھی۔ اس لئے مشتعل ہو کر شیر افگن اور اُس کے دو ساتھیوں نے قطب الدین کو قتل کر ڈالا تھا۔ قطب الدین کے کیمپ سے شیر افگن کا بچ کر نکل جانا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا قطب الدین کے فوجیوں نے اُسے بھی مار ڈالا اور بادشاہ کی خدمت میں یہ رپورٹ بھیجی کہ شیر افگن باغی ہو گیا تھا اور قطب الدین کو قتل کرنے کے بعد خود بھی مارا گیا۔ مغلیہ دستور کے مطابق باغی کی بیوہ اور اُس کی بیٹی کو گرفتار کر کے شاہی دربار میں بھیج دیا گیا۔

جہانگیر نے مہر النساء اور اُس کی بیٹی کو اپنی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کے حوالے کر کے شاہی سرپرستی میں لے لیا۔ اس عمل سے مراد یہ تھی کہ شیر افگن کی خدمات کے پیش نظر اُس کے خاندان سے عمدہ سلوک کیا گیا۔ چار سال بعد ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے مہر النساء سے شادی کر لی اور اُسے نور محل کا خطاب دیا۔ بعد ازاں اس خطاب کو بدل کر اُسے نور جہاں کا خطاب ملا اور وہ بادشاہ کی چہیتی ملکہ بن گئی۔

نور جہاں کی صفات:۔ جہانگیر سے شادی کے وقت نور جہاں چونتیس برس کی تھی لیکن وہ حسن و جمال کی پیکر تھی۔ جہانگیر نے پہلی بار

اُس کے حسن سوگوار کو ۱۶۰۷ء میں شاہی دربار میں دیکھا جب وہ ایک باغی سردار کی بیوہ کی حیثیت سے پیش ہوئی۔ قیاس یہ ہے کہ جہانگیر اُس پر عاشق ہو گیا اور اُس نے مہرالنساء کو اُس کے باپ یا بھائی کے سپرد کرنے کی بجائے (جو اُن دنوں شاہی دربار میں منصبدار تھے) اپنی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کی مقرّب بنا دیا چار سال کی مدّت گذرنے کے بعد بھی مہرالنساء کی شوخی و دلربائی میں فرق نہ آیا اور جہانگیر نے اس باکمال بیوہ کو اپنی ملکہ بنا لیا۔ ملکہ نور جہاں زود فہم اور زیرک تھی۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں وہ بے مثال تھی۔ ملکہ کی خوش مزاجی۔ خوش پوشی، نت نئے فیشن سے بادشاہ اُس کا متوالا بن گیا۔ تزئین اور آرائش میں نور جہاں خوب ماہر تھی۔ جہانگیر کی فنکارانہ طبیعت اور ذوق کو ان اُمور سے خوب تسکین ہوتی تھی۔ نیز ملکہ نور جہاں بھی جہانگیر کی مانند شعر و شاعری، موسیقی اور مصوّری کی دلدادہ تھی۔ اس سے نور جہاں کی شخصیّت میں مزید کشش پیدا ہوئی۔ نور جہاں نے اپنی لیاقت اور انتظامی صلاحیّت سے بھی بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا۔ جہانگیر اُس کے مشوروں پر عمل کرنے لگا اور قلیل عرصے کے بعد سلطنت کے تمام اُمور ملکہ کو سونپ دیئے۔ جہانگیر کو اپنی ملکہ پر اسقدر بھروسہ تھا کہ اُس نے تن آسانی کی زندگی اختیار کر لی اور نور جہاں کو سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ پورے گیارہ برس (۱۶۲۲ء تک) ملکہ نور جہاں نے تمام انتظامی معاملات کو نہایت خوبی سے نپٹائے اور اپنی دانشمندی و لیاقت کا ثبوت دیا۔ وہ ملکی سیاست پر چھا گئی۔

ڈاکٹر بینی پرشاد کی رائے یہ ہے کہ شادی کے بعد پورے گیارہ سال ملکہ نور جہاں اس بنا پر ملکی سیاست پر حاوی رہی کہ شاہی دربار میں اُس کے قریبی رشتہ دار کلیدی اسامیوں پر فائز تھے اور اُس سے پورا تعاون کرتے تھے۔ اُس کے باپ کو اعتماد الدولہ کا خطاب مل چکا تھا اور وہ اعلےٰ منصب پر فائز تھا۔ نور جہاں کا بھائی آصف خان وزیر تھا۔ نور جہاں کی بھتیجی ارجمند بانو (جس نے بعد ازاں ممتاز محل کا خطاب پایا) ۱۶۱۲ء میں شہزادہ خرّم سے بیاہی گئی۔ پس نور جہاں کی فوقیت کا راز دراصل اُس کے قریبی رشتہ داروں کی سربلندی میں پنہاں تھا۔ ۱۶۲۲ء کے بعد نور جہاں نے شہزادہ خرّم کی سرپرستی ترک کرکے اپنے داماد شہر یار (جہانگیر کی لاڈلی بیگم کے خاوند) کو ولیعہد بنانا چاہا۔ اس سے شاہی دربار سازشوں کا مرکز بن گیا۔ مہابت خان اور دیگر اُمراء بادشاہ کو ملکہ کے چنگل سے آزاد کرکے ذاتی سربلندی کے خواہاں تھے۔ آصف خان اور شہزادہ خرّم ملکہ نور جہاں کے حامی نہ رہے۔ جہانگیر کی موت تک نور جہاں نے شہر یار کے لئے بہت تگ ودو کی لیکن وہ اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ ملکہ نور جہاں دوسرے دور میں (۱۶۲۲ء تا ۱۶۲۷ء) بے حد خود سر اور اقتدار کی بھوکی ہو گئی تھی۔ لہٰذا شہزادہ خرم نے حصولِ تخت کے لئے بغاوت کی۔ کئی اُمراء اُس سے مل گئے۔ آخر کار مہابت خان جیسا وفادار جرنیل بھی ملکہ سے کبیدہ خاطر ہو کر بغاوت پر آمادہ ہوا۔

نور جہاں ۱۶۲۲ء تک اپنے بھائی کے داماد شہزادہ خرّم پر

خوب مہربان تھی لیکن جہانگیر کی زندگی کے آخری پانچ سالوں میں
اُس نے شہزادہ خرّم کو راستے سے ہٹا کر اُس کے سوتیلے بھائی
شہریار کی سرپرستی شروع کردی کیونکہ وہ اُس کا اپنا داماد تھا
وہ شہریار کو جہانگیر کے بعد بادشاہ بنانا چاہتی تھی۔ ملکہ کی
کوششوں سے ملکی سیاست بداعتمادی اور سازشوں کا شکار ہو
گئی۔ شہزادہ خرّم کی ناکام بغاوت کے بعد جب 1625ء میں
باپ بیٹے میں صلح ہو گئی اور خرّم نے اپنے دو بیٹے (دارا اور
اورنگ زیب) بطور ضمانت شاہی دربار میں بھیج دیئے تو نورجہان
نے شہزادہ خرم اور اس کے خسر (یعنی اپنے بھائی آصف خان)
پر بھروسہ کرنا شروع کردیا اور اب اُسے یہ خدشہ پیدا ہوا کہ
مہابت خان شہزادہ پرویز کو تخت دلانے کا حامی ہے۔ لہٰذا اُس
نے مہابت خان اور پرویز کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی
مہابت خان 1627ء میں شکست کھا کر بھاگ اُٹھا اور اُس نے
شہزادہ خرّم کی ملازمت اختیار کرلی۔ اس اثنا میں آصف خان
چپ سادھ کر اپنے داماد خرّم کے لئے راستہ ہموار کرتا رہا۔ جہانگیر
نے اٹھائیس اکتوبر 1627ء میں کشمیر سے لاہور آتے ہوئے وفات
پائی۔ شہریار نے فوراً تخت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن لاہور
کے قریب شکست کھا کر مارا گیا۔ داماد کی وفات کے بعد نورجہان
نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ شاہ جہان نے اُسے دولاکھ
روپے سالانہ وظیفہ عطا کیا۔ نورجہان نے اپنے وظیفے سے یتیم اور
نادار عورتوں کی خوب مدد کی اور 1645ء میں وفات پائی

اُس کا مقبرہ لاہور میں ہے۔ اس مقبرے کو سکھوں کے زمانۂ اقتدار میں کافی نقصان پہنچا۔

نور جہان کی عظمت:- نور جہان عظیم الشان ملکہ تھی۔ اپنے خاوند کے لئے وہ نعمت تھی۔ اُس نے انتظام سلطنت کا بوجھ سنبھال کر جہانگیر کو کافی سکھ دیا ورنہ اُس کی صحت بہت جلد بگڑ جاتی۔ ملکہ کے زیرِ اثر جہانگیر نے شراب نوشی آہستہ آہستہ کم کر دی نور جہان نے شاہی دربار کی شان و شوکت کو بڑھایا اور علمی سرپرستی میں خاوند کا ہاتھ بٹایا۔ ملکہ کی لیاقت اور انتظامی صلاحیت بلند پایہ تھی۔ جہانگیر اُس کی صفات کا مداح تھا اور اُس پر فریفتہ تھا۔ ملکہ نت نئے فیشن ایجاد کرتی تھی۔ گلاب کا عطر ملکہ نور جہان نے ایجاد کیا۔ پان پر چونا لگا کر عمدہ اور بہتر رنگ پیدا کرنے کا طریقہ ملکہ کی فہم و فراست کا نتیجہ ہے زنانہ کپڑوں پر رنگدار پھولوں کی بیل چھاپنا اُس کی سرپرستی میں شروع ہوا۔ الغرض نور جہان یکتائے روزگار اور باکمال ملکہ تھی۔ اقتدار کی ہوس کے باوجود تاریخ اُس کی عظمت کی قائل ہے۔ ثقافت اور نفاست میں نور جہان نے گہرے اثرات پیچھے چھوڑے ہیں۔

نور جہان کے بارے میں افسانے:- نور جہان کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں کئی ایک غلط افسانے درج ہیں۔ سب سے زیادہ ظلم مولوی محمد حسین آزاد نے کیا ہے۔ اُس نے شہزادہ سلیم اور مہر النساء کے عشق کا افسانہ گھڑ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

مینا بازار میں ایک روز شہزادہ سلیم گھوم رہا تھا کہ پھول توڑنے کی غرض سے اُس نے اپنے دونوں کبوتر پاس سے گزرنے والی لڑکی مہرالنساء کو پکڑا دئے۔ جب شہزادہ سلیم پھول توڑ کر واپس آیا تو دیکھا کہ ایک کبوتر لڑکی کے ہاتھ سے چھوٹ کر پرواز کر چکا ہے۔ سلیم نے جب پوچھا کہ ہمارا کبوتر کہاں ہے تو مہرالنساء نے کہا کہ اُڑ گیا ہے، سلیم نے پوچھا کہ کیسے؟ تو مہرالنساء نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا اور کہا کہ ایسے! سلیم اس معصومیّت اور حسن پر فدا ہو گیا۔

اکبر نے سلیم کے عشق کو ناپسند کیا اور مہرالنساء کی شادی ایک ایرانی نوجوان علی قلی استجلو سے کردی جو معمولی فوجی افسر تھا۔ افسانہ نگار یہ لکھتے ہیں کہ سلیم نے علی قلی کو مروانا چاہا لیکن ناکام رہا اور مجبوراً اُسے شیر افگن کا خطاب دیا۔ بادشاہ بنتے ہی سلیم نے شیر افگن کو مروا ڈالا اور مہرالنساء سے شادی کرلی۔

مؤرّخین نے اس قصّے کو سراسر غلط قرار دیا ہے۔ مندرجہ ذیل حقائق کے پیشِ نظر یہ کہانی بالکل غلط ثابت ہو جاتی ہے:۔

(۱) جہانگیر نے اپنی زندگی کے تمام واقعات کو تزک جہانگیری میں بالتفصیل بیان کیا ہے لیکن مہرالنساء سے ابتدائے شباب میں عشق کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کبوتروں اور مینا بازار کا قصہ سراسر غلط ہے۔ جہانگیر نے پہلی بار مہرالنساء کو اُس کے بیوہ ہونے کے بعد دیکھا اور اُس وقت وہ اُس کا عاشق زار بنا۔ بعض مؤرّخین کی رائے یہ ہے کہ

مہرالنساء اور اُس کی لڑکی لاڈلی بیگم کو سلیمہ بیگم (جہانگیر کی سوتیلی ماں) کی سرپرستی میں دے دیا گیا تھا۔ وہاں جہانگیر نے جشن نوروز کے دن مارچ ۱۶۱۱ء میں مہرالنساء کو شیرافگن کی موت کے چار سال بعد پہلی بار دیکھا اور اُس کے حُسن کا پرستار بن کر مئی ۱۶۱۱ء میں اُس سے شادی کر لی۔ تزک جہانگیری میں مہرالنساء کے بیوہ ہو جانے کے بعد اُس کا ذکر ملتا ہے۔

(۲) اگر سلیم شروع سے ہی مہرالنساء کا عاشق تھا تو اکبر کو بھلا اس شادی پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اکبر آزاد خیال تھا اور سلیم سے محبّت کرتا تھا۔ نیز مہرالنساء کا باپ اعلیٰ خاندان سے تعلّق رکھتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ باپ اپنے لاڈلے بیٹے کی خواہش کو نظرانداز کر کے ایک معمولی فوجی علی قلی سے مہرالنساء کی شادی کر دے۔ نیز یہ کیسے ممکن تھا کہ سلیم کا رقیب اس کا مصاحب (یعنی ADC) بنا رہے۔

(۳) سلیم اگر چاہتا تو شہزادگی کے زمانے میں ہی نہایت آسانی سے علی قلی خان کو مروا سکتا تھا۔ مہرالنساء سے عشق کے باوجود تخت نشینی تک انتظار کرنا لایعنی معلوم ہوتا ہے۔ اگر سلیم ابوالفضل جیسے بااثر انسان کو قتل کروا سکتا تھا تو علی قلی خان کو ختم کروانا تو اور بھی آسان تھا۔ لہٰذا شکار کے بہانے شیر سے لڑوانا اور مجبور ہو کر اُسے شیرافگن کا خطاب دینا، سب کچھ افسانے میں رنگ بھرنے کے مترادف ہے۔

(۴) ابوالفضل سمیت کسی ہم عصر مؤرّخ نے سلیم اور مہرالنساء

کے عشق کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ابوالفضل کے تعلقات سلیم سے اچھے نہ تھے، وہ کبھی اس قصّے کو فراموش نہ کرتا۔ نیز عیسائی مبلّغین بھی اس عشق کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ جہانگیر نے مہرالنساء کو ابتدائے شباب میں دیکھنے کی بجائے پہلی بار اس کو بیوہ ہونے کے بعد دیکھا۔ ڈاکٹر بینی پرشاد بھی اس رائے سے متفق ہیں۔

(۵) ڈاکٹر ایشوری پرشاد کا خیال یہ ہے کہ جہانگیر نے شیر افگن کی موت کے بارے میں تزک جہانگیری میں جو الفاظ تحریر کئے ہیں اُن سے شک پیدا ہوتا ہے کہ شہنشاہ کی نیّت میں فتور تھا۔ نیز یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ بیوہ ہو جانے کے بعد مہرالنساء کو جہانگیر کی سوتیلی ماں سلیمہ کے سپرد کیا گیا حالانکہ اُس کا باپ اور بھائی زندہ تھے اور شاہی ملازم تھے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ان دنوں مغلیہ دستور کے مطابق شاہی نمک خواروں کے بچوں کو شاہی سرپرستی میں لے لیا جاتا تھا۔ اسی دستور کے مطابق مہرالنساء کو جہانگیر نے سلیمہ بیگم کی مقرب (Lady in waiting) بنا دیا۔

اصل واقعات:۔ گزشتہ صفحات میں ہم اصل واقعات بیان کر چکے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ جہانگیر نے مہرالنساء کو پہلی بار ۱۶۰۷ء میں بیوہ ہونے کے بعد دیکھا اور اُس کے حسن سوگوار سے متاثر ہو کر اُس پر عاشق ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جہانگیر نے بعد ازاں اپنی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کے ہاں اُس کی مقرّب

(مہر النساء) کو دیکھ کر پسند کر لیا ہو اور اُس سے شادی کر لی ہو۔ مینا بازار اور کبوتروں والا قصّہ سراسر غلط ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اگر سلیم کا عشق شہزادگی کے دنوں میں پیدا ہُوا ہوتا تو مہرالنساء کا حصول اُس کے لئے مشکل نہ تھا۔ پس مولوی محمد حسین آزاد نے تاریخی حقائق کو مسخ کر دیا ہے اور بعض مؤرّخین نے (خاص طور پر ہندو اور انگریز مؤرّخین نے) افسانوی واقعات کو بلا وجہ اُچھالا ہے۔

انارکلی کا افسانہ:۔ جہانگیر کے بارے میں انارکلی کا افسانہ بھی لوگوں نے گھڑ لیا ہے۔ فلمسازوں نے بھی انارکلی نامی کنیز سے شہزادہ سلیم کے ناکام عشق کو عوام کے ذہنوں پر مسلّط کر دیا ہے۔ مروّجہ قصّہ یہ ہے کہ انارکلی اور سلیم کے عشق کو شہنشاہ اکبر ناپسند کرتا تھا لہٰذا لونڈی کی موت کا حکم صادر ہُوا۔ عوام یہ سمجھتے ہیں کہ انارکلی لاہور میں سیکرٹریایٹ کے دفاتر کے اندر مدفون ہے۔ یہ قصّہ بے بنیاد ہے۔

اصلی بات یہ ہے کہ جہانگیر کی ایک بیوی صاحب جمال تھی جو پرویز کی ماں تھی۔ وہ زین خان کوکہ کی لڑکی یا بھانجی تھی۔ اور اعلےٰ خاندان سے تعلّق رکھتی تھی۔ اُس نے جہانگیر کے بادشاہ بننے سے قبل وفات پائی اور لاہور میں انارکلی باغ میں دفن ہوئی۔ یہ باغ شہزادہ سلیم کو بے حد پسند تھا اور ضلع کچہری سے کچھ دور واقع تھا۔ اس کے قریب وہ مشہور ٹیلہ تھا جہاں بابا فریدؒ نے چلّہ کشی کی تھی۔ صاحب جمال اس باغ میں دفن کی

گئی اور اُس کی قبر پر ایک خوبصورت گنبد اب تک موجود ہے مقبرے کی عمارت کو انگریزی دور سے بطور ریکارڈ آفس استعمال کیا جارہا ہے۔ صاحب جمال کی قبر کا تعویذ اب تک موجود ہے سکھوں کے زمانۂ اقتدار میں انار کلی باغ برباد ہوا۔ بعد ازاں باغ کے تمام حصّے پر عمارتیں بن گئیں۔ صاحب جمال کا مقبرہ سرکاری دفتر کی چار دیواری میں آگیا اور ریکارڈ آفس بن گیا۔ لاہور میں ایک بازار پرانی انارکلی کہلاتا ہے۔ یہ بازار قدیم انارکلی باغ کے نام پر ہے۔

صاحب جمال سے جہانگیر بے پناہ محبّت کرتا تھا۔ صاحب جمال کے مقبرے پر جو اشعار جہانگیر نے لکھوائے اُن سے جہانگیر کی محبّت ٹپکتی ہے۔ تزک جہانگیری میں شہنشاہ جہانگیر نے صاحب جمال کی بہت تعریف کی ہے۔ اُس نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ صاحب جمال جیسی گرم جوشی، اُنس اور ملاطفت جہانگیر کو کسی دوسری بیوی سے حاصل نہیں ہوئی۔ افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس صاحب جمال کا نام بھول چکے ہیں اور عوام بھی گمراہ ہو کر صاحب جمال کے مقبرے کو انارکلی نامی لونڈی کا مقبرہ شمار کرتے ہیں :-

جہانگیر کے عہد کی فوجی مہمّیں :

جہانگیر کا عہد فوجی کارناموں کے لحاظ سے گو اتنا درخشاں نہیں ہے لیکن چند فوجی مہمّیں قابلِ ذکر ہیں :-

(۱) **بنگال اور اُڑیسہ کی مکمل تسخیر:۔** بنگال اگرچہ اکبری دور سے مغلیہ سلطنت میں شامل تھا لیکن وہاں افغانوں کی سرکشی کا خاتمہ نہ ہُوا تھا۔ مان سنگھ نے افغانوں کو اُڑیسہ سے نکال دیا تھا لیکن انہوں نے سلہٹ میں جمع ہو کر مغلوں کے خلاف محاذ بنا لیا تھا اور بنگال کے بڑے بڑے زمینداروں سے اتحاد کر کے مغلوں کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ بنگال کے زمیندار 'بڑا بھوئیاں' کہلاتے تھے۔ جہانگیر نے اسلام خان چشتی کو بنگال کے افغانوں اور زمینداروں کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ اسلام خان نے مسلسل فوجی کارروائیوں سے باغیوں کو مطیع کیا اور جہانگیر نگر یعنی ڈھاکہ کو بنگال کا صدر مقام بنایا تا کہ انتظامِ سلطنت میں آسانی ہو۔ ۱۶۱۲ء میں افغان سردار عثمان خان مارا گیا اور سلہٹ پر بھی مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ جہانگیر نے افغانوں سے نہایت اچھا سلوک کیا اور اس طرح اُن کے دلوں سے مغلوں کی عداوت ختم کر دی افغانوں کو اعلیٰ عہدے عطا ہوئے اور وہ سلطنت مغلیہ کے جاں نثار خادم بن گئے۔ جہانگیر نے دولت خان لودھی کے بیٹے خان جہاں لودھی کو ہفت ہزاری ذات و سوار کا منصب عطا کیا اور اسے دکن کا گورنر بنا دیا۔ دلاور خان افغان کو چار ہزاری ذات و سوار کا منصب عطا ہُوا اور اسے لاہور کا گورنر بنایا گیا۔ جہانگیر کے عہد سے افغان پورے طور پر مغلوں سے گھل مل گئے اور مغلوں کی راہ سے ایک اہم مصیبت دور ہوئی۔ افغانوں کے بارے میں جہانگیر کی حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی اور

اس نے دانائی اور فراخ دلی سے کام لے کر افغانوں کو جو اس کے دشمن تھے، اپنا جانثار خادم بنا لیا۔

(۲) میواڑ سے جنگ:۔ اکبر کے عہد میں چتوڑ کے رانا پرتاپ نے ہلدی گھاٹ کے مقام پر شکست کھائی تھی لیکن ہتھیار ڈالنے کی بجائے وہ پہاڑوں میں چھپ گیا تھا اور بعد میں مغلوں کو تنگ کرتا رہا۔ جہانگیر کے عہد میں رانا پرتاپ کے بیٹے امر سنگھ نے میواڑ کی آزادی کے لیے مغلوں کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا جہانگیر نے تخت نشینی کے فوراً بعد میواڑ کی کامل تسخیر کا عزم کیا۔ پورے آٹھ سال تک کئی مقتدر مغل جرنیل رانا امر سنگھ کے خلاف مصروف پیکار رہے لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ امر سنگھ کے سپاہی گوریلا جنگ کے ماہر تھے اور سامنے آ کر مغلیہ فوج کا مقابلہ نہ کرتے تھے۔ شہزادہ پرویز، آصف خان، جعفر بیگ، مہابت خان اور شہزادہ خرم یکے بعد دیگرے میواڑ میں پہنچ کر قسمت آزمائی کرتے رہے۔ آخر کار ۱۶۱۴ء میں شہزادہ خرم نے میواڑ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور کئی گاؤں کو نذر آتش کر کے امر سنگھ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ صلح کے بعد جہانگیر نے ریاست میواڑ کو اپنی سرپرستی میں لے کر آزاد رہنے دیا اور چتوڑ کا شہر بھی رانا امر سنگھ کو عطا کیا۔ رانا کے بیٹے کرن کو پنج ہزاری منصب عطا کیا۔ میواڑ کے راجپوت بھی جہانگیر کے عہد سے مغلوں کے مطیع ہو گئے، لیکن اس ریاست کے حکمرانوں نے مسلمانوں سے رشتے ناطوں سے اجتناب کیا۔

(۳) کانگڑہ کی تسخیر:- ۱۶۲۰ء میں جہانگیر نے کانگڑہ کی تسخیر پر پنجاب کے گورنر مرتضیٰ خاں کو مامور کیا لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ آخر کار شہزادہ خرم کو اس مہم پر بھیجا گیا جس نے چودہ ماہ کے طویل محاصرے کے بعد کانگڑہ کا قلعہ فتح کر لیا۔ جہانگیر اس فتح بہت خوش ہوا۔ ۱۶۲۱ء میں وہ خود کانگڑہ گیا اور جوالا مکھی پہاڑ پر قربانی کا حکم دیا۔ اس نے کانگڑہ کے قلعے کے اندر ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ جہانگیر کو کانگڑہ کی فتح پر ہمیشہ ناز رہا۔ اکبر کے عہد میں کانگڑہ فتح نہ ہو سکا تھا۔

(۴) کشتواڑ کی فتح:- اکبر کے زمانے میں کشمیر اگرچہ فتح ہو چکا تھا لیکن کشتواڑ کا علاقہ تا حال آزاد تھا۔ جہانگیر کے عہد میں (۱۶۲۰ء میں) دلاور خان نے کشتواڑ کے راجہ کو شکست دی۔ راجہ نے مغلیہ دربار میں حاضر ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ کچھ عرصے کے بعد کشتواڑ کی رعایا نے اپنے راجہ کے ظلم وستم کے خلاف بغاوت کی۔ کئی ماہ کی فوجی کارروائی کے بعد کشتواڑ کے علاقے میں مغلوں نے امن وامان بحال کیا۔

(۵) جہانگیر کی دکنی پالیسی:- اکبر کے زمانے میں خاندیش کے علاوہ احمد نگر کے کچھ علاقے پر مغلوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ جہانگیر نے تمام دکن کو مغلیہ سلطنت میں شامل کرنے کی غرض سے وسعت پذیری کی پالیسی اختیار کی۔ احمد نگر کے علاوہ اس کی نظر بیجاپور اور گولکنڈہ پر بھی تھی۔ ۱۶۰۸ء میں اس نے عبدالرحیم خانخاناں کو دکن کی تسخیر کے لئے بارہ ہزار سواروں

کے ساتھ بھیجا۔ عبدالرحیم خانخاناں اچھا جرنیل تھا اور اس نے احمد نگر فتح کرنے کی پوری کوشش کی، لیکن ریاست کے حبشی وزیر ملک عنبر کی تنظیمی اور دفاعی لیاقت کے سامنے مغلیہ فوج کی کچھ پیش نہ گئی۔ احمد نگر پر نظام شاہی خاندان کی حکومت تھی۔ ملک عنبر نے گوریلا جنگ سے مغلوں کو بہت تنگ کیا۔ نیز اس نے مرہٹہ سپاہیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر کے ان سے خوب کام لیا جہانگیر نے شہزادہ پرویز کو محاذ جنگ پر بھیج کر مغلیہ فوج کا دل بڑھایا اور آصف خان کو شہزادے کا نگران بنا کر ساتھ بھیجا شہزادے کو سرکاری طور پر خاندیش اور برار کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ چار سال جنگ ہوتی رہی۔ خان جہاں لودھی اور عبداللہ خاں جیسے فوجی دماغوں کو بھی دکن بھیجا گیا لیکن ملک عنبر کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی اور گوریلا جنگ کے مقابلے پر مغل فوج ہمت ہار بیٹھی۔

۱۶۱۱ء میں مغلوں نے احمد نگر پر ہر جانب سے یلغار کی ٹھانی۔ سکیم یہ بنائی گئی کہ ایک ہی وقت میں عبداللہ خان گجرات کی جانب سے اور خان جہاں لودھی، مان سنگھ اور امیر الامراء مہابت خان خاندیش کی جانب سے حملہ کر کے ملک عنبر کا صفایا کر دیں۔ یہ سکیم عمدہ تھی لیکن عبداللہ خان نے جلد بازی سے کام لیا اور باقی جرنیلوں کی افواج کا انتظار کئے بغیر حملہ بول دیا اور شکست کھا کر پسپا ہوا۔ اس پر جہانگیر سخت ناراض ہوا اور اس نے دوبارہ خانخاناں کو دکن کی تسخیر پر مامور کیا۔

اس نے چند ایک فتوحات ضرور حاصل کیں لیکن احمد نگر پر قابض نہ ہو سکا۔ مغلیہ جرنیل ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور ان میں تعاون مفقود تھا۔

آخر کار ملکہ نور جہان کے مشورے پر عمل کر کے جہانگیر نے ۱۶۱۵ء میں شہزادہ پرویز کو الہ آباد کا گورنر بنا دیا اور شہزادہ خرم کو شاہ سلطان کا خطاب عطا کر کے دکن بھیجا۔ وہ خود مانڈو میں مقیم ہوا تا کہ مغلیہ فوج کا دل بڑھائے۔ شہزادہ خرم عظیم الشان فوج لے کر جب دکن پہنچا تو احمد نگر کے حکمران نے ڈر کے مارے مغلوں سے ۱۶۱۶ء میں صلح کر لی۔ سلطان عادل شاہ بذات خود تحفے تحائف لے کر شہزادہ خرم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اطاعت قبول کی۔ بالا گھاٹ کے علاقے کے علاوہ احمد نگر کا قلعہ بھی مغلوں کے حوالے ہوا۔ جہانگیر نے خوش ہو کر شہزادہ خرم کو "شاہ جہان" کا خطاب عطا کیا۔ یہ صلح نامہ محض سطحی تھا کیونکہ ملک عنبر کی طاقت کچلی نہ جا سکی تھی۔ محض شہزادہ خرم کی عظیم الشان فوج کے ڈر سے دکنی ریاست نے صلح کر لی تھی دو تین سال کے بعد جنگ دوبارہ چھڑ گئی۔

۱۶۲۰ء میں بیجا پور اور گولکنڈہ سے مل کر ملک عنبر نے احمد نگر کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ مغلیہ فوج جو ان دنوں خانخاناں کے زیر کمان تھی، گوریلا جنگ سے عاجز آ کر پیچھے ہٹ آئی۔ مغلوں کو مجبوراً برہان پور اور مانڈو تک پسپا ہونا پڑا۔

آخر شاہجہان کو دوبارہ دکن کی افواج کی سالار بنایا گیا

لیکن اُن دنوں کانگڑہ کا محاصرہ جاری تھا لہٰذا شہزادہ کو دکن جانے میں تاخیر ہوئی۔ اُجین پہنچ کر شہزادہ خرم نے ابوالحسن اور بیرم بیگ کی سرکردگی میں مانڈو کی جانب فوجی دستے بھیجے تاکہ مرہٹوں کی سرکوبی کر کے اُن کو احمد نگر کی حمایت سے باز رکھا جائے۔ مغلیہ فوج کو اس امر میں پوری کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد شہزادہ خرم کی فوج فتوحات کرتی ہوئی احمد نگر تک جا پہنچی جہاں مغل فوج محصور تھی۔ جب شہزادہ خرم کی فوج پٹن تک پہنچ گئی (جہاں سے نظام شاہی حکمران کے نئے پایۂ تخت کھیکھری پر ضرب لگائی جا سکتی تھی)، تو ملک عنبر نے صلح کی درخواست کی۔ شہزادہ خرم کے لئے لازم تھا کہ صلح کرنے کی بجائے دکنی ریاست کو کچل کر ہمیشہ کے لئے یہ مصیبت ختم کر دیتا لیکن ان دنوں نورجہاں شہزادہ خرم کی مخالف ہو چکی تھی اور وہ دہلی کے تخت کا وارث بننے کی فکر میں تھا۔ پس اس نے صلح کو غنیمت جانا اور سنہ ۱۶۲۱ء کے صلح نامے کی رو سے مغلوں کو سابقہ علاقے (بالا گھاٹ اور احمد نگر کے شہر کے نواحی علاقے) واپس مل گئے۔ ریاست احمد نگر نے چند مزید اضلاع مغلوں کو دئے جن کا لگان چودہ لاکھ تھا۔ احمد نگر نے ۱۲ لاکھ روپے خراج ادا کیا، بیجاپور نے 18 لاکھ اور گولکنڈہ نے بیس لاکھ روپے خراج دینا منظور کیا۔ بعد ازاں جب شہزادہ خرم نے باپ کے خلاف بغاوت کی تو ملک عنبر نے کافی علاقہ مغلوں سے چھین لیا۔ ملک عنبر نے سنہ 1626ء میں وفات پائی

ریاست احمد نگر کے نئے سالار حمید خان نے بالا گھاٹ کا علاقہ مغل گورنر خان جہان لودھی سے خرید لیا۔ پس دکن میں طویل جنگ کے باوجود مغلوں کو خاص فائدہ یا قطعی اقتدار حاصل نہ ہو سکا، یعنی جہانگیر کی دکنی مہم ناکام رہی۔

(۶) قندھار کا قضیہ اور ایران کے صفوی شاہان سے مغلوں کے تعلقات:۔ بابر کے زمانے سے ایران کے صفوی حکمرانوں اور مغلوں کے مابین گہری دوستی چلی آتی تھی۔ دونوں حکمران ایک دوسرے کی جانب تحفے تحائف اور سفیر بھیجا کرتے تھے۔ ایرانی شہنشاہ طہماسپ نے ہندوستان میں ہمایوں کی سلطنت بحال کرنے کے لئے اُسے بارہ ہزار فوج دی تھی۔ مغل شہزادگان اس احسان کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے اور دونوں ملکوں کے تعلقات خوشگوار تھے۔ البتہ مغل شہنشاہ اپنے آپ کو صفویوں سے برتر سمجھتے تھے کیونکہ اُن کی سلطنت وسیع تھی اور ملکی وسائل زیادہ تھے۔

سولھویں صدی کے آخر سے قندھار پر فوقیت حاصل کرنے کے خیال سے دونوں ملکوں کے تعلقات خوشگوار نہ رہے اور فوجی کارروائیوں اور چال بازیوں سے ہر ملک نے اس کلیدی شہر پر قابض ہونے کی مسلسل کوشش کی۔ قندھار عمدہ فوجی اڈہ تھا اور یہاں سے ایران یا وسط ایشیا کی جانب سے ہندوستان پر حملہ ہو سکتا تھا اور کابل پر قبضہ جمانا تو بالکل آسان تھا پس اُن دنوں قندھار ہندوستان کے دفاع کے لیے پہلا اہم

مقام تھا اور مغل حکمران قندھار کی فوجی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

تجارتی لحاظ سے بھی قندھار کی اہمیت کم نہ تھی۔ یہ شہر اہم تجارتی شاہراہوں پر واقع تھا۔ ایران، ہندوستان، ترکی اور وسط ایشیا کے تاجر یہاں تجارت کرتے تھے اور یورپ کی تجارت بھی اسی راستے سے ہوتی تھی۔

بابر نے 1522ء میں قندھار پر قبضہ کر لیا تھا لیکن ہمایوں کی وفات کے بعد 1558ء میں یہ شہر مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ایرانی شہنشاہ نے قندھار شاہ حسین مرزا کی تحویل میں دے دیا تھا۔ 1594ء میں اکبر نے قندھار پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

شاہ عباس صفوی جہانگیر کا ہم عصر تھا اور وہ قندھار پر قبضہ کرنے کے لئے بے قرار تھا۔ 1606ء میں جب خسرو نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تو شاہ عباس نے چالبازی سے قندھار پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ مغلوں کے خلاف خود نبرد آزمائی کرنے کی بجائے اُس نے خراسان کے سرداروں کو اکسا کر قندھار پر حملہ کروا دیا۔ قندھار کے مغل گورنر شاہ بیگ خان نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن محصور ہو گیا۔ 1607ء میں جہانگیر نے مرزا غازی کی کمان میں ایک زبردست فوج بطور کمک قندھار بھیجی۔ ایرانی افواج پسپا ہو کر خراسان بھاگ گئیں۔

شاہ عباس کی سیاست: قندھار سے ایرانیوں کی پسپائی کے بعد ایرانی حکمران شاہ عباس نے مکرو فریب (اور سیاست) سے کام لیا۔ اُس نے جہانگیر کو گراں قدر تحفے بھیج کر یہ لکھا کہ اُس کے علم

اور اجازت کے بغیر خراسان کے ایرانی افسروں نے قندھار پر حملہ کر دیا تھا جس کا ایرانی شہنشاہ کو سخت افسوس ہے۔ شاہ عباس نے یہ بھی لکھا کہ اُس نے خراسان کے آزاد قبائل کو سرکشی کی کافی سزا دی ہے۔

جہانگیر بے فائدہ جنگ مول لینا نہ چاہتا تھا لہٰذا اُس نے بھی شاہ ایران کو خیر سگالی اور دوستی کے پیغام بھیجے اور یہ لکھا کہ شاہ ایران جہانگیر کے بھائی کی مانند ہے۔ شاہ عباس کی اصلی چال یہ تھی کہ امن و امان اور برادرانہ فضا کی بدولت مغل قندھار کے دفاعی استحکام سے غافل ہو جائیں اور ایرانی فوج مناسب وقت پر اس اہم شہر پر آسانی سے قبضہ جمالے۔ ۱۶۱۱ء میں شاہ عباس کا سفیر آگرہ پہنچا اور تحفے تحائف پیش کرنے کے بعد اس نے اکبر کی وفات کا افسوس بھی کیا (حالانکہ اکبر کو فوت ہوئے چھ سال ہو چکے تھے)۔ ایران کی جانب سے اس کے بعد دوستی اور خیر سگالی کے کئی مشن ہندوستان میں آئے۔ ایرانیوں کا اصل مدعا ہمیشہ یہی رہا کہ مغل غافل ہو کر قندھار کا مکمل دفاع نہ کریں۔ پہلا ایرانی سفارتی مشن جہانگیر کے دربار میں ۱۶۱۵ء میں آیا، دوسرا مشن ۱۶۱۷ء میں اور تیسرا ۱۶۲۰ء میں آیا۔ ظاہری طور پر ایران اور ہندوستان کے مابین برادرانہ روابط قائم تھے لیکن درحقیقت ایرانی قندھار کے حصول کے لئے موقع کی تاک میں تھے۔

۱۶۲۱ء میں جب ایرانیوں کو معلوم ہوا کہ ہندوستان کی ملکی سیاست تخت کی وراثت کے سوال پر اُلجھ چکی ہے اور نورجہان نے شہزادہ خرم کی بجائے شہریار کی سرپرستی شروع کر دی ہے تو شاہ عباس نے اس نزاع سے فائدہ اُٹھا کر قندھار کی تسخیر کے لئے ایک زبردست

فوج بھیج دی (۱۶۲۲ء)۔ یہ افواہ بھی زوروں پر تھی کہ ایران کی ایک اور فوج ٹھٹہ پر حملہ کرنے کی غرض سے آرہی ہے۔ جہانگیر اُن دنوں کشمیر میں تھا۔ اُس نے شہزادہ خرم کو لکھا کہ وہ فوراً دکن سے روانہ ہو کر قندھار پہنچ جائے۔ لیکن شہزادہ خرم سخت برگشتہ تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ نور جہاں نے اُسے ہندوستان سے باہر بھجوانے کا جال بچھایا ہے تاکہ اپنے داماد شہریار کو ولیعہد بنا سکے۔ چنانچہ شہزادہ خرم نے شاہی احکام ماننے کی بجائے بغاوت کا علم بلند کیا۔

قندھار کو ایرانی فوج نے پینتالیس (۴۵) دن کے محاصرے کے بعد فتح کر لیا۔ شاہ عباس نے جہانگیر کو خط لکھ کر اپنی روش کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی اور بے بنیاد عذر پیش کیے۔ جوابی خط میں جہانگیر نے شاہ عباس پر بے وفائی اور ریاکاری کا الزام لگایا۔

جہانگیر اس کے بعد خرم کی بغاوت کے پیش نظر قندھار کی بازیابی کے لئے فوج نہ بھیج سکا اور قندھار ایرانیوں کے قبضے ہی میں رہا۔ شاہجہان کے عہد حکومت میں قندھار کا قضیہ پھر پیدا ہوا۔ اس بار شاہجہان نے ایرانیوں کو جھانسا دے کر قندھار پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ اس کی تفصیلات شاہجہانی دور میں بیان ہوں گی۔

(۷) شہزادہ خرم کی بغاوت:۔ ۱۶۲۲ء میں شہزادہ خرم نے قندھار کی مہم پر روانہ ہونے کی بجائے ٹال مٹول سے کام لیا تاکہ نور جہاں اس کی غیر حاضری میں اپنے داماد شہریار (جو شہزادہ خرم کا سوتیلا بھائی تھا) کو ولیعہد نہ بنوا دے۔ نور جہاں بھی چپ رہنے والی عورت نہ تھی۔ اُس نے جہانگیر کو برہم کر کے خرم کی جاگیر ضبط کروا دی۔ خرم نے باپ کو

لکھا تھا کہ مجھے پنجاب کی گورنری عطا کی جائے اور میرے بیوی بچوں کے لئے رنتھمبور کا قلعہ دیا جائے۔ میں برسات کے موسم کے بعد قندھار کی مہم پر روانہ ہو جاؤں گا۔ حصار سمیت خرم کی ضبط شدہ جاگیر شہریار کو عطا ہوئی اور اس کے مناصب میں بھی اضافہ کر کے اسے قندھار کی مہم پر بھیج دیا گیا۔ ان حالات میں خرم نے بغاوت کر دی نورجہاں نے احتیاطی تدابیر اختیار کر کے اپنے بھائی آصف خان کو آگرہ بھجوا دیا تاکہ وہ اپنے داماد خرم کی حمایت نہ کر سکے۔ نیز اس نے کابل سے بہترین مغل جرنیل مہابت خان کو بلوا کر شہزادہ خرم کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ قندھار اب مغلوں کے قبضے سے نکل چکا تھا۔

نورجہاں نے شہزادہ خرم کا مقابلہ کرنے کے لئے بہار سے شہزادہ پرویز کی فوج طلب کر لی اور راجپوتانے کی ریاستوں سے بھی فوری طور پر فوجی مدد طلب کی۔ نورجہاں نے مرزا عزیز کوکہ کو بھی راضی کر لیا اور باغی شہزادے سے نہ ملنے دیا۔ ملکہ جہانگیر کو لے کر دہلی پہنچی اور پھر خرم کے صدر مقام مانڈو کی جانب روانہ ہوئی تاکہ فوجی انتظامات شاہی نگرانی میں مکمل ہو سکیں۔

ادھر خرم نے فوری طور پر فتح پور سیکری اور آگرہ پر قبضہ جمانے کی کوشش کی لیکن دونوں مقامات پر شکست کھائی۔ اس دوران میں پرویز اور مہابت خان کی فوجوں نے خرم کا پورے طور پر تعاقب کیا۔ اسیر گڑھ پہنچ کر خرم نے ملک عنبر سے مدد حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ان دنوں خرم کی کافی فوج اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ عبدالرحیم خانخاناں کو اس نے مہابت خان کے پاس صلح کے لئے بھیجا لیکن

خانخاناں بھی خرم کا ساتھ چھوڑ کر دوسری پارٹی سے مل گیا۔ شہزادہ خرم تاپتی اور تلنگانہ ہوتا ہوا بنگال جا پہنچا، جہاں اس نے شاہی گورنروں کو شکست دے کر بنگال اور اڑیسہ پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں خرم نے بہار اور جونپور پر بھی قبضہ کر لیا۔

اب خرم کی سکیم یہ تھی کہ الہ آباد اور اودھ پر قبضہ کر کے آگرہ کی جانب بڑھے تاکہ جہانگیر سے اپنی مرضی کی شرائط منوا سکے لیکن مہابت خان کی فوج نے خرم کو بنگال کی جانب مار بھگایا۔ وہاں سے وہ دکن بھاگ گیا لیکن مہابت خان سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتا رہا۔ برہان پور اور بالا گھاٹ سے پسپا ہو کر خرم بیمار پڑ گیا اور اُس کے بہترین جرنیل عبداللہ خاں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ حالات سے مجبور ہو کر خرم نے مہابت خان سے صلح کر لی، اپنے کئے پر پشیمان ہوا اور باپ سے معافی مانگ لی۔ جہانگیر نے اُسے معاف کر دیا لیکن نور جہاں کے کہنے پر خرم نے اپنے دو بیٹے دارا اور اورنگ زیب بطور ضمانت شاہی دربار میں بھیج دئیے۔ پس شہزادہ خرم کی بغاوت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور تین سال تک مغلیہ افواج ایک دوسرے کے خلاف لڑتی رہیں۔ اپریل 1626ء میں شہزادہ خرم اور جہانگیر کا ملاپ ہو گیا۔

(۸) **مہابت خان کی بغاوت:۔** شہزادہ خرم کی بغاوت فرو کرنے میں مہابت خان نے نمایاں کام کیا تھا اور اُس نے شہزادہ پرویز کی سرپرستی بھی شروع کر دی تھی۔ نور جہاں کو مہابت خان کا بڑھتا ہوا اقتدار ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ خرم کی طاقت

ٹوٹ چکی ہے لہٰذا پرویز کو شاہی تخت دلانے کا حامی اور شہریار کا اصلی رقیب اب مہابت خان ہے۔ نور جہان نے اپنے بھائی آصف خان (دیوان سلطنت) کی مدد سے مہابت خان کے اقتدار کو ختم کرنے کی ٹھانی اور شہزادہ پرویز اور مہابت خان کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی غرض سے جہانگیر سے یہ احکام صادر کروادئے کہ مہابت خان فوراً بنگال جاکر اُس صوبے کے گورنر کا عُہدہ سنبھالے۔ اسی دوران میں دیوان سلطنت کی رپورٹ پر مہابت خان سے سابقہ جنگی کارروائیوں کا حساب مانگا گیا اور ہر طریقے سے اُس کی تذلیل کی گئی۔ مہابت خان نور جہان کے سیاسی غلبے کو ناپسند کرتا تھا اور شہزادہ پرویز کی خاطر جہانگیر کو نور جہان کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ ۱۶۲۶ء میں مہابت خان اپنی فوج سمیت شاہی دربار میں حاضر ہونے کی نیّت سے اور اپنے معاملات سمجھانے کی غرض سے جہلم تک آیا جہاں سے بادشاہ کابل روانہ ہونے کے لئے تیار تھا۔ مہابت خان کے ساتھ پانچ ہزار راجپوت سپاہی تھے جو اُس کے وفادار تھے۔ نور جہان کے ایماء پر مہابت خان کی مزید تذلیل کی گئی اور اُس کے داماد کو محض اس لئے شاہی دربار میں ذلیل کیا گیا کہ مہابت خان نے اپنی لڑکی کی شادی شاہی اجازت کے بغیر کردی تھی۔ مہابت خان یہ بے عزتی برداشت نہ کرسکا اور اُس نے اپنی فوج کی مدد سے بادشاہ کو حراست میں لے لیا، لیکن شاہی عزت برقرار رہی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بادشاہ اب نور جہان کی بجائے مہابت خان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا جو اپنی فوج کے بل بوتے پر بادشاہ سے اپنی مرضی کے

احکام نافذ کرواتا تھا۔

نورجہان نے اپنی دانش مندی سے گہری چال چلی اور مہابت خان کے فوجی اقتدار کو ختم کر کے دم لیا۔ ابتدا میں نورجہان نے مہابت خان کو شکست دینے کی ناکام کوشش کی۔ بعد میں اُس نے اپنی مرضی سے بادشاہ کے ساتھ نظربندی قبول کر لی۔ مہابت خان سمجھا کہ شاہی جوڑا اُس کے رحم وکرم پر ہے اور اصلی اقتدار مہابت خان کے پاس رہے گا۔ چند ماہ امور سلطنت مہابت خان کی مرضی کے مطابق جہانگیر کے حکم سے چلتے رہے۔ آصف خان جیسا طاقتور وزیر بھی اٹک کے قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ جب جہانگیر نے کابل جانا چاہا تو مہابت خان بادشاہ اور ملکہ کو اسی نظربندی کی حالت میں اپنی فوج سمیت وہاں لے گیا۔ بادشاہ یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ مہابت خان کی مرضی کے مطابق ہر حکم نافذ کرتا ہے لیکن پس پردہ نورجہان نے مہابت خان کی فوج کو اُس سے الگ کر کے اُسے بے یار و مددگار بنا دیا۔ نیز کابل سے واپسی پر نورجہان نے مزید شاہی فوج بھرتی کر لی۔ شاہی فوج کے معائنے کے بہانے رہتاس کے قریب جہانگیر مہابت خان کی فوج سے الگ ہو گیا اور پورے طور پر اُس کے چنگل سے آزاد ہو گیا۔ اس مقام پر جہانگیر کے پاس طاقتور شاہی فوج تھی۔ نیز ان چند ماہ میں نورجہان کے حسن تدبّر اور سازشی دماغ کی بدولت مہابت خان کی پانچ ہزار فوج کے بے شمار راجپوت سپاہی اُس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اپنے آپ کو رہتاس کیمپ کے قریب کمزور اور بے یار و مددگار پا کر مہابت خان بھاگ کھڑا ہوا اور اس نے دکن جا کر ۱۶۲۷ء میں شہزادہ خرم کی ملازمت اختیار کر لی۔ اسی سال جہانگیر

نے ۲۹ اکتوبر 1627ء کو وفات پائی اور نور جہان کو مہلت نہ ملی کہ مہابت خان کا سر کچل سکے۔ مہابت خان کے تمام قضیے میں اصل جھگڑا اس بات کا تھا کہ جہانگیر کے تخت کا وارث کون ہو۔ مہابت خان شہزادہ پرویز کا سرپرست تھا، آصف خان ظاہری طور پر اپنی بہن ملکہ نور جہان کے ساتھ تھا لیکن دراصل اپنے داماد شہزادہ خرم کے لئے زمین ہموار کر رہا تھا۔ نور جہان نے اُس پر بھروسہ کیا اور آخرکار زک اُٹھائی۔ البتہ مہابت خان کے خلاف بہن بھائی نے مل کر کام کیا۔ نور جہان جہانگیر کے بعد اپنے داماد شہریار کو تخت پر بٹھانے اور اصل اقتدار اپنے پاس رکھنے کے لئے بے تاب تھی۔ مہابت خان بھی خود سر تھا، وہ نور جہان کے غلبے کو توڑنے کے لئے کوشاں ہوا لیکن محض فوجی دماغ ہونے کی وجہ سے مناسب حدود کو پھاند گیا اور بادشاہ کو قلیل عرصے کے لئے اپنے قابو میں رکھ کر سلطنت کا "انتظام" کیا۔ اپنی سادگی کی بدولت وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ شاہی جوڑے کی محض نظربندی کافی نہیں اور نہ ہی فوجی طاقت کی بدولت جہانگیر کو اپنی مرضی کے تابع رکھنا طویل عرصے کے لئے ممکن ہے۔ نیز نور جہان کی دانشمندی سے وہ مات کھا گیا اور یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ بادشاہ اپنی بیوی کے بے پناہ اثر سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا اور وہ محض بے بسی کی حالت میں مہابت خان کی مرضی کے مطابق احکام نافذ کرتا ہے۔ جوں ہی شاہی فوج اور جہانگیر کا رابطہ قائم ہوا، مہابت خان کو خود اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور اُس کی وفادار فوج، مکمل طور پہ اُس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

جہانگیر کے بارے میں مورخین کی رائے

ڈاکٹر تری پاٹھی کی رائے یہ ہے کہ "جہانگیر علوم وفنون اور آرٹ کا سرپرست تھا۔ اس کے عہد میں مصوری بامِ عروج پر پہنچی۔ فنِ تعمیر میں زیبائش اور آرائش کے نئے انداز وضع ہوئے۔ نیز ادب میں خوب گہما گہمی رہی۔"

"Jahangir was a patron of arts and literature. It was in his reign that the art of painting reached its highest water-mark, that new elements were added to architectural decorations, and literature maintained its vitality."........

(۲) ڈاکٹر سری واستوا نے جہانگیر پر یوں تبصرہ کیا ہے:۔

(۱) "جہانگیر اعلیٰ ادبی ذوق رکھتا تھا۔ اسے شاعری۔ فنِ تعمیر۔ موسیقی مصوری اور دیگر فنونِ لطیفہ سے دلی لگاؤ تھا۔ نیز وہ علم حیوانات۔ ادویات اور نباتات میں بھی گہری دلچسپی رکھتا تھا۔"

"A man of great literary taste and love of poetry, architecture, music, painting and other fine arts, it was remarkable that he, at the same time, had genuine interest in serious subjects like Botany, Zoology and Medicine.".....

(ب) "جہانگیر انتظامی تدابیر اور حکمرانی میں کافی حد تک کامیاب تھا۔ لیکن وہ اعلےٰ سیاست دان یا معمار قوم نہ تھا۔ نت نئے اور اہم اصلاحات نافذ نہ کرسکا۔ اُس میں اکبر جیسی خداداد لیاقت نہ تھی اور نہ ہی بلند عزائم تھے لیکن اُس نے اکبر کے دور کی انتظامی مشینری کو برقرار رکھا۔"

"Jahangir was a fairly successful ruler and administrator ....But he was not a great constructive statesman who could initiate great administrative reforms.........He did not possess high idealism and genius of Akbar. The administrative machinery of his father was allowed to remain practically untouched."

(ج) ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے یوں ہے کہ:-

"عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جہانگیر تن آسان۔ ظالم اور عیش پسند تھا۔

لیکن الزامات بے بنیاد ہیں۔ وہ نہایت زیرک اور ہوشمند تھا۔ اور سلطنت کے مشکل ترین مسائل کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس کے کردار میں گوناگوں صفات ایسی ہیں جن کی بدولت اُسے تاریخ ہند کی دلکش شخصیت گِنا جاتا ہے۔"

"The ordinary view that he was a sensual pleasure-seeker and a callous tyrant does him less than justice. All accounts agree that he was intelligent, shrewd and capable of understanding the most complex problems of the State without any difficulty.........There is much in his character that entitles him to be placed among the most fascinating personalities of Indian History."

۴) ایس۔ لین پول یوں رقمطراز ہیں:۔

"اپنے کردار کی خامیوں کے باوجود جہانگیر بے عقل نہ تھا۔ وہ ذہین اور ہوشمند تھا اور اکبر کی اختیار کردہ رواداری اور انتظامی تدابیر کو برقرار رکھ کر اُس نے عقلمندی کا ثبوت دیا۔

"Inspite of his vices.........he was no fool ; he possessed a shrewd intelligence, and he showed his good sense in carrying on the government and principle of toleration inaugurated by Akbar."

(۵) ڈاکٹر سمتھ کی رائے یہ ہے کہ "جہانگیر متضاد صفات کا مالک تھا۔ اُس کے کردار میں نرم دلی اور جبر و استبداد کی آمیزش تھی۔ وہ منصف مزاج تھا لیکن خود غرض بھی تھا۔ وہ سلجھا ہوا ضرور تھا لیکن اُس کے کردار سے وحشیانہ صفات بھی جھلکتی تھیں۔ اُس میں اُوچھا پن بھی تھا اور وہ سلیقہ شعار و ہوشمند بھی تھا۔"

"A strange compound of tenderness and cruelty, justice and caprice, refinement and brutality, good sense and childishness."

(۶) جہانگیر کے بارے میں ڈاکٹر بینی پرشاد کی رائے کافی دلچسپ ہے۔ جہانگیر کے بارے میں یہ تصوّر کرنا کہ وہ شراب میں ڈوبا رہتا تھا یا سنگدل اور ظالم تھا یا عیش و عشرت کا دلدادہ تھا، سراسر ناانصافی ہے۔ تاریخی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ جہانگیر کی شہرت اس لئے کم دکھائی

دیتی ہے کہ اُس کے باپ کا دور شاندار تھا اور اُس کے بیٹے کی عظمت آنکھوں کو چکاچوند کردیتی ہے۔ غیر ملکی سیاحوں کی غلط تحریروں اور تاریخی واقعات گھڑ لینے کے ماہرین نے جہانگیر پر کافی ظلم روا رکھا ہے۔ جہانگیر کی زندگی کا صحیح جائزہ لینے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ ہوشمند۔ نرم دل۔ منصف مزاج اور فیاض تھا۔ اُس کے عہد حکومت میں ملک کو امن و امان اور خوشحالی نصیب ہوئی۔ نیز فارسی اور مقامی زبانوں کے ادیبوں اور شعراء کی کثرت نے اُس کے زمانے کو درخشاں بنادیا تھا۔"

"It is at once unscientific and unjust to dismiss him (Jahangir) as a hard-hearted, fickle-minded tyrant, soaked in wine and sunk in debauchery......*His fame has been eclipsed by the transcendent glory of his father and the dazzling splendour of his son.* His memory has suffered from the implicit faith reposed in historical forgeries and travellers' tales.........From a review of his life as a whole, he comes out a sensible, kind-hearted man with strong family affections and unstinted generosity to all, with a burning hatred of oppression and passion for justice.........His reign was fruitful of peace and prosperity to the empire.........A host of remarkable Persian and vernacular poets all over the country combined to make the period the Augustan age of mediaeval Indian literature."

جہانگیر کے عہد کی خامیاں:۔ مورخین نے بلاوجہ جہانگیر کے کردار کی "خامیوں" پر زور دیا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ اس کے کردار سے عظمت اور بلندی جھلکتی ہے۔ بعض مورخین نے اسے "بیدار مغز شرابی" (Talented Drunkard) کا خطاب دیا ہے۔ بعض یہ لکھتے ہیں کہ نورجہاں کا اثرورسوخ اس کے عہد کی خرابیوں کا باعث بنا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نورجہاں کی لیاقت اور سلیقہ شعاری نے شہنشاہ کو ملکہ کا گرویدہ بنا لیا اور جہانگیر نے امور سلطنت اسے سونپ دئے۔ لیکن چند سال کے بعد نورجہاں نے شہزادہ خرم کی بجائے اپنے

داماد شہریار کو تخت نشین کرانے کے لئے تگ و دو شروع کردی - اس سے شاہی دربار سازشوں کا مرکز بن گیا - واقعات جہانگیر کے تتمہ میں یہ لکھا ہے کہ "نورجہاں سلطنت کے سیاہ و سفید کی مالک تھی البتہ خطبہ جہانگیر کے نام کا پڑھا جاتا تھا"

جہانگیر کے عہد کی چند خامیاں بھی توجہ طلب ہیں - اُس زمانے میں فتوحات کا سلسلہ ختم ہو گیا - سلطنت کو مزید وسعت نصیب ہونے کی بجائے قندھار جیسا اہم فوجی اور تجارتی اڈہ مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا - اس کی وجہ محض یہ تھی کہ درباری سازشیں حد سے بڑھ گئی تھیں اور شہزادہ خرم و نورجہاں کے مابین کشیدگیوں میں روز افزوں ترقی ہو رہی تھی - قندھار کے بچاؤ کی نسبت ہر سیاسی پارٹی حصول اقتدار کے لئے مضطرب تھی -

جہانگیر کے زمانے میں شاہی منصبداروں کی تعداد بے تحاشا بڑھ گئی - اس سے شاہی خزانے پر بے جا بوجھ پڑ گیا - مؤرخین حیران ہیں کہ جہانگیر کے دور میں فتوحات کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن منصبداروں کی تعداد بڑھ کر ۲۹۴۱ ہو گئی حالانکہ اکبر کی وفات پر منصبداروں کی کل تعداد محض آٹھ سو تھی - جہانگیر نے تن آسانی کی بدولت ملکی آمدنی بڑھانے کی جانب توجہ مبذول نہ کی - اس کے برعکس وہ سلطنت کے اخراجات پورے کرنے کے لئے باپ کا جمع کردہ خزانہ صرف کرتا رہا - دوسرے لفظوں میں جہانگیر کے دور سے اُمراء کی فوقیت کا زمانہ شروع ہوا - نیز منصبداری نظام میں اہم خرابیاں شروع ہوئیں اور منصبدار بھی دولت کی زیادتی کی بنا پر عیش کوشی

بن گئے۔ ہم عصر مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جہانگیر کے دور میں شاہی ملازمین کو رشوت ستانی کا چسکا پڑ گیا تھا، شہنشاہ نے اس برائی کے قلع قمع کے لئے کوئی اقدام نہ کیا۔ سر ٹامس راؤ اور دیگر عیسائی سیاحوں نے شاہی دربار کا گھناؤنا نقشہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ "نذرانے" کے نام پر شاہی دربار میں بھی رشوت چلتی تھی۔ ہماری رائے یہ ہے کہ عیسائی سیاحوں کی تحریریں مبالغے سے بھرپور ہیں۔ البتہ جہانگیر کے دور میں فیشن پرستی کو عروج ہوا۔ معیار زندگی مصنوعی طور پر بلند ہو گیا۔ شاہی دربار کی شان و شوکت ایرانی اثرات کی بدولت مزید بڑھ گئی اور ہندوستان کے لوگ دیگر ممالک کی اشیاء خریدنے کے شوقین بن گئے۔ یہ امور ملکی خوشحالی کو برقرار نہ رکھ سکے۔ جہانگیر کے دور کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ ایرانی اُمراء کو حد سے زیادہ فوقیت حاصل ہو گئی۔ اُن کی اجارہ داری کی بدولت شاہی منصبداروں میں اہلیت کے اصول قائم نہ رہے اور مختلف شعبوں کی کارکردگی میں فرق رونما ہوا۔

یورپی اقوام سے جہانگیر کے تعلقات:۔ جہانگیر کے عہدِ حکومت میں پرتگیزوں کی طاقت زوال پذیر ہوئی۔ دیگر یورپی اقوام (خاص طور پر انگریزوں اور ولندیزوں) نے مشرق کا رخ کیا اور ہندوستان میں تجارتی مراعات کے حصول کے لئے سر توڑ کوشش کی۔ جہانگیر کی تخت نشینی سے قبل پرتگال کے عیسائی مبلّغین (Jesuists) ہندوستان میں وارد ہو چکے تھے۔ اکبر کے عہد میں انہوں نے مذہبی مباحثوں میں بھی شرکت کی تھی۔ شہزادہ سلیم ان مبلّغین

کا دوست سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد جہانگیر نے پرتگیزوں سے دوستانہ مراسم برقرار رکھے اور ۱۶۰۷ء میں پرتگیزی مشن پن ہیرو (Father Pinheiro) کی سرکردگی میں گوا پہنچا لیکن ۱۶۱۳ء میں پرتگیزوں نے سورت کے قریب چار شاہی جہازوں کو لوٹ کر جہانگیر کو برافروختہ کر دیا۔ شاہی حکم سے سورت کے گورنر مقرب خان نے پرتگیزوں کی سمندری طاقت کا صفایا کر ڈالا اور اُن کی تمام مراعات منسوخ ہوئیں۔ پرتگیزوں کو مغلیہ سلطنت سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ لاہور اور آگرہ کے پرتگیزی گرجے بند کر دئے گئے اور مشہور عیسائی مبلغ جیروم ایکسی ور (Father Jerome Xavier) کو زندان میں ڈال دیا گیا۔ آخر کار پرتگیزوں کا دماغ ٹھکانے لگا اور انہوں نے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی کی۔ ۱۶۱۵ء میں پرتگیزوں کو معافی عطا ہوئی۔ لیکن پرتگیزوں کی طاقت بحال نہ ہو سکی۔ وجہ یہ تھی کہ پرتگال اور سپین کے اتحاد کے بعد پرتگیزوں کی توجہ منتشر ہو گئی۔ اُن کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں اور وہ مذہبی جھگڑوں میں اُلجھ کر رہ گئے اور انگریزوں یا ولندیزوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ۱۶۱۷ء میں پادری جیروم ایکسی ور نے وفات پائی۔ ایک سال بعد یعنی ۱۶۱۸ء میں پن ہیرو (Pinheiro) بھی فوت ہوا۔

انگریزوں کی آمد:۔ اگست ۱۶۰۸ء میں برطانوی شہنشاہ جیمز اوّل کا خط لے کر انگریزی سفیر کیپٹن ولیم ہاکنز (Hawkins) سورت پہنچا۔ اپریل ۱۶۰۹ء میں وہ تحفے تحائف لے کر شاہی دربار

میں حاضر ہوا۔ وہ تین برس تک مغلیہ دربار میں رہا۔ ہاکنز ترکی اور فارسی زبانیں جانتا تھا لیکن وہ اپنی قوم کے لئے مراعات حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ وجہ یہ تھی کہ پرتگیزی رومن کیتھولک مبلّغین انگریزوں کے رقیب تھے اور اُن کی بدولت مغلیہ دربار میں ہاکنز کی پیش نہ گئی ہاکنز ۱۶۱۱ء میں واپس انگلستان چلا گیا۔ ہاکنز کے بعد یکے بعد دیگرے دو اور انگریز پال کیننگ اور ولیم ایڈورڈز جیمز اوّل کے خطوط لے کر ہندوستان پہنچے لیکن مراعات حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ یعنی پرتگیزی رقیبوں سے مات کھا کر واپس ہوئے۔

سر ٹامس راؤ:۔ ۱۶۱۵ء میں برطانوی سفیر سر ٹامس راؤ براستہ سورت ہندوستان پہنچا۔ اُسے بھی جیمز اوّل نے بھیجا تھا۔ جہانگیر نے اُس کی خوب آؤ بھگت کی اور وہ 1618ء تک مغلیہ دربار میں رہا۔ وہ عالم آدمی تھا اور شاہی آداب سے پوری طرح واقف تھا۔ جہانگیر نے خوش ہو کر سر ٹامس راؤ کو شاہی فرمان عطا کیا جس کی رو سے انگریزوں کو سورت میں تجارتی مراعات عطا ہوئیں۔ سر ٹامس راؤ نے اس امر کی کوشش کی تھی کہ انگریزوں کو ہندوستان کی تمام بندرگاہوں میں (خاص طور پر سندھ اور بنگال میں) آزادانہ تجارتی مال لانے کی اجازت مل جائے۔ انگریزی تجارتی مال پر کوئی محصول نہ لگے اور اُن کو یہ اجازت ہو کہ گودام کرایہ پر لے سکیں اور ہندوستان کے سمندروں سے مال لے جانے کے لئے جہاز بھی کرایہ پر لے سکیں۔ سر ٹامس راؤ اس قدر زیادہ مراعات حاصل نہ کر سکا۔ البتہ سورت میں انگریزوں کو تجارتی مراعات حاصل ہوگئیں۔ پس برّ صغیر میں

انگریزی تجارت کی بنیاد و شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں رکھی گئی - مانڈو اور احمد آباد کی سیاحت کے بعد سر ٹامس راؤ سترہ فروری ۱۶۱۹ء کو واپس لوٹا۔ نورجہان کا بھائی آصف خان بھی سر ٹامس راؤ پر مہربان تھا۔ سر ٹامس راؤ کے علاوہ اُس کے مشہور ساتھی پادری ٹیری (Terry) نے ہندوستان کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔

سر ٹامس راؤ نے جہانگیر کے دور میں مصوری کے کمال کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ انتظام سلطنت عمدہ نہ تھا۔ تاجروں سے اچھا سلوک نہ ہوتا تھا۔ نذرانوں کے بہانے شاہی درباری بھاری رقوم بطور رشوت طلب کرتے تھے۔ گورنر جبرو استبداد سے باز نہ رہتے تھے۔ سفر پُرخطر تھا اور دکنی علاقہ خوشحال نہ تھا۔ بادشاہ عیش و عشرت میں ڈوبا رہتا تھا سر ٹامس راؤ نے اپنی قوم کو یہ مشورہ دیا کہ برِّصغیر کی سیاست میں دخل دئے بغیر اور فوجی اڈّے قائم کئے بغیر چپ چاپ تجارت میں مگن رہ کر نفع کمانا چاہیئے ورنہ پرتگیزوں کی مانند انگریزوں کو بھی ہندوستان سے نکلنا پڑے گا۔ سر ٹامس راؤ کی نسبت پادری ٹیری کی تحریروں کو زیادہ قابلِ اعتبار گنا گیا ہے۔

مجدّدِ الفِ ثانی:- شہنشاہ جہانگیر کے دور میں برِّصغیر کے مشہور ترین بزرگ مجدّد الف ثانی (شیخ احمد سرہندی) ہو گذرے ہیں۔ وہ چھبّیس جون ۱۵۶۴ء کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرہند اور سیالکوٹ میں حاصل کی۔ بعد ازاں وہ فتح پور سیکری چلے گئے۔

اُسی جگہ انہوں نے شیعہ علماء کے اعتراضات کے جواب میں ایک مدلّل مضمون لکھا۔ اس مضمون سے اُن کی شہرت ماوراء النہر تک پھیل گئی اس مضمون سے اُن کی علمیّت چھلکتی ہے اور عمدہ و پُرتاثیر اسلوب بیان واضح ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی زندگی دینی اور علمی خدمت کے لئے وقف کی۔ ۱۵۹۹ء میں شیخ احمد نے دہلی پہنچ کر حضرت باقی باللہ کی مریدی اختیار کی جو سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور صوفی اور عالم دین ہو گذرے ہیں۔ اپنے مرشد کے حکم پر شیخ احمد نے لاہور پہنچ کر لوگوں کو روحانی فیض پہنچایا۔ اُن کی وفات کے بعد ۱۶۰۳ء میں شیخ احمد سرہندی کچھ عرصہ دہلی میں مقیم رہے بعد ازاں وہ سرہند واپس آ گئے اور دینی خدمت کی بدولت مجدّد الف ثانی کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ آپ نے مغل اُمراء کو کئی ایک خط لکھ کر انہیں اکبری دور کے الحاد سے بچایا۔ شیخ احمد سرہندی نے اس بات پر زور دیا کہ اسلام اور شرک میں بُعد المشرقین ہے۔ یعنی رام اور رحیم یکجا نہیں ہو سکتے۔ اسلام اور کفر متضاد مذاہب ہیں۔ اُن کا یکجا ہونا ممکن نہیں۔ مجدّد الف ثانی کے خطوط پُرتاثیر ہیں۔ مختلف اُمراء اور اُن کے حواری اِن خطوط کی بدولت بھٹکنے سے بچ گئے۔ بعض درباری اُمراء (خاص طور پر آصف خان) کے بہکانے سے جہانگیر نے مجدّد الف ثانی کو دربار میں طلب کیا اور اُن کی بعض تحریروں کے بارے میں استفسار کیا۔ مجدّد الف ثانی نے تشفی بخش جواب دیا۔ آخر کار مجدّد صاحب کے دشمنوں نے بادشاہ کے کان بھرے کہ شیخ احمد سرہندی نے سجدۂ تعظیم بجا لانے سے

انکار کر کے شاہی توہین کا ارتکاب کیا ہے۔ جہانگیر نے برہم ہو کر شیخ احمد سرہندی کو قید خانے میں ڈال دیا۔ لیکن شہنشاہ نے ایک سال کے بعد اُن کو گوالیار کے قلعے سے رہا کر کے خلعت عطا کی اور ایک ہزار روپیہ بھی پیش کیا۔ جہانگیر نے حضرت مجدّد الف ثانی کو اختیار دیا کہ وہ اپنی مرضی سے خواہ سرہند واپس تشریف لے جائیں یا شاہی کیمپ میں رہیں۔ مجدّد صاحب نے شاہی کیمپ میں رہنا قبول کیا۔ اکثر مؤرّخین کا خیال ہے کہ مذہب اسلام کی جانب جہانگیر کا روز افزوں رجحان حضرت مجدّد الف ثانی کی بدولت تھا۔ شیخ احمد سرہندی نے بھی اپنی تحریروں میں جہانگیر کی مذہبی پالیسی کی تعریف کی ہے۔ مجدّد الف ثانی نے 1624ء میں وفات پائی۔ آپ کا مزار سرہند میں اب تک مرجع خلائق ہے۔

Typical Questions

Q. 1. Do you agree with Dr. Smith that "Jahanagir was a strange compound of tenderness and cruelty, justice and caprice, refinement and brutality, good sense and childishness ?"

Q. 2. "Jahangir's fame has been eclipsed by the trancendent glory of his father and the dazzling splendour of his son." Discuss.

Q. 3. Do you regard Jahangir to be a "talented drunkard"? Make an estimate of his character and achievements.

Q. 4. Describe briefly the career of Nur Jehan and her role in politics.

Q. 5. Critically examine the consequences of Nur Jahan's influence on Emperor Jahangir.

Q. 6. Account for the loss of Qandhar under Emperor Jahangir.

Q. 7. Examine the relations of Safvids of Iran with the Mughal rulers of India—Babur to Jahangir.

Q. 8. Write an essay on one of the following :—

(*a*) Jahangir's Deccan Policy.

(*b*) Jahangir's relations with Europeans.

(*c*) Jahangir's relations with Mujadid 'Alif-Sani.

(*d*) Painting under Jahangir.

Q. 9. Write short notes on the following :—

(*i*) Tuzak-i-Jahangiri.

(*ii*) Mahabat Khan.

(*iii*) Prince Khusroe.

(*iv*) Sher Afghan.

(*v*) Sahib Jamal.

(*vi*) Captain William Hawkins.

(*vii*) Malik Ambar.

امتحانی سوالات

۱- آپ کو سمتھ صاحب کی رائے سے کس حد تک اتفاق ہے کہ "شہنشاہ جہانگیر متضاد صفات کا مالک تھا۔ اُس کے کردار میں نرم دلی اور جبر و استبداد کی آمیزش تھی۔ وہ منصف مزاج لیکن خود غرض بھی تھا۔ وہ سلجھا ہوا ضرور تھا لیکن اُس کے کردار سے وحشیانہ صفات بھی جھلکتی تھیں۔ اُس میں اوچھا پن بھی تھا اور وہ سلیقہ شعار و ہوشمند بھی تھا۔"

۲- "جہانگیر کی شہرت اس لئے کم دکھائی دیتی ہے کہ اُس کے باپ کا

دور شاندار تھا اور اُس کے بیٹے کی عظمت آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی ہے"۔ تبصرہ کیجئے۔

3- یہ فتویٰ کس حد تک درست ہے کہ "جہانگیر بیدار مغز شرابی تھا"۔ جہانگیر کے کردار اور کارناموں کا جائزہ لیجئے۔

4- نورجہان کی زندگی کے حالات قلمبند کیجئے۔ ملکی سیاست میں اس کے عمل دخل کا جائزہ بھی لیجئے۔

5- شہنشاہ جہانگیر پر ملکہ نورجہان کے اثر و رسوخ کے نتائج کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

6- قندھار کن وجوہات کی بدولت جہانگیر کے عہد میں مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا؟

7- ایران کے صفوی تاجداروں اور ہندوستان کے مغل حکمرانوں (بابر تا جہانگیر) کے باہمی روابط کا حال قلمبند کیجئے۔

8- مندرجہ ذیل عنوانوں میں سے کسی ایک پر مختصر شذرہ لکھیئے۔

(ا) جہانگیر کی دکنی پالیسی۔

(ب) جہانگیر کے عہد میں یورپی اقوام کی برّصغیر میں آمد۔

(ج) جہانگیر اور حضرت مجدّد الف ثانی۔

(د) جہانگیر کے عہد میں مصوّری کا کمال۔

9- مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیئے۔

(ا) تزک جہانگیری

(ب) مہابت خان (ج) شہزادہ خسرو (د) شیر افگن۔

(ھ) صاحب جمال (و) کیپٹن ولیم ہاکنز (ز) ملک عنبر۔

اکتیسواں باب

شہاب الدین شاہجہان

جہانگیر کی وفات کے وقت شہزادہ خرّم دکّن میں تھا۔ لاہور میں نورجہان کے داماد شہزادہ شہریار نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا تھا۔ دہلی میں وزیر سلطنت آصف خان نے (جو ممتاز محل کا والد اور نورجہان کا بھائی تھا) شہزادہ خسرو کے ایک بیٹے داور بخش کو عارضی طور پر بادشاہ بنایا اور خرّم کو دکّن سے فوری طور پر بلا بھیجا۔ شہزادہ خرّم کی آمد سے پہلے آصف خان نے لاہور کے قریب شہریار کو شکست دے کر گرفتار کرلیا۔ شاہجہان کے حکم سے اُسے اندھا کردیا گیا۔ آصف خان نے سرکردہ مغل اُمراء کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ خرّم نے دہلی پہنچنے سے قبل اپنے سُسر آصف خاں کو حکم دیا کہ شہزادہ داور بخش سمیت تخت کے تمام دعویداروں کو ختم کر ڈالا جائے۔ دہلی پہنچنے پر اُس کی تاجپوشی چار فروری 1628ء کو ہوئی۔ اُسے باپ کی زندگی میں ہی شاہ جہان کا خطاب عطا ہُوا تھا۔ تخت نشینی پر اُس نے ابوالمظفر شہاب الدین شاہ جہان صاحب قرآن ثانی کا لقب اختیار کیا۔ شاہ جہان 1658ء میں بیمار پڑ گیا

اور اُس کی زندگی میں ہی اُس کے بیٹوں کے مابین تخت نشینی کی جنگ کا فیصلہ ہو گیا اور اورنگ زیب نے باپ کو تخت سے معزول کر دیا لہٰذا شاہجہان کی مدت حکومت تیس سال (۱۶۵۸ء تک)، گنی جاتی ہے۔

تخت نشینی پر شاہ جہان نے اپنے حامیوں کو اعلیٰ منصب عطا کئے اور دیگر اُمراء پر انعام و اکرام کی خوب بارش کی۔ مہابت خان کو خانِ خاناں کے خطاب کے ساتھ سات ہزار ذات و سوار کا منصب عطا ہوا۔ آصف خان کو وکیل سلطنت بنا دیا گیا اور اُسے آٹھ ہزاری ذات و سوار کا منصب ملا۔ شاعروں۔ نجومیوں۔ علماء اور اہلِ فن کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا گیا۔ نور جہان نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے لاہور میں سکونت کی اجازت پائی۔ شاہ جہان نے اُس کی عزت و توقیر میں فرق نہ آنے دیا اور اُسے دو لاکھ روپے سالانہ وظیفہ عطا کیا۔ نور جہان نے اپنی بقایا زندگی رفاہی کاموں میں بسر کی۔ اُس نے ۱۶۴۵ء میں وفات پائی اور لاہور میں دفن ہوئی آصف خان نے اُس کے لئے ایک معمولی سا مقبرہ بنا دیا۔ سکھوں کے دور میں اس مقبرے پر خاص طور پر آفت نازل ہوئی اور سکھ اس کے تمام قیمتی پتھر نکال کر لے گئے۔ اب اس مقبرے کی مرمت ہو رہی ہے۔

ابتدائی زندگی:۔ شہزادہ خرم پانچ جنوری ۱۵۹۲ء کو لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کی ماں موٹا راجہ اُودھے سنگھ کی بیٹی تھی جس کا نام جگت گوسائیں تھا۔ اکبر نے شہزادہ خرم کو لاڈ پیار سے پالا اور اُس

کی تعلیم کا مناسب بندوبست کیا۔ شہزادہ خرّم نے فارسی میں خوب مہارت حاصل کر لی اور تاریخ۔ جغرافیہ۔ سیاسیات۔ علم طب اور علم دین میں وہ خوب شغف رکھتا تھا۔ بادشاہ بننے پر بھی مذہب کی جانب اُس کا لگاؤ بہت زیادہ تھا لیکن اُس نے رواداری اور انصاف سے کام لیا۔ وہ نماز روزے کا پابند تھا اور اسلامی تہوار دھوم دھام سے مناتا تھا۔ اُس نے غیر اسلامی درباری رسوم بند کر دیں۔ ہندوؤں سے کسی مسلمان عورت کی شادی اُس نے حکماً بند کر دی۔ مؤرّخین شاہجہان کو پارسا کہتے ہیں۔ وہ مطلق العنان بادشاہ ضرور تھا لیکن عدل و انصاف کا پتلا تھا اور رعایا کی بہبودی و خوشحالی پر زور دیتا تھا۔ غیر مسلم رعایا کو اُس نے بدستور اعلےٰ عہدے عطا کئے۔

شہزادہ خرّم کی فوجی قابلیّت اور شجاعت مسلّم تھی۔ اُس نے متعدّد مہموں میں اپنی جنگی قابلیّت کی دھاک بٹھائی۔ میواڑ کے رانا امر سنگھ کو بھی شہزادہ خرّم نے ۱۶۱۴ء میں شکست دے کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ بعد ازاں شہزادہ خرّم کو دکن کی گورنری عطا ہوئی اور باپ نے خوش ہو کر اُسے شاہ جہاں کا خطاب دیا۔ دکّن میں شہزادہ خرّم نے ملک عنبر سے احمد نگر چھین لیا اور اسے صلح پر مجبور کیا۔ گجرات کی حکومت بھی شہزادہ خرّم کے سپرد ہوئی۔

جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد جب شہزادہ خسرو نے بغاوت برپا کی تھی تو شہزادہ خرّم باپ کا چہیتا بن گیا اور اُسے آٹھ ہزار

ذات و پنج ہزار سوار کا منصب عطا ہوا۔ سنہ 1608ء میں اُسے حصار فیروزہ کی جاگیر ملی جو عام طور پر ولیعہد کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ سنہ 1610ء میں اُس کی شادی مظفر حسین صفوی کی بیٹی سے ہوئی اور اُس سے ایک سال بعد اُسے دس ہزار ذات و پنج ہزار سوار کا منصب ملا۔ سنہ 1612ء میں شہزادہ خرم کی شادی ارجمند بانو (ممتاز محل) سے ہوئی جو آصف خاں کی بیٹی اور نور جہان کی بھتیجی تھی۔ شہزادہ خرم ممتاز محل کا دل و جان سے متوالا تھا اور تاج محل آگرہ اسی ملکہ کی یادگار ہے۔ شاہ جہان بھی ملکہ کے پہلو میں مدفون ہے۔ ملکہ ممتاز محل نے چودہ بچے جنے تھے۔ جن میں سے سات زندہ بچے۔ زندہ رہنے والے بچوں کے نام حسب ذیل ہیں (1) جہان آرا بیگم۔ سنہ 1614ء میں اجمیر کے مقام پر پیدا ہوئی (2) دارا شکوہ۔ سنہ 1615ء میں اجمیر کے مقام پر پیدا ہوا (3) شاہ شجاع سنہ 1616ء میں اُسی شہر میں پیدا ہوا۔ (4) روشن آرا بیگم سنہ 1617ء میں برہان پور کے مقام پر پیدا ہوئی (5) اورنگ زیب جو بیس اکتوبر سنہ 1618ء کو دوہد (Dauhad) کے مقام پر پیدا ہوا (6) مراد بخش سنہ 1624ء میں رہتاس کے مقام پر پیدا ہوا۔ (7) گوہر آرا بیگم کی پیدائش سنہ 1631ء میں برہان پور کے مقام پر ہوئی لیکن بچی کے پیدا ہوتے ہی ملکہ ممتاز محل نے وفات پائی۔ شاہجہان عمر بھر سوگوار رہا اور ملکہ کے مرنے کے بعد ۳۵ برس زندہ رہا۔ ملکہ کے مرنے کے بعد دو برس میں شاہجہان کے بال سفید ہو گئے اور وہ برملا کہا کرتا تھا کہ "اب حکمرانی کا کچھ مزہ نہیں اور زندگی کا کوئی لطف نہیں رہا"

"Empire has no sweetness, life itself has no relish left for me now."

گذشتہ باب میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ ممتاز محل سے شادی کرنے کے بعد شہزادہ خرّم کو ملکہ نورجہان اور اُس کے رشتہ داروں کی سرپرستی حاصل رہی۔ چنانچہ دس برس تک شہزادہ خرّم کا اقتدار بے پناہ تھا اور ہر شخص اُسے ولیعہد گنتا تھا۔ بعدازاں ملکہ نورجہان نے اپنے داماد شہریار کو شہزادہ خرّم کی بجائے تخت کا وارث بنانے کے لئے تگ و دو شروع کر دی اور شاہی دربار سازشوں کا مرکز بن گیا۔ شاہ جہان نے تنگ آکر باپ کے خلاف بغاوت کی۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ نورجہان محض اس بنا پر اپنے مقصد میں ناکام رہی کہ اُس نے اپنے بھائی آصف خان پر بھروسہ کیا جو ظاہری طور پر ملکہ کا وفادار بنا رہا لیکن درپردہ اپنے داماد شہزادہ خرّم کے لئے راہ ہموار کرتا رہا۔

سنہری دور:۔ شاہ جہان کے عہدِ حکومت کو مؤرخین نے مغلوں کا سنہری دور گنا ہے۔ اُس کے عہد میں مغلیہ سلطنت بامِ عروج پر پہنچی۔ اس کے دور میں رعایا خوشحال تھی۔ تجارت اور زراعت ترقی پذیر تھی۔ دولت کی فراوانی تھی۔ قیمتیں متوازن تھیں۔ علی مردان خان نے نہریں کھدوا کر ملک کو زرخیز بنا دیا تھا۔ میرجملہ اور سعد اللہ خان چنیوٹی جیسے لائق وزیر اعلےٰ منتظم ثابت ہوئے۔ علوم و فنون کو بے مثال ترقی ہوئی۔ فنِ تعمیر اور مصوّری معراج کو پہنچی۔ شاہ جہان کی عمارات آج تک درخشاں گنی جاتی ہیں۔ دکّن میں فتوحات کی

بدولت مغلیہ سلطنت کو عظیم الشان وسعت نصیب ہوئی۔ البتہ قندھار اور وسط ایشیا کی تسخیر میں شاہ جہان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دکن اور گجرات میں قحط رونما ہوا۔ لیکن شاہ جہان کے تیس سالہ عہد میں رعایا کی خوشحالی اور آسودگی کی بدولت اس کے عہد حکومت کو مغلیہ سلطنت کا سنہری دور (Golden Age) گنا جاتا ہے۔ شاہجہانی دربار کی شان وشوکت بے مثال تھی۔ بعض مؤرخین نے شاہ جہان کو رفیع الشان حکمران (Magnificent) کا خطاب دیا ہے۔ شاہ جہان نے ہر بڑے شہر میں لاتعداد عمارتیں بنوائیں اور باغات لگوائے۔ شاہی محل تعمیر کرائے اور عظیم الشان قلعے بنوائے۔ دلی۔ آگرہ۔ لاہور اور ٹھٹھہ میں اُس کی عمارات اُس کی عظمت کی دلیل ہیں۔ تخت طاؤس بھی اُسی نے بنوایا تھا۔ تاج محل آگرہ عجائبات دنیا میں شمار ہوتا ہے۔ الغرض ہر لحاظ سے مغلیہ سلطنت شاہ جہان کے عہد میں بام عروج کو پہنچی۔ لہٰذا اُس کے عہد حکومت کو بجا طور پر مغلیہ سلطنت کا سنہری دور گنا جاتا ہے۔ اُس کے عہد کے واقعات تاریخی تسلسل کے لحاظ سے بیان ہوں گے اور اس باب کے آخر میں شاہ جہان کے بیٹوں میں جنگ تخت نشینی کا حال بھی دیا جائیگا۔

شاہجہانی عہد کی بغاوتیں:۔ شاہ جہان کی تخت نشینی کے فوراً بعد چند ایک بغاوتیں رونما ہوئیں۔ ان کا مختصر حال حسب ذیل ہے:۔

(۱) خان جہان لودھی کی بغاوت:۔ مشہور مغلیہ جرنیل خان جہان لودھی جہانگیر کے عہد میں اعلیٰ عہدوں میں متمکن رہا تھا۔ وہ جہانگیر

کی موت کے وقت دکن میں تھا۔ باقاعدہ منصوبہ بنائے بغیر اس افغان منصبدار نے نورجہاں کی طرف داری کے خیال سے اپنے صدر مقام برہان پور سے روانہ ہو کر مانڈو کے قلعہ پر قبضہ جمانے کی ناکام کوشش کی۔ نیز نظام شاہی سلطان سے دوستی گانٹھ کر بالا گھاٹ کا علاقہ اُس کے حوالے کیا۔ شاہ جہاں جب اجمیر جا پہنچا اور آصف خان نے شہر یار کو لاہور میں شکست دے کر گرفتار کر لیا تو یہ بات عیاں تھی کہ شاہجہان مغلیہ سلطنت کا وارث بنے گا۔ ان حالات کو دیکھ کر خان جہاں لودھی نے شاہ جہان کی اطاعت قبول کی۔ شاہ جہان نے بھی فراخ دلی کا ثبوت دے کر اُسے معاف کر دیا۔ شاہ جہان نے اُسے حکم دیا کہ برہان پور واپس جا کر بالا گھاٹ کو حاصل کرے۔ خان جہاں لودھی نے بالا گھاٹ فتح نہ کیا لہٰذا اُسے شاہی دربار میں بلوا لیا گیا۔ اُس کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ شاہ جہان اُس کی تذلیل کے درپے ہے۔ نیز مہابت خان کو جب ہفت ہزاری منصب کے علاوہ خان خانان کا خطاب ملا تو خانِ جہان لودھی کے دل میں حسد پیدا ہوا۔ وہ دکن بھاگ گیا اور بغاوت پر آمادہ ہوا۔ شاہی فوج نے تعاقب کر کے دریائے چمبل کے قریب اُس سے جنگ کی۔ خان جہان لودھی اور اُس کے بیٹے شکست کھانے کے باوجود دکن پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ خان جہان لودھی کے فتنہ کو ختم کرنے کے لئے شاہ جہان نے دسمبر ۱۶۲۹ء میں خود نوجکشی کی۔ اُس نے مرہٹوں کو بھاری تنخواہیں دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور خان جہان لودھی کے

خلاف تین اطراف سے فوج کشی کی۔ شاہ جہان کا یہ خیال درست تھا کہ احمد نگر۔ بیجاپور اور گولکنڈہ باہمی حسد کی بدولت مغلوں کے خلاف متحد نہ ہوں گے۔ شاہ جہان نے ایک فوج ابوالحسن کی سرکردگی میں دھولیا کی جانب بھیجی تاکہ احمد نگر اُس کی زد میں رہے اور گجرات کی جانب سے سامان رسد پہنچتا رہے۔ دوسری فوج جنوبی برار کی جانب سے دیول گاؤں پہنچی تاکہ دشمن پر شمال مشرق کی جانب سے حملہ کرے۔ تیسری فوج نے تلنگانہ کی جانب سے خان جہان لودھی پر حملہ کیا۔ خان جہان لودھی کو شکست ہوئی اور وہ پناہ کی تلاش میں بیجاپور بھاگ گیا۔ بیجاپور کے سلطان نے اُس کی مدد نہ کی اور مرہٹہ سردار شاہ جی بھونسلہ نے (جس نے مغلوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی) خان جہان لودھی کا تعاقب کر کے اُس کا قافیہ تنگ کیا۔ احمد نگر کا سلطان بھی خان جہان لودھی کی حمایت سے دستبردار ہو کر نادم ہوا۔ باغی امیر تنگ آ کر بندھیل کھنڈ کی جانب بھاگ اُٹھا۔ اُس کے عزائم یہ تھے کہ پنجاب پہنچ کر افغانوں کو سرکشی پر آمادہ کرے۔ بندھیل کھنڈ کے حکمران جوجھار سنگھ نے اُس کی مدد نہ کی اور مغلیہ فوج نے خان جہان لودھی کو ۱۶۳۰ء میں کالنجر کے قریب شکست دی۔ اُس نے بھاگنے کی ناکام کوشش کی اور مارا گیا۔

(ج) بندھیل کھنڈ کی بغاوت:۔ بندھیل کھنڈ کی ریاست پر بیر سنگھ راجپوت کا بیٹا جوجھار سنگھ حکمران تھا۔ بیر سنگھ نے جہانگیر کو خوش کرنے کے لئے ابوالفضل کو قتل کیا تھا۔ جہانگیر بادشاہ بننے

کے بعد اُس پر خوب مہربان رہا تھا۔ شاہ جہان کی تخت نشینی پر جوجہار سنگھ شاہی دربار میں حاضر ہوا اور ریاست کی حکمرانی اُس نے اپنے بیٹے وکرم جیت سنگھ کے حوالے کی تھی جو نا اہل ثابت ہوا اور رعایا جلدی ہی اُس سے برگشتہ ہو گئی۔ شاہ جہان نے بندھیل کھنڈ کے حالات کا جائزہ لینے کا حکم دیا۔ اس سے جوجہار سنگھ بھڑک اُٹھا اور بغاوت برپا کر دی۔ وہ اپنی ریاست کو جغرافیائی اعتبار سے ناقابل تسخیر سمجھتا تھا اور اُسے اپنے قبیلے کی بہادری پر ناز تھا۔ 1628ء میں شاہ جہان نے جب بندھیل کھنڈ کی بغاوت کی خبر سنی تو اُس نے فوراً ایک زبردست فوج اپنے مشہور جرنیل مہابت خان کی سرکردگی میں روانہ کی۔ دیگر اطراف سے عبداللہ خان اور خان جہان لودھی نے ہلّہ بول دیا۔ جوجہار سنگھ نے ہتھیار ڈال کر صلح کی درخواست کی۔ 1629ء میں شاہ جہان نے اُسے معاف کر دیا لیکن اُس کے کچھ علاقے ضبط کر لئے۔

1635ء میں جوجہار سنگھ پھر باغی ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ شاہجہان کی اجازت کے بغیر گونڈوانہ کی تسخیر کے درپے ہوا۔ شاہجہان نے اُس پر پانچ لاکھ روپے جرمانہ عاید کر کے حکم دیا کہ گونڈوانہ کا علاقہ اصلی وارثوں کے سپرد کرے۔ جوجہار سنگھ نے حکم عدولی کر کے بغاوت اختیار کی۔ اس سے قبل بندھیل کھنڈ کی فوج نے دکن میں اعلےٰ خدمات سرانجام دی تھیں۔ شاہ جہان نے اورنگ زیب کو بندھیل کھنڈ کی تسخیر کے لئے بھیجا۔ اورنگ زیب نے جوجہار سنگھ کو قدم قدم پر شکست دی۔ جوجہار سنگھ کا ایک قریبی رشتہ دار

دیوی سنگھ مغلوں سے آملا اور بندھیل کھنڈ کا بیشتر علاقہ اُس کے حوالے ہوا۔ بندھیل قبیلے کے ایک اور سردار چمپت رائے نے 1639ء میں بغاوت کی لیکن عبداللہ خان کی سرکردگی میں مغلیہ فوج نے بغاوت فرو کی۔

(3) پرتگیزوں کے خلاف کارروائی:۔ جہانگیر کے زمانے سے پرتگیزوں کو بنگال میں خاص تجارتی مراعات حاصل تھیں۔ ہگلی اُن کا صدر مقام تھا اور نمک کی تجارت کی اجارہ داری اُن کے پاس تھی۔ وہ سالانہ دس ہزار ٹکہ مغلوں کو ادا کرتے تھے۔ لیکن پرتگیزوں نے تجارت پر قناعت کرنے کی بجائے دولت کے حصول کے ناجائز ذرائع اختیار کئے۔ اُنہوں نے تجارتی مراعات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حد سے تجاوز کیا وہ سمندری لٹیرے بن گئے۔ وہ مقامی تاجروں پر ناجائز ٹیکس عاید کر کے اُن کو خوب دق کیا کرتے تھے۔ پرتگیزوں نے لوگوں کو اغوا کر کے بیرونی ممالک میں بیجا کر بطور غلام بیچنا شروع کر دیا۔ وہ لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ شاہجہان نے برہم ہو کر 1632ء میں پرتگیزوں کے خلاف سخت کارروائی کا حکم دیا بنگال کے گورنر قاسم خان نے ہگلی کا محاصرہ کر لیا۔ مغلیہ فوج نے بحری اور برّی جنگ لڑی اور شدید گولہ باری سے پرتگیزوں کی طاقت کا صفایا کر ڈالا۔ شاہ جہان کے حکم سے ہگلی سے پرتگیزوں کا مکمل اخراج ہوا۔ اس کے بعد بنگال میں پرتگیزوں کی طاقت بحال نہ ہو سکی۔

بدخشاں اور قندھار کی تسخیر کا عزم
یا
شاہ جہان کی وسط ایشیائی پالیسی

تخت نشین ہوتے ہی شاہجہان کو اس بات کا شوق ہوا کہ وہ اپنے آبائی وطن یعنی تیمور کے پایۂ تخت سمرقند پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت کی حدود وسط ایشیا میں ماوراءالنہر (Transoxiana) تک پھیلائے۔ سمرقند پر قبضہ کرنے سے پہلے لازم تھا کہ وہ بلخ اور بخارا کے شہروں پر بھی قبضہ کرتا۔ نیز برِّصغیر کے سرحدی قبائل کو مطیع کئے بغیر وسط ایشیا کے علاقوں پر حکومت کرنا ممکن نہ تھا۔ پس وسط ایشیا تک وسعت پذیری ایک حسین خواب تھا۔ اپنی اُمنگوں میں محو ہو کر وہ راہ کی لاتعداد مشکلات کو بھول گیا اور مناسب موقع پاتے ہی اُس نے اپنی فوجوں کو وسط ایشیا کی فتوحات کے لئے بھیج دیا۔ برفانی اور بنجر علاقوں کی مشکلات کا ہندوستانی فوج سامنا نہ کرسکی۔ نیز اُن دنوں مغلیہ فوج کے لئے تنظیم نو کی ضرورت تھی۔ تن آسان افسر پہاڑی علاقوں میں جا کر ہمت ہار بیٹھے شاہجہان نے کئی مہمیں بھیجیں، کافی روپیہ خرچ کیا اور ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں، لیکن وہ وسط ایشیا کی تسخیر کے حسین خواب کو پورا نہ کرسکا، بلکہ ایک انچ زمین بھی حاصل نہ کرسکا۔

دوسرا پہلو۔ شاہجہان کی وسط ایشیا کی پالیسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ قندھار کے اہم شہر پر بھی قبضہ رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس شہر کی فوجی اور تجارتی اہمیت سے مغلیہ سلطنت کو فائدہ پہنچے۔ قندھار پر جہانگیری عہد کے آخر سے ایرانی شہنشاہ عباس صفوی نے قبضہ کر لیا تھا۔ شاہجہان نے اعلیٰ سیاست کا ثبوت دیے بغیر اپنی فوجوں کو بیک وقت دونوں محاذوں پر بھیج دیا اور زک اٹھائی۔ ابتدا میں اُس نے ایرانی حکومت کو دوست بنائے بغیر بلخ اور بخارا کی سیاست میں دخل اندازی کی، بعد ازاں وہ قندھار پر اپنا تسلط قائم نہ رکھ سکا، لہٰذا طویل جنگوں کے باوجود اُس کی وسط ایشیائی پالیسی ہر لحاظ سے سراسر ناکام رہی۔ سمتھ صاحب کے قول کے مطابق "مغلیہ فوج کے بیرونی دبدبے اور شان و شوکت کا پول کھل گیا اور اُس کی اندرونی کمزوری عیاں ہو گئی۔ اس سے مغلیہ حکمرانوں کی فوجی دھاک میں کمی واقع ہوئی"۔

جنگ کے واقعات اور سیاسی قلابازیاں

شاہجہان تو سمرقند پر نظریں جمائے بیٹھا تھا لیکن سمرقند کے حکمران جو ازبک تھے، مغلوں سے کابل چھین لینے کے خواہش مند تھے۔ چنانچہ جن دنوں شاہجہان تخت نشین ہوا سمرقند کے حکمران انعام قلی کے بھائی نذر محمد نے کابل پر حملہ کر دیا۔ نذر محمد فتح مند تھا لیکن موسم گرما میں وہ کابل سے پیچھے ہٹ گیا کیونکہ مغلوں

کی کمک پہنچ جانے کا خدشہ تھا۔ مئی ۱۶۲۹ء میں نذر محمد نے دوبارہ حملہ آور ہو کر بامیان پر قبضہ کر لیا جو کابل کے قریب اہم درہ تھا لیکن وہ مزید پیش قدمی نہ کر سکا۔ جب ازبکوں نے دیکھا کہ شاہجہاں تخت نشین ہو چکا ہے تو انہوں نے اُس کی فوجی دھاک کی بدولت معافی مانگ لی اور فوجیں پیچھے ہٹا لیں۔ چند سال شاہجہان اور ازبک حکمرانوں کے تعلقات خوشگوار رہے۔

جنگ کا آغاز:۔ ازبک حکمرانوں کے اندرونی خلفشار اور اور باہمی تنازعوں سے فائدہ اُٹھا کر شاہجہان نے جولائی ۱۶۴۶ء میں اپنی فوجیں شہزادہ مراد کی سرکردگی میں وسط ایشیا کی تسخیر کے لئے بھیج دیں۔ حالات نے عجیب و غریب پلٹا کھایا۔ نذر محمد نے اپنے بھائی انعام قلی کی آنکھیں نکلوا کر اُس سے سمرقند کا تخت چھین لیا۔ لیکن وہ سلطنت کے مولویوں کو خوش نہ رکھ سکا۔ ۱۶۴۵ء میں اُس نے اپنے لڑکے عبدالعزیز کو اُن کی بغاوت فرو کرنے کی غرض سے کھیوا (Khiva) کے سرحدی علاقے میں بھیجا، لیکن عبدالعزیز نے باپ کے خلاف بغاوت کر کے بخارا میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

نذر محمد بھاگ کر بلخ میں پناہ گزین ہوا۔ عین اس موقع پر شاہجہان نے وسط ایشیا میں فوجیں اُتار کر سیاست کو اُلجھا دیا مغلیہ فوج کابل سے آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گئی لیکن سردی کا موسم شروع ہوتے ہی فوجی کارروائی ماند پڑ گئی۔ ۱۶۴۶ء میں مغلیہ فوج نے پہلے نذر محمد کی مدد کی لیکن بعد ازاں بخارا اور

سمرقند دونوں اس نے چھین لئے۔ اس سال بخارا پر قبضہ ہو جانے کے بعد مغلوں نے نذر محمد کو ترمذ اور شوارگھان کے مقامات پر شکست دی اور وہ ایران بھاگ گیا۔

صفوی شہنشاہ عباس ثانی وسط ایشیا کے حالات سے بدک اُٹھا اور اُس نے نذر محمد کی مدد کا اعلان کر دیا۔ گویا شاہجہان کی سیاست ایران کو غیر جانب دار رکھنے میں ناکام ثابت ہوئی اور وسط ایشیا کی تسخیر کڑوا نوالہ بن کر رہ گئی۔

اُدھر عافیت کوش شہزادہ مراد جنگ سے اُکتا گیا اور مہم سے واپس جانے کی درخواست کی۔ اُس کی جگہ اورنگ زیب کو بھیجا گیا لیکن اب سرحدی (آزاد) قبائل اور عبدالعزیز نے مصیبت برپا کر دی۔ بلخ کے قریب اورنگ زیب نے عبدالعزیز کو شکست دی لیکن مغلیہ فوج ماوراء النہر کی آب و ہوا برداشت نہ کر سکی اور وہاں رہنے سے انکار کر دیا۔ اس دوران میں نذر محمد نے بھی ایران سے آکر مغلوں کو خوب ہراساں کیا۔ ان حالات میں مغلوں کو بلخ سے پیچھے ہٹنا پڑا۔

قندھار کا قضیہ:۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قندھار جہانگیر کے عہد سے ایران کے قبضے میں چلا آ رہا تھا۔ 1638ء میں قندھار کا ایرانی گورنر علی مردان خاں مغلوں سے مل گیا اور اس نے قندھار اُن کے حوالے کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ ایرانی شہنشاہ عباس ثانی نے اُس سے اچھا سلوک نہ کیا تھا اور اُس کے خلوص پر شک کیا تھا۔ علی مردان خان برہم ہو کر مغلوں سے مل گیا اور

شاہجہان نے اُسے پنجاب اور کشمیر کا گورنر بنا دیا۔

1647ء میں جب مغلیہ فوج وسط ایشیا میں مصروف پیکار تھی اور بلخ سے اُسے پسپائی ہوئی تو شاہ عباس ثانی نے قندھار پر دوبارہ قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ جب اورنگ زیب بلخ سے پیچھے ہٹ کر کابل پہنچا تو ایرانی فوج نے آگے بڑھ کر بست (Bist) پر قبضہ کر لیا جو قندھار کے نواح میں واقع تھا۔ اس پر شاہ جہان نے اورنگ زیب کو قندھار کی حفاظت کا حکم دیا۔ اورنگ زیب قندھار کی جانب روانہ ہوا لیکن اُس کی آمد سے پہلے قندھار کے فوجی گورنر دولت خان نے حوصلہ ہار کر فروری 1649ء میں قندھار ایرانیوں کے حوالے کر دیا۔ اورنگ زیب نے مئی 1649ء میں قندھار کو دوبارہ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ 1652ء میں ایک بار پھر مغلوں نے قندھار پر قبضہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی اور اورنگ زیب کے علاوہ سعداللہ خان بھی محاذ جنگ پر گیا۔ شاہ جہان فوج کا دل بڑھانے کے لئے کابل آیا لیکن قندھار فتح نہ ہو سکا۔ ایرانی توپخانے سے مغلوں کو کافی نقصان پہنچا۔

مزید کوششیں :۔ اب خدشہ یہ تھا کہ ایرانی اور اُزبک حکمران مل کر مغلوں پر ہلّہ نہ بول دیں۔ پس وقتی طور پر قندھار کی تسخیر ملتوی کر دی گئی۔ اورنگ زیب کو دکن کا وائسرائے بنا کر بھیج دیا گیا اور فروری 1653ء میں شہزادہ دارا شکوہ کو عظیم الشان فوج دے کر قندھار کی تسخیر کے لئے بھیجا گیا۔ دارا نے بست اور گرشک پر قبضہ کر لیا د جو قندھار کے نواحی علاقے

تھے، لیکن ایرانی توپخانے نے مغلیہ فوج کے منہ پھیر دیئے، سرحدی قبائل نے اُدھم مچا دیا اور مغلیہ فوج کا گولہ بارود ختم ہو گیا اور خوراک کی رسد منقطع ہو گئی۔ مجبوراً قندھار فتح کئے بغیر دارا پیچھے ہٹ آیا اور یہ مہم بھی ناکام رہی۔

نتیجہ:۔ قندھار مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور وسط ایشیا کی تسخیر کا خواب بھی پورا نہ ہوا۔ مغلیہ فوج نے ہر قدم پر زک اُٹھائی۔ قندھار کی تسخیر کے لئے تین بار مہمیں بھیجی گئیں (۱۶۴۹ء ۱۶۵۲ء ۱۶۵۳ء)، لیکن ہر بار مغلیہ فوج بے نیل و مرام واپس لوٹی۔ ان جنگوں پر بارہ کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ ہزاروں سپاہی مارے گئے۔ وسط ایشیا سے مغل پٹ گئے۔ نیز قندھار بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ کابل کا دفاع خطرے میں پڑ گیا اور مغلوں کی فوجی عظمت کا پول کھل گیا۔ پس شاہجہان کی وسط ایشیائی پالیسی سراسر ناکام رہی۔

دکن میں شاہ جہان کی امپیریل پالیسی

تخت نشین ہوتے ہی شاہ جہان نے دکن کو مطیع بنانے کا عزم کیا اور فتوحات کے شوق میں مختلف حیلے بہانے کر کے دکنی ریاستوں کی جانب پیش قدمی کی۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانے سے دکن کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لہٰذا شاہجہان کے عہد میں دکن میں فوجی مداخلت لازمی تھی۔ دکن کافی عرصے سے باغیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ پس شاہ جہان نے دکنی علاقوں

کی تسخیر کا بیڑا اُٹھایا۔ طویل جنگوں کے بعد شاہ جہاں نے داراشکوہ کی غلط رائے پر عمل کر کے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کا الحاق نہ کیا اور محض خراج وصول کرنے پر قناعت کی۔ دکنی ریاستوں نے مغلوں کی سیادت قبول کر لی لیکن ان ریاستوں کی دولت لوٹ کر مرہٹوں کو نشوونما پانے کا موقع مل گیا۔ اگر دکنی ریاستیں مغلیہ سلطنت میں شامل ہو جاتیں تو مرہٹوں کی طاقت ابتدا سے ہی کچلی جاتی۔

بعض انگریز مؤرخین نے (خاص طور پر ایڈورڈ اور گیرٹ نے) شاہ جہاں کی دکنی پالیسی کو شدید غلطی قرار دیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاہ جہاں نے دکنی فتوحات کا سلسلہ شروع کر کے اورنگ زیب کے لئے مصیبت پیدا کر دی اور آخرکار دکن کی بدولت مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ شاہ جہاں کی دکنی پالیسی سے مغلیہ سلطنت کے زوال کا بہت دور کا تعلق ہے۔ اکبر نے ۱۵۹۹ء میں خاندیش کا الحاق کر لیا تھا اور ۱۶۰۱ء میں اسیر گڑھ پر بھی قبضہ جما لیا تھا۔ اُس نے احمد نگر سے برار کا علاقہ بھی چھین لیا تھا۔ پس دکنی فتوحات کا سلسلہ اکبر کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔ جہانگیر نے دکن میں طویل عرصے تک جنگ کی لیکن ملکی حالات کے پیش نظر (یعنی نور جہاں۔ آصف خان۔ مہابت خان اور شہزادہ خرم کی کشمکش کی بدولت)، وہ دکن کو فتح نہ کر سکا۔ شہزادہ خرم نے جب خود باپ کے خلاف بغاوت کی تھی تو اُسے بیجاپور کے

سلطان اور ملک عنبر نے مدد دی تھی۔ اُس کی تخت نشینی پر خان جہان لودھی کی بغاوت کے دوران میں احمد نگر کے نظام شاہی حکمران نے اُس کی پشت پناہی کی تھی، پس دکن میں دخل اندازی شاہ جہان کے لیئے لازم تھی۔ اس کے بغیر مغلوں کی عظمت برقرار نہ رہتی۔ نیز شاہ جہان کو فتوحات کا شوق تھا۔ اُسے یہ بھی پتہ تھا کہ باہمی حسد کی بنا پر احمد نگر۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں مغلوں کے خلاف متحد نہ ہو سکیں گی۔ پس اُس نے دکن پر فوجکشی کر کے اپنی سیادت منوائی دکنی فتوحات شاہ جہانی عہد میں واقعات کا قدرتی نتیجہ تھا۔ عالمگیر کے عہد میں حالات بدل گئے اور اُس نے دکنی ریاستوں کا الحاق کر لیا۔ مغلیہ سلطنت کا زوال عالمگیر کی وفات کے بعد شروع ہوا۔ شاہ جہان کی ذمہ داری اس سلسلے میں ناقابل فہم ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں دکنی فتوحات کا حال حسب ذیل ہے:۔

احمد نگر کی تسخیر۔ شاہجہان کے عہد میں احمد نگر کا لائق وزیر ملک عنبر فوت ہو چکا تھا اور ریاست میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کا بیٹا فتح خاں وزیر بنا دیا گیا تھا لیکن وہ خود غرض اور موقع پرست تھا اور نظام شاہی دربار سازشوں کا مرکز بن چکا تھا۔ وزیر نے سلطان کو معزول کر کے اُس کے بیٹے حسین شاہ کو تخت پر بٹھا دیا اور اصلی اقتدار اپنے پاس رکھنے کے لئے جوڑ توڑ کرتا رہا۔ نیز اُن دنوں ریاست میں خوفناک قحط رونما ہوا جس سے ریاست کی حالت اور بھی بگڑ گئی۔ شاہجہان نے ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر احمد نگر پر حملہ بول دیا اور بہانہ یہ بنایا کہ خان جہان لودھی کی بغاوت کے وقت ریاست

نے اُس کی مدد کی تھی۔ 1630ء میں مغلیہ فوج پارندہ کو فتح نہ کر سکی لیکن اگلے سال مہابت خان کی سرکردگی میں مغلوں نے دولت آباد کا محاصرہ کر لیا۔ فتح خان مغلوں سے مل گیا اور اعلیٰ منصب پایا۔ احمد نگر کی ریاست پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا اور 1633ء میں اس کا الحاق کر لیا گیا۔ مرہٹہ جاگیردار شاہ جی (جو سیواجی کا باپ تھا) نے 1636ء میں نظام شاہی خاندان کے ایک لڑکے کو دوبارہ تخت پر بٹھانا چاہا لیکن مغلیہ طاقت کے مقابلے پر اس نے منہ کی کھائی۔ ریاست احمد نگر کا کچھ علاقہ شاہجہان نے بیجاپور کے سلطان عادل شاہ کو دے دیا۔ احمد نگر کی تسخیر دکن میں وسعت پذیری کی جانب پہلا مؤثر قدم تھا۔ اس کے بعد بیجاپور اور گولکنڈہ سے لڑائی لازمی امر تھا کیونکہ ان ریاستوں کو مغلیہ اقتدار پسند نہ تھا اور مرہٹے ان ریاستوں کی شہ پر مغلیہ علاقے میں ختور مچاتے تھے۔

بیجاپور اور گولکنڈہ۔ خان جہان لودھی کی بغاوت کے وقت بیجاپور اور گولکنڈہ نے احمد نگر کے کافی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ بیجاپور کے سلطان نے دولت آباد پر خود قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب اُس نے شاہ جی مرہٹہ کو اپنی ملازمت میں رکھ کر شاہجہان کو مشتعل کر دیا۔ نیز بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بار بار مغلیہ علاقوں میں گھس کر سرحدی علاقوں کے بعض حصّوں پر قابض ہو جاتی تھیں۔ شاہجہان نے معاملات سلجھانے اور ان دونوں شیعہ حکمرانوں کا دماغ درست کرنے کی ٹھانی ۲۱ فروری 1636ء کو وہ بذاتِ خود دکن پہنچ کر جنگی تیاریوں میں مصروف ہوا اور دونوں ریاستوں کو یہ حکم دیا کہ یہ دونوں ریاستیں مغلیہ سلطنت کی باجگذار بن کر مغلوں کے اقتدار اعلیٰ اور سیادت

(Sovereignty) کو تسلیم کریں، نیز شاہ جی مرہٹہ سے قطع تعلق کرلیں اور اُسے بدامنی پر نہ اکسائیں۔ گولکنڈہ کے سلطان نے ان تمام شرائط کو مان لیا اور خراج کی ادائیگی کے علاوہ سکوں اور خطبے میں بھی شاہجہان کا نام شامل کرکے کامل اطاعت کا ثبوت دیا۔ شاہجہان نے اس ریاست کی حفاظت کا ذمہ لیا اور یقین دلایا کہ بیجاپور کو اجازت نہیں دی جائے گی کہ گولکنڈہ کے علاقوں کی جانب بڑھنے کی کوشش کرے۔

بیجاپور کے سلطان محمد عادل شاہ نے مغلوں کی ماتحتی اختیار نہ کی اور مغلوں نے تین اطراف سے اس ریاست پر ہلّہ بول دیا۔ بیجاپور کی فوجیں بہادری سے لڑیں لیکن مغل فوج کے سامنے جم نہ سکیں اور ریاست پر مغلیہ فوج کی یلغار سے خوب تباہی نازل ہوئی۔ آخر عاجز آکر مئی 1636ء کو عادل شاہ نے رحم کی درخواست کرنے کے بعد مغلوں سے صلح کرلی اور شاہجہان کی تمام شرائط تسلیم کرلیں بیجاپور کے سلطان نے مغلوں کی سیادت مان لی اور 22 لاکھ روپے تاوان ادا کیا، نیز شاہ جی مرہٹہ سے تعلّقات قطع کرلئے۔ شاہجہان کے کہنے پر سلطان نے وعدہ کیا کہ گولکنڈہ کی ریاست کی سرحدوں کا احترام کیا جائے گا۔ شاہجہان نے مفتوحہ ریاست احمد نگر کا کچھ علاقہ بیجاپور کو عطا کیا۔ شاہجہان کی دکنی پالیسی ہر لحاظ سے کامیاب رہی اور اس سے مغلوں کی عزّت و توقیر بڑھ گئی۔

وائسرائے کا تقرر۔ شاہجہان 1636ء میں دکن سے واپس لوٹا اور اپنے جواں سال بیٹے اورنگ زیب کو دکنی مقبوضات کا وائسرائے بنا دیا۔ شہزادے کی عمر اُس وقت محض اٹھارہ برس کی تھی لیکن

اُس نے غیر معمولی لیاقت اور انتظامی صلاحیت کا ثبوت دیا اور آٹھ سال تک دکنی علاقوں پر بطور وائسرائے حکومت کرتا رہا۔ ان دنوں دکنی میں مغلیہ سلطنت تمام الحاق شدہ علاقوں یعنی خاندیش، تلنگانہ، برار اور دولت آباد پر مشتمل تھی۔ اورنگ زیب نے شاہ جی مرہٹہ کا قدم بقدم تعاقب کرکے اُس سے ہتھیار رکھوائے۔ ۱۶۴۴ء میں اورنگ زیب نے اس بنا پر استعفیٰ دے دیا کہ اُس کا بڑا بھائی دارا شکوہ دکن کے معاملات میں دخل اندازی کرتا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب کو گجرات کا گورنر بنا دیا گیا۔

اورنگ زیب کا دکن میں دوبارہ تقرر۔ ۱۶۵۲ء میں شاہجہان نے اورنگ زیب کو دوبارہ دکن کا وائسرائے مقرر کیا۔ ان دنوں دکن کی حالت خاصی خراب تھی۔ زراعت کی حالت ناگفتہ بہ تھی، رشوت اور نااہلی کا دور تھا، انتظامی حالت بگڑ چکی تھی اور مالیات میں خسارہ ہو رہا تھا۔ اورنگ زیب نے مرشد قلی خان کے مشورے سے دکن میں مالیہ کی اصلاحات نافذ کیں، مزارعین کو تقاوی قرضے دیئے اور زراعت کی حالت کو بہتر بنایا۔ اُس نے سخت گیری سے رشوت اور نااہلی کو دور کیا۔ چند جاگیریں ضبط کرلیں اور فوجی انتظام بھی بہتر بنایا۔

گولکنڈہ سے دوبارہ جنگ۔ ۱۶۵۵ء میں شاہجہان نے گولکنڈہ پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ گولکنڈہ کا سلطان قطب شاہ مغلیہ سیادت کی پرواہ نہ کرتا تھا اور خراج کی ادائیگی کے وقت حیلے بہانے تراشتا تھا۔ نیز اُس نے شاہ ایران سے تعلقات اُستوار کر

لئے تھے۔ قطب شاہ نے خوش ہو کر کرناٹک کا علاقہ اپنے لائق وزیر میر جملہ کو دے دیا تھا لیکن اس چھوٹی سی ریاست (کرناٹک) سے حسد کی بنا پر اُس نے میر جملہ کے خاندان پر ناجائز سختیاں شروع کر دیں۔ میر جملہ مغلوں سے آملا اور اعلیٰ ترین منصبوں پر فائز رہا۔ میر جملہ کی بدولت مغلوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ نیز اورنگ زیب جیسے جرنیل کی قیادت میں مغلیہ فوج نے بہت جلد گولکنڈہ کو زیر کر کے پایۂ تخت کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان قطب شاہ نے صلح کی بات چیت کی لیکن اورنگ زیب گولکنڈہ کے الحاق کا تہیہ کر چکا تھا۔ گولکنڈہ کے سلطان نے دارا شکوہ کی سفارش سے شاہجہان کو راضی کر لیا اور 1656ء میں اورنگ زیب کو یہ حکم ملا کہ گولکنڈہ کا محاصرہ اُٹھا لیا جائے۔ صلح نامے کی رو سے گولکنڈہ نے سابقہ خراج کی رقوم کے علاوہ تاوان جنگ بھی ادا کیا، میر جملہ کی جاگیر بحال کی اور اُس کے بیٹے محمد امین کو رہا کر دیا۔ نیز قطب شاہ نے اپنی لڑکی کی شادی اورنگ زیب کے بیٹے محمد سلطان سے کر دی۔ شاہجہان نے گولکنڈہ کے الحاق کا سنہری موقع کھو دیا۔

بیجاپور سے جنگ۔ گولکنڈہ سے تصفیہ کرنے کے بعد اورنگ زیب نے شاہجہان کے حکم سے بیجاپور پر حملہ کر دیا۔ اس ریاست کے حالات بھی دگرگوں تھے اور خراج کی ادائیگی بند ہو چکی تھی۔ محمد عادل شاہ نے مغلوں کی اجازت کے بغیر کرناٹک سے جنگ کی تھی، نیز اُس کی وفات کے بعد مغل شہنشاہ کی اجازت کے بغیر اُس کے ایک رشتہ دار کو تخت پر بٹھا دیا گیا تھا اور بیجاپور کا دربار سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اورنگ زیب فتوحات کرتا ہوا بیجاپور کے پایۂ تخت پر قبضہ کرنے ہی

والا تھا کہ شاہجہان کے حکم سے جنگ بند کر دی گئی۔ داراشکوہ نے حسد کی بنا پر باپ کو غلط رائے دی اور بیجاپور کی زوال پذیر ریاست مغلیہ سلطنت میں مدغم ہونے سے بچ گئی۔ اگر اس مرحلے پر بیجاپور کا الحاق مغلیہ سلطنت سے ہو جاتا تو مرہٹے اس زوال پذیر ریاست میں لوٹ کھسوٹ مچا کر اپنی طاقت بڑھانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ بیجاپور کی ریاست نے ۱۶۵۷ء کے صلح نامے کی رو سے بھاری تاوان جنگ ادا کیا، نیز کلیانی، بیدر اور پرندہ کے علاقے مغلوں کے حوالے کیے۔

شاہ جہان کے خصائل!

شاہ جہان اعلےٰ جرنیل، شجاع اور نڈر جنگجو تھا۔ اپنے باپ کی زندگی میں ہی اُس نے کئی معرکے سر کیے۔ حصولِ تخت کے لئے اُس نے تخت کے دعویداروں کا خون بہانے سے گریز نہ کیا۔ لیکن وہ انصاف پسند۔ حلیم طبع اور فیّاض تھا۔ وہ مذہب کا دلدادہ اور پارسا تھا۔ اُس نے علماؤں کو فوقیت حاصل ہونے نہ دی۔ نہایت ہوشمندی سے اُس نے حدِ اعتدال کو قائم رکھ کر مذہبی رواداری اختیار کی۔ مطلق العنان بادشاہ ضرور تھا لیکن جبر و استبداد کا قائل نہ تھا وہ نفاست پسند، موسیقی اور مصوّری کا شوقین اور ادب و آرٹ کا سرپرست تھا۔ شاہ جہان شان و شوکت کا حامی تھا۔ اُس کے عہد میں شاہی دربار کی زینت اور دبدبہ منتہائے کمال کو پہنچا۔ اُسے فنِ تعمیر میں خاص مقام حاصل ہے۔ اُس کی عمارات سے شاہ جہان کی تمام صفات اُجاگر ہو جاتی ہیں۔ شاہی قلعے اور محل اُس کی شان و شوکت

اور دبدبے کی یاد دلاتے ہیں۔ موتی مسجد۔ لال مسجد سے اُس کا مذہبی رجحان اور پاکبازی عیاں ہے۔ دہلی۔ لاہور اور کشمیر کے باغات اُس کی طبیعت کے حسن کی دلالت کرتے ہیں۔ آگرہ میں اُس کی رفیقۂ حیات، کا خوبصورت روضہ یعنی تاج محل دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے اور عاشقِ زار کے سوگوار بڑھاپے کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں فن آرائش اور زیبائش کمال کو پہنچا۔ قیمتی پتھروں اور ہیرے جواہرات کے انتخاب میں شاہ جہان جوہریوں کی مانند تھا۔ گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے کہ اُس کے زریں عہد میں رعایا خوشحال تھی۔ ملک میں امن وامان اور آسودگی تھی۔ شاہ جہان کی حکومت پدرانہ شفقت کی حامل تھی اور اُس کے مشہور انجنیئر علی مردان خان نے آبپاشی کے لئے نہریں کھدوا کر ملک کو مزید خوشحال بنا دیا تھا۔

غیر ملکی سیاح :- شاہ جہان کے عہد میں غیر ملکی سیاحوں نے ہندوستان آکر کافی عرصہ بسر کیا اور ملکی حالات لکھنے کے علاوہ شاہ جہان کی سیرت پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان سیّاحوں کی بعض تحریریں غیر منصفانہ ہیں۔ انہوں نے شاہ جہان کو تعیش پسند بلکہ شہوت پرست لکھا ہے۔ فرانسیسی سیاح برنیئر (BERNIER) نے خاص طور پر شاہ جہان کے حالات لکھتے وقت غلط بیانی اور مبالغہ سے کام لیا ہے۔ بعض یورپی مؤرخین ان تحریروں کو چشم دید حالات قرار دے کر قابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ یورپی سیّاحوں کی تحریریں درست واقعات پر مبنی نہیں

ہیں۔ شاہ جہان کے عہد میں دو فرانسیسی سیاح برنیئر اور ٹریونیئر (Travenier) ہندوستان میں وارد ہوئے۔ ایک اطالوی سیاح منوچی (Manucci) بھی برِّ صغیر پہنچا۔ ان تینوں کے بیان کردہ حالات کافی دلچسپ ہیں۔

ٹریونیئر کے چند فقرات قابل ذکر ہیں:۔

"شاہ جہان اگرچہ عدل و انصاف میں سخت گیر تھا لیکن اُس نے ملکی مالیات اور نظم و نسق کو سنوار کر دیگر حکمرانوں پر سبقت حاصل کی۔ وہ بادشاہ ضرور تھا لیکن حکمرانی میں پدرانہ عنصر غالب تھا اور وہ رعایا کو اپنے بچے اور خاندان کے افراد سمجھتا تھا۔"

" He reigned not so much as a king over his subjects but as a father over his family and children. He excelled other monarchs in good administration and in the order and arrangements and finances as well as the system of justice which was stern."

منوچی نے شاہ جہان کو عیش پرست قرار دیا ہے لیکن وہ تسلیم کرتا ہے کہ شاہجہان کا نظم و نسق نہایت عمدہ تھا۔ بادشاہ بہت محنتی تھا اور اُس کے عہد میں امن و امان کی بدولت رعایا

خوشحال تھی۔ نیز وہ اپنی فراخ دلی کی بدولت رعایا میں ہر دلعزیز تھا۔

فرانسیسی طبیب برنیئر نے ہندوستان کے "چشم دید" حالات لکھے ہیں۔ جدید تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ برنیئر کی تحریریں لغو اور بے بنیاد ہیں۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ:۔

"شاہی افسران عمدہ ملکی قوانین کی سرتابی نہایت آسانی سے کر سکتے تھے۔ امراء خود غرض اور ابن الوقت تھے۔ صوبائی گورنر ظالم اور حریص تھے۔ کاشتکاروں کی زبوں حالی ناقابل بیان تھی اُن کی معاشی حالت دگرگوں تھی اور وہ ذلت کے عمیق گڑھے میں ۔۔ے ہوئے تھے۔ درباری شان و شوکت کی بقا کے لئے ملک بوجھل ٹیکسوں کے بار تلے دبا ہوا تھا۔ امراء (یعنی منصبداروں) کی وفات پر اُن کی تمام جائیداد بحق سرکار ضبط ہو جاتی تھی افسران کی ترقی کا انحصار شاہی مرضی پر تھا۔"

"His officials could disregard good laws with impunity. The chief men in the country were opportunists and time-servers. Provincial governors were rapacious, opporessive and ambitious. The people were demoralisced and spiritless; the peasantry was completely crushed......the country is ruined by the necessity of dafraying the enormous charges required to maintain the splendour of numerous court...... According to the laws of escheat all the property of the nobles was taken over by the king at rhe time of his death."

برنیئر کی مندرجہ بالا تحریر تاریخی حقائق کے سراسر خلاف ہے شاہ جہان کے عہد کی خوشحالی کو معاشی زبوں حالی قرار دینا اور ٹیکسوں کو بوجھل قرار دینا اصل حالات پر پردہ ڈالنے اور یاوہ گوئی کے مترادف ہے۔ برنیئر مغلوں کے منصبداری نظام کو سمجھنے سے بھی قاصر رہا اور اُس نے غلط طور پر یہ فتویٰ دیا کہ منصبداروں یا اُمراء کی وفات پر اُن کی تمام جائیداد ضبط ہو جاتی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ منصبداری نظام میں برنیئر ذات اور سوار کے فرق میں تمیز نہ کر سکا۔

منوچی اگرچہ شاہ جہان کے عدل و انصاف کی تعریف کرتا ہے لیکن اُس نے یہ لکھا ہے کہ شاہ جہان وحشیانہ سزائیں دیتا تھا اور ظالم افسروں کو کیفر کردار پر پہنچانے کے لئے وہ اکثر یہ حکم دیتا تھا کہ شاہی دربار میں ظالم افسر پیش کیا جائے اور زہریلا سانپ ڈسوانے سے اُسے موت کی سزا دی جاتی تھی۔ اس قسم کے حالات محض بکواس ہیں۔ تاریخی حقائق سے اُن کا رتی بھر بھی تعلق نہیں۔

ان سیاحوں کی دیکھا دیکھی بعض ہندو مؤرخین نے شاہ جہان

کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے اور اُس کی پاکدامن بیٹی جہان آراء کے متعلق بھی کئی ایک افسانے گھڑ لئے ہیں۔

ہم عصر مؤرخین اور خاص طور پر خافی خان شاہ جہان کی حمایت میں رطب اللسان ہیں۔ انھوں نے شاہ جہان کو انصاف کا پتلا۔ ہوشمند اور پارسا قرار دیا ہے۔ مسٹر ولز لی ہیگ رقمطراز ہیں کہ "ہندوستان کے ہم عصر مؤرخین نے شاہ جہان کو پارسا اور پرہیزگار بنا کر یہ لکھا ہے کہ اُس کے کردار میں کوئی خامی نہ تھی۔ اُس کے برعکس بعض یورپی سیّاحوں نے اُسے اخلاقی لحاظ سے مہیب حد تک گرا ہوا پیش کیا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ شاہجہان میں یہ دونوں باتیں نہ تھیں یعنی اُس کا کردار متناسب و موزوں تھا۔"

مغربی مؤرخین میں سے الفنسٹن اور لین پول نے شاہ جہان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ البتہ سمتھ صاحب کو شاہ جہان کے عیوب بڑھ چڑھ کر نظر آتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں کہ "شاہجہان نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی۔ خسرو کو قتل کروانے کے علاوہ تخت کے تمام دعویداروں پر ظلم کیا۔ وہ اپنے بیٹوں کو قابو میں نہ رکھ سکا اور اپنے بڑے بیٹے دارا پر حد سے زیادہ شفقت کر کے معاملات بگاڑ دیئے۔" سمتھ صاحب نے خوب سر مارا ہے اور شاہ جہان کی خامیاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مندرجہ بالا "خامیوں" سے شاہ جہان کے کردار یا اُس کے عہد کی درخشانی میں رتی بھر فرق نہیں پڑتا۔

فن تعمیر:۔ شاہ جہان کے عہد میں مغلیہ فنِ تعمیر اوج کمال کو

پہنچا۔ اُس کی عمارتوں میں تنوع اور زیبائش ہے۔ تاثر میں حسن و موزونیت کے علاوہ نزاکت و نفاست موجود ہے۔ عمارات کی دلکشی اور آرائش کو دیکھ کر انسان عش عش کر اُٹھتا ہے۔ اُس نے شاہی باغات بھی تعمیر کرائے۔ اُن میں سدا بہار درخت۔ پھل دار درخت۔ فوارے اور بارہ دریاں بنوائیں۔ لاہور۔ دہلی اور آگرہ میں شاہجہانی عہد کے شاہی باغات آج تک موجود ہیں۔ دہلی میں شاہجہان نے لال قلعہ اور جامع مسجد کی تعمیر میں سنگ سرخ استعمال کیا جو صوبہ بہار سے منگوایا گیا۔ ان عمارات سے شاہی شان و شوکت جھلکتی ہے۔ لاہور اور آگرہ کے قلعوں میں کئی ایک عمارات تعمیر کرائیں۔ ان میں سے خوابگاہ۔ نولکھا برج اور مثمن برج خاص طور پر قابل دید ہیں۔ شاہ جہان کے عہد میں کاشی کاری اور پچی کاری سے سجاوٹ کی گئی۔ اُس کی عمارات کی بلندی بے تحاشا نہیں بلکہ دروازوں کے رخ۔ گنبد و محراب کا تناسب۔ عمارتوں کا فرش اور دیواروں کی موٹائی سب کچھ سوچ سمجھ کر بنائے گئے ہیں عمارت کی نوعیت کے مطابق سجاوٹ کی گئی ہے۔ عمارتوں سے ہندووانہ اثرات بالکل غائب ہوئے۔ دوہری ساخت کے گنبد بھی ترک کر دئے گئے۔ شاہجہان کی تمام عمارتوں میں موزونیت پر زور دیا گیا۔ اکثر عمارتوں میں مردانہ رعب کی بجائے زنانہ نزاکت اور نفاست پائی جاتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ شاہجہان کی عمارتوں میں بے ساختہ پن اور دلربائی موجود ہے۔

قلعوں کی تعمیر میں فوجی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا۔ اُن کی

دیواروں کو درخشانی اور سجاوٹ کی بجائے مضبوطی کے اُصولوں پر تعمیر کیا گیا لیکن قلعوں کے اندر شاہی محل میں سجاوٹ موجود ہے اور سنگ مرمر کی جالی۔ کاشی کاری اور پچی کاری سے خوب کام لیا ہے بلکہ دیواروں میں مختلف رنگوں کے قیمتی پتھر بھی لگائے۔

شاہجہان کی تعمیر کردہ مسجدیں اکثر سادگی کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔ لیکن مسجدوں کو بیل بوٹوں، مختلف خطوط، رنگدار اینٹوں اور مختلف رنگ کے پتھروں سے خوب مزیّن کیا ہے۔ شاہ جہانی عہد کی عمارات کا گردو نواح بھی حسین اور موزوں ہے۔ شاہجہان کی اکثر عمارات آگرہ میں ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی۔ لاہور۔ ٹھٹھہ میں بھی اُس کی عمارات ہیں۔ باغات لاہور۔ کشمیر۔ دہلی اور آگرہ میں ہیں۔ ٹھٹھہ کی جامع مسجد رنگدار اینٹوں کی بنی ہوئی ہے اور دلکشی و رعنائی میں بے نظیر ہے۔ اُس کی تمام عمارات کی تفصیلات آخری باب میں مغلیہ فن تعمیر کے ضمن میں دی جائیں گی۔

تاج محل:- آگرہ میں شاہجہان کی چہیتی ملکہ ممتاز محل کا روضہ قابل دید ہے۔ یہ تاج محل کے نام سے مشہور ہے اور دنیا کے عجائبات میں شامل ہے۔ ممتاز محل نے ۱۶۳۱ء میں وفات پائی تھی۔ تاج محل کے بیرونی دروازے پر اس روضہ کی تاریخ تکمیل ۱۶۴۸ء کندہ ہے یعنی یہ روضہ سترہ برس میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ مُلّا عبدالحمید لاہوری نے لکھا ہے کہ تاج محل بارہ سال میں بنا اور اس پر پچاس لاکھ روپے صرف ہوئے۔ ظاہر ہے کہ عبدالحمید غلطی کا شکار ہوا ہے۔ ٹیورنیئر لکھتا ہے کہ تاج محل بائیس سال میں بنایا

گیا اور اس پر تین کروڑ روپے صرف ہوئے۔ اس سیاح کی تحریر بھی مستند نہیں ہے۔

تاج محل کی تعمیر کے لئے نگران انجینئر اُستاد عیسیٰ خان اور میر عبدالکریم تھے۔ اُن کو بھاری تنخواہیں ملتی تھیں۔ امانت خان شیرازی کو قندھار سے بلوا کر کتبے لکھوائے گئے۔ اسمٰعیل خان رومی نے گنبد تعمیر کیا۔ دہلی، آگرہ اور دیگر شہروں سے صاحب فن معمار اور سنگ تراش بلوائے گئے نیز غیر ملکوں سے بھی قیمتی پتھر منگوا کر روضہ تاج محل میں لگوایا گیا۔

یورپی سیاحوں میں سے پادری مانریق (Father Manrique) اور دی کاسترو (De Castro) یہ لکھتے ہیں کہ تاج محل کا ڈیزائن یا ماڈل ایک اطالوی نے بنایا تھا جس کا نام جیرونیمو ویرونیو (Geronimo Verones) ہے۔ بعض یورپی مورخین یہ سمجھتے ہیں کہ تاج محل کا ڈیزائن تیار کرنے والا ایک فرانسیسی انجینئر آسٹن دی بورڈیو (Austin de Bourdeax) تھا۔ مارشل۔ ہیول اور آرتھر پوپ جیسے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ تاج محل کی طرزِ تعمیر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یورپ کے انجینئر نے اس کا ماڈل تیار نہ کیا تھا۔ شاہجہان اپنی ملکہ کے پہلو میں تاج محل میں مدفون ہے۔

شاہجہانی دور کے چند مشاہیر

جاہ و جلال اور شان و شوکت کے لحاظ سے شاہجہان کا عہد

عظمت کا نشان ہے - پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ خوش حالی اور امن و امان کی وجہ سے بھی اس کا عہد سنہری دور کہلاتا ہے - اُس کے عہد کی عمارتیں اس قول کی تصدیق کرتی ہیں کہ "فن تعمیر میں مغلوں نے جنّوں اور بھوتوں کی مانند جسیم اور مضبوط عمارات بنا کر اپنے دور کا آغاز کیا، لیکن آخر میں جوہریوں کی مانند عمارتوں میں آرائش اور حسن پیدا کیا۔"

"The Mughals began as giants and ended as jewellers."

شاہجہانی عہد میں سلطنت کا انتظام عمدہ تھا - عدالتی انتظام اور انصاف قابل قدر تھا - خزانہ معمور تھا اور بادشاہ کا دربار شان و شوکت میں بے مثال تھا - اس دور میں علوم و فنون کی قدر و منزلت تھی، موسیقی اور مصوّری نے خاطر خواہ ترقی کی تھی، زراعت اور تجارت کو فروغ تھا، ہندو اور مسلمان رعایا امن چین کی زندگی بسر کر رہی تھی، قانون کی حرمت تھی اور سب کو بلا تمیز مذہب و ملت ترقی کے یکساں مواقع حاصل تھے - اس سنہری دور کے چند مشاہیر کا ذکر دلچسپی کا باعث ہو گا :-

(۱) **مرشد قلی خان** :- مرشد قلی خان مالیات کا ماہر تھا اور ایرانی نسل سے تھا - شاہجہان کے عہد میں جب اورنگ زیب دکن کا دوبارہ وائسرائے بنا تو مرشد قلی خان دیوان مالیات مقرر ہوا - اُس نے اپنی دانش مندی اور تدبّر سے لگان اراضی میں قابل قدر اصلاحات کیں اور آہستہ آہستہ دکن میں زمین کی پیمائش کر کے

ٹوڈرمل کا نظام ضبطی رائج کیا اور مقامی ضروریات کے مطابق اُس میں ضروری ترمیمیں کیں۔ اس نے لگان کی وصولی کے لیئے دکن کو پہاڑی اور دریائی خطوں میں تقسیم کیا، کسانوں کو تقاوی قرضے دیے اور 1656ء تک دکن میں کاشتکاری کو بے حد فروغ ہُوا جس سے سرکاری آمدنی بڑھ گئی۔

(۲) علی مردان خان:۔ علی مردان خان ابتدا میں قندھار کا ایرانی گورنر تھا لیکن شاہ ایران سے ناراض ہو کر مغلوں سے مل گیا اور قندھار ان کے حوالے کر دیا۔ اُس نے شاہجہانی دور میں اعلیٰ منصب پائے۔ وہ کابل اور کشمیر کا گورنر بنا، بعد میں پنجاب کا گورنر بھی رہا۔ علی مردان اعلیٰ منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین انجینئر بھی تھا۔ شالیمار باغ کو سیراب کرنے کے لیئے نہر اُسی نے بنوائی۔ اس کے علاوہ دریائے راوی سے آبپاشی کے لیئے نہریں کھدوانے میں اُس نے اپنی قابلیّت کا ثبوت دیا۔ اُس کا مرتبہ ہفت ہزاری ذات اور چھ ہزاری سوار تھا۔ اس نے 1657ء میں وفات پائی۔

(۳) آصف خان:۔ ملکہ نورجہاں کا بھائی آصف خان اعلیٰ سیاست دان تھا اور اپنے داماد کو تخت دلانے میں اُس نے خوب دانشمندی سے کام لیا۔ ممتاز محل اُس کی لڑکی تھی۔ شاہجہان کے تخت نشین ہونے پر اُسے وزیر اعظم کا عہدہ ملا۔ اُس نے 1641ء میں وفات پائی اور لاہور میں دفن ہُوا۔ وہ ہندی اور سنسکرت کے شعراء کا سرپرست تھا۔ اس کا مرتبہ نو ہزاری ذات وسوار تھا۔

(۴) سعد اللہ خان چنیوٹی:۔ شاہجہانی دور کا جیّد عالم سعد اللہ خان

چنیوٹ کے ایک غریب خاندان کا چشم و چراغ تھا لیکن محض اپنی لیاقت کی بنا پر ترقی کی منزلیں طے کر کے وزیر اعظم بنا اور ہفت ہزاری ذات و سوار کا منصب پایا۔ ایمانداری، جانفشانی اور علمیت میں وُہ یکتائے روزگار تھا۔ ۱۶۵۳ء میں وہ بلخ کے محاذ پر بطور جرنیل بھی گیا۔ سعداللہ خان کے بعد میر جملہ وزیر اعظم ہُوا۔

(۵) میر جملہ:۔ میر جملہ کا اصلی نام محمد سعید تھا۔ وہ اصفہان کا باشندہ تھا اور شیعہ مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ جواہرات کا تاجر بن کر ۱۶۳۰ء میں وہ دکن پہنچا اور وہاں عبداللہ قطب شاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ میر جملہ توپیں ڈھالنے میں ماہر تھا۔ اس کی دکنی جاگیر کی آمدنی بہت زیادہ تھی۔ بعد ازاں اس نے کرناٹک کی جاگیر کو ایک چھوٹی سی ریاست بنا لیا اور گولکنڈہ کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالے رکھا گولکنڈہ کے سلطان سے اس کے تعلقات بگڑ گئے تو دکن کے وائسرائے شہزادہ اورنگ زیب نے اُسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ شاہجہان نے اسے پنج ہزاری منصب بخشا۔ دہلی پہنچ کر میر جملہ شاہجہان کا وزیراعظم بنا۔ میر جملہ اعلیٰ جرنیل تھا اور اورنگ زیب کا گہرا دوست تھا۔ وہ اُسے اپنا محسن گنتا تھا۔ دارا کے خلاف میر جملہ نے اورنگ زیب کی بہت بڑی خدمت کی۔ نیز شجاع کے خلاف فوجی کارروائی کر کے اُسے اراکان کی جانب بھگا دیا۔

(۶) مشہور مؤرخین:۔ شاہجہانی دور میں متعدد تاریخیں لکھی گئیں اُس دور کے مؤرخین میں سے "بادشاہ نامہ" کا مصنف عبدالحمید لاہوری اور "منتخب اللباب" کا مصنف خافی خان بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ان

کے علاوہ عنایت خاں نے "شاہجہاں نامہ" لکھا اور محمد صالح نے "عمل صالح" کے عنوان سے اپنی شہرۂ آفاق کتاب لکھی۔ ان کے علاوہ شاہجہان کے دربار میں علماء، فضلا اور شاعروں کا جھرمٹ رہتا تھا ہندی اور سنسکرت کے علماء و شعراء کی بھی قدر کی جاتی تھی۔

شاہجہان کے بیٹوں میں تخت نشینی کی جنگ

ستمبر 1657ء میں شاہجہان سخت بیمار ہوا۔ اس کے چاروں بیٹوں نے جب یہ سنا کہ بادشاہ صاحب فراش ہے اور اس کے بچنے کی امید کم ہے تو ہر ایک شہزادے نے تخت کا وارث بننے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دی اور اپنے فوجی ذرائع سے ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے ہوئے۔ چاروں سگے بھائی تھے اور ممتاز محل کے بطن سے تھے، لیکن مغلیہ خاندان میں تخت کا وارث بننے کا واضح اصول صرف یہ تھا کہ بزور شمشیر تخت کے باقی تمام دعویداروں کا خاتمہ کر دیا جائے اور بھائیوں کا خون گرا کر تاج و تخت حاصل کیا جائے۔ شاہجہان کے بیٹوں میں تخت نشینی کی یہ جنگ بادشاہ کی زندگی میں ہی اس کی بیماری کے ایام میں شروع ہو گئی اور جولائی 1658ء تک تخت کے دعویداروں میں سے صرف اورنگ زیب بچا جس نے باپ کو (جو صحتیاب ہو چکا تھا) آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ البتہ اس کی تاجپوشی اگلے سال جون 1659ء میں ہوئی۔ شاہجہان اس کے بعد آٹھ برس زندہ رہا اور اپنے بیٹے اورنگ زیب کی قید میں 1665ء میں وفات پائی۔ اورنگ زیب کے حامی خواہ کچھ بھی صفائی پیش

کریں، یہ حقیقت ہے کہ اس نے حصول تخت اور اقتدار کی خاطر باپ کو بھی معزول کر دیا اور اس کی طبعی موت کا انتظار نہ کیا بعض مؤرخین یہ قیاس آرائی کرتے ہیں کہ اگر اورنگ زیب اپنے باپ کو صحت یابی کے بعد تخت سے معزول نہ کرتا تو وہ اورنگ زیب کو زندہ نہ چھوڑتا۔

جنگ تخت نشینی کے واقعات قلمبند کرنے سے پہلے شاہجہان کے چاروں بیٹوں کی عادات و خصائل اور ان کے فوجی ذرائع پر روشنی ڈالی جائے گی:۔

دارا شکوہ:۔ ستمبر 1657ء میں شاہجہان کا سب سے بڑا اور لاڈلا بیٹا دارا شکوہ 43 سال کا تھا۔ وہ اگرچہ پنجاب کا گورنر تھا لیکن صوبے کی حکومت اپنے نائبوں کے سپرد کر کے وہ باپ کے پاس آگرہ میں رہتا تھا۔ منوچی (Manucci) سیاح نے لکھا ہے کہ دارا خوش وضع، ملنسار، خوش زبان اور باوقار انسان تھا، اس کے خیالات میں تنگ نظری نہ تھی، وہ نرم دل انسان اور ہمدردی کا پتلا تھا لیکن خودسر اور مغرور تھا۔ دوسروں سے رائے لینے کی ضرورت نہ سمجھتا تھا اور اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ باپ کی مانند وہ بھی ہر شخص کا منظور نظر ہے۔ مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ دارا مذہبی خیالات میں آزاد روش کا حامی تھا۔ نیز فلسفہ و تصوّف میں دلچسپی لینے کے باعث وہ الحاد کے قریب تر ہو چکا تھا۔ سنی مسلمان اس کو مرتد گنتے تھے اور اس کی تخت نشینی کو اسلام کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس وہ اورنگ زیب کے زہد و تقویٰ کے مداح تھے۔ باپ کے لاڈ پیار کی بدولت دارا نہ تو فوجی مہارت حاصل کر

سکا نہ صحیح طور پر سلطنت کے انتظامی امور کو سمجھ سکا۔ اس کی اصل تباہی کا باعث یہ تھا کہ وہ اپنے بہی خواہوں سے بھی صلاح و مشورہ نہ کرتا تھا۔ وہ ویدانت فلسفے کا شائق تھا اور اس نے اُپنشد کا فارسی میں ترجمہ کروایا تھا۔ دارا اورنگ زیب کی فوجی لیاقت، سلیقہ اور انتظامی صلاحیتوں سے حسد کرتا تھا۔ خوشامدیوں کا جمگھٹا ہر وقت اس کے گرد رہتا تھا۔ لین پول کی رائے یہ ہے کہ وہ جذباتی، حساس اور زود رنج تھا، تدبر سے عاری تھا اور صائب رائے نہ رکھتا تھا۔

باپ کے صاحب فراش ہوتے ہی وہ نائب سلطنت بن گیا لیکن شروع سے ہی اس نے سخت غلطی کا ارتکاب کیا اور شاہجہان کی بیماری کے بارے میں تمام اطلاعات بند کر دیں۔ اس کے تینوں بھائی یہ سمجھے کہ شاہجہان مر چکا ہے اور دارا اپنی گرفت مضبوط کر رہا ہے۔ پس دارا کے تمام بھائیوں نے تخت کے حصول کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

شجاع :۔ شاہجہان کا دوسرا بیٹا شاہ شجاع اس وقت اکتالیس سال کا تھا اور بنگال کا گورنر تھا۔ وہ عیش کوش اور تن آسان تھا لیکن جرأت اور شجاعت میں بابر کی مانند تھا۔ شجاع کی زبان رسیلی تھی اور وہ بہت جلد لوگوں کا دل موہ لیتا تھا۔ وہ شیعہ عقاید رکھتا تھا اور اس فرقے کے درباری امراء اس کے حامی تھے۔ وہ بنگال کی دولت سے اپنے بھائیوں کا اچھی طرح سے مقابلہ کر سکتا تھا لیکن پیش از وقت منصوبے سوچنے کی اسے عادت نہ تھی اور

ہمایوں کی مانند وہ بیویوں کی محفل میں خوب خوش رہتا تھا:۔

"Shuja's Zenana was the prison of his career.

(S. Lane Poole)

وہ عمدہ ذوق کے علاوہ سپاہیانہ جوہر بھی رکھتا تھا لیکن بنگال کی خوش حالی اور شراب کی لت نے اسے نکما کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس کی قوت فیصلہ کمزور پڑ چکی تھی۔

اورنگ زیب:۔ شاہجہان کا تیسرا بیٹا اورنگ زیب اس وقت انتالیس برس کا تھا۔ اس نے ابتدائے شباب سے فوجی کارناموں اور انتظامی صلاحیتوں کی بدولت کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ وہ مختلف صوبوں میں گورنر رہا تھا۔ شاہجہان کی بیماری کے دنوں میں وہ دکن کا وائسرائے تھا اور اس کے زہد و تقویٰ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت اس کی شیدائی تھی کیونکہ وہ سنی عقاید رکھتا تھا اور الحاد کا سخت دشمن تھا۔ انگریز مؤرخ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب نے مطلب برآری کے لئے جان بوجھ کر مذہب کی محبت اور سادہ زندگی کا لبادہ پہنا ہوا تھا، اس کی دور اندیشی، ریاکاری اور ہوش مندی نے اسے ملک بھر کے مسلمانوں کا ہیرو بنا دیا تھا۔ یہ رائے معاندانہ معلوم ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بادشاہ بن کر بھی اورنگ زیب نے مذہب کی خاطر سیاسی مصلحتوں کی رتی بھر پرواہ نہ کی۔ پس اس میں ریاکاری اور خلوص کے فقدان کی بجائے اعلیٰ منصوبہ بندی، امور کی بر وقت جائزہ لینے کی اہلیت اور ہمت و شجاعت باقی بھائیوں کی نسبت کہیں زیادہ تھی۔ اس نے بے پناہ فوجی لیاقت سے کام

لے کر اپنے سیاسی حریفوں کو مات دی۔ اس کی جنگی چالوں کو مکروفریب قرار دینا زیادتی ہے۔ چونکہ اکثر یورپین و ہندو مؤرخین اورنگ زیب سے عناد رکھتے ہیں اس لئے اس کے عہد کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ اورنگ زیب خاموش طبع تھا اور اس کے جذبات کو بھانپ لینا مشکل امر تھا۔ سخت مصائب میں بھی اس نے بلند ہمتی اور استقلال کا پورا ثبوت دیا۔

مراد:۔ شاہجہان کا سب سے چھوٹا بیٹا مراد تھا جس کی عمر اس وقت تینتیس برس کی تھی۔ وہ اس وقت گجرات کا گورنر تھا۔ وہ فنون سپہ گری میں یکتا، شیر کی مانند بہادر لیکن سیاست میں بالکل کورا تھا۔ وہ صاف گو اور نڈر تھا۔ شراب کا شائق تھا اور سادہ لوحی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔

جنگ کا آغاز:۔ شاہجہان کے صاحب فراش ہوتے ہی شجاع اور مراد نے اپنے اپنے صوبوں میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور تخت دہلی کے حصول کے لئے مستعد ہو گئے۔ انہوں نے اپنے علاقوں میں اپنے نام کے سکے جاری کر دیئے اور جمعہ کے خطبے میں اپنا نام شامل کروا دیا۔ دارا نائب سلطنت بن چکا تھا۔ اگر شاہجہان مر جاتا تو وہ بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیتا۔ وہ آگرہ میں نائب سلطنت کی حیثیت سے سیاہ و سفید کا مالک تھا اور اس نے تخت سنبھالنے کے لئے اپنے قدم مضبوط کرنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ شاہجہان کے نام پر فرمان جاری کرتا تھا اور سرکاری خزانہ سمیت سلطنت کے تمام وسائل اس کے قبضے میں تھے۔ اگر اس میں دور اندیشی یا فوجی

قابلیت ہوتی تو وہ باپ کے تخت کا وارث بنتا۔ صرف اورنگ زیب نے اپنی بادشاہت کا اعلان نہیں کیا تھا اور وہ نہایت تدبر اور احتیاط سے شاطرانہ چالیں چل رہا تھا تاکہ اپنا راستہ صاف کر سکے۔

دارا نے اورنگ زیب کو کمزور کرنے کے خیال سے مالوہ کے گورنر شائستہ خان کو واپس بلا لیا کیونکہ وہ اورنگ زیب کا حامی تھا۔ نیز دارا نے دکن کے مشہور جرنیل اور میر توپخانہ میر جملہ کو آگرہ آنے کا حکم دیا۔ میر جملہ کے اہل و عیال اُن دنوں دہلی میں تھے میر جملہ خفیہ طور پر اورنگ زیب سے مل گیا اور اپنے اہل و عیال کو بچانے کے لئے اس نے اورنگ زیب سے جھوٹ موٹ کی معمولی جھڑپ کے بعد توپخانہ اس کے حوالے کر دیا۔ اورنگ زیب نے ظاہر کیا کہ میر جملہ کو شکست کے بعد گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شاہی توپخانے سے اورنگ زیب کی طاقت کافی بڑھ گئی۔ نیز اورنگ زیب نے دانش مندی سے کام لے کر مراد سے سمجھوتا کر لیا۔ دونوں بھائیوں کی فوجوں کا اتحاد ہوا اور انہوں نے آگرے کی جانب کوچ کیا۔ طے یہ پایا کہ "برِصغیر کی سلطنت مراد اور اورنگ زیب باہم تقسیم کر لیں گے۔ پنجاب، کابل، کشمیر اور سندھ پر مراد کی حکومت ہوگی اور باقی ہندوستان اورنگ زیب کے حوالے ہوگا۔ تاریخی طور پر یہ کہانی غلط ہے کہ اورنگ زیب نے مراد کو یہ حکمہ دیا تھا کہ میں درویشی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں (یعنی مراد کو) بادشاہ بنا کر حج کو چلا جاؤں گا اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کروں گا۔ یہ روایت لوگوں نے گھڑی ہوئی ہے۔

اورنگ زیب نے دکن میں اپنے بیٹے معظم کو انتظامی امور کے لئے رکھا اور خود اپنی فوج سمیت مراد سے اُجین کے قریب دیپالپور کے مقام پر جا ملا اور دونوں بھائیوں کی فوجیں آگرہ کی جانب روانہ ہوئیں۔

اس دوران میں شاہ شجاع کے خلاف دارا نے اپنے بیٹے سلیمان شکوہ اور مشہور راجپوت جرنیل جے سنگھ کی سرکردگی میں فوج بھیجی۔ شجاع کو فروری 1658ء میں بہادر گڑھ (بنارس کے قریب) شکست فاش ہوئی۔

اسی دوران میں دارا نے ایک زبردست فوج جسونت سنگھ اور قاسم خان کی سرکردگی میں مراد اور اورنگ زیب کے خلاف بھی بھیجی۔ اپریل 1658ء میں اجین کے قریب دھرمت (Dharmat) کے مقام پر شاہی فوجوں کو شکست ہوئی اور دارا پیچ وتاب کھا کر مراد اور اورنگ زیب کے مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔

شاہجہان صحت یاب ہو چکا تھا۔ دارا کو چاہئے تھا کہ باپ کو ساتھ لے جاتا تاکہ اس کی شکل دیکھتے ہی مراد اور اورنگ زیب لڑنے سے باز رہتے یا ان کی فوجیں تتر بتر ہو جاتیں، لیکن دارا اپنے بھائیوں کو کچل دینے پر تلا ہوا تھا۔ نیز اس نے جلد بازی سے کام لے کر بنگال سے اپنے فتح مند بیٹے سلیمان شکوہ کی فوج کا انتظار بھی نہ کیا اور آگرہ سے روانہ ہو کر اپنے دونوں بھائیوں کے مقابلے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

سامو گڑھ کا معرکہ:- 29 مئی 1658ء کو سامو گڑھ کے مقام پر دارا کی فوج سے مراد اور اورنگ زیب کی فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ دارا کی فوج کے راجپوتوں نے خوب جانبازی دکھائی لیکن اس کی

فوج کے مسلمان سپاہی دل سے اورنگ زیب کے حامی تھے۔ اس کے باوجود گھمسان کا رن پڑا۔ لڑائی کے دوران میں دارا کا ہاتھی تیر لگنے سے زخمی ہو گیا اور اس نے یہ فاش غلطی کی کہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کے سپاہی یہ سمجھے کہ دارا مارا گیا ہے اور وہ بددل ہو کر بھاگ اُٹھے۔ دارا ساموگڑھ سے بھاگ کر آگرہ جانے کی بجائے دہلی بھاگ گیا اور وہاں سے لاہور ہوتا ہوا ملتان، ٹھٹھہ کاٹھیاواڑ اور سوات چلا گیا جہاں اس نے ایک اور فوج بھرتی کی۔

اس دوران میں اورنگ زیب اور مراد کی فوج نے آگے بڑھ کر جون 1658ء میں آگرے پر قبضہ کر لیا اور اورنگ زیب کے حکم سے شاہجہان کو آگرے کے قلعے کے اندر شاہی محل (مثمن برج) میں نظر بند کر دیا گیا جہاں وہ آٹھ برس یعنی اپنی موت تک (1666ء) اسی حالت میں رہا۔ اورنگ زیب کی رائے یہ تھی کہ شاہجہان کی غلطی سے ملک کے سیاسی حالات بگڑ گئے ہیں لہٰذا اُسے تخت پر بحال نہ کرنا چاہیئے۔

سورت پر قبضہ کرنے کے بعد دارا نے اپنے حامیوں کی اس رائے کو نہ مانا کہ دکن جا کر مزید مہلت ملنے پر اورنگ زیب کو تنگ کیا جائے۔ اس کے برعکس دارا نے اپنے تعاقب میں آنے والی فوج کا سامنا کیا اور اجمیر کے قریب مارچ 1659ء میں پھر شکست کھائی۔ اس کے بعد وہ سندھ بھاگ گیا اور ملک جیون کے پاس پناہ لی۔ ملک جیون نے اُسے اورنگ زیب کی افواج کے حوالے کر دیا اور جون 1659ء میں اورنگ زیب کی تاجپوشی سے پہلے دارا

کو دہلی لا کر قید کر دیا گیا۔ بعد میں دارا کو مرتد ہونے کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔

مراد کی موت :۔ ساموگڑھ کے معرکے کے فوراً بعد اورنگ زیب کے حکم سے ایک محفل طعام کے بعد مراد کو نشے کی حالت میں سازش کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور اُسے گوالیار کے قلعے میں بند کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے گجرات کے دیوان کے قتل کی پاداش میں موت کی سزا ملی۔ دارا اور مراد کے خاتمے کے بعد اورنگ زیب کے لئے شجاع اور سلیمان شکوہ (دارا کا بیٹا) سے نپٹنا باقی رہ گیا۔ ساموگڑھ کے معرکے کی خبر سن کر سلیمان شکوہ بغیر لڑے گڑھوال (Garhwal) کی جانب بھاگ گیا۔ لیکن اُس علاقے کے سردار نے دسمبر ۱۶۶۰ء میں اُسے گرفتار کر کے اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ سلیمان شکوہ گوالیار کے قلعے میں قید رہا اور کچھ عرصہ بعد وہیں مر گیا۔ دارا کا ایک خورد سال بچہ سپہر شکوہ زندہ بچا جسے اورنگ زیب نے پرورش کر کے اپنی لڑکی سے بیاہ دیا۔

شجاع نے بنگال میں پھر سر اُٹھایا اور بنارس، الہ آباد اور جونپور پر قبضہ جما لیا۔ اورنگ زیب نے اپنے لائق جرنیل میر جملہ کو اُس کے خلاف بھیجا جس نے مئی ۱۶۶۰ء میں شجاع کو شکست دے کر اراکان کی پہاڑیوں کی جانب بھگا دیا۔ اس علاقے کے راجہ نے شجاع کو اہل و عیال سمیت مروا ڈالا۔ غلط طور پر یہ مشہور ہے کہ شجاع کو اراکان کے جنگل میں چیتے نے پھاڑ کھایا۔

پس تخت نشینی کی جنگ میں اورنگ زیب نے ایک ایک کر کے اپنے تمام رقیبوں کا خاتمہ کر ڈالا اور خود عالمگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

اورنگ زیب کی کامیابی کی وجوہات:۔ تخت نشینی کی جنگ میں اورنگ زیب کی کامیابی میں کئی عناصر کارفرما تھے۔ اُس کی کامیابی کی اہم وجوہات مندرجہ ذیل تھیں۔

(۱) فوجی لیاقت:۔ تمام بھائیوں کی نسبت اورنگ زیب بہترین جرنیل تھا اور اعلیٰ فوجی لیاقت کا مالک تھا۔ اُس نے قندھار اور دکن میں فوجی کارنامے دکھا کر شہرت حاصل کر لی تھی۔ وہ جنگی چالوں سے خوب واقف تھا۔ اُس نے دانش مندی اور صبر سے کام لیا اور ایک ایک کر کے سب دشمنوں کا خاتمہ کر ڈالا دارا کی شکست کے بعد اُس نے جے سنگھ اور جسونت سنگھ کو اپنی ملازمت میں لے کر اُن کی فوجی قابلیت سے فائدہ اُٹھایا۔

(۲) مراد سے مفاہمت:۔ ابتدا سے ہی اورنگ زیب نے مراد سے مفاہمت کر کے اُس کے فوجی ذرائع سے اپنی طاقت بڑھا لی اور سامو گڑھ کے معرکہ کے بعد بڑی چستی سے کام لے کر مراد کو گرفتار کر لیا اور اُسے حیلے بہانے سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اورنگ زیب کے مقابلے میں مراد بالکل سادہ لوح تھا اور سیاست اُس کے پاس بھی نہ پھٹکی تھی۔

(۳) علی مردان:۔ اورنگ زیب نے بروقت علی مردان کو اپنے ساتھ ملا کر شاہی توپخانے پر قبضہ کر لیا اور علی مردان کی خواہش

کے مطابق (اُس کے خاندان کی جان بچانے کے لئے) اُسے گرفتار کر لیا۔ توپ خانے کی بدولت اورنگ زیب کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ بعد ازاں اُس نے علی مردان کو اعلیٰ منصب عطا کیے۔ شجاع کے خلاف فوجی کارروائی میں علی مردان نے اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔

(۴) مذہبی ہیرو:۔ اورنگ زیب کی کامیابی کی اہم ترین وجہ یہ تھی کہ وہ برّصغیر کے علاقوں میں پکا سنّی ہونے کی بنا پر مقبول تھا۔ وہ متقی لوگوں میں پرہیز گار اور اسلام کا خادم مشہور تھا۔ اس کے برعکس دارا کی مذہبی آزاد خیالی الحاد کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی اور لوگ اُسے مرتد خیال کرتے تھے۔ خود دارا کی اپنی فوج میں اورنگ زیب کے بہی خواہ موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اورنگ زیب کی فوج کو خوراک اور دیگر ضروریات کا سامان ہر علاقے سے نہایت آسانی کے ساتھ میسّر ہو جاتا تھا۔

(۵) دارا کی غلطیاں:۔ دارا نے فاش غلطیاں کیں اور اپنی ان غلطیوں کی وجہ سے اورنگ زیب سے مات کھائی۔ سب سے پہلے اُس نے شاہجہان کی صحت کے بارے میں خبریں بند کر کے سنسنی پھیلا دی، لیکن وہ اورنگ زیب کے جاسوسوں پر قابو نہ پا سکا۔ خود اُس کی بہن روشن آرا آگرہ دربار کے تمام حالات اورنگ زیب کو مہیّا کر دیتی تھی۔ دارا نے ایک اور غلطی یہ کی کہ سلیمان شکوہ کی فوج کا انتظار کیے بغیر ساموگڑھ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اگر وہ ساموگڑھ کی جنگ میں شاہجہان کو ہاتھی پر سوار کر کے لے آتا تو شاید لڑائی کی نوبت نہ آتی اور وہ بعد ازاں

ولیعہد نامزد ہو جاتا۔ اس کے علاوہ لڑائی کے عین دوران میں وہ ہاتھی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اُس کی فوج خالی ہودج کو دیکھ کر بددل ہو گئی اور یہ سمجھ کر کہ دارا مارا گیا ہے، بھاگ اُٹھی۔ ساموگڑھ کی شکست کے بعد اُسے چاہیئے تھا کہ آگرہ جا کر فوج کی دوبارہ تنظیم کرتا اور شاہی خزانے سے کام لیتا لیکن وہ گھبرا گیا اور تعاقب میں آنے والی فوج کے ڈر سے دہلی، لاہور، ملتان وغیرہ میں ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ آخرکار غلط قسم کے سردار (جیون خاں) کے پاس پناہ لی جس نے اُسے گرفتار کر کے اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ پس ہمایوں کی مانند دارا نے بھی لاتعداد غلطیاں کیں اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔

(۶) **سلیمان شکوہ:**۔ دارا کا بیٹا سلیمان شکوہ نہایت سست اور کاہل ثابت ہوا۔ شجاع کو شکست دے کر اُس نے حالات کا جائزہ غلط لیا اور آگرہ سے دور رہ کر سنہری موقع کھو دیا کیونکہ اُس کی فوج کے بغیر دارا نے (جلدبازی کی بنا پر) ساموگڑھ کی جنگ لڑی اور شکست کھائی۔ ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد سلیمان شکوہ بزدل ثابت ہوا اور بغیر لڑے بھاگ اُٹھا۔ اُس نے بھی دارا کی مانند غلط میزبان چنا اور گڑھوال کے سردار نے اُسے اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔

(۷) **اورنگ زیب کی صفات:**۔ سب مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اورنگ زیب کی کامیابی کا زیادہ انحصار اُس کی ذاتی صفات پر ہے۔ وہ اپنے تمام بھائیوں کی نسبت ٹھنڈا دل و دماغ رکھتا تھا۔ جنگی تجربہ رکھتا تھا اور اپنی شاطرانہ چالوں سے دشمن کو بے بس کر دیتا

تھا۔ چست و چالاک تھا، بروقت حملہ کر کے دشمن کو مضبوط ہونے کا موقع نہ دیتا تھا۔ اُس نے صبر و تحمل سے کام لے کر ایک ایک کر کے اپنے تمام رقیبوں اور تخت کے دعویداروں کو ختم کر ڈالا۔ اورنگ زیب جیسی سیاست، فہم و فراست اور چالاکی اُس کے بھائیوں میں سرے سے موجود نہ تھی۔

اورنگ زیب لیاقت۔ تنظیم۔ ہردلعزیزی اور شاطرانہ چالوں میں اپنے بھائیوں کی نسبت بہت بلند تھا۔ ان صفات کی بدولت کامیابی نے اُس کے قدم چومے۔ نیز وہ مستعد اور باعمل تھا۔ اُس کے بھائی سستی اور غفلت کا شکار تھے اور اپنے اعضاء کو بروقت جنبش نہ دیتے تھے۔ اکثر مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ اورنگ زیب کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ برِّصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت اُسے مذہبی ہیرو سمجھتی تھی اور اُس کے اہم ترین رقیب دارا کا الحاد کافی مشہور تھا۔ لوگ اُسے مرتد سمجھتے تھے اور اُس کی حمایت پر آمادہ نہ تھے۔ خود دارا کی اپنی فوج میں اورنگ زیب کے بہی خواہ موجود تھے۔

Typical Questions

Q. 1. Show that Sıah Jahan's reign marked the cl imax of the Mughal Empire.

Q. 2. " The most glorious period of Mughal history." How far is it a correct estimate of the reign of Shah Jahan."

Q. 3. Describe Shah Jahan's North-west Frontier and Central Asian policy.

Q. 4. Briefly describe the chief stages in the expansion of Mughal power in the Deccan till the Bijapore Treaty of 1636 A. D.

Q. 5. " It is in the domain of literature, art and architecture that the reign of Shah Jahan is most distinguished." Elucidae this remark.

Q. 6. " Shah Jahan was a magnificent monarch." Justify this statement.

Q. 7. Examine critically one of the following statements :—

(i) " Shah Jahan's rule was an epoch of grandeur unmixed with symptoms of decay."

(ii) " The reign of Shah Jahan sounded the death-knell of the Mughal Empire and the decline of its economic system.

Q. 8. Briefly describe the chief events of the War of succession among Shah Jahan's sons. What were the causes of Aurangzeb's success ?

Q. 9. " Shah Jahan was the prince of builders and to him we owe some of the master-pieces of Mughal architecture." Discuss.

Q. 10. Write short notes the followiag :—

(*a*) Murshid Kuli Khan.

(*b*) Ali Mardan Khan.

(*c*) Mir Jumla.

(*d*) The Taj at Agra.

(*e*) Manucci.

(*f*) Travnier

امتحانی سوالات

۱- شاہ جہاں کے عہد میں مغلیہ سلطنت منتہائے کمال کو پہنچی۔ وضاحت کیجئے۔

2- یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ شاہجہانی عہد مغلیہ تاریخ کا درخشاں باب تھا؟

۳- شاہ جہاں کی وسط ایشیائی پالیسی اور شمالی مغربی سرحدی پالیسی کا جائزہ لیجئے۔

4- صلحنامۂ بیجاپور (1636ء) تک دکن میں مغلوں کی وسعت پذیری کا حال قلمبند کیجئے۔

5- "شاہ جہاں کا عہد ادب۔ آرٹ اور فن تعمیر میں ممیز ہے"۔ وضاحت کیجئے۔

6- "شاہ جہاں پُر شکوہ شہنشاہ تھا"۔ تبصرہ کیجئے۔

7- مندرجہ ذیل آراء میں سے کسی ایک کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

(i) "شاہ جہاں کا عہد حکومت بے شک درخشاں تھا لیکن زوال کا آغاز ہو چکا تھا"

(ii) "شاہ جہانی عہد سے معاشی بدحالی شروع ہوئی اور سلطنت کے زوال کا بگل بج گیا"

8- شاہ جہاں کے بیٹوں میں جنگِ تخت نشینی کا حال بیان کیجئے نیز اورنگ زیب کی کامیابی کی وجوہ گنوائیے۔

۹- "شاہ جہاں فن تعمیر کا شہزادہ تھا اور مغلیہ فن تعمیر کے شاہکار اُس کے عہد میں ہی ملتے ہیں"۔ تبصرہ کیجئے۔

۱۰- مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھئے:-

(ا) مرشد قلی خاں (ب) علی مردان خاں (ج) میر جملہ (د) تاج محل آگرہ۔ (ھ) منوچی (اطالوی سیاح) (و) ٹریونیئر (فرانسیسی سیاح)

تیتیسواں باب

محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر

جنگ تخت نشینی کے خاتمے پر اورنگ زیب نے عالمگیر کا لقب اختیار کیا اور اکتیس جولائی 1658ء کو تخت نشین ہوا۔ اُس نے مراد بخش کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور اپنے بوڑھے باپ کو بھی آگرہ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ دارا شکوہ اور شجاع کو اپنے راستے سے ہٹانے کے درپے ہو۔ ان دونوں بھائیوں کو زک دینے کے بعد اُس کی تاجپوشی دہلی میں 15 مئی 1659ء کو ہوئی۔ اُس نے بیس فروری 1707ء تک حکومت کی۔

بادشاہ بننے سے قبل اورنگ زیب مختلف صوبوں میں گورنر کے عہدے پر فائز رہا اور اُس نے اعلیٰ منتظم ہونے کا ثبوت دیا۔ وہ 1636ء سے لے کر 1644ء تک (پورے آٹھ سال) دکن کا وائسرائے رہا۔ 1645ء سے 1647ء تک وہ گجرات کا وائسرائے تھا۔ 1647ء میں اُسے بلخ کی مہم پر بھیج دیا گیا وہ ماوراالنہر کو فتح نہ کر سکا لہٰذا اُسے واپس بلا کر 1648ء میں ملتان کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر وہ چار سال تک

فائز رہا۔ 1652ء میں اُسے دوبارہ قندھار کی تسخیر کے لیئے بھیجا گیا لیکن طویل محاصرے کے باوجود قندھار فتح نہ ہوا۔ شاہ جہان نے اورنگ زیب کو واپس بلا کر 1652ء میں دکّن کا وائسرائے بنا دیا۔ 1658ء تک اورنگ زیب دکّن کا وائسرائے تھا۔ دکّن سے ہی اُس نے جوڑ توڑ کر کے جنگ تخت نشینی میں کامیابی حاصل کی اور برِّ صغیر کا شہنشاہ بن بیٹھا۔

خصائل:۔ اورنگ زیب نہایت زیرک اور ہوشمند تھا۔ وہ عربی اور فارسی میں مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے ہندی اور ترکی بھی سیکھی۔ قرآن اور حدیث کو اُس نے شوق سے پڑھا۔ فنون حرب میں بھی مہارت حاصل کی لیکن مصوّری، موسیقی اور فنونِ لطیفہ میں اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ پکّا سنّی تھا اور پابند شریعت تھا۔ اُس نے حکمرانی کرتے وقت شریعت کے اُصولوں کی پوری طرح سے پابندی کی۔ مؤرخین اُسے انتہا پسند پیوریٹن (Puritan) کہتے ہیں۔ بعض نے اُسے مکر و فریب اور ریا کاری کا پتلا قرار دیا ہے۔ لیکن یہ رائے درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کے زہد اور تقویٰ، اُس کی سادہ زندگی، محنت اور عزم و استقلال کی داد اُس کے دشمنوں نے بھی دی ہے۔ جنگ تخت نشینی میں وہ ذاتی صفات یعنی اپنی دانشمندی، سیاست دانی، تدبّر اور فوجی قابلیت کی بنا پر کامیاب ہوا۔ اُس نے اپنے طویل عہد حکومت میں اسلامی شریعت کی پوری پوری پابندی کی — کسی سیاسی مصلحت کی رتی بھر پرواہ نہ کرتا تھا

وہ حتی المقدور ذاتی اور ملکی معاملات میں اسلامی اصولوں پر کاربند رہتا تھا۔ اس کے اصول کامل طور پر غیر لچکدار تھے۔ ہندو مؤرخین نے اس کی اصول پرستی کو تعصب کا نام دیا ہے اور اسے تنگ نظر بادشاہ قرار دیا ہے۔ محتاط انگریز مؤرخ اسے مذہبی انتہا پسند یا پیوریٹن کہتے ہیں۔

تخت نشین ہوتے ہی اس نے غیر اسلامی ٹیکس منسوخ کر دئے جن کی تعداد تقریباً اسی (80) تھی۔ البتہ اس نے جزیہ دوبارہ لگا دیا۔ یہ اقدام مصلحت اندیشی کے سراسر خلاف تھا۔ اس کے آباؤ اجداد نے جزیہ معاف کر کے ہندو رعایا کو خوش کر لیا تھا لیکن اورنگ زیب نے یہ جزیہ دوبارہ عاید کر کے ہندو رعایا کو ناراض کر لیا حالانکہ جزیہ کی آمدنی بھی زیادہ نہ تھی۔ نئی پالیسی کے بارے میں لین پول رقمطراز ہے کہ "اورنگ زیب مذہب کے سامنے سلطنت کی بالکل پرواہ نہ کرتا تھا۔"

اورنگ زیب شب و روز محنت کرتا تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی جوا بازی۔ شراب نوشی اور عصمت فروشی قطعی طور پر بند کر دی۔ اس نے شاہی دربار سے بھی غیر اسلامی رسوم اور شان و شوکت کو ختم کر ڈالا۔ اس نے دنیاوی لذتوں میں ڈوبے ہوئے عیش کوش اور تن آسان امراء کو راہ راست پر لانا چاہا لیکن وہ راہ راست پر نہ لگ سکے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں مغلیہ منصبدار اور جرنیل نفیس ریشمی لباس پہن کر پالکیوں میں بیٹھ کر میدان جنگ کو جاتے تھے۔ لشکرگاہ میں ان کی بیویوں اور لاتعداد نوکرانیوں

کی موجودگی کی بدولت میلہ سا لگا رہتا تھا۔ اورنگ زیب کی محنت کے باوجود مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہونے سے بچ نہ سکی۔ نیز اُسی زمانے سے غیر مسلم اقوام (یعنی مرہٹے، سکھ اور ست ناحی) سیاسی طور پر بیدار ہوئے اور انھوں نے سیاسی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اورنگ زیب نے ان سب کا سر کچلا لیکن اُس کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت تیزی سے زوال پذیر ہو گئی۔ پس اورنگ زیب کی وفات کا سال یعنی سنہ 1707ء تاریخی موڑ (Turning Point) گنا جاتا ہے۔

اورنگ زیب وعدے کا پکّا اور سخت گیر تھا۔ اُس کی شخصیت رعب دار تھی۔ اُسے دیکھ کر ہر شخص دبک کر بیٹھ جاتا تھا۔ اُس کی محفل میں خوش مزاجی، لطیفہ گوئی اور ہنسی مذاق کو بالکل دخل نہ تھا۔ اُس نے اپنے عہد حکومت میں کبھی بھی محفل نشاط قائم نہ کی۔ وہ متین اور خاموش طبع تھا۔ لیکن انصاف کا پتلا اور علماء کا قدردان تھا۔ وہ بلا کا نڈر اور حاضر دماغ تھا۔ اُسے اپنے جذبات اور زبان پر پورا پورا قابو تھا۔ اُس کی صحت اور بینائی آخری عمر تک عمدہ تھی۔

اورنگ زیب کے کردار میں چند خامیاں بھی تھیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ شکّی مزاج تھا اور کسی پر بھروسہ نہ کرتا تھا۔ اُس کی اولاد نالائق تھی اور شاہی افسر اکثر نااہل اور تن آسان تھے۔ اورنگ زیب خود اعتمادی کی بدولت کسی کی نصیحت پر کان نہ دھرتا تھا۔ اُس نے حد سے زیادہ محنت کی لیکن وہ مغلیہ سلطنت کے زوال

کو روک نہ سکا۔

مذہبی پالیسی:- اورنگ زیب نے تخت نشین ہوتے ہی غیر اسلامی رسومات کو یک لخت ختم کر کے ملکی قوانین کو اسلامی شرع کے مطابق ڈھالا۔ اُس نے شاہی محل میں سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال بند کر دیا۔ مردوں کے لئے ریشمی لباس پہننا ناجائز قرار دیا۔ دربار کی مشرکانہ رسومات یکسر بند ہوئیں۔ اورنگ زیب کے آباد اجداد سونے چاندی اور اناج میں تُل کر صدقہ دیتے تھے اور صبح سویرے جھروکہ درشن میں بیٹھ کر ہندو رعایا کو درشن دیتے تھے۔ اورنگ زیب نے ان تمام رسومات کو بند کر دیا۔ شاہی دربار سے لہو ولعب کے سامان ختم ہوئے نجومیوں اور گویّوں کی سرپرستی بند ہوئی۔ سلطنت کے طول و عرض میں قماربازی۔ عصمت فروشی اور شراب خوری بھی نہ ہوئی۔ جشن نوروز بند کر دیا گیا۔ محرّم اور دسہرہ کے جلوسوں پر پابندیاں لگ گئیں ہر مسجد کے امام اور مؤذّن کے لئے باقاعدہ تنخواہ مقرّر ہوئی غیر اسلامی ٹیکس منسوخ ہوئے لیکن جزیہ دوبارہ لگا دیا گیا۔

ہندوؤں کے مندر:- ہندو مؤرّخین نے اورنگ زیب کے خلاف یہ الزام لگایا ہے کہ اُس نے ہندوؤں کے لاتعداد مندروں کو مسمار کیا اور غیر مسلم رعایا کا قافیہ تنگ کیا۔ یہ سراسر بہتان ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو من مانی کارروائیاں کرنے اور اسلام کا حلیہ بگاڑنے کی اجازت نہ دی۔ وہ غیر مسلم رعایا سے رواداری برتنے کا قائل تھا لیکن اُس کا اُصول یہ تھا کہ رواداری کے نام پر ہندوؤں کو شیر ہونے کا موقع نہ ملے۔ اُس نے حکم دیا کہ ہندوؤں

کے قدیم مندروں سے تعرض نہ کیا جائے اور اُن کی جاگیریں اور آمدنیاں بحال رکھی جائیں۔ لیکن ملکی قانون کی خلاف ورزی کر کے ہندوؤں نے جو مندر حکومت کی منظوری کے بغیر تعمیر کر لئے تھے اُن کو گرا دیا جائے اورنگ زیب نے ناجائز طور پر کوئی مندر مسمار نہ کئے۔ البتہ اُس نے اُن مندروں کے خلاف کارروائی کی جو حکومت کے خلاف سازشوں کے اڈے تھے۔ نیز اُس نے اُن مندروں کو بحال نہ کیا جو ایام جنگ میں برباد ہوئے تھے۔ بیس ہندو مؤرخین نے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور اورنگ زیب کے خلاف یہ بہتان تراشی کی ہے کہ اُس نے مذہبی تعصب کی بنا پر ہندوؤں کے مندر مسمار کئے۔ ایرداعن۔ سمتھ۔ الفنسٹن۔ جادو ناتھ سرکار۔ شرما اور سری واستو اسبھی اورنگ زیب کے فرمانوں کا بغور مطالعہ نہیں کرتے اور تصویر کا اصلی رخ پیش کرنے کی بجائے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔

ہنٹر نے اورنگ زیب کے بارے میں معاندانہ روش اختیار کر کے یہ طنزیہ فقرہ چست کیا ہے کہ "اورنگ زیب مثالی بادشاہ ثابت ہوتا اگر قید کرنے کے لئے اُس کا باپ زندہ نہ ہوتا، قتل کرنے کے لئے اُس کے بھائی موجود نہ ہوتے اور ظلم روا رکھنے کے لئے ہندو رعایا نہ ہوتی"۔

"He would have been an ideal monarch if he had no father to imprison, no brothers to butcher and no Hindu Subjects to persecute."

اس فقرے کے ہر لفظ سے بغض و عناد ٹپکتا ہے۔ اور یہ فقرہ تاریخی تنقید کے اُصولوں سے گرا ہُوا ہے۔

غیر مسلم رعایا سے امتیازی سلوک:- ہندو مورّخین نے اورنگ زیب کے خلاف یہ بھی الزام لگایا ہے کہ اُس نے غیر مسلم رعایا سے امتیازی سلوک (Discrimination) کی پالیسی روا رکھی۔ یہ بھی سراسر بہتان تراشی ہے۔ ہندو مورّخین یہ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کے حکم سے مسلمان تاجر کم محصول ادا کرتے تھے اور ہندو تاجروں سے محصول کی شرح زیادہ وصول ہوتی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ اورنگ زیب نے مسلمانوں کے لئے درآمدی محصول میں $2\frac{1}{2}$ فیصدی کی رعایت دے دی تھی کیونکہ مسلمان تاجر زکوٰۃ بھی ادا کرتے تھے۔ ہندو مورّخین زکوٰۃ کا ذکر نہیں کرتے اور محض اورنگ زیب کو بدنام کرنے کے لیئے یہ الزام لگاتے ہیں کہ شہنشاہ نے غیر مسلم رعایا سے امتیازی سلوک روا رکھا۔

ہندو مورّخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض محکموں میں نئی ملازمتیں محض مسلمانوں کے لئے مخصوص تھیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ٹوڈرمل کے زمانے سے لگان اراضی اور مالیات کے محکمے میں ہندوؤں کی اجارہ داری تھی۔ اورنگ زیب نے ست نامیوں اور راجپوتوں کی بغاوتوں کے بعد ان محکموں میں ہندوؤں کی اجارہ داری ختم کرنے کی نیّت سے ۱۶۷۱ء میں یہ حکم دیا کہ سرکاری دفاتر میں کم درجے کی آسامیوں پر مسلمانوں کو بھی لگایا جائے۔ اگر کسی افسر کے دو نائب ہوں تو اُن میں سے ایک ضرور مسلمان ہونا چاہیئے۔ ہندو مورّخین نے

اس فرمان کو غلط معانی پہنائے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر شرما نے یہ بہانہ بنایا ہے کہ مسلمان خود حسابات میں دلچسپی نہ رکھتے تھے اور فوج کی نوکری کو ترجیح دیتے تھے۔" حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب نے حکومت کے چند اہم محکموں سے ہندوؤں کی اجارہ داری توڑنے کے لئے اقدام کیا۔ ہندوؤں کی سرکشی اور سیاسی بیداری کے پیش نظر وہ حق بجانب تھا کہ محتاط پالیسی اختیار کرے۔ اس پالیسی کو ہندوؤں پر ظلم قرار دینا سراسر غلط ہے۔

اورنگ زیب کے عہد کی چند بغاوتیں اور فوجی مہمیں

آزاد قبائل کی سرکوبی:۔ ۱۶۶۷ء میں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے آزاد قبائل نے اورنگ زیب کی حکومت کے خلاف بغاوت کردی۔ اس بغاوت میں یوسف زئی، آفریدی اور خٹک قبیلے پیش پیش تھے۔ اس بغاوت کی بدولت دریائے اٹک سے لے کر قندھار تک تمام علاقے میں شورش پھیل گئی، لیکن ہزارہ کے قبائل مغلوں کے وفادار رہے۔ خوشحال خان خٹک نے مغلوں کے خلاف خوب کام کیا۔ کئی سالوں کی جنگ کے بعد اورنگ زیب نے حسن ابدال پہنچ کر سرحدی قبائل کی بغاوت کو فرو کیا۔ اس نے آزاد قبائل کو فوجی طاقت سے کچلنے کی بجائے ان سے دوستی کرلی اور ان کے سرداروں کو وظیفے عطا کئے۔ یہ پالیسی کامیاب ثابت ہوئی اور بعض افغان سرداروں نے مغلیہ فوج میں نوکری کرلی۔ انگریزی دور میں لارڈ کرزن نے بھی اسی پالیسی پر عمل کیا۔

اراکان اور آسام کی تسخیر:۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے دو تین سال بعد بنگال میں مغلیہ گورنر میر جملہ نے کوچ بہار فتح کر لیا، اس کے بعد دریائے برہم پتر کو عبور کر کے اس نے آسام پر بھی قبضہ جما لیا۔ سلطنت کی یہ وسعت پذیری کافی اہم ہے۔ مغلیہ سلطنت کی سرحد اب چین سے جا ملی۔ میر جملہ کی صحت یک لخت خراب ہو گئی اور وہ چل بسا۔ اس کے بعد مغل جرنیل شائستہ خان بنگال کا گورنر مقرر ہوا شائستہ خان نے اراکان کے خلاف فوجی کارروائی کر کے چاٹگام پر قبضہ کر لیا۔ نیز جزیرہ سندیپ سے بھی اراکانیوں کو نکال دیا۔ اس طرح اراکان اور آسام بھی مغلیہ سلطنت میں شامل ہو گئے۔

شمالی ہند کی چند بغاوتیں:۔ اورنگ زیب کے عہد میں شمالی ہند میں بھی غیر مسلموں کی چند بغاوتیں رونما ہوئیں۔ ان بغاوتوں کی تہہ میں مسلمانوں سے سلطنت چھین لینے کا جذبہ کارفرما تھا لیکن اورنگ زیب نے ان تمام بغاوتوں کا خاتمہ کر ڈالا۔ یہ بغاوتیں ست نامیوں، سکھوں اور جاٹوں نے کیں۔ شمالی ہند کی یہ بغاوتیں فرو ہو گئیں، لیکن یہ بغاوتیں غیر مسلموں کی سیاسی بیداری کا بیّن ثبوت تھیں۔

جاٹوں کی بغاوتیں:۔ غیر مسلم جاٹوں نے ۱۶۶۹ء میں متھرا میں گوکولانہ (Gokulana) کی سرکردگی میں بغاوت کی۔ یہ بغاوت تیزی سے تمام جاٹ کاشتکاروں میں پھیل گئی۔ جاٹ قبیلے کے لوگ جفاکشی میں مشہور تھے اور کئی سال مغلیہ فوج کے لئے پریشانی کا باعث بنے رہے۔ ۱۶۶۹ء کی بغاوت کو فرو کرنے میں ایک برس صرف ہوا۔ اس کے بعد ۱۶۸۱ء، ۱۶۸۸ء اور ۱۶۹۱ء میں جاٹوں نے بار بار

بغاوت کی۔ آخری بغاوت میں انہوں نے مغل شہنشاہ اکبر کی قبر کو بھی نقصان پہنچایا اور اس کی ہڈیاں نکال کر جلا ڈالیں۔

ست نامیوں کی بغاوت:۔ 1672ء میں نارنول یا پٹیالہ کے ضلع میں ست نامیوں نے بغاوت کی اور مقامی مغلیہ فوج کو مار بھگایا شرارت پسند عناصر نے یہ مشہور کر دیا کہ ست نامی جادوگر ہیں اور کوئی طاقت ان کو زک نہیں پہنچا سکتی۔ اورنگ زیب نے زبردست فوج بھیج کر ست نامیوں کا صفایا کیا۔ جادو کا وہم نکالنے اور مغلیہ فوج کا نفسیاتی علاج کرنے کی غرض سے اورنگ زیب نے قرآن مجید کی چند آیات لکھ کر تعویذ بنائے اور مغلیہ فوج کے جھنڈوں کے ساتھ آویزاں کر دئے اس فوجی کارروائی میں پانچ ہزار ست نامی مارے گئے۔

سکھوں کی شورش:۔ سکھ مذہب کے بانی گورو نانک نے امن و آشتی کا پیغام دیا تھا اور ہندو سوسائٹی سے ذات پات کے علاوہ برہمنوں کا غلبہ بھی ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ گورو نانک نے 1539ء میں وفات پائی تھی اور اس کے بعد کافی عرصہ سکھ مذہب کے پیروکار امن پسند رعایا بن کر رہے۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں شہزادہ خسرو کی حمایت کی بنا پر سکھوں کے پانچویں گورو ارجن کو جرمانہ کیا گیا تھا، لیکن گورو ارجن نے ہٹ دھرمی کی بنا پر جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا اور قید ہوا۔ ارجن کی وفات کے بعد اس کے لڑکے گورو ہرگوبند نے سکھوں کو فوجی تربیت دے کر مغلوں کا جانی دشمن بنا دیا۔ سکھ اسے 'اکال تخت' کا بانی 'سچا بادشاہ' گنتے ہیں۔ سکھوں کا نواں گورو تیغ بہادر 1664ء میں گدی نشین ہوا۔ وہ شروع سے ہی اورنگ زیب کا تخت

مخالف تھا، لیکن مشہور راجپوت جرنیل جے سنگھ کے بیٹے مرزا راجہ رام سنگھ کے کہنے پر شہنشاہ نے سکھ گورو کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ گورو تیغ بہادر کے زمانے میں سکھوں نے پنجاب میں لوٹ مار شروع کر دی، چنانچہ ان کی فوجی تنظیم اور مذہبی جنون سے پنجاب کی پہاڑیوں کے ہندو راجے خاص طور پر تنگ آ گئے۔ آخرکار اورنگ زیب نے سکھوں کی خودسری ختم کرنے کے لیے کارروائی کی۔ تیغ بہادر گرفتار ہوا اور سکھوں کے تمام قلعوں اور غیر قانونی مرکزوں پر شاہی فوج نے قبضہ کر کے امن و امان بحال کیا۔ بغاوت کے جرم میں تیغ بہادر پر مقدمہ چلانے کے بعد اسے موت کی سزا دی گئی۔ تیغ بہادر سلطنت کا باغی تھا۔ اس کی موت کا اورنگ زیب کے مذہبی تعصب سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن ہندو مؤرخین نے یہ قصہ گھڑ لیا ہوا ہے کہ گورو تیغ بہادر کی گرفتاری کے بعد اسے شاہی دربار میں پیش کیا گیا جہاں اورنگ زیب نے اسے اسلام قبول کرنے کو کہا۔ گورو کے انکار پر اسے قتل کر دیا گیا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تیغ بہادر شاہی دربار میں کوئی معجزہ نہ دکھانے کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ تاریخی طور پر یہ تمام قصے غلط ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بغاوت اور لوٹ مار کے جرم میں تیغ بہادر پر مقدمہ چلانے کے بعد 1675ء میں اسے موت کی سزا ملی۔

سکھوں کے دسویں اور آخری گورو یعنی گورو گوبند سنگھ نے 1675ء اور 1708ء کے مابین پنجاب میں سکھوں کو بہترین فوجی تربیت دی۔ اس نے ضلع ہوشیارپور میں انند پور کو اپنا صدر مقام

بنایا۔ اس نے اپنے زمانے میں سکھوں کو بالکل گوریلا فوجی بنا دیا
انہی زمانے سے سکھوں نے موجودہ شکل وصورت اختیار کی یعنی
خالصہ کہلائے اور کیس رکھنے کے علاوہ کرپان، کچھا، کنگھا اور لوہے کا
کڑا پہننا شروع کیا۔ پنجاب کے ہندو سرداروں نے سکھوں کی لوٹ مار
سے تنگ آکر انندپور پر ۱۷۰۱ء میں حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔
اورنگ زیب کے حکم سے ۱۷۰۴ء میں سرہند کے مغلیہ فوجدار وزیر خان
نے گوبند سنگھ کے خلاف فوجی کارروائی کی۔ انندپور اور چم کور کے
مقامات پر سکھوں کو شکست ہوئی اور گوبند سنگھ تلونڈی کی جانب
بھاگ گیا۔ ان دنوں گورو گوبند سنگھ نے فارسی اشعار میں ایک
عرض داشت اورنگ زیب کی خدمت میں دکن بھیجی جسے ظفر نامہ
کہتے ہیں۔ اس عرض داشت کے موصول ہونے پر شہنشاہ نے اسے
دکن طلب کیا۔ بعض مؤرخ یہ کہتے ہیں کہ مغلیہ افسروں نے سکھ گورو
کو شکست دینے کے بعد شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ گورو گوبند سنگھ
کے دکن پہنچنے سے پہلے اورنگ زیب نے وفات پائی اور نئے مغل
بادشاہ بہادر شاہ اوّل کی تخت نشینی پر سکھ عارضی طور پر امن کی
زندگی بسر کرنے لگے۔ گورو گوبند سنگھ نے ۱۷۰۸ء میں وفات پائی
اس کے بعد ایک ڈوگرا راجپوت لچھمن داس بیراگی سکھوں کا لیڈر بن
گیا۔ وہ اپنے آپ کو گورو گوبند سنگھ کا بندہ یا غلام کہتا تھا اور
تاریخ میں بندہ بیراگی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے پنجاب میں
دوبارہ لوٹ مار مچادی اور سکھ فوجیوں نے کیتھل، سامانہ اور انبالہ تک
تمام علاقہ برباد کر دیا۔ آخرکار جون ۱۷۱۵ء میں نواب عبدالصمد نے

سکھوں کو شکست دے کر بندہ بیراگی کو گرفتار کر لیا اور فرخ سیر کے حکم سے دہلی میں بندہ بیراگی قتل ہوا۔

راجپوتوں سے جنگ

اورنگ زیب کے عہد کا افسوس ناک واقعہ یہ ہے کہ اُسے راجپوتوں کے خلاف فوجکشی کرنا پڑی۔ اکبر کے زمانے سے راجپوت مغلوں کے وفادار اور جان نثار خادم ثابت ہوئے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے عہد میں غیر مسلموں میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی اور انہوں نے مسلمانوں کی غلامی کا جوأ اپنے کندھوں سے اُتار پھینکنے کے لئے سر توڑ کوشش کی۔ ریاست مارواڑ (جودھپور) کے متعصب وزیر درگاداس نے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا اور عوام کو مغلوں کے خلاف خوب بھڑکایا۔ اُس نے جھوٹی افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ دیگر راجپوت ریاستیں بھی درگاداس سے مل گئیں۔ اورنگ زیب کو مجبوراً راجپوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونا پڑا ان دنوں اورنگ زیب نے جزیہ دوبارہ لگا دیا تھا۔ اس سے درگاداس کے لئے راجپوت عوام کو بھڑکانے میں مدد ملی۔

اورنگ زیب نے راجپوتوں کے معاملے میں کوئی زیادتی نہ کی تھی لیکن حالات تیزی سے بگڑ گئے اور جنگ کے سوا چارہ نہ رہا۔ راجپوتوں سے تعلقات ٹوٹنے سے مغلوں کو بہت نقصان ہوا۔ اُن کے بہادر جان نثار سپاہی اب اُن کی خدمت کرنے کی بجائے دشمنوں کی صف میں جا شامل ہوئے۔ مغلیہ سلطنت اس نقصان

کی تلافی نہ کر سکی۔

اصل حالات:۔ ریاست جودھپور یا مارواڑ کا راجہ جسونت سنگھ اورنگ زیب کا مشہور جرنیل تھا اور اعلیٰ عہدوں پہ فائز رہا تھا۔ اس نے اپنی ریاست کا انتظام اپنے وزیر درگاداس کو سونپا ہوا تھا اور خود مغلوں کی خدمت کرتا تھا۔ اس نے دسمبر ۱۶۷۸ء میں وفات پائی۔ اس وقت وہ شمالی ہند میں سرحدی صوبوں کا گورنر تھا۔ جسونت سنگھ کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اورنگ زیب نے اس کے ایک بھتیجے اندر سنگھ راٹھور کو ریاست کا والی مقرر کر دیا۔ لیکن فروری ۱۶۷۹ء میں لاہور کے مقام پر جسونت سنگھ کی دونوں بیوہ عورتوں نے دو بیٹے جنے۔ ان میں سے ایک لڑکا چند روز کے بعد مر گیا۔ چند راجپوت دوسرے شیر خوار لڑکے اجیت سنگھ کو اورنگ زیب کے دربار میں لے گئے اور درخواست کی کہ اسے مارواڑ کے تخت کا وارث قرار دیا جائے۔ اورنگ زیب نے قدیم دستور کے مطابق شیر خوار اجیت سنگھ کو شاہی سرپرستی میں لے لیا اور مارواڑ کے تخت کا وارث قرار دیا۔ اس پر درگاداس نے مشہور کر دیا کہ اورنگ زیب اجیت سنگھ کو مسلمان بنا لے گا نیز مغلوں کی خواہش ہے کہ مارواڑ کا الحاق کر لیا جائے۔ ان غلط افواہوں سے راجپوت بھڑک اٹھے اور میواڑ (اودے پور) کے راجہ جے سنگھ نے بھی درگاداس سے فوجی اتحاد کر لیا۔ دراصل راجپوتوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی اور وہ اب مسلمانوں کے مطیع رہنا نہ چاہتے تھے۔ درگاداس کے طاقتور حامیوں نے اجیت سنگھ

کو شاہی سرپرستی میں نہ رہنے دیا اور اُسے چرا کر لے گئے۔ اورنگ زیب نے برہم ہو کر اگست ۱۶۷۹ء کو درگا داس کے خلاف فوجی کارروائی کا حکم دیا۔ اس دن سے راجپوتوں اور مغلوں کی دوستی کا خاتمہ ہو گیا۔

واقعات جنگ:۔ ۱۶۷۹ء میں مغلیہ فوج نے درگا داس کو شکست دے کر ریاست مارواڑ کا الحاق کر لیا۔ میواڑ کے پایہ تخت کو بھی مغلوں نے ۱۶۸۱ء میں فتح کر لیا لیکن میواڑ کے راجہ جے سنگھ نے گوریلا جنگ جاری رکھی۔ آخرکار جون ۱۶۸۱ء میں جے سنگھ نے شہزادہ معظّم کے سامنے ہتھیار ڈال کر اطاعت قبول کر لی اور اپنی ریاست کے چند اضلاع مغلوں کے حوالے کئے۔ اُن دنوں درگا داس نے ریاست مارواڑ میں دوبارہ شورش برپا کر دی اور مغلوں کے خلاف چھاپہ مار فوج تیار کی۔ اورنگ زیب نے شہزادہ اکبر کو راجپوتوں کی سرکوبی کے لئے کثیر فوج دے کر بھیجا لیکن شہزادہ اکبر باغی ہو کر راجپوتوں سے جا ملا اور دہلی کا تخت حاصل کرنے کے درپے ہوا۔ اورنگ زیب اُس وقت اجمیر میں تھا۔ اُس نے دل نہ ہارا بلکہ ایک عمدہ چال چلی جس سے راجپوت شہزادہ اکبر سے بد دل ہو گئے۔ اورنگ زیب نے ایک جعلی خط لکھوایا جس میں اکبر کی جانب سے باپ کو یہ لکھا گیا تھا کہ میں نے راجپوتوں کو آپ کے چنگل میں پھنسانے کے لئے جھوٹ موٹ بغاوت کی ہے اورنگ زیب نے اپنے کارندوں کے ذریعے یہ خط راجپوتوں کے کیمپ بھی فریب سے پہنچا دیا۔ اس خط کو پڑھ کر راجپوت بدظن ہو گئے اور انہوں نے شہزادہ اکبر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ بدک کر

دکن بھاگ گیا۔ جہاں کچھ عرصہ وہ مرہٹہ سردار سمبھاجی کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ بعد ازاں وہ ایران بھاگ گیا جہاں اُس نے ۱۷۰۴ء میں وفات پائی۔

اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب ۱۶۸۱ء میں میواڑ کے راجہ جے سنگھ نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی۔ اُسے پنج ہزاری منصب عطا ہوا۔ ریاست مارواڑ نے مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ آخرکار ۱۷۰۹ء میں اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ اوّل سے راجپوتوں نے صلح کر لی۔ چنانچہ اجیت سنگھ کو مارواڑ کا رانا تسلیم کر لیا گیا

اورنگ زیب کی دکنی پالیسی

اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کے بعد پورے اٹھائیس برس تک دکن کی ریاستوں کو باجگذار رہنے دیا۔ لیکن مرہٹوں سے جنگ وجدل کے بعد اُسے اس بات کا گہرا احساس ہوا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کے الحاق کے بغیر مرہٹوں کی سرکوبی ممکن نہیں۔ یہ دونوں ریاستیں بے حد کمزور تھیں اور مرہٹوں کی روک تھام سے قاصر تھیں۔ مغلوں سے پٹ کر مرہٹہ فوجیں ان ریاستوں میں پناہ گزین ہو جاتی تھیں اور تازہ دم ہو کر دوبارہ مغلوں سے جنگ کرتی تھیں۔ ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب نے ان دکنی ریاستوں کے الحاق کی ٹھانی۔ شاہی دربار کے شیعہ اُمراء نے اس بات کی مخالفت کی لیکن اورنگ زیب نے دکن کی کمزور شیعہ ریاستوں کو مرہٹوں کے

رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے مغلیہ سلطنت میں مدغم کر لینے ہیں سلطنت کی بہتری تھی۔ بعض جلد باز مؤرّخ یہ الزام لگاتے ہیں کہ اورنگ زیب نے مذہبی تنگ نظری کی بدولت دکّن کی شیعہ ریاستوں کو ختم کر ڈالا۔ یہ رائے محض شر انگیزی ہے۔ اورنگ زیب نہ تو شیعوں کا مخالف تھا اور نہ شیعہ ریاستوں سے نفرت کرتا تھا۔ دکّنی ریاستوں کے الحاق کی وجوہات محض سیاسی تھیں۔ مذہب سے الحاق کا رتّی بھر تعلّق نہ تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ۱۶۵۷ء میں شاہ جہان کے عہد میں بھی اورنگ زیب نے گولکنڈہ کے الحاق پر زور دیا تھا لیکن دارا کی رائے پر عمل کرتے ہوئے شاہ جہان نے ریاست کو باجگذار رہنے دیا تھا۔ اگر دکنی ریاستوں کے الحاق میں مذہب کارفرما ہوتا تو اورنگ زیب اپنے عہد حکومت میں پورے اٹھائیس برس چپ سادھے بیٹھا نہ رہتا۔ اصلی بات یہ ہے کہ دکنی ریاستوں کے اندرونی خلفشار اور اُن کی کمزوری سے مرہٹے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ لہٰذا مرہٹوں کو کچلنے کے لئے دکنی ریاستوں کا الحاق ضروری تھا۔

بیجاپور کا الحاق:۔ بیجاپور کا سلطان علی عادل شاہ ثانی چوبیس نومبر ۱۶۷۲ء میں فوت ہوا۔ اور اُس کا نابالغ بیٹا سکندر تخت نشین ہوا جس کی عمر محض چار برس تھی۔ سکندر عادل شاہ کی تخت نشینی سے بیجاپور کا دربار سازشوں کا مرکز بن گیا اور مسلمان اُمراء مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ افغان اور حبشی اُمراء نے جتھہ بندیاں قائم کر لیں۔ نیز دکّنی اور غیر دکّنی کا سوال

بھی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ان حالات میں ریاست کا نظام درہم برہم ہوگیا اور ریاست کا وجود مغلوں کے لئے ناسور بن گیا۔ اُن دنوں مرہٹہ سردار سیواجی نے تئیس ہزار فوج سے مغلیہ علاقے پر حملہ بول دیا اور مغلیہ جرنیل دلیرخان کو خوب تنگ کیا۔ سلطان سکندر عادل نے اپنی ہمشیرہ شہر بانو (پادشاہ بی بی) کی شادی اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ اعظم سے کر دی تھی اور باجگذار ہونے کی بنا پر اس کے لئے لازم تھا کہ وہ مرہٹوں کے خلاف مغلیہ افواج کی مدد کرتا لیکن اُس نے اپنے علاقے سے مغلیہ فوج کو گذرنے کی اجازت نہ دی۔ نیز سامان رسد بھی نہ بھیجا۔ اس معاندانہ سلوک سے برہم ہوکر اورنگ زیب نے بیجاپور کے خلاف فوجی کارروائی کا حکم دیا۔ دلیرخان کو 23 فروری 1680ء کو واپس بلا لیا گیا اور شہزادہ اعظم کو دکن کا وائسرائے بنا کر بھیجا گیا۔

اورنگ زیب کے حکم سے مغل فوجوں نے یکم اپریل 1685ء کو بیجاپور کا محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ پورے پندرہ ماہ جاری رہا۔ جون 1686ء میں اورنگ زیب بیجاپور پہنچا اور جنگ کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ بارہ ستمبر 1685ء کو بیجاپور فتح ہُوا اور ریاست کا الحاق کر لیا گیا۔ سکندر عادل شاہ گرفتار ہو کر مغلوں کا پنشن خوار بن گیا۔

ریاست گولکنڈہ کا الحاق:۔ ریاست گولکنڈہ کا قطب شاہی سلطان ابوالحسن تاناشاہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور اُس نے انتظام سلطنت برہمن وزیروں کے سپرد کیا ہُوا تھا جو مرہٹوں کے حلیف تھے۔ ایک وزیر مادھنا (Madanna) خاص طور پر سازشی تھا اور مرہٹوں

کو خفیہ طور پر سرکاری خزانے سے مالی مدد پہنچاتا تھا۔ ۱۶۶۶ء میں جب سیواجی آگرہ سے فرار ہو کر دکن پہنچا تو اُس وقت بھی گولکنڈہ نے اُس کی مدد کی تھی۔

بیجاپور کی تسخیر کے بعد اورنگ زیب نے گولکنڈہ کے الحاق کا فیصلہ کیا اور سات فروری 1687ء کو اُس نے ریاست گولکنڈہ پر حملہ کر کے گولکنڈہ کے پایہ تخت کا محاصرہ کر لیا۔ بارش اور آندھی کے طوفان کی پرواہ کئے بغیر اور وبا و قحط کے باوجود مغلیہ فوج نے طویل محاصرہ جاری رکھا اور طرفین نے داد شجاعت دی۔ مغلیہ جرنیل غازی الدین فیروز جنگ تھا اور گولکنڈہ کی افواج کے سالاروں میں سے اہم ترین شیخ منہاج۔ شیخ نظام اور مصطفےٰ خان لاری تھے۔ مصطفےٰ خان لاری کو ہم عصر مؤرخین نے عبدالرزاق کے نام سے موسوم کیا ہے۔

آخر کار شیخ منہاج اور شیخ نظام مغلیہ فوج سے مل گئے اور اعلےٰ منصب پائے۔ اکیس ستمبر 1687ء کو آٹھ ماہ کے محاصرے کے بعد قلعہ فتح ہوا اور ریاست گولکنڈہ کو مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

ابوالحسن کو دولت آباد کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ بعد ازاں اُسے پنشن عطا ہوئی۔ مغلیہ مؤرخ خافی خان رقمطراز ہے کہ گولکنڈہ کی تسخیر سے مغلوں کو مال و دولت کا انبار ہاتھ آیا جس کی قیمت کا اندازہ ایک ارب ، پندرہ کروڑ ، سولہ لاکھ روپے تھا۔

نتائج اور تبصرہ :۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی تسخیر سے مغلیہ سلطنت بہت وسیع ہو گئی جس سے انتظامی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں۔

سر جادو ناتھ سرکار کی سربراہی میں اکثر ہندو اور انگریز مؤرخین نے دکنی فتوحات کو اورنگ زیب کی فاش غلطی (Blunder) قرار دیا ہے۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ دکن کے الحاق سے اورنگ زیب نے مغلیہ سلطنت کے لئے مزید بوجھ اُٹھا لیا جو ناقابل برداشت تھا۔ اورنگ زیب دکن میں اس قدر مصروف رہا کہ وہ شمالی ہند کی جانب توجہ مبذول نہ کرسکا۔ اس سے نظام سلطنت بگڑ گیا اور اُس کے مرتے ہی مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔

بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ مغلیہ سلطنت 1687ء میں کشمیر سے راس کماری تک اور کابل سے چٹا گانگ تک پھیلی ہوئی تھی۔ جدید ذرائع آمدورفت کے نہ ہونے کی بدولت اتنی وسیع سلطنت کا انتظام آسان نہ رہا۔ مجبوراً اورنگ زیب کو وائسرائے مقرر کرنے پڑے جو موقع ملتے ہی خود مختار بن بیٹھے۔ اِن ناقدین کی رائے یہ ہے کہ اورنگ زیب کے لئے بہتر یہ تھا کہ دکن کا الحاق کرنے کی بجائے شمالی ہند کے انتظام کو بہتر بناتا اور نا اہل شاہی افسروں کو قابو کرتا۔

ایڈورڈز اور گیرٹ صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ شاہ جہان نے اپنے عہد حکومت میں دکنی فتوحات کا سلسلہ شروع کر کے مغلیہ سلطنت کی قبر کھودی اور اورنگ زیب کی وفات کے بعد زوال پذیر مغلیہ سلطنت کا پول کھل گیا۔ یہ رائے دیگر تمام مؤرخین نے سراسر غلط قرار دی ہے۔

جادو ناتھ سرکار اور اُس کے چیلے خوب شور مچا مچا کر یہ لکھتے

ہیں کہ اورنگ زیب کی دکنی پالیسی فاش غلطی تھی۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی اور اُس کی تنگ نظری کی بدولت غیر مسلم رعایا بگڑ گئی۔ راجپوت اُس کے مخالف ہو گئے۔ جاٹ۔ سکھ اور ست نامی اُس کی مذہبی انتہا پسندی کو برداشت نہ کر سکے اور بغاوتوں پر آمادہ ہوئے۔ اِن حالات سے مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی۔

اصل حقیقت:۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اورنگ زیب کی دکنی پالیسی ناگزیر اور درست تھی۔ اگر وہ بیجاپور اور گولکنڈہ کا الحاق نہ کرتا تو مرہٹے ان ریاستوں کی مدد سے مغلیہ علاقے میں افراتفری مچا دیتے۔ دکنی ریاستوں کے الحاق سے مرہٹوں کے خلاف فوجی کارروائی میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ مرہٹے دکنی ریاستوں کے وسائل سے استفادہ کرنے سے محروم ہو گئے۔ مغلوں کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مرہٹے 1687ء کے بعد ریاستی قلعوں میں پناہ گزین ہونے کی بجائے پہاڑی علاقوں میں دربدر پھرنے لگے۔

اورنگ زیب کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ مرہٹوں کی طاقت کا صفایا نہ کر سکا۔ اُس نے 1687ء کے بعد مرہٹوں کے خلاف طویل جنگ جاری رکھی اور اُس نے کئی فتوحات حاصل کیں لیکن وہ مرہٹوں کا کچومر نہ نکال سکا۔ یہ اُس کا کمال تھا کہ نااہل مغلیہ فوجی افسر مرہٹوں کے خلاف مصروف پیکار رہے۔ جب کبھی اورنگ زیب کسی دوسرے کو دکنی وائسرائے بنا کر دکن سے مراجعت کرتا تو مغلیہ فوج مرہٹوں سے پسپا ہو جاتی۔ دراصل اورنگ زیب تن آسان شہزادوں اور نااہل افسروں میں نئی روح نہ پھونک سکا۔

یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مرہٹے جم کر لڑائی نہ کرتے تھے وہ دکنی علاقے کے چپے چپے سے واقف تھے اور پہاڑیوں کے قدرتی حصاروں میں چھپ جاتے تھے۔ لہٰذا ان خاص حالات کی بنا پر اورنگ زیب مرہٹوں کا صفایا نہ کر سکا۔ اُس نے پوری انسانی طاقت صرف کر کے مرہٹوں کو بار بار شکست دی لیکن وہ ان کی کمر نہ توڑ سکا۔ اورنگ زیب کے جانشین معمولی درجے کے حکمران تھے لہٰذا مرہٹے دن بدن زور پکڑتے گئے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال میں اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو اہم عنصر قرار دینا درست نہیں۔ اصلی بات یہ تھی کہ برّ صغیر کے غیر مسلم سیاسی طور پر بیدار ہو چکے تھے اور وہ مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ختم کرنا چاہتے تھے۔ پنجاب میں سکھوں نے فوجی تربیت حاصل کر لی تھی راجپوتانہ میں درگا داس نے زہر پھیلا کر مختلف راجپوت حکمرانوں کو مغلوں کے خلاف میدان جنگ میں لا کھڑا کیا تھا۔ دکن میں سیواجی کے عروج سے برّ صغیر کے ہندو یہ خواب دیکھنے لگے کہ ملک کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں آ جائے۔ انسانی بساط کے مطابق اورنگ زیب نے مغلوں کا سیاسی غلبہ قائم رکھنے کے لئے پوری جدّ و جہد کی لیکن اُس کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال نہ رک سکا۔ اورنگ زیب کی بجائے اگر دارا شکوہ یا کوئی اور معمولی درجے کا بادشاہ تخت نشین ہو جاتا تو مغلیہ سلطنت فوری طور پر ختم ہو جاتی۔ بس اورنگ زیب کی دکنی پالیسی کسی لحاظ سے غلط نہ تھی۔

مرہٹوں سے جنگ وجدل

دکنی پہاڑوں ست پڑا اور وندھیاچل کے درمیانی علاقوں میں رہنے والے لوگ مرہٹہ کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ جفاکش اور محنتی ہیں شاہ جہان کے عہد میں بیشتر مرہٹے ریاست احمد نگر کی رعایا تھے۔ ریاست کے وزیر ملک عنبر نے مرہٹوں کو گوریلا جنگ کی تربیت دے کر مغلیہ فوجوں کے خلاف استعمال کیا۔ اُس نے مرہٹہ فوجی افسروں کو جاگیریں عطا کیں اور اُن میں دکنی باشندے ہونے کا تعصب بھر دیا۔ اُسی زمانے میں شاہ جی بھونسلہ کو پونا میں جاگیر ملی۔ مغلوں نے جب احمد نگر کو فتح کر لیا تو شاہ جی بھونسلہ نے بیجاپور کی ملازمت اختیار کر لی۔

آہستہ آہستہ شاہ جی بھونسلہ اور دیگر مرہٹہ سرداروں نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر خوب ہاتھ رنگے اور مرہٹوں کی فوجی طاقت بڑھ گئی۔ اگر شاہ جہاں اپنے عہد حکومت میں اورنگ زیب کی رائے پر عمل کر کے بیجاپور اور گولکنڈہ کا فوری الحاق کر لیتا تو مرہٹوں کی طاقت ابتدا ہی سے کچلی جاتی۔

شاہ جی کے بیٹے سیواجی کی سرکردگی میں مرہٹوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی اور انہوں نے اپنے آپ کو علیحدہ قوم سمجھنا شروع کر دیا اور انہوں نے ہندوؤں کی سلطنت کی بحالی کا عزم کیا۔ شاہ جہاں کے بیٹے جب تخت نشینی کی جنگ میں مصروف تھے تو مرہٹوں کو اپنی طاقت بڑھانے کا سنہری موقع ملا

اور انہوں نے سیواجی کی سرکردگی میں ریاست بیجاپور سے کئی ایک قلعے چھین لئے۔

افضل خان:- زوال پذیر ریاست بیجاپور مرہٹوں کے سامنے بے بس تھی اور ان سے کونکن و کلیان کے قلعے واپس نہ لے سکی۔ 1659ء میں ریاست بیجاپور نے اپنے جرنیل افضل خان کو سیواجی کے خلاف بھیجا۔ مرہٹہ سردار نے عجز و نیاز کا بہانہ کرکے افضل خان سے ملاقات کی درخواست کی۔ سیواجی نے اپنے کپڑوں کے نیچے ہتھیار چھپائے ہوئے تھے، بغل گیر ہوتے وقت اس نے بے خبری کے عالم میں افضل خان کو پشت میں خنجر گھونپ دیا۔ افضل خان کے یوں قتل ہو جانے کے بعد بیجاپور کی فوج پسپا ہوئی۔ اس کے بعد سیواجی نے دریائے کرشنا تک تمام علاقہ بیجاپور سے چھین لیا۔ بیجاپور نے تین بار سیواجی کے خلاف فوج بھیجی لیکن شکست کھائی اور آخرکار صلح کرکے مفتوحہ علاقے مرہٹوں کے قبضے میں رہنے دئے۔

مغلوں سے تصادم:- اورنگ زیب کی تاجپوشی کے دنوں میں سیواجی نے آگے بڑھ کر مغلیہ سلطنت کے علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی اور مرہٹہ فوج کی تنظیم محض لوٹ کھسوٹ کے چسکے کی بدولت پائدار ہوتی گئی۔ نیز سیواجی فوجی قابلیت رکھتا تھا اور اس نے ہندو مرہٹوں میں بیداری کی روح پھونکی۔ مسلمان مؤرخ سیواجی کو حقارت سے 'پہاڑی چوہا' کہتے ہیں، لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ سیواجی میں لیڈرشپ کی تمام

صفات موجود تھیں۔ نیز اس نے مرہٹوں میں جذبۂ قومیت پیدا کر کے انہیں اہم فوجی طاقت بنا دیا۔

اورنگ زیب نے ۱۶۶۰ء میں اپنے ماموں شائستہ خان کو (جو ان دنوں دکن کا وائسرائے تھا) سیواجی کی سرکوبی کا حکم دیا اور راجپوت جرنیل راجہ جسونت سنگھ کو بھی فوج دے کر بھیجا مغلیہ فوج نے پونا اور اس کے نواحی علاقے پر جلدی ہی قبضہ کر لیا۔ شائستہ خان نے پونا کو فوجی صدر مقام بنا کر مرہٹوں کی طاقت کچلنے کی کوشش کی، لیکن جسونت سنگھ یا تو شائستہ خان سے حسد کرتا تھا یا اپنے ہم مذہب سیواجی سے ساز باز رکھتا تھا۔ ۱۶۶۳ء میں سیواجی یک دم شبخون مار کر شائستہ خان کے کیمپ میں آگھسا اور جسونت سنگھ کی فوج کھڑی تماشہ دیکھتی رہی۔ شائستہ خان نے بھاگ کر جان بچائی، لیکن اس کی تین انگلیاں کٹ گئیں، نیز اس کا بیٹا بھی مارا گیا۔ شائستہ خان کو اس شکست کے بعد بنگال کا گورنر بنا دیا گیا اور جسونت سنگھ کو واپس بلا کر شہزادہ معظم کو دکن کا وائسرائے مقرّر کیا گیا اور راجہ جے سنگھ کو بھی دکن بھیجا گیا۔ اس دوران میں سیواجی نے جنوری ۱۶۶۴ء میں سورت پر حملہ کر کے لوٹ مار مچائی۔

راجہ جے سنگھ آف امبر مشہور مغلیہ جرنیل تھا اور اس کی فوجی دھاک بہت زیادہ تھی۔ اس نے سیاست دانی سے کام لیا اور مرہٹوں کے دشمنوں کے تعاون کی بدولت سیواجی کو ہر جانب سے دبایا اور تین ماہ میں سیواجی کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر

دیا۔ 1665ء میں پورندر (Purander) کے صلحنامے کی رو سے سیواجی نے اطاعت قبول کر لی اور کئی قلعے مغلوں کے حوالے کیے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ 1666ء سے بیجاپور کی دکنی ریاست نے مرہٹوں کی مخالفت ترک کر دی تھی اور وہ سیواجی کو مغلوں کے خلاف لڑائی میں خفیہ طور پر مدد دیتی رہی۔ اسی بنا پر مغلوں نے بیجاپور پر حملہ کر دیا۔ اس کا حال اورنگ زیب کی دکنی پالیسی میں بیان ہو چکا ہے۔

آگرہ میں نظر بندی:۔ سیواجی سے صلح کرنے کے بعد جے سنگھ نے اسے مغلیہ دربار میں حاضر ہونے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ سیواجی اپنے بیٹے سمیت آگرہ پہنچا۔ سیواجی پورے آداب نہ بجا لایا لہٰذا اورنگ زیب نے ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے اسے نظر بند کر دیا۔ اگر اورنگ زیب اسے قید کر دیتا یا عمدہ سلوک کر کے اسے مغلیہ منصبدار بنا لیتا تو بہتر تھا لیکن اس مقام پر اورنگ زیب چوک گیا۔ سیواجی نے بیماری کا بہانہ کر کے مٹھائی کے ٹوکرے بھر کر خیرات کرنے شروع کئے۔ ایک روز وہ اپنے بیٹے سمیت مٹھائی کے ٹوکروں میں بیٹھ کر شاہی پہرہ داروں سے نکل بھاگا اور سنیاسیوں کا بھیس بدل کر دکن پہنچ گیا۔ راجہ جے سنگھ آگرہ کی جانب روانہ ہو چکا تھا لیکن وہ راستہ میں مر گیا۔

آگرہ سے فرار ہونے کے بعد سیواجی نے مغلوں کے خلاف تین سال تک جنگ نہ چھیڑی اور اس عرصے میں ان کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر اپنی طاقت خوب بڑھاتا رہا۔ اورنگ زیب نے

جسونت سنگھ کو دوبارہ دکن میں مغلیہ افواج کا سالار بنا دیا۔ ۱۶۶۷ء
میں جسونت سنگھ کی سفارش پر اورنگ زیب نے سیواجی کے لیئے راجہ
کا خطاب منظور کیا۔ ان دنوں سیواجی کی طاقت عروج پر تھی اور
وہ نواحی علاقوں سے چوتھ وصول کرتا تھا۔ اس نے خاندیش کے
بعض اضلاع سے بھی ۱۶۷۰ء میں چوتھ یعنی کل پیداوار کا
چوتھا حصہ وصول کیا۔ اگر چوتھ ادا نہ کیا جاتا تو مرہٹے اس
علاقے پر حملہ کرکے لوٹ مچاتے تھے۔ اس نے ۱۶۷۰ء میں چوتھ
وصول نہ ہونے پر سورت کو دوبارہ لوٹا۔ سیواجی کے عزائم بلند ہو
چکے تھے۔ اس نے پے در پے کئی قلعوں پر قبضہ جما لیا اور گولکنڈہ
سے توپ خانہ چھین کر اسے زبردستی مرہٹوں کی دوستی پر مجبور کیا
ڈر کے مارے بیجاپور کا سلطان بھی اس سے تعاون کرتا تھا۔
سیواجی نے کرناٹک پر بھی حملہ کیا تھا اور ویلور و تنجور سمیت
وسیع علاقے غصب کر لیئے تھے۔ مغلیہ جرنیل جسونت سنگھ چپ سادھے
بیٹھا تھا اور صلحنامے کی آڑ میں وہ مرہٹوں کی طاقت کو بام عروج
پر پہنچتا ہوا دیکھتا رہا۔

شہزادہ معظم یوں تو دکن کا وائسرائے تھا لیکن سیاست سے
عاری تھا۔ اورنگ زیب خود افغانوں کی سرکوبی میں مصروف تھا
لہذا مرہٹوں کی طاقت بڑھتی گئی اور انہوں نے سازگار حالات
سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ۱۶۷۴ء میں رائے گڑھ کے مقام پر
سیواجی کی تاجپوشی ہوئی لیکن ۱۶۸۰ء میں وہ وفات پا گیا۔ اس
کی سلطنت میں مغربی گھاٹ، کونکن کا علاقہ دھو کیانی اور گوا کے

درمیان تھا) پہاڑوں کے مشرقی اضلاع، مغربی گھاٹ اور مدراس کا کچھ علاقہ، ویلور اور جنجی کے علاقے شامل تھے۔

سیواجی کے جانشین:۔ سیواجی کے بعد اس کا بیٹا سنبھاجی مرہٹوں کا سردار بنا۔ اس نے 1682ء میں برہان پور پر حملہ کردیا اور مسلمانوں کے قتل سے ہاتھ رنگے۔ اس نے مغلیہ سلطنت کی سرحدوں کی پرواہ نہ کی۔ نیز اس نے باغی شہزادے اکبر کو بھی اپنے پاس پناہ دی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں مرہٹوں کی حلیف بن گئی تھیں۔ اگر مغلیہ فوج سے مرہٹے پسپا ہوتے تو وہ ان ریاستوں کے قلعوں میں پناہ گزیں ہو جاتے تھے۔ اس تگڈرم (Combination of three Powers) سے اورنگ زیب کو غصہ آیا اور مارچ 1682ء میں وہ خود دکن جا پہنچا۔ اس نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مرہٹوں کے خلاف مؤثر کارروائی کرنے سے پہلے بیجاپور اور گولکنڈہ کی شیعہ ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا جائے لیکن وہ مرہٹوں کی طاقت کو ختم نہ کرسکا۔ مرہٹوں نے اورنگ زیب کے جانشینوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مزید طاقت بڑھالی۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کے الحاق کے بعد اورنگ زیب نے مرہٹوں کے خلاف فوجی کارروائی کی اور 1689ء میں سنبھاجی کو گرفتار کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مرہٹوں کا نیا سردار راجہ رام تھا۔ اس نے اپریل 1700ء میں وفات پائی لیکن اس کی بیوی تارا بائی نے مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ اورنگ زیب طویل

جنگ کے باوجود مرہٹوں کی طاقت کو نہ کچل سکا۔ اس نے مرہٹوں سے لاتعداد قلعے چھینے لیکن گوریلا جنگ سے مرہٹے مغلوں کو خوب تنگ کرتے تھے، بلکہ موقع پاتے ہی مغلیہ صوبوں میں لوٹ مچا دیتے تھے۔ چنانچہ مرہٹوں نے 1699ء میں مالوہ پر حملہ کر دیا اور 1703ء میں شمالی علاقوں سے آنے والی مغلیہ فوج کی رسد کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ 1706ء میں مرہٹوں نے برودا پر ہلّہ بول دیا اور بہت لوٹ مچائی۔ 1707ء کے اوائل میں اورنگ زیب فوت ہو گیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے جانشین بے بس ہو گئے اور مرہٹوں کی طاقت دن بدن بڑھتی گئی۔ اٹھارھویں صدی میں مرہٹے انگریزوں کے لئے بھی دردِ سر بن گئے تھے لیکن 1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کو شکست دے کر اُن کا صفایا کر دیا۔

اورنگ زیب کی وفات:۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بیس فروری 1707ء کو دکن میں 92 برس کی عمر میں وفات پائی۔ اُسے دکن ہی میں دولت آباد کے قریب خلد آباد میں دفن کیا گیا۔ اورنگ زیب مغلیہ تاریخ میں عظیم المرتبت ہستی ہے۔ وہ آہنی عزم کا مالک تھا۔ شجاعت میں بے مثال تھا۔ بڑھاپے کے باوجود وہ سخت محنت کرتا تھا اور محاذ جنگ پر خود کمان کرتا تھا۔ البتہ وہ اپنی افواج کی نا اہلی اور تن آسانی کا خاتمہ نہ کر سکا۔ اُس کی اولاد بھی نکمی اور معمولی لیاقت کی تھی۔ اُس کے جانشینوں میں اگر ایک اور اورنگ زیب پیدا ہو جاتا تو برِصغیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی

اورنگ زیب پرہیزگاری اور تقویٰ میں لاثانی تھا۔ اُس نے شریعت کی پوری پوری پابندی کی اور غیر اسلامی رسومات سے شاہی دربار کو پاک کیا۔ اُس نے مرہٹوں کے خلاف پچیس برس تک طویل جنگ کی لیکن وہ مرہٹوں کا صفایا نہ کرسکا۔ ہندو اور انگریز مؤرّخین نے جادوناتھ سرکار کی سربراہی میں اورنگ زیب کے خلاف اپنا زور قلم پورے طور پر صرف کیا ہے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ اورنگ زیب کے بارے میں صحیح تاریخی حقائق پیش کرنے کافی کٹھن ہیں۔

Typical Questions

Q. 1. Analyse critically the religious policy of Emperor Aurangzeb. Do you think that "religion over-rode his statesmanship" under him ?

Q. 2. Explain the main features of Aurangzeb's religious policy and point out its results.

Q. 3. Give a brief account of Aurangzeb's dealings with the Rajputs.

Q. 4. Do you agree with the view that the Deccan Policy of Aurangzeb was a political blunder ?

Q. 5. "Aurangzeb as a sovereign was a failure". Discuss this statement.

Q. 6. Describe briefly the character of Aurangzeb and analyse his dealings with (*a*) the Satnamies (*b*) his brothers and (*c*) his father.

Q 7. "The Deccan was the grave of Aurangzeb's reputation as well as of his body." Comment.

Q. 9. Compare the policies of Akbar and Aurangzeb.

Q. 10. Write short notes on the following :—

(a) Afzal Khan. (c) Sivaji. (d) Prince Akbar.
(e) Sikhs under Aurangzeb.
(b) Shaista Khan.

امتحانی سوالات

۱- **شہنشاہ** اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کا تنقیدی جائزہ لیجئے
کیا اورنگ زیب نے سیاست کو مذہب کے تابع رکھا؟

2- اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کی خصوصیات قلمبند کیجئے نیز اس
پالیسی کے نتائج واضح کیجئے۔

3- راجپوتوں سے اورنگ زیب کے سلوک کا حال بیان کیجئے۔ کیا
اُس کے لئے ممکن تھا کہ راجپوتوں کے خلاف جنگ نہ کرتا؟

4- آپ کو اس رائے سے کس حد تک اتفاق ہے کہ اورنگ زیب
کی دکنی پالیسی سیاسی طور پر فاش غلطی تھی؟

5- اس رائے پر تبصرہ کیجئے کہ "اورنگ زیب ناکام بادشاہ تھا"

6- اورنگ **زیب** کا کردار بیان کیجئے نیز ستنامیوں کی بغاوت کی
وجوہ اور اپنے بھائیوں اور باپ سے اورنگ زیب کے سلوک
پر روشنی ڈالئے۔

7- "اورنگ زیب کا مزار دکن میں ہے لیکن اُس کی شہرت (یا عظمت)
بھی اُسی جگہ مدفون ہے"۔ تبصرہ کیجئے۔

8- "اورنگ زیب کی زندگی ایک طویل المیہ کی مانند تھی- وہ عمر
بھر تقدیر کے خلاف نبرد آزما رہا- وہ تقدیر کا لکھا مٹا نہ سکا
تاریخ کی یہ المیہ داستان آخر کار ڈرامائی انداز میں ختم ہو گئی"

(سر جادو ناتھ سرکار) تبصرہ کیجئے۔

۹ - اکبر اور اورنگ زیب کی پالیسی کا موازنہ اور مقابلہ کیجئے۔

۱۰ - مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیئے:-

(ا) افضل خان (ب) شائستہ خان (ج) سیوا جی (د) شہزادہ اکبر (ھ) اورنگ زیب کے عہد میں سکھوں کا عروج۔ (و) اورنگ زیب کی شمال مغربی سرحدی پالیسی۔

تینتیسواں باب

مُغلیہ دور کے مختلف پہلو

مرکزی نظامِ سلطنت مغلیہ سلطنت کا باقاعدہ انتظامی ڈھانچہ اکبر نے بنایا اس سے قبل بابر اور ہمایوں نے اپنے زمانے میں سلاطین دہلی کا نظام سلطنت برقرار رکھا۔ ان دونوں تاجداروں کی حکومت دراصل فوجی جاگیرداروں کی حکومت تھی۔ اکبر نے جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے نیا لگانِ اراضی نافذ کیا جس کی تفصیلات اکبر کے عہد میں بیان ہو چکی ہے۔ اکبر نے ملک کو صوبوں میں تقسیم کیا۔ اور منصب داری نظام وضع کر کے سول اور فوجی تنظیم کی۔ منصب داری نظام کی تفصیلات بھی اکبر کے عہد میں بیان ہو چکی ہیں۔

اکبر کا قائم کردہ انتظامی ڈھانچہ تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بھی قائم رہا۔ مغلیہ نظامِ سلطنت میں کوئی بنیادی خامی نہ تھی۔ فرق صرف یہ رونما ہوا۔ کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سرکاری افسر نااہلی اور رشوت ستانی کی بدولت ناکارہ ہو گئے۔ جس سے نظامِ حکومت درہم برہم ہو گیا۔ نیز صوبائی گورنر خود مختار بن بیٹھے۔ جس سے مرکزی حکومت کی طاقت زائل ہو گئی اکبر نے انتظامی امور کے لئے مرکزی حکومت کے ذیشعبے قائم

گئے۔ یہ شعبے تمام مغلیہ دور میں قائم رہے۔ ان شعبوں کا مختصر حال حسبِ ذیل ہے۔

دیوان یا وزیر اعظم :۔ دیوان یا وزیر اعلیٰ ہمیشہ محکمہ مال کا سربراہ ہوتا تھا۔ اسے وزیر اعظم، وزیرِ خزانہ یا وکیل سلطنت بھی کہتے تھے اس کی مدد کے لئے کئی ایک افسر ہوتے تھے۔ جن کا درجہ وزیر کا ہوتا تھا۔ لیکن ہر وزیر دیوان نہیں کہلاتا تھا۔ ہنگامی حالات میں وزیر اعظم فوجی امور کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اگر بادشاہ نابالغ ہوتا تو دیوان حکومت کا ناظم اعلیٰ یا ریجنٹ بن جاتا تھا۔ عام حالات میں دیگر شعبوں کے تمام وزیر اور سالار وزیر اعظم کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ اور وہ ان کے تبادلے کے احکام صادر کر سکتا تھا۔ لیکن بادشاہ اس کے احکام کو منسوخ بھی کر سکتا تھا۔ گویا مملکت میں بادشاہ کے بعد با اختیار شخص وزیرِ اعظم ہوتا تھا۔ مالی معاملات اور ادائیگیوں کے احکام وہی جاری کرتا تھا۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنے کے لئے دیوان کی ماتحتی میں ایک الگ وزیر ہوتا تھا۔ جسے دیوان عام کہتے تھے۔ اس کے علاوہ سرکاری زمینوں سے متعلق امور کا نگران وزیر دیوان خاص کہلاتا تھا۔ سرکاری زمینیں خالصہ (Crown lands) کہلاتی تھیں۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد دیوان یا وزیر اعظم سیاہ و سفید کے مالک ہوتے تھے۔ اور امراء کے گروہ ان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ اس لئے مغل بادشاہ دیوان کی فوقیت توڑنے کے لئے سازشیں کرتے تھے لیکن پھر بھی ہر نیا دیوان لامتناہی اختیارات کا مالک بن جاتا تھا۔

اورنگ زیب کے عہد تک مغل شہنشاہ کافی طاقتور تھے۔ انہوں نے وزرائے اعظم کو اپنے قبضے میں رکھا۔ اور ان کی ہوس کو حد سے بڑھنے نہ دیا۔

(۲) خان ساماں:۔ اثر و رسوخ کے لحاظ سے خان ساماں کا عہدہ نہایت اہم تھا۔ شاہی محل اور اس کے ذاتی ملازمین کے لئے خوراک اور دیگر ضروریات کا انتظام اسی کے سپرد تھا۔ سفر میں خان ساماں بادشاہ کے ساتھ جاتا تھا۔ شاہی کارخانے اور ذخیرے اسکی نگرانی میں ہوتے تھے۔ کبھی کبھار کارکردگی کی بنا پر اسے وزیر کا درجہ مل جاتا تھا۔ اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے ذمہ دار ماتحت افسر ہوتے تھے۔ برطانوی مؤرخ اسے Lord High Steward) کہتے ہیں۔ فوجی رسد کا انتظام بھی اس کے سپرد تھا

(۳) میر بخشی:۔ یہ وزیر منصب داروں کے مشاہرہ اور الاؤنس کی ادائیگی کرتا تھا۔ منصب داری فوج کا معائنہ کرتا تھا۔ اور ان کے گھوڑوں کی پڑتال کرتا تھا۔ نیز وہ ذات و سوار مرتبے کا ریکارڈ رکھتا تھا۔ انگریز مؤرخ اسے (Militaty Paymaster) کہتے ہیں۔ بعض حالات میں وہ فوج بھرتی بھی کرتا تھا۔ اور فوج کے مختلف دستوں کے کمانڈروں کا تقرر کرتا تھا۔ محمد شاہ رنگیلا کے عہد سے میر بخشی کا عہدہ وزیر اعظم کے بعد اہم ترین ہو کر سازشوں کا مرکز بن گیا۔

میر بخشی کے ماتحت داروغۂ توپ خانہ یا میر آتش ہوتا تھا جسے وزیر کا درجہ حاصل تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد یہ محکمہ

الگ ہو گیا۔

(۴) **قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس** ۔ عدلیہ کا اعلیٰ ترین افسر قاضی مملکت کہلاتا تھا۔ وہ ملکی عدالتوں کے ججوں کا تقرر کرتا تھا وہ جید عالم ہوتا تھا۔ اور فوجداری و دیوانی قانون میں ماہر ہونے کے علاوہ فقہ دان بھی ہوتا تھا۔ وہ صوبائی قاضی کی عدالت سے اپیل سنتا تھا۔ اور شرعی قانون کے مطابق فیصلے کرتا تھا۔ لیکن شہنشاہ کے نافذ کردہ قوانین کی بھی پابندی کرواتا تھا۔

قاضی القضاۃ کے ماتحت دو افسر ہوتے تھے۔ ایک مفتی اور دوسرا میر عدل۔ مفتی صرف مقدمات کے بارے میں شرعی احکام کی وضاحت کرتا تھا۔ جن کی روشنی میں قاضیٔ مملکت کو فیصلہ صادر کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ میر عدل کا فرض یہ تھا۔ کہ مقدمے کے دونوں فریقوں کو عدالت میں حاضر کرے۔ اور فیصلوں کی پابندی کرائے۔ اگر دونوں فریق ہندو ہوتے تو وہ اپنے رسم و رواج کے متعلق فیصلہ کروا سکتے تھے۔ لیکن خاص خاص معاملات میں شرعی احکام کی پابندی لازم تھی۔

سرکاری افسروں کے خلاف شکایات کی سماعت خاص عدالت میں ہوتی تھی جسے عدالتِ مظالم کہتے تھے ملکی دارالحکومت میں بادشاہ ہر بدھ کو عدالتِ مظالم لگاتا تھا۔ جہانگیر نے فوری داد رسی کے لئے قلعے کے بیرونی دیوار کے ساتھ سونے کی زنجیر لٹکا دی تھی۔ اگر کوئی شخص اسے کھینچتا تو شاہی محل میں گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ اور بادشاہ فوراً برآمد ہو کر شکایت سنتا تھا۔ صوبے کا اعلیٰ ترین جج قاضی کہلاتا تھا۔ تمام مغلیہ دور میں

عدل کا انتظام بہی تھا۔ اورنگ زیب کے بعد بھی عدالتی نظام برقرار رہا۔ اور اس کی کارکردگی میں فرق نہ آیا۔

(۵) **محتسب**:۔ مغلیہ دور میں محتسب با اختیار افسر تھا۔ اور انتظامیہ (executive) کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ عدلیہ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اشیاء کی قیمتیں مقرر کرتا تھا۔ اور وزن اور پیمانوں کی نگرانی کرتا تھا۔ تاکہ دوکاندار کم تول کر دھوکہ نہ دے سکیں قمار بازی اور شراب نوشی کے اڈوں پہ چھاپہ مار کر ملزموں کو سزا دلواتا تھا۔ اس کا اہم ترین فرض یہ تھا۔ کہ لوگوں کی اخلاقی حالت پست نہ ہو۔ اور وہ شرعی احکام کی پابندی کریں وہ رمضان کا احترام بھی کرواتا تھا۔ نماز سے لاپرواہی برتنے پر سزا دلوا سکتا تھا۔

(۶) **صدر الصدور اور محکمہ خیرات**:۔ مرکزی محکمہ خیرات و وظائف اور اوقاف کے انتظام کے لئے اعلیٰ ترین افسر صدرالصدور کہلاتا تھا۔ اس محکمے کا صوبائی اعلیٰ ترین افسر صدر کہلاتا تھا اور وہ صدر الصدور کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔ یتیموں، بیواؤں حاجت مندوں اور علماء و مشائخ کے وظیفے وہی مقرر کرتا تھا۔ اس کی سفارش پہ مسجدوں اور مدرسوں کو سرکاری امداد عطا ہوتی تھی۔ شروع شروع میں قاضی القضاۃ اور صدرالصدور کا عہدہ ایک ہی شخص کے پاس ہوتا تھا۔ لیکن اکبر نے عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ الگ کر دیا۔

(۷) **داروغۂ ڈاک چوکی**:۔ ابتداء میں یہ افسر بھی کافی اہم

درجہ نہ رکھتا تھا۔ لیکن بعد میں اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ ہر صوبے میں اس کی نگرانی میں متعدد افسران ہوتے تھے۔ وہ نظام جاسوسی کا اعلیٰ ترین افسر تھا۔ اور ڈاک کا انتظام بھی اسی کے سپرد تھا۔ انگریز مورخ اسے (Superintendent of Post and Intelligence) کہتے ہیں۔ خبر رساں اور جاسوس اس کے ماتحت تھے۔ نیز ڈاک چوکیوں کا انتظام اس کے سپرد تھا۔ ہر ڈاک چوکی میں تیز رفتار گھوڑے خبر رسانی کے لئے موجود ہوتے تھے۔ ہر گاؤں اور شہر میں اس محکمے کا کوئی نہ کوئی ملازم ضرور ہوتا تھا۔ مغلوں نے یہ محکمہ شیر شاہ سوری سے لیا۔ بادشاہ کی خدمت میں مملکت کی خبروں کا خلاصہ ہفتہ وار بھیجا جاتا تھا۔ اور اہم امور کی جانب فوری طور پر شاہی توجہ مبذول کرائی جاتی تھی۔

(۸) دیوان بیوتات :۔ یہ افسر بھی کافی اہم تھا۔ اس محکمے میں مرنے والوں کی دولت اور جائداد کی نگرانی کر کے یہ جانچا جاتا تھا۔ کہ اس کے صحیح وارث کون تھے۔ حکومت کی کتنی رقم مرنے والے کے ذمے ہے۔ سرکاری واجبات وصول کرنے کے بعد جائداد اصل وارثوں کو مل جاتی تھی۔ ہنگامی حالات میں دیوان بیوتات دیگر فرائض بھی سرانجام دیتا تھا مثلاً وہ اشیاء کی قیمتیں مقرر کرتا تھا۔ نیز وہ شاہی کارخانوں کی پیداوار اور خرچ کے تخمینے بھی تیار کرتا تھا۔

(۹) داروغہ توپ خانہ یا میر آتش :۔ شروع میں میر آتش نائب وزیر تھا۔ اور میر بخشی کے ماتحت تھا۔ بعد ازاں میر آتش

اپنے شعبے کا سربراہ بن گیا۔ اور داروغۂ توپ خانہ کہلایا۔ گولہ بارود کی فراہمی اس کے سپرد تھی۔ نیز توپ خانہ کی درستی اس کی اہم ترین ذمہ داری تھی۔ وہ شاہی محل اور قلعے کی حفاظت کے انتظامات کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ بادشاہ تک اس کی رسائی تھی۔

مغل شہنشاہ:۔ مغل شہنشاہ ہر لحاظ سے مختار مطلق (Despots) تھے۔ لیکن وہ فیض رساں اور رعیت پرور (Benevolent) تھے۔ مطلق العنانی کے باوجود وہ شریعتِ اسلام کی پابندی ہوتے تھے۔ اور عدل و انصاف کے پتلے تھے۔ اکبر کے زمانے میں دینِ الٰہی رائج ہونے سے مذہبی معاملات میں آزاد خیالی عام ہوئی۔ لیکن جہانگیر نے تخت نشین ہوتے ہی اکبری الحاد کا خاتمہ کر ڈالا۔ البتہ درباری شان و شوکت برقرار رہا۔ نیز راجپوت شہزادیوں سے شادیاں کرنے کا رواج (جو اکبر کے عہد سے شروع ہوا تھا) قائم رہا اس کے علاوہ شاہی دربار میں لاتعداد ہندوانہ رسومات رائج ہوگئیں۔ اورنگ زیب نے تخت نشین ہوتے ہی شریعت کی کامل پابندی کی۔ اور دربار سے تمام مشرکانہ رسومات کا خاتمہ کر ڈالا۔

مغل شہنشاہ رواداری کے پتلے تھے۔ ہندو مؤرخین یہ الزام لگاتے ہیں۔ کہ اورنگ زیب نے مذہبی تعصب کی بنا پر رواداری کی پالیسی ترک کردی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اورنگ زیب رواداری کا قائل تھا۔ لیکن وہ مذہب اسلام کی بنیادوں کو ہلا دینے والی رواداری کو برداشت نہ کر

سکتا تھا۔

مغل شہنشاہ اقتدارِ اعلیٰ کے حامل ہوتے تھے اور ان کے شاہی اختیارات پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی۔ بادشاہ کی خفگی یا شاہی عتاب کا کوئی علاج نہ تھا۔ وزیر اور جرنیل بھی شاہی حکم کے سامنے بے حقیقت ہوتے تھے۔ بادشاہ غصے میں اگر یہ حکم دے سکتا تھا۔ کہ معتوب شخص کو قلعے کی دیوار سے پھینک کر ہلاک کر دیا جائے۔ یا مست ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندا جائے۔ عام طور پر بادشاہ عدالتی امور میں دخل نہ دے سکتا تھا۔ لیکن اس کی خدمت میں خاص اپیل ہو سکتی تھی۔ جہانگیر نے شکایات کے فوری ازالہ کے لئے اپنے محل میں سونے کی زنجیر لٹکا رکھی تھی۔ فریادی جب اس زنجیر کو کھینچتا تھا۔ تو شاہی محل میں گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ اور بادشاہ فوراً نمودار ہو کر انصاف کرتا تھا۔

ایرانی تاجداروں کی مانند مغل شہنشاہ آخری دور تک شان و شوکت کے دلدادہ رہے۔ وہ شاہی محل میں رہتے تھے۔ جو ہمیشہ شاہی قلعے کے اندر ہوتا تھا۔ سفر کے دوران میں الگ خیمہ نصب ہوتا تھا۔ قلعے میں دیوانِ عام اور دیوانِ خاص میں شاہی دربار منعقد ہوتے تھے۔ تمام منصب دار اپنے مراتب کے لحاظ سے دربار میں جگہ پاتے تھے۔ شاہی دربار میں حاضر ہونے والے کو خاص آداب بجا لانے پڑتے تھے۔ تسلیم اور کورنش کا رواج عام تھا۔ اکبر نے تعظیمی سجدہ رائج کر دیا۔ اور جھروکہ درشن

میں بیٹھنے کی رسم شروع کی۔ اورنگ زیب نے ان مشرکانہ رسوم کو بند کر دیا۔ بادشاہ جب محل سے باہر نکلتا تھا۔ تو نقارے بجتے تھے۔ بادشاہ کی حفاظت کے لئے باڈی گارڈز ہر وقت موجود رہتے تھے۔ بادشاہ تاج پہنتا تھا۔ قیمتی جڑاؤ تخت پر بیٹھتا تھا۔ اور ریشمی کپڑے پہنتا تھا۔ شاہی محل میں سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال اورنگ زیب نے بند کر دیا اور مردوں کے لئے ریشمی لباس پہننا ممنوع قرار دیا۔

مغلیہ دور کا صوبائی انتظامی ڈھانچہ

مغلیہ دور میں صوبائی نظم و نسق اور تمام افسران ہو بہو مرکزی سلطنت کی نقل تھے۔ البتہ چند افسران مختلف تھے۔ صوبائی انتظامی ڈھانچے میں یہ بات قابل ذکر تھی کہ ہر محکمے کے افسرِ اعلیٰ کے کام کی نگرانی متعلقہ مرکزی محکمے کا افسرِ اعلیٰ کرتا تھا۔ مثلاً صوبائی دیوان مرکزی دیوان کے ماتحت تھا۔ اسی طرح صوبائی قاضی مرکزی قاضی (یا قاضی القضاۃ) کے زیرِ نگرانی ہوتا تھا اسی طرح ہر مرکزی شعبے کا افسرِ اعلیٰ تمام صوبوں میں اپنے محکمے کے افسرِ اعلیٰ کا محاسبہ کر سکتا تھا۔

مغلوں نے انتظام سلطنت کی سہولت کے پیشِ نظر اپنی مملکت کو متعدد صوبوں میں بانٹا ہوا تھا۔ ہر صوبے کا حاکمِ اعلیٰ یا گورنر یا صوبیدار بادشاہ کے حکم سے مقرر ہوتا تھا سرحدی علاقوں میں فوجی گورنر بھیجے جاتے تھے۔ دکنی علاقوں میں وائسرائے

بھیجا جاتا تھا۔ عام طور پر کسی مغل شہزادے کو وائسرائے کا عہدہ عطا ہوتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں کل پندرہ صوبے تھے لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں صوبوں کی کل تعداد اٹھارہ ہوگئی گورنر اور دیگر اعلیٰ افسر۔ گورنر اگرچہ صوبے کا ناظم اعلیٰ ہوتا تھا۔ لیکن اس کی طاقت کو حدود کے اندر رکھنے کے لئے ہر صوبے میں دو طاقتور افسران موجود ہوتے تھے۔ ان کا تقرر مرکز کرتا تھا۔ یعنی صوبائی دیوان محکمۂ مال کا انچارج ہوتا تھا۔ اور صوبے کی فوج صوبائی بخشی کے ماتحت ہوتی تھی۔ صوبائی دیوان اور بخشی براہِ راست بادشاہ کو تمام صوبائی واقعات سے باخبر رکھتے تھے۔ ان دونوں باختیار افسران کی موجودگی سے گورنر پر شاہی گرفت مضبوط رہتی تھی۔ اور وہ صرف انتظامی مشینری چلاتا تھا۔ گورنر تمام اہم امور میں مرکزی حکومت سے احکام حاصل کرتا تھا۔ اسے جنگ یا صلح کرنے کا اختیار نہ تھا۔ اس کے حکم سے کسی کو موت کی سزا نہ مل سکتی تھی۔ ہر صوبے میں وقائع نویس موجود تھے۔ جو اپنے افسر بخشی کی معرفت صوبے کے تمام حالات لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں بھیجتے تھے۔ اس کے علاوہ صوبے میں خفیہ رپورٹر بھی ہوتے تھے۔ جو سوانح نویس کہلاتے تھے۔ گورنر کے تبادلے وزیرِ اعظم کے حکم سے ہوتے تھے۔ بادشاہ اپنی مرضی سے کسی گورنر کے تبادلے کا حکم منسوخ کر سکتا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد وزیر اعظم کا عہدہ کافی اہم ہو گیا۔ اور صوبائی گورنر خود مختار بن بیٹھے۔ اکبر

کے عہد میں صوبائی گورنر کو سپہ سالار کہتے تھے۔ بعد ازاں وہ ناظم یا صوبیدار کہلانے لگا۔

سرکار اور پرگنے :- ہر صوبے کو انتظامی سہولت کے پیشِ نظر "سرکاروں" میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ سرکار کا افسرِ اعلےٰ فوجدار کہلاتا تھا جس کا تقرر بادشاہ براہِ راست کرتا تھا۔ تمام فوجدار گورنر کے احکام کے تابع ہوتے تھے اور اپنی اپنی سرکار میں قیام امن کے ذمہ دار ہوتے تھے۔

لگان اراضی کی وصولی کے لئے ہر سرکار کو پرگنوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ گویا پرگنہ انتظامی وحدت تھا۔ پرگنے کا افسرِ اعلےٰ عامل کہلاتا تھا۔ شیر شاہ کے زمانے میں اسے شقدار کہتے تھے۔ مالیہ کی وصولی کے علاوہ عامل انتظامی امور کا نگران بھی تھا۔ اس کی حیثیت ڈپٹی کمشنر کی مانند ہوتی تھی۔ مالیہ کی تشخیص کے لئے ایک علیحدہ افسر ہوتا تھا۔ جسے امین یا منصف کہتے تھے۔ خزانچی کو فوطہ دار کہتے تھے۔ ان افسران کے علاوہ ہر پرگنے میں لاتعداد اہل کار ہوتے تھے۔ فارسی میں اراضی کا ریکارڈ رکھنے والا اہل کار "بتکچی" کہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ قانون گو، چودھری، مقدم (نمبردار) اور پٹواری محکمۂ مال میں خاص اہمیت رکھتے تھے۔ مغلیہ دور میں پرگنے کو محل بھی کہتے تھے۔

صوبے کے اہم شہروں میں کوتوال اہم ترین افسر ہوتا تھا اس کے اختیارات وہی تھے۔ جو مرکز میں محتسب کے تھے۔

مندرجہ بالا افسران کے علاوہ مرکزی حکومت کے تمام شعبے ہر صوبے میں موجود تھے۔ اور صوبائی شعبوں کا افسرِ اعلیٰ مرکزی متعلقہ شعبے کے نگران کے ماتحت ہوتا تھا۔ گاؤں میں پنچایت کا رواج برقرار تھا۔

کوتوال کے فرائض :۔ صوبے کے اہم شہروں میں اہم افسر کوتوال ہوتا تھا جس کا تقرر مرکزی حکومت کرتی تھی۔ اس کا درجہ موجودہ زمانے کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے برابر ہوتا تھا۔ اس کا اہم ترین فرض امن و امان قائم رکھنا تھا۔ اس کے حکم سے ہر شہر کے محلّے بنا لئے جاتے تھے جن میں سپاہی اور چوکیدار متعین ہوتے تھے۔ اطلاعات مہیا کرنے کی غرض سے جاسوس بھی متعین کئے جاتے تھے۔ رات کے وقت کوتوال کے حکم سے چوکیدار اور پولیس کے سپاہی شہر بھر میں گشت کرتے تھے۔

شہر بھر میں منشیات مثلاً شراب۔ افیون اور بھنگ کی خرید و فروخت پر کوتوال کڑی نگرانی رکھتا تھا، نیز ناچنے گانے والیوں اور رنڈیوں کی حرکات و سکنات پر بھی کوتوال نظر رکھتا تھا۔

کوتوال پیمانے اور بٹے پرکھتا تھا۔ منڈیوں کا معائنہ کرتا تھا۔ اور بعض حالات میں قیمتیں متوازن رکھنے کی غرض سے احکام صادر کرتا تھا۔ وہ امیر آدمیوں اور تاجروں کی آمدنی کا جائزہ لیتا تھا۔ غیر ملکیوں کی آمد و رفت پر بھی کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ خاص شاہی احکامات کی بجا آوری کے سلسلے میں کوتوال

مناسب قدم اٹھاتا تھا۔ لاوارث جائیداد کو ضائع ہونے سے بچاتا تھا۔ اور مذبح خانوں و قبرستانوں کی نگہداشت کرتا تھا وہ لوگوں کے اخلاق کی نگہداشت بھی کرتا تھا۔ الغرض کوتوال کے سپرد کافی اہم انتظامی امور تھے۔

منصب داری نظام

مغلوں کے منصب داری نظام کو بھی اکبر نے شروع کیا۔ یہ نظام دیوانی اور فوجی محکموں کی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ یعنی ہر محکمے میں منصب دار کا تبادلہ ہو سکتا تھا۔ ایک منصب دار آج محکمہ مال میں ہوتا تھا۔ تو دوسرے روز فوج کی کمان کرتا تھا۔ تیسرے روز کسی اور سول محکمے میں منتقل ہو جاتا تھا۔ تمام سرکاری عہدوں پر فائز ہونے والے اشخاص کو منصب دار کہا جاتا تھا۔ ان کا تقرر بادشاہ کی مرضی پہ ہوتا تھا۔ اور ان کی ترقی اہلیت کے مطابق ہوتی تھی۔ مغلیہ منصب داری نظام کی تفصیلات اکبری عہد میں بیان ہو چکی ہیں۔ اس نظام کی اہم ترین خصوصیات یہ ہیں کہ اس نظام سے موروثی عہدے ختم ہوئے۔ نیز بطور جاگیر زمین عطا کرنے کا قدیم طریقہ بھی کالعدم ہوا۔ اگر کسی منصب دار کا بیٹا لائق اور محنتی نہ ہوتا۔ تو وہ باپ کے منصب پہ فائز نہ ہو سکتا تھا۔ ہر منصب دار کو ذاتی مرتبہ کے مطابق تنخواہ اور الاؤنس ملتا تھا اکثر منصب داروں کو سواروں کا مرتبہ بھی عطا ہوتا تھا۔ اس صورت میں اسے مقامی فوج رکھنی پڑتی تھی۔ جس کا خرچ مقامی سرکاری خزانے سے ادا ہوتا تھا۔ مرکزی افسر اس مقامی فوج کا معائنہ کرتے تھے۔

شاہی گھوڑوں کو داغنے کا طریقہ رائج تھا۔ اور منصب داری فوج میں بھرتی ہونے والے ہر سپاہی کا مکمل حلیہ لکھا جاتا تھا۔
مقامی فوج کے علاوہ مرکزی فوج الگ تھی۔ جب کہیں فوجی کارروائی کی ضرورت پڑتی تو نزدیکی علاقے کے منصب دار کو حکم ملتا۔ کہ اتنی تعداد فوجیوں کی بھیج دو۔ ضرورت کے وقت مرکزی شاہی فوج کے دستے بھی بھیجے جاتے تھے۔

لگان اراضی کا نظام

مغلیہ دور کا نظام مالیہ یا لگان اراضی کا نظام بھی اکبر نے رائج کیا اس نظام کو ضبطی سسٹم بھی کہتے ہیں۔ اکبر کا وضع کردہ نظام مالیہ تمام مغلیہ دور میں رائج رہا۔ اس نظام کی تمام تفصیلات اکبر کے عہد میں بیان ہو چکی ہیں اکبر نے شیر شاہ سوری کے نقش قدم پر چل کر اس کے نظام مالیہ کو بہتر بنا کر نافذ کیا۔ مغلیہ دور میں زمین کی پیمائش کے لئے رسی کی بجائے بانس کی جریب استعمال ہوتی تھی۔ بنجر اور خراب زمین پر مالیہ نہ لگتا تھا۔ قحط کے دنوں میں رعایت برتی جاتی تھی۔ لگان اراضی متعین کرنے کا عام اصول یہ تھا کہ زرخیزی اور پانی کی دستیابی کے لحاظ سے زمین کی اقسام متعین ہوتی تھیں۔ بعد ازاں زمین کی پیداوار کے مطابق گذشتہ دس سال کے اوسط تخمینے نکال لئے جاتے تھے۔ پھر ان دس سالوں کی قیمتوں کے اوسط تخمینے نکال کر دونوں کی نسبت سے ایک تہائی حصہ لگان وصول کیا جاتا تھا۔ جو نقدی یا جنس کی صورت میں ادا ہو سکتا تھا۔ اس نظام میں ضرب تقسیم۔ اور اوسط کی بھرمار تھی۔ اکبر کے

زمانے سے ٹوڈرمل کی بدولت محکمہ مالی ہندوؤں کی اجارہ داری بن گیا اورنگ زیب کی وفات کے بعد مقامی منصب داروں، عاملوں اور صوبائی گورنروں نے مرکزی حکومت کو باقاعدگی سے رقوم بھیجنا بند کر دیں۔ مغلیہ حکومت دیوالیہ ہو گئی۔ اور اس کی مالی حالت دن بدن پتلی ہوتی چلی گئی۔ عیش پسند اور نااہل بادشاہ حالات کو سدھار نہ سکے یہ مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔

مغلیہ فنِ تعمیر

مغلیہ فنِ تعمیر نے تبدریج ارتقاء کی کئی ایک منزلیں طے کیں اور آخر کار شاہجہانی عہد میں اسے کمال حاصل ہوا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت کے بعد مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔ اور اُسکے بعد فنِ تعمیر میں بھی کوئی نادر نمونہ یا شاہکار دکھائی نہیں دیتا۔ مغلوں کے فنِ تعمیر کے مختلف ادوار کا حال حسبِ ذیل ہے۔

(۱) ابتدائی دور:- بابر کی آمد سے لے کر ہمایوں کی موت تک شاہی عمارات نہایت قلیل ہیں۔ بابر کی تعمیر کردہ عمارات میں سے صرف دو مسجدیں بچی ہیں، ایک پانی پت میں ہے اور دوسری سنبھل روہیلکھنڈ میں ہے۔ ان مساجد سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر کی آمد سے قبل مسلمان وسط ایشیا کا فنِ تعمیر اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور ہندی امتزاج سے گنبد۔ محرابیں۔ اور بلند مینار مفتوحہ علاقوں میں رائج ہو چکے تھے۔ لیکن مسلمان حکمرانوں نے عام قسم کی چھتوں اور ستونوں کو پسند نہ کیا۔ بابر نے آگرہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا، وہ ہندوستانی معماروں کی

کی لیاقت کا قائل نہ تھا۔ اور سمرقند سے فن کار منگوانا چاہتا تھا۔ لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی۔ البتہ بابر کے مختصر عہد میں باغات۔ فوارے اور بارہ دریاں وجود میں آئیں۔ مغلیہ باغ چار حصوں میں منقسم ہوتا تھا۔ اور چہار باغ کہلاتا تھا۔ بابر نے باغات میں سدا بہار درخت اور پھلدار درخت لگوائے۔ اور پھولوں سے ان کو سجایا۔ نیز تالابوں نہروں بوٹوں اور فواروں سے باغات کی سجاوٹ کی۔ بعد ازاں بابر کی تقلید میں اس کے جانشینوں نے باغات میں فواروں اور نہروں کو ہر عمارت کے لئے لازم قرار دیا۔ ہمایوں نے اپنے ابتدائی دور میں دین پناہ میں شاہی محل تعمیر کرایا۔ لیکن شیر شاہ سوری نے اسے منہدم کرا دیا۔ اور اس جگہ پرانا قلعہ تعمیر کرایا۔ دوبارہ تخت حاصل کرنے کے بعد ہمایوں کو موت نے آ لیا۔

(۲) ہمایوں کا مقبرہ :۔ اکبر کے ابتدائی دور کی اہم ترین عمارت ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرے سے مردانہ پن، رعب اور دبدبہ عیاں ہے اور جسامت پر زور دیا گیا ہے۔ نزاکت یا تناسب کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا۔ ہمایوں کے مقبرے کی کرسی کافی بلند ہے اور گنبد دوسرا ہے یعنی ایک دوسرے کے اوپر دو گنبد تعمیر کئے گئے ہیں۔ جن کے مابین خلا ہے۔ بیرونی گنبد عالیشان اور بلند ہے یہ گنبد گول نہیں۔ بلکہ جسامت اور رعب داب میں پہلوانوں کی مانند ہے۔ بیرونی گنبد کی ساخت سمرقند کے گنبدوں سے مختلف ہے۔ لیکن گنبد کا نچلا ڈھول یا گردن، دمشق کی اموی مسجد کی مانند ہے جس کی تقلید میں امیر تیمور کا مقبرہ سمرقند میں بنایا گیا تھا۔ ہمایوں کا مقبرہ عکس

دار اور وسیع ہے۔ ہمایوں کی قبر کے گرداگرد مسقف برآمدے ہیں۔ جہاں قرآن خوانی کے لئے چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہیں۔ اس مقبرے میں رنگین اینٹوں کی بجائے سنگِ مرمر لگایا گیا ہے اور تعمیر سے ایرانی طرز جھلکتی ہے یہ مقبرہ دہلی کے قریب ہے اکبر کی سوتیلی والدہ حاجی بیگم نے اس مقبرے کو اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔ مقبرے کے گرداگرد فصیل نما دیوار ہے۔

(۳) اکبری دور کی دیگر عمارات :۔ اکبر کے عہدِ حکومت میں مغلیہ فنِ تعمیر میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ یعنی ہمایوں کے مقبرے کی تقلید ترک کر دی گئی۔ کرسی کی بلندی اور دوہرے گنبد متروک ہوئے۔ اکبر کے عہدِ حکومت میں سُرخ پتھر استعمال کیا گیا۔ اکبر نے الہ آباد۔ لاہور۔ آگرہ میں کئی ایک عمارتیں بنوائیں لیکن شاہجہانی عہد میں ان کو گرا کر از سرِ نو تعمیر کرا دیا گیا۔ البتہ اکبری محل اور جہانگیری محل جو ولیعہد کے لئے بنوایا گیا تھا۔ اب تک اس عہد کی یادگار ہیں۔ اکبر کی ان عمارتوں سے ہندوانہ اثرات عیاں ہیں۔ یعنی ستون اور چھوٹے چھوٹے محراب راجپوتوں کی طرزِ تعمیر کی غمازی کرتے ہیں۔ فتح پور سیکری میں بھی اکبر نے کئی ایک عمارتیں بنوائیں۔ بلند دروازہ مسجد اور شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ اس عہد کی نفیس عمارات ہیں۔

(۴) جہانگیری دور :۔ جہانگیر کے عہد میں بارہ دریاں اور باغات کی تعمیر پہ زور دیا گیا۔ جہانگیر کے باغات میں سے اہم ترین اودھے پور سری نگر (کشمیر) اور فتح پور سیکری میں تھے۔ اس نے شاہدرہ کے قریب ایک دلکش باغ بنوایا۔ جہاں بعد ازاں اس کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ آگرہ میں اس نے اعتماد الدولہ کا مقبرہ سنگِ مرمر کا بنوایا۔ اسے بیش بہا پتھروں کی بجائے معمولی قیمت کے پتھروں سے سجا لیا۔ جہانگیر کے دور میں کاشی

کاری کی ابتداء ہوئی۔ نیز مصورانہ آرائش پر بھی زور دیا گیا۔ اور روغنی اینٹیں استعمال ہونے لگیں۔ اس عہد کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ رنگ دار شیشوں سے چھتوں کو اندر کی جانب سے سجا کر نقاشی کے فن سے عمارتوں کو مزین کیا گیا۔

(۵) شاہجہانی دور :۔ شاہ جہاں نے فن تعمیر کو وہ رفعت بخشی جس پر آج تک دنیا عش عش کرتی ہے۔ وہ تزئین و آرائش میں فن کارانہ نظر رکھتا تھا۔ شاہ جہانی عمارات میں توازن، موزونیت نسوانی کشش، درخشانی اور مسحور کن آرائش ہے اس دور سے پہلے مغلیہ عمارتوں میں مردانہ پن اور رعب و دبدبہ پایا جاتا تھا۔ اور جسامت پر زور تھا۔ شاہجہان کے عہد میں عمارات کی دلکشی اور حسن کا معیار بدل گیا۔ شاہجہان کی عمارتوں میں دلکشی، لطافت اور حسین تاثر پہ زور دیا گیا ہے۔ شاہ جہان کی عمارتوں میں سرخ پتھر کے علاوہ سنگِ مرمر اور سنگِ ابری اور سنگِ سیاہ بھی استعمال کیا گیا۔ اس نے قیمتی پتھروں کی پچی کاری سے سجاوٹ کو چار چاند لگائے۔ اس عہد میں کاشی کاری درجۂ کمال کو پہنچی۔ تاج محل آگرہ اس عہد کی نادر عمارت ہے جس کی تفصیلات شاہ جہان کے میں بیان کی گئی ہیں ہر ناقد نے تاج محل آگرہ کو دیکھنے کو بعد اس کی بے حد تعریف کی ہے۔

شاہ جہان نے قلعہ آگرہ میں شاندار محل تعمیر کیا۔ اس قلعہ میں دیوان عام دیوانِ خاص اور موتی مسجد بھی قابلِ دید ہیں۔ دہلی اور لاہور کے قلعوں میں بھی شاہ جہان نے عظیم الشان عمارتیں بنوائیں۔ ہر قلعے میں دیوانِ عام خواب گاہیں اور شیش محل موجود ہیں۔ دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد

اس کی عظمت کا نشان ہیں۔ شیش محل، مثمن برج اور نولکھا برج..
شاہجہانی عمارتوں کی جان ہیں۔

شاہ جہان کی عمارتوں میں مختلف رنگ کے قیمتی پتھر اور سیپیاں اس انداز سے ترتیب دی گئی ہیں کہ ان کی سجاوٹ سے آنکھوں کو تازگی نصیب ہوتی ہے بعض عمارتوں میں میناکاری۔ کاشی کاری اور پچی کاری سے اُن کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ ہر عمارت کی سجاوٹ اس کی نوعیت کے مطابق ہے۔ عمارت، گنبد اور محراب کی بلندی متناسب و موزون ہے۔ سنگِ مرمر کی جالی کثرت سے مستعمل ہے۔

شاہ جہان کے عہد میں عمارتوں میں خالص اسلامی طرز ہے۔ فنِ تعمیر کو ہندوانہ اثرات سے پاک کر دیا گیا۔ ہر عمارت میں بے ساختہ پن اور دلربائی ہے۔ شاہجہانی مسجدیں پچی کاری کے باوجود سادگی کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔ بیل بوٹوں، مختلف خطوط۔ رنگدار اینٹوں اور مختلف رنگ کے پتھروں سے مختلف مسجدوں کو مزین کیا گیا ہے۔

شاہ جہانی قلعوں کی دیواروں کو فوجی ضروریات کے پیشِ نظر درخشانی اور سجاوٹ کی بجائے مضبوطی کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ قلعے کی ایک جانب جونہی شاہی محل شروع ہوتا ہے تزئین و آرائش اور قیمتی پتھروں کا استعمال بھی نمایاں ہو جاتا ہے، اور شاہی شان و شوکت اُجاگر ہو جاتی ہے۔

مغربی پاکستان میں شاہجہانی عمارتیں :۔ شاہ جہان نے شاہی قلعہ لاہور میں کئی ایک عمارتیں بنوائیں۔ ان عمارتوں میں سے خواب گاہ۔ نولکھا برج مثمن برج (جو ہشت پہلو ہے)، شیش محل اور چہل ستون والا دیوانِ عام

خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ شاہجہان نے شاہدرہ باغ میں جہانگیر کا مقبرہ نہایت ذوق و شوق سے بنوایا۔ نورجہاں اور آصف خان کا مقبرہ بھی اسی عہد میں بنا۔ سکھوں کے عہد میں ان تینوں عمارتوں کو کافی نقصان پہنچا۔ لیکن جہانگیر کے مقبرے میں اب تک رنگا رنگ کے خوشنما پتھر مقبرے کی زینت کو دوبالا کرتے ہیں۔ لاہور میں شاہجہانی عہد میں مسجد وزیر خان بھی تعمیر ہوئی۔ جس کی آرائش لاجواب ہے۔ ٹھٹھے میں شاہجہاں نے دو عالیشان مسجدیں بنوائیں۔ جن میں چمکدار اور رنگ دار یعنی روغنی اینٹیں لگوائیں۔ اینٹوں کے رنگ میں اب تک ترو تازگی موجود ہے اور کڑکتی دھوپ میں ان روغنی اینٹوں کا دلکش رنگ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔

بابر کی مانند شاہجہاں بھی باغات کا شوقین تھا۔ اس کے باغات میں سدا بہار درخت۔ بارہ دریاں۔ فوارے۔ نہریں۔ تالاب اور پھل دار درخت موجود ہیں۔ شاہجہانی باغات مختلف تختوں میں منقسم ہیں۔ باغ کے گرد دیوار اور برجیاں ہیں۔ لاہور میں اس نے شالامار باغ بنوایا۔ جو باغبانپورہ کے قریب ہے۔ کشمیر میں اس کے مشہور ترین باغات میں سے نشاط باغ چشمۂ شاہی اور شالیمار باغ قابلِ دید ہیں۔

تختِ طاؤس:۔ شاہ جہاں نے اپنے عہد میں تختِ طاؤس بنوایا تھا۔ جس پر ایک کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ یہ جڑاؤ تخت ہیروں اور قیمتی موتیوں سے سجایا گیا۔ تخت کے بارہ ستون تھے۔ جن پر دو مور بنے ہوئے تھے۔ یہ مور بیش بہا موتیوں کے ہار اپنی چونچ میں لئے

یوں کھڑے تھے۔ گویا ابھی ناچنا شروع کر دیں گے۔ ان موروں کی نسبت سے اس کو تختِ طاؤس کہتے ہیں۔ نادرشاہ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا۔ تو وہ دہلی کے قلعے سے تختِ طاؤس اپنے ساتھ ایران لے گیا۔

(۴) اورنگ زیب کے عہد کی عمارتیں :- شاہجہان کی وفات کے بعد مغلیہ فنِ تعمیر زوال پذیر ہو گیا۔ البتہ اورنگ زیب کے عہد میں لاہور میں شاہی مسجد تعمیر ہوئی۔ اس جامع مسجد میں دہلی کی لال مسجد کی مانند اعلےٰ قسم کا سُرخ پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ مسجد بہت وسیع ہے اور اس کے شاندار گنبدوں محرابوں اور میناروں سے اسلامی طرزِ تعمیر عیاں ہے۔ اس مسجد کی کرسی بلند ہے اور قلعہ لاہور کے مقابل ہے۔ اس مسجد کے قریب شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کا چھوٹا سا مزار ہے۔ شاہی مسجد کے مسقّف حصّے کے اندر ہلکے رنگوں کی لکیروں سے سجاوٹ کی گئی ہے۔ اس سجاوٹ سے سادگی اور متانت عیاں ہے۔ مسجد کے گرداگرد چھوٹے چھوٹے حجرے تعمیر کیے گئے تھے۔ اب ان حجروں میں ردّ و بدل کر کے سنگِ مرمر لگایا گیا ہے۔ اور مسجد کے گرداگرد برآمدے سے بنا دیئے گئے ہیں۔ بڑے دروازے کی جانب وضو کے لئے انتظام کیا گیا ہے مسجد کے صحن میں وضو کے لئے جو قدیم تالاب تھا۔ اُسے اب محض تزئین اور سجاوٹ کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ شاہی مسجد کی مرمت پر کئی لاکھ روپیہ صرف ہوتے ہیں

مغلیہ دور میں آرٹ مصوّری اور موسیقی

مغلیہ شہنشاہوں نے فنِ تعمیر کے علاوہ آرٹ، مصوری اور موسیقی کی بھی خوب سرپرستی کی، وہ صنعت کے نادر نمونوں خطاطی اور اعلیٰ جلد بندی کے بھی شوقین تھے۔ پس یہ کہنا بجا ہوگا کہ اکثر مغلیہ تاجدار گہری جمالیاتی نظر رکھتے تھے۔ مورخین کا خیال ہے کہ بابر اپنے ساتھ مصوری کے نادر شاہکار لایا تھا جو تیموری حکمرانوں نے محفوظ کر رکھے تھے۔ مصوری میں ہمایوں کا ذوق و شوق اس امر سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایران سے دو مشہور مصور میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ دونوں عظیم المرتبت مصور دلبستانِ چین کے پیرو تھے۔ اور اکبر کے دور میں وہ شہرۂ آفاق ہوئے اکبر کے زمانے میں ہندوستان کے مصوروں نے چین اور ایران کے اثرات کے علاوہ ہندوؤں کی مصوری اور نقاشی سے بھی استفادہ کیا مغلیہ آرٹ میں راجپوت آرٹ کے گہرے اثرات واضح ہیں اکبر کے زمانے میں کتابوں کے مصور نسخے تیار ہوئے۔ یعنی کتابوں میں وضاحت کے لئے تصاویر بھی شامل کی گئیں۔ ایسی مصور کتابوں میں سے داستان امیر حمزہ چنگیز نامہ، رامائن نل دمن اور کلیلہ دمنہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابو الفضل رقمطراز ہے کہ اکبر کے درباری مصوروں کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ خواجہ عبدالصمد کو شیریں قلم کا خطاب عطا ہوا تھا عبدالصمد اور میر سید علی کے علاوہ مشہور مصور فرخ بیگ، دسونت، تاراچند اور جگن ناتھ تھے۔

شہنشاہ جہانگیر مصوری میں خوب مہارت رکھتا تھا مصوری میں اس کا شعور اور ذوق اتنا بلند تھا کہ وہ دیکھتے ہی بتا دیتا تھا۔

کہ یہ تصویر فلاں مصوّر نے بنائی ہے اور تصویر کے کس کس حصّے پر مختلف مصوّروں نے قلمکاری کی ہے۔ جہانگیر کے عہد میں مناظرِ قدرت، پھولوں اور پرندوں کی تصاویر بنانے کے علاوہ کاشی کاری میں تصاویر بنانے کا آغاز ہوا۔ لیکن جہانگیری دور کی شہرت اس بنا پر ہے کہ اس زمانے میں مختصر تصویروں کی نقاشی (Miniature Paintings) کے دبستان کو بامِ عروج حاصل ہوا۔ جہانگیر کے عہد کے مشہور مصوّر آغا رضا، ابوالحسن، محمد نادر، محمد مراد سمرقندی اور بشن داس تھے۔

شاہ جہان کے عہد میں مصوّری کی بجائے فنِ تعمیر اور کاشی کاری پہ زور دیا گیا۔ شاہ جہان نے دیواروں طاقچوں اور محرابوں پر شفاف اور چمکیلے رنگوں میں کاشی کی پچیوں سے تصاویر بنوائیں۔ سبز، نیلے، اودے، زرد، لاجوردی اور سفید رنگ کی آمیزش اور حسنِ ترتیب سے دلکش تاثر پیدا کیا۔ قلعۂ لاہور کی شاہ برج والی مغربی دیوار پر آج تک شاہجہانی دور کی کاشی کاری کی پچیوں سے بنی ہوئی تصاویر موجود ہیں۔

شاہجہان اچھی مصوّری میں صاحبِ نظر تھا۔ لیکن اورنگ زیب کے عہد میں مذہب اور مصوّری کے تصادم سے اس فن کو زوال ہوا۔ اور شاہی دربار سے تمام مصوّروں کو چھٹی ملی۔ اکثر مصوّر حیدرآباد دکن، لکھنؤ اور بنگال چلے گئے۔

موسیقی:۔ بابر اور ہمایوں موسیقی کے سرپرست تھے۔ اور وہ خود اچھے موسیقار تھے۔ اکبر نے اس فن کو خوب ترقی دی۔ وہ پکّے راگوں کو بڑے ذوق اور انہماک سے سنتا تھا۔ اس کے زمانے میں تان سین

باز بہادر، بیجو باورا، سورداس اور رام داس جیسے شہرۂ آفاق موسیقار تھے۔ میاں تان سین عرف تنو ابتداء میں ہندو تھا۔ بعد ازاں وہ مسلمان ہوگیا اور اکبر کے نورتنوں میں شامل ہوا۔ وہ گوالیار میں مدفون ہے۔ اس کا داماد لال خان شاہ جہان کے عہد کا مشہور موسیقار تھا۔ جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں بھی موسیقی کو شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ لیکن اورنگ زیب نے اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی غرض سے شاہی دربار میں موسیقی بند کردی۔ البتہ تصوّف کے عروج سے قوالی عام ہوئی۔ اورنگ زیب کے جانشین ناچ گانے اور شراب کے دلدادہ تھے۔ اس لئے اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ دربار نے موسیقی کی خوب سرپرستی کی۔

مستند تاریخیں اور دیگر علمی ذخیرے

مغلیہ دور کے علمی ذخیرے۔ تراجم، یادداشتیں (Diaries) اور تاریخی کتابیں کافی اہم ہیں۔ بابر نے خود نوشت سوانح حیات ترکی زبان میں تزک بابری کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب نثر نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ تاریخ اور ادب میں اس کا مقام بلند ہے اور بابر کی شخصیت اس کتاب سے پورے طور پر جھلکتی ہے۔ اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خانخانان نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ بابر کے نقشِ قدم پر چل کر شہنشاہ جہانگیر نے بھی تزک جہانگیری لکھی جو فارسی زبان میں ہے۔ اس کتاب سے جہانگیر کی علمیت اور اس کا اعلیٰ ذوق عیاں ہے۔ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ لکھا جو مستند تاریخی کتاب ہے۔ ہمایوں کے ملازم جوہر نے

بھی تاریخی واقعات لکھے۔

اکبر کے عہد میں لاتعداد کتابوں کے فارسی میں تراجم ہوئے۔ اصل کتابیں ہندی یا سنسکرت میں تھیں۔ بدایونی نے راماین کا ترجمہ کیا۔ مختلف علماء نے مہابھارت کے حصوں کا الگ الگ ترجمہ کیا۔ ان حصوں کو یکجا کرکے رزم نامہ کا نام دیا گیا۔ حاجی ابراہیم سرہندی نے اتھروید کا ترجمہ کیا۔ اور فیضی نے ریاضی کی مشہور کتاب لیلاوتی کا ترجمہ کیا۔ عبدالرحیم خان خاناں نے واقعات بابری کا ترجمہ کیا۔ نیز کلیلہ دمنہ کو سلیس فارسی میں ڈھالا۔ مولانا شاہ محمد نے تاریخ کشمیر کا ترجمہ کیا۔ چند ایک عربی اور یونانی کتب کا بھی ترجمہ ہوا۔

اکبری دور کی مشہور فارسی تاریخیں کئی ایک تھیں۔ ان کتابوں میں سے ملا داؤد کی تاریخ الفی ابوالفضل کا اکبر نامہ اور آئین اکبری بدایونی کی منتخب التواریخ نظام الدین احمد کی طبقات اکبری فیضی سرہندی کا اکبر نامہ اور عبدالباقی کی مشہور تاریخ مآثر رحیمی قابل قدر تاریخی کتب ہیں۔

جہانگیر کے عہد کی مشہور تاریخی کتابیں اقبال نامہ جہانگیری مآثر جہانگیری اور زبدۃ التواریخ ہیں۔ شاہجہانی دور کی اہم تاریخی کتابوں میں سے بادشاہ نامہ (عبدالحمید لاہوری) عمل صالح (محمد صالح) بادشاہ نامہ (امین قزوینی) شاہجہان نامہ (عنایت خان) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں شہزادہ دارا نے اپنی سرپرستی میں گیتا اور اپنشد کے تراجم کرائے۔

اورنگ زیب کے زمانے میں فقہ اسلامی کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری مرتب ہوئی۔ شہنشاہ کے حکم سے علماء کے ایک کمیشن نے اس کتاب کی تدوین کی۔ اورنگ زیب کے عہد میں بھی کئی ایک مشہور تاریخی کتابیں

لکھی گئیں۔ محمد ہاشم خافی خان نے منتخب الالباب مرزا محمد کاظم نے عالمگیر نامہ محمد ساقی نے آثرِ عالمگیری سجان رائے بٹالوی نے خلاصتہ التواریخ اور ایشر داس نے فتوحات عالمگیری لکھیں۔

ادب۔ ثقافت اور کتب خانے

مغلیہ حکمران اپنے ساتھ شاعرانہ دماغ اور مصوّرانہ آنکھ لائے تھے لیکن وہ علم و ادب کا ذوق رکھتے تھے اور اُن کے ذاتی کتب خانے شہرۂ آفاق تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی اُمراء اور منصبداروں نے بھی ذاتی کتب خانے قائم کئے اور علم و ادب کی سرپرستی کی مغلیہ دور میں ایران سے لاتعداد علماء اور اہل فن ہندوستان میں وارد ہوئے اور اعلےٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ پس مغلیہ دور میں فارسی زبان سرکاری زبان بن گئی (اگرچہ اس میں ترکی الفاظ بھی نظر آتے تھے) اس کے علاوہ ایرانی تمدّن اور ثقافت برّصغیر پر کافی حد تک اثر انداز ہوئے۔ فارسی زبان میں شعر و ادب کو خوب فروغ ہوا۔ غزل۔ مثنوی۔ قصیدہ مقبول ہوئے اور نثر میں بھی صاحب فن اشخاص نے پورا زور صرف کیا۔ مختلف تراجم کا حال اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اہم فارسی شعراء میں سے فیضی عبدالرحیم خانخانان۔ عرفی۔ غزالی اور محمد حسین نظیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

فارسی کے علاوہ مغلیہ دور میں ہندی میں بھی گراں مایہ ادبی تخلیق ہوئی۔ نیز بنگالی ادب کو بھی فروغ ہوا شیر شاہ سوری

کے زمانے میں ملک جائسی نے پدماوتی کے عنوان سے اپنا مشہور افسانہ لکھا جس میں ایک خیالی راجپوت شہزادی پدمنی کو چتوڑ کی رانی بنا کر سلطان علاؤالدین خلجی کو اُس کا عاشق زار بنا لیا اس کہانی کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خانخاناں۔ بھگوان داس۔ مان سنگھ اور بیربل ہندی زبان میں شعر گوئی کے اُستاد تھے۔ اکبری دربار میں کرن اور نرہری سہائے ہندی کے مشہور شاعر تھے۔ اکبر کے زمانے میں ہندی کا مشہور ترین شاعر تلسی داس تھا جس نے سنہ 1623ء میں وفات پائی۔ اس کے علاوہ سورداس نے کرشن اور رادھا کے بارے میں دلکش اور والہانہ اشعار لکھے۔ اُس کے کلام کا عنوان سورساگر ہے۔
اس دور میں بنگالی زبان میں بھگتی تحریک کے مشہور راہنما چیتنیا نہ کی کئی ایک سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ اُس کے سوانح نگاروں میں سے کرشنا داس۔ برنداون داس۔ ترلوچن داس اور نرہری چکرورتی قابل ذکر ہیں۔ مغلیہ دور میں ہندوانہ علوم کے مرکز بنارس۔ نادیا (بنگال)۔ ترہٹ۔ متھرا۔ ہردوار اور اُجین تھے۔
مغلوں کے زمانے میں اسلامی تعلیمات کے اہم مرکزوں میں سے آگرہ۔ دہلی۔ لاہور۔ جونپور۔ لکھنؤ۔ الہ آباد۔ گوالیار اور انبالہ خاص طور پر مشہور تھے۔ آگرہ میں عظیم الشان کالجوں کی ابتدا ہمایوں اور ماہم انگہ (اکبر کی انّا) نے کی تھی۔ مغلیہ دور میں شہزادوں اور اُمراء کی تعلیم و تربیت کے لیئے خاص اتالیق ملازم رکھے جاتے تھے۔ متوسط طبقے اور عوام کے بچوں کی

تعلیم کے لئے کافی درسگاہیں موجود تھیں - ہر مسجد کے ساتھ مکتب ہوتا تھا - جامع مسجد کی حیثیت بڑے کالج یا یونیورسٹی کی مانند تھی - مسجد یا درسگاہ میں طلبا کی اقامت کا بندوبست تھا - سرکار کی جانب سے ان تعلیمی اداروں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے معقول مدد ملتی تھی - عام طور پر مسجد اور ملحقہ درسگاہ کے اخراجات کے لئے زمین وقف کر دی جاتی تھی - درسگاہوں میں ہندو اور مسلمان دونوں بلا تفریق مذہب تعلیم حاصل کرتے تھے - ان درسگاہوں کے علاوہ مشہور صوفیوں اور بزرگان دین نے جگہ جگہ علمی مراکز قائم کئے ہوئے تھے جو خانقاہ کہلاتے تھے - ان خانقاہوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام پر زور دیا جاتا تھا - ہر درسگاہ میں فارسی زبان کے علاوہ قرآن حدیث - فقہ - طب - منطق - ریاضی - تاریخ - جغرافیہ - سیاسیات اور سائنسی علوم کی تدریس ہوتی تھی - علم قیافہ اور نجوم کی تعلیم بھی عام تھی -

مغل شہزادیاں بھی شعر و سخن میں اعلیٰ علمی ذوق رکھتی تھیں نور جہاں - ممتاز محل - جہاں آراء اور زیب النساء علم و ادب میں خوب مہارت رکھتی تھیں - پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ لکھا جو فن تاریخ نویسی کا اعلیٰ نمونہ ہے - اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء نے امام رازی کی تفسیر کبیر کا فارسی میں ترجمہ کیا -

شاہجہانی دور سے اردو زبان کافی مقبول ہوئی اور ثقافتی

زبان کی حیثیت سے ملک بھر میں رائج ہو گئی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ میں بھی اُردو زبان کو خوب فروغ ہوا۔ اُردو شاعری کا باوا آدم ولیؔ دکن کا باشندہ تھا۔ اُس دور کے مشہور شعرا حاتمؔ۔ آبروؔ مظہرؔ اور خان آرزوؔ ہیں۔ بعد ازاں غالبؔ۔ ذوقؔ۔ انیسؔ۔ دبیرؔ نے اُردو شاعری کو چار چاند لگائے۔ مغلوں کے زمانے میں مشاعرے عام ہوتے تھے اور شعراء کی خوب قدر و منزلت ہوتی تھی۔ اُردو زبان پر حکمرانوں کی زبان یعنی فارسی کا گہرا اثر تھا لیکن اُردو اور ہندی کے مابین مناقشت مفقود تھی۔ اسی بنا پر اُردو زبان میں نامور ہندو اہلِ قلم بھی ہو گذرے ہیں جنہوں نے اپنے ماحول کی کامل عکاسی کی ہے۔

مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں کاغذ پہلی بار دسویں صدی عیسوی میں مسلمان اپنے ساتھ وسط ایشیا سے لائے مغلوں نے کاغذ سازی کے کارخانوں کو فروغ دے کر علم کی خدمت کی۔ مغلیہ دور میں خوش نویسی اور خطاطی کے اعلےٰ نمونے ملتے ہیں۔ عمدہ جلد سازی اور مصوّر کتابوں کی تدوین نے خوب ترقی پائی۔ قرآن مجید کے نادر نسخے اب تک ملتے ہیں جن کے کنارے مزیّن ہیں۔ اس کے علاوہ بعض کتابوں کی جلدوں اور صفحات پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہے۔ خوش نویسی سے لوگ روزی کماتے تھے لیکن خوش نویسی اُمراء اور شہزادگان کا محبوب مشغلہ بھی تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے آج تک ملتے ہیں۔ ہمایوں۔ اکبر۔ دارا شکوہ

اور دیگر مغلیہ اُمراء کی ذاتی لائبریریاں نادر کتابوں کے نسخوں سے بھرپور تھیں۔ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے دوران میں مغلیہ دور کے یہ کتب خانے لٹ گئے اور نادر کتابوں کے نسخے بکتے بکاتے مغربی ممالک میں جا پہنچے۔ اب تک برِ صغیر بھر میں بعض قدیم خاندانوں کے پاس نادر کتب کے قلمی نسخے موجود ہیں

Typical Questions

Q. 1. Describe the structure of Central Government under the Mughals and explain briefly the duties of the various officers.

Q. 2. Give a brief description of the structure of provincial administration in the Mughal period.

Q. 3. Give a brief account of the progress of painting, music and literature under the Mughals.

Q. 4. Give a critical account of the evolution of Mughal Architecture stage by stage.

Q. 5. "The Mughals began as giants and ended as jewellers." Discuss this statement with reference to Mughal Architecture.

Q. 6. Give a brief account of the development of Historiography under the Mughals (Babur to Aurangzeb).

Q. 7. Analyse carefully the Legacy of Mughals for the people of Indo-Pakistan sub-continent.

Q. 8. What were the legacies or permanent effects of the Mughal Rule in India ?

Q. 9. Write short notes on :—

(*a*) Miniature Paintings under the Mughals.

(*b*) Progress of Hindi literature under the Mughals.

(*c*) Caligraphy as an art under the Mughals.

(*d*) Mughal Libraries.

(*e*) Mughal Gardens.

امتحانی سوالات

۱۔ مغلیہ دور میں مرکزی حکومت کے انتظامی ڈھانچے کے خدوخال بیان کیجئے اور اہم افسروں کے فرائض بیان کیجئے۔

2۔ مغلیہ دور میں صوبائی انتظام سلطنت کا حال قلمبند کیجئے۔

3- مغلیہ دور میں مصوری- موسیقی اور ادب کی ترقی کا جائزہ لیجئے۔
۴- مغلیہ دور میں فن تعمیر کے تدریجی ارتقاء کا حال قلمبند کیجئے۔
5- مغلیہ فن تعمیر پر درج ذیل فقرے کی روشنی میں بحث کیجئے۔

"ابتدا میں مغلیہ عمارتیں دیو قامت اور عظیم الجثہ ہوتی تھیں لیکن بعد ازاں اُن کا فن تعمیر حسن موزونیت اور تزئین میں جوہریوں کی فنکاری کا نمونہ ہے۔"

6- مغلیہ دور میں بابر سے لے کر اورنگ زیب تک فن تاریخ نویسی پر ایک مختصر شذرہ تحریر کیجئے۔
۷- برِ صغیر پاکستان و ہند کے اہالیان کے لئے مغلیہ دور کی میراث کا جائزہ لیجئے۔
8- ہندوستان پر مغلیہ فوقیت کے پائیدار اثرات یا ترکہ کا جائزہ سپردِ قلم کیجئے۔
۹- مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیئے۔
(ا) مغلیہ دور میں مختصر تصاویر کی نقاشی۔
(ب) مغلیہ دور میں ہندی ادب کی ترقی کی سرگزشت۔
(ج) مغلیہ دور میں خوش نویسی اور خطاطی کی مقبولیت۔
(د) مغلیہ دور کے کتب خانے۔
(ہ) مغلیہ دور کے باغات۔

رحمانی پرنٹنگ پریس۔ ذیلدار روڈ ۔ لاہور